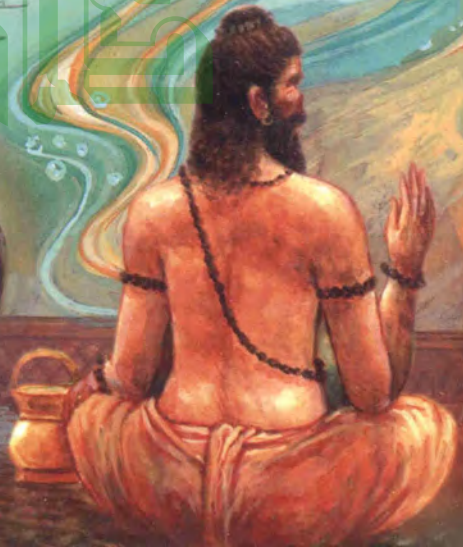


# انکارانی

[www.allpdfstuff.blogspot.com](http://www.allpdfstuff.blogspot.com)

1

انوار صدیقی



شوشہ www.allpdfstuff.blogspot.com

20 مارچ 2001ء کو ”امبریل“ کا پیش لفظ تحریر کرنے کے بعد میں نے کمر سیدی کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ امریکہ سے میرے بیٹے ڈاکٹر فرخ کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ میں نے رخت سفر باندھنا شروع کیا۔ برادر محمد علی قریشی کو علم ہوا تو لاہور سے کراچی آ گئے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد دہلی زبان میں ”انکا“ کو ”انکارانی“ بنانے کا ”شوشہ چھوڑ دیا“۔ ”انکا“ میرے ذہن میں بھی ایک عرصے سے کلبلا رہی تھی۔ میں نے اپنے ناول ”تاریک بھوت“ میں بھی ”انکا“ کا ذکر دہلی زبان میں کیا، پھر ”برق پاش“ میں ”فساد کی جڑ“ کے عنوان سے جو پیش لفظ تحریر کیا اس میں ”انکارانی“ کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا تھا۔ بہر حال محمد علی قریشی ”شوشہ چھوڑ کر“ لاہور چلے گئے اور میں ”انکارانی“ کے عشق میں مبتلا ہو کر ذہنی طور پر ”دربدر“ ہونے لگا۔

”انکا“ قارئین کے ذہنوں پر اٹھائیس سال سے ”چھدکتی“ پھر رہی ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں ”انکا“ کے کروڑوں پرستار موجود ہیں۔ ”انکا“ کی شہرت میں میرے قلم سے کہیں زیادہ اس کے چاہنے والوں کی محبتیں شامل ہیں۔ ”انکا“ کو جو عروج حاصل ہوا وہ آپ کی پسندیدگی اور چاہتوں کا صلہ ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ میں نے ”انکا“ کو صرف تخلیق کیا۔ آپ نے اسے دل کی دھڑکنوں میں جگہ دی۔ نگاہوں میں بسالیا۔ پلکوں پر سجالیا۔ ”انکا“ کے خنجرے برداشت کئے۔ اس کی ناز برداریاں کیں۔ اس کی شوخی اور شرارتوں کو سراہا۔ مجھے یاد ہے کہ آپ کو ہر ماہ بڑی شدت سے اپنی ”انکا“ کا انتظار رہتا تھا۔ آپ ہی کے پیار کی خاطر میں نے ”انکا“ کو ”انکارانی“ بنانے کا ارادہ کر لیا..... ”انکارانی“ تحریر کرنے کا ایک سبب اور بھی تھا.....!

لاہور ”زندہ دلوں“ کا شہر ہے۔ لاہور کو ”ادب کا گہوارہ“ بھی کہا جاتا ہے۔ اسی لاہور کے تین چار ”دیانت دار“ ناشر حضرات نے کراچی کے کچھ ”نقب زنی“ اور ”کردار کشی“ کے فن میں مہارت رکھنے والے مصنفین کے ساتھ ”ساز باز“ کر کے ”انکا“ کے کردار پر

شبنون مارنے کا ”مذموم دھندا“ بنا رکھا ہے۔ ہندوستان اور امریکہ میں بھی ”انکا“ کے کردار کو ”باپ کی جاگیر“ سمجھ کر ”بڑے دھڑلے“ سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ مجھے آئے دن خبریں ملتی رہتی ہیں کہ ”آپ کے ”فلانے“ واقف کار نے ”بھیس بدل“ کر ”انکا“ کے لازوال کردار پر ”طلبلہ آزمائی“ کی ہے..... (میں نے دیدہ و دانستہ ”طبع آزمائی“ کو ”طلبلہ آزمائی“ تحریر کیا ہے۔ وہ یوں کہ جس طرح کوئی ”اناڑی“ طلبلہ بجانے والا اچھی خاصی غزل کا ”ستیاناس“ مار دیتا ہے، اسی طرح یہ ”چمبہ ساز“ اور ”برساتی مینڈک“ بھی ”انکا“ کے ”سُر تال“ کو سمجھے بغیر ”بھان مٹی“ سے رشتہ جوڑ کر اُلٹے سیدھے تانے بانے ”نن کر“ ”ناول نگار“ بن بیٹھے ہیں) اور ”ادب نواز ناشران“ ان کے ”الم غلم“ مسودوں کو چھاپ کر ”شہیدوں میں شامل“ ہونے سے کم نہیں سمجھتے۔ میں نے ایک ”دانش ور“ سے پوچھا۔ ”یہ مصنف اور ناشر حضرات ایسا کیوں کرتے ہیں.....؟“ اُس نے دائیں بائیں دیکھا پھر بڑی رازداری سے کہا۔ ”برادرِ م، آپ کو اپنے سوال کا جواب فیروز اللغات اردو جدید (نیا ایڈیشن 1967ء) کے صفحہ نمبر 289 کے کالم نمبر 2 پر آخری لفظ سے پہلے والی ”مثل“ میں مل جائے گا۔ مجھے کیوں گتھگار کرتے ہیں؟ خود ملاحظہ فرمائیں۔“ میں نے مذکورہ لغت نکالی۔ صفحہ نمبر کھولا۔ دانش ور کے دیئے ہوئے حوالے پر نظر ڈالی تو ”ششدر“ رہ گیا..... وہاں لکھا تھا ”چوری اور (سر) سینہ زوری“.....!!

بہر حال، میں نے امریکہ پہنچ کر کئی بار ”انکارانی“ کو شروع کرنا چاہا لیکن ایک خوف آڑے آ جاتا..... اگر بات نہ بنی.....؟ ”انکا“ کا جو خاکہ اس کے پرستاروں کے ذہنوں میں محفوظ ہے، دلوں میں گھر کر چکا ہے اسے ذرا بھی ٹھیس پہنچی تو ”انکا“ کے چاہنے والوں کی حُکلی ایک طرف۔ دشمنوں کو بھی بقول ابن صفی ”..... پیٹ پیٹ کر ہنسی اڑانے کا موقع میسر آ جائے گا۔“ میں نے محمد علی قریشی کو بہلانے کی خاطر ”انکارانی“ کے خیال کو پس پشت ڈال کر ”برق پاش“ کا مسودہ تیار کیا، میرا خیال تھا کہ وہ تازہ مسودہ پا کر بہل جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ”انکارانی“ کے سلسلے میں اس کی خواہش اور بھڑک اُٹھی۔ اصرار پہلے سے دوچند ہو گیا۔ چنانچہ مجھے ”انکارانی“ کے سلسلے میں نہایت سنجیدگی سے تمام ضروری مواد اکٹھا کرنا پڑا۔ اسی دوران اس قادرِ مطلق کی جانب سے ”جج“ کا بلاوا آ گیا۔ میں بیوی کے ساتھ مرحوم والدین کی طرف سے ”جج بدل“ کی سعادت حاصل کرنے چلا گیا۔ (خدا

کے گھر اور اس کے محبوب کے در پر ہم دست نگیروں کی یہ پانچویں حاضری تھی) میں مارچ 2002ء کے وسط میں ”ارض مقدس“ سے واپس آیا۔ محمد علی قریشی لاہور سے ہار، پھول اور مٹھائی لے کر آ گئے۔ بڑی عقیدت اور احترام سے گلے ملے۔ ایک کان میں ”مبارک باد“ کا ”شہد نکایا“ دوسرے میں پھر ”انکارانی“ کا ”شوشہ چھوڑ دیا“..... میں نے دس بارہ روز آرام کیا پھر اللہ کا نام لے کر لکھنے بیٹھ گیا۔ کرم ہے اس ”ذات پاک“ کا جس نے ”میرے قلم کی رہنمائی کی“ کم و بیش سات ماہ کی محنت کے بعد ”انکارانی“ کا مسودہ بروز جمعہ، مورخہ 18 اکتوبر 2002ء کو مکمل ہوا۔ میں نے ”شکرانے“ کی نماز ادا کی۔ ”انکارانی“ کی تکمیل میں بھی میری وحشتوں کا وہی عالم تھا جس کا تذکرہ میں ”امبر تیل“ میں کر چکا ہوں۔ آٹھ دس روز میں جو کچھ لکھتا، اُس پر نظر ثانی ضرور کرتا۔ جہاں تقصی کا ذرا احساس ہوتا، رد و بدل کرنے بیٹھ جاتا۔ کبھی کسی صفحہ پر ”تنگی داماں“ آڑے آ جاتی تو ”حاشے“ میں اس کی کوڑور کرتا۔ کوئی پیرا گراف ہلکا محسوس ہوتا تو اس کی جگہ دوسرے کاغذ کی ”پیوند کاری“ کر کے از سر نو تحریر کرتا۔ اکثر کئی کئی سطروں پر ”کرکشن پن“ (CORRECTION PEN) سے ”سفیدی پھیر کر“ اس پر نئے جملے اُجاگر کرنے پڑے۔ یہ خدشہ بھی لاحق رہتا کہ ”کمپوزنگ“ کرنے والا ”شین، قاف“ کی غلطی کر کے کہیں ”کرکشن“ کے بجائے ”کرکشن“ کمپوز کر گیا تو ”انکارانی“ کی عاشقی میں ”عزت سادات“ سے بھی محروم ہونا پڑے گا۔

”انکارانی“ کے کردار میں حقیقت کا رنگ بھرتے ہوئے اور ”پوشین“ (SITUATION) کے تقاضوں کے پیش نظر کہیں کہیں کچھ ایسے الفاظ بھی لکھنے پڑے جو ممکن ہے ”بار خاطر“ پر گراں گزریں۔ جو کچھ ہوا ”بے ساختگی“ میں ہوا۔ قصور میرا نہیں، کرداروں کا ہے جو ”موقع و محل“ کے اعتبار سے ”اپنی اپنی بولیاں“ بولتے رہے۔ میں سر جھکائے انہیں لکھتا رہا۔ یوں بھی ہر ”جھکے“ اور ”ہر فرد واحد“ کی اپنی اپنی زبان ہوتی ہے۔ پولیس افسران اگر مجرموں سے ”لکھنوی انداز“ میں ”باز پرس“ شروع کر دیں تو ہو چکی جرائم کی ”سج کئی“..... مجرم ”نواب صاحب“ بن کر ”مونچوں پر تاد“ دیتے پھریں گے۔ ”چڑے اور ڈنڈے کی زبان“ میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ بزرگوں کی زبان سے صرف ”دُعائیں“ بھلی لگتی ہے..... لیکن بات جہاں دیرینہ دشمنی کی ہو، ”زخم ناسور“ بن چکے ہوں، ”مرنے یا مار ڈالنے“

کی ”نوبت“ آجائے اور ”انکارانی“ سر پر اپنے ”نوکیلے پنچ“ چھو رہی ہو تو ”جو کچھ نہ ہو“ کم ہے۔

میں نے ”انکا“ کے بعد اب ”انکارانی“ کا ”شوشہ چھوڑ دیا ہے“۔ آپ حسب دستور اسے بھی اپنے ”پرائگندہ“ ذہنوں کی مشین میں ڈال کر ”پھوک“ کی حد تک پہنچانے کی خاطر ”کمر کس لیں“۔ ”انکا“ کے کردار پر آپ کی ”دست درازی“، ”نقب زنی“ اور ”چوبہ سازی“ ہی میری ”تخلیق“ اور ”تحریر“ کی کامیابی کی ”سند“ ہے۔ گریبانوں میں جھانک کر کہیں۔ ”آپ کا ضمیر (اگر ہے تو) کیا کہتا ہے.....؟“

”انکارانی“ کے ضمن میں اگر برخوردار شہزاد احمد کا ذکر نہ کروں تو زیادتی ہوگی۔ انہوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود جس محبت سے پورے مسودے کو پڑھنے اور ”اغلاط“ کی نشاندہی کرنے میں میرا ہاتھ بٹایا وہ ”قابل ستائش“ ہے۔ موصوف کی مختصر تعریف یہ ہے کہ (نہ جانے کیوں؟) میرے مداحوں میں سے ہیں۔ مستقل سکونت کراچی میں ہے لیکن محمد علی قریشی نے انہیں لاہور سے ”دریافت کر کے“ میزے حوالے کر دیا۔ بواذین نوجوان ہے۔ خدا کرے زندگی کے تمام شعبوں میں کامیابی حاصل کرے.....!

میرا ذاتی خیال ہے کہ ”انکارانی“ آپ کو ”انکا“ کے مقابلے میں زیادہ پسند آئے گی.... سچ کیا ہے؟ اس کا فیصلہ ”انکا“ کے پرستار ہی کریں گے.....!

آپ کی قیمتی آراء اور بے لاگ تبصروں کا منتظر

انوار صدیقی

کراچی۔ 23 اکتوبر 2002ء

www.allpdfstuff.blogspot.com

قارئین زندہ۔ انکا باقی

www.allpdfstuff.blogspot.com

میں لندن کے سب سے بڑے ہسپتال کے وی آئی پی روم میں آنکھیں بند کئے بستر پر لیٹا اپنی تسبیح روز شب کے دانے شمار کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جین قریب ہی کہیں کرسی پر کہنی ٹکائے بیٹھی ہوگی یا دیوار سے لگی کھڑی حسرت بھری نظروں سے میری سمت دیکھ رہی ہوگی۔

جب سے وہ مجھے بمبئی کی فٹ پاتھ سے اٹھا کر لندن لائی تھی، میری طرف سے امید و بیم کی کیفیتوں سے دوچار تھی، ماہر ڈاکٹروں کی ایک پوری ٹیم بڑی جانفشانی سے میرے علاج معالجہ پر تعینات تھی، وہ اپنے وسیع تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں جین کو متعدد بار یقین دلا چکے تھے کہ میری زندگی کو ایسا کوئی خطرہ لاحق نہیں جس کی خاطر راتوں کی نیند اور دن کا جین حرام کیا جائے لیکن اس کے باوجود وہ ایک لمحے کو بھی مجھ سے دُور رہنے پر آمادہ نہیں تھی۔

جین مارنڈا، مغرب کی آزاد اور کھلی فضاؤں میں کسی حسین اور نازک اندام تھلی کی مانند ڈال ڈال پات پات رنگ بکھیرنے والی کافراوا حسینہ جو ایک نگاہ غلط انداز سے لاکھوں دلوں پر بجلیاں گرا سکتی تھی میری محبوبیت کے سحر میں اس طرح اسیر ہو گئی کہ اُسے اپنی قدردانیت کا اندازہ بھی نہیں رہ گیا۔ مجھے وہ ساتیں، وہ لمحے یاد ہیں جب جین نے مجھے شناخت کرنے کے بعد خوشی سے چیخ مار کر میرے جسم کی تمام تر گندگی، میل کچیل اور تعفن کو یکسر نظر انداز کر کے مجھے اپنی مہکتی بانہوں میں بڑی شدت سے سمیٹ لیا تھا، میں بھی ششدر رہ گیا۔ راہ گیروں کے لئے بھی کسی حسین و جمیل سفید قام دوشیزہ کی ایک خستہ حال اور ناگفتہ بہ حالات سے دوچار شخص کے لئے وہ انداز وارفتگی اور شیداانیت حیران کن تھی۔ ہمارے گرد تماشا بینوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ جین نے مجھے اپنی حسین بانہوں کا سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے اپنی شستگی کا احساس دلانے کی خاطر مدھم آواز میں سرگوشی کی۔



”میں ایک بے گور و کفن لاش ہوں جین، تم میرے لئے اپنا قیمتی وقت کیوں ضائع کر رہی ہو؟ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اب زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں رہا۔ میری مانو تو کانٹوں میں الجھنے کی بجائے واپس لوٹ جاؤ۔ تمہارا دولت علی تو نہ جانے کب کا.....“

”نہیں..... ایسی دل آزار باتیں مت کرو۔“ اُس نے تڑپ کر اپنا نازک ہاتھ میرے ہونٹوں پر جمادیا۔ بڑی لجاجت سے بولی۔ ”جب تمہیں اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تو اسے میری جھولی میں ڈال دو۔ میں تمہیں لندن لے چلوں گی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ پھر..... ہم ایک نئی زندگی کی ابتہا کریں گے۔“

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا، اُس کے جذبات کی صداقت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ کبھی وہ سر اغراساں جم کی محبوبہ تھی۔ جم نے اُسے پہلی بار مجھ سے امرائے لندن کے کلب میں اپنی سنگیتری کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا۔ اس حسینہ دلنواز کو دیکھ کر میرے سینے میں فشار برپا ہونے لگا۔ وہ کسی مصور کا حسین تخیل تھی جو لاشعور کی سرحدوں کو پھلانگ کر شعور کی دنیا میں آگئی تھی، کسی شاعر کا خواب تھی جس کے شاداب جسم کا ایک ایک بیج غم گنگنا تا محسوس ہوتا تھا، کسی ماہر سنگتراش کا لازوال شاہکار تھی جس کی صناعی سے متاثر ہو کر قدرت نے اس میں رُوح پھونک دی تھی۔ شاید وہ کوئی اپسرا تھی جو اندر کے اکھاڑے میں رقص کرتے کرتے بد مستی کے عالم میں بھولے سے آسمان کی بلندیوں سے زمین پر اتر آئی تھی۔ اُس کی غزالی آنکھوں میں مستی کے جام چھلک رہے تھے۔ اُس کی ایک ایک ادا نرالی تھی۔ وہ سرتاپا قیامت ہی قیامت تھی۔ اُس کے جسم کا ہوش رُبا گداز کسی طاقتور مقناطیس سے زیادہ پُرکشش تھا۔ میں اُسے دیکھ کر محو ہو گیا۔ میری زندگی میں ہزاروں لڑکیاں آچکی تھیں لیکن جین سب سے مختلف تھی۔ میں اسے زیادہ دیر آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکا، اُس کے اطمینان اور خواب جسم کے دیکھے ریٹوں پر میری حریص نگاہیں بھسلنے لگیں۔ میں پہلی ملاقات میں اس پر کوئی غلط تاثر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا، جم براؤن سے گفتگو میں مصروف ہو گیا مگر میرے وجود کے اندر جین کے قرب نے ایک تلاطم برپا کر دیا تھا۔ جم سے باتیں کرتے ہوئے میری نگاہیں بار بار جین کی سمت ہلکنے لگتیں۔

جین کو تسخیر کرنا میرے لئے کچھ دشوار نہ تھا۔ انکا میری دسترس میں تھی، کئی بار وہ مجھے جین کی خاطر اُکسا چکی تھی۔ میرا ایک اشارہ جین کو کسی کپے پھل کی طرح میری خواہشات

کی دہلیز پر ڈھیر کر دیتا، میں اُس کے گداز جسم پر فح کے جھنڈے گاڑ کر ان لڑکیوں کی طویل فہرست میں شامل کر سکتا تھا جو میری خواہشات کی تکمیل کو اپنی خوش بختی تصور کرتی تھیں۔ لیکن جین کے سلسلے میں انکا کے بجائے میں اپنی ذاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا خواہشمند تھا۔ قدرت نے اس کے لئے مجھے ایک موقع بھی فراہم کر دیا۔ ان دنوں میں ہندوستان جانے کی خاطر پر تول رہا تھا جب جم براؤن کے بے حد اصرار پر میں جرمنی جانے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ جم کو جرمنی کے ایک معروف سائنسدان مارک کو انخواہ کرنے کا مشکل کام سونپا گیا تھا۔ مجھے جم یا اس کے کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں شاید اُس کی درخواست کو کسی بہانے سے رد کر دیتا لیکن جب جم نے مجھے بتایا کہ اس اہم مہم میں جین میری سیکرٹری کی حیثیت سے میرے ساتھ ہوگی تو میں نے اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا۔

برلن میں میرا اور جین کا قیام ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوا۔ ہمارا کمر مشترک تھا۔ کام کی اہمیت کے پیش نظر ہمارا ہر وقت ایک دوسرے سے قریب رہنا ضروری تھا، وہاں مجھے جم یا کسی دوسرے واقف کار کی مداخلت کا کوئی اندیشہ بھی نہیں تھا..... پہلی ہی رات جب جین ڈرائیو روم سے شب خوابی کا لباس پہن کر برآمد ہوئی تو میرے جسم سے آڈخوڑ چوٹیاں لپٹ گئیں، میرے وجود کے اندر کا آتش فشاں پھٹ پڑنے کو چمکنے لگا۔ سفید باریک گاؤن سے جین کا مرمریں جسم جھانک رہا تھا۔ وہ کندن کی طرح دمک رہی تھی، اُس کے جسمانی نشیب و فراز پارے کی مانند چل رہے تھے۔ سونے کے ارادے سے اپنے بستر پر جانے سے پیشتر وہ مجھے دُش کرنے کی خاطر قریب آئی تو انکا میرے سر پر کسمسانے لگی۔

”جمیل..... اس کے جسم کو غور سے دیکھو، اس کے ایک ایک انگ سے خون چھلک رہا ہے۔“

میں نے عالم تصور میں انکا کو دیکھا، وہ ندیدوں کی طرح اپنی زبان ہونٹوں پر پھیر رہی تھی، انسانی خون اُس کی غذا تھی۔ اُس کی نگاہیں جین کے سراپا پر چل رہی تھیں، ان نگاہوں میں کسی ایسے ماہر شکاری کا اعتماد جھلک رہا تھا جس کی زد میں آیا ہوا شکار کبھی اس کے نشانے سے فرار نہ حاصل کر سکا ہو۔

”جین کا خیال دل سے نکال دو انکارانی.....“ میں نے سرگوشی کی۔ ”اس پھول کو ابھی گلشن میں کچھ عرصہ اور مہک لینے دو۔“

”تم جین کو مجھ پر ترجیح دے رہے ہو؟“ انکا ٹھنک کر بولی۔ ”اپنی انکا پر.....“

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ جین نے قریب آ کر میری پیشانی کا بوسہ لیا تو میں اپنے براہیختہ جذبات پر قابو نہ پاسکا، میرے ہاتھ کا پھندا اچانک جین کی لوجہدار کمر کے گرد تنگ ہوا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی، لہرا کر میری آغوش میں آگری۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے قرب کی تپش سے پکھل کر موم ہو جائے گی، مغربی تہذیب میں ایسے چھوٹے موٹے تصادم آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں، انہیں معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ جین بھی اسی ماحول کی پروردہ تھی مگر میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ میری گود میں بکھرنے کے بعد اُس نے تیز نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکا، پھر اپنا سفید گاؤں جو میری رندانہ جسارت پر منتشر ہو گیا تھا، سینٹے ہوئے تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”دولت علی.....“ (لندن میں، میں نے خود کو دولت علی کے نام ہی سے روشناس کرایا تھا) اُس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم شاید بھول رہے ہو کہ ہم یہاں ایک اہم مشن پر آئے ہیں۔“

”مجھے یاد ہے.....“ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن تمہارا خوبصورت اور حسین وجود بھی میرے لئے کسی اہم مشن سے کم حیثیت نہیں رکھتا۔“

”میں جانتی ہوں.....“ وہ دبی زبان میں بولی۔ ”تم اپنی روحانی قوتوں سے کسی کو بھی اپنا تابع کر سکتے ہو۔“

”ہاں.....“ میں زیر لب مسکرایا۔ ”تم میری قوت کے کئی کھیل تماشے دیکھ چکی ہو۔“

”مجھے تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف ہے لیکن.....“

”کچھ کہنے سے پیشتر ایک بار قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر خود اپنے حسن بے مثال کا جائزہ لو۔“ میں نے اُس کے اندر بھرے بارود کو آگ دکھانے کی کوشش کی۔ ”شاید تمہارا اپنا عکس میرے جذبات کی ترجمانی کر سکے۔“

”تم“ وہ سلجھے ہوئے انداز میں بولی۔ ”یہ..... کیسی باتیں کر رہے ہو؟“

”مجھے غلط مت سمجھو.....“ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”میں چاہوں تو پلکوں کی ایک جنبش سے تمہیں اپنا دیوانہ بنا سکتا ہوں، تم خوشی خوشی میری ہانہوں میں سٹ جانے کو اپنے لئے ایک اعزاز سمجھو گی لیکن تمہارے سلسلے میں نہ جانے کیوں میں

مصنوعی تکمیل سے گریز کرنا چاہتا ہوں، تم ایک خوبصورت لڑکی ہو۔ وقت کی ڈالی پر مہکتا ہوا ایک تازہ گلاب، میں تمہیں زبردستی توڑنے کی کوشش نہیں کروں گا..... میری خواہش کی تکمیل کے لئے تمہاری آمادگی بھی شرط ہے۔“

”دولت علی.....“ وہ ایک لمحے کو جھجکی، پھر میرے قریب آ کر بڑی معصومیت سے بولی۔ ”میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں بھی تمہاری شخصیت سے متاثر ہوں مگر پلیز..... میرا اشار لندن کی ان آزاد خیال لڑکیوں میں مت کرو جو شراب کے محض ایک جام کی بیخودی کی خاطر اپنی خودی کو غلاظتوں کے ڈھیر میں دفن کر دیتی ہیں..... اگر تمہارے نزدیک میری آمادگی بھی شرط ہے تو مجھے سوچنے کی مہلت دو..... اور..... تم یہ کیوں فراموش کر رہے ہو کہ میں جم سے منسوب ہونے والی ہوں۔ اسی وجہ سے ایک بہتر مستقبل کی خاطر میں سیکرٹ سروس سے وابستہ ہوئی ہوں۔ جم نے تمہیں قابل اعتماد سمجھ کر ہی مجھے تمہارے ساتھ بھیجا ہے۔ کیا تم جم کے اعتماد کو.....“

”میں تمہیں اپنے بارے میں غور کرنے کی مہلت دیتا ہوں۔“ میں نے جین کی بات کاٹ کر کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ تم مفاہمت کے انداز میں کوئی حتمی فیصلہ کرو گی۔“

”جیل.....“ یہ کیا حماقت کر رہے ہو؟“ انکا میرے سر پر کلبلانے لگی۔ ”تم اس موم کی پتلی کی باتوں میں آ گئے۔ یہ مغربی تہذیب کی پروردہ آزاد اور آوارہ خیال حسینائیں محض اپنا بھاؤ بڑھانے کی خاطر اس قسم کی لچھے دار باتیں کرتی ہیں۔ مجھے حکم دو میں ایک لمحے میں اسے تمہاری آغوش میں چھلنے پر مجبور کر سکتی ہوں۔“

”جین.....“ میں نے انکا کی بات کو نظر انداز کر کے بڑی شائستگی سے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”میں تمہاری آمادگی کے اظہار کا انتظار کروں گا، اس یقین کے ساتھ کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔“

جین کو میری بات کا یقین آیا تو اُس کے چہرے سے تفکرات کے بادل چھٹ گئے۔ اُس نے اظہار تشکر کے طور پر ایک بار پھر میرے قریب آ کر میری پیشانی پر اپنے جلتے ہونٹوں کی مہر ثبت کی، پھر مسکراتی ہوئی اپنے بستر پر چلی گئی۔ انکا مجھے عجیب نظروں سے گھور رہی تھی، شاید جین کے لئے میرے ذہن میں ابھرنے والے پاکیزہ خیالات پڑھنے کے بعد وہ کسی خاص نتیجے پر پہنچنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔

پھر..... جین اور میرے درمیان اعتماد کی فضا قائم ہوئی تو فاصلے بتدریج سننے لگے۔ میں نے جم براؤن کے مشن کو کامیاب کرنے کے بعد بھی جین کو کچھ عرصے کے لئے روک لیا۔ رفتہ رفتہ وہ میرے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میں جرمنی میں اپنے قیام کی مدت بڑھاتا رہا۔ میں نے انکا کو کچھ وقت کے لئے لندن واپس بھیج دیا تاکہ وہ اپنی غذا کی خاطر انسانی خون کے حصول کے لئے پریشان نہ ہو۔ انکا کی موجودگی میں یہ خطرہ تھا کہ کہیں وہ جین کے سلسلے میں مجھے کوئی غلط قدم اٹھانے پر مجبور نہ کر دے۔

ایک روز میں فرینکفرٹ کے نائٹ کلب میں جین کے مہکتے وجود کو اپنی بانہوں میں لئے رقص کر رہا تھا کہ انکا اچانک میرے سر پر آ گئی۔ میں نے اُسے عالم تصور میں دیکھا، وہ اپنے دونوں ہاتھ کولہوں پر جمائے ملک ملک کر میرے گھنے بالوں کے درمیان چہل قدمی کرنے میں مصروف تھی۔ اُس کی آنکھوں سے مستی پک رہی تھی۔ چہرہ قدحاری اتار کی مانند سرخ ہو رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ انسانی خون سے پوری طرح سیراب ہو کر آئی ہے۔ خون پی لینے کے بعد اُس کے ہونٹ گلاب کی پتھریلوں کی طرح کھل اُٹھتے تھے۔

”کس کا خون کر کے آئی ہو.....؟“ میں نے اُسے چھیڑنے کی خاطر دریافت کیا۔

”سارا کا.....“ انکا نے مسکرا کر جواب دیا۔

سارا کا نام سن کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ لندن میں قیام کے دوران سب سے پیشتر سارا ہی مجھ سے متعارف ہوئی تھی۔ بڑی زندہ دل اور شوخ طبیعت کی مالک تھی۔ لیکن باپ کی موت کے بعد وہ ذہنی ڈپریشن کا شکار ہو گئی تھی۔ اُس کی بے پناہ دولت اور جائیداد کے حصول کی خاطر شری پسند عناصر دوستی کی آڑ میں قدم قدم پر اُس کے لئے دُشواریاں پیدا کر رہے تھے۔ سازشوں کے جال بن رہے تھے۔ سارا میری محبت میں گرفتار تھی اس لئے میری ذات پر بھی کئی خطرناک حملے کئے گئے۔ انکا نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو شاید میں لندن کی کسی جیل میں پڑا سزا رہا ہوتا۔ مجھے سارا سے صرف اُنسیت تھی، وہ میری ایک اچھی دوست تھی۔ میں اُس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں قائم کر سکتا تھا۔ لندن کے قیام کے دوران اُس کی دوستی میرے بہت کام آئی تھی۔ اُسی نے مجھے محفلوں میں روشناس کرایا تھا۔ دباؤ غیر میں اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ انکا نے میرے چہرے کے بدلے تاثرات دیکھ کر چبھتے ہوئے

لچے میں دریافت کیا۔ ”کیا سارا کے بارے میں سن کر تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی؟“  
”انکا.....“ میں نے اُلجھتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم جانتی ہو کہ حالات نے اُس غریب لڑکی کا سکون برباد کر رکھا تھا۔“

”بڑے بے مروت اور احسان فراموش ہو گئے ہو.....“ انکا نے سنجیدگی اختیار کر لی۔  
”ایک تو میں نے تمہارے اور جین کے لئے راستہ ہموار کر دیا اور تم.....“

”چپ ہو جاؤ.....“ میں نے اُسے جملہ مکمل کرنے کی مہلت نہیں دی۔ تھلا کر بولا۔  
”سارا کے مقابلے میں جم براؤن میرے لئے زیادہ ٹیز بھی کھیر ہے۔“

”پریشان مت ہو۔“ انکا میرے سر پر آتی پاتی مار کر بیٹھ گئی۔ ”میں نے سارا کے ساتھ ساتھ تمہارے اُس رقیب کو بھی.....“

”نہیں.....“ میں چیخ اُٹھا۔ ”تم نے جو حماقت کی ہے وہ میری گردن میں پھانسی کا پھندہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔“

”کیا بات ہے دولت علی؟“ جین نے میرے قدموں میں پیدا ہونے والی لڑکھڑاہٹ محسوس کی تو بڑی معصومیت سے پوچھا۔ ”تم تھکن تو نہیں محسوس کر رہے ہو؟“

”جیل.....“ انکا نے معنی خیز انداز میں جین کی سمت دیکھتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”تمہاری اجازت ہو تو میں جین کے سر پر چلی جاؤں، اُسے تمہاری تھکن اُتارنے پر آمادہ کر دوں؟“

انکارانی کا وہ جملہ اس وقت میرے لئے مزید جھلاہٹ کا سبب بن گیا۔ میں نے اُسے گھور کر قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

”تم سچ جین کی محبت میں دیوانے ہو گئے ہو۔“ انکا نے تیزی سے کہا، پھر شوخی سے مسکرا کر بولی۔ ”میں نے لندن پہنچ کر جم اور سارا کو جذباتی طور پر اتنا قریب کر دیا ہے کہ اب جم سارا سے شادی کے منصوبے بنا رہا ہے۔“ پھر انکا نے مجھے وضاحت سے جم اور سارا کی ایک دوسرے میں دلچسپی لینے کی تفصیل سنائی تو میں نے اُسے گھور کر کہا۔  
”تم بڑی حرافہ ہوتی جا رہی ہو.....“

”تمہاری محبت کا اثر ہے.....“ اُس نے لکھنوی انداز میں جھک کر سلام کیا اور پھر آرام کرنے کے ارادے سے میرے گھنے بالوں میں پاؤں پیار کر لیٹ گئی۔ ایک لمحے بعد ہی

اُس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔  
انکار نے چین کے سلسلے میں میرے لئے جو آسانی فراہم کر دی تھی وہ بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔ لندن پہنچ کر چین کو جب جم براؤن کی بے وفائی کا اندازہ ہوا تو وہ طویل ہو گئی۔ لیکن جب میں نے روحانی علم کی آڑ لے کر اُسے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس کی اور جم کی شادی کامیاب نہ رہتی تو وہ کسی قدر مطمئن ہو گئی۔ اُس نے جم کی طرف سے مایوس ہو کر مجھے اپنے غموں کا مداوا سمجھ کر قبول کر لیا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔

جس روز میں لندن سے روانہ ہو رہا تھا اُس روز چین کا اضطراب قابل دید تھا۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا، چین میری محبوبیت کے سحر میں پوری طرح اسیر ہو چکی تھی۔ میری جدائی کے غم میں اُس کی آنکھیں بار بار بھر آتیں۔ پھر جب مسافروں کے جہاز میں بیٹھنے کی درخواست کا اعلان ہوا تو وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے رخصت کرتے وقت اُس کی غزالی آنکھیں برسنے لگیں۔ میرے اختیار میں ہوتا تو ایئر پورٹ پر ہی شائستگی اور اخلاقیات کے تمام رسمی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اُس کے حسین قرب سے اپنی پیاس بجھا لیتا، ہانہوں میں سمیٹ کر اُس کے سارے آنسو پی جاتا۔ لیکن میں نے اپنے جذبات کو بے لگام نہیں ہونے دیا۔ دل پر جبر کر کے میں نے اُس سے بہت جلد واپس آنے کا جھوٹا وعدہ کیا۔ اُس کے بھیگے ہوئے نرم گالوں کو چوم کر ہاتھ لہراتا ہوا اُس سے دُور ہو گیا۔ میں نے لندن اور جرمنی کے قیام کے دوران بھی کبھی اُس کی پاکیزگی کو داغدار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ وہاں بس وہی ایک ایسی لڑکی مجھے ملی تھی جو حسن و شباب کی تمام تر رعنائیوں سے مالا مال ہونے کے باوجود تمام آلودگیوں سے پاک تھی۔

میں نے ماہ و سال اور گزرتے موسموں کا حساب نہیں رکھا لیکن اتنا یاد ہے کہ چین کو جھوٹے خوابوں کی حسین تعبیریں دکھا کر اُس سے جدا ہوئے مجھے ایک طویل عرصہ بیت گیا تھا۔ اس عرصے میں مجھے کبھی شدت سے اُس کی یاد بھی نہیں آئی۔ حالات اور ہندوستان کے پنڈت پجاریوں کی دشمنی نے کبھی اتنی فرصت نہیں دی کہ پلٹ کر چین کی طرف دیکھتا..... اُس کے بارے میں کچھ سوچتا..... جب ایک ایک کر کے سارے سہارے ٹوٹ گئے، کلدیپ کا ساتھ بھی چھوٹ گیا تو مجھے زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں رہا۔ میں موت کے انتظار میں سیدھزدوب کی لالچی سینے سے لگائے بمبئی کی فٹ پاتھوں پر ایڑیاں رگڑتا پھر رہا

تھا، آخری سانسیں گن رہا تھا جب چین نے اچانک سامنے آ کر میرا ہاتھ تھام لیا، وہ ضد کر کے مجھے اپنے ساتھ لندن لے آئی اور اب موت کے ہاتھوں سے بچانے کی خاطر مجھ پر بے دریغ دولت لٹا رہی تھی۔ عجیب دیوانی لڑکی تھی۔ نہ جانے اس نے میری ذات سے کیا توقعات وابستہ کر رکھی تھیں.....؟

چین کے بارے میں سوچتے سوچتے یکنخت میرے خیالوں کی افق پر کلدیپ کا تصور قوس قزح کی مانند ابھرنے لگا۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں طفیلی آگئی۔ میں ہواؤں میں اڑتا میسور کی اُن پہاڑیوں پر پہنچ گیا جہاں کلدیپ نے میری خاطر سادھو پریم لال کی کنیا میں دھونی مار رکھی تھی۔ اس غریب نے ایک عمر گیان دھیان میں بتا دی۔ مجھے مضبوط کرنے کی دھن میں دن رات منزل میں بیٹھی دیوی دیوتاؤں کو راضی کرنے کی خاطر جاپ کرتی رہی۔ اُس نے اپنی جوانی کی تمام رعنائیوں، تمام تشنہ کام اُنگلوں کو میری محبت پر بھینٹ چڑھا دیا۔ اپنے ریشمی جسم پر بھسوت مل کر آسمان کی اپسرا سے مندر کی پجاریں کا رُوپ دھار لیا۔ جب بھی میری قسمت کے ستارے گردش میں آتے وہ مختلف رنگ و روپ میں سامنے آ کر میری مدد کرتی۔ کلپنا کے رُوپ میں متعدد بار وہ میرے شانہ بشانہ چلتی رہی، میری بدبختی کہ میں اُسے کلدیپ کی حیثیت سے شناخت نہ کر سکا۔ پہچان لیتا تو کبھی اپنے وجود سے علیحدہ نہ کرتا، اپنی ہانہوں میں سمیٹ لیتا، سانسوں میں جذب کر لیتا، پلکوں کی اوٹ میں چھپا لیتا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو شاید پریم لال کی آتما اس سے ناراض ہو جاتی۔ کلدیپ کی برسوں کی تپسیا غارت ہو جاتی۔ سارا گیان دھیان دھڑے کا دھارہ جاتا۔ شاید اسی لئے وہ رُوپ بدل بدل کر میری مدد کرتی رہی۔ پھر جب میرے دشمن مالا کو اغواء کر کے لے گئے اور پنڈت بدری نرائن کی پشت پناہی کے لئے کالی کا مہبان پجاری امر لال خم ٹھونک کر میدان میں کود پڑا تو کلدیپ کو مجبوراً پریم لال کی کنیا چھوڑ کر پہاڑ کی بلندیوں سے نیچے اُترنا پڑا۔ وہ اس غریب کی زندگی کا آخری معرکہ تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اگر اس نے بروقت میری مدد نہ کی تو میں دشمنوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ اُسے میری شکست منظور نہیں تھی۔ وفا کی اُس پتلی نے میری سر بلندی کی خاطر دیوی دیوتاؤں کے قدموں میں اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کرنے کا وجہ دے کر ان کی خوشنودی حاصل کر لی۔ میں آخری وقت تک اُس کے عزم سے ناواقف رہا۔



پنڈت بدری نرائن کو میں نے کتوں جیسی موت مارا تو امر لال مقابلے پر آگیا، کلدھپ نے مجھے اپنے پیچھے کر لیا، خود سینہ سپر ہو گئی۔ امر لال اُس پر اپنے جنتر منتر آزماتا رہا۔ کلدھپ کا رنگ وزو پ خوفناک ہو گیا۔ اُس کے جسم پر آبلے پڑ گئے۔ امر لال کے منتر کے بیروں نے ایک ایک کر کے اُس کے جسم کا تمام لباس نوج لیا۔ کلدھپ کے زخموں سے خون اور پیپ بہہ رہی تھی، وہ اپنی جگہ پتھر کے کسی بے جان مجسمے کی مانند جمی کھڑی رہی۔ امر لال کو شاید اُس کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہ تابڑ توڑ حملے کرتا رہا۔ جب کلدھپ نے پینترا بدلاتو امر لال کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کلدھپ نے ایک ہی عمل کیا تو اپنی اصلی صورت اختیار کر لی۔ اُس کا جسم پہلے کی طرح شاداب نظر آنے لگا۔ پھر اُس نے آسمان کی طرف دیکھ کر دوسرا طلسم پھونکا تو امر لال کے جسم سے خون جاری ہو گیا۔ وہ بھیا تک انداز میں چیختا ہوا اُس پرانے مندر کی طرف بھاگا جہاں مالا قید تھی۔ کلدھپ نے باری باری اپنی دو انگلیوں کو جنبش دی تو امر لال کی دونوں ٹانگیں اُس کے جسم سے جدا ہو گئیں۔ وہ اوندھے منہ مندر کی سیڑھیوں پر گرا۔ اُس کے جسم سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ اسی لمحے کلدھپ نے اپنا ہاتھ زمین پر مار کر تیزی سے دائیں بائیں گھمایا تو امر لال کا سرتن سے جدا ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔ کھیل ختم ہو گیا۔ میں مالا اور کلدھپ کو ساتھ لے کر سینڈ غوث کے گھر چلا گیا۔

مجھے سکون کا سانس لئے صرف دو دن گزرے تھے جب کلدھپ نے ضد کی کہ وہ آخری بار پریم لال کی کنیا میں واپس جانا چاہتی ہے۔ اُس کا اصرار حد سے بڑھا تو میں نے مفاہمت کے انداز میں کہا۔

”میں تمہیں وہاں لئے چلتا ہوں لیکن ایک شرط پر۔ تمہیں وہاں سے میرے ساتھ ہی آنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اُس نے عجیب انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں دس روز بعد تمہارے اختیار میں ہوں گی، تم جہاں چاہنا مجھے ساتھ لے جانا۔ میں انکار نہیں کروں گی۔“ میں، کلدھپ کا جواب سن کر خوشی سے سرشار ہو گیا۔ آنے والے اچھے دنوں کے خواب دیکھنے لگا۔ حسب وعدہ میں اُسے دوسرے ہی دن ساتھ لے کر میسور روانہ ہو گیا۔ پریم لال کی کنیا میں ہم دونوں نے ایک ساتھ وقت گزارا۔ ان دنوں کا ایک ایک لمحہ ایک ایک پل

میرے ذہن پر نقش ہے۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ کلدھپ جو پریم لال کے پوتر استھان پر دھونی رمانے کے بعد جسمانی طور پر میرے لئے اجنبی بن گئی تھی اب ہر وقت میری آغوش میں سر رکھے پیار و محبت کی باتیں کرتی رہتی۔ ہمارے درمیان کوئی حجاب نہیں تھا، کوئی دُوری باقی نہیں رہ گئی۔ میں کبھی ایک پل کو اُس سے دُور ہوتا تو وہ پاگلوں کی طرح دوڑ کر مجھ سے دیوانہ وار لپٹ جاتی۔ میرے کشادہ سینے میں سر چھپائے پیار و محبت کی باتیں کرتی رہتی۔

میسور سے ہماری واپسی میں صرف ایک رات کا وقفہ باقی رہ گیا تھا۔ اس رات بھی وہ میری بانہوں میں کسٹی بیٹھی تھی جب میں نے اُسے اُس کا وعدہ یاد دلایا۔

”تمہیں اپنا وچن یاد ہے نا؟ اب صرف ایک رات باقی رہ گئی ہے۔ کل میں تمہیں ہمیشہ کے لئے یہاں سے لے چلوں گا۔ پھر جانتی ہو کیا ہوگا۔؟“

”کیا ہوگا۔؟“ اُس نے مجھے حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ میں اُس کے اندر کا کرب نہ دیکھ سکا، شوخ لہجے میں بولا۔

”میں تمہیں ایک ایسے رشتے میں جکڑ لوں گا جس کے بعد مجھے تمہارے ساتھ ہر قسم کی شرارت کرنے کا قانونی اختیار ہوگا۔“

”ہاں جمیل، میں نے بھی روزِ اوّل سے یہی سوچ رکھا تھا کہ ہم سارے رسم و رواج توڑ کر ایک ایسے بندھن میں بندھ جائیں گے کہ پھر دھرتی کی کوئی قوت بھی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے گی۔ سہاگ رات منانے کی آشا کس لڑکی کے من میں نہیں کلبلاتی، اب اس کا سے آگیا ہے تو کل کیوں؟“ کلدھپ کی کنول جیسی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تیرنے لگی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”جمیل، کیا ہم آج ہی اپنی سہاگ رات نہیں منا سکتے؟ سے بڑا اکٹھور ہوتا ہے، ایک بار ہاتھ سے نکل جائے تو پلٹ کر واپس نہیں آتا۔“

”کلڈھپ۔۔۔۔۔“ میں نے تڑپ کر اُس کی پیشانی چوم لی۔ ”تمہیں مہاراج پریم لال کی قسم، سچ بتاؤ تم ہتے ہتے اچانک اس قدر اُداس کیوں ہو گئیں؟ جو کچھ تمہارے دل میں ہے کھل کر کہہ ڈالو۔۔۔۔۔“

”اب خاموش رہنے کا سے بھی بیت چکا ہے جمیل۔“ کلدھپ نے بڑے دل گرفتہ لہجے میں کہا، پھر میرا ہاتھ تھام کر بولی۔ ”میری بات دھیان سے سن لو۔ میں نے تم سے دُور رہ کر جیون کا ایک ایک پل بڑے دُکھ سے بتایا ہے۔ بڑی دیا کل رہی ہوں، تم چاہتے تھے کہ میں

مہاراج کا پوتر استھان چھوڑ کر تمہارے پاس آ جاؤں۔ میرے من کی بھی یہی ایتھا تھی۔ لیکن میں اگر مہاراج کی کنیا سے اپنا سبندھ توڑ لیتی تو سارا کھیل بگڑ جاتا، تم بہت کمزور پڑ جاتے۔ اسی کارن میں تمہیں بار بار بہلاتی رہی، تم سے دُور بیٹھی تمہارے لئے بھگوان سے پرارتھنا کرتی رہی، دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے کارن کٹھن تپسیا کرتی رہی۔ میری بات کا دوش اس کرو جیل۔ میں تم سے دُور رہ کر بھی ہمیشہ تمہارے بہت قریب رہی ہوں۔“

کلدیپ بڑے مغموم لہجے میں اپنی رُوداد سناتی رہی۔

”مجھے دوش اس تھا کہ تم بدری نرائن کے مقابلے میں کمزور نہیں پڑو گے..... انکا جو تمہارے ساتھ تھی۔ لیکن تم نے کالی کے بڑے مندر میں جا کر ہنگامہ کیا تو بڑے بڑے سادھو اور دوسرے پنڈت پجاری بھی بدری نرائن کے ساتھ ہو گئے۔ تم اس دلدل سے نکلنے کی بجائے اس میں پھنستے ہی گئے۔ میں ابھی کوئی اوپائے سوچ رہی تھی کہ کالی کا سب سے مہان سیوک امر لال بھی بدری نرائن کی سہائتا کی خاطر میدان میں آ گیا۔ میں جانتی تھی جیل۔ امر لال اور بدری نرائن کا گٹھ جوڑ تمہیں کبھی سکھ کا سانس نہ لینے دیتا۔ انہوں نے مالا کو اغواء کیا تو تم دیوانے ہو گئے۔ وہ تمہیں تمہارے منڈل سے باہر لانا چاہتے تھے۔ انکا نے تمہیں روکا لیکن تم نے ہوش کی بجائے جوش سے کام لیا۔ امر لال اسی موقع کی کھوج میں تھا۔ مجھے خبر تھی کہ وہ تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا۔ سو میں نے کالی کو وجہ دیا کہ اگر میں بدری نرائن اور امر لال کے مقابلے میں کامیاب ہو گئی تو اس کے چرنوں میں اپنا جیون بھیئت کر دوں گی..... دیوی نے میرا بلیدان سوئے کار کر لیا۔ پھر وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ تمہیں اُن دونوں دشمنوں سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل گیا اور میں.....“

”کلدیپ.....“ میں دیوانوں کی طرح چیخ اٹھا۔ ”کلدیپ۔ تم نے میری خاطر اتنی بڑی قربانی کیوں دی؟ مر جانے دیا ہوتا مجھے۔“

”ایسے شبد زبان پر نہ لاؤ جیل۔ مجھے دکھ ہو گا۔“ کلدیپ کے چہرے پر کرب نمایاں ہونے لگا۔ بڑی جسرت سے بولی۔ ”میں نے دیوی سے تمہارے کارن دس روز کی مہلت مانگ لی تھی۔ آج اس مہلت کی آخری رات ہے۔ میں بہت خوش ہوں جیل۔ میں تمہارے کام آ گئی۔ میرا انت تمہاری گود میں ہو رہا ہے۔ آج مجھے میری جیون کی تپسیا کا پھل مل رہا ہے۔ آؤ..... میرے سینے بے لگ جاؤ۔ سارے فاصلے ختم کر دو۔ مجھے اپنے

کلچے میں اس طرح چھپا لو کہ ساری دُوریاں ختم ہو جائیں، کوئی فاصلہ باقی نہ رہے۔ اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دو، میری جنم جنم کی پیاس بجھ جائے گی۔ میں سہاگنوں کی طرح مرنا چاہتی ہوں.....“

”کلدیپ..... کلدیپ.....“ میں نے اُسے پوری شدت سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”ایسی باتیں مت کرو۔ تم نے اگر میرا ساتھ چھوڑ دیا تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ خدا کے لئے ہوش میں آؤ، کہہ دو کہ تم نے ابھی جو کچھ کہا ہے وہ سب جھوٹ ہے، تم نے کوئی دُراؤنا خواب دیکھا تھا، میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ تمہیں میرے لئے زندہ رہنا ہو گا۔ ہاں، صرف میرے لئے۔“ مجھ پر جنون سا طاری ہو رہا تھا۔ میں نے اُسے اس طرح اپنی بانہوں میں بھر لیا جیسے اُس کی رُوح کو جسم سے نکلنے سے روک لوں گا۔

”تمہیں میری سوگند جیل.....“ کلدیپ نے بڑی نقاہت سے کہا۔ ”اپنے آپ کو سنبھالے رکھو، تمہیں اپنی کلدیپ کے کارن زندہ رہنا ہو گا۔ اگر تم نے جیوتپا کی یا کوئی اور پاگل پن کیا تو تمہاری کلدیپ کی آتما کو مر کر بھی چین نہیں ملے گا۔ مجھے وجہ دو تم زندہ رہو گے، تمہیں زندہ رہنا ہو گا۔ سن رہے ہو میں کیا کہہ رہی ہوں؟“

”تم جھوٹ بول رہی ہو.....“ میں نے تڑپ کر جواب دیا۔ ”تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو، میرا امتحان لے رہی ہو۔ میں جانتا ہوں تم اپنے جیل کو چھوڑ کر کبھی اس سے دُور نہیں جاؤ گی۔ تم نے ایسا کیا تو میرے دماغ کی ساری نیس پھٹ جائیں گی۔“ میں ہڈیاں بکنے لگا۔ کلدیپ میرے جسم سے لگی کپکپا رہی تھی۔ اُس پر لرزہ طاری تھا۔ اُس نے بڑی مشکلوں سے سر کو ذرا سا بلند کیا۔ میں نے اپنا چہرہ جھکا لیا۔ شاید وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس نے کچھ بھی نہیں کہا، اپنے تھر تھراتے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے پھر میری آغوش میں درخت سے ٹوٹے کسی خزاں رسیدہ پتے کی مانند گر کر ڈھیر ہو گئی۔ اُس کے شریر اور آتما کا بندھن ٹوٹ گیا..... میری دُنیا تاریک ہو گئی۔ میں نے اُس کی لاش کو ایک ہاتھ سے سمیٹ کر کاندھے پر اٹھایا۔ میں کلدیپ کو موت کے سفر پر تنہا کیسے روانہ کر سکتا تھا؟ میں نے طے کر لیا کہ کسی بلند چٹان پر چڑھ کر اپنے آپ کو بھی کلدیپ کے ساتھ نیچے گرا دوں گا، قصہ پاک ہو جائے گا۔ لیکن انکا میرے سر پر آ گئی۔ وہ میرے چہرے کے تاثرات سے میری وحشتوں، میرے جنون کا اندازہ لگا چکی تھی۔ اس سے قبل کہ میں انکا سے کچھ کہتا اُس نے

اچانک اپنے پنج اتنی شدت سے میرے سر میں چبھوئے کہ میں کلدیپ کی لاش کے ساتھ ہی لڑکھڑا کر ڈھیر ہو گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا.....؟ میں کتنے عرصے بے ہوش رہا.....؟ اور اب..... جین مجھے زندگی کی طرف واپس گھسیٹنے کی خاطر بمبئی کے فٹ پاتھ سے اٹھا کر لندن لے آئی تھی۔

کلدیپ کی جدائی کا منظر میرے ذہن میں کلبلایا تو میرا دل بھر آیا۔ میں نے دل میں سوچا۔ ”جیل احمد خاں، تم کیوں اپنے ساتھ ساتھ جین کو بھی فریب دے رہے ہو؟ جب تمہیں زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں رہا تو پھر لندن کے ہسپتال میں پڑے اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟ کیا تم کلدیپ کو بھول سکو گے؟ نرس کو فراموش کر سکو گے؟ کسی کی خاطر زندگی کی آرزو میں مبتلا ہو؟ جب تمام ہنگاموں سے منہ موڑ لیا تو پھر بسترِ استراحت پر پڑے کیا سوچ رہے ہو؟ اٹھو اور اس سے پیشتر کہ جین تمہارا ارادہ بھانپ سکے، کمرے کی کھڑکی کھول کر اپنے وجود کو آنکھ بند کر کے نیچے گرا دو۔ سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ تم بھی موت کی ابدی نیند سو جاؤ گے، دوسروں کی زندگی میں بھی کوئی ہلچل پانچ نہیں ہوگی۔ آخر کار تمہارا یہی انجام ہونا ہے۔ پھر انتظار کس بات کا.....؟ وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟ بار بار مرنے سے بہتر ہے کہ ایک ہی بار اپنا قصہ پاک کر دو۔ بے مقصد کہانی کو طول دینے سے حاصل بھی کیا ہو گا.....؟“

میرے اندر اضطراب کی لہروں نے طغیانی کی شکل اختیار کی۔ میں نے اپنے ارادے کو تکمیل دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ جین میرے لئے جو کچھ کر چکی تھی وہی بہت تھا۔ اُس کو مزید پریشان کرنا مناسب نہیں تھا۔ میری موت کے بعد وہ ضرور تڑپے گی۔ خواب چکنا چور ہو جائیں تو درد کی شدت کی لہریں ضرور سر اُبھارتی ہیں۔ لیکن وقت ہر زخم کے لئے مرہم بن جاتا ہے۔ کوئی زندگی بھر کی کسی کی خاطر آنسو نہیں بہاتا۔ جین کو بھی کچھ دنوں بعد سکون آ جائے گا۔ وہ زندہ رہنے کی خاطر مجھ سے بہتر کوئی سہارا تلاش کر لے گی۔

میں نے پلکوں کے درمیان ہلکی سی جھری کر کے دیکھا، جین ایک کھڑکی کے قریب سو گوار سی کھڑی اپنے خیالوں میں غرق تھی۔ میں نے آہستہ سے اُٹھنے کی کوشش کی تو ایک کھٹکھٹانی... ٹی ٹھوس آواز نے مجھے چونکا دیا، میں نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر آواز کی سمت

دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ہڈیوں کا وہ لڑکھڑاتا ہوا استخوانی پنجر جس کے جسم پر برائے نام گوشت تھا پر یتیم لال کے سوا کسی اور کا نہیں تھا۔ میرے بستر کے قریب بمشکل دو گز کے فاصلے پر کھڑا وہ مجھے بڑی گہری نظروں سے گھور رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اس وقت بھی وہی پہلے جیسا جلال موجود تھا۔ پر یتیم لال کو سامنے دیکھ کر مجھے جبر جھری آ گئی۔ وہ مہمانِ شگفتی کا مالک تھا۔ نہ ہوتا تو کلدیپ اُس کے استھان پر اپنی جوانی نہ دیتا۔ انکا بھی اُسے دیکھ کر دم سادھ لیتی تھی.....!

مجھے یاد آیا، پر یتیم لال میسور کی پہاڑی پر عین اُس وقت میرے سامنے آ گیا تھا جب میں مالارانی کے ساتھ چھپر چھاڑ میں مصروف تھا۔ وہ مجھے میری گستاخی کی کوئی عبرتناک سزا دینا چاہتا تھا جب کلدیپ درمیان میں آ گئی..... وہ جھولی پھیلائے پر یتیم لال سے میری زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ پر یتیم لال یقیناً اتنی مہمانِ شگفتیوں کا مالک تھا کہ انکا بھی اُسے دیکھ کر سہم گئی تھی۔ انکا کے کہنے پر میں نے بھی پر یتیم لال کے پیر پکڑ لئے۔ انکا بھی میری خاطر منت سماجت کرنے لگی، کلدیپ ہاتھ باندھے التجا کرتی رہی۔ پر یتیم لال نے مجھے سخت سزا دینے کے بعد معاف کر دیا، پھر وہ رفتہ رفتہ مجھ پر مہربان ہونے لگا۔ مرنے سے پیشتر اس مہمانِ پجاری نے مالارانی کی ذمہ داری مجھے سونپ دی۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے مجھے کھانے کے لئے کھریا مٹی دی جس پر اُس نے کئی جنتز منتر پڑھ کر پھونکے تھے۔ اُس نے کہا تھا..... ”اس مٹی کو کھانے کے بعد تمہارے شریر میں ایک نئی شگفتی پیدا ہوگی۔ تم اتنے بلوان ہو جاؤ گے کہ گندی بلائیں تمہارے قریب پھٹکنے کی ہمت نہیں کر سکیں گی، چھوٹے موٹے پنڈت پجاری تمہیں دُور ہی سے دیکھ کر کتر ا جائیں گے۔ تم اُبلے اور سچے من سے میرا نام لے کر چوچا ہو گے وہ اوش پورا ہوگا پر تو ایک بات گرہ سے باندھ لو۔ مالارانی کو کبھی کوئی دکھ نہ دینا اور پاپ کے کاموں میں میری دان کی ہوئی شگفتی کو کام میں نہ لانا۔“

پر یتیم لال کی موت میری اور کلدیپ کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے اُس کا کریا کریم کرنا پڑا تھا۔ اُس کی چتا کی راکھ کو بھی میں نے ہی دریا برد کیا تھا..... اس وقت وہی پر یتیم لال میرے سامنے کھڑا مجھے بڑی گہری نظروں سے گھور رہا تھا۔

”مہاراج..... تم.....؟“ میری آواز لڑکھڑانے لگی۔

”تن کی آنکھیں بند کر لے.....“ پر یتیم لال نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”من کے دوار کھول

کر دیکھ۔“

”میں..... میں کوئی سنا تو نہیں دیکھ رہا؟“

”اب تیرے سپنے دیکھنے کی عمر بیت گئی مورکھ، جیون کی ڈور کو پوری مضبوطی سے تھام لے۔“

”میری کلدیپ چلی گئی مہاراج.....“ میں نے تڑپ کر کہا۔ ”اُس کے بنا جینے کو من نہیں کرتا۔“

”کلدیپ.....“ پریم لال ایک لمحہ کو آزرده ہو گیا۔ ”کلدیپ مر کر امر ہو گئی بالک۔ تیرے لئے اس کا پیار سچا تھا۔ اُس نے تجھے دیوتا جان کر تن من دھن سے تیرے کارن اپنا سارا جیون دان کر دیا۔ اب اسے بھول جا، یاد کرے گا تو اُس ابھانگن کی آتما کو بھی چین نہیں آئے گا۔ تجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔“ پریم لال کے لہجے میں پھر کرخنگی آ گئی۔ ”جو کام کلدیپ ادھورے چھوڑ گئی وہ تجھے پورے کرنے ہیں۔“

”میں اُس کے بنا ادھورا رہ گیا ہوں.....“

میرا جواب سن کر پریم لال نے اپنے ہونٹ سختی سے بھیج لئے۔ اُس کی آنکھوں میں سرخی اُتر آئی۔ شاید میری بات سے اُسے دکھ پہنچا تھا، میں جانتا تھا کلدیپ کا نام میری زبان سے بار بار سن کر اُس کے من میں بہت سارے وچار کلبلائے گئے ہوں گے۔ اس مہان پجاری نے کچھ سوچ کر ہی اپنا پوتر استھان کلدیپ کے حوالے کیا تھا۔ اُس کی دُور بین نظروں نے کلدیپ کے دل میں جھانک کر دیکھ لیا ہو گا کہ اس کے من میں دیوی دیوتاؤں اور دھرم کا سودا سا گیا تھا۔ میرے لئے کلدیپ کا پریم سچا تھا اس میں کوئی کھوٹ نہیں تھا اور پیار سچا ہو تو انسان آسمان کی بلندیوں کو بھی چھو سکتا ہے۔

کلدیپ کبھی بھی کہ امر لال کا لی سب سے مہان سیوک ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اُس کے دل میں میری چاہت نہ ہوتی تو پریم لال کا ہاتھ تھام لینے کے بعد وہ امر لال سے زیادہ مہان شکتیوں کی مالک بن سکتی تھی۔ میرے پیار نے اُسے دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ وہ آنکھ بند کر کے صرف دیوی دیوتاؤں کو من میں بسا لیتی تو سب سے بلند مقام کو چھو لیتی۔ پریم لال نے ایک موقع پر کہا تھا کہ کلدیپ کو پاربتی نے پسند کر لیا ہے، وشنو مہاراج نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ سنسار میں بڑا نام پیدا کر سکتی تھی، ہندوستان

کے بڑے بڑے پنڈت پجاری اُس کی کنیا کو سلام کرنا بھی اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتے لیکن کلدیپ نے اپنے من مندر میں بھگوان کی جگہ میری مورتی سجائی تھی۔

”اب اُس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دے مورکھ۔“ پریم لال مجھے گھورتا ہوا بولا۔ ”میں نے کہا نا کہ اُس کی آتما بے چین ہو جائے گی۔“

”میرا ایک کام کر دو مہاراج.....“ میں مجسم التجا بن گیا۔ ”مجھ سے میرا حافظہ چھین لو۔ کچھ ایسا پڑھ کر پھونک دو کہ میں اپنا ماضی، اپنا حال، اپنا مستقبل سب کچھ بھول جاؤں۔ میں جانتا ہوں تم مہان قوتوں کے مالک ہو، تمہارے حکم پر انکا بھی اس وقت میرا خون پینے پر مجبور ہو گئی تھی جب میں مالارانی کی طرف سے من میں برا خیال لایا تھا۔“ میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”مجھے نراش مت کرنا مہاراج، تمہاری شکتی اپرم پار ہے۔ مجھ سے میری یادداشت چھین لو۔ بڑی کرپا ہوگی۔“

”اور اس سندری کو کس کے سہارے چھوڑے گا جو تیرے پیار کو من میں بسائے سپنے دیکھ رہی ہے؟“ پریم لال کا اشارہ جین کی طرف تھا۔ میں نے بے اختیار جین کی طرف دیکھا تو میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ کسی بے جان مجسمے کی طرح اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑی تھی۔ اُس کی پلکوں نے جھپکنا بند کر دیا تھا۔ پتھر کے بت کی مانند ایک ہی جگہ ایستادہ ہو کر رہ گئی تھی۔

”اے..... اے کیا ہو گیا مہاراج؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

”میں نے اس کے من کو کچھ دیر کے لئے شانت کر دیا ہے۔“ پریم لال نے لا پرواہی سے کہا پھر لکھنت سنجیدہ ہو گیا۔ ”میری بات دھیان سے سن۔ تیرے بھائیہ میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ اوش پورا ہو گا۔ یہ اور بات ہے کہ تو اپنے من کو مار لے۔ خود کو چٹان بنا لے، پتھر کی اتنی ٹھوس اور سخت مورتی بن جا جس پر آندھی، برکھا اور سرو و گرم کا بس نہیں چلتا۔ پرنتو میری نظریں تیرے بھوش کو ٹوٹ چکی ہیں۔ تو دھرم کے کارن کوئی بلیدان نہیں دے سکتا۔ جل کے اوپر ہی اوپر تیرا رہے گا۔ جل کی تہہ میں غوطہ نہیں لگا سکے گا لیکن جو کام آدھے رہ گئے ہیں وہ تجھے پورے کرنے ہوں گے۔ کلدیپ کی بھی یہی آشنا تھی، میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ لیکن اس کام کے لئے بھی تجھے بڑے پاپ پڑیلئے ہوں گے۔ بڑا کشت اٹھانا پڑے گا۔“

”میں نہیں سمجھ سکا مہاراج کہ تم کن کاموں کی طرف اشارہ کر رہے ہو؟“ میں نے



وضاحت چاہی۔

”سے کا انتظار کرو۔“ اُس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”دھیرج سے کام لے، آہستہ آہستہ سب کچھ تیری سمجھ میں آجائے گا۔“

”تم شاید مجھے ٹال رہے ہو؟“ میری اضطرابی کیفیت دوچند ہو گئی۔ ”مجھے بتاؤ مہاراج، کلدھپ مجھ سے کیا چاہتی تھی؟ تم کوئی آگیا دو۔ میں تمہارے کسی حکم سے سرتابی نہیں کروں گا۔ تم گواہ ہو، میں نے اُس وقت بھی گھٹنے نہیں ٹیکے جب آدھے ہندوستان کے پنڈت پجاری اور بڑے بڑے گیانی دھیانی گھٹ جوڑ کر کے زمین سے میرے قدم اکھاڑنے کی خاطر زور لگا رہے تھے۔ تم تو میرے محسن ہو۔ میں تمہارا کوئی حکم ماننے سے انکار نہیں کروں گا۔ مجھے بتاؤ مہاراج، مجھے کون سے ادھورے کام پورے کرنے ہوں گے۔“

”ہندوستان کے کچھ پنڈت پجاری پھر سر جوڑ کر تیرے بارے میں سوچ بچار کر رہے ہیں۔“ پریتم لال نے سپاٹ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”پنڈت بدری نرائن کے چیلوں نے ابھی تک اُس کی چٹا کی راگھویش کی لٹیا میں بہت سنبھال کر رکھی ہے۔ اُسے گنگا میں نہیں بہایا۔ انہوں نے سوگند اٹھائی ہے کہ تیرا کیا کرم کرنے کے بعد ہی وہ اس پوتر راگھویش کی کسی بلند چوٹی پر بکھیریں گے۔ کالی کے مہمان پجاری امر لال کا ایک ہی بالک تھا..... چندرا۔ اُس نے کالی کے پوتر چرنوں میں بیٹھ کر اپنے خون سے ماتھے پر تلک لگا کر قسم کھائی ہے کہ وہ جب تک تجھے ٹھٹ نہیں کر دے گا کسی ناری کے شریر کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ جب سے امر لال ترلوک سدھارا ہے وہ وندھیا چل کی پہاڑی کی ایک گھما میں دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ ابھی وہ کیول اٹھارہ اُنیس سال کا گبر و جوان ہے۔ اُسے اپنا گیان دھیان پورا کرنے میں سے لگے گا۔ امر لال جیسی شکتی پر اپت کرنا بالکوں کا کھیل نہیں۔ لیکن سانپ کا بچہ سنبھالیا ہی کہلاتا ہے۔“

”مہاراج.....“ میں نے زہر خند سے کہا۔ ”پہلے زنگس گئی، پھر مالارانی گئی۔ ایک ایک کر کے جانے کتنے سہارے چھوٹ گئے، کتنے رشتے ناتوں نے منہ موڑ لیا۔ جب نئے سرے سے دنیا بسانے کی آرزو تو میری کلدھپ کو کالی کا دیا ہوا دھن چاٹ گیا۔ میں تو دنیا سے منہ موڑ چکا ہوں، میری جھولی خالی ہو چکی ہے۔ اب میرے دشمن مجھ سے کیا انتقام لیں گے؟“

”نراش مت ہو بالک، میں جو تیرے ساتھ ہوں.....“ پریتم لال نے آگے بڑھ کر اپنا استخوانی ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک برقی رو میرے جسم میں دوڑ گئی ہو۔ میرے جسم کی کھوئی ہوئی ساری توانائیاں پلک جھپکتے میں بحال ہو گئیں۔ میری رگوں میں دوڑتے خون میں ایک نیا جوش، نیا ولولہ پیدا ہو گیا۔ میری عمر جیسے کئی سال گھٹ گئی ہو۔ میں پھر سے خود کو جوان محسوس کرنے لگا۔

”مہاراج.....“ میری آنکھیں چھلک اٹھیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں بڑی عقیدت سے بولا۔ ”تمہارا ہاتھ سر پر رہا، تمہارا آشیر باد حاصل رہا تو میں اپنے دشمنوں کو کبھی سکون کی نیند نہیں لینے دوں گا۔“

”ابھی وہ سے آنے میں دیر ہے بالک.....“ پریتم لال نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ابھی موج میلہ کر، زیادہ سوچ و چارمت کر۔ کیول ایک بات گرہ سے باندھ لے۔“

”تم حکم دو مہاراج.....“

”کبھی لگن منڈپ سجانے کا وچار من میں نہ لانا ورنہ کلدھپ کی آتما.....“ پریتم لال کا استخوانی بنجر کھڑکھڑانے لگا۔ اُس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ میرے اوپر اُس کی مہمان شکتی کا ایک اور بھید کھلا۔ میں پھٹی پھٹی نظروں سے سب کچھ دیکھتا رہا، پریتم لال کی بوڑھی آنکھوں سے ڈھلکنے والے آنسو زمین پر گرنے سے پہلے ہی غائب ہو جاتے تھے۔ وہ مہمان شکتی کا مالک تھا۔ انکا بھی اُسے دیکھ کر سہم جاتی تھی لیکن اس وقت پریتم لال، کلدھپ کی یاد میں بے حد مضطرب نظر آ رہا تھا۔

”میں وچن دیتا ہوں مہاراج.....“ میں نے اُسے یقین دلایا۔ ”کلدھپ کی جگہ میرے دل میں ہمیشہ خالی رہے گی، اُس کی مانگ کا سیندر میری زندگی کی امانت ہے۔ میں اس امانت کو ہمیشہ سنبھال کر رکھوں گا۔“

”مجھے دشو اس تھا کہ تو یہی کہے گا۔“ پریتم لال نے سرد آہ بھر کر کہا۔ پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آج وہ سندری نظر نہیں آرہی؟“

”تم کس کی بات کر رہے ہو.....؟“

”وہی بالشت بھر کی فتنہ، آفت کی پڑیا جو تیرے سر پر بیٹھی اتراتی رہتی تھی۔“

”اوہ، تم شاید انکارانی کی بات کر رہے ہو۔“ میں نے دل گرفتہ لہجے میں جواب دیا۔

ساری توانائی یلکھت بجال ہو گئی ہو، میں اس وقت بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا جیسے میرے سر سے دنیا جہان کا بوجھ اتر گیا ہو۔ وہ یقیناً پریتم لال کی ساحرانہ نظروں کا کرشمہ تھا جس نے میرے جسم میں زندگی کی نئی لہر پھونک دی تھی۔

”مہاراج.....“ میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”کیا میں ہندوستان واپس چلا جاؤں؟“

”ابھی سے نہیں آیا..... جب آئے گا تو وہ بلاشت بھر کی سندری تجھے سب بتا دے گی۔“

میں اُسے ساتھ ہی لایا ہوں، تیرے بنا وہ بڑی اُداس اُداس رہنے لگی تھی۔“ پریتم لال مسکراتے مسکراتے یلکھت سنجیدہ ہو گیا، اُس نے نظر گھما کر سید مجذوب کی لالھی کو بہت غور سے دیکھا، بدری زائن اور امر لال کی موت کے بعد بھی میں نے اس لالھی کو ایک لمحے کو بھی خود سے جدا نہیں کیا تھا، پریتم لال اسی لالھی کو نکلتی باندھے پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا، اُس کی پلکوں نے جھپکنا چھوڑ دیا تھا۔ اُس کی دُور رس نگاہوں میں ایک عجیب سا تجسس نظر آ رہا تھا۔ کبھی اُس کی کشادہ پیشانی پر آڑی ترچھی لکیروں کے جال پھیل جاتے، کبھی وہ آنکھیں بند کر کے اپنے خیالوں میں مستغرق ہو جاتا، کبھی بے چینی کے عالم میں ہونٹ چبانے لگتا۔ میں اُس کی ایک ایک کیفیت کا جائزہ لے رہا تھا۔ پریتم لال تا دیر مختلف زاویوں سے سید مجذوب کی لالھی کو پرکھتا رہا، پھر مجھے دیکھ کر بولا۔

”تو قسمت کا دھنی ہے بالک جو یہ لالھی تیرے ہاتھ آ گئی۔ پرنتو تو پوری طرح نہیں جانتا کہ اس پوتر لالھی کے اندر شکتی کے کیسے کیسے انمول چنکار چھپے ہوئے ہیں۔ میں جیوت ہوتا تو اسے حاصل کرنے کے کارن اپنے ہزاروں جیون بھینٹ چڑھا دیتا۔“

”مہاراج.....“ میرا تجسس بڑھنے لگا۔ ”تم کیا جانتے ہو اس لالھی کے بارے میں؟“

”میں وہ سب کچھ جانتا ہوں جسے کھوجنے کے لئے منش اپنا پورا جیون بلیدان کر سکتا ہے۔ پرنتو میں تجھے کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”تم مجھے نراش کر رہے ہو مہاراج.....“ میں نے بے چینی کا اظہار کیا۔ ”مجھے بتاؤ کہ اس لالھی میں.....“

”نہیں بالک، نہیں.....“ پریتم لال نے ہاتھ اٹھا کر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”مجھے مجبور نہ کر، میں اس پوتر لالھی کے بارے میں اپنی زبان نہیں کھول سکتا..... کیول اتنا سمجھ لے کہ اگر میں اپنی تمام خلکیاں دان کر کے بھی اس لالھی کو حاصل کر سکتا تو یہ سودا میرے لئے بہت

”مکھ پیپ کے بعد میں جیون کے سارے بندھن توڑ دینا چاہتا تھا، میں نے انکا کو بھی رخصت کر دیا۔ وہ ہوتی ہے تو نئے نئے ہنگامے جنم لیتے رہتے ہیں۔ اب میں ہنگاموں سے اکتا گیا ہوں۔“

”ہنگامے تو جیون کی پہچان ہیں مورکھ۔“ پریتم لال نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اُسے واپس بلا لے۔ وہ پاس ہوگی تو تیرا من بہلاتی رہے گی، میں جانتا ہوں وہ تیرے بنا بڑی اُداس اُداس رہتی ہے۔“

”تم نہیں جانتے مہاراج، وہ جس کی غلام بن جاتی ہے اُسی کے گن گاتی ہے۔ اُس کی آنکھیں بدل جاتی ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اُسی نے مجھے ایک ہاتھ سے محروم کر دیا تھا۔ وہ آتی جاتی چھاؤں ہے، کبھی کسی ایک کی ہو کر نہیں رہ سکتی۔“

”پرنتو یہ کیوں بھول رہا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے تیرے سر پر آئی تھی۔ تو نے اُس کے کارن کسی منڈل میں بیٹھ کر کوئی جنت منتر بھی نہیں کیا۔“ پریتم لال نے مجھے یاد دلایا۔ پھر میرے کٹے ہوئے ہاتھ کی سمت دیکھ کر کہا۔ ”تو اس ہاتھ کا علاج کرالے۔“

”تم کہتے ہو تو کرا لوں گا۔ لیکن مصنوعی ہاتھ صرف میرے شریک شو بھا بڑھا سکتا ہے۔ میرے کسی کام نہیں آ سکے گا۔“

”زیادہ دُور کی نہ سوچا کر۔“ پریتم لال کی کشادہ پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ ”گرو کی آگیا کا پالن کرنے کی عادت ڈال لے، اپنی شکتی پر مان کرنا چھوڑ دے۔ کیول اتنا ہی اُونچا اڑا کر جہاں تک تیری پہنچ ہے۔“

”مہاراج، تمہاری شکتی اپرم پار ہے، تم.....“

”مکھ پیپ کی سوگند اٹھا کر مجھے وچن دے کہ پھر کبھی تو اپنے پالی من میں جیوتہیا کرنے کا دھیان نہیں آنے دے گا۔“ پریتم لال نے مجھے تیز نظروں سے دیکھا، اُس کی نگاہوں کی تپش مجھے اپنے جسم میں تحلیل ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

”میں..... میں وچن دیتا ہوں.....“ میں نے سنبھل کر جواب دیا۔ پریتم لال کی آمد بے سبب نہیں تھی۔ میں اس مہان بیماری کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”اب بستر چھوڑ دے، بہت دن سستا لیا۔“ پریتم لال نے ایک لمحے بعد سرسراتے لہجے میں کہا تو میں غیر اختیاری طور پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جسم کی

میں نے اس موم کی حسین ساحرہ کو یقین دلانے کی خاطر اُس کے خوبصورت وجود کو پوری شدت سے بھیچا تو اُس کی چیخ نکل گئی۔ ایک نرس چیخ سن کر تیزی سے کمرے میں آئی تو جین اپنا بے ترتیب لباس سمیٹتی جلدی سے مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔ نرس مجھے تندرست و توانا دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد اُس نے جو جذباتی منظر دیکھا شاید اس میں نرس کے لئے کوئی انوکھی بات نہیں تھی، وہ جین کی بجائے مجھے تعجب خیز نظروں سے گھور رہی تھی جب جین کی خوشی میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

”مسٹر، ڈاکٹر برنارڈ کو بلاؤ، جلدی، میں چاہتی ہوں کہ ڈاکٹر بھی آکر اس بات کی تصدیق کر دے کہ دولت علی حیرت انگیز طور پر رو بصحت ہو گیا ہے، میں اسے آج ہی ہسپتال سے گھر لے جانا چاہتی ہوں۔“

نرس اُن کے قدموں واپس چلی گئی۔ اُس کے چہرے پر بھی خوشگوار حیرت نظر آرہی تھی۔

”جین.....“ میں نے نرس کے جانے کے بعد کہا۔ ”جہاں تم نے مجھ پر اتنے احسانات کئے ہیں، وہاں ایک احسان اور کرو۔“

”اس انداز میں بات مت کرو دولت علی.....“ اُس نے بڑی گرجوٹی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم نے کہا تھا کہ تمہیں اپنی زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں رہا، میں نے مت کی تھی کہ اپنی زندگی کو میری جھولی میں ڈال دو۔ میں احسان مند ہوں کہ تم نے میری درخواست رد نہیں کی۔ مجھے غیر مت سمجھو۔ میں تمہاری داسی ہوں، تمہاری ملازمہ ہوں، تمہارے قدموں کی دھول ہوں۔ احسان کی بات مت کرو، مجھے حکم دو، میں تمہارے ہر حکم کو اپنے لئے ایک اعزاز سمجھوں گی..... وکٹوریہ کر اس سے بھی بڑا اعزاز۔“

”میں اپنے جسم کی اس بدنمائی کو دور کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اپنے کئے ہوئے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ کیا مشکل ہے؟“ جین نے بڑی سادگی سے کہا۔ ”پلاسٹک سرجری نے تو اب بہت ترقی کر لی ہے۔ میں ابھی ڈاکٹر برنارڈ سے بات کروں گی۔“

کچھ دیر بعد ڈاکٹر برنارڈ نرس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو مجھے ہشاش بشاش دیکھ کر اپنی حیرت پر قابو نہ پاسکا۔ اُس نے میرا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد جین کو میری تندرستی کا یقین دلادیا۔

ستا ہوتا، اسے بہت سنبھال کر رکھنا، اسے حکومت دینا..... اب مجھے آگیا دے۔“

”میرے لئے کیا حکم ہے.....؟“ میں نے بڑی عقیدت سے پوچھا۔

”ابھی موج میلہ کر۔ ساتھ ساتھ ڈنڈ بیٹھک بھی کرتا رہ، سادھو جگد یو، کپالا اور نندانے تجھے جو شکلیاں دان کی تھیں اُسے بھول مت جانا، شاکیہ منی کو من میں بسائے رکھ..... آج کی محنت کل تیرے کام آئے گی۔“ پریم لال نے آگے بڑھ کر میرے سر پر دوبارہ ہاتھ پھیرا، پھر وہ یلکھت نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں بستر پر بیٹھا پریم لال کے آنے کی وجہ سوچ رہا تھا کہ جین دیوانہ وار دوڑتی ہوئی قریب آئی، بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ شاید پریم لال کے جاتے ہی وہ سحر بھی ٹوٹ گیا تھا جس نے جین کو وقتی طور پر پتھر کے مجسمے میں تبدیل کر دیا تھا۔

”اوہ، دولت علی..... مجھے یقین تھا، مقدس مریم کی پاکیزگی کی قسم، میں جانتی تھی، میرا دل گواہی دیتا تھا کہ تم کسی دن اچانک اپنی کھوئی ہوئی توانائی حاصل کر کے سب کو حیران کر دو گے۔“ وہ میرے چہرے کو اپنی نازک ہتھیلیوں پر رکھ کر بڑی مسرت سے چیخی۔ ”تم بالکل ویسے ہی چاق و چوبند اور تندرست و توانا نظر آ رہے ہو جیسا میں نے تمہیں پہلی بار امرائے لندن کے کلب میں دیکھا تھا۔ حیرت انگیز..... تم حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک ہو، مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ سچ بتاؤ دولت علی کہ اس وقت تم کیا محسوس کر رہے ہو.....؟“

”میں.....“ میں نے جین کے نازک وجود کو پوری طرح اپنے اندر سموتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”میں اس وقت خود کو لندن کا سب سے خوش قسمت آدمی تصور کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ لندن کی خوبصورت ترین حسینہ، میری جین، میری محبوبہ میری آغوش میں ہے۔“

”تم بالکل ٹھیک ہو گئے ہو..... اوہ میرے خدا۔“ جین خوشی سے دیوانی ہوئی جارہی تھی۔ اُس کی غزالی آنکھیں کسی ہرنی کی مانند بار بار میرے وجود پر پھسل رہی تھیں۔ وہ بڑے جذباتی انداز میں کہہ رہی تھی۔ ”میں تمہاری روحانی قوتوں اور حیرت انگیز صلاحیتوں کی پہلے ہی سے معترف ہوں۔ لیکن آج..... آج مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ بسببی کی فٹ پاتھ پر جب میں نے تمہیں دیکھا تھا تو میرا کلیجہ پھٹنے لگا تھا، میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر تمہیں کچھ ہوا تو میں بھی جان دے دوں گی۔ مگر آج..... آج تم نے پھر مجھے حیران کر دیا، مجھے یقین دلا دو دولت علی۔ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی؟“

”اب آپ اگر چاہیں تو مسٹر دولت علی کو گھر لے جاسکتی ہیں۔“

”گھر جانے سے پیشتر میں چاہوں گا کہ میرے کئے ہوئے ہاتھ کی جگہ مصنوعی ہاتھ بھی لگا دیا جائے۔“ میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر برنارڈ نے مسکرا کر کہا۔ ”میں آج ہی کسی سرجن سے بات کر کے اپکمٹ لے لیتا ہوں۔“

ڈاکٹر برنارڈ اور نرس کے جانے کے بعد میں بستر سے اتر کر نیچے آ گیا۔ جین کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ اُس کا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اُسے سینے سے لگا لیا، وہ کسمسا نہ لگی۔ حیا کی سرخی سے اُس کا پنڈا سرخ ہو گیا۔ میں جانتا تھا وہ لندن کی عام لڑکیوں سے مختلف تھی لیکن اس وقت مجھے اپنے دل پر اختیار نہیں رہا، میں نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں سے اُس کے ہونٹوں پر محبت کی مہر ثبت کی تو وہ ٹپ کر میری بانہوں سے نکل گئی، کسی سہمی ہوئی ہرنی کی مانند اُس کی سانسیں بہکنے لگیں۔ وہ پاکباز ہونے کے باوجود گوشت پوشت کی ایک عورت ہی تھی۔ میں نے اُس کے اندر چھپی ہوئی دوشیزگی کو آواز دی تو اُس کے جذبات میں یقیناً ہلچل مچی ہوگی۔ میرے لمس کی گرمی سے اُس کی اُمٹگوں میں بھی طغیانی ضرور آئی ہوگی۔ میرے قریب ہی کھڑی وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ان نظروں میں پیار تھا، اپنائیت تھی اور ایک سہمی سہمی سی درخواست بھی تھی۔ میں نے اُسے چھیڑنے کی خاطر اُس کی کلائی تھام کر دوبارہ اپنی سمت گھسیٹا۔ وہ شرماتی لجاتی میرے قریب آ گئی۔ اُس نے اپنا سر میرے سینے پر ٹکا دیا۔ میں نے سیدھے ہاتھ سے اُس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اُس نے میری آنکھوں میں تشنہ ارماتوں کی طغیانی دیکھی تو شرما کر پلکیں جھٹک لیں۔ مجھ پر بے خودی طاری ہونے لگی۔ میں نے اُس کے یا قوتی ہونٹوں پر پھر ہونٹ رکھ دیئے۔ میرے لبوں کی چاشنی اُس کے وجود میں گھلنے لگی۔ اُس کے اندر کا آتش فشاں متحرک ہونے لگا، وہ کمزور پڑنے لگی۔ میں چاہتا تو اُس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا لیتا۔ لیکن میں نے اُسے چھوڑ دیا، وہ حیرت سے مجھے نکتے لگی۔ اُس کی خمار آلود نگاہوں میں مستی کے ساغر چھلک رہے تھے۔

”جین.....“ میں نے اُسے مدھم سروں میں آواز دی۔

”کہو دولت علی۔“ اُس کی آواز مندر کی نفرتی گھنٹیوں کی طرح میرے کانوں میں گونجی۔

”تمہاری جین تمہارے پاس ہی ہے۔“

”میں نے ایک بار تم سے کہا تھا کہ میری خواہش کی تکمیل میں تمہاری آمادگی بھی شرط ہو گی..... یاد ہے تمہیں؟“

”ہاں.....“ اُس نے نظریں جھکا کر کہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اُس کے سینے میں طوفان کی شدتیں اُمٹڑ ہی تھیں، اُس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اُس کا پورا وجود مہک رہا تھا۔

”تم نے اُس وقت مجھ سے سوچنے کی مہلت طلب کی تھی۔“ میں نے آگے بڑھ کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ ریت کے ٹیلے پر بڑی مشکل سے قدم جمائے کھڑی تھی۔

”ہاں دولت علی.....“ اُس نے حیا بار پلکیں اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں تارے بھللا رہے تھے، خواب مچل رہے تھے، آرزوؤں اور اُمٹگوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اُس نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے یاد ہے۔“

”میں نے درخواست کی تھی کہ میرے بارے میں مفاہمت کے انداز میں کوئی فیصلہ کرنا۔“ میں نے جان بوجھ کر بات کو طول دینے کی کوشش کی۔ ”میں آج تمہارا فیصلہ سننے کا منتظر ہوں۔“

”مم..... میں نے..... فیصلہ کر لیا تھا۔“ اُس نے مجھے بڑی گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنائیت کا انداز اختیار کیا۔ اُس کی مخمور نگاہوں میں محبت کے جام چھلک اُٹھے۔ اُس کے پورے وجود میں جیسے نشہ سا اتر گیا ہو۔ ”اگر میں نے تمہارے حق میں فیصلہ نہ کیا ہوتا تو تمہاری تلاش کی خاطر ہندوستان کبھی نہ جاتی۔“

”جین.....“ میں نے اُس کے ہاتھوں کو محبت سے سہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”تم نے میرے متعلق فیصلہ کرنے میں کوئی جلد بازی تو نہیں کی؟“

”کیا تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں.....؟“ اُس کی دراز پلکوں پر شبنمی قطروں کی نمی آ گئی۔ اُس کا انداز الہانہ تھا۔

”یقین نہ ہوتا تو میں تمہارے ساتھ لندن بھی نہ آتا۔“

”پھر.....؟“ اُس نے لڑکھڑاتی آواز میں سوال کیا۔ ”تم میری زبان سے کیا سنتا چاہتے ہو؟“



”یہی کہ تم نے میرے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے، سوچ سمجھ کر کیا ہے۔“ میں نے اُس کے وجود میں سر اُبھارتے طوفانوں کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ کل تمہیں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی پڑے۔“

جین نے کوئی جواب نہیں دیا، اُس کی نگاہوں میں جذبات کی طغیانی اُبھری پھر وہ بجلی کی طرح لپک کر میرے سینے سے چمٹ گئی۔ میں نے اپنی ہانہوں کا حلقہ ذرا تنگ کیا تو وہ موم کی طرح میرے جسم کی حدت سے پکھلنے لگی۔ بڑی دیر تک ہم دل کی دھڑکنوں کی زبانی ایک دوسرے سے سوال جواب کرتے رہے۔ وہ پوری طرح میری محبت کے سحر میں اسیر ہو چکی تھی۔ اُس کی خود سپردگی کا انداز مجھے دیوانہ کر رہا تھا۔ میرے ذہن سے ماضی کی تمام تلخیاں محو ہو گئیں۔ بڑے طویل عرصے کے بعد میرے اندر کا سویا ہوا انسان بیدار ہونے کے لئے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے اندر ضم ہو جانے کے لئے مضطرب تھے۔ جین کی دوشیزگی کے سمندر کی پھری ہوئی طوفانی موجیں مجھے بے حال کر رہی تھیں جب ایک مانوس آواز میرے کانوں میں گونجی۔

”ایسی بھی کیا جلدی ہے جیل صاحب۔ کوئی دوسری نرس یا ڈاکٹر آگیا تو تمہاری جین کو پھر شرمندگی سے دوچار ہونا پڑے گا۔“

میں اس آواز کو سن کر چونکا۔ اسی لمحے مجھے اپنے سر پر انکا کی موجودگی کا احساس ہوا، مجھے یاد آیا، پریتم لال نے کہا تھا کہ وہ انکا کو اپنے ساتھ لایا ہے۔ میں نے عالم تصور میں سر پر نگاہ ڈالی، انکا رانی بچوں کے بل کھڑی دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے مستی کے عالم میں تھرک رہی تھی، دیوانہ وار ناچ رہی تھی، پریتم لال کی شہ پا کر میرے سر پر دوبارہ تسلط جمانے کی خوشی میں اپنی وارفتگی کا اظہار کر رہی تھی۔ انکا کی مسرتوں کے اظہار کا وہ منظر دیدنی تھا.....!!



ہسپتال سے رخصت ہونے کے بعد میں دو ماہ تک جین کے اُس فارم ہاؤس تک محدود رہا جو اُسے سیکرٹ سروس میں اعلیٰ کارکردگی اور بے مثال خدمات کے عوض حکومت کی طرف سے بطور انعام دیا گیا تھا۔ یہ علاقہ شہر کے ہنگاموں سے دُور اور پُر سکون تھا۔ تین کمروں پر مشتمل اس فارم ہاؤس میں میرے لئے دنیا کی تمام آسائشیں موجود تھیں۔ شاید جین نے مجھے وہاں لانے سے پیشتر خاصی فضول خرچی سے کام لیا تھا۔ درود یوار پر نیارنگ وروغن اور قیمتی آرائشی ساز و سامان دیکھ کر ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ جین نے میرے خاطر خواہ استقبال کے اہتمام میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ فارم ہاؤس کے اندر رہائشی کمروں کے عقبی سمت ایک سوئمنگ پول بھی تھا۔ مکان کے مشرقی گوشے والے کمرے میں جین کی بوڑھی ماں رہتی تھی، وہ مفلوج ہونے کے باوجود وہیل چیئر پر بیٹھی باغبانی میں مصروف رہتی۔ جین نے ماں کی دیکھ بھال کے لئے ایک خوبصورت ملازمہ رکھ چھوڑی تھی جو ہر طرہ اُس کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ گھر کے دوسرے کام کاج میں جین کا ہاتھ بھی بٹاتی تھی وہ صبح ہی صبح آجاتی اور سورج غروب ہونے کے ایک گھنٹے بعد واپس چلی جاتی۔ اُس کا نام ماریا تھا۔ جین نے مجھے ماریا کے بارے میں بتایا تھا کہ تین سال قبل اس نے مورگن نام ایک نوجوان سے شادی کی تھی لیکن شادی کے صرف سات ماہ بعد وہ ماریا کو چھوڑ کر ملک سے کہیں باہر چلا گیا تھا۔ کم از کم ماریا کا یہی خیال تھا کہ وہ ملک میں نہیں ہے، اگر ہوتا اُس سے رابطہ ضرور قائم کرتا۔ ماریا ابھی تک اُس کی محبت میں گرفتار تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ مورگن اُس سے سچا پیار کرتا تھا، وہ ماریا سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔ لیکن مورگن کی پراسر گمشدگی کے سلسلے میں ماریا کوئی جواز پیش کرنے سے بھی قاصر تھی۔

فارم ہاؤس اور زمینوں کی دیکھ بھال کا کام جیکب نامی ایک ادھیڑ عمر کا شخص سرانجام دیتا تھا۔ اُس کا قیام فارم ہاؤس کی حد بندی کے دوسرے کونے میں ہٹ نما ایک کمرے اور مختص

کے دوران میں نے خود اپنی دیوانگی اور وحشتوں سے زنگ آلود کر لیا تھا۔ انکا قدم قدم پر مجھے روکتی ٹوکتی رہی، میں نے اُس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ کلد بیپ، سادھو جگد یو، کمپالا، نندا کے علاوہ سید مجذوب بھی مجھے اشاروں کنایوں میں وقت اور حالات کی مصلحتوں کے پیش نظر قدم اٹھانے کی تلقین کرتا رہا۔ لیکن میرے ستارے گردش میں تھے یا پھر میں نے مہان پنڈت پجاریوں کو اپنے مقابلے میں حقیر سمجھ رکھا تھا جو اپنی من مانی کرتا رہا۔ بدری نرائن اور کالی کے مہان سیوک امر لال سے مقابلے کے وقت بھی انکا نے کئی بار مجھے حصار توڑ کر باہر نکلنے سے روکا، میں نے اُس کی بات نہیں مانی۔ اس وقت بھی جب پنڈت بدری نرائن کالی کے بڑے مندر میں چھپا بیٹھا تھا میں انکا، کا مشورہ رد کر کے اپنی طاقت کے زعم میں دندناتا ہوا مندر میں گھس گیا۔ میں نے کئی چھوٹے موٹے پجاریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، کئی پجاریں اور حسین دیوایاں میری ہوس کا شکار ہو گئیں، اپنے بدترین دشمن پنڈت بدری نرائن کو تھس نہس کر ڈالنے کے خیال نے مجھے درندہ بنا دیا تھا، میرے راستے میں جو بھی آیا میں اُسے ٹھوکر مار کر بھولہاں کرتا رہا۔ میں نے خود کو ناقابلِ تسخیر سمجھ لیا تھا، یہی وجہ تھی جو بدری نرائن کی حمایت میں بہت سارے پنڈت پجاریوں میں گٹھ جوڑ ہو گیا۔ کالی کا مہان سیوک امر لال بھی خم ٹھونک کر میرے مقابلے پر آ گیا۔ میری دیوانگی نے مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا، میں کالی کے مندر میں نہ گیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ دوسرے پنڈت پجاری میری اور بدری نرائن کی جنگ میں پاؤں نہ پھنساتے، امر لال جیسا مہان شکتی کا مالک بھی میدان میں نہ آتا، میری کلد بیپ کو بھی پریتم لال کا استھان چھوڑ کر میسور کی پہاڑیوں سے نیچے نہ آنا پڑتا۔ میری ہی خاطر کلد بیپ نے کالی کو اپنا جیون بھینٹ دینے کا وچن دیا تھا۔ وقت نے میرا سب کچھ چھین لیا، میں بالکل تنہا رہ گیا۔ جین اگر مجھے بھنبی کی فٹ پاتھ سے اٹھا کر لندن نہ لاتی تو میں کب کامر کھپ گیا ہوتا۔ کوئی رونے دھونے والا بھی نہ ہوتا۔ کمیٹی کے کارندے میرے وجود کو سمیٹ کر کسی اندھے گڑھے میں دبا دیتے، کہانی ختم ہو جاتی.....!

ہسپتال میں میرے ضمیر نے ملامت کی تو میں نے خودکشی کا مصمم ارادہ کر لیا لیکن اس کی تکمیل سے پہلے پریتم لال میرے سامنے آ گیا۔ اُس نے مجھے باخبر کیا کہ بدری نرائن کے چیلوں نے اُس کی چتا کی راکھ کو دیا برد نہیں کیا۔ وہ مجھ سے انتقام لینے کی گھات میں سر

سائبان والے مکان میں تھا جہاں وہ تنہا رہتا تھا۔ جیکب کی عمر چالیس اور بیالیس کے درمیان تھی۔ بظاہر وہ نہایت مخفی، جفاکش، دیانتدار، نڈر اور بے خوف نظر آتا تھا۔ ماریا اور جیکب دونوں ہی بہت جلد مجھ سے مانوس ہو گئے لیکن جین کی بوڑھی اور مفلوج ماں مجھ سے کھنچی کھنچی رہتی۔ میں نے اُس کے رُوحے طرزِ عمل پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ ہندوستان پر حکومت کرنے والے سفید چمڑی والے آقاؤں کے دلوں میں برتری کا جو احساس تھا وہ نسل در نسل اُن کے خون میں سرایت ہوتا چلا آ رہا تھا۔ شاید جین کی ماں نے بھی مجھے غلاموں کے دیس کا ایک ادنیٰ نمائندہ سمجھ کر منہ لگانا پسند نہیں کیا۔ میں نے جین سے اس موضوع پر کبھی گفتگو بھی نہیں کی۔

جین نے میری صحت یابی کا جشن بڑے پیمانے پر منانے کا ارادہ کر رکھا تھا لیکن میں نے اُسے منع کر دیا۔ پریتم لال نے دوبارہ سامنے آ کر مجھے اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کو بحال کرنے کی ترغیب دی تھی۔ میں صبح سویرے ہی اٹھ کر فارم ہاؤس کے ایک ویران گوشے میں چلا جاتا، اپنے وجود کے اندر دفن مخفی قوتوں کو زندہ کرنے کی خاطر تطہیرِ قلب اور مراقبہ کی مشقوں میں تا دیر مصروف رہتا۔ میں نے کمپالا کی رفاقت میں بہت کچھ سیکھا تھا، شاکیہ منی کے عظیم بھکشونندا نے مرنے سے پیشتر مجھے اپنے خون سے غسل کرنے پر مجبور کیا، بعد میں کمپالا نے انکشاف کیا کہ بدھ مت کے اس عظیم ترین درویش نے مرتے مرتے مجھے اپنی بے شمار قوتوں سے سرفراز کیا تھا۔ نندا کہا کرتا تھا کہ تپسیا اور مراقبہ ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنے کی ورزش ہیں۔ اُس نے مجھے تصور اور تخیل کو یکسو کرنے کا عمل بتایا تھا۔ میں اُس کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق ارتکازِ ذہن کی مشقیں اور ورزشیں کرتا رہا۔ میں ماضی میں ان ریاضتوں کا حیرت انگیز کرشمہ دیکھ چکا تھا۔ انکا کی پراسرار قوتیں بھی کبھی میرے مقابلے میں سر اٹھانے کی جرأت نہیں کرتی تھیں۔

کمپالا اور عظیم نندا کے علاوہ مجھے کالی کے مہان پجاری پریتم لال کی حمایت بھی حاصل تھی۔ برکاتی شاہ کا وظیفہ مکمل کرنے کے بعد میں نے انکا کو اپنے دشمن تر بنی داس سے چھین لیا تھا۔ سادھو جگد یو نے بھی پریتم لال کے حوالے سے مجھے کئی بار نوازا تھا، میرے پاس سید مجذوب کی لاشی تھی جسے دیکھ کر پریتم لال جیسے مہان پجاری کی آنکھیں بھی حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ میرے اندر قوتوں کا ایک خزانہ دفن تھا جسے پنڈت پجاریوں سے جنگ

جوڑے بیٹھے ہیں۔ امر لال جہنم رسید ہو چکا تھا لیکن اُس کا اکھوتا لڑکا چندرا، وندھیا چل کی پہاڑیوں میں کسی گھٹا میں بیٹھا مہان شکتی پر اپت کرنے کی خاطر جاپ کر رہا تھا۔ میری ایک تنہا ذات کی خاطر کئی آدم خور بھیڑیے موجود تھے، مجھے پھاڑ کھانے کی خاطر اپنے آپ کو پوری طرح منظم کر رہے تھے، منصوبے بنا رہے تھے اور میں بے خبر تھا۔ اچھا ہوتا اگر میں بے خبری میں ان کے ہاتھوں زندگی کی قید سے آزاد ہو گیا ہوتا، سارے جھگڑے ختم ہو جاتے، سارے قصے ختم جاتے۔ ایک میری ذات کے نہ ہونے سے دنیا کے ہنگاموں میں کیا کمی آ جاتی.....؟ موت اور زندگی کے کھیل تو روزمرہ کا معمول ہیں۔ ایک آتا ہے، ایک جاتا ہے۔ جو دنیا سے منہ موڑ جاتا ہے اُس کے لواحقین کچھ روز روتے دھوتے ہیں پھر دنیا کے تقاضوں کی سمت واپس لوٹ آتے ہیں۔ کوئی کسی کے ساتھ اُس کی قبر میں چھلانگ نہیں لگاتا۔ سستی کی صدیوں پرانی رسم بھی دم توڑ چکی ہے، وقت کا پہرہ کبھی نہیں رکتا، اس کی حرکت جاری رہتی ہے۔ ازل سے یہی کچھ ہوتا چلا آرہا ہے، ابد تک یہی سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔

مجھے کلدھپ کے چلے جانے کے بعد دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی، میں زمین کا بوجھ بن کر زندہ تھا۔ جین نے اس بوجھ کو نہ جانے کیوں گدڑی کا لعل سمجھ کر سمیٹ لیا تھا۔ پھر پریم لال نے سامنے آ کر مندل ہوتے ہوئے زخموں کو کرید دیا۔ اُس مہان پجاری نے کہا تھا کہ جو کام کلدھپ ادھورے چھوڑ گئی تھی وہ مجھے پورے کرنے ہوں گے۔ اُس نے مجھے اپنی حمایت کا یقین دلایا تھا۔ کلدھپ میری زندگی، میری رُوح، میری حیات کا سب سے انمول سرمایہ تھی۔ میں نے اُس کے ادھورے کاموں کو پورا کرنے کی قسم کھالی، اُس کی آتما کو شانت کرنے کی خاطر میں اپنی زندگی بھی قربان کر سکتا تھا۔ پریم لال کی زبان سے کلدھپ کا نام سن کر ماضی کی بہت ساری بھولی بسری کہانیوں کے ڈھیر میں پھر پھل پیدا ہو گئی۔ ایک لمحے کو میرے دل میں یہ خیال ابھرا کہ اگر پریم لال اپنی مہان شکلیوں کے ذریعے ماڈی شکل اختیار کر کے سامنے آ سکتا ہے تو کیا عجب کہ کسی روز میری کلدھپ بھی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ہنسی مسکراتی اچانک سامنے آ کر مجھے ششدر کر دے۔ کلدھپ کو پریم لال نے اپنی جانیں مقرر کیا تھا، وہ میسور کی پہاڑیوں پر اُس کی کنیا میں بیٹھی دن رات جاپ منتر میں محو رہتی۔ اُس نے سارے جتن میرے پیار کی خاطر کئے، اپنی جوانی کی اُمنگوں کو پس پشت ڈال دیا۔ اُس نے کالی کا آشیر باد حاصل کر کے مجھے میرے

دو ماہ اسی طرح ریاضتیں اور مشق کرتے بیت گئے۔ میں جتنی دیر مراقبے میں ڈوبا رہتا، انکا میرے سر سے دُور رہتی، جب میں سانس لینے کی خاطر کسی درخت سے ٹیک لگا کر سستانے بیٹھتا وہ میرے سر پر آ جاتی، مجھے ٹکر ٹکر گھورتی رہتی۔ وہ بھی لازوال قوتوں کی مالک تھی۔ وہ نہ ہوتی تو شاید مجھے یہ شہرت بھی نصیب نہ ہوتی۔ اُسی نے میری زندگی کی ساکت سطح پر اپنے وجود کی ایک کنکری اُچھال کر ان گنت لہریں پیدا کر دی تھیں پھر لہر لہر ایک داستان بنتی چلی گئی۔ جب تک وہ میرے قبضے میں رہتی، مجھ سے شواہیاں کرتی رہتی، اپنی شرارتوں سے میرا دل لہاتی رہتی، مجھے کسی بات کی فکر نہ ہوتی میرے ایک اشارے پر وہ میری دل بستگی کے سارے سامان چٹکی بجاتے مہیا کر دیتی۔ ایسا نہ ہوتا تو ہندوستان کے بڑے بڑے پنڈت پجاری اُس کے دیوانے نہ ہوتے، اُسے حاصل کرنے کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر نہ لگاتے۔ انکا کی قوتیں اُس کے مختصر سے وجود کے مقابلے میں ہزاروں، لاکھوں گنا زیادہ تھیں لیکن وہ بھی پریم لال اور کلدھپ سے نظریں ملاتے کتراتے تھے۔ سید مجذوب کو دیکھ کر اُس کی سٹی گم ہو جاتی تھی اس کے باوجود وہ لامحدود قوتوں کی مالک تھی۔ میں کلدھپ کی جدائی کے بعد زندگی سے اس قدر مایوس ہو گیا کہ جین کے ساتھ لندن آتے وقت انکا کو پیچھے چھوڑ آیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ سر پر ہوگی تو آئے دن نت نئے ہنگامے سر اٹھاتے رہیں گے۔ آج میں اعتراف کرتا ہوں کہ انکا سے بچھڑتے وقت مجھے ایسا ہی لگا تھا جیسے زندگی کا آخری ہمدرد و رفیق بھی مجھ سے جدا ہو گیا ہو۔ پریم لال نے اُسے واپس لا کر میری اکائی کی مایوسیوں کو دُور کر دیا تھا۔ شاید اس مہان پجاری نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ انکا کا اور میرا ساتھ لازم و ملزوم ہے، انکا کی قوت کسی آڑے وقت میں میرے کام آ سکتی تھی، وہ آنے والے خطروں کی بوسہ گھنٹے میں ملکہ رکھتی تھی۔ اُس کے مشورے بہت اہم اور دُور رس ہوتے تھے۔ اگر میں اُس کے مشوروں پر عمل کرتا رہتا تو شاید کلدھپ کو پہاڑیوں سے

نیچے اترنے کی زحمت نہ گوارا کرنا پڑتی۔ بہت کچھ ممکن تھا، بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہوتا وہی ہے جو قسمت میں ایک بار رقم کر دیا جاتا ہے۔ اس لکھے سے مفر انسان کی قوت سے باہر ہے۔

اس روز بھی میں ارتکاز اور مراقبہ کی مشقتوں سے تھک کر سستانے کے لئے بیٹھا تھا کہ انکا میرے سر پر آگئی۔ میں کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ انکا کی بے چینی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اُس دن میں نے پوچھ لیا۔

”کیا بات ہے انکارانی؟ تم اس قدر بھی بھٹی اور اُداس کیوں رہتی ہو؟ کیا لندن کی آب و ہوا اس بار تمہیں پسند نہیں آئی؟ کبھی تو تم سرخ سرخ گالوں اور نیم برہنہ عورتوں کے گداز جسموں کو دیکھ کر پھولی نہیں سماتی تھیں۔“

”میں آج کل صرف تمہارے بارے میں سوچتی رہتی ہوں.....“

”میرے بارے میں.....؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

”ہاں جمیل..... میں محسوس کر رہی ہوں کہ تمہیں میرے دوبارہ آنے سے خوشی نہیں ہوئی۔“ اُس نے سوگوار انداز میں کہا۔ ”تم کیا جانو کہ تمہارے بمبئی سے لندن آ جانے کے بعد میرے دل پر کیا گزری؟ میں کبھی ایک لمحہ، ایک پل بھی تمہارے خیال سے غافل نہیں رہی۔ تمہاری جدائی کا تصور مجھے خون کے آنسوڑلاتا رہا۔ میں چاہتی تو تمہارے پاس آ سکتی تھی لیکن میں نے براہ راست اس کی کوشش نہیں کی۔ میں تمہاری مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی، تمہارے بغیر زندگی بھی نہیں گزار سکتی تھی۔“

”آج تو بڑے سر میں بول رہی ہو۔“ میں نے اُسے چھیڑا۔ ”گفتگو کا یہ انداز کہاں سے سیکھ لیا؟“

”تمہاری بے مروتی اور طوطہ چشی سے۔“ انکا ٹھٹھک کر بولی۔ ”تم بڑے کھنور دل ہوتے جا رہے ہو۔“

”حالات نے بنا دیا ہے انکارانی۔“ میں نے سرد آہ بھری..... ”انسان ماں کے پیٹ سے اُداس یا غمگین پیدا نہیں ہوتا۔ تم نے جمیل احمد خان کی زندگی کا وہ روپ بھی دیکھا ہے جب حسین اور مہکتے چہروں کے درمیان شب و روز گزرا کرتے تھے۔ میں نے کبھی آنے والے کل کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی۔ میرے پاس شاید اتنا وقت

ہی نہیں تھا کہ کچھ سوچتا۔ تم میری زندگی کے شب و روز کے ایک ایک لمحے، ایک ایک ساعت کی گواہ ہو لیکن نتیجہ کیا برآمد ہوا.....؟ کبھی تم مجھ سے رُوٹھ گئیں تو مجھے اپنے ایک ہاتھ سے محروم ہونا پڑا۔ تم دوبارہ مہربان ہوئیں تو میرے لئے عیش و عشرت کے خزانوں کے منہ کھل گئے۔ کبھی نرس حالات کا شکار ہو جاتی تو میں مضطرب ہو جاتا۔ مالا میری جھولی میں ڈال دی گئی تو جینے کا بہانہ مل گیا، تزئین زندگی میں شامل ہوئی تو بہار آگئی، کلد پیپ اور میرے لئے وہ سگی اولاد سے کم نہیں تھی، اب بھی مجھے اُس کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ کیسے کیسے ساتھی میرے ہم رکاب رہے۔ پھر وقت نے کروٹی تو ایک ایک کر کے سب نے منہ موڑ لیا۔ کلد پیپ چلی گئی تو میری زندگی میں گھپ اندھیرا ہو گیا، شاید میں بمبئی کی فٹ پاتھوں پر ایڑیاں رگڑتے رگڑتے اپنے انجام کو پہنچ جاتا کہ نہ جانے جین کہاں سے آگئی؟“ میں نے ملول آواز میں کہا۔ ”آگے کیا لکھا ہے، کون جانے؟“

”اتنی مایوسی کی باتیں مت کرو جمیل۔“ انکا نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔“

”تم.....“ میں زہر خند سے بولا۔ ”کب تک ساتھ دوگی انکارانی؟ کوئی پنڈت پجاری تمہارے حصول کا چپ مکمل کر کے تمہارا آقا بن گیا تو تم پھر نکاح میں پھیر لو گی۔“

”وہ میری مجبوری ہو گی جمیل۔ لیکن تم نے اب جتنی تو تیں حاصل کر لی ہیں وہی تمہارے لئے بہت ہیں۔“ انکا نے اپنی مجبوری کا احساس دلایا، پھر موضوع بدل کر بولی۔

”میں اس وقت تم سے ایک اہم بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”کیا پھر تمہارے لئے غذا فراہم کرنے کی خاطر مجھے کسی صحت مند دوشیزہ کے خون سے ہاتھ رنگنے ہوں گے؟“

”یہ معاہدہ تو ایک عرصہ ہوا ٹوٹ چکا۔“ انکا نے تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”کیوں دل جلانے کی بات کرتے ہو.....؟“

”اور کیا بات ہو سکتی ہے.....؟“ میں نے دریافت کیا۔

”میں تمہیں جیکب کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔“

”کیا ہوا جیکب کو.....؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”وہ جو کچھ اوپر سے نظر آتا ہے، اندر سے اس کی ضد واقع ہوا ہے۔“ انکا نے سنجیدگی



ہوا ہے تو کیا وہ محض جین کی مفلوج ماں کے کہنے پر میرے لئے کوئی خطرہ مول لینے پر آمادہ ہو جائے گا؟“

”تمہاری سوچ بھی غلط نہیں ہے۔“ انکا نے کسمسا کر جواب دیا پھر تھوڑے وقفے سے بولی۔ ”سنو جیل۔ میں جب تک تمہارے پاس ہوں جب تک جیسے سینکڑوں مجرم مل کر بھی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میں تمہارے علم میں لائے بغیر بھی تمہارے کسی دشمن کو ٹھکانے لگانے کا حق رکھتی ہوں۔ لیکن تمہاری جین کے اس فارم ہاؤس میں کوئی ہلچل پیدا ہو، یہ بھی مجھے گوارا نہیں۔“

”انکارانی.....“ میں نے انکا کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”کیا میرا یہ اندازہ غلط ہے کہ تم اس وقت کوئی اہم بات مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہی ہو.....؟“

”جیل صاحب.....“ انکا نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”لندن میں عورتوں کی عمر سے نہیں بلکہ اُن کے دل کی دھڑکنوں سے بڑھاپے یا جوانی کا اندازہ لگایا جاتا ہے، تم میرا اشارہ سمجھ رہے ہو گے۔“

”تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“ میں نے انکا کو ٹوٹتی نظروں سے گھورا۔

”جین کی ماں کے ہاتھ میں جیکب کی کچھ ایسی کمزوری ہے کہ وہ اُس کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا۔“ انکا نے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا۔ ”تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ مفلوج بڑھیا اپنی بیٹی کے مستقبل کے ساتھ ساتھ تمہیں اپنے راستے کا کاٹنا بھی سمجھنے پر مجبور ہے۔“ انکا نے بات جاری رکھی۔ ”جب تک تم فارم ہاؤس میں نہیں آئے تھے اس مفلوج عورت کے لئے تمام راستے کھلے ہوئے تھے۔ جن دنوں جین ٹائٹ ڈیوٹی پر گھر سے باہر رہتی تھی اُن دنوں اس کی ماں، جیکب کو اپنے تحفظ کے بہانے سے فارم ہاؤس میں سلا لیا کرتی تھی۔ پھر اُن کے درمیان فاصلے ختم ہو گئے۔ مکار اور تجربہ کار بڑھیا نے ایسا جال بنا کہ جیکب اس میں بری طرح پھنس گیا۔ اب وہ اُس کے اشارے پر عمل کرنے پر مجبور ہے۔“

میں نے انکا کی بات سن کر حالات کے دُور رس نتائج پر نگاہ ڈالی۔ مجھے یقین تھا کہ انکا مجھ سے دروغ گوئی نہیں کر سکتی۔ میرا ذاتی مشاہدہ بھی یہی تھا کہ مغربی تہذیب کی پروردہ عورتوں کی عمریں موت سے پہلے نہیں ڈھلتیں، وہ زندگی کا ایک لمحہ انجوائے (ENJOY) کرنے کے فن سے بخوبی واقف ہوتی ہیں۔ ان کے نزدیک رشتہ جانتوں یا شرم و حیا کے

اختیار کر لی۔ ”میں تمہیں اُس سے محتاط رہنے کا مشورہ دوں گی۔“

”اس مشورے کی کوئی معقول وجہ بھی ضرور ہوگی.....؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”جیکب اُس کا اصلی نام نہیں ہے۔“ انکا میرے سر پر چھل قدمی کرتے ہوئے بولی۔

”وہ امریکہ کا ایک مفروضہ قیدی مائیکل ہے جو اپنی خوبصورت اور نو جوان بیوی کرسٹی کو بدکاری کے شے میں گلا گھونٹ کر مارنے کے بعد فرار ہو کر یہاں آ گیا ہے، پندرہ سولہ سال سے پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ امریکہ میں اس کا قیام مٹی گن کے دُور دراز علاقے کی ایک مضامنی بستی میں تھا جہاں زیادہ آبادی نہیں تھی۔ مائیکل اُس علاقے میں بھی اپنے والدین سے بھاگ کر آیا تھا اس لئے پولیس کے پاس کوئی باقاعدہ ریکارڈ نہیں ہے۔“

”مائیکل یا جیکب سے مجھے کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے.....؟“ میں نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔

”خطرہ مائیکل یا جیکب نہیں، تمہاری جین کی مفلوج ماں ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ میں حیرت سے چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ ”جین کی ماں سے میری کیا دشمنی ہے.....؟“

”جین اُس کے لئے سونے کی چڑیا سے کم نہیں ہے۔“ انکا نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ نسل پرست بڑھیا، ایشیائی لوگوں سے شدید نفرت کرتی ہے۔ جین کے دل میں تمہاری محبت کی شدتوں کو محسوس کر کے اُس چالاک عورت نے اب تک زبان نہیں کھولی، لیکن وہ تمہیں ایک آنکھ بھی پسند نہیں کرتی۔“

”جیکب درمیان میں کہاں سے آ گیا؟“ میں نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

”وہ جین کی ماں کا نمک خوار ہے۔“ انکا نے کہا۔ ”جین نے جیکب کو ملازم رکھنے پر اعتراض کیا تھا۔ سیکرٹ سروس سے وابستہ ہونے کے سبب وہ کسی ایسے آدمی کو ملازمت دینے کے خلاف تھی جس کے ماضی کے بارے میں کسی بھی حوالے سے وہ کچھ نہ جانتی ہو لیکن اُس کی ماں نے اپنی بزرگی کا حق اختیار کرتے ہوئے جیکب کو ملازمت دے دی۔“

”تمہاری اطلاع میں مجھے ایک جھول نظر آ رہا ہے۔“ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ جین کی ماں میرے وجود کو جین کی زندگی میں برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے لیکن جیکب اگر ایک مفروضہ قاتل ہے اور پولیس کی نظروں سے بھاگا

الفاظ صرف کتابوں کی حد تک محدود ہوتے ہیں۔ عملی زندگی میں انہیں ہر قسم کی شخصی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ ان پر کسی بندش کا اطلاق نہیں ہوتا، انہیں اپنے کردار کو بنانے یا بگاڑنے کا پورا پورا حق حاصل ہوتا ہے، کسی باز پرس کا خوف نہیں ہوتا۔

”کس سوچ میں گم ہو گئے جمیل؟“ انکا نے میری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے دبی زبان میں پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا جین کو حالات کا اندازہ نہیں ہے.....؟“ میں نے یونہی سرسری طور پر پوچھ لیا۔ میں نے جین کو بہت قریب سے برتا تھا۔ وہ سیکرٹ سروس سے وابستہ ہونے کے باوجود بہت معصوم اور سیدھی سادھی لڑکی تھی۔ لیکن کردار کے معاملے میں بڑی ٹھوس واقع ہوئی تھی۔ اگر جیکب کے ماضی یا حال کی بھنک بھی اُسے ملی ہوتی تو شاید وہ اُسے ایک پل کے لئے بھی برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہوتی۔ انکا نے بھی وہی جواب دیا جو میرے دل کی آرزو تھی۔

”جمیل۔ تم اگر اجازت دو تو میں ایسے حالات پیدا کر سکتی ہوں کہ جیکب از خود کسی قریبی پولیس اسٹیشن جا کر اپنی بیوی کو قتل کرنے کا الزام قبول کر لے، اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاش بھی محفوظ رہے گی۔“

”نہیں..... فی الحال تم میرے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گی۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا، پھر گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے بولا۔ ”پریتم لال نے مجھے ہسپتال میں بتایا تھا کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ لایا ہے، تمہاری اُس کی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟“

”میں تمہارے پاس آنے کی خاطر بے چین تھی جب وہ مہمان پجاری ایک دن خود بخود میرے سامنے آ گیا۔ ان دنوں میں ایک حسینہ کو اپنے جال میں پھانسنے کی تاک میں تھی۔ تم جانتے ہو کہ انسانی خون میری غذا ہے لیکن میں کسی کو قتل کرنے کی طاقت سے محروم ہوں۔ چنانچہ میں اُس لڑکی کو ورغلا کر اُس علاقے میں لے گئی جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ وہیں میں نے دو بے ہنگم ہوئے شرابیوں کو لڑکی کے سلسلے میں اس طرح لڑوایا کہ اُن میں سے ایک نے لڑکی کو مارنے کی ٹھان لی۔ لیکن پریتم لال کے آجانے سے بات نہیں بنا سکی۔“ انکا نے کہا۔ ”میں اُس مہمان پجاری کو دیکھ کر فرار کے لئے راستہ تلاش کر رہی تھی کہ اُس نے مجھے اپنے سر پر آنے کا حکم دیا، میں ڈری سہمی اُس کے سر پر چلی گئی۔ اُس کی

چاہوں میں ایسا سحر تھا کہ دونوں شرابی، لڑکی کو چھوڑ کر نو دو گیارہ ہو گئے۔ لڑکی بھی جان بچا کر بھاگ نکلی۔ مجھے خدشہ تھا کہ پریتم لال مجھے آڑے ہاتھوں لے گا لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ میں تین چار روز اُس کے سر پر رہی، اس عرصے میں اُس مہمان پجاری نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ پھر اُس نے لندن پہنچ کر ہی یہ راز افشا کیا کہ وہ مجھے تمہارے سر پر چھوڑنے کی خاطر لایا ہے۔ اُس کی بات سن کر مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ لیکن یہ سب کچھ خواب نہیں تھا، خواب ہوتا تو میں اس وقت تمہارے پاس نہ ہوتی۔“

آخری جملہ انکا نے اٹھلا کر بڑی شوخی سے ادا کیا۔

”کیا پریتم لال مرنے کے بعد بھی اپنے اصلی روپ میں آنے کی طاقت رکھتا ہے؟“

”دیوی اور دیوتا مہربان ہوں تو سب کچھ ممکن ہے۔“

”کیا کلدیپ بھی مادی شکل میں میرے سامنے آ سکتی ہے؟“ میں نے بے چینی سے دریافت کیا۔

”مجھے افسوس ہے جمیل۔ میں اس سلسلے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اُس کی آتما آج بھی تمہارے آس پاس بھٹک رہی ہوگی، وہ تمہاری گنجی پجاری تھی..... تم سے دور نہیں رہ سکتی۔“

”لیکن میں اُس کے لئے دیوتا نہ بن سکا۔“ میرے اندر کا کرب زبان پر آ گیا۔ ”اپنے مسائل میں الجھا بھٹکتا رہا، مگر حاصل کیا ہوا؟ کچھ بھی نہیں۔“

”جین کے مستقبل کے بارے میں تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ انکا نے موضوع بدل دیا۔

”اگر تم پریتم لال کی منظور نظر بن کر یہاں تک آئی ہو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ جین میری آخری منزل نہیں ہے۔“

”نہیں، پریتم لال نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

”پھر..... تم جین کے بارے میں میری زبان سے کیا سننا چاہتی ہو.....؟“

”میری بات کا غلط مطلب نہ نکالو جمیل۔“ انکا میرے سر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی، سنجیدگی سے بولی۔ ”مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ تمہارے دشمن امر لال کا اکلوتا بیٹا چندرا اس وقت دندھیا چل کی پہاڑیوں پر بیٹھا تمہارے خلاف اپنے آپ کو مضبوط بنانے کی کوششوں میں مگن ہے، اُس کے من میں امر لال کے انتقام کی جواا بھڑک رہی ہے، میں یہ بھی جانتی

ہو کہ رام دیال کی ماں نے سب سے پہلے مجھے تمہارے حصول کی خاطر سبز باغ دکھا کر اُسکے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اُس کی پیشکش مسترد کر دی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ تم چھلا وہ بن کر میرے وجود سے چٹ گئیں۔ پھر میری زندگی کے نئے نئے باب رقم ہونے لگے۔ تم نے اپنی طاقت کے ایسے ایسے ہوشربا کرشمے دکھائے کہ میں بہکتا چلا گیا، تمہارے ہاتھوں کھلونا بن گیا، باگ ڈور تو ہمیشہ تمہارے ہاتھوں میں رہی ہے انکارانی، میں تو صرف کٹھ پتلی تھا، تم اپنی شوخی اور طراری سے میرا دل لہواتی رہیں، میری کہانی طویل ہوتی رہی، افسانوں میں جوڑ لگتے رہے۔ قصور وار تم تھیں لیکن میں کسی مفروضہ قیدی کی طرح شہروں شہروں بھاگتا رہا۔ تمہیں انسانی خون کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کے لئے تم نے میرا انتخاب کر لیا۔ میں تمہارے زیر اثر تھا، تمہارے اشارے پر خون فراہم کرتا رہا۔ اس کے عوض تم مجھے عیش کراتی رہیں۔ جب کوئی پنڈت پجاری اپنا چاکمیل کر کے تمہیں اپنا محکوم بنا لیتا تھا تو تمہارے عتاب اور ستم کا نشانہ بھی مجھے بننا پڑتا۔“ انکار نے میری دکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا، میں اُسے اپنے آئینے میں اُس کی شکل دکھاتا رہا اور وہ میرے سر پر بالوں کے درمیان سبھی سمٹی بیٹھی سب کچھ سنتی رہی۔ بڑی نخل نخل سی نظر آ رہی تھی۔ میں بولتے بولتے تھک کر خاموش ہوا تو اُس نے بڑی معصومیت سے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”مجھ سے..... اپنی انکارانی سے بہت خفا ہو.....؟“

”فی الحال مجھ سے دور ہو جاؤ.....“ میں نے لمبی سانس لے کر تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔ ”دل کا غبار چھٹ جائے تو واپس آ جانا، تمہیں پریتم لال اپنے ساتھ لایا ہے اس لئے میں تم سے کنارہ کشی اختیار نہیں کروں گا۔“

”ایسا مت کہو جمیل.....“ انکار تپ اٹھی۔ ”جو کچھ تم نے کہا میں نے خاموشی سے سن لیا۔ میں نے تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے از خود تمہارا انتخاب کیا تھا، میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں نے تمہیں بہت دکھ پہنچائے ہیں، تم نے زندگی میں پہلا خون میرے ہی اُسکے پر کیا، میری ہی وجہ سے تمہیں اپنے ایک ہاتھ سے دست بردار ہونا پڑا، اور بھگمائی صدے برداشت کرنے پڑے۔ لیکن تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ میں آڑے دھڑوں میں تمہارے کام بھی آتی رہی ہوں۔ زندگی کے سفر میں ہمارا ساتھ بڑا طویل رہا ہے۔ ہم حالات کے پیش نظر لازم و ملزوم بن گئے۔ پھر مجھے تم سے پیار ہو گیا۔ میری بات کا

ہوں کہ لندن میں تمہارا قیام عارضی ہوگا، ایسی صورت میں تم اور جین دو جان ایک قالب نہیں بن سکتے۔“

”مجھے میرے ارادوں سے کون روک سکتا ہے؟“ میں نے سرد لہجے میں دریافت کیا۔ چندرا کا نام سن کر میرے اندر سوائے ہوئے آتش فشاں میں ہلچل پیدا ہونے لگی۔

”میں جانتی ہوں، تمہیں تمہارے ارادوں سے کوئی نہیں روک سکتا۔“ انکار نے رُوٹے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”طاقت کا نشہ سارے نشوں سے تیز ہوتا ہے، تم نے ان دو مہینوں میں اپنی کھوئی ہوئی پراسرار قوتوں کو دوبارہ حاصل کر لیا ہے۔ مجھے تجربہ ہے جمیل، تمہارے اوپر جب انتقام کا خون سوار ہوتا ہے تو تم میرے مشوروں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہو۔ جوش میں ہوش کا خیال نہ رہے تو دشمن اپنی چال چل جاتا ہے۔ پانسہ ایک بار پلٹ جائے تو خواب کی ساری حسین تعبیریں بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں اور.....“

”بس کرو انکارانی..... بس کرو۔“ میں الجھ گیا۔ ”خاموش ہو جاؤ۔ میرا دل پہلے ہی ٹکا ہے۔ میں اور تیرا دفتر برداشت نہیں کر سکتا۔“ میں نے بے رُخی سے جھڑکا تو انکار سہم کر خاموش ہو گئی۔

”جو وقت گزر گیا میں اسے بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں، تم جلدی پر نمک چھڑک رہی ہو۔“ میں نے سہمی ہوئی انکار کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں لندن اپنی مرضی سے نہیں آیا، کلدیپ کے بعد مجھے زندگی سے کوئی پیار نہیں رہ گیا تھا، میں نے میسور کی پہاڑی پر اسی وقت اپنی کلدیپ کے ساتھ لمبے سفر پر جانے کا ارادہ کر لیا تھا جب کالی کو دیا ہوا وچن اُسے میری بانہوں سے گھسیٹ کر موت کی وادی کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں اُسے کاندھوں پر اٹھائے زندگی سے منہ موڑ کر کسی بلند چوٹی سے نیچے چھلانگ لگانے کی خاطر قدم بڑھا رہا تھا جب تم نے اپنے نوکیلے اور بے رحم پنجوں کی تیز چھین سے میرے ہوش و حواس معطل کر دیئے۔ تم درمیان میں مداخلت نہ کرتیں تو جمیل احمد خان کی کہانی اُسی روز انجام کو پہنچ جاتی میری سرگزشت اتنی طویل نہ ہوتی، اتنی فرصت کس کے پاس ہے جو میری الم انگیز آپ نئی میری داستانِ عمرت سناتا رہے گا اور میں کہاں تک خود کو بے قصور اور مظلوم ثابت کرتا رہوں گا۔ سب جانتے ہیں کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بچتی، دوسرے ہاتھ کی شمولیت شرط ہوتی ہے اور تم یہ کیوں فراموش کر رہی ہو کہ میری اس خونچکاں داستان کی اصل ذمہ دار تم ہو، تم جاؤ

اعتبار کرو جیل۔ میں نے تم کو کلدیپ سے کم نہیں چاہا ہے۔ میری بات کا یقین نہیں تو کبھی پریتم لال مہاراج سے پوچھ لینا، وہ مہان شکتیوں کا مالک ہے، دل کی گہرائیوں اور سمندر کی تہہ در تہہ دیکھنا اُس کے اختیار میں ہے۔ وہ مرنے کے بعد بھی اپنا اصل رُوپ دھارنے پر قادر ہے۔“ انکا نے بسورتے ہوئے کہا۔ ”وہ مجھے تمہارے پاس واپس لایا ہے تو اُس نے بھی ضرور محسوس کیا ہوگا کہ تم سے دُور ہو جانے کے بعد میری ساری شوخیاں اور طراریاں ختم ہو گئی تھیں، میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ شاید اسی کارن اُسے میرے حال پر دیا آگئی۔“

”مجھے کچھ دیر کے لئے تنہا چھوڑ دو انکارانی..... پلیز۔“ میں نے دوبارہ اصرار کیا تو انکا نے مجھے بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھا، پھر سر جھکائے ہونٹ کاٹتی نیچے اتر گئی۔

اُسی رات کھانے کی میز پر جب میں نے جین کی بوڑھی ماں کو دیکھا تو میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ بظاہر وہ بڑی مظلوم نظر آ رہی تھی لیکن اُس کے دل و دماغ میں میرے خلاف نفرت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ مجھے جین کے راستے سے ہٹانے کی خاطر سازشوں کے تانے بانے بن رہی تھی، جیکب کو مجھے قتل کر دینے پر آمادہ کر چکی تھی۔ شاید اُس نے مجھے ایک عام آدمی سمجھ رکھا تھا جسے وہ کسی بے زبان جانور کی طرح ذبح کر سکتی تھی۔ غالباً جین نے اُس بڑھیا سے میرا تفصیلی ذکر نہیں کیا ہوگا۔ کیا ہوتا تو میری سمت آنکھ اٹھاتے وقت بھی اُسے کئی بار سوچنا پڑتا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جیل احمد خان کون ہے؟ اگر اُسے میری ماضی کی داستان کا ایک مختصر حصہ بھی معلوم ہوتا تو شاید وہ مجھے موت کے گھاٹ اُتارنے کی بجائے خود زہر پی کر ہڈ سکون موت مر جانے کو زیادہ ترجیح دیتی۔

کھانے کی میز پر میرے، جین اور اُس کی مفلوج ماں کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ جین میرے سامنے والی نشست پر بیٹھی حسب معمول مجھے اپنی دن بھر کی مصروفیات کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اُس کی ماں وہیل چیئر پر بیٹھی سوپ پینے میں مصروف تھی، وہ خاصی خوش خوراک واقع ہوئی تھی۔ بظاہر وہ مجھ سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتی لیکن اس وقت مجھے زہر لگ رہی تھی، میں جین کی باتوں کو بھی توجہ سے سن رہا تھا اور اُس کی ماں کے بارے میں بھی غور کر رہا تھا۔ ممکن ہے انکا بھی کہیں آس پاس موجود رہی ہو، لیکن وہ میرے سر پر واپس نہیں آئی تھی۔

”دولت علی.....“ جین نے بات کرتے کرتے اچانک کھانے سے ہاتھ روک کر مجھے

مخاطب کیا۔ ”آج سارا، جم کو لینے دفتر آئی تھی۔ وہ اس ویک اینڈ (Week end) پر پکنک پر جانے کا پروگرام مرتب کر رہے ہیں۔ سارا نے خاص طور پر تمہیں بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی ہے۔“

”اور جم نے تمہیں ضرور انوائٹ کیا ہوگا.....؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”ظاہر ہے.....“ جین نے شوخی سے جواب دیا۔ ”اگر سارا اب بھی تمہیں ساتھ لے جانے کا اصرار کر سکتی ہے تو جم کو بھی مجھے مدعو کرنے کا حق حاصل ہے، اس کے علاوہ ہم ایک ہی دفتر میں ایک ساتھ کام بھی کرتے ہیں۔“

”مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ جم اور سارا ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔“ میں نے بڑے خلوص سے کہا۔

”ایک کامیاب شادی کے لئے عورت اور مرد کے اسٹیٹس میں نیٹلس ہونا بہت ضروری ہے۔“ جین کی ماں نے موقع اور موضوع کی مناسبت سے ڈنک مارنے کی کوشش کی۔ ”جہاں توازن نہ ہو وہاں گاڑی زیادہ دنوں نہیں چلتی، بیچ راستے میں کہیں ٹھپ ہو جاتی ہے۔“

”میں نہیں مانتی.....“ جین نے بڑی صاف گوئی سے ماں کی بات کی تردید کی۔ ”میں اسٹیٹس سے زیادہ عورت اور مرد کے درمیان انڈر سٹینڈنگ اور محبت میں اعتقاد رکھتی ہوں۔“

”تمہارا یہی اعتماد ایک بار تمہیں مایوسی سے دوچار کر چکا ہے۔“ بڑھیا نے دوسرا موقع بھی ضائع نہیں جانے دیا۔ ”تفریح کے لئے بغیر سوچے سمجھے کسی گھوڑے پر بازی لگا دینا اور بات ہے لیکن ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لئے لائف پارٹنر کا انتخاب کرتے وقت عورت کو بہت سارے اہم پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے۔“

”ممی پلیز.....“ جین نے ماں کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بدستور خوشگوار موڈ میں کہا۔

”اب میں بچی نہیں ہوں جو ہر مسئلے میں تمہاری اُلنگی تھام کر کوئی فیصلہ کروں۔ جم کل بھی میرا دوست تھا اور آج بھی ہمارے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہے، اگر اُس نے کسی وجہ سے سارا سے شادی کر لی تو ہمیں اُس کی خوبیوں کو یکسر نظر انداز نہیں کر دینا چاہئے۔ مجھے خوشی ہے کہ اُس نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا، اگر چاہتا تو مجھ سے شادی کرنے کے ایک دو سال بعد بھی سارا کو اپنا سکتا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے دولت علی؟“ جین نے آخری جملہ مجھے مخاطب کر کے کہا۔

”کیا یہ مناسب ہوگا کہ میں تم ماں بیٹی کے درمیان ثالث کا کردار ادا کروں؟“ میں



نے پہلو تہی مناسب سمجھی۔ مجھے جین کی ماں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ لیکن میں کوئی تلخ بات زبان پر لا کر جین کی دل شکنی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”تم نے درست سمت میں قدم اٹھانے کی دانشمندی کی ہے۔“ جین کی ماں نے مجھے طنزاً سراہتے ہوئے گردن اُونچی کی۔ ”تمہارے اور ہمارے ملک کی تہذیب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہماری رسمیں، ہمارا رہن سہن، ہمارے قوانین، ہمارا کلچر سب کچھ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اور تم اگر برانہ مانو تو یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ ہمارا معیار زندگی ہندوستانیوں کے مقابلے میں.....“

”ممی.....“ جین نے ماں کو ٹوکا۔ ”دولت علی ہمارے مہمان ہیں۔“

”میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔“ میں نے جین کو نظر انداز کرتے ہوئے براہ راست اُس کی ماں سے کہا۔ ”انسان آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے جسمانی خدوخال، اپنی رنگت اور اپنے وجود کی اس اصلیت سے انکار نہیں کر سکتا جو اُس کو کھلی آنکھوں سے نظر آ رہی ہو۔ جو اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے وہ خود فریبی کا شکار ہوتے ہیں، میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرا تعلق ایک پسماندہ ملک سے ہے۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ ہم سلطنت برطانیہ کے غلام رہ چکے ہیں اور غلام کا صرف ایک ہی اثیش ہوتا ہے، اپنے آقاؤں کے سامنے ہمیشہ سرنگوں رہے، بلا چون و چرا اُس کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دے، اس کے کسی فیصلے میں کوئی عیب نکالنے کی جسارت نہ کرے۔ بلکہ مختصر لفظوں میں یوں بھی کہا اور سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک اعلیٰ نسلی غلام کی خاصیت اُس کتے سے مختلف نہیں ہوتی جو اپنے مالک کے سامنے ہمیشہ اپنی وفاداری کے اعلان کے طور پر خاموش کھڑا دم ہلاتا رہے..... بھونکنے سے گریز کرے۔“

”میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو تم نے میری ایک سیدھی سادھی اور درست بات کو غلط مطلب پہنانے کی کوشش کی ہے۔“ جین کی ماں نے بیٹی کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ کر بڑے سیاسی تدبیر سے کام لیا۔ ”بہر حال اگر تمہیں میری بات گراں گزری ہو تو.....“

”ہم کیا کوئی اور بات نہیں کر سکتے.....؟“ جین اپنی جھلاہٹ پر قابو نہیں پاسکی۔ وہ اپنی ماں کو بدستور خشکیں نظروں سے گھور رہی تھی۔

”بزرگوں کی زبان پر اس طرح تالے ڈالنا بھی بے ادبی میں شمار ہوتا ہے۔“ میں نے

جین کو پیار سے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”وقت کی پرواز پہلے کے مقابلے میں بہت تیز ہو گئی ہے۔ سائنس کی ترقی نے انسانی ذہن کو بھی جلا بخشی ہے، کل تک جو لوگ پہاڑیوں کی چوٹیاں سر کرنے کو دشوار گزار مہم تصور کرتے تھے آج وہ تسخیر کائنات میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ بلاشبہ اس شعبے میں بھی مغرب، مشرق سے بازی لے گیا۔ یہ شرف بھی مغربی ماحول کے پروردہ ایک جانور ہی کو حاصل ہے جس نے چاند پر قدم رکھا۔ کیا تم اس حقیقت سے انکار کر سکتی؟“

جین جانور کے حوالے پر مسکرانے لگی۔ اُس کی جہاندیدہ ماں اپنی وہیل چیئر پر بل کھا کر رہ گئی۔ اُس نے جن نگاہوں سے مجھے دیکھا ان میں حقارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ شدت جذبات سے اُس کا چہرہ تہمتار ہا تھا۔

”دولت علی،“ جین نے مسکرا کر کہا۔ ”تم موضوع سے ہٹ رہے ہو۔“

”نہیں.....“ میں نے بدستور سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ ”میں موضوع سے نہیں بھاگ رہا بلکہ یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ترقی کے اس دور میں بھی شادی کا مسئلہ ہمارے بڑے بوزھوں کے لئے اتنا ہی پیچیدہ ہے جتنا آج سے سو سال پہلے تھا۔ وہ آج بھی اولاد کی بہتری کے لئے بہت کچھ سوچتے ہیں لیکن آج کی اولاد والدین کے فیصلوں کا احترام نہیں کرتی۔ تم شاید اسے جینریشن گیپ (Generation Gap) کہہ کر ٹالنے کی کوشش کرو لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ فی زمانہ شادیوں کی ناکامیوں کی بڑھتی ہوئی شرح کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کی رائے کو اہمیت نہیں دیتے۔“

”تم اسی رفتار سے بولتے رہے تو بھوکے رہ جاؤ گے۔“ جین نے چاول اور چکن کری کی ڈشیں میری جانب کھسکاتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”بھوکا رہنا انسانی صحت کے لئے نیک علامت نہیں ہوتی..... میں نے تمہاری ہی کتابوں میں کہیں پہلے طعام بعد کلام کے زریں اصول کے بارے میں پڑھا تھا۔“

جین کی ماں کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ وہ مجھے ناپسند کرتی تھی اس لئے جین کا التفات دیکھ کر اُس کا کانٹوں پر لوثا قدرتی امر تھا۔ میں نے جین کے اصرار پر دو چار لقمے لئے، پھر لا پرواہی سے بولا۔

”تم نے اس فارم ہاؤس کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

بیٹھا اُس کے وجود میں ہونے والی کھد بد محسوس کر رہا تھا۔  
 ”میرا خیال ہے کہ میں نے فارم ہاؤس کے بارے میں تم سے کوئی غیر سنجیدہ بات نہیں دریافت کی۔“ میں نے سنجیدگی برقرار رکھی۔ ”تمہیں اپنی والدہ کے قیمتی مشورے کے بعد اب اپنا گھر بسالینا چاہئے۔“

”کیا اس فارم ہاؤس کے اندر گھر نہیں بسایا جاسکتا؟“ جین نے شوخی سے پوچھا۔  
 ”بات پھر وہی اسٹیٹس کی آجاتی ہے۔“ میں نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”تم جس عہدے پر فائز ہو اس کے مقابلے میں یہ فارم ہاؤس تمہارے شایان شان نہیں ہے۔“  
 ”تم نے سارا اور جم کے ساتھ پکنک پر چلنے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ جین نے گفتگو کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ اسٹیٹس کے حوالے پر اُس کی ماں کے چہرے پر میرے خلاف زلزلے کے جوتاثرات ابھرے تھے شاید وہ اسے دیکھ چکی تھی۔  
 ”اگر زندہ رہا تو ضرور چلوں گا۔“ میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچے ہوئے ایسے لہجے میں جواب دیا کہ جین کا تشکر ہونا قدرتی بات تھی۔

”اب کیا تم مجھے اپنی بے سروپا باتوں سے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟“ اُس نے مجھے تیز نظروں سے گھورا۔

”ضروری نہیں ہے کہ انسان کی زبان سے جو نکلے وہ سچ ہی ہو۔ لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کچھ خطرے میرے ارد گرد ضرور منڈلا رہے ہیں۔“ میں نے نکلیوں سے جین کی ماں کو دیکھتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ”تم اسے میری چھٹی حس کی طرف سے ایک سنگٹل بھی تصور کر سکتی ہو۔ کل کیا ہونے والا ہے؟ کون یقین سے کہہ سکتا ہے؟“

”یہ تم کہہ رہے ہو دولت علی.....؟“ جین نے مجھے پُر تجسس نظروں سے گھورا۔ ”مجھے سارے تفتیشی افسر دنگ رہ گئے تھے۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم نے انکل لارڈ سمٹھ کی رُوح کو طلب کر کے اُس سے تمام تفصیلات دریافت کی تھیں، اس کے بعد ہی رابرٹ کی جیب سے زہر کی وہ شیشی برآمد کر لی گئی جو موت کا سبب بنی تھی اور لڑی نامی ملازمہ کے سوٹ کیس سے دو سو پونڈ کی وہ رقم بھی دستیاب ہو گئی جس کے عوض اُس نے دودھ میں زہر ملایا تھا؟ جو شخص دوسروں کے بارے میں اپنی رُوحانی قوت استعمال کر سکتا ہو کیا وہ اپنے بارے میں پیش

”تمہاری یہی باتیں مجھے اکثر یاد آیا کرتی تھیں۔“ جین نے بڑے والہانہ انداز میں میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ہنستے بولتے لیکھت سنجیدہ ہو جانا، اچانک کسی شوخ جملے سے محفل کو زعفران زار بنا دینا، کبھی کسی کے دل کا چور پکڑ کر اُسے ششدر کر دینا۔ تم نے جس کے بارے میں جو کہا وہ سچ ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ ترکی بازی گرا سپارٹا اور اُس کا استاد سلیمان بے۔“ جین میرے ہاتھوں اُن دونوں جادو گروں کی دُرگت کا احوال یاد کر کے بے تحاشہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”مجھے آج بھی یاد ہے جب تمہارے ایک اشارے پر اُس دھان پان سی لڑکی سوزی نے اسپارٹا کو فضا میں اُچھال کر ایک اُننگی پر روک لیا تھا۔ سلیمان بے خاموش کھڑا بے بسی سے تماشہ دیکھتا رہا۔ میرے خدا، وہ کتنا دلچسپ اور عجیب منظر تھا جب سوزی نے اسپارٹا کو ایک اُننگی پر اٹھائے اٹھائے پورے ہال کا چکر لگایا تھا۔ سلیمان بے حیرت سے کھڑا آنکھیں پٹ پٹاتا رہا۔ اُن دونوں کی ساری شعبہ بازی دھری کی دھری رہ گئی۔ آخر میں جب تم نے سلیمان کو مرغا بنوایا تو پورا ہال کھڑا ہو کر تالیاں بجا رہا تھا۔ تم کیا چیز ہو دولت علی؟ میں تمہیں آج تک پوری طرح نہیں سمجھ سکی۔“ جین نے اپنی ہنسی پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی ممی شادی کے موضوع پر اسٹیٹس کی بات کر رہی تھیں، تم نے سائنس کی ترقی کے حوالے سے چاند پر جانے والے جانور کا ذکر چھیڑ دیا اور اب تم مجھ سے سوال کر رہے ہو کہ میں نے اس فارم ہاؤس کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ تمہاری ہر بات بڑی دلچسپ اور معنی خیز ہوتی ہے۔“

جین اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں میرے سلسلے میں زمین و آسمان کے قلابے ملائی رہی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اُس کی ماں وہیل چیئر پر بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ چھری کاٹنا اُس کے ہاتھ میں موجود تھا لیکن وہ کھانا بھول کر یقیناً میرے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شاید اُس نے جین سے کسی سر پھرے ہندوستانی کے بارے میں کچھ ناقابل یقین کہانیاں سن رکھی تھیں جن کے بارے میں کچھ نہ کچھ رائے بھی ضرور اخذ کی ہوگی۔ لیکن اس نے خواب میں بھی یہ نہ سوچا ہو گا کہ کبھی وہی حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک اُس کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا کھانا بھی کھا رہا ہو گا۔ وہ بے چینی سے بار بار کبھی جین اور کبھی میری سمت دیکھنے لگتی، پھر کسی سوچ میں غرق ہو جاتی۔ مجھے خوشی تھی کہ جین نے اُسے مضطرب کر دیا تھا، ایک لمحہ پہلے وہ برتری کے احساس میں مبتلا تھی، اب بے حد فکر مند نظر آرہی تھی۔ میں دُور

کھانے سے فارغ ہو کر میں، جین کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گیا جس کی ایک بڑی کھڑکی باہر لان کی سمت کھلی تھی۔ کھڑکی پر شیشے اور جالیوں کے فریم لگے تھے۔ شیشے کی دوسری جانب لکھی اندھیرا پھیلا تھا۔ سڑک کے اُس پار دوسرے مکانوں کے بلب ٹمٹماتے نظر آرہے تھے۔ جین میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اُس کی ماں اپنی خواہگاہ میں چلی گئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کہیں قریب چھپی ہماری باتوں کی سن گن لے رہی ہو، میں چاہتا بھی یہی تھا کہ اُسے میری قوت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے۔ اُس مفلوج عورت سے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جینک کے لئے انکا ہی بہت تھی۔ میں اُن دونوں کو کیفر کردار تک پہنچا سکتا تھا لیکن جینک کی ماں کے سلسلے میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ کر کے جین کے دل کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

جین اپنی رُوداد سناتی رہی، میں اپنے بارے میں سوچتا رہا۔ پریم لال نے مجھ سے وچن لیا تھا کہ میں شادی سے گریز کروں گا، مجھے بھی احساس تھا کہ اگر میں نے اپنی دلچسپی کی خاطر جین کا ہاتھ تمام لیا تو کلدھپ کی رُوح تڑپ اٹھے گی۔ آپ اسے ایک جذباتی لگاؤ بھی کہہ سکتے ہیں ورنہ سچ یہی ہے کہ مرنے والے کا دنیا سے سارا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا استبدان بھی ابھی تک کوئی ایسا پیمانہ ایجاد نہیں کر سکا جو کسی مرنے والے کی رُوح کے احساسات کو ریکارڈ کر سکے۔ موت، زندگی کے خوابوں کی ایک تلخ اور بھیاںک تعبیر ہے۔ ڈوبنے والے کی طرح مرنے والا بھی زندگی برقرار رکھنے کی خاطر پوری شد و مد سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے لیکن پھر منکر نکیر کے ہاتھوں اپنی شکست تسلیم کر لیتا ہے۔ ساری شان و شوکت، تمام ٹھاٹھ باٹھ، عالی شان و حسین محلات، بینک کے کھاتوں میں جمع شدہ گیارہ بارہ ہندسوں پر مشتمل بڑی بڑی رقمیں، سب دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے، تمام قریبی، خونی اور جذباتی رشتے پلک جھپکتے میں بلبلوں کی مانند ٹوٹ جاتے ہیں۔ پھر ایک نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نئے سفر میں انسان کے اپنے اعمال کے علاوہ کچھ اور کام نہیں آتا، خالق کائنات کے نظام میں کہیں کوئی جھول، کوئی چلک، کوئی جھری، کوئی دراڑ نہیں ہوتی۔ اس کا انصاف بڑا صاف و شفاف ہوتا ہے۔ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کر دیتا ہے۔

میں کلدھپ کے خیال میں گم ہو کر کسی اور دنیا کی سیر کر رہا تھا جب جین نے میرا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ”دولت علی۔ یہ بیٹھے بیٹھے تم کہاں گم ہو گئے ہو.....؟“

آنے والے خطروں کا کھوج نہیں لگا سکتا؟“

جین کی ماں کے چہرے پر نظر آنے والا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ اُس نے جینک کے ساتھ مل کر میرے خلاف جو بھی سازش مرتب کی تھی، اس وقت اُس کے ذہن میں اس کے بارے میں دوسو سے زائد پیرا ہو رہے ہوں گے۔ وہ خاصی بے چین نظر آ رہی تھی۔ میں چاہتا تو سارا کھیل چند لمحوں میں ختم کر دیتا، جین کی ماں اور جینک کے درمیان جو ناجائز تعلقات تھے وہ خود باری باری اپنی زبان سے اس کا اعتراف کر لیتے۔ میرا ایک اشارہ ہوتا وہ ریکارڈ کی طرح بجنا شروع کر دیتے۔ لیکن میں جین کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا، میں نے کچھ سوچ کر بڑی افسردگی سے کہا۔

”تم میری جن رُوداد جانی تو توں کا ذکر کر رہی ہو وہ مجھ سے چھن گئی ہیں۔“

”یہ..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو دولت علی؟“ جین کو میرا جواب سن کر ایک جھٹکا سا لگا۔

”حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔“ میں نے دیدہ دانستہ بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”ہندوستان میں میرے اوپر کیا گزری، اس کی داستان بڑی طویل اور الم انگیز ہے۔ تم نے خود اپنی آنکھوں سے میری حالت دیکھی ہے، کچھ دن اور تم نے غفلت سے کام لیا ہوتا تو پھر شاید میں تمہیں نہ ملتا۔ میری بجائے میری لاش ہی ملتی۔“

”ایسی دردناک باتیں مت کرو، پلیز۔“ جین تڑپ اٹھی۔ ”مُمی سے پوچھو، جب تم چلے گئے تو میرے اوپر کیا ہوتی تھی۔ تمہارے بغیر میں نے زندگی کے دن کس عذاب میں گزارے ہیں یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا، وقت جیسے تھم کر رہ گیا ہو۔ جم اور سارا شادی کے بعد ہنی مون منانے چلے گئے تو میں اور بھی تنہا ہو گئی۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ تم تھے تو رات اور دن گزرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ پھر ایک دن میں نے تمہیں تلاش کرنے کی ٹھان لی۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم مجھے مل گئے، تمہاری تلاش میں زیادہ در بدر نہیں ہونا پڑا۔ تمہیں اس حالت میں دیکھ کر میں گنگ سی رہ گئی تھی، ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کھلی آنکھوں سے کوئی بھیاںک خواب دیکھ رہی ہوں۔ تمہیں پہچان لینے کے بعد مجھے اپنا ہوش نہیں رہا۔“ جین اپنے ماضی کی داستان سناتی رہی۔ میں جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے اس کا ایک ایک حرف صداقت پر مبنی ہے، اس کی پرورش بھی اسی آزاد ماحول میں ہوئی تھی لیکن وہ دوسروں سے بڑی مختلف تھی۔ بالکل الگ تھلک۔

”تمہاری میٹھی میٹھی باتیں سن رہا تھا۔“ میں نے ہوش میں آتے ہی منافقت اور دروغ گوئی کو پھر اپنا شعار بنالیا۔ پیار بھری نظروں سے جین کو دیکھا تو اُسے یقین آ گیا کہ میں اُسی کے خیالوں میں گم تھا۔ ”مجھے تم سے ایک شکایت ہے جین۔“ میں نے اُسے ہاتھوں کے حصار میں لیا تو وہ بڑی مطمئن نظر آنے لگی۔ ”تم نے پہلے کبھی اپنی می کا ذکر نہیں کیا۔“

”ممی مجھ سے علیحدہ رہتی تھیں اس لئے میں نے ان کے ذکر کی ضرورت محسوس نہیں کی۔“ جین نے بھولپن سے جواب دیا، پھر ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ”میرے پاپا کے انتقال کے صرف ایک سال بعد ممی نے دوسری شادی کر لی تھی، اُس وقت میری عمر گیارہ سال تھی۔ ممی کی شادی کے بعد میں مشکل سے دو تین مہینے ان کے ساتھ رہ سکی، پھر میری پرورش کی ذمہ داری میری ایک مالدار بیوہ پھوپھی نے سنبھال لی۔ وہاں میں بڑے سکون سے تھی، مجھے ہر قسم کا تحفظ حاصل تھا۔ لیکن پھوپھی کے انتقال کے بعد مجھے خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں تعلیم مکمل کر چکی تھی، ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے کی خاطر مجھے بڑے پاپڑ بیٹنے پڑے۔ میں لندن آ گئی۔ انگلستان میں لندن ہی ایک ایسا شہر ہے جو ہر طبقہ فکر کے لوگوں کو اپنے دامن میں سولیتا ہے۔ فکر معاش میں بھٹکنے والے بھی اسی شہر کا رخ اختیار کرتے ہیں۔ یہاں جرائم بھی ہوتے ہیں لیکن اس کی نوعیت عام انسانوں کی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے لندن آ کر زیادہ دنوں بھٹکنا نہیں پڑا۔ میں نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ملازمت اختیار کر لی۔ ہوٹل کا مالک میری اس کلاس فیلو کا واقف کار تھا جس نے مجھے عارضی طور پر اپنے اپارٹمنٹ میں پناہ دی تھی۔ ہوٹل کا ماحول بظاہر صاف ستھرا تھا لیکن مجھ جیسی تنہا اور بے سہارا لڑکیوں کے لئے مناسب نہیں تھا۔ ہوٹل کا مالک مہربان نہ ہوتا تو شاید مجھے بھی اپنے جیسی دوسری لڑکیوں کی طرح یا تو کسی پب میں بیٹھے ہوئے شریاویوں کے درمیان زندگی گزانی پڑتی یا پھر جسم فروشی پر مجبور ہونا پڑتا۔ ہوٹل کے مالک نے میرے کام سے متاثر ہو کر ایک سرونٹ کوارٹر میں جگہ دے دی جہاں ایک ادھیڑ عمر کی بیوہ پہلے سے رہتی تھی۔ وہ میری بہترین رفیق بن گئی۔ زمانے کی اونچ نیچ سے باخبر رکھنے کے علاوہ ہر طرح سے میری نگہداشت کرتی تھی۔ میں نے ڈیڑھ سال اس ہوٹل میں ملازمت کی، جم سے میری ملاقات بھی اُسی ہوٹل میں ہوئی تھی۔ وہ اکثر وہاں آیا کرتا تھا۔ جم میں کوئی خاص بات ضرور تھی جو میں اُس سے بہت جلد متاثر ہو گئی۔ مجھے یہ بات بعد

میں معلوم ہوئی کہ وہ محکمہ سرانفرسانی سے وابستہ ہے۔ جم سے بے تکلفی کے بعد ہماری ملاقاتیں ہوٹل سے باہر بھی ہونے لگیں۔ پھر جب جم کو میری تعلیم کے بارے میں علم ہوا تو اُس نے ہاتھ پاؤں مار کر مجھے بھی اپنے محکمے میں ملازمت دلادی۔ یہ جم کا میری ذات پر بہت بڑا احسان تھا۔ اُس نے میرے لئے ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ کا بندوبست بھی کر دیا جہاں وہ مجھ سے ملنے کی خاطر بلاناغہ کیا کرتا تھا..... ہم رات گئے تک باتوں میں مصروف رہتے۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ جم میری ذات میں دلچسپی لے رہا ہے۔ لیکن اس بات کی اُمید نہیں تھی کہ وہ مجھے اپنی زندگی کا ہمسفر بنانے پر آمادہ ہو جائے گا جس دن اُس نے مجھے پروپوز کیا اُس دن مجھے اپنی قوت سماعت اور خوش بختی پر یقین ہی نہیں آیا۔ زندگی ایک سیدھے راستے پر بڑے سکون سے گزر رہی تھی جب تم سے ملاقات ہو گئی۔ جم تمہارے کھیل تماشے دیکھ چکا تھا، لارڈ اسمتھ کی موت کی سازش بے نقاب ہونے کے بعد وہ تمہارا مداح ہو گیا تھا۔ انہی دنوں جم کو جرمن سائنسدان کو اغواء کرنے کی اہم ذمہ داری سونپی گئی، جم اس مشن سے اپنی جان چھڑانا چاہتا تھا، وہ اگر ناکام ہو جاتا تو محکمہ میں اُس کی ساری کی ساری ساکھ مٹی میں مل جاتی۔ جم نے بڑے غور و خوض کے بعد تمہارا انتخاب کیا۔ مجھے بھی یقین تھا کہ تم اپنی رُوحانی قوتوں سے جم کی مشکل آسان کر سکتے ہو۔ اس کے بعد جو حالات پیش آئے وہ تمہارے علم میں ہیں۔“

”اس مہم میں، میں نے تمہیں جم سے چھین لیا تھا۔“ میں نے بالوں کی ایک آوارہ لٹ جین کے چہرے سے ہٹا کر اُس کے لب چوم لئے، اُس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

”تمہارے لندن سے جانے کے بعد ممی کو دوسری بار شوہر کی جدائی کا غم برداشت کرنا پڑا۔“ جین نے طویل سانس لے کر کہنا شروع کیا۔ ”اس بار وہ اپنی بیوگی کا غم برداشت نہ کر سکیں۔ مجھے اُن کی پریشانیوں کی اطلاع ملتی رہی۔ پھر جب یہ بات میرے علم میں آئی کہ ممی پرفانج کا حملہ ہوا ہے تو میں انہیں منا کر اپنے ساتھ لندن لے آئی۔ تب سے وہ میرے ساتھ اسی فارم ہاؤس میں ہیں جو تمہاری مہربانی اور محکمہ کی عنایت سے میرے حصے میں آیا ہے۔“

”ایک بات کہوں اگر تم برا نہ مانو.....“

”میں جانتی ہوں تم کیا کہو گے.....؟“ جین مجھ سے علیحدہ ہو کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ”ممی اس بات کے حق میں نہیں ہیں کہ میں تمہارے ساتھ شادی



کروں۔ اسٹیش کا بھوت اُن کے دماغ پر اس لئے سوار رہتا ہے کہ وہ اپنی محرومیوں کے سبب ازدواجی زندگی کے تلخ حقائق سے دوبار حالات کا شکار ہو چکی ہیں۔“

”اگر میں سنجیدگی سے مشورہ دوں کہ تم اپنی می کے تجربات سے استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کرو تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟“

جین نے مجھے تیز نظروں سے دیکھا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں نے محض اُسے چھیڑنے کی خاطر وہ بات کہی ہوگی۔ لیکن جب میری سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا تو وہ کسی خونخوار بلی کی طرح ایک لمحہ مجھے گھورتی رہی، پھر جھپٹ کر مجھے پوری شدت سے اپنی حسین اور گداز بانہوں میں جکڑ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجھے اُسے منانے میں خاصا وقت لگا۔ وہ اس وعدے پر اپنی خواب گاہ میں گئی تھی کہ میں پھر کبھی مذاق میں بھی اُسے ماں کا فیصلہ تسلیم کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا.....!



میں خواب خرگوش میں بھی جین کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس کی محبت جنون کا رنگ اختیار کرنے لگی تھی۔ رات میں نے اُسے بڑی مشکل سے اُس کی خواب گاہ تک پہنچایا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر ہی میرے ساتھ سونے پر مُصر تھی۔ آگ اور پٹرول کا ساتھ مناسب نہیں تھا، اُس کا جوان اور گداز قرب میرے اندر چھپے وحشی انسان کو بار بار ایڑ لگا رہا تھا۔ پہلے بھی مجھے برلن میں بے شمار ایسے مواقع ملے تھے کہ میں اُس کی سرکش جوانی کو تسخیر کر سکتا تھا لیکن میں نے اس سے گریز کیا۔ وہ لندن کی عام لڑکیوں سے مختلف تھی۔ مجھے یاد ہے ایک بار اُس کے ہونٹوں کی چاشنی میرے جسم میں کھلی تو میں بے خود ہو گیا تھا۔ وہ بھی طوفان کے تھپیڑوں میں جھکولے کھا رہی تھی۔ میں لنگر کھول دیتا تو شرم و حیا کے سارے تقاضے دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ میرے ساتھ جین بھی موجوں کے زیر و بم پر بہتی بیچ منہ ہار میں چلی گئی ہوتی۔ لیکن اُس نے اپنے پاؤں رپٹنے سے پہلے ہلکی ہلکی آواز میں کہا تھا۔

”دولت علی..... میں تمہاری امانت ہوں۔ لیکن وقت سے پہلے اس امانت میں خیانت مت کرو۔“

”جین۔ میں اپنے اختیار میں نہیں ہوں۔“ میں نے بکھری بکھری سانسوں کے درمیان درخواست کی۔ ”تم مجھ سے دُور چلی جاؤ، ورنہ پانی کا دوسرا ریلوے قدم اُکھاڑ دے گا۔“

جین مجھ سے دُور ہو گئی۔ اُس وقت جین میرے رحم و کرم پر تھی، میں چاہتا تو وہ ہنستی مسکراتی میری آغوش میں ڈھیر ہو جاتی۔ اب بات بہت آگے نکل چکی تھی۔ میں یہ کہوں کہ جین میری محنت تھی تو غلط نہ ہوگا۔ وہ مجھے بمبئی جیسے دُور دراز سفر کے بعد موت کے چنگل سے نکال کر لندن لے آئی تھی۔ اُس نے میرے علاج معالجے میں بے دریغ دولت لٹائی۔ میرے کئے ہوئے ہاتھ کی جگہ مصنوعی ہاتھ لگا دیا، مجھے اپنے ساتھ اپنی چھت کے نیچے لے آئی۔ اُس نے مجھے زندگی کی نوید دی، جینے کا سہارا دیا، رہنے کا ٹھکانا فراہم کیا۔ میں اُس

کے اعتماد پر شب خون مار دیتا تو خود اپنی نگاہوں میں گر جاتا۔ پر تیم لال کو دیا ہوا عہد ٹوٹ جاتا، کلدیپ کی روح بھی تڑپ اٹھتی۔ میں نے اپنی ذات کو زسوا نہیں ہونے دیا، سمجھا بھجا کر چین کو اُس کی خوابگاہ تک پہنچا دیا۔ وہ چل رہی تھی۔ بار بار میرے کشادہ سینے میں سر چھپا کر سسکتی لگتی۔ اُسے میری کسی بات سے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ میں اُس کے ساتھ زندگی کے سفر پر بہت دُور تک نہ جا سکوں گا، راستے میں کسی پڑاؤ پر اُسے تنہا چھوڑ کر آگے نکل جاؤں گا۔ اُس کا اندیشہ غلط بھی نہیں تھا۔ میں کھل کر اُسے مجبور یوں کا احساس دلانے سے قاصر تھا۔ وہ بڑے نازک احساسات کی مالک تھی۔ ایک ذرا سی ٹھیس لگتی تو اُس کا ہیشہ دل ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا، وہ بکھر جاتی، اُسے سینا مشکل ہو جاتا۔

”ہوش سے کام لو چین۔“ میں نے اُسے دلاسا دیا۔ ”تم اب ایک ذمہ دار آفیسر ہو، اتنی جلدی ہمت ہار دو گی تو ترقی کی راہیں کس طرح طے کرو گی؟ ابھی تو تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔“

”نہیں دولت علی نہیں۔“ وہ میری بانہوں میں چھلنے لگی۔ ”میں حالات سے بڑی خوفزدہ رہتی ہوں، تم ایک بار مجھے واپس آنے کا یقین دلا کر چلے گئے تھے، میں تمہاری یاد میں ایک ایک دن کا شمار کرتی رہی۔ میں نے وہ دن بڑے کرب میں گزارے تھے۔ اب تم واپس آ گئے ہو تو پھر جینے اور مرنے کی باتیں کرنے لگے۔ مجھے مئی کے مشوروں پر عمل کرنے پر اُکسا رہے ہو، تمہارے دل میں کیا ہے؟ مجھے ایک بار کھل کر صاف صاف بتا دو۔“

”بچوں جیسی باتیں مت کرو چین۔“ میں نے اپنی مجبوری کو خوبصورت انداز میں بیان کیا۔ ”میں کہیں بھاگنا نہیں چاہتا۔ اگر بھاگنا ہوتا تو تمہارے ساتھ آتا ہی کیوں؟ عقل سے کام لینے کی کوشش کرو۔“

”مجھ سے ایک وعدہ کرو۔“ اُس نے مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ ”تم بہت جلد مجھے اپنا بنا لو گے، میں تمہاری ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔ مئی کی فکر مت کرو، میں اُنہیں بھی تمہارے سلسلے میں آمادہ کر لوں گی۔“

”مجھے تھوڑا وقت دو چین۔“ میں نے اُس کے کپکپاتے ہونٹوں کی سرخی چراتے ہوئے نیا بہانہ تراشا۔ ”میں اپنی کھوئی ہوئی قوتیں دوبارہ حاصل کرنے کی خاطر کچھ مشق اور ریاضتیں کر رہا ہوں۔ مجھے کامیاب ہو لینے دو۔ اس کے بعد میں تمہاری ہر خواہش کے آگے

سر تسلیم خم کر دوں گا۔“

”سچ؟“ اُس کی حسین آنکھوں میں کھکشاں جگمگانے لگی۔ ”میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟“

میں اُسے سمجھا بھجا کر اُس کی خوابگاہ میں چھوڑ آیا تھا۔ اب اُس کا تصور مجھے خواب میں پریشان کر رہا تھا جب اچانک میرے سر پر شدید چھین ہوئی۔ وہی مانوس چین جو انکا کے وجود کا احساس دلاتی تھی۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

انکا کی نگاہوں میں نفرت اور انتقام کے جذبے اُمنڈ رہے تھے۔ اُس کا چہرہ خون کی تمازت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اُس کے پاس میرے لئے بری خبر ہی ہوگی۔ میں نے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

”کیا بات ہے؟ اس قدر غضبناک اور بھیانک کیوں نظر آ رہی ہو.....؟“

”مجھے اجازت دو جیل۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں اُس کے گندے خون سے اپنے وجود کو سیراب نہیں کروں گی۔ لیکن اُسے ایسی عبرتناک موت ماروں گی کہ اُس کی آتما کو بھی کبھی چین نصیب نہیں ہوگا۔“

”کس کی بات کر رہی ہو انکارانی؟“ میں نے انکا کو اس بار پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ اُس کا اشارہ کس کی جانب تھا، میں سمجھ رہا تھا۔ میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔

”میں اُس حرامزادے جبک کی بات کر رہی ہوں جواب حد سے گزر جانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔“ انکا غصے میں ہاتھ مسلتے ہوئے بولی۔

”کوئی تازہ خبر.....؟“

”ہاں“ انکا تمللا کر بولی۔ ”وہ اس وقت چین کی ماں کی خوابگاہ میں تنگ دھڑنگ کھڑا تمہاری موت کے منصوبے بنا رہا ہے۔“

”تمہیں کس بات پر غصہ ہے؟“ میں نے انکا کو چھیڑنے کی خاطر مسکرا کر پوچھا۔

”جبک کے تنگ دھڑنگ ہونے پر یا اس منصوبے پر جو میرے خلاف طے پا رہا ہے؟“

”مذاق میں مت ٹالو جیل۔“ انکا پیچ و تاب کھانے لگی۔ ”پانی اب سر سے اُونچا ہونے لگا ہے۔ چین کا خیال نہ ہوتا تو میں اُس بد بخت کو اب تک بڑی اذیتناک موت سے ہلکا کر چکی ہوتی۔“

دے کر اس بات پر ہموار کر لیا ہے کہ وہ پہلی فرصت میں جین کے راستے سے تمہارا کانٹا ہمیشہ کے لئے نکال پھینکے گا۔“

انکا کی بات سن کر مجھے سنجیدگی اختیار کرنی پڑی۔ جیکب کوئی مسئلہ نہیں تھا، میرے ایک اشارے کی دیر تھی، انکا اُس کو جہنم میں چھلانگ لگانے پر بھی مجبور کر دیتی۔ مجھے صرف جین کا خیال تھا، وہ ایک ذمہ دار آفسر تھی۔ جس مضافاتی علاقے میں رہتی تھی وہاں کے لوگ اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جیکب کی موت اُس کے لئے پریشانی کا سبب بن سکتی تھی۔ انکا کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق جیکب پولیس کو مطلوب ایک مفرور مجرم تھا۔ یہ بات کھلتی تو ہر طرف چرچے شروع ہو جاتے۔

”کیا سوچ رہے ہو جیل.....؟“

”میرا خیال ہے کہ جیکب کا فوری طور پر چھٹی لے کر یہاں سے کہیں دُور چلا جانا زیادہ مناسب ہو گا۔“ میں نے کافی غور و خوض کے بعد سنجیدگی سے کہا۔ ”پولیس اُسے ہفتہ دس دن بعد کسی دوسرے جرم کی پاداش میں بھی گرفتار کر سکتی ہے۔ جو صورت بھی ہو، لیکن جین کا نام کسی حوالے سے درمیان میں نہیں آنا چاہئے۔“

”یہی بات تم مجھے سر سے اتر جانے کا نادر شاہی حکم دینے سے پیشتر بھی کہہ سکتے تھے۔“ انکا نے اٹھلا کر کہا۔ ”میں محسوس کر رہی ہوں کہ اب تمہاری نگاہوں میں میری کوئی وقعت نہیں رہی۔“

”میں نے کبھی تم سے ایک درخواست کی تھی مگر تم نے اس پر عمل نہیں کیا۔“ میں نے لمبی سانس لے کر انکا کو شکایتی نظروں سے گھورا۔

”ہو سکتا ہے اُس وقت تمہاری انکارانی کسی دوسرے کے قبضے میں ہو۔ ورنہ تم کوئی حکم دو اور میں انکار کر دوں؟“ انکا کے لہجے میں لگاوٹ تھی۔ وہ میرے بالوں کے درمیان آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی، گنگنتا تے لہجے میں کہا۔ ”تم اپنی انکا کو سمجھ ہی نہیں سکے جیل۔ ورنہ ایسی بات کبھی نہ کہتے۔ اب آ کر دیکھ لو، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔“

”سوچ لو..... کہیں بعد میں کوئی طالع نہ ہو۔“

”تمہارے ہاتھوں مجھے موت بھی گوارا ہے۔“ انکا نے ہنسنے لہجے میں سرگوشی کی، پھر دل پر ہاتھ مار کر مستی کے عالم میں بولی۔ ”چلو، آج یہ فیصلہ ہو جائے کہ ہم دونوں میں

”جین کے ساتھ ساتھ تمہیں اُس کی ماں کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔“ میں نے شوخی سے جواب دیا۔ ”جیکب مر گیا تو اُس بڑھیا کے ارمان بھی اُسی کے ساتھ دفن ہو جائیں گے۔“ جواب میں انکا نے مجھے خشکیں نظروں سے گھورا۔ ”میں تمہیں ایک اہم بات اور بتانا چاہتی ہوں، پریم لال مہاراج نے مجھے تمہارے پاس لاتے وقت بتایا تھا کہ اب میں صرف اس کے دائرہ اختیار میں ہوں۔ جب تک اس کی پوتر آتما میرے حق سے دستبردار نہیں ہو جاتی، دھرتی کا کوئی پنڈت یا پجاری مجھے اپنے قبضے میں کرنے کا سہنا بھی نہیں دیکھ سکتا۔“

”اوہ، گویا تم اب پریم لال کی طرف سے میرے لئے ایک تحفہ ہو؟“

”ایسا نہیں ہے.....“ انکا نے انکساری سے کہا۔ ”مہاراج کے انوسار میں اب بھی اسی طرح تمہارے تابع ہوں جیسے پہلے تھی، میں تمہارے کسی حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی۔ لیکن مہاراج نے ایک اور بات بھی کہی تھی۔“

”وہ کیا.....؟“

”مجھے ہر حال میں تمہاری حفاظت کا خیال رکھنا ہو گا.....“ انکا نے خلاء میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا کہنا چاہ رہی ہو انکارانی.....؟“ میں نے انکا کو تکیہ نظروں سے گھورا۔

”بات سمجھنے کی کوشش کرو جیل صاحب.....“ انکا نے میرے سوال کی وضاحت کرنے کی بجائے مچل کر کہا۔ ”جین کی ماں کو کل رات تک اس بات کا علم نہیں تھا کہ تم وہی ہو جس نے اسپارٹا اور سلیمان بے جیسے عظیم جادوگروں اور شعبہ بازوں کو ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں مگنی کا ناچ نچا دیا تھا، جین نے کھانے کے دوران تمہارے ماضی کے کارناموں کو کرید کر اُس بڑھیا کے کان کھڑے کر دیئے ہیں۔ اُسے مفلوج بھی نہ سمجھو، وہ بڑی حرفوں کی بنی ہوئی ہے۔ ایک معمولی مرض کو اُس نے ڈاکٹروں سے مل کر فالج کا رنگ اس لئے دے دیا کہ جین کی پوری پوری ہمدردی حاصل کر سکے۔ بے حد چالاک اور خزانٹ واقع ہوئی ہے۔ اُسے تمہارے بیان پر بھی شبہ ہے کہ تم اپنی روحانی قوتیں کھو چکے ہو۔ اُس کا خیال ہے کہ تم نے وہ بات صرف اُسے سنانے کے لئے کہی ہوگی۔ وہ اب تمہاری طرف سے پوری طرح محتاط ہو گئی ہے۔ اپنے خطرناک منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر اس وقت بھی بڑی بے غیرتی سے جیکب کو نواز رہی ہے۔ اُس نے جیکب کو ایک بڑے انعام کا لالچ

سے کون ایک دوسرے کو زیادہ چاہتا ہے۔“  
”زبان دے رہی ہو؟“

”میں دل ہار چکی ہوں، تم زبان کی بات کر رہے ہو.....“ انکا نے توبہ شکن انگڑائی لے کر شرابی لہجے میں جواب دیا۔ اُس کی شوخ نظروں میں جام و مینا گلے ل رہے تھے۔  
”رات جین کے قرب نے دل پر نشتر چلائے تھے، اب تمہاری ادائیں چھریاں چلا رہی ہیں۔“ میں نے انکا کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے حسرت بھرے انداز میں مخاطب کیا۔ ”میں نے پہلے بھی درخواست کی تھی انکارانی۔ آج پھر اسی خواہش کا اعادہ کر رہا ہوں، صرف ایک بار اپنی بھرپور جوانی، حسن کی تمام تر حشر سامانیوں کے گداز کو اپنے دراز قد میں سمو کر میرے پہلو میں آ جاؤ۔ میری ہانہوں میں سا جاؤ۔ پھر تمہیں کبھی مجھ سے شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ وعدہ رہا، میں تمہاری جنم جنم کی پیاس بجھانے میں کسی بخل سے کام نہیں لوں گا۔“  
”کاش..... کاش تمہاری خواہش کا احترام میرے اختیار کی بات ہوتی۔“ انکا نے جذباتی نظروں سے مجھے گھورا، میرے بالوں کے بستر پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گئی، بیجا بی انداز میں لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ وہ مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے موڈ میں تھی۔ میں نے کروت بدل کر آنکھیں موند لیں۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر جین کی ماں بڑی مطمئن نظر آرہی تھی۔ ماریا بڑی مستعدی سے اپنے کاموں میں مصروف تھی، جین دفتر جانے کے لئے تیاری کر رہی تھی۔ ناشتے کی میز پر جین کی والدہ، ماریا اور میرے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ میں نے ماریا کو غور سے دیکھا، پھر مورگن کے بارے میں سوچنے لگا جو اس نوخیز کلی کو شادی کے صرف سات ماہ بعد چھوڑ کر کہیں گم ہو گیا تھا۔ ماریا کو یقین تھا کہ وہ ملک چھوڑ کر کہیں باہر چلا گیا ہو گا۔ تین سال گزر جانے کے بعد بھی وہ اُسی کی راہ تک رہی تھی۔ ماریا نہ صرف قبول صورت بلکہ مورگن سے وفادار بھی تھی۔ نہ ہوتی تو کسی دوسرے کا ہاتھ تھام لیتی۔ اُس کے سراپا میں وہ تمام خوبیاں، دلکشی اور مقناطیسی کشش موجود تھی جو جس مخالف کو اپنا گرویدہ بنا سکتی تھی۔ میں نے اُسے اپنے کام سے کام رکھتے دیکھا تھا۔ وہ زیادہ باتیں کرنے کی عادی نہیں تھی۔ جب سے میں جین کے ساتھ فارم ہاؤس میں آیا تھا وہ صرف دو تین ہی موقعوں پر مجھ سے ہمکلام ہوئی تھی۔ وہ بھی اُس وقت جب میں نے کسی کام کی غرض سے اُسے مخاطب کیا۔

”کیا بات ہے جمیل.....؟“ انکا نے میرے سر پر کسماتے ہوئے شوخی سے سوال کیا۔  
”یہ آج تم ماریا کو اتنے غور سے کیوں گھور رہے ہو؟“

”کیوں؟ کیا حسین و جمیل چہرے دیکھنا گناہ ہے؟“  
”ہرگز نہیں.....“ انکا نے پہلو بدلا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم آہستہ آہستہ دوبارہ زندگی کی رنگینیوں کی طرف واپس قدم اٹھا رہے ہو۔ کبھی وہ زمانہ تھا جب تم بڑے بڑے خاندانوں کی شوخ و شنگ، الہڑ حسیناؤں کی بھیڑ میں گھرے رہتے تھے۔ انہیں لباس کی طرح بدلنے کے عادی تھے، تمہاری بھوک کے ساتھ ساتھ میری پیاس بھی مٹ جاتی تھی۔“  
”میں سمجھ رہا ہوں انکارانی۔ کہ تم اس وقت کیوں چپک رہی ہو۔“ میں انکا کا مفہوم بھانپ کر سنجیدہ ہو گیا۔ ”ماریا کا خیال دل سے نکال دو۔ یہ بھی مت بھولو کہ یہ جین کی رہائش گاہ ہے۔ میں اس چھت کے نیچے تمہاری خواہش کی تکمیل سے قاصر ہوں۔“

”ان کھیت اور باغوں کے بارے میں کیا خیال ہے جہاں موسمی پھلوں کی بھینی بھینی خوشبو میں زرخیز زمین کی سوندھی سوندھی مہک بھی رچی بسی رہتی ہے؟“ انکا سر سے پھدک کر میرے شانوں پر آ گئی۔ دونوں پاؤں ہلاتے ہوئے بڑی رازداری سے بولی۔ ”ان لہلہاتے کھیتوں کے اندر کیا کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی تو میں بھی شرم سے آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔ گوری چٹی لڑکیوں کی جسارت دیکھو گے تو تم بھی پانی پانی ہو جاؤ گے۔“  
”تم شاید مجھے اُکسانے کی کوشش کر رہی ہو؟“

”یہ تمہارا وہم ہے۔“ انکا نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ”مجھے حیرت ہے کہ تم نے ابھی تک جین کے بارے میں سنجیدگی سے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔“  
”کیا مطلب.....؟“ میں نے انکا کو گھورا۔

”رقابت کی آگ کی حدت سیسے کو بھی پگھلا دیتی ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”پریم لال مہاراج کو دیئے ہوئے وچن کے مطابق تم کسی کو زندگی کا ہمسفر نہیں بنا سکتے، جین کو جھوٹے وعدوں کی الٹی پر کب تک لٹکائے رہو گے جمیل؟ اُسے اپنے آپ سے متنفر کرنے کی خاطر تمہیں کہیں نہ کہیں تو دل لگانا پڑے گا، کوئی ایسا ذرا مہر تریب دینا ہو گا جسے دیکھ کر جین محسوس کر سکے کہ تم بھی جم کی طرح کسی وقت اپنی منزل کا رخ بدل سکتے ہو..... تمہیں کلدیپ کی آتما کو شانت رکھنے کی خاطر کوئی نہ کوئی ایسا راستہ ضرور اختیار کرنا ہو گا جو جین کے دل میں



تمہاری محبت کو نفرت کے رُوپ میں تبدیل کروے.....“

”جین بڑی حساس، بڑے نازک دل کی مالک ہے۔ میں نے بے وفائی کا اظہار کیا تو اُس کا دل ٹوٹ جائے گا، ہو سکتا ہے وہ کوئی انتہائی قدم اٹھا لے۔“ میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ”تم میرے حالات سے واقف ہو، اس وقت میں بے سہارا ہو گیا تھا جب کلدیپ کالی کو دیئے ہوئے عہد کو پورا کرنے کی خاطر میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی، میری دنیا اندھیر ہو گئی، مجھے کچھ نہیں سمجھائی دیتا تھا، میں دیوانہ ہو گیا۔ میں نے سید مجذوب کو بھی ناراض کر دیا۔ میں نے موت کی تمنا کی لیکن موت بھی میری زندگی کا مذاق اُڑانے پر تلی ہوئی تھی، وہ جمیل احمد خان جس نے اپنے بدترین دشمن بدری نرائن کو کالی کے مہمان سیوک امر لال کی موجودگی میں کتوں جیسی موت مارا تھا۔ کالی کے بڑے مندر میں میرے جانے سے کھلبلی مچ جاتی تھی، پتھر کے بتوں کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ جاتی تھیں۔ بڑے بڑے پنڈت، پجاری اور سادھو میرا نام سن کر لرزنے لگتے تھے۔ تم گواہ ہو انکارانی جب تم تربیتی کے سر پر تھیں اُس وقت بھی میرے جنون میں کوئی نمایاں کمی نہیں آئی۔ تمہاری بات اور ہے، تم لازوال قوتوں کی مالک ہو لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں نے تمہارے ہونے نہ ہونے کی پرواہ بھی نہیں کی۔ جو بھی میری راہ میں آیا اُسے خس و خاشاک کی طرح پیروں تلے روندنا چلا گیا، کلدیپ میری زندگی کا آخری سرمایہ تھی۔ جب اُس نے بھی منہ موڑ لیا تو میں نے صرف موت کی تمنا کی تھی۔ سید مجذوب کی متبرک لاشی کے سوا میں نے تمام ہتھیار ڈال دیئے، اپنے دل پر جبر کر کے تمہیں بھی اپنے وجود سے علیحدہ کر دیا۔ بمبئی کی فٹ پاتھ پر موت کی تلاش میں بھٹکتا رہا، حقیر کیڑوں جیسے چھوٹے موٹے افراد بھی مجھے دیکھ کر قہقہے لگاتے تھے۔ میں زبان کھول دیتا تو پوری بمبئی میں بھونچال آ جاتا، ہر شے تھس تھس ہو جاتی۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا، مجھے موت کی آرزو تھی۔ رات دن پتھریلی فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑتے رگڑتے میرے زخموں نے ناسور کی شکل اختیار کر لی۔ میرے وجود سے ابھرنے والا تعفن راہ گیروں کو میرے قریب آنے سے روکنے لگا، وہ ناک پر زوال رکھ کر مجھ سے کترا کر گزر جاتے تھے۔ ایسے میں جین ہزاروں میل کا سفر طے کر کے مجھے تلاش کرتی ہوئی ہندوستان آ گئی، اُس نے جمیل احمد خان کو ایک نیم وحشی اور دیوانے کے رُوپ میں اذیت ناک حالات سے دوچار دیکھا تو اُس کی غزالی آنکھوں میں نفرت کا احساس نہیں جا گا۔ وہ اپنے جوان

مہکتے جسم اور حسن کی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ دوڑ کر دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئی، اپنی ہانہوں میں سمیٹ لیا، اپنے سینے کی کشادگی میں چھپا کر وہ مجھے ہندوستان سے لندن لے آئی۔ میں جو اُس کا محبوب تھا، جس کی خاطر اُس نے دنیا جہان کی خوشیاں حرام کر لی تھیں۔ میں اُس کی قربانیوں کو اتنی آسانی سے کیسے فراموش کر دوں؟ اُس نے میری بے وفائی کے غم میں موت کو گلے لگا لیا تو میں اپنے آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟“

”میں تمہاری مجبوری سمجھ رہی ہوں جمیل۔“ انکا نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر کچھ توقف نے دبی زبان میں بولی۔ ”تم جم کو کیوں فراموش کر رہے ہو.....؟“

”میں سمجھا نہیں.....؟“ میں نے انکا کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”جم بھی کبھی جین کا دم بھرتا تھا۔ اُس وقت تم درمیان میں آ گئے۔ جرمنی کی مہم میں جین کے حسین اور جوان قرب نے تمہیں ریشہ حطی بنا دیا۔ میں نے تمہاری خاطر جم کی محبت کا رُخ سارا کی جانب پھیر دیا۔ آج وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمیں جین کے سلسلے میں بھی ایسا ہی کوئی منصوبہ بنانا پڑے گا۔ اس کی جذباتی محبت کے تیز بہاؤ کا رُخ کسی مناسب نو جوان کی طرف موڑنا ہو گا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا۔ ورنہ جیسے جیسے وقت اور دن گزرتے جائیں گے، اُس کے دل میں تمہاری محبت کا پودا تناور درخت کی شکل اختیار کرتا جائے گا۔“

”تم..... تم شاید ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے مضصل آواز میں انکا کے مشورے کی تائید کی۔

”مجھ پر اعتماد کرو جمیل۔“ انکا نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”میں کوئی مناسب وقت اور موقع دیکھ کر ایسا قدم اٹھاؤں گی کہ تمہاری جین کی زندگی بھی محفوظ رہے اور اُس کا گھر بھی آباد ہو جائے۔“

جین تیار ہو کر آئی تو ناشتہ شروع ہو گیا۔ وہ بظاہر ناشتہ کر رہی تھی مگر اُس کی نظریں بار بار میری جانب اٹھ رہی تھیں۔ ان مخمور نگاہوں میں رات کا نشہ ابھی تک چمک رہا تھا، مستقبل کے ارمان مچل رہے تھے۔ انکا ہم دونوں کو دلچسپ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے چونک کر خلاء میں دیکھا اور تیزی سے ریج کر میرے سر سے اتر گئی۔

”پنک کے سلسلے میں سارا کو تمہارا کیا جواب دوں؟“ جین نے مجھے چھینرنے کی خاطر معنی خیز نظروں سے گھورا۔

اغواء کیا جانا تھا۔“ جین کا چہرہ تھمتانے لگا۔ ”میں سمجھی تھی کہ تم مذاق کر رہے ہو۔ لیکن جب جم نے فون پر تمہاری بات کی تصدیق کی تو میں حیرت سے اُچھل پڑی۔ وہ سب کچھ بڑا حیرت انگیز تھا۔ میں ششدر رہ گئی تھی۔ آج وہ ساری باتیں مجھے خواب لگتی ہیں۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جین کے بیان پر اُس کی ماں کے چہرے پر اضطراب کی کیفیتیں اور نمایاں ہو گئیں۔ ماریا نے پہلی بار مجھے بہت غور سے دیکھا، وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔

”دولت علی“ جین روانی میں بولتی چلی گئی۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم نے اس وقت مورگن کا ذکر بلاوجہ نہیں چھیڑا ہوگا۔ مجھے یہ محسوس کر کے خوشی ہو رہی ہے کہ تمہاری حالت پہلے سے بہت بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ کیا تم مورگن کے سلسلے میں بھی کوئی حیرت انگیز انکشاف کرنے والے ہو.....؟ اگر ایسا ہوا تو کم از کم مجھے کوئی تعجب نہیں ہوگا۔ البتہ ماریا خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔“

اسی وقت انکا میرے سر پر واپس آ گئی۔ وہ بڑی مطمئن نظر آ رہی تھی۔

”سر.....“ ماریا نے جین کی بات سن کر میری سمت ملتی نظروں سے دیکھا۔ ”کیا آپ مجھے مورگن کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟“

”ایسی احقانہ باتیں مت کرو۔“ جین کی ماں نے ماریا کو گھورا۔ ”مسٹر دولت علی بتا چکے ہیں کہ ان کی روحانی قوتیں کسی وجہ سے چھن چکی ہیں۔“

”بہت خوب.....“ انکا دیدے منکانے لگی۔ ”میں ایک منٹ کو سر سے اُتری اور تم نے ماریا سے بھی چکر چلا دیا۔“

”کہاں گئی تھیں؟“

”تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے۔“ انکا نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”جیکب خاموشی سے اپنا سامان لپیٹ کر یہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔ جاتے وقت اُس نے میرے اشارے پر اپنی ایک تحریر بھی جین کے نام چھوڑی ہے۔ اُس نے اقرار کیا ہے کہ خزانہ بڑھیا نے اُسے تمہارے قتل پر اُکسایا تھا۔ اس لئے وہ باوجود دال، فے، عین ہو رہا ہے.....“

”وہ تحریر کسی اور کے ہاتھ لگ گئی تو.....؟“ میں نے ایک مکث خدشے کا اظہار کیا۔

”پریشان مت ہو۔“ انکا بڑے اعتماد سے بولی۔ ”جین دفتر جاتے وقت کسی کام سے

”اُس نے اگر مدعو کیا ہے تو میں سر کے بل چلوں گا۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”تمہارا آج کا کیا پروگرام ہے؟“

”میں جو مشقیں کر رہا ہوں ابھی اس میں تھوڑا وقت اور لگے گا۔“ میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا، پھر ماریا کی سمت دیکھ کر بولا۔ ”کیا مورگن کی ابھی تک کوئی خیر خبر نہیں ملی؟“

”جی نہیں.....“ ماریا نے دہلی زبان میں جواب دیا۔ جین کی ماں نے مجھے تیز نظروں سے گھورا، شاید اُسے اس وقت میرا ماریا سے مورگن کے سلسلے میں دریافت کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔ جین ناشتے میں مصروف رہی۔ میں نے مفلوج بڑھیا کو نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ ماریا کو مخاطب کیا۔ ”تم نے کبھی مورگن کے گھر والوں سے اُس کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی.....؟“

”وہ ہماری شادی کے خلاف تھے اس لئے میں نے مورگن کے بعد اُن سے ملنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔“ ماریا کے لہجے میں کسک شامل تھی۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ تین سال بعد بھی کسی روز اچانک.....“

”مسٹر دولت علی.....“ جین کی ماں نے مجھے بڑے زور کے انداز میں ٹوکا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں ماریا اور مورگن کے سلسلے میں زیادہ چھان بین کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ان دونوں کا ذاتی معاملہ ہے۔“

”آپ نے درست فرمایا۔“ میں نے سنبھل کر جوابی حملہ کیا۔ ”مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ کبھی جیکب نے اگر میرے اور جین کے معاملے میں دخل اندازی کی حماقت کی تو مجھے بھی یقیناً اُس کی مداخلت ناگوار گزرے گی۔“

جین کی ماں جیکب کے حوالے پر میرا جملہ سن کر اس طرح چونکی جیسے نقب زنی کرتے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔ جین نے جلدی سے ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کی خاطر مجھے مخاطب کیا۔

”میں تو بھول ہی گئی تھی کہ تم نے برلن میں کس قدر ناقابل یقین اور حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا تھا۔ مجھے یاد ہے جب تم نے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے آنکھ بند کر کے کہا تھا کہ ہمارا مطلوبہ سائنسدان اپنی مرضی سے اس جہاز میں جا کر بیٹھ گیا ہے جس میں اُسے

جیکب کے کوارٹر میں جھانکنے گی۔ اور وہ تحریر اُس کے ہاتھ آجائے گی۔“

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“ ماریا نے مجھے خاموش دیکھ کر دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

میں نے جواب دینے کی بجائے آنکھیں بند کر لیں۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اپنی روحانی قوتوں کے ذریعے مورگن تک رسائی کی کوششوں میں مصروف ہوں۔ چند لمحے یونہی پیشہ وارانہ انداز میں بیٹھا ہونٹ ہلاتا رہا، پھر انکا سے مورگن کے پیارے میں حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں آنکھیں کھول کر ماریا سے کہا۔

”مورگن ملک چھوڑ کر کہیں باہر نہیں گیا..... اس وقت بھی وہ تمہاری دسترس سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

”یہ..... یہ ناممکن ہے سر۔“ ماریا ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ ”وہ اگر کہیں قریب ہوتا تو مجھ سے ملنے ضرور آتا۔“

”ایک مجبوری اُس کے پیروں کی زنجیر بن گئی ہے۔“ میں نے ماریا کی بے چین آنکھوں میں دُور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں اُسے یہاں آنے پر آمادہ کر سکتا ہوں لیکن ایک شرط پر۔ تمہیں پرانی باتوں کو بھولنا ہوگا، اُس کی غلطیوں کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ خوشگوار زندگی گزارنے کی خاطر ساری کوتاہیوں کو درگزر کرنا ہوگا۔ تم جتنی باتوں کو کبھی دہرانے کی غلطی نہیں کرو گی۔“

”بہت اچھے جا رہے ہو جمیل صاحب.....“ انکا منک کر بولی۔ ”میری مانو تو دنیا کے سارے کھٹ راگ چھوڑ کر یہی دھندا شروع کر دو، میں تمہارے ارد گرد آنکھ کے اندھوں اور گانٹھ کے پوروں کا جم غفیر لگا دوں گی، ویسے بھی یہ سفید چمڑی والے جو آٹو کو ذہانت اور خوش بختی کی علامت سمجھتے ہیں کسی ہندوستانی سے زیادہ کچے عقیدوں کے مالک اور توہم پرست ہوتے ہیں۔“

”کیا غلطی سر زد ہو گئی ہے مورگن سے.....؟“ ماریا پریشان ہو گئی۔ ”خدا بخواتم وہ کسی مصیبت میں تو گرفتار نہیں ہو گیا؟“

”تم صرف اُسے معاف کر دینے کا وعدہ سچے دل سے کرو، میں اُسے دو روز کے اندر اندر تمہارے پاس واپس بلا سکتا ہوں۔“

”میں تیار ہوں مسٹر دولت علی.....“ ماریا پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ ”میں اُسے کچھ نہیں کہوں گی، مجھے اُس سے محبت نہ ہوتی تو تین سال تک اُس کے انتظار میں نہ بیٹھی رہتی۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے ٹھوس لہجے میں اُسے یقین دلایا۔ ”مورگن دو روز بعد تمہاری نظروں کے سامنے ہوگا۔“

”اگر تم صرف ماریا کو بھلانے کی خاطر ایک سنجیدہ مذاق کر رہے ہو تو یہ اچھی بات نہیں ہے۔“ جین کی ماں نے ہونٹ چباتے ہوئے قدرے تلخ لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ”میں نے دنیا دیکھی ہے، بہت سارے غم برداشت کئے ہیں، خوشیوں کی تلاش میں ان پروفیسروں اور روحانی عمل کرنے والوں سے بھی ملی ہوں جو ہر دکھ کا بشرطیہ علاج کرنے کا بلند بانگ دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ وہ سب فراڈ ہیں۔ اسٹیج پر اُچھل کود کرنے والے عام مداریوں اور جھگڑوں کے علاوہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، جو کروں کی ٹوپی سے دس بارہ کبوتر نکال دینا، ایک رنگ کے رُومال کو کئی رنگوں کے رُومالوں میں ظاہر کر دینا، یہ سب کچھ شعبہ بازی ہے، نظر بندی ہے۔ یہ لوگ صرف انسانی نفسیات سے کھیلنے میں مشغول ہوتے ہیں، دوسروں کو اپنی لہجے دار باتوں کے سحر میں الجھا کر اتنا مرعوب کر دیتے ہیں کہ انسان ان کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔“

”لیکن دولت علی کا شمار ان فراڈ پروفیسروں کی فہرست میں نہیں کیا جاسکتا۔“ جین نے ناشتے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے اپنی خفگی کا برملا اظہار کیا۔ ”میں نے دولت علی کے حیرت انگیز کمالات اپنی نظروں سے دیکھے ہیں۔ جرمن سائنسدان کا اغواء شعبہ بازی یا جھگری نہیں تھی، دولت علی نے ہوٹل کے بند کمرے میں بیٹھے بیٹھے اپنی روحانی قوتوں کے ذریعے اسے جم کے پاس پہنچا دیا تھا۔ اخبار کے وہ تراشے آج بھی میرے پاس بطور سند محفوظ ہیں جس کی حقیقت نے تہلکہ مچا دیا تھا، بڑے بڑے ماہر سراغ رساں انگشت بدندان رہ گئے تھے۔“

جین جذباتی ہونے لگی۔ میں نے انکا کواشارہ کیا، وہ میرے سر سے اتر گئی۔ جین کے چہرے پر خون کی تمازت بتدریج کم ہونے لگی۔ ”سوری می.....“ اُس نے اپنی نشست سے اٹھ کر ماں کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے شرمندگی کا اظہار کیا۔ ”میں روانی میں کچھ زیادہ ہی بول گئی۔ لیکن میں نے جو کچھ کہا وہ غلط نہیں تھا۔“

”اٹ ازل رائٹ بے بی.....“ جین کی ماں نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ جین مجھے معذرت طلب نظروں سے دیکھتی ہوئی دفتر کے لئے روانہ ہو گئی۔ ماریا ماحول کا رنگ بدلتا دیکھ کر شش و پنج میں گرفتار تھی۔ میں نے چائے کا آخری گھونٹ حلق کے نیچے اتار کر اٹھنا چاہا تو جین کی ماں نے روک لیا۔

”دولت علی۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ اُس نے خلاء میں گھورتے ہوئے سپاٹ لہجہ اختیار کیا۔ ”میرا خیال ہے کہ جین نے تمہیں میرے ماضی کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا ہوگا، اُس ضمن میں مجھے تمہاری کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ایک ماں کی حیثیت سے میں نے جین کے مستقبل کے لئے کچھ حسین خواب ضرور دیکھے ہیں۔ مجھے یہ حقیقت تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ہمارے معاشرے میں ایک خاص عمر کو پہنچ جانے کے بعد ہر فرد واحد کو شخصی آزادی کا حق حاصل ہو جاتا ہے، کوئی کسی پر اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتا، ہر شخص اپنے عمل، قول و فعل کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ جین اس عمر سے بہت آگے گزر چکی ہے لیکن وہ عام لڑکیوں سے بڑی مختلف ہے۔ کسی بے جان کھلونے سے بھی بے حد متاثر ہو جانا اس کی معصومیت کی دلیل ہے۔ اسے انتہا پسند نہیں کہا جاسکتا۔ مگر اُس کی کوئی عزیز شے اگر اُس سے چھن جائے تو اس کے دل پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے، وہ خود کو بڑی آسانی سے دوسروں پر اعتماد کر لینے پر آمادہ کر لیتی ہے۔ میں اس عادت کو جین کی زندگی کا منفی پہلو قرار دوں گی، جم کے سلسلے میں وہ ایک بار پہلے بھی فریب کھا چکی ہے۔ میں اس وقت جین کے پاس نہیں تھی، اُس کے حالات کا علم مجھے ہوتا رہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایک بار ٹھوکر کھالینے کے بعد وہ دوبارہ کوئی حماقت نہیں کرے گی۔“

جین کی ماں نے مجھے گہری نظروں سے گھورا، پھر ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

”جب وہ مجھے اپنے پاس یہاں لائی تو اُس نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا، وہ تم سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ ایسا ہوتا ہے، کوئی بچہ جب پہلی بار فائر ورک (آتش بازی) دیکھتا ہے تو فضا میں ہلکے ہلکے دھماکوں کے ساتھ بکھرنے والے خوبصورت حسین رنگوں کی آمیزش اور ان سے وجود میں آنے والی مختلف شکلیں اُسے مبہوت کر دیتی ہیں، اُس کے دل پر نقش ہو جاتی ہیں۔ وہ ہر سال اسی موقع کا منتظر رہتا ہے۔ سب کچھ اُسے دُور سے بہت اچھا لگتا ہے لیکن وہ بارود کی اہمیت سے ناواقف ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ بارود کسی

بڑی تباہی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ میں نفسیات کی ماہر نہیں ہوں پھر بھی اتنی سوجھ بوجھ رکھتی ہوں کہ بچوں کو جس کام سے روکا جائے وہ اس کی غرض و غایت کو جاننے کی زیادہ کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ تم اسے انسانی فطرت بھی کہہ سکتے ہو۔“

ماریا جو میری زبانی مورگن کے بارے میں سن لینے کے بعد مزید جاننے کو بڑی مضطرب تھی، جین کی ماں کی پشت پر کھڑی اپنی بے بسی پر ہونٹ چبانے میں مصروف تھی، میں سمجھ رہا تھا کہ جین کی ماں کس بات کی تمہید باندھ رہی تھی، انکا مجھے اس کی اصلیت سے آگاہ کر چکی تھی۔ میں چاہتا تو اُس کی اصلیت بے نقاب کر کے اپنے اشاروں پر بھی نچا سکتا تھا۔ مگر میں نے صبر و تحمل سے کام لیا، مجھے کسی مناسب موقع کی تلاش تھی۔

”کیا تم میرے ایک سوال کا جواب نہیں دو گے؟“ اُس نے کچھ توقف کے بعد سرسراتے لہجے میں کہا۔

”جین میری محنت ہے میڈم اور آپ اُس کی ماں ہیں۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ آپ کو یا جین کو میری ذات سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔“

”مجھے اپنے نقصان ہے زیادہ جین کا مستقبل عزیز ہے۔“

”میں اس ضمن میں کیا خدمت کر سکتا ہوں.....؟“ میں نے اپنی نشست پر پہلو بدلا۔

”جین تم سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔“ جین کی ماں نے ہاتھ مسلتے ہوئے بڑے ناخوشگوار انداز میں کہا۔ ”وہ تم سے شادی کی خواہشمند ہے۔“

”آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں.....؟“ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔

”ہو سکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو لیکن میرا خیال ہے کہ تمہارا اور جین کا جوڑنا مناسب رہے گا۔“ اُس نے الفاظ چباتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”پھر؟..... آپ نے اس کا کیا توڑ مناسب سمجھا ہے؟“ میں نے چھپتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ وہ میرے جملے کی ساخت سے ایک لمحے کو چوکی، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

”صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو میں جین کی دنیا سے دُور چلی جاؤں یا پھر تم شادی سے انکار کر دو۔“

میں نے ایک لمحے کو ماریا کے چہرے پر نظر ڈالی، وہ جین کی ماں کا جملہ سن کر شینا گئی تھی،



نہیں ہوتے، میری صورت شکل کچھ ایسی بری بھی نہیں کہ مجھے اپنی زندگی کے لئے کسی نئے ہمسفر کی تلاش میں کوئی دشواری پیش آتی لیکن مورگن میرا محبوب ہے۔ میں نے اُسے چاہا ہے، پھر اُس کی یاد کو کھرچ کر دل سے کس طرح دُور کر سکتی ہوں؟ کسی کی دل شکنی بڑا عظیم گناہ ہے سر۔ آپ بڑی میڈم کی بات ماننے سے انکار کر دیں۔“

”ماریا.....“ مکار بڑھیا نے مجھے ماریا کی طرف متوجہ پا کر اُسے سرد آواز میں ہم دیا۔ ”تم ناشے کے برتن اٹھا کر کچن میں جاؤ۔“ ماریا خاموشی سے ناشتے کے برتن سمیٹنے لگی۔ جین کی ماں آہستہ آہستہ مجھ پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہی تھی، میں درگزر سے کام لے رہا تھا۔ وہ اُسے میری مجبوری اور بے بسی سے تعبیر دے رہی تھی۔

”دولت علی۔“ ماریا کے چلے جانے کے بعد اُس نے وہیل چیئر پر کچھ اور آگے کی جانب جھکے ہوئے بڑے پیار سے مجھے چارہ ڈالا۔ ”میں نے اتنے دنوں میں محسوس کر لیا ہے کہ تم مضبوط قوت ارادی کے مالک ہو، تم نے کہا تھا کہ وقتی طور پر تمہاری روحانی قوتیں تم سے چھن چکی ہیں لیکن اس کی تھوڑی بہت رقی اب بھی تمہارے وجود کی گہرائیوں میں کہیں ضرور سلگ رہی ہے، شاید اسی لئے تم نے مورگن کے سلسلے میں بڑے اعتماد سے پیشینگوئی کی ہے، میں تمہاری صلاحیتوں کی قدر کرتی ہوں، تم ایک دُور اندیش اور معاملہ فہم انسان ہو..... مجھے یقین ہے کہ تم جین کے سلسلے میں میری باتوں پر مفاہمتی انداز میں غور کرو گے، میں تم سے ایک درخواست اور کروں گی..... اس وقت میرے اور تمہارے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے اس کا علم جین کو نہیں ہونا چاہئے۔“

”ماریا کی ذمہ داری کون لے گا؟“ میں اُس کی حماقت پر دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ ”وہ بھی ہماری گفتگو سن چکی ہے۔“

”تم ماریا کی فکر مت کرو۔“ اُس نے وہیل چیئر کی پشت سے ٹپک لگاتے ہوئے بڑے اعتماد اور یقین سے کہا۔ ”میں ملازموں سے ایک محدود فاصلہ رکھنے کی قائل ہوں۔ ماریا میرے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرے گی، اُس کی کچھ کمزوریاں میری مٹھی میں ہیں۔“ آخری جملہ ادا کرتے وقت اُس کی آنکھوں میں شیطانی مسکراہٹ ابھر کر پہچانی جلی گئی۔ میں کوئی معقول جواب کے بارے میں سوچ رہا تھا جب میرے کمرے سے فون کی کھنٹی کی آواز ابھری۔ جین نے خاص طور پر فون کا ایک علیحدہ کنکشن میرے لئے حاصل کیا

اُس کی غزالی آنکھوں میں ابھرنے والا تاثر اس بات کی ترجمانی کر رہا تھا کہ وہ جین کی ماں کی باتوں سے متفق نہیں تھی۔ میں نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر بڑے غور و خوض کے بعد کہا۔ ”میڈم۔ میں جین کے جذبات و احساسات سے پوری طرح واقف ہوں، وہ مجھے جنون کی حد تک چاہتی ہے، نہ چاہتی تو مجھے تلاش کرنے کی خاطر ہندوستان کے شہروں اور گلی کوچوں کو کبھی نہ کھنگالتی۔ میں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کروں گا کہ مالی اعتبار سے میں جین کے قدموں کی دھول بھی نہیں ہوں۔ میں ایک تنہا اور لاوارث شخص ہوں جس کا ماضی بھی خطروں سے بڑھا اور مستقبل بھی اندیشوں کی لپیٹ میں ہے، مجھے زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں رہ گیا تھا، میں مرجانا چاہتا تھا جب جین نے اچانک سامنے آ کر مجھے سہارا دیا۔ میں اُس کی خواہش کو رد نہ کر سکا، اُس کے ساتھ لندن آ گیا لیکن.....“ میں نے دیدہ و دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”لیکن کیا دولت علی؟ تم کچھ کہتے کہتے رک کیوں گئے؟“ وہ مکار بڑھیا میری سچ بیانی کو میری کمزوری سمجھ کر منہ زور ہونے لگی۔ ”اگر تم سمجھتے ہو کہ تم اس اسٹیٹس کے مالک نہیں ہو جو جین کے مستقبل کو زندگی کی بہترین نعمتیں، خوشیاں اور تحفظ فراہم کر سکے تو تمہاری بڑائی اسی میں ہے کہ تم خاموشی سے اس کے راستے سے علیحدہ ہو جاؤ.....“

”میں نے اس بارے میں ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا، لیکن اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ آپ جین کے بارے میں جو کچھ سوچ رہی ہیں وہ غلط نہیں ہے۔“

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری باتوں کا برا نہیں مانا۔“ میرے جواب سے اُس کا چہرہ فاتحانہ انداز میں تمتانے لگا۔ ”یہ بڑی بات ہے کہ تم مثبت انداز میں مسائل کی تحلیل نفسی کرنے کے قائل ہو۔“

میری نگاہیں پھر ماریا کی سمت اٹھ گئیں۔ میں جلد بازی میں جین کی ماں کو آہٹنے میں اُس کی شکل نہیں دکھانا چاہتا تھا، میری نظریں ماریا سے ٹکرائیں تو اُس کی نظریں بول اٹھیں۔ ”نہیں سر..... کسی چاہنے والے کا دل توڑ دینا نیک عمل نہیں ہو سکتا، میں جانتی ہوں کہ چھوٹی میڈم آپ کو ٹوٹ کر پیار کرتی ہیں۔ انہوں نے آپ کو اپنے دل کے اندر سجا رکھا ہے، آپ نے بڑی میڈم کی بات مانی تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں بھی عورت ہوں۔ عورت، عورت کے دُکھ درد کو سمجھتی ہے۔ میری مثال آپ کے سامنے ہے۔ تین سال کچھ کم

تھا تا کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کوئی تیسرا شخص نہ سن سکے۔ میں کسی خیال سے چونکا، پھر لپکتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ فون پر حسب توقع دوسری جانب سے جین ہی کی آواز ابھری۔

”ابھی تو تم گھر سے گئی ہو، اتنی جلدی کیا کام پیش آ گیا؟“ میں نے جین کی الجھی ہوئی آواز سے اندازہ لگا لیا کہ اُسے جیکب کا خط مل چکا ہے، انکا بھی شاید اُسی کے سر پر بھی جو ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔

”مئی کہاں ہیں.....؟“ جین نے پوچھا۔

”ابھی میرے ساتھ ناشتے کی میز پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔“ میں نے جین کے لب و لہجے سے اُس کی قلبی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم اُن سے بات کرنا چاہتی ہو.....؟“

”نہیں، م..... میں تمہیں صرف ایک مشورہ دینا چاہتی ہوں۔“ اُس نے جذباتی انداز اختیار کیا۔ ”جب تک میں واپس نہ آؤں تم محتاط رہنا۔ میرا مطلب ہے کہ اگر اپنے کمرے تک محدود رہو تو زیادہ مناسب ہوگا، یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے واپسی میں کچھ دیر بھی ہو جائے۔“

”کیا بات ہے جین.....؟“ میں نے سنجیدگی اختیار کی۔ ”تمہاری آواز بتا رہی ہے کہ تم کچھ گھبرائی ہوئی ہو۔“

”ہاں..... ایک دُشواری پیش آ گئی جس نے وقتی طور پر مجھے الجھا دیا ہے۔“ جین نے دبی زبان میں اعتراف کیا۔

”کیا میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں.....؟“

”نہیں۔“ اُس نے تیزی سے جواب دیا۔ ”اب میں اس قابل ہو گئی ہوں کہ چھوٹے موٹے معاملات کو خود ہی نمٹا سکوں۔ واپسی پر تم سے تفصیلی بات ہوگی۔“

”ون منٹ.....“ میں نے کہا۔ ”تم نے مجھے صرف کمرے تک محدود رہنے کا مشورہ کیوں دیا ہے؟ کیا مجھے کوئی خطرہ لاحق ہے؟“

”آئی ایم سوری دولت علی میں فون پر زیادہ گفتگو نہیں کر سکتی۔“

”میرا خیال ہے کہ تم کوئی اہم بات مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔“ میں نے جان بوجھ کر شکوہ کیا۔

”اپنی جین پر اعتماد رکھو.....“ دوسری طرف سے ریسپور چونے کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی جین کی آواز سنائی دی۔ ”تمہاری خاطر میں کبھی کسی قربانی سے گریز نہیں کروں گی۔“

”لیکن.....“

”میں بہت جلدی میں ہوں۔ واپسی پر اطمینان سے بات کروں گی۔“ جین نے میری بات کاٹ دی۔ اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

میں نے جھانک کر باہر کی جانب دیکھا، ماریا اور جین کی ماں ناشتے کی میز پر نہیں تھیں۔ میں اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا، مجھے جین کی فکر لاحق تھی۔ جیکب کی تحریر دیکھنے کے بعد اُس کا رد عمل کیا ہوا ہوگا؟ فون پر اُس نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ اُسے کوئی دُشواری پیش آ گئی ہے۔ وہ دُشواری جیکب کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی؟ اُس نے مجھے اپنے کمرے تک محدود رہنے کا مشورہ دیا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اُسے اس بات کا خدشہ پہلے سے تھا کہ میرے سلسلے میں اُس کی مفروضہ ماں کوئی بھی خطرناک قدم اٹھانے سے گریز نہیں کرے گی، محض جیکب کی تحریر اُس کی تشویش کا سبب نہیں ہو سکتی تھی۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ جب وہ جین کی ماں کے منصوبے کا بھانڈا پھوڑ کر راستے سے علیحدہ ہو گیا تھا۔

فون پر جین کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے جملے میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ انکا، جین کے سر پر تھی اس لئے مجھے کوئی تشویش نہیں تھی۔ وہ اپنی پراسرار قوتوں سے حالات کا منہ موڑ سکتی تھی۔ اُسے علم تھا کہ میں جین کے سلسلے میں اُس کی کسی حماقت کو برداشت نہیں کروں گا۔ میرے حوالے سے وہ جین کی حفاظت کرنے کی پابند تھی۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ وہ جیکب کے سلسلے میں کسی سنگدلی کا مظاہرہ کر بیٹھتی۔ وقت بڑی ست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ میرے ذہن میں ابھرنے والے وسوسوں کی پرواز وقت کے مقابلے میں زیادہ تند و تیز تھی۔ انکا نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں جین کی محبت کا رخ کسی اور جانب موڑ دوں۔ انکا میرے لئے یہ خدمت پہلے بھی انجام دے چکی تھی۔ انکا کے لئے جین کی توجہ کسی دوسری سمت تبدیل کرنا بھی مشکل نہیں تھا، پریم لال نے چند را کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا میں اُن کی طرف سے غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس مہمان پجاری نے مجھے بتایا تھا کہ بدری نرائن کے کچھ سر پرے چیلے مجھے گھبرانے کی خاطر سر جوڑے منصوبے بنا رہے ہیں۔ ان احمقوں نے کالی کے چرنوں میں ڈنڈوت کر کے یہ عہد کیا تھا کہ جب تک میرے وجود کو ختم

نہیں کر دیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ میں اگر ان پنڈت پجاریوں سے منہ چھپائے لندن میں بیٹھا رہتا تو یہ کلدیپ کے سارے جیون کی تپسیا کی توہین ہوتی۔ اُس نے میری خاطر اپنی زندگی بھینٹ دی تھی، میں اُس کی رُوح کو سکون پہنچانے کی خاطر پورے ہندوستان کے پنڈت پجاریوں کو تہس نہس کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ پر تپم لال نے کہا تھا کہ کچھ دنوں موج میلہ کر لو، پھر کلدیپ کے چھوڑے ہوئے ادھورے کام کی تکمیل کرنی ہوگی۔ چندرا کے لئے میں نے کچھ اور ہی سوچا تھا۔ وہ میرے دشمن اور کالی کے مہان سیوک امر لال کا اکلوتا لڑکا تھا، مجھے امر لال کی قوت اور اُس کے عتاب سے بچانے کی خاطر کلدیپ نے جیون بلیدان کیا تھا۔ میں چندرا کو انتقاماً سسکا سسکا کر مارنے کے منصوبے بناتا رہا۔ انکا کا مشورہ غلط نہیں تھا، لندن چھوڑنے سے پیشتر مجھے جین کے مستقبل کے تحفظ کی خاطر کسی پائیدار جیون ساتھی کا بندوبست کرنا شرط تھا۔ میں اُسے بچ منجھار میں بے سہارا چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔

دو پہر کھانے کی میز پر جین کی والدہ کے چہرے پر فکرو پریشانی کے ڈونگرے برس رہے تھے۔ شاید اُسے جبک کے اچانک چلے جانے کی اطلاع مل چکی تھی، وہ یقیناً اس کی وجہ جاننے کے لئے مضطرب ہوگی۔ ماریا بھی کچھ ابھی ابھی نظر آ رہی تھی۔ وہ مجھ سے مورگن کے سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی خاطر بے چین تھی۔ میرے ذہن میں جین کا مستقبل کلبلا رہا تھا۔ میں سر جھکائے کھانے میں مصروف تھا جب جین کی ماں نے مجھے مخاطب کیا۔

”دولت علی۔ کیا تمہیں علم ہے کہ جبک اچانک اپنا ساز و سامان سمیٹ کر چلا گیا ہے؟“  
 ”نہیں۔“ میں نے لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔ ”ناشتے کے بعد سے میں اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا۔“

”تم نے مورگن کے بارے میں بڑے یقین سے کہا تھا کہ وہ دو دن بعد ہمارے درمیان ہوگا۔“

”ہاں.....“ میں نے شانے اچکا کر جواب دیا۔ ”میرا علم یہی کہتا ہے کہ وہ ضرور واپس آئے گا۔“

میرا جواب سن کر ماریا کے چہرے کے تاثرات کچھ اور گہرے ہو گئے۔ جین کی ماں اپنی

جیل چہرے پر کسمسا کر بولی۔  
 ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ جبک نے کسی سے کچھ کہے بغیر چوری چھپے چلے جانے کی حماقت کیوں کی؟“  
 ”ممکن ہے اُسے کوئی بہتر کام مل گیا ہو۔“

”ہاں، ہو سکتا ہے کہ کسی نے اُسے زیادہ پیسوں کا لالچ دے کر اُس کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی ہو۔ پیسوں کے معاملے میں وہ خاصا لالچی واقع ہوا تھا لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے یلکھت ”خاموش ہو کر ہونٹ چبانے لگی۔“  
 ”میں نہیں سمجھتا کہ جبک جسکے چلے جانے سے جین کو کوئی نقصان پہنچے گا۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔ ”مورگن بھی واپسی کے بعد اُس کی جگہ لے سکتا ہے، بشرطیکہ آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو.....“ آخری جملہ میں نے چھپتے ہوئے انداز میں ادا کیا۔ اُس نے چونک کر مجھے تیز نظروں سے گھورا۔

”مجھے کیا اعتراض ہوگا؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں کام چوری کی عادت کو برداشت نہیں کرتی۔“

”میرا بھی یہی مطلب تھا۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں بات کو اور واضح کرنے کی کوشش کی۔ ”ہو سکتا ہے کہ مورگن وہ خدمات انجام نہ دے سکے جو جبک دیا کرتا تھا..... انسان انسان میں تھوڑا بہت فرق تو ہوتا ہے۔“

”تم..... تم کیا کہنا چاہ رہے ہو.....؟“ جین کی ماں کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اُس کے دل میں چور تھا اس لئے میرے جملے پر چونکے بغیر نہ رہ سکی۔

”تمہارا کیا خیال ہے ماریا؟.....“ میں نے مسکراتی نظروں سے تذبذب کے عالم سے دوچار ماریا کی سمت دیکھا۔ ”کیا مورگن وہ سارے کام انجام دینے پر آمادہ ہو جائے گا جو جبک خوشی خوشی کیا کرتا تھا؟“

”دولت علی.....“ ماریا کے جواب دینے سے پیشتر جین کی ماں نے قدرے خفگی سے مجھے مخاطب کیا۔ ”میں سیدھی سادھی باتوں میں گھماؤ پھراؤ کو پسند نہیں کرتی۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ جب ملازم موجود ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں مورگن اور جبک کے ٹاپک کو یہیں ختم کر دینا چاہئے۔“

”مسٹر دولت علی.....“ ماریا کی سرگوشی کے انداز میں ابھرنے والی نہایت مدہم آواز میری قوتِ سماعت سے ٹکرائی۔ ”کیا آپ سو رہے ہیں؟“

”نہیں.....“ ماریا کی آواز سن کر میں آہستہ سے اٹھ بیٹھا۔ اُس کی نگاہوں میں چھلنے والے تجسس کو دیکھ کر کہا۔ ”میں اس وقت تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

”میرا انتظار.....؟“ وہ کچھ گھبرا سی گئی۔

”ہاں.....“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم موقع ملتے ہی پہلی فرصت میں مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش ضرور کرو گی۔“

”آپ کا خیال درست ہے سر۔“ اُس نے بڑی معصومیت سے میری بات کی تائید کی۔

”میں مورگن کے بارے میں بہت کچھ جانتا چاہتی ہوں۔“

میں نے جواب میں ماریا کے سراپا کو تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ وہ بہت زیادہ حسین نہیں تھی لیکن اُس کے جسم کے مناسب اور دلکش نشیب و فراز، نظروں میں چھلنے والا شوخ ہر نیوں جیسا تجسس، اُس کے مخروٹلی ہونٹوں کا گداز، چہرے کے تیکھے نقوش، جلد کی کھلتی ہوئی سفیدی مائل گندمی رنگت، سینے کا زیروہم، سانسوں کی خوشگوار مہک، سہمے سہمے بدن کا حسین احتراز سب کچھ بڑا دلواؤ تھا۔ مرد کی تنہائی میں پسینے میں ڈوبی کسی سیاہ فام دوشیزہ کا وجود بھی بڑا ہیجان خیز ہوتا ہے۔ ماریا تو پھر ایک اُبھرتا ہوا تناور درخت تھی، مورگن کے چلے جانے سے اُس کی فصلِ جوانی کی مناسب آبیاری نہیں ہو سکی تھی لیکن اُس نے اپنی ترائش خراش کا مناسب خیال رکھا تھا، خود رو جھاڑیوں کی طرح بد نما نہیں ہونے دیا تھا۔ اُس کا ایک ایک انداز زندگی کی سرمستیوں سے معمور تھا، وہ چاہے جانے کے قابل تھی، بھیکے موسم میں اس قرب کو محسوس کر کے میرے اندر اٹھل پھٹھل شروع ہو گئی۔

”اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں سر.....؟“ وہ میری نگاہوں کی پیش سے پکھننے لگی۔

محبوب انداز میں بولی۔ ”میں مورگن کے سلسلے میں بہت بے چین ہوں۔ کیا وہ دو دن بعد آ جائے گا؟“

”میں چاہوں تو وہ آ بھی سکتا ہے.....“ میں نے اُسے چھیڑنے کی خاطر کہا۔

”اُسے بلا لیجئے سر۔“ وہ مضطرب ہو گئی۔ ”تین سال کا انتظار بہت ہوتا ہے۔“

”جیکب کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟“ میں نے موضوع بدلاتا تو وہ شیشا کر بولی۔

میں نے بڑی سعادت مندی اور فرمانبرداری سے شانے اچکا کر خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ لُنج ختم ہونے تک وہ بدکردار بڑھیا کھانے کی بجائے بیچ و تاب ہی کھاتی رہی، اُس کی دزدیدہ نظریں بار بار ٹوہ لینے کے انداز میں میری طرف اٹھ رہی تھیں۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ انکا ابھی تک میرے سر پر واپس نہیں آئی تھی، مجھے یقین تھا کہ چین کی واپسی پر وہ رات خاصی ہنگامہ خیز ثابت ہوگی اس لئے میں نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں، انکا کی موجودگی میں مجھے چین کی ذات کو کوئی خطرہ لاحق ہونے کی امید نہیں تھی، البتہ چین کا ایک جملہ رہ رہ کر میرے ذہن میں چبھ رہا تھا، اُس نے مجھے محتاط رہنے اور کمرے تک محدود ہونے کا مشورہ کیوں دیا تھا.....؟

دوپہر کو سونا میرے معمولات میں کبھی شامل نہیں رہا۔ لیکن لندن کے کسی مضافاتی علاقے میں رہنے والے بخوبی واقف ہوں گے کہ وہاں کی زندگی کس قدر سادہ ہوتی ہے۔ وہ رونقیں، ہنگامے اور رنگینیاں جو کسی شہر میں عام شاہراہوں پر بھی دلوں میں ہلچل پیدا کر دیتی ہیں دیہاتی علاقوں میں کشادہ شاہراہوں پر بھی ان کا فقدان پایا جاتا ہے۔ بہر حال چین کے بارے میں سوچتے سوچتے میں شاید کچھ دیر کے لئے غنودگی کی کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا جب کوئی آہٹ پا کر میرا ذہن بیدار ہو گیا۔ میری خوابگاہ میں ملگجے اندھیرے کا راج تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو اس کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ باہر آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میں نے فوری طور پر کوئی حرکت کرنے کی حماقت نہیں کی۔ مجھے بظاہر کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا لیکن چین کی خمیٹ ماں جو جیکب کے اچانک چلے جانے سے خاصی کبیدہ خاطر اور اُلجھی اُلجھی تھی اُس کی طرف سے کسی حماقت انگیز اور جذباتی دیوانگی کا ارتکاب خالی از امکان بھی نہیں تھا۔ دوپہر کے کھانے کے دوران میرے چبھتے ہوئے جملوں سے اُسے دو اور دوچار کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی ہوگی۔ جیکب کی طرف سے واپس ہو کر اور میرے جملوں کی گہرائی پالینے کے بعد وہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر سکتی تھی۔ میں دم سادھے پڑا رہا، ممکن ہے بارش کے شور سے ہونے والی کسی آواز کو میں خطرے کی بوسجھ کر بیدار ہو گیا ہوں، اس خیال کے پیش نظر میں اپنی پوزیشن میں ایسی تبدیلی لانے پر غور کر رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ میرے سامنے آ جائے۔ مگر اس کی ضرورت نہیں پیش آئی۔



کسمانے لگی۔ شاید اُس نے میری آنکھوں میں کروٹ لیتے ہوئے طوفان کی ابھرتی ہوئی شدتوں کو محسوس کر لیا تھا۔

”سر..... آپ.....“ اُس نے احتجاجی کلمات ادا کرنے چاہے۔

”تمہاری بڑی میڈم بتا رہی تھی کہ جیکب کی طرح تمہاری بھی کوئی کمزوری اُس کی مٹھی میں ہے۔“ میں نے اُس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”وہ..... وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔“ ماریا سہم گئی۔ ”میں حالات کے آگے مجبور و بے بس ہو گئی تھی۔ وہ مورگن کا جگری دوست تھا اس لئے میں اُسے قابل اعتماد سمجھتی تھی لیکن.....“

”زندگی انہی بھول بھلیوں کا نام ہے ماریا۔ انسان کو ایک غلطی چھپانے کی خاطر دوسری غلطی کرنی پڑتی ہے۔ ایک جھوٹ بھانے کی خاطر بار بار جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے، مگر تم مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو۔ تمہارا راز ہمیشہ میرے کشادہ سینے میں دفن رہے گا۔“ میں نے ماریا کی کلائی پر گرفت مضبوط کی۔ وہ شش و پنج میں گرفتار تھی۔ میں نے اُسے سنہلنے یا سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ اُس کے مقابلے میں میرا تجربہ کئی گنا زیادہ تھا۔ باہر بارش زور پکڑتی جا رہی تھی، اندر پیاس کی شدت مجھے کسی زہریلے پھوکی طرح ڈنک مارنے لگی، ماریا کی مزاحمت میرے تجربوں کے آگے کمزور پڑتی گئی..... پر تیم لال نے مجھے موج میلہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی، سرکش جوانیوں سے کھیلنا میری سرشت میں داخل تھا، انکا اس وقت میرے سر پر ہوتی تو مجھے ماضی کی رنگینیوں کی طرف واپس پلٹنا دیکھ کر خوشی سے دیوانی ہو جاتی.....!!



جین کی واپسی سورج غروب ہونے کے بعد ہوئی۔ میں شام کی چائے پی کر باہر لان میں آکر ہلکی ہلکی خنکی سے لطف اندوز ہو رہا تھا جب جین کی کار فارم ہاؤس میں داخل ہوئی۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا اس لئے کار سے اتر کر سیدھی میری طرف آرہی تھی۔ اُس کے قریب آنے سے پیشتر انکا میرے سر پر آگئی، وہ خاصی مطمئن نظر آرہی تھی۔

”اس وقت جین کو زیادہ کریدنے کی کوشش نہ کرنا۔“ انکا نے سرگوشی کی۔ ”وہ جیکب سے زیادہ تمہاری طرف سے پریشان ہے۔“

”جیکب کا کیا بنا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”وہ اس علاقے سے جا چکا ہے، اب واپسی کی حماقت نہیں کرے گا۔ ایک ہفتے بعد تم

”آپ کیا جاننا چاہتے ہیں.....؟“

”وہ سب کچھ جو تمہارے علم میں ہو.....“ میں نے اُسے ٹولنے کی کوشش کی۔

”جیکب اچھا اور محنتی آدمی تھا سر۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا لیکن شاید وہ اپنے ماضی سے کچھ خائف بھی تھا۔“ ماریا نے تھم تھم کر کہا۔ ”ہر انسان کی اپنی کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں۔ شاید اُس کی کوئی کمزوری بڑی میڈم کے ہاتھ آگئی تھی جو وہ اُن کے اشاروں پر ناپچنے پر مجبور تھا۔“

”اُس کے اچانک چلے جانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“ میں نے سرسری انداز میں دریافت کیا۔

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی سر۔ لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ ادھر کچھ دنوں سے...“

”اُس کی بیشتر راتیں تمہاری بڑی میڈم کی خوابگاہ میں گزر رہی تھیں۔“ میں نے اُسے ہچکچاتا دیکھ کر بات مکمل کی تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔

”آپ کو سب کچھ معلوم ہے تو پھر مجھ سے.....“ وہ اس بار بھی اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی۔

شرم کے بوجھ سے پلک کر رہ گئی۔

”تم تین سالوں سے مورگن کی راہ دیکھ رہی ہو، اُس کی واپسی کی خاطر کیا قربانی دے

سکتی ہو.....؟“ میرے اندر بارش کی ٹپ ٹپ کی آواز گونجنے لگی۔

”آپ جو کہیں سر.....“ اُس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ وہ جمیل احمد خاں کے

ماضی سے ناواقف تھی جو بغیر سوچے سمجھے اقرار کر بیٹھی۔

”تمہیں مورگن کو معاف کرنا ہو گا۔“ میں نے کسی منجھے ہوئے کھلاڑی کی طرح اُس

کے اور قریب ہو کر کہا۔ ”تم اُس کے کل کے بارے میں کوئی استفسار نہیں کرو گی۔“

”مجھے منظور ہے۔“

”وہ بھی تم سے گزر رہے دنوں کا کوئی حساب نہیں طلب کرے گا۔“ میں نے ماریا کو یقین

دلایا۔ ”یہ میرا وعدہ ہے۔“

”وہ اتو جائے گا تا سر؟“ ماریا نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”آپ نے جب سے مورگن

کے سلسلے میں باتیں شروع کی ہیں، میرے اندر ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہونے لگی ہے۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی؟“

”میرے اوپر اعتبار نہیں ہے؟“ میں نے اُس کی دراز زلفوں کو شرارت سے چھیڑا تو وہ

اُس کی موت کی خبر بھی سن لو گے۔“

جین میرے قریب آ کر بے اختیار میرے سینے سے چٹ گئی، وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ میں اُس کی پریشانی کا سبب جانتا تھا پھر بھی میں نے پوچھ ہی لیا۔ ”کیا بات ہے جین؟ تمہارا فون ملنے کے بعد میں صبح سے تمہاری خاطر الجھ رہا ہوں، مجھے بتاؤ۔ میں تمہاری خاطر کیا کر سکتا ہوں؟“ میں نے انجان بن کر سوال کیا۔ ”کیا تمہاری پریشانی کا سبب جیکب تو نہیں؟ تمہاری ماں بھی اُس کے چلے جانے سے خاصی فکر مند نظر آرہی ہے۔“

”دولت علی۔ مجھ سے وعدہ کرو، تم اپنی جین پر شک نہیں کرو گے۔“ جین نے ڈڈبائی نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”آج میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ لو.....“ اُس نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ”خود اپنی نظروں سے پڑھ کر دیکھ لو کہ میری پریشانی بلاوجہ نہیں تھی، میں نے تمہیں محتاط رہنے کا مشورہ کیوں دیا تھا؟“

انکا مجھے جیکب کی تحریر کے بارے میں بتا چکی تھی پھر بھی میں نے سرسری نظروں سے اس مختصر تحریر کو پڑھا اس کے بعد مسکرا کر لا پرواہی سے بولا۔ ”جیکب اگر یہ تحریر چھوڑے بغیر خاموشی سے چلا جاتا تو شاید تمہیں اس سازش کے بارے میں کوئی علم نہ ہوتا۔“

”کیا مطلب.....؟“ جین نے مجھے چونک کر حیرت بھری نظروں سے گھورا۔ ”کیا تم.....؟“

”ہاں.....“ میں نے سنجیدگی سے اُسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”مجھے جیکب اور تمہاری مفلوج ماں کی اس سازش کا علم پہلے سے تھا۔“

”اور تم نے مجھے.....“

”میں نے ضروری نہیں سمجھا۔“ میں نے جین کو دلاسا دیا۔ ”میں جانتا تھا کہ جیکب اس سازش کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہیں کرے گا۔ رہا تمہاری ماں کا سوال تو تم اس کی طرف سے بھی مطمئن رہو۔ ایک ماں کی حیثیت سے اُس نے تمہارے مستقبل کے لئے جو خواب دیکھے ہیں وہ اُس کا حق ہے۔ جیکب کے چلے جانے کے بعد اب وہ دوبارہ میرے خلاف کوئی نیا منصوبہ بنانے کی غلطی نہیں کرے گی۔“

”تم یہ بات اس قدر یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہو؟“ جین نے مجھے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ میں کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ ماریا آگئی، وہ مجھ سے نظریں ملاتے

انکارانی

ہوئے کتر رہی تھی۔ وہ غروب آفتاب کے بعد واپس جانے کی عادی تھی۔ شاید اُسے جین کے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔

”میڈم۔“ اُس نے قریب آ کر جین کو مخاطب کیا۔ ”میں نے اپنے سارے کام مکمل کر لئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، تم اب جاسکتی ہو۔“ جین نے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔

”سر.....“ جاتے جاتے ماریا نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ ”کیا میں یقین کر لوں کہ آپ نے مورگن کے سلسلے میں جو کہا تھا وہ.....“

”فکرت کرو۔“ میں نے اُس کی نظروں کی بے چینی کا مفہوم سمجھ کر مطمئن کرنے کی خاطر کہا۔ ”تم مجھ پر اتنا ہی اعتماد کر سکتی ہو جتنا تمہیں جین پر ہے۔“

ماریا نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا، پھر خاموشی سے پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھاتی چلی گئی۔ ماریا کے جانے کے بعد جین اپنی ماں کی طرف سے میرے اطمینان کی وجہ معلوم کرنے کے لئے مضطرب تھی۔

”پریشان مت ہو۔“ میں نے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر فارم ہاؤس کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم نہادھو کر تازہ دم ہو لو پھر میں تمہیں کچھ چونکا دینے والے کرتب دکھاؤں گا۔“

”میں تمہاری طرف سے بہت زیادہ فکر مند ہوں اور تم کرتب دکھانے کی بات کر رہے ہو۔“ جین الجھ گئی۔ لیکن میں نے اُسے اس بات پر رضا مند کر لیا کہ پہلے وہ تازہ دم ہو کر لباس تبدیل کر لے پھر میں اُس کی ساری پریشانیاں دور کر دوں گا۔ انکا میرے سر پر بیٹھی بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ کسی حساس جنگلی جانور کی طرح چہرہ آسمان کی طرف اٹھا کر ناک سے اس طرح شوش شوش کی آواز نکالنے لگتی تھی جیسے کسی خطرے کی بوسو گھننے کی کوشش کر رہی ہو۔ انکا کا یہ انداز میرے لئے نیا تھا۔

”یہ تمہارے اندر جنگلی جانوروں کی خوبی کب سے پیدا ہو گئی ہے؟“ میں نے انکا کو چھیڑنے کی خاطر پوچھا۔

”پریم لال مہاراج کی دیا سے کچھ نئی قوتیں مجھے بھی حاصل ہو گئی ہیں۔“ انکا نے معنی خیز انداز میں جواب دیا پھر میرے سر پر اونڈھی لیٹ کر دونوں پیر ہوا میں آگے پیچھے ہلاتی

کرتب دکھانے کا وعدہ کیا ہے۔“

”مجھے افسوس ہے کہ تم حکمہ سراغ رسانی سے وابستہ ہونے کے بعد بھی مصلحتوں اور دُور اندیشیوں کے تقاضوں سے پوری طرح واقف نہیں ہو۔“ مجھے بروقت سوچھ گئی۔ ”روحانی قوتیں چھن جانے والی بات میں نے تمہاری ماں کو اندھیرے میں رکھنے کی خاطر کہی تھی، دوسری شکل میں عین ممکن تھا کہ وہ اور جیکب غلطی میں کوئی وار کر بیٹھتے اور میں.....“

”اڑنے کی کوشش مت کرو.....“ جین نے مجھے قاتلانہ نظروں سے گھورا۔ ”تم نے روحانی قوتوں والی بات مجھ سے اکیلے میں بھی کہی تھی۔“

”ہوسکتا ہے کہ تمہیں تنہائی میں دیکھ کر میں تمہارے حسن جہاں سوز کی رنگینیوں میں اتنا مگم ہو گیا ہوں کہ وقت کے تقاضوں کا خیال رکھنا.....“

”تم اس وقت بھی بہک رہے ہو۔“ جین نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اتنی معصومیت سے کہا کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکا۔ میں نے اُسے گھسیٹ کر اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ انکا نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر جمائے لیکن انگلیوں کے درمیان جبری کئے وہ ہماری ایک ایک حرکت دیکھ رہی تھی۔

جین نے کچھ دیر بعد پھر سنجیدگی سے جیکب اور اپنی ماں کی سازش کا ذکر چھیڑ دیا، وہ بار بار مجھ سے ”کرتب“ دکھانے کا تقاضہ کر رہی تھی۔ میں اُسے نالتا رہا۔ پھر رات کے کھانے پر مجھے اس کا موقع مل گیا۔ ڈزینیل پر ہم تینوں کے چہروں پر تناؤ کی کیفیت محسوس تھی، جین کی ماں جیکب کے بارے میں فکر مند تھی، جین میرے خلاف ہونے والی سازش کے سبب ماں سے کھینچی نظر آ رہی تھی اور میں کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ اس خبیث بڑھیا کو جین کے سامنے بے نقاب کر سکوں۔

”جین.....“ مہر سکوت کو جین کی ماں نے توڑا۔ ”کیا تمہیں علم ہے کہ جیکب اچانک کسی سے کچھ کہے سنے بغیر چوروں کی طرح کہیں غائب ہو گیا ہے؟“

”ہاں.....“ جین نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”ماریا نے جاتے جاتے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ لیکن اس میں فکر کی کیا بات ہے؟“ جین نے ماں کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ”ہم جیکب کی جگہ کوئی دوسرا منتخب، جفاکش اور نمک حلال ملازم رکھ لیں گے۔“

”آں..... ہاں۔“ جین کی ماں نے نمک حلال کے حوالے پر چوکتے ہوئے کہا، پھر

ہوئی بڑی شوخی سے بولی۔ ”تم آج اپنی جین کو کرتب دکھا لو، اس کے بعد میں بھی تمہیں ایک تماشہ دکھاؤں گی۔“

”مجھے تمہارے لب و لہجے سے کسی خطرناک شرارت کی مہک آ رہی ہے۔“ میں نے انکا کوٹنوں کی خاطر مسکرا کر کہا۔

”مہک تو مجھے بھی تمہاری رگ رگ سے پھونتی محسوس ہو رہی ہے۔“ وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔ ”کہو تو یہ بھی بتاؤں کہ یہ کس کے حسین بدن کی مہک ہے؟“

”اوہ.....“ میں نے انکا کی بات پر صرف مسکرانے پر اکتفا کی۔

”مجھے خوشی ہے جیل کہ تم زندگی کی سمت واپس لوٹ رہے ہو۔ لیکن ایک شکوہ بھی ہے۔“ انکا اٹھلا کر بولی۔ ”اپنی پیاس تو بجھالیتے ہو لیکن اب تمہیں اپنی انکارانی کی تشنگی کا خیال نہیں رہتا۔“

ہمارے درمیان اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ جاری تھی۔ انکا میرے سر پر ٹھک ٹھک کر کبھی میرے ماضی کے قصے دہرانے لگتی، کبھی کسی رُوشی ہوئی محبوبہ کے انداز میں گلے شکوے شروع کر دیتی۔ ایک طویل عرصے کے بعد میں اور میری انکارانی دونوں ترنگ میں آئے تھے۔ جب جین کمرے میں داخل ہوئی بھیکے بالوں کو جوڑے کے انداز میں تولیہ میں لپیٹے، گہرے سرخ رنگ کے گاؤں میں وہ کسی معصوم بیرہوئی جیسے انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میری طرف آ رہی تھی۔ اُس کی جگہ کوئی دوسری حسینہ اس ہیجان انگیز انداز میں لہراتی، بل کھاتی، حسن کا جادو جگاتی میری نگاہوں کے سامنے آتی تو شاید میں بے قابو ہو جاتا۔ انکا جین کو دیکھ کر کسمانے لگی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ نہانے دھونے کے بعد جین بڑی ہلکی پھلکی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کے اندر وہ اضطرابی کیفیت بھی نہیں تھی جو میں نے کچھ دیر پہلے محسوس کی تھی۔ میرے برابر بیٹھنے کے بعد اُس نے مجھے شوخ نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”دولت علی۔ میرا خیال ہے کہ اب تم اپنی جین سے بھی کچھ باتیں چھپانے لگے ہو۔“

”میں سمجھا نہیں.....“ میں لیکھت محتاط ہو گیا۔

”تم نے کہا تھا کہ تمہاری روحانی قوتیں تم سے چھن چکی ہیں اور آج تم نے مجھے کوئی

بڑی تیزی سے خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”تم نے ٹھیک کہا۔ اب ہم ٹھوک بجا کر کسی ایسے شخص کا انتخاب کریں گے جو چوروں کی طرح منہ چھپا کر بھاگنے کا عادی نہ ہو۔“

”دولت علی کا کہنا ہے کہ مورگن دو روز بعد واپس آ جائے گا۔“ جین نے سر دلچسپ اختیار کیا۔ ”اُس کے آنے کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کروں گی۔ وہ اگر کام کرنے پر آمادہ ہو گیا تو زیادہ مناسب رہے گا، ماریا کو بھی ہمارے فیصلے سے دلی مسرت ہوگی۔“

میں نے انکا کو اشارہ کیا، وہ میرے سر سے اتر کر جین کی ماں کے سر پر چلی گئی۔

”ماریا کو بھی اب روزمرہ کے کام یاد نہیں رہتے۔“ جین کی ماں کچھ توقف سے بولی۔

”آج وہ اتنی جلدی میں گئی کہ مجھے کھانے سے پہلے وہ گولیاں کھانا بھول گئی ڈاکٹر نے جنہیں پابندی سے کھانے کی تاکید کی تھی۔“

”کیا آپ نے وہ گولیاں ابھی تک نہیں کھائیں؟“ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر پوچھا۔

”نہیں.....“ خبیث بڑھیا نے مجھے تیز اور ناپسندیدہ نظروں سے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ شاید اس وقت میری مداخلت اُسے پسند نہیں آئی تھی۔

”اگر وہ دو ضروری ہے تو اب جا کر کھالیں۔“ میں نے جین کو مرعوب کرنے کی خاطر ٹھوس اور تحکمانہ انداز میں کہا اور اس وقت جین کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں جب اُس نے اپنی ماں کو وہیل چیئر سے اتر کر اپنے قدموں سے خوابگاہ کی طرف جاتے دیکھا۔

”یہ..... یہ سب کیا ہے دولت علی؟“ جین نے حیرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”یہ کرتب یا جھگری نہیں ہے جین۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”تمہاری ماں اس وقت میری روحانی قوتوں کے زیر اثر ضرور ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ مفلوج نہیں ہے، مفلوج ہونے کا ڈھونگ اُس نے محض تمہاری ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے رچایا ہے، تم چاہو تو میں اس ڈاکٹر کو بھی بے نقاب کر سکتا ہوں جس نے بھارنی معاوضے کے تحت جھوٹا سریشلیٹ اور جھوٹی رپورٹ تیار کی تھی۔“

”اب جبکہ حقیقت میری نظروں کے سامنے ہے، مجھے کسی مزید ثبوت کی بھلا کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ لیکن..... لیکن۔“ جین نے ہونٹ چباتے ہوئے جذباتی انداز میں

کہا۔ ”یہ سراسر فراڈ ہے، خونی رشتوں کے درمیان اس قسم کی بددیانتی زیب نہیں دیتی۔“

”میں تمہاری تائید کرتا ہوں، لیکن میری درخواست ہے کہ تمہیں اپنی زبان بند رکھنی ہو گی۔“ میں نے بات جاری رکھی۔ ”مورگن کو آ لینے دو، جبکہ کا قصہ تمام ہو جائے پھر.....“

”جبکہ کا قصہ ختم ہونے سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ جین سمجھدار تھی اُس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”جبکہ ایک مفروضہ قاتل تھا، پولیس اُسے تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ یہ بات تمہاری ماں کو معلوم تھی۔ اُس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ٹھان لی۔“ میں نے جین کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”میرے مرنے کے بعد جبکہ بھی نہیں بچ سکتا تھا، رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا اور.....“

”اور تم نے یہ تمام باتیں مجھ سے پوشیدہ رکھیں۔“ جین نے شکوہ کیا۔ ”اگر میرے محکمے کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میں نے اپنی چھٹ کے نیچے ایک مفروضہ قاتل کو ملازم کی حیثیت سے پناہ دے رکھی ہے تو..... مائی گاڈ، میری بنی بنائی رپوٹیشن خاک میں مل جاتی، تفتیش ہونے کے بعد اصلیت بے نقاب ہوتی تو مجھے ملازمت سے سبکدوش کر دیا جاتا اور.....“

شاید یہ فارم ہاؤس بھی چھین لیا جاتا۔“

”میرے ہوتے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے جین کو یقین دلایا۔ ”میری بات غور سے سنو۔ جبکہ کی اصلیت کے بارے میں معلوم ہونے کے بعد ہی میں نے اُسے پوری طرح بے بس کر رکھا تھا۔ یہ بھی میری روحانی قوتوں کا کرشمہ ہے کہ وہ اپنا سب کچھ سمیٹ کر نو دو گیارہ ہو گیا اور اب ہفتہ دس دن بعد وہ کسی دور دراز علاقے سے گرفتار کر لیا جائے گا۔“

”اور تفتیش کے دوران جب وہ میرے فارم ہاؤس پر کام کرنے کا اقرار کرے گا تو.....“

”وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔“ میں ٹھوس لہجے میں بولا۔ ”میں نے اُس کے ذہن سے درمیان کا وہ حصہ حذف کر دیا ہے جو اُس نے تمہارے پاس گزارا تھا۔“

جین نے مجھے شکرانہ نظروں سے دیکھا پھر اُس کی توجہ اپنی ماں کی سمت مبذول ہوئی جو اپنے پاؤں سے چلتی ہوئی واپس آ کر وہیل چیئر پر بیٹھی تھی۔ وہ جو حماقت کر چکی تھی اُسے اس کا مطلق احساس نہیں تھا، انکا نے اُس نے اُس کے سر پر تسلط بجا رکھا تھا۔ وہیل چیئر پر بیٹھ کر وہ دوبارہ کھانے میں مشغول ہو گئی۔



”تم..... تم واقعی بہت بڑے جادوگر ہو.....“ جین نے دبی زبان میں کہا۔  
 ”دولت علی۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ تین سال سے لاپتا مورگن دو روز کے اندر واپس آ  
 جائے گا؟“ جین کی ماں نے مجھے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی ہاں۔ میرے دعوے کو تسلیم کرنے کی خاطر صرف دو روز کی زحمت اور اٹھانی ہو  
 گی۔ میں آپ کو تیسرے روز کی زحمت نہیں دوں گا۔“ میں نے ایسے انداز میں جواب دیا  
 کہ جین بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اُس کی ماں نے اُسے غور سے گھورا، پھر کھانے میں  
 مشغول ہو گئی۔ انکا میرے سر پر واپس آ گئی۔

”جیل.....“ انکا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اب اگر تمہاری اجازت ہو تو میں ماریا کو بلا کر  
 اس بات کی تصدیق بھی کراؤں کہ تم کتنے پینچے ہوئے بزرگ ہو..... اور آج فارم ہاؤس  
 میں کیسا بیجان انگیز کھیل کھیلا گیا ہے۔“

”مجھے بلیک میل کر رہی ہو انکارانی.....؟“ میں نے اُسے تیز نظروں سے گھورا۔

”اتنے کٹھوردل مت بنو جیل۔“ انکا نے لتجی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تم جانتے ہو کہ  
 انسانی خون میری غذا ہے، میں بہت دنوں سے ہوا اور پانی پر گزارا کر رہی ہوں، تمہیں  
 تمہاری ماریا اور جین کا واسطہ میری پیاس بھی بچھا دو۔“

”پیاس بچھا دو“ کہنے کے بعد وہ اس انداز میں شرما کر اپنے وجود میں سمٹنے لگی جیسے پہلی  
 رات کی ڈلہن کی زبان سے غلطی سے وہ بات پھسل گئی ہو۔ مجھے اُس کی وہ ادا بھا گئی۔ میں  
 نے اُس کی غذا فراہم کرنے کا وعدہ کیا تو وہ میرے سر پر کھڑی ہو کر دیوانہ وار خنک ڈانس کا  
 مظاہرہ کرنے لگی۔ جین کی ماں اور جین دونوں اپنے اپنے خیالوں میں مستغرق تھیں۔ میں  
 انکارانی کے غمکوں سے لطف اندوز ہوتا رہا..... اُس کی حسرت دیدنی تھی.....!



نصف رات گئے تک جین میرے ساتھ کسی جو تک کی طرح چپٹی رہی۔ اس بات کا یقین  
 کر لینے کے بعد کہ میری روحانی قوتیں میرے پاس ہیں اس شوخ ادا حسینہ کی تمام  
 پریشانیاں ختم ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر وہ اپنی ماں کی باتیں کرتی رہی۔ اُس کا خیال تھا کہ مفلوج  
 ہونے کا ٹانگ رچا کر ماں نے بددیانتی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ ایسا نہ کرتی تو بھی جین اُسے  
 حالات کی ستم ظریفیوں کے حوالے نہ کرتی۔ لیکن اب وہ مجھ سے مشورہ کر رہی تھی کہ کیوں  
 نہ اپنی ماں کو اولڈ ہاؤس میں داخل کرادے جہاں ایک دو نہیں ہزاروں اور لاکھوں بوڑھے  
 اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ اولڈ ہاؤس میں انہیں کسی کام کے لئے مجبور نہیں کیا  
 جاتا..... قسم کا آرام و آسائش مہیا کی جاتی ہے۔ لیکن یہ تصور ہی ان کے لئے بڑا کرناک  
 ہوتا ہے کہ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنی اولادوں سے نہیں مل سکتے۔ البتہ ان  
 کے رشتے دار ہفتے عشرے میں تھوڑا سا وقت نکال کر سرسری طور پر اُن کی خیریت دریافت  
 کرنے آ جاتے ہیں۔

مغربی تہذیب کی یہی ریت ہے کہ جب بچوں کو والدین کی تربیت کی ضرورت ہوتی  
 ہے اس عمر میں ان کا کمرہ علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ جو افراد آیا یا گورنس انفرڈ کر سکتے ہیں ان  
 کے بچوں کی تربیت نسبتاً بہتر ہو جاتی ہے لیکن جہاں تنگ دہلی آڑے آتی ہے وہاں دور اور  
 وقت کا ماحول ان کی تربیت کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مغربی ممالک میں چھوٹے بڑوں کے  
 درمیان کوئی شرم و لجاظ نہیں ہوتا۔ جوان بیٹی اپنے والدین کی موجودگی میں بھی اپنے بوائے  
 فرینڈ کے ساتھ بوس و کنار کرنے کی مجاز ہوتی ہے۔ شراب اور شباب کی محفلوں میں بھی وہ  
 قدم ملا کر اپنا اپنا وقت اپنی اپنی مرضی سے گزارتے ہیں، وہاں کے دانشور اسے شخصی آزادی  
 کے نام سے بڑے فخر سے منسوب کرتے ہیں۔ انہی خطوط پر سوچتے ہوئے جین بھی اپنی ماں  
 کو کسی اولڈ ہاؤس میں داخل کرانا چاہتی تھی لیکن میں نے مخالفت کی تو وہ مان گئی، کوئی بحث

نہیں کی۔

میں نے خاصی رات گئے نیند کا بہانہ کر کے جین کو بمشکل اُس کی خوابگاہ میں جانے پر آمادہ کیا، پھر تھکے تھکے انداز میں اپنے بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ ”جیل، یہ لڑکی تو تمہارے گلے کا ہار بنتی جا رہی ہے۔“ جین کے جانے کے بعد انکا نے اپنا چہرہ کہنی پر ٹکا تے ہوئے پُر خیال انداز میں کہا۔ وہ سر پر آلتی پالتی مارے بیٹھی کسی سوچ میں غرق تھی۔ ”کیا سوچا ہے تم نے اس کے بارے میں؟“

”اتنی رات گئے سوچنا نیند کو بھگانے کے مترادف ہو گا۔“ میں نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ ”تم بھی سونے کی کوشش کرو۔“

”میرا مشورہ مانو تو اب یہاں سے اپنا یوریا بستر باندھنے کی فکر کرو۔“ انکا نے میرے بالوں کے بستر پر پاؤں سپار کر لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”لندن میں تمہارا قیام زیادہ طویل نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں ہندوستان واپس چل کر اپنے اُن دشمنوں کی بھی خبر لینی ہے جو ہمیں غافل سمجھ کر گھیرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔“

انکا کو ٹالنے کی خاطر میں نے ہلکے ہلکے خراٹے لینے شروع کر دیے۔ وہ مجھے توجہ سے کچھ دیر دیکھتی رہی، پھر بالوں میں سر چھپا کر کسی معصوم بچے کی طرح اوندھ گئی۔ میں دن بھر کا تھکا ماندہ تھا، ماریا کے جوان جسم کا خمار بھی کم نہیں ہوا تھا اس لئے جلد ہی نیند کی آغوش میں ڈبکیاں لگانے لگا۔ انکا کا مشورہ غلط نہیں تھا۔ خود میں نے بھی طے کر رکھا تھا کہ کوئی خوبصورت سا بہانہ بنا کر جتنی جلدی ممکن ہو گا جین کے فارم ہاؤس کو خیر باد کہہ کر شہر کے کسی شاندار ہوٹل یا ہوٹل میں منتقل ہو جاؤں گا۔ ہاتھ کی سرجری ہو جانے کے بعد میرے وجود کی بدنمائی دور ہو گئی تھی۔ انکا کی موجودگی میں مجھے روپے پیسے کی کمی کا احساس بھی کبھی نہیں ہوا۔ پریتم لال کے آنے کے بعد میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ جین کو اپنے پیروں کی زنجیر نہیں بناؤں گا۔ لیکن یہ پروگرام بھی طے تھا کہ لندن سے واپسی سے قبل میں جین کو کسی مضبوط اور محفوظ ہاتھوں میں سوہنے کے بعد ہی کوچ کا ارادہ کروں گا۔

میں نیند کی وادیوں میں گم تھا جب مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرے سر ہانے بیٹھا اپنی نازک انگلیاں آہستہ آہستہ میرے بالوں پر پھیر رہا ہو۔ شاید وہ جین تھی جو کسی خیال سے دوبارہ میری خوابگاہ میں آگئی تھی، مجھے سوتا دیکھ کر میرے سر ہانے بیٹھ کر میرا سر سہلانے

گئی تھی۔ یہ بھی محبت کے اظہار کا ایک انداز ہوتا ہے۔ میں نے کوئی حرکت نہیں کی، آنکھیں بند کئے اسی کروٹ لیٹا رہا، پھر اچانک خوشبو کا ایک مانوس جھونکا میری قوت شامہ سے ٹکرایا تو میرے وجود میں کھلبلی مچ گئی..... میں نے پلکوں کے درمیان جھری پیدا کی، وہ میری کلدیپ ہی تھی..... میں اُس کے وجود کی مہک کو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ کلدیپ کے قرب و محسوس کر کے میرے ذہن پر نشہ سا طاری ہونے لگا، وہ کلدیپ نہیں بلکہ اُس کی بے چین روح تھی جو اپنے سراپا میں میرے سر ہانے بیٹھی مجھ سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ اُس کی نزکی آنکھوں میں وہی روایتی شوخی اور لبوں کے گداز پر سحر انگیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی، اُس کے انداز میں دلربائی تھی، اپنی تمام تر حشر سامانیوں اور جسمانی مقناطیسی کشش کے باوجود وہ اپنے عارضی پیکر میں بھی بڑی بڑوقار اور بردبار نظر آ رہی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں اسی طرح آنکھیں بند کئے لیٹا رہوں، کلدیپ والہانہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہے، میرے سر پر ہاتھ پھیرتی رہے۔ لیکن کلدیپ مہانِ شکتی کی مالک تھی، اُسے پریتم لال نے اپنی کنیا کے لئے منتخب کیا تھا تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہو گا۔ وہ دل کی مہرانیوں میں جھانکنے کی قوت رکھتی تھی، اُس کے لئے فاصلوں کی کوئی قید نہیں تھی، اندھیرے اُس کے راستوں کی زکاوت نہیں بن سکتے تھے، اُس نے میرے دل میں ابھرنے والی خواہش کا راز بھی پالیا۔

”جیل.....“ اُس کے گداز ہونٹوں کو جنبش ہوئی تو میرے وجود میں مندر کی نفرتی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، انکا میرے سر پر موجود نہیں تھی۔ کلدیپ کو دیکھ کر شاید وہ خاموشی سے اتر گئی تھی۔ میں کلدیپ کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اُس کے ہونٹوں کی پگھڑیوں کو دوبارہ جنبش ہوئی۔ ”میرے پاس سے کم ہے۔ مہاراج پریتم لال نے تمہیں چندرا اور ہندوستان کے سر پھرے پنڈت بچاریوں کے بارے میں بتا دیا ہو گا، میں تم سے کیول اتنا کہنے آئی ہوں کہ اس بار جلد بازی میں فیصلے مت کرنا، سوچ و چار کے بعد ہی کوئی قدم اٹھانا۔ تمہاری انکارانی تمہارے پاس ہے، وہ مہاراج کی طرف سے تمہارے لئے ایک انمول تحفہ ہے، امر لال کا جوان سپوت چندرا، دندھیا چل کی گھماؤں میں آسن جمائے بیٹھا کالی کے نام پر جنتر منتر کر رہا ہے، بدری کے چیلے تمہارے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ کل میں کیا ہونے والا

ہے۔“

”کلد پیپ.....“ میں نے دل کی گہرائیوں سے اُسے یقین دلایا۔ ”میں اپنی جان کی بازی لگا کر بھی وہ کام ضرور پورے کروں گا جو تم ادھورے چھوڑ گئی ہو، لیکن پریتم لال نے کچھ باتیں اشاروں کنایوں میں بھی کی تھیں۔ مہاراج نے کہا تھا کہ میں جل کے اُپر ہی اُپر تیرتا رہوں گا، جل کے اندر غوطہ نہیں لگا سکوں گا۔ مجھے بڑا کشت بھوگنا پڑے گا، میں ان باتوں کی گہرائی نہیں سمجھ سکا۔“

”نراش مت ہو۔“ کلد پیپ نے مجھے دلاسا دیا۔ ”تمہارے پاس انکا ہے، سید مجذوب کی کراماتی لاشی ہے، ننذا کی دان کی ہوئی شکلیاں ہیں اور..... مہاراج کا آشیر واد بھی ہے۔“

”کیا تم میری مدد کو نہیں آؤ گی؟“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں شکوہ کیا تو کلد پیپ کی غزالی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔

”چنتا مت کرو جمیل۔“ اُس نے مسکرا کر میری ہمت افزائی کی۔ ”مہاراج کا سایہ تمہارے سر پر ہے۔ مجھے وشواس ہے کہ تم اوش بھل ہو گے لیکن..... یدھ اور پریم میں کچھ کٹھنایاں تو جھیننی پڑتی ہیں۔“

”جین کے بارے میں تمہارا کیا فیصلہ ہے.....؟“ میں نے کچھ سوچ کر دریافت کیا۔

”تمہاری انکارانی نے جو مشورہ دیا ہے وہ زیادہ مناسب ہے۔“ کلد پیپ نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں یاد ہو گا جمیل۔ انکا جب کوشلیا کا خون پی کر آئی تھی اور تربیتی کو پولیس گرفتار کر لے گئی تھی تو تم بہت پریشان تھے، اس وقت انکا نے پہلی بار دبی زبان میں تمہیں بتایا تھا کہ کسی نے اس سے کبھی وہ کام نہیں لیا جو دوسرے نہیں کر سکتے۔ اُس نے غلط نہیں کہا تھا، میں جانتی ہوں کہ انکا ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ ہاں جمیل، میری بات پر وشواس کرو۔ اُس کے ننھے وجود میں مخفی لازوال قوتیں ایسے کارنامے بھی انجام دے سکتی ہیں جو انسانی ذہن خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتا۔ وہ اپنی حدود میں رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتی ہے۔ بدری نرائن اور امر لال سے جنگ لڑتے وقت اگر تم نے انکا کا کہا مان لیا ہوتا تو شاید مجھے پریتم لال کا استھان نہ چھوڑنا پڑتا۔ تم منڈل سے باہر نہ نکلتے تو امر لال تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔“

”کلد پیپ.....“ میں نے شرمندگی سے مٹھیاں بھیجنے لیں۔

”جو ہو چکا اُسے بھول جاؤ۔“ کلد پیپ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے محبوبانہ انداز میں کہا۔ ”دیوی دیوتاؤں کو جو منظور تھا وہ پورا ہو گیا۔ پرنتو اب دوبارہ ایسی بھول مت کرنا۔ انکا کے مقابلے میں تم نے زیادہ شکلیاں پر اپت کر لی ہیں، مجھے خوشی ہے لیکن میری ایک بات گرہ سے باندھ لو..... انکا کی باتوں کو ہمیشہ دھیان سے سننا، سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا۔ وہ بڑی عظیم اور حیرت انگیز قوتوں کی مالک ہے، اگر چاہے تو پہاڑوں کو بھی دھول کی طرح اڑا سکتی ہے۔ سید مجذوب کی لاشی بھی سنبھال کر رکھنا۔ ہو سکتا ہے کبھی وہی تمہارا آخری سہارا ثابت ہو.....“

پھر کلد پیپ کا کوئل وجود میری نظروں سے اوجھل ہو گیا، میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ میرا وہم نہیں حقیقت تھی۔ کلد پیپ کے صندلی بدن کی مسحور کن خوشبو ابھی تک خوابگاہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سر کی طرف دیکھا، انکا واپس نہیں آئی تھی۔ میں نے تھکے ہارے انداز میں دوبارہ بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں، کلد پیپ کے ہونٹوں سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہا تھا۔ پھر کلد پیپ کے حسین تصور سے کھیلتا کھیلتا کب میں نیند کی آغوش میں پہنچ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوا؟ مجھے اس کا کچھ ہوش نہیں رہا۔

دو روز سکون سے گزر گئے۔ جین نے میرے سمجھانے کے بعد بظاہر اپنی ماں سے دو ٹوک بات نہیں کی لیکن اُن کے درمیان سرد جنگ کا سلسلہ جاری رہا فارم ہاؤس کی فضا پر ایک کھنچاؤ کی کیفیت طاری تھی۔ جین کی ماں نے مجھ سے کوئی شکوہ یا شکایت نہیں کی لیکن اُس کی نظروں میں میری ذات بری طرح کھٹک رہی تھی۔ ماریا کی حالت سب سے مختلف تھی۔ جب بھی میرا اُس کا سامنا ہوتا، اُس کی نگاہوں میں ایک ہی سوال بار بار ابھرتا۔

”دولت علی میں نے تمہیں مورگن کی واپسی کی بہت بھاری قیمت پیشگی ادا کی ہے۔ اگر تمہارا کہا غلط ثابت ہوا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

میں ماریا کے خاموش پیغام کو پڑھ کر اُسے نگاہوں نگاہوں میں جواب دیتا کہ میری پیشینگوئی غلط ثابت نہیں ہوگی۔ پھر تیسرے دن جب مورگن اچانک سامنے آ گیا تو ماریا اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکی۔ تہذیب اور مصلحتوں کے تمام تقاضوں کو پھلانگ کو دوڑتی ہوئی دیوانہ وار مورگن سے لپٹ گئی۔ جین نے مجھے دیکھ کر صرف مسکرانے پر اکتفا کی لیکن اُس کی

بڑی آنکھوں میں اعتماد جھلک رہا تھا۔ اُس کے قوی خاصے مضبوط تھے۔ اُس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مضبوط قوت ارادی کا مالک بھی ہے۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری پیشکش رد نہیں کی۔“ جین نے ماریا کی خوشی محسوس کرتے ہوئے مورگن سے کہا۔ ”تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ماریا تمہارا ہاتھ بٹاتی رہے گی اور تمہیں وہ سارے کام سمجھا دے گی جو جیکب سرانجام دیا کرتا تھا۔“

”تم نے سنا جمیل۔ تمہاری جین کیا کہہ رہی ہے؟“ انکا نے خوشی کا مظاہرہ کیا۔ ”گویا اب مورگن پر سرمنڈواتے ہی اگلے پڑنے والی مثال صادق آنے والی ہے۔ بیچارے کو ایک وقت میں دو کشتیوں پر سواری کرنی پڑے گی۔“

”تمہیں اگر ماریا کی حق تلفی کا خیال ہے تو فکر مت کرو، اُس کا خسارہ میں پورا کرتا رہوں گا۔“ میں نے بائیں آنکھ جھپکا کر سر نہراتے لہجے میں کہا۔

انکا نے ایک لمحے کے لئے مجھے بڑی رقیبانہ نظروں سے گھورا، پھر یلخت سنجیدگی سے بولی۔ ”جمیل۔ اب ہمیں اس فارم ہاؤس سے جلدی نکلنے کی کوشش کرنی ہوگی۔“

”کیوں.....؟“ میں چونکا۔ ”کیا تم کوئی خطرہ محسوس کر رہی ہو.....؟“

”بات خطرے کی نہیں، تمہاری جین کے مستقبل کی ہے۔“ انکا نے دُور کی کوڑی لاتے ہوئے کہا۔ ”خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پڑتا ہے۔ مورگن کے آجانے کے بعد جین کے دل میں تمہاری محبت کا رنگ اور گہرا ہونے لگے گا۔ میں نے جین کے مسئلے کا ایک حل تلاش کر لیا ہے لیکن اس کے لئے ہمیں پہلی فرصت میں کہیں اور منتقل ہونا پڑے گا۔“

”تمہارے خیال میں جین مجھے آسانی سے جانے کی اجازت دیدے گی؟“ میں نے قدرے طویل لہجے میں سوال کیا۔ جین جن حالات میں مجھے اپنے سینے سے لگا کر موت کے چنگل سے نکال لائی تھی، وہ میری زندگی پر ایک احسان تھا، میں اُسے زندگی کا ہمسفر بنا کر کلدیپ کی رُوح کو بے چین کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے پریم لال کے کہنے کے مطابق زندگی اور موت کے بہت سارے مرحلوں سے گزرتا تھا۔ میں جتنی جلدی جین کی زندگی سے دُور نکل جاتا اتنا ہی بہتر ہوتا۔ مگر میں اچانک نظریں پھیر کر احسان فراموشی کا مظاہرہ کرنے سے بھی قاصر تھا۔

”مجھ پر بھروسہ رکھو جمیل۔“ انکا نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”میں تمہارے دل کی کیفیت

بوڑھی ماں کی پیشانی پر ان گنت شکنیں ابھر کر آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں۔ وہ بار بار مجھے دزدیدہ نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ اُس کے دل میں یقیناً بہت سارے خیال ابھرے ہوں گے، وسوسے جاگ رہے ہوں گے۔ ماریا اور مورگن کا جذباتی ملاپ ختم ہوا تو سب سے پہلے جین کی ماں نے اُسے سرد لہجے میں مخاطب کیا۔

”تم تین سال سے بھگوروں کی طرح کہاں منہ چھپائے پھر رہے تھے اور اب یہاں کیا لینے آئے ہو؟“

”میں ماریا کو اپنے ساتھ لے جانے کی خاطر آیا ہوں۔“ مورگن نے بڑے مہذب انداز میں صاف گوئی سے کہا۔ ”جو ہو چکا میں اس پر شرمندگی کے اظہار کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔“

”ماریا.....“ خزانٹ بڑھیا نے ماریا کو تہر آلود نظروں سے گھورا۔ ”کیا تم ایسے شخص کے ساتھ دوبارہ نباہ کرنے کو تیار ہو جو شادی کے صرف سات ماہ بعد تم سے کچھ کہے سنے بغیر چوروں کی طرح روپوش ہو گیا تھا اور اب تین سال بعد مسکینوں جیسی صورت بنائے.....“

”میڈم.....“ ماریا نے دبی زبان میں احتجاج کیا۔ ”یہ میرا اور مورگن کا نجی معاملہ ہے۔ اس کے علاوہ میں مشر دولت علی سے وعدہ کر چکی ہوں کہ مورگن سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کروں گی۔“

”میں بھی تم دونوں کو یہی مشورہ دُوں گی کہ پرانی باتوں کو یکسر فراموش کر کے نئے سرے سے خوشگوار زندگی کی ابتدا کرو۔“ جین نے اپنی ماں کے دوسرے کسی سخت جملے کا انتظار کئے بغیر تیزی سے کہا، پھر مورگن سے بولی۔ ”مجھے خوشی ہے کہ ماریا کی بے لوث محبت تمہیں واپس کھینچ لائی۔ تم اگر ماریا کو لے جانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن میرا مشورہ ہے کہ اگر تم یہیں ماریا کے ساتھ رہو تو زیادہ مناسب ہوگا۔ میں فیصلہ تمہارے اوپر چھوڑتی ہوں۔“ پھر جین نے مورگن کو جیکب کی جگہ دینے کی پیشکش کی جسے مورگن نے خوشی خوشی منظور کر لیا۔ ماریا کا معصوم چہرہ تازہ گلاب کی طرح کھل اُٹھا۔ وہ مورگن کو دالہانہ نظروں سے دیکھنے لگی، جین کی ماں کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ اُس نے خلاف توقع بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا۔ محض وہیل چیئر پر بل کھا کر رہ گئی۔

میں نے مورگن کو غور سے دیکھا، وہ تیس سال کا خوب رو اور گہرو جوان تھا۔ اُس کی بڑی



فرمائش کر رہی تھیں۔ جین کی بوڑھی ماں اپنی ڈھیل چیئر پر لدی پھندی قریب ہی موجود تھی۔ اُس نے کئی بار مجھے ایسی گہری نظروں سے دیکھا تھا کہ میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ تفریح کے دوران اگر کوئی ناخوشگوار بات انسان کی مرضی کے خلاف ہو جائے تو اُسے اپنا موڈ ٹھیک کرنے میں خاصا وقت لگتا ہے۔ میں بھی اسی کیفیت سے دوچار تھا، دوسری طرف سارا اور جین کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔

”جیل.....“ انکا نے مجھے تذبذب کی حالت سے دوچار دیکھ کر اپنے نوکیلے پنجوں سے ٹھوکا دیا۔ ”تم دومنٹ کے لئے آنکھیں بند کر لو۔ میں جو تماشا دکھاؤں گی اسے دیکھ کر تمہارے پیٹ میں بھی بل پڑ جائیں گے۔“

”کوئی ایسی شرارت نہ کرنا کہ سارا اور جم کی موجودگی میں مجھے شرمندہ ہونا پڑے.....“

”فکرمات کرو۔“ انکا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں جو کچھ کرنے جا رہی ہوں ہو سکتا ہے اس میں تمہاری جین کا مستقبل بھی شامل ہو.....“

”کیا مطلب.....؟“

”میرا کہا مان لو جیل۔ آنکھیں بند کر کے ظاہر کرو کہ تم کسی مطابق جادوگر کی طرح اپنے قبضے میں موجود ارواح کو آواز دے رہے ہو۔ وہی ساں باندھو جو سلیمان بے کو نیچا دکھانے کے لئے اپنایا تھا، باقی کام میرا ہوگا۔“

میں نے انکا کے اصرار پر آلتی پالتی مار کر آنکھیں بند کر لیں، چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے اس طرح ہونٹوں کو جنبش دینے لگا جیسے کوئی عمل پڑھ رہا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت متعدد نگاہیں میری حرکات، وسکناات کا جائزہ لے رہی ہوں گی۔ میں بڑی دیر تک اسی پوزیشن میں بیٹھا بدبواتا رہا۔ پھر جب میرے کانوں میں سارا اور جین کے علاوہ طے جلتے قہقہوں کی آوازیں گونجنے لگیں تو میں سمجھ گیا کہ انکا نے اپنی پراسرار حیرت انگیز قوتوں سے پکنک پر آنے والوں کے لئے کوئی نیا شگونہ چھوڑا ہوگا۔ کھلتے نفرتی قہقہوں کی آوازیں ہر لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھیں جب میری قوت سماعت میں جین کی بوڑھی ماں کی کھٹی کھٹی جیج بھی گونجی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں، نظریں اٹھا کر دیکھا تو مجھے بھی اپنی ہنسی پر قابو پانا دشوار ہو گیا۔ جین کی بوڑھی ماں زمین سے تھکے بیاڈس فٹ اوپر فضا میں اس طرح معلق نظر آ رہی تھی کہ اُس کے اور ڈھیل چیئر کے درمیان دو فٹ کا فاصلہ بھی تھا۔ وہ خوفزدہ انداز میں چیخ رہی

سمجھ رہی ہوں۔ جین کے دل کو دھچکا لگا تو مجھے بھی صدمہ ہوگا۔ تمہاری زندگی بچا کر جین نے تمہاری انکا پر بھی احسان کیا ہے۔ میں ایسے حالات پیدا کر دوں گی کہ جین خوشی خوشی تمہیں جانے کی اجازت دیدے گی..... سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔“

میں نے انکا کی بات سن کر خاموشی اختیار کر لی۔ کلدیپ کی رُوح نے بھی خواب میں آ کر یہی تلقین کی تھی کہ میں انکا کی باتوں کو دھیان سے سنوں، اُس کی کسی بات سے رُوگردانی نہ کروں۔

مورگن کے آجانے سے ماریا کی زندگی میں گویا بہار آ گئی۔ میں اُس کے جذبات میں نئی نئی کونٹیلیں پھوٹی دیکھ رہا تھا۔ پہلے اپنے کام سے کام رکھنے اور سنجیدہ سنجیدہ سی نظروں والی وہ حسیناب مست ہر نیوں کی طرح قلائچیں بھرنے لگی تھی۔ جب بھی میری اُس کی نظروں کا تصادم ہوتا اُس کی غزالی نظروں میں احساسِ ممنونیت موجیں مارنے لگتا۔ پھر اُس روز جب ہم لوگ جم اور سارا کے ساتھ پکنک پر جا رہے تھے، حسن اتفاق سے مجھے اُس سے تنہائی میں ملنے کا موقع میسر آ گیا۔ ضروری سامان گاڑیوں میں بار کرنے کے بعد ہم لوگ بھی بیٹھ چکے تھے جب جین کو احساس ہوا کہ وہ اپنا مووی کیمرہ بھول گئی ہے، میں کیمرہ لینے کی خاطر اُس کی خواہگاہ میں گیا، ماریا کمرے میں سامان سلیپے سے رکھنے میں مصروف تھی، میں پنجوں کے بل چلتا اُس کی پشت پر پہنچ گیا۔ وہ قدموں کی آہٹ پا کر پٹلی، مجھے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ میں مغرب کی پروردہ حسیناؤں کی عادات و اطوار سے خاصی واقفیت رکھتا تھا۔ ایک بار جس کے سامنے ان کا حجاب ٹوٹ جائے مگر وہ دوبارہ ہچکچانے کا مظاہرہ نہیں کرتیں۔ ماریا ہر چند کہ قدرے مختلف تھی لیکن اُس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ میں جلدی میں تھا اس لئے اُس کے گداز ہونٹوں سے صرف حسن کا زاج وصول کیا اور مووی کیمرہ اٹھا کر باہر آ گیا۔

پکنک میں جو لوگ شریک تھے اُن کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ زیادہ تر چہرے جانے پہچانے تھے، جو اجنبی تھے اُن سے بھی ہائے، ہیلو کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ سارا اور جین میرے ساتھ ساتھ تھیں۔ جم اپنے ایک دوست ولیم لیونارڈو کے ساتھ گپ شپ لگانے میں مصروف تھا۔ باقی افراد بھی دو دو تین تین کی ٹولیوں میں بے موسم اور ماحول کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سارا اور جین بار بار مجھ سے جادوگری کا کمال دکھانے کی

تھی اور بار بار نظریں جھکا کر پھٹی پھٹی نظروں سے اپنی وہیل چیئر کو دیکھ رہی تھی۔ پلنگ پر آنے والے افراد رفتہ رفتہ اس حیرت انگیز منظر کی طرف متوجہ ہونے لگے تھے۔ اُن کے چہروں پر گہری سنجیدگی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات مسلط تھے۔

”یور آر گرینٹ دولت علی۔“ جین بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگی۔ ”یہ خوشگوار لمبے ہماری زندگی میں ہمیشہ ایک یادگار حیثیت سے محفوظ رہیں گے۔“

میں آہستہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جم اور ولیم لیونا روڈ بھی اُٹھ کر میرے قریب آ گئے۔ سارا اور جین پہلے ہی میرے قریب موجود تھیں۔

”اب میں آپ حضرات کو دو مختلف سمت میں حرکت کرنے والے دائروں کا حیرت انگیز کمال دکھاؤں گا۔“ میں نے پیش رو کھیل تماشہ کرنے والے بازیگروں کا انداز اختیار کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ”میری درخواست ہے کہ کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے، نہ منہ سے کسی قسم کی آواز نکالے۔“

مجموع کو سانپ سونگھ گیا۔ سب کی نظریں جین کی ماں پر تھیں جو چیختے چیختے بے حال ہو رہی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ بلند کر کے یونہی اُلٹے سیدھے دائروں کی شکل میں ہلانا شروع کیا۔ جھوم انگشت بدنداں رہ گیا، انہیں سانپ سونگھ گیا خون ان کی شریانوں میں منجمد ہو گیا۔ وہ بے جان بت کی مانند اپنی اپنی جگہ ایستادہ وہیل چیئر اور جین کی ماں کو مختلف سمتوں میں گردش کرتا دیکھتے رہے۔ خزانہ بڑھیا کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اُس نے اچانک چیخا بند کر دیا۔ شاید دہشت کی وجہ سے اُس کے دل نے دھڑکنا بند کر دیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سکتے کی کیفیت سے دوچار ہو گئی ہو۔ میں بدستور بلا مقصد ہاتھ کو حرکت دیتا رہا۔ وہیل چیئر اور جین کی ماں دونوں مخالف سمتوں میں دائرے کی شکل میں حرکت کرتی رہیں۔ پھر دونوں دائرے گردش مکمل کرنے کے بعد ایک دوسرے کے نیچے اوپر آ کر رُک گئے۔ میں نے ہاتھ کو آہستہ آہستہ نیچے کی جانب جھکایا تو جین کی ماں بھی حرکت کرتی ہوئی نیچے اتر کر وہیل چیئر پر ٹک گئی۔ پھر جب وہیل چیئر لٹ چہسے انداز میں حرکت کرتی ہوئی سبزے پر آ کر رُک تو پورا علاقہ تالیوں کی آواز سے گونہ لگا۔ جین خوشی سے بے حال ہو کر مجھ سے لپٹ گئی۔ پلنگ پر موجود دوسرے افراد بھی میرے گرد حلقہ تک کرنے لگے۔ بے شمار کیمروں کی فلش گتیں جاگ اُٹھیں۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میں ایک بار پہلے بھی لندن کے

اخبارات کی شہ سرخیوں میں جگہ پا چکا تھا، میرے سلسلے میں بڑے بڑے ادارے لکھے گئے، مجھے راتوں رات وہ شہرت ملی کہ میرا آزادی سے گھومنا پھرنا محال ہو گیا۔ میں جہاں جاتا پہچان لیا جاتا۔ لوگ مجھ سے مشرق کے جادوگروں کے بارے میں دریافت کرتے، مغرب کے لوگ ہندوستان سے زیادہ تو ہم پرست ہوتے ہیں۔ میں اُن سے پیچھا چڑھانے کی خاطر الٹی سیدھی حیرت انگیز اور ناقابل یقین کہانیاں سنا کر پیچھا چڑھاتا۔ اس بار میں کسی شہرت سے بچنا چاہتا تھا۔ میں نے انکا کو یاد کیا۔ وہ شوخ ادا ڈیڑھ باشت کی کافر ادا حسینہ ہنستی مسکراتی، اٹھلاتی، بل کھاتی میرے سر پر آگئی۔ اُس کی رگ رگ سے شوخی پھوٹ رہی تھی۔ ”یہ سب کچھ اچھا نہیں ہوا انکارانی۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اگر ان شعبہ بازیوں میں گھر گیا تو میری واپسی میں پھر دُشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ تم جانتی ہو کہ مجھے کلہ پ کے ادھورے کام نمٹانے ہیں، اور بھی بہت کچھ کرنا ہے۔“

”میرے لئے کیا حکم ہے میرے آقا؟“ انکا نے الہ دین کے جادوئی چراغ کے جن کے انداز میں کورش بجالاتے ہوئے دریافت کیا۔

”میں چاہتا ہوں کہ اخبارات میں میری تصویریں نہ شائع ہوں۔“

”تم اس بات کا اعلان کر دو۔“ انکا نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”وہی ہوگا جو تم چاہو گے۔“

”میرے عزیز دوستو.....“ میں نے بلند آواز میں مجمع کو مخاطب کیا۔ ”میں نے اس وقت کسی کی فرمائش پر جو مظاہرہ کیا وہ میرے کمال فن کا ایک ادنیٰ اور حقیر نمونہ تھا۔ میں عنقریب کسی بڑے کلب یا ہوٹل میں باقاعدہ اپنے کمالات کا حیرت انگیز مظاہرہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میری درخواست ہے کہ آپ نے اس وقت جو تصاویر کھینچی ہیں انہیں ضائع کر دیں۔ ورنہ قبل از وقت اگر میری تشہیر غلط انداز میں ہوئی تو میرا آئندہ کاروبار گرام برقی طرح متاثر ہو سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری درخواست کو رد نہیں کریں گے.... شکریہ۔“

میں نے اعلان ختم کیا تو انکا میرے سر سے اتر گئی۔ پھر جو کچھ ہوا وہ میرے لئے غیر متوقع نہیں تھا۔ مجمع میں موجود افراد نے یکے بعد دیگرے اپنے اپنے کیمروں کی فلش گتیں (NEGATIVES) ضائع کرنے شروع کر دیئے۔ انکا اپنا کام مکمل کر کے دوبارہ میرے سر پر آگئی۔

”آپ نے ایسا کیوں کیا مسٹر دولت علی؟“ ولیم لیوناڈو نے جو مجھ سے بہت زیادہ متاثر نظر آ رہا تھا، دبی زبان میں کہا۔ ”یہاں تو شہرت اور پہلی کی خاطر لوگ لاکھوں خرچ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور آپ نے مفت میں ہاتھ آیا ایک سنہری موقع ضائع کر دیا۔“ ”میرا خیال ہے کہ جو لوگ شہرت کی بنیاد پر نام کماتے ہیں ان میں خود اعتمادی کا فقدان پایا جاتا ہے۔“

میرے فلسفیانہ جواب نے ولیم لیوناڈو کو لا جواب کر دیا۔ جین نے جو بڑی بے تکلفی سے میری کمر میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی اچانک نظریں گھما کر اُس جانب دیکھا جہاں کچھ افراد اُس کی ماں کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ جین کے ساتھ ساتھ میں بھی اُس طرف لپکا۔ لوگوں کو ہنساتا ہوا میں آگے پہنچا تو جین کی ماں کی حالت قابلِ تشویش نظر آئی۔ وہ اپنی وکیل چیز پر اس طرح ایک طرف ڈھلکی نظر آ رہی تھی جیسے رُوح اس قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہو، جین دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی۔

”گھبراؤ مت جمیل۔“ انکا نے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔ ”یہ صرف بے ہوش ہوئی ہے، اسے جلدی ہی ہوش آ جائے گا۔“

ولیم، سارا اور جم بھی ہمارے قریب آ گئے۔ جین نے ماں کی حالت دیکھ کر سسکنا شروع کر دیا۔ میں اُسے تسلی دینے لگا۔

”ہمیں فوراً کسی قریبی ہسپتال چلنا چاہئے۔“ ولیم نے جذباتی لہجے میں کہا پھر اُس نے تیزی سے آگے بڑھ کر جین کی ماں کو وکیل چیز سے اٹھا کر اپنے شانوں پر ڈالا اور گاڑی کی سمت دوڑنے لگا۔ میں نے پہلی بار ولیم لیوناڈو کو تفصیلی نظروں سے دیکھا، وہ ایک صحت مند خور و نو جوان تھا۔ اُس کے چہرے پر جھلکنے والی خود اعتمادی اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ اپنے اندر ہر قسم کے نامساعد حالات سے نمٹنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں نظر آنے والی چمک بتاتی تھی کہ اُس کے اندر آگے بڑھنے اور اپنی منزل پالینے کا وہ یقین موجود تھا جو انسان کو دوسروں سے سرفراز رکھتا ہے، مجموعی طور پر وہ ایک باہمت اور پُر اعتماد شخصیت کا مالک نظر آتا تھا۔

ہسپتال پہنچنے کے بیس منٹ بعد جین کی ماں کو ہوش آ گیا لیکن وہ ابھی تک حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس طرح ایک ایک کو دیکھ رہی تھی جیسے اُسے اپنے زندہ بچ جانے کا یقین

نہیں آ رہا تھا۔ سارا اور جم ہسپتال سے واپس چلے گئے، ولیم ہمارے ساتھ فارم ہاؤس تک آیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ جین اُس کی شخصیت سے خاصی متاثر نظر آ رہی تھی۔ جین کے علاوہ میں بھی اُس نوجوان کے پُر خلوص جذبے سے متاثر ہوا۔ لندن اور امریکہ کی مصروف زندگی میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ رفعتی یا امدادی کاموں میں زیادہ حصہ لے سکے۔ ان کاموں کے لئے علیحدہ ادارے ہوتے ہیں جہاں کل وقتی طور پر ملازم کارندے خدمات انجام دیتے ہیں۔

”تم اب کیسا محسوس کر رہی ہو مام.....؟“ جین نے بڑے پیار سے ماں کی خیریت دریافت کی جو ہسپتال سے واپسی کے بعد اپنی خوابگاہ میں بستر پر لیٹی چھت کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہ ابھی تک خود کو ہوا میں معلق محسوس کر رہی ہو۔ ولیم، جین کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ ماریا اور مورگن بھی ایک طرف کھڑے فکر مند نظر آ رہے تھے۔ میں بستر کی دوسری جانب تھا، انکا میرے سر پر پشت پر ہاتھ باندھے اس طرح ٹہل رہی تھی جیسے کوئی کتھی سلجھانے پر غور کر رہی ہو۔

”خدا کا شکر ہے کہ میں زندہ بچ گئی ورنہ.....“ جین کی ماں نے لمبا سانس لے کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر گردن گھما کر میری سمت دیکھتے ہوئے خفیف آواز میں بولی۔ ”دولت علی۔ تم نے جو حیرت انگیز کمال دکھایا وہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر قبل از وقت مجھے اپنے ارادے سے آگاہ کر دیتے تو شاید میری یہ حالت نہ ہوتی۔“

”میں شرمندہ ہوں۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”مجھے آپ کے علم میں لائے بغیر ایسا کچھ نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ کو اس وقت سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔“ ولیم نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ایک دو گھنٹے پُر سکون نیند سولینے کے بعد آپ خود کو پہلے سے بہت بہتر محسوس کریں گی۔“

ولیم کی تجویز معقول تھی۔ جین نے ماں کو ایک مفرح مشروب قلب پلایا، پھر ہم سب باہر آ گئے۔ ولیم نے جانے کی اجازت طلب کی تو جین نے اُسے روک لیا۔ ولیم کی خاطر مدارات کے بغیر صرف شکرے پر خُدا دینا یقیناً بد اخلاقی ہوتی۔ جین ماریا کے ساتھ کچن کی سمت چلی گئی، مورگن باہر جا چکا تھا۔ میں ولیم کے ساتھ لاؤنج میں ہی بیٹھ گیا۔ انکا نے ٹہلنا

بند کر کے ولیم کو سنجیدگی سے گھورنا شروع کر دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق نظر آرہی تھی۔  
 ”مسٹر دولت علی۔“ میں اسے اپنی خوشی سمجھتا ہوں کہ آپ جیسے بڑے فنکار سے ملاقات ہو گئی۔“ ولیم نے انکساری سے کام لیا۔ ”آج کا دن میری زندگی میں ایک یادگار بن کر ہمیشہ آپ کی یاد دلاتا رہے گا، مجھے آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ جم اور سارا اکثر آپ کے ناقابل یقین کارناموں کا ذکر کیا کرتے تھے، خاص طور پر جم نے متعدد بار اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ آپ نے ایک ناممکن کام کو ممکن بنا کر اس کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ میرے اصرار کے باوجود اس نے کسی بات کی وضاحت نہیں کی، کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ وہ کون سا ناممکن کام تھا جسے آپ نے بقول جم چٹکی بجاتے سرانجام دے دیا تھا؟“

”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی خواہش کا احترام کرنے سے قاصر ہوں۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”وہ ایک حساس نوعیت کا ایسا اہم راز ہے جس کی تشہیر دو حکومتوں کے سفارتی تعلقات کے درمیان دراڑیں بھی پیدا کر سکتی ہے۔“  
 ”شاید اسی لئے جم نے بھی اس سلسلے میں کبھی زبان نہیں کھولی۔“

کچھ دیر بعد جین بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئی۔ ماریا کے ساتھ مل کر اُس نے ولیم کی تواضع کی خاطر خاصا اہتمام کر ڈالا تھا، ماریا بڑی نفاست سے میزبانی کی خدمات انجام دینے لگی۔ مورگن کی واپسی کو ابھی صرف تین دن گزرے تھے لیکن اس مختصر عرصے میں بھی ماریا کے حسن، اُس کے رکھ رکھاؤ اور صحت پر بڑے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے تھے۔ مجھے اُس کے وجود میں زندگی کی ایک نئی لہر دکھائی دے رہی تھی۔

”جیل.....“ انکا نے جین اور ولیم کو مصروف گفتگو پا کر بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا۔  
 ”ولیم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”پہاڑ اور گہری کا جوڑ ممکن نہیں ہے انکارانی۔“ میں نے اُسے چھیڑنے کی خاطر افسوس کا انداز اختیار کیا۔ ”ولیم کا خیال دل سے نکال دو۔“

”اگر میں جین کی محبت کا رُخ ولیم کی طرف پھیر دوں تو کیسا رہے گا؟“ انکا نے میرے لطیف حراح کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بدستور سنجیدگی سے کہا۔

”تم نے اتنی جلدی میں یہ پلان کیوں کر مرتب کر لیا.....؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”میں نے ولیم کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لی ہیں۔“ انکا نے ولیم کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ولیم کا باپ لیونارڈو ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اُس نے یہ دولت بڑی محنت اور مشقت سے کمائی تھی، بڑا آدمی بننے سے پہلے وہ ایک معمولی موٹر مکینک تھا لیکن اُس کی ایک حیرت انگیز ایجاد نے راتوں رات اُسے کروڑ پتی بنا دیا۔ مگر افسوس کہ جس عورت کی کمپنی میں وہ ملازم تھا اُس نے نہ صرف لیونارڈو کی اُس ایجاد کو اپنے نام سے منسوب کر لیا بلکہ اُس کی زبان بند رکھنے کی خاطر اُس کے ساتھ شادی کا ڈھونگ رچانے میں بھی جلد بازی کا مظاہرہ کیا۔ لیونارڈو اس مکار عورت کے فریب کو نہ سمجھ سکا۔ وہ بنیادی طور پر ایک سیدھا سادھا شریف، محنتی اور ایماندار شخص تھا، بڑی آسانی سے اُس بیوہ کے جھانے میں آ گیا جو پہلے ہی اپنے مرحوم شوہر کی جمع جائیداد پر قبضہ جمائے بیٹھی تھی۔ ماریٹا نہایت چال باز اور جہاندیدہ عورت تھی اُس نے ایسا چکر چلایا کہ لیونارڈو نے اُس بدکار عورت کو اپنی خوش نصیبی سمجھ کر قبول کر لیا۔ اُس غریب کو اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب موت اور اُس کی زندگی کے درمیان چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔“  
 ”کیا مطلب.....؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

”اُس دعا باز عورت نے لیونارڈو کے گرد اپنے حسن اور جوانی کا ایسا حسین اور مضبوط جال بنا کہ وہ اُس کی تھا بھی نہ پاسکا۔“ انکا نے بات جاری رکھی۔ ”ماریٹا نے لیونارڈو سے اپنی محبت اور شادی کی خواہش کا اظہار کرنے سے پہلے ہی ایک اچھی خاصی بڑی رقم اُس کے نام سے بینک میں جمع کرادی۔ لیونارڈو کی نظروں کے سامنے شاندار مستقبل تھا۔ زندگی سنوارنے اور بڑا آدمی بننے کی خواہش کسی بھی شخص کو دیوانہ کر سکتی ہے۔ لیونارڈو کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ماریٹا کھیلی کودی، تجربہ کار عورت تھی۔ اُس نے شادی کرنے کی غرض سے شہر سے دُور عارضی طور پر ایک شاندار رہائش گاہ کرائے پر حاصل کر لی۔ شادی کے بعد اُس نے لیونارڈو کو مصروف رکھنے کی خاطر اُسے زندگی کی بیش قدر آسائشیں اسی عمارت میں فراہم کر دیں جہاں کئی ضرورت مند، خویر اور جوان ملازمائیں بھی اُس کا دل بہلانے کو موجود تھیں۔ لیونارڈو شراب اور شباب کے دلدل میں پھنسا آنے والے خوشگوار مستقبل کے خوابوں میں گم رہا۔ شادی کے ڈیڑھ سال بعد ماریٹا نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا جسے لیونارڈو کی ذات سے منسوب کیا گیا۔“



کو بھی شیریں فرہاد کے سانچے میں ڈھال سکتی ہوں۔“  
 ”میں بھول گیا تھا انکارانی کہ تم ہر مرض کا علاج ہو۔“ میں نے شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اس بات کا خیال بھی رکھنا کہ جین کی ماں کے دماغ میں لڑکے کا انتخاب کرتے وقت اسٹیش کا کیڑا ضرور کھلائے گا۔“

”تم سب کچھ میرے اوپر چھوڑ دو۔۔۔۔۔“ اُس نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”خاموشی سے دیکھتے رہو کہ تمہاری انکارانی اب کیا کیا گل کھلاتی ہے۔۔۔۔۔“  
 میں نے کوئی مزید بات نہیں کی۔ میں انکا کی ذات سے بخوبی واقف تھا، میرا اُس کا برسوں کا ساتھ تھا، میں جانتا تھا کہ وہ جو کہتی ہے اسے کر گزرنے کی طاقت بھی رکھتی ہے۔ کچھ دیر بعد ولیم جانے کے ارادے سے اٹھا تو انکا میرے سر سے اتر گئی۔ جین، ولیم کو رخصت کرنے کی خاطر دروازے تک گئی۔ ماریا برتن سمیٹ کر کچن کی سمت جارہی تھی میں اُس کے سراپا کو دیکھنے لگا۔ پھر میری نظر دروازے کی سمت اُٹھی تو میرے اندر رقابت کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ بیرونی دروازے کے قریب جین بڑے والہانہ انداز میں ولیم کی ہانہوں میں سٹھی نظر آئی۔ ولیم اُس کے ہونٹوں کا رش کشید کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ انکا اس وقت جین کے سر پر موجود ہوگی۔ میں نے جلدی سے نظریں پھیر لیں۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو رہی تھی جب جین نے میرے قریب آکر بڑی معصومیت سے مخاطب کیا۔  
 ”کہاں گم ہو دولت علی۔۔۔۔۔؟“ اُس کے چہرے کے بھولپن سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ابھی تک انکا کے زیر اثر تھی۔

”میں تمہاری ماں کے بارے میں غور کر رہا تھا۔“ میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ”مجھے شاید اُن کے ساتھ۔۔۔۔۔“

”جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔“ وہ میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ پھر پینک کے دوران ہونے والی جھوٹی جھوٹی باتوں کو مزے لے لے کر دہرانے لگی۔ میں اُس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ کاش میں جین کو بتا سکتا کہ اُسے ولیم کی ہانہوں میں مچلتا دیکھ کر میرے دل پر کیا قیامت گزر گئی تھی۔ انکا نے بھی کاٹا بند لٹے میں بڑی عجلت کا مظاہرہ کیا تھا۔

وہ رات میں نے کانٹوں کے بستر پر کروٹیں بدل بدل کر گزار دی۔ انکا نے ولیم اور جین کے ستارے ملا کر مجھے حالات سے رہائی دلانے کی کوشش کی تھی لیکن جین کو کسی دوسرے کی

”کیا ولیم مارٹینا اور لیونارڈو کی محبت کا نتیجہ نہیں تھا۔۔۔۔۔؟“ میں چونکا۔  
 ”مغربی تہذیب میں پچاس فیصد بچوں کو اُن کی ماں کے نام سے پچانا جاتا ہے۔“ انکا نے حقارت سے کہا۔ ”شاید مارٹینا بھی مکمل یقین اور اعتماد کے ساتھ نہیں بتا سکتی کہ ولیم کس کا لطفہ ہے۔“  
 ”لیونارڈو کا کیا بتا۔۔۔۔۔؟“ میں نے پہلو بدل کر سوال کیا۔

”بڑی طویل داستان ہے جمیل صاحب۔“ انکا نے سرد آہ بھری۔ ”ولیم کی پیدائش کے چار سال بعد غریب لیونارڈو کثرت شراب نوشی کی وجہ سے ایک رات اپنی خوابگاہ میں مُردہ پایا گیا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اُسے سلو پوائزنگ (SLOW POISONING) کے ذریعے راستے سے ہٹایا گیا تھا۔ مرنے سے پیشتر مارٹینا، لیونارڈو سے ایک دوسادہ چیکوں پر دستخط کرا کے بینک میں اُس کے نام پر جمع رقم کا بیشتر حصہ وقتاً فوقتاً کیش کرا کے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا چکی تھی۔ موت کے بعد لیونارڈو کے نام پر محض دو ہزار ڈالر بینک کے کھاتے میں پائے گئے۔ اس کے بعد ولیم کو زیادہ دنوں مارٹینا کی آغوش کی گرمی نصیب نہیں ہوئی، اُس کی پرورش ایک گورنس کے ذمہ کر دی گئی۔ پانچ سال تک وہ فریبی عورت کی نہ کسی طرح اُس کے وجود کو اپنی چھت کے نیچے برداشت کرتی رہی پھر ولیم کو ڈر دروازے کے ایک تعلیمی ادارے کے ہوشل میں داخل کرا دیا۔ نو دس سال تک ولیم اسی ہوشل سے وابستہ رہا۔ پھر اس نے عملی زندگی میں قدم رکھا۔“ انکا نے سانس لیتے ہوئے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”ہوشل سے فارغ ہونے کے بعد وہ مارٹینا کے ساتھ بمشکل دو ماہ گزار سکا پھر اُس کی سردمہری اور بے اعتنائی سے دلبرداشتہ ہو کر علیحدگی اختیار کر لی۔ اب یہ ایک انشورنس کمپنی میں ملازم ہے، اس کا کردار بے داغ ہے، مخنتی اور ایماندار بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جین کے لئے ولیم ایک بہترین انتخاب ثابت ہوگا۔۔۔۔۔“

”کیا جین آسانی سے میری محبت سے دستبردار ہو جائے گی؟“ میں نے ولیم کی زندگی کے تمام نشیب و فراز کی تفصیل جاننے کے بعد سوال کیا۔  
 ”جم اور جین کی محبت کو بار بار کیوں فراموش کر دیتے ہو؟“ انکا نے جھپکتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر میں ایک بار تمہاری خاطر جین اور جم کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کر کے جم اور سارا کے ستارے ملا سکتی ہوں تو دوسری بار بھی تمہاری مجبوریوں کے پیش نظر جین اور جم

بانہوں میں دیکھنا مجھے گوارا نہیں تھا۔ میں اُس کے حسن کا دیوانہ تھا، اُس کی خاطر پچھلی بار میں نے لندن میں اپنے قیام کو طویل دیا، جم یا اُس کے مشن کی کامیابی یا ناکامی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جین، جم کی دیوانی تھی۔ میں نے کسی سپرے کی طرح اُسے پنی بین کی دھن پر جھومنے کا عادی بنانے میں بڑی صبر آزمائیاں گزاری تھیں۔ انکا کے ذریعے میں ایک بل میں اُس کی جوانی کی سرکش اداؤں کو تاراج کر سکتا تھا۔ انکا کو ایک اشارہ بہت ہوتا۔۔۔۔۔ جین خوش خوشی میری بانہوں میں سینے کو اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتی۔ سب کچھ ممکن تھا، ہر بات میرے اختیار میں تھی۔ لیکن جین دوسری لڑکیوں سے مختلف تھی۔ میں اُسے کھلونے کی طرح استعمال کر کے توڑتا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنی تعقیبی بجھانے کی خاطر اُس کی رضامندی کا طویل انتظار کیا۔۔۔۔۔ مجھے میرے خوابوں کی تعبیر مل گئی، انکا نے جم کو درمیان سے ہٹا دیا۔ میدان میرے لئے صاف ہو گیا۔ پھر حالات نے جین کو مجھ سے دور کر دیا، مجھے بڑی جگت میں لندن کو خیر باد کہنا پڑا۔ وقت گزرتا گیا، میں شاید جین کو بھول گیا تھا؟ نہیں، وہ میرے دل کے نہاں خانوں میں دہکی بیٹھی کسی مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ حالات نے اُسے وہ موقع فراہم کر دیا۔ کلدیپ کی جوان موت نے میری کمر توڑ دی، محرمیوں کا شکار کر دیا۔ پھر عین اُس وقت جب میں موت اور زندگی کے درمیان پر کھڑا تھا جین نے اچانک سامنے آ کر حیران کر دیا۔ اُس کی لگن سچی تھی، اُس نے مجھے بدترین حالات میں اپنی مہکتی بانہوں کا سہارا دیا، میں ششدر رہ گیا۔

عجیب مذاق تھا، جب میں نے چاہا جین کی آمدگی بھی شرط ہو تو اُس نے مہلت طلب کر لی۔ اب وہ گلے گلے آمادہ تھی تو پریم لال نے کلدیپ کی آتما کے بے چین ہو جانے کا احساس دلا کر میرے قدموں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ میرے ماضی کی داستان مختلف ذات پات کی خور و لڑکیوں کے ساتھ گزرے ہوئے رنگین لمحوں سے بھری پڑی ہے۔ ایک سے ایک سرکش حسینائیں میری خواہشات کی دہلیز پر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو چکی تھیں۔ میں بے دھڑک اُن کے حسن، اُن کے غرور کو پیروں تلے روندتا، اُن کے جسم کے گاڑھے اور تازہ خون سے انکارانی کے وجود کو سیراب کرتا پھر آگے بڑھ جاتا۔ میرے اوپر کوئی روک ٹوک، کوئی بندش نہیں تھی۔۔۔۔۔

پریم لال نے بھی مجھے موج میلہ کرنے سے منع نہیں کیا تھا، میں جین کے جوان مہکتے

وجود سے بھی اپنی پیاس بجھا سکتا تھا لیکن میں اُس کے ذہن میں تعمیر محبت اور عقیدت کے تاج محل نہیں ڈھانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ وہ میری نظروں کے سامنے کسی دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر بوس و کنار کرے یہ بھی میری برداشت سے باہر تھا۔ انکا پہلے ہی دہلی زبان میں اس خطرے کا اعلان کر چکی تھی کہ آگ اور پٹرول کا ساتھ مناسب نہیں ہے۔ میں تکمیل آرزو میں مصلحتوں سے کام لیتا رہا، میں نے دیر کر دی، وقت میرے ہاتھوں سے پھسل گیا۔۔۔۔۔!

رات میری آنکھ دیر سے لگی۔ دوسرے دن اتوار تھا لیکن میری نیند پوری نہیں ہو سکی۔ کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر بیدار کیا، میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ جین شب خوابی کے باریک لباس میں میرے سامنے موجود تھی۔ اُس کا تسمیں بدن جھلک رہا تھا۔ میرے اندر سویا ہوا طوفان جاگنے لگا، میرے نگار سینے میں سلگتے ارمانوں نے مجھے اُکسانے کی کوشش کی۔

”جمیل احمد خان۔ تمہیں اس سے خوبصورت موقع شاید دوبارہ میسر نہ ہو۔ تمہارا محبوب تم سے ایک قدم کے فاصلے پر ہے، ہاتھ بڑھاؤ۔ لچکتی شاخ کو اپنے بازوؤں میں گھسیٹ لو۔ کپے ہوئے پھل کو توڑنے میں دیر کرنا دانشمندی کے منافی ہے۔ تم نے دیر کی تو کوئی اور اُچک لے جائے گا۔ اپنی پیاس بجھا لو ورنہ ہمیشہ کف افسوس ملے رہ جاؤ گے۔“

میرے جسم پر چوینیاں ریگنے لگیں۔ باریک گاؤں سے جھلکتے جین کے جسمانی نشیب و فراز بڑے ہیجان انگیز تھے۔ میں نے ہاتھ تھام کر اُسے اپنے پہلو میں گھسیٹ لیا۔ اُس کے بدن کی سوندھی سوندھی خوشبو مجھے دیوانہ کر رہی تھی جب اُس کی گھبرائی ہوئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

”دولت علی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جم کا فون آیا تھا۔ اُس نے مجھے ایک پریشان کن اطلاع دی ہے۔“

جین میری بانہوں میں کسمسا رہی تھی۔ اُس کی آواز صدا بہ صحرا ہو کر رہ گئی۔ میں نے اس قیامت کو پوری شد و مد سے اپنے اندر ضم کرنے کی کوشش کی، جین نے معمولی مزاحمت کرتے ہوئے مجھے دوبارہ مخاطب کیا۔

”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو دولت علی۔ جبیک ایک عورت کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اب اُس کا پرانا ریکارڈ ضرور کھنگالا جائے گا۔ جم اور سارا دونوں

”ایک تیر سے تین نشانے لگائے ہیں۔“ انکا دونوں ہاتھ کولہوں پر ٹکا کر سر پر چہل قدمی کرتے ہوئے بولی۔ ”کرشی کی روح بھی مائیکل سے اپنی موت کا انتقام لینے کو بے چین تھی۔ مارینا کی بدکرداری بھی حد سے تجاوز کرتی جا رہی تھی اور تمہاری انکارانی کو بھی اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے تازہ خون کی ضرورت تھی، میں نے سارے کام ایک ساتھ نمٹا دیئے، نس کم جہاں پاک۔“

”دولت علی، پلیز۔“ جین کا اضطراب بڑھنے لگا۔ ”کچھ سوچو۔ اگر میرا نام درمیان میں آ گیا تو میں بڑی دشواریوں میں پڑ جاؤں گی۔“

”جین کو یقین دلا دو جیل۔“ انکا سرے اُچھل کر میرے کندھے پر آ گئی۔ ”میں نے کچا کام نہیں کیا۔ پولیس کے فرشتوں کو بھی جیکب یا مائیکل کے بارے میں کوئی پچھلا ریکارڈ دستیاب نہیں ہو سکے گا۔ جم کا دوسرا فون جین کی ساری بے چینی دور کر دے گا۔“

میں نے انکا کے کہنے پر جین کو مطمئن کرنے کی خاطر دلا سا دیا۔ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی جب لاؤنچ والے فون کی گھنٹی بجی، جین تیزی سے قدم اٹھاتی کمرے سے نکلے۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے لگا۔ انکا میرے کندھے پر بیٹھی دونوں پاؤں ہلا رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر اطمینان جھلک رہا تھا۔

جین فون پر تین چار منٹ بات کرتی رہی، اُس کے چہرے پر اضطراب کی جگہ حیرت اور استعجاب کے طے جلے تاثرات ابھرنے لگے۔ فون بند کرنے کے بعد اُس نے مجھے بڑی جذباتی نظروں سے دیکھا۔

”دولت علی۔ مجھے ایک بار تفصیل سے بتا دو کہ تم کیا چیز ہو؟ میں نے مشرقی جادو گروں اور پنڈت پجاریوں کے سلسلے میں بہت کچھ سن رکھا ہے لیکن تمہاری ماورائی اور روحانی قوتوں کا کرشمہ دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں تمہیں کیا سمجھوں؟ کہیں تم کوئی جن یا بھوت تو نہیں جو اتنی آسانی سے ناقابل یقین اور حیرت انگیز کارنامے انجام دے ڈالتے ہو؟“

”جم نے اب کیا اطلاع دی.....؟“ میں نے شکھیوں سے انکا کی طرف دیکھا۔ اُس کے پتلے پتلے نازک ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

”جم کے علاوہ موقعہ واردات پر موجود ٹیم کے دوسرے افراد بھی حیرت زدہ ہیں۔ اُن کا

جانتے ہیں کہ وہ میرے ہاں ملازمت کر چکا ہے۔ کچھ سوچو دولت علی۔ جیکب کے مفرد طرز ہونے کی بات کھل گئی تو مجھ سے بھی باز پرس ضرور ہوگی۔“

میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر مجھ سے دور ہو گئی۔ جیکب کے کسی عورت کو قتل کر دینے کی اطلاع نے اُسے خاصا پریشان کر دیا تھا، بڑی اُلجھی اُلجھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں اُنھ کو بیٹھ گیا۔ انکا کے خراٹوں کی ہلکی ہلکی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ میں نے اُسے عالم تصور میں دیکھا، دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے وہ اس پر سر رکھے بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا، کل رات تک اُس کا چہرہ زردی مائل تھا لیکن اب قدحاری انار کی مانند سرخ ہو رہا تھا، اُس کے نازک نازک ہونٹوں پر سرخی تیر رہی تھی۔ میرا ماتھا ٹٹکا، انکا کا اطمینان اور چہرے کی رنگت جھپٹی کھا رہی تھی کہ وہ کسی کے تازہ خون سے اپنے وجود کو سیراب کرنے کے بعد بے فکری کی نیند سے دوچار ہے۔ جو خبر جین نے سنا تھی اس کی پشت پر انکا کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔

”دولت علی۔“ جین نے بے چینی سے کہا۔ ”تم نے کہا تھا کہ جیکب کی طرف سے مجھے بے فکر ہو جانا چاہئے۔ لیکن اُس کا سابقہ ریکارڈ.....“

”اپنے آپ کو ہلکان مت کرو۔“ میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”تمہارا نام کسی طرح درمیان میں نہیں آنے پائے گا۔“

انکا کو بیدار کرنے کی خاطر میں نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو کٹکھسی کی طرح بالوں میں پھیرا۔ وہ توبہ شکن انگڑائی لے کر اُنھ بیٹھی۔ اُس کی نگاہوں سے غماز چھلک رہا تھا۔ جین کو منہ صبح میرے کمرے میں دیکھ کر وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی۔ لیکن بڑے تجاہل عارفانہ سے جمائی لپٹے ہوئے بولی۔

”کیا بات ہے جمیل؟ تم دونوں اتنے اُلجھے اُلجھے کیوں نظر آ رہے ہو؟“

”ابھی جم نے فون پر اطلاع دی ہے کہ جیکب نے گزشتہ رات کسی عورت کو قتل کر دیا۔“

میں نے انکا کے چہرے کے تاثرات پر نظر جمائے رکھی۔

”ہاں، جم نے غلط نہیں کہا۔“ انکا نے لا پرواہی سے کہا۔ ”مارینا نے جو سلوک ولیم اور اُس کے مرحوم باپ کے ساتھ کیا اس کی سزا تو اُسے ملنی ہی تھی۔“

”کیا مطلب.....“ میں چونکا۔ ”کیا تم نے.....“

خیال ہے کہ قاتل کوئی مافوق الفطرت انسان تھا جس نے پولیس اور قانون کے لئے کوئی سراغ باقی نہیں چھوڑا۔“

میں نے جواب میں صرف مسکرانے پر اکتفا کی۔ جین نے بات جاری رکھی۔

”جم بڑے یقین سے کہہ رہا تھا کہ اُس نے قاتل کو جبک کی حیثیت سے شناخت کیا تھا، اُسے مقتولہ کی لاش کے قریب ہی کھڑا پایا گیا تھا، حیرت ہے کہ اُس نے واردات کے بعد فرار ہونے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ جم کا بیان ہے کہ قاتل کو جھٹکڑی پہنا کر لے جایا جا رہا تھا جب وہ چکرا کر گرا پھر حیرت انگیز طور پر اُس کے چہرے کے نقوش اور جسم کے تمام اعضاء اپنی ماہیت کھونے لگے۔ جسم کا گوشت اس طرح جھڑنے لگا جیسے کوئی نادیدہ پراسرار قوت اُسے تیزی سے کھا رہی ہو اور اب..... اب پولیس کی تحویل میں ایک استخوانی منجر کے سوا باقی کچھ نہیں ہے۔ یہ سب کس طرح ممکن ہوا دولت علی؟ محکمہ سراغ رسانی میں کھلبلی مچ جائے گی، اخبارات چیخ اٹھیں گے۔ اس سے پیشتر ایسا کبھی نہیں ہوا۔“

”جین.....“ میں نے انکا کے اُکسانے پر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”حالات کے پیش نظر اب مجھے کچھ دنوں کے لئے تمہارے فارم ہاؤس سے دُور رہنا ہوگا۔ اگر یہ اقدام فوری طور پر نہ اٹھایا گیا تو میرے اور تمہارے درمیان فاصلے بڑھ جائیں گے۔ صرف دو تین ماہ کی مجبوری ہے، اس کے بعد میں پھر واپس آ جاؤں گا۔“

”نہیں دولت علی.....“ وہ دیوانی لڑکی بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ اس طرح اپنی مرمیس بانہوں میں سختی سے جکڑ لیا جیسے وہ مجھے کہیں جانے سے روک لے گی۔

”کسی کمزوری کا مظاہرہ نہ کرنا جیل صاحب۔ ورنہ ایسا سنہری موقع مشکل سے ہاتھ آئے گا۔“ انکا اپنا جملہ مکمل کر کے میرے سر سے اتر گئی۔ میں سمجھ گیا وہ جین کے سر پر گئی ہوگی۔

”تمہاری خاطر میں جان بھی دے سکتا ہوں مگر.....“

”ایسا مت کہو دولت علی۔“ جین کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ میرے سینے پر سر ٹکا کر سسکتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں رکنے پر مجبور نہیں کروں گی، تمہارے بغیر میرے دن رات کس طرح گزریں گے؟ میں نہیں جانتی۔“

میں اپنے جسم پر جین کے سینے کی دھڑکن محسوس کر رہا تھا، میرے اندر کا آتش نشاں

پھٹ پڑنے کو مچلنے لگا، میں نے ضبط سے کام لیا۔ تا دیر جین کی سسکیاں میرے صبر کو آزماتی رہیں، پھر وہ چہرہ اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے جذباتی لہجے میں بولی۔

”میں دو مہینے تو کیا دو زندگیوں تک تمہارا انتظار کر سکتی ہوں۔“

میں نے جین کو بہلانے کی خاطر اپنے سلگتے ہونٹ اُس کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ اُسی شام میں جین کے فارم ہاؤس پر الوداعی نظریں ڈالتا ہوا پوش علاقے کے ایک فائبر اسٹار ہوٹل میں منتقل ہو گیا۔ سید مجذوب کی لاشی میرے ساتھ تھی.....!!





میرے اندر جوار بھائے کی کیفیت پیدا ہوئی تو انکا پہلو بد لئے لگی۔  
 ”میرے اس مصنوعی ہاتھ کی طرف ایک نظر ڈالو انکارانی۔“ میں زہر خند سے بولا۔  
 ”تمہیں تو یاد ہوگا کہ میرا ہاتھ کس طرح کاٹا گیا تھا؟ اُس لمحے کی طرف پلٹ کر دیکھو جب  
 میری مجبور اور بے قصور نرس کے گلاب بدن کو ایک جنسی جنونی نوچ کھسوٹ رہا تھا۔ کیا  
 تصور تھا نرس کا؟ وہ غریب تو میری بہتری کے لئے سوچ رہی تھی اور وقت نے اُسے ایسی  
 ہولناک سزا دی کہ میں.....“

”میں شرمندہ ہوں جمیل۔“ انکا کی آواز بھرا گئی۔ ”یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم  
 نے ایک دوسرے کی ضرورتوں کو پوری طرح نہیں سمجھا تھا۔ لیکن اب تو ہم لازم و ملزوم.....“  
 ”نہیں.....“ میں جھلا گیا۔ ”میں نہیں مانتا، کوئی لازم و ملزوم نہیں ہوتا۔ سب دنیا دکھاوا  
 ہے، جھوٹ ہے، مکر ہے، فریب ہے۔ تم نے وقت کی بات چھیڑی تھی، میں تردید نہیں کروں  
 گا۔ وقت ہی وہ بھیا نک اور ہولناک عفریت ہے جو انسان کی خوشیوں کو نگل جاتا ہے۔ ہم  
 سب وقت کے سامنے بے بس ہیں۔ تم بھی، میں بھی۔ وقت پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ آندھی  
 اور طوفان کا ایک تیز جھکڑ چلتا ہے، بڑے بڑے تناور درخت جڑیں چھوڑ کر زمیں بوس ہو  
 جاتے ہیں۔ سب ٹائیں ٹائیں فٹ ہو جاتا ہے۔ ہم دل کی تسلی کے لئے ایک دوسرے پر  
 تہمتیں لگانے بیٹھ جاتے ہیں، دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر ایک دوسرے کو مورد الزام  
 ٹھہراتے ہیں، اپنی غلطی کون تسلیم کرتا ہے؟“  
 میں نے انکا کو تیز نظروں سے گھورا۔

”بولو انکارانی..... جواب دو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں.....“ انکا نے مجھے سہمی سہمی نظروں سے دیکھا۔ ”دنیا کی ریت کو بدلا نہیں جا  
 سکتا۔ میں تمہاری باتوں سے اتفاق کرتی ہوں۔“ انکا نے میرے سامنے سپر ڈال دی تو مجھے  
 ہنسی آگئی۔ شاید اُس نے میری ذہنی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ بحث کر کے زیادہ نہیں الجھنا  
 چاہتی تھی۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ بخنہ اُدھرنے سے حاصل بھی کیا تھا؟ جو گزر  
 چکا تھا واپس نہیں آسکا تھا، جو آنے والا تھا اس کے لئے سوچنا ضروری تھا۔

”اس شہر میں شاید پہلی واری آئے ہوئیں.....؟“ کب کے سکھ ڈرائیور نے خاموشی  
 سے اکتا کر مجھے مخاطب کیا۔

جین کے فارم ہاؤس سے فائو اسٹار ہوٹل تک کا سفر بڑا تکلیف دہ تھا۔ جین نے میرے  
 جانے کے لئے ایک کیب (CAB) منگوائی تھی۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جب تک فارم  
 ہاؤس نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا میں مشتاق نظروں سے پلٹ پلٹ کر جین کو دیکھتا رہا۔ وہ  
 اپنے لان پر کھڑی ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے وٹ کر رہی تھی۔ جین کی جدائی کا ایک ایک لمحہ میرے  
 لئے بڑا تکلیف دہ تھا۔ انکا سر پر بیٹھی کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ جین نظروں سے اوجھل  
 ہو گئی تو میں نے ایک سرد آہ بھر کر انکا کو مخاطب کیا۔

”جین کے بغیر لندن میں دل نہیں لگے گا۔ ہمیں ہندوستان جانے کی خاطر تیاری کرنی  
 ہوگی۔“

”میں تمہاری اُداسی دیکھ رہی ہوں جمیل۔“ انکا نے ہمدردی ظاہر کی۔ ”لیکن ہم جو کچھ  
 کر رہے ہیں اس میں تمہاری جین کا ہی فائدہ ہے۔“

”نفع اور نقصان کی بات مت کرو انکارانی۔“ میں یلکھت تلخ ہو گیا۔ ”میں نے زندگی  
 میں کیا کھویا، کیا پایا تم اس کی شاہد ہو۔ اب زندگی کی تمنا کس کجخت کو ہے؟“

”ایسی باتیں مت کرو۔“ انکا نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ”وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔  
 زندگی میں تغیرات آتے جاتے ہیں۔ وقتی طور پر کسی اپنے سے بچھڑ جانے کی تکلیف ضرور  
 ہوتی ہے، لیکن وقت.....“

”کس وقت کی بات کر رہی ہو؟“ میری بے چینی سوا ہو گئی۔ ماضی میں دفن ڈھیر کو کرید  
 کر انکا نے کچھ پرانے زخم تازہ کر دیئے۔ ”نرس یاد ہے تمہیں.....؟“ میں نے اُسے خشکیوں  
 نظروں سے دیکھا۔ ”میں نے اُسے دل کی گہرائیوں سے چاہا، اُس کے حصول میں بے شمار  
 دشواریاں جائل تھیں، تم نے کرم کیا تو ایک ایک کر کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ میں نے  
 نرس کو پالیا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟“

”آپ کو کہاں جانا ہے؟“ ایک کارندے نے بظاہر مسکرا کر پوچھا لیکن میں نے اُس کی مسکراہٹ میں چھپے گہرے طنز کو محسوس کر لیا۔

”میں تمہارے اس ہوٹل میں قیام کر کے اس کی شہرت میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

”سوری سر.....“ اُس نے رُو کھے لہجے میں فیصلہ سنا دیا۔ ”آپ اس ڈنڈے کے ساتھ اندر نہیں جاسکیں گے۔“

”کون روکے گا مجھے.....؟“ میں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ نندا کی بخشی ہوئی قوتوں کو آنکھوں میں سمیٹ کر اعتراض کرنے والے کو گھورا تو وہ کسی گرتے ہوئے ستون کی طرح لڑکھڑانے لگا۔ دوسرا کارندہ مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ صدر دروازے کے وسیع و عریض ٹرانسپیرنٹ شیشے کی دوسری جانب خاصی گہما گہما نظر آرہی تھی۔ گیٹ پر لڑکھڑاتے ہوئے ساتھی کو دیکھ کر کچھ دوسرے کارندے بھی لپک کر باہر آ گئے۔ وہ بے ہوش تھے کہ مجھے لاشی باہر چھوڑنی پڑے گی۔ میں ایک لمحے کو بھی سید کی لاشی سے جدا ہونے کو تیار نہیں تھا، بات بڑھتی گئی۔

دروازے پر بھیڑ جمع ہونی شروع ہوئی تو آنے جانے والوں کی پیشانی شکن آلود ہونے لگی۔ ایک ہندوستانی کی جسارت انہیں پسند نہیں آتی تھی۔ اُن کی نظروں میں حقارت تھی۔ میرا خون کھولنے لگا۔ لیکن اس سے پیشتر کہ میں اُن کے سامنے اپنی طاقت کا کوئی اور کرشمہ پیش کرتا، ہوٹل کا جنرل منیجر لمبے لمبے قدم اٹھاتا قریب آ گیا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے آدمیوں کو اندر جانے کی ہدایت کی، میں سینہ تانے ڈٹا رہا، ملازموں کے جانے کے بعد جنرل منیجر نے مجھے بڑے مودبانہ انداز میں مخاطب کیا۔

”آئی ایم پوری مسٹر دولت علی۔ ہمیں ابھی ابھی فون پر آپ کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔ آپ ہمارے ہوٹل میں ٹھہریں گے تو یہ ہمارے لئے ایک اعزاز ہوگا.....“

جنرل منیجر کی مداخلت پر مجمع کافی کی طرح چھٹ گیا۔ میں نے قدم آگے بڑھا دیئے، مجھے ہوٹل کی ساتویں منزل پر واقع ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ سید کی لاشی میرے ساتھ ہی تھی۔ میں نے گھوم پھر کر تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں ضرورت کی تمام اشیاء موجود تھیں۔

”خود نہیں آیا۔“ میں نے سر دلچرا اختیار کیا۔ ”حالات لے آئے ہیں۔“

”سچ دس رہے ہو برادر۔ حالات ہی بندے کا کچھ مر نکال کر کھو دنا تیل بنا دیتے ہیں۔“

”تمہارا نام؟“ میں نے دل بہلانے کی خاطر سوال کیا۔

”ہرنام سنگھ۔“ اُس نے دل برداشتہ انداز میں جواب دیا۔ ”پانچ ورش پہلے اپنی وحشی کے ساتھ لندن دی سیر واسطے آیا تھا۔ وہ..... ایک چٹی چمڑی والے دے نال نس گئی، میں ٹاپتارہ گیا۔ اب اُس کی تلاش میں ایسی کم تہی کرانا پھر رہا ہوں۔“

”وحشی کو تلاش کر کے کیا کرو گے؟“ میں سنہل کر بیٹھ گیا۔ ”اب وہ مل بھی گئی تو تمہارے کس کام کی؟“

”واہ گرو دی سو.....“ ہرنام سنگھ کی غیرت کو جلال آ گیا۔ ”وہ..... بس ایک واری مجھے مل جائے، میں اُس کے ٹوٹے کردیاں گا۔ پھر بھلے پھانسی لگ جائے۔“

”بھول جاؤ اُسے۔“ میں نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔ ”میری مانو تو تم بھی کسی گوری چٹی میم کو آپک لو۔ جب تک گاڑی چل سکے اُس سے اپنی وحشی کا حساب چکتا کرتے رہو.....“

جب کھٹارا ہو جائے تو اونے پونے کہیں بھیڑ دینا۔“

”ان کڑیوں کو اپنانے دی کی لوڑ ہے؟“ ہرنام سنگھ نفرت سے بولا۔ ”دو پیک ان کے حلق وچ انڈیل دو، جو تک کی طرح چمٹ جائیں گی۔“

”تم آدمی دلچسپ ہو ہرنام سنگھ۔ لندن میں میرا قیام زیادہ طویل نہیں ہوگا۔ لیکن ملتے رہنا، شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔“

انکا خاموش بیٹھی میری اور ہرنام سنگھ کی باتیں سنتی رہی۔ کیب ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر رُک کر تو میں نے بڑی فیاضی کا ثبوت دیا۔ جب میں جتنے بھی کرنسی نوٹ تھے سب نکال کر ہرنام سنگھ کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے تیزی سے قدم آگے بڑھا دیئے۔ انکا سنہل کر بیٹھ گئی۔ ہوٹل کے بیرونی گیٹ پر تعینات باوردی کارندوں نے مجھے حیرت سے دیکھا، میرے ایک شانے پر مختصر سا بیگ تھا، دوسرے ہاتھ میں، میں نے سید کی لاشی تھام رکھی تھی۔ لباس بھی اتنا خاص نہیں تھا کہ وہ میری حیثیت سے مرعوب ہوتے۔ چنانچہ میری راہ میں حائل ہو گئے۔ انکا میرے سر سے اتر گئی۔

”سر.....“ جنرل میجر نے باادب دریافت کیا۔ ”آپ کا سامان کب آئے گا؟“

”میں غیر ضروری باتیں پسند نہیں کرتا۔“ میں نے انگریزوں سے ہندوستانوں کی ازلی نفرت کے اظہار کا موقع ضائع نہیں کیا۔ ”آپ جاسکتے ہیں۔“

جنرل میجر کی پیشانی پر پل آتے آتے رہ گیا۔ اسی لمحے ایک حسین لڑکی قدم اٹھاتی کمرے میں داخل ہوئی۔ بڑی ہنس کھ، بے حد اسارٹ، ہوٹل کے مہمانوں کو خوش رکھنے کے سلسلے میں تمام کیل کانٹوں سے لیس۔ اُس کے جسم کا انگ انگ پیشہ وارانہ انداز میں تھرک رہا تھا۔ مجھے اُسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ سینے کے ابھار پر لگی آسانی نیم پلیٹ پر سفید چلی حروف سے اُس میزبان (ہوسٹس) خاتون کا نام بھی درج تھا۔

”یہ میس میلبا ہیں۔“ جنرل میجر نے ”میں“ پر زور دے کر تعارف کرایا۔ ”انہیں آپ کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔“

”مجھے دولت علی کہتے ہیں۔“ میں نے بے تکلفی سے میلبا کا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی، جنرل میجر میری جسارت پر تمللا کر رہ گیا۔ وہ بل کھاتا چلا گیا تو میں نے میلبا کو تنصیلی نظروں سے دیکھا، وہ درمیانہ قد اور چھریرے بدن کی ایک حسین لڑکی تھی۔ اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا، اُس کے لمس میں وہ گرمی کچھ زیادہ ہی تھی جو جنس مخالف کے جذبات براہیختہ کرنے میں موثر ثابت ہوتی ہے۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی، غیر ممالک کے ہوٹلوں میں ”میزبان خواتین“ کا انتخاب ٹھونک بجا کر کیا جاتا ہے۔ انہیں وہ گر سکھائے جاتے ہیں جو مہمانوں کو زیادہ سے زیادہ قیام پر آمادہ کر سکیں۔ ان میں جھک نام کی کوئی شے نہیں پائی جاتی، اپنے فرائض کی ادائیگی میں وہ بڑی بے باکی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

”میرے لئے کوئی حکم.....؟“ میلبا نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گنگنائے لہجے میں پوچھا۔ اُس کا انداز دلبرانہ تھا۔ شاید مجھے اتناڑی سمجھ کر چارہ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”نی الحال میں کچھ دیر آرام کروں گا۔“ میں نے دیدہ و دانستہ سردمہری کا مظاہرہ کیا۔ ”ضرورت ہوئی تو گھنٹی بجا کر تمہیں کوئی زحمت دوں گا۔“

میلبا چلی گئی۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا، بستر پر لیٹ کر چین کے بارے میں سوچ رہا تھا جب انکا سر پر واپس آگئی۔ بڑی بھیجی بھیجی سی نظر آرہی تھی۔ غالباً میری کھری کھری باتیں ابھی تک اُس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔

”کہاں گم ہوا انکارانی.....؟“ میں نے دوستانہ لہجے میں سوال کیا۔

”تمہیں تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں جمیل۔“ انکا کے لہجے میں شکوہ تھا۔ ”میں

محسوس کر رہی ہوں کہ اب تم اپنی انکارانی سے ترش ہونے لگے ہو۔“

”تم نے میری فیاضی دیکھی؟“ میں نے اُسے منانے کی خاطر مسکرا کر بات ٹالنے کی

کوشش کی۔ ”میں نے ہر نام سنگھ کے سامنے اپنی جیب خالی کر دی۔“

”مجھے حکم دو جمیل۔“ انکا سنجیدگی سے بولی۔ ”میرے ہوتے تمہیں کسی بات کے لئے

پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ تم اشارہ کرو۔ میں قارون کا خزانہ بھی تمہارے قدموں

میں ڈھیر کر سکتی ہوں۔“

”اگر میں تمہیں خزانہ سمجھ کر اپنی ہانہوں میں ڈھیر ہونے کا حکم دوں تو.....؟“ میں نے

شوخی سے کہا۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنی انکارانی کو معاف کر دیا۔“ وہ سر پر خوشی سے رقص کرنے

لگی۔ پھر سنجیدگی سے بولی۔ ”آج مجھ سے ایک وعدہ کرو جمیل۔ تم دوبارہ پچھلی باتوں کو نہیں

دہراؤ گے۔“

”کوشش کروں گا۔“ میں نے مفاہمت کا انداز اختیار کیا، پھر موضوع بدل کر بولا۔

”ولیم کے بارے میں تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔“ انکا نے خلاء میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔

”مارٹن کا قصہ پاک ہو جانے کے بعد اب اُس کی تمام جائیداد ولیم کو ملنی چاہئے۔ کچھ

دشواریاں پیش آئیں گی، لیکن ہوگا وہی جو میں چاہوں گی۔ اس کام کے لئے ممکن ہے مجھے

چار پانچ روز کے لئے تم سے دور بھی رہنا پڑے۔“

”میں ولیم سے ملنا چاہتا ہوں.....“ میں نے بچھے ہوئے دل سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں آج شام ہی اُسے تمہارے پاس لے آؤں گی، مگر اس بات کا خیال

رکھنا کہ چین کے سلسلے میں ولیم سے گفتگو کرتے وقت تمہارے قدم نہ ڈمگائیں۔“

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ فون کی گھنٹی بجی تو میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔ میرا

اعزاز غلط نہیں تھا، دوسری جانب سے چین ہی تھی۔ میں جس ہوٹل میں ٹھہرا تھا اس کا مشورہ

بھی چین ہی نے دیا تھا۔

کے سلسلے میں تم سے کوئی باز پرس ہوگی۔“

”تم ابھی مقتولہ کے سلسلے میں کچھ کہہ رہے تھے۔“ جین نے استفسار کیا۔

”وہ ایک بے حد مالدار اور کروڑ پتی بیوہ تھی۔“ میں نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”اُس کا

باطنی شروع سے ہی داغدار رہا ہے۔“

”دولت علی۔ میرا خیال ہے کہ تم کوئی اہم بات درمیان سے حذف کر رہے ہو۔“ جین

نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم نے ابھی ولیم کا نام بھی لیا تھا۔ کیا ولیم اور مقتولہ کے درمیان کوئی

تعلق تھا؟“

”ابھی نہیں.....“ میں نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ ”کچھ دن اور صبر کر لو۔ اس کے

بعد میں حیرت انگیز اور چونکا دینے والے انکشاف کروں گا۔“

”تمہاری مرضی.....“ جین نے اصرار کرنے کی بجائے پیار سے پوچھا۔ ”تمہیں کسی

چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟“

”مجھے ایک چیز کی ضرورت ہے۔“ میں نے بڑی مدہم آواز اور رازدارانہ لہجے میں کہا۔

”تم ملنے آؤ گی تو تفصیل سے بتاؤں گا۔“

”میں کل سیدھی آفس سے اٹھ کر تمہاری طرف آؤں گی۔ کہیں غائب نہ ہو جانا۔“

”آج کی رات تمہارے بغیر کیسے گزرے گی؟“ میں پھر جذبات میں بہک گیا۔ اچھا

ہوا جو جین نے دوسری طرف سے ”نوٹی مین“ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

”اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرو جمیل صاحب۔“ انکا نے مجھے سرزنش کی۔

”اگر اسی طرح بھکتے رہے تو پانی کسی دن سر سے اُونچا بھی ہو سکتا ہے..... باگ ڈور پر

گرفت مضبوط رکھو۔ اسی میں تمہاری اور جین کی بہتری ہے۔“

”کوشش کرو انکارانی کہ جیکب اور مارٹینا کا معاملہ کسی طرح دب جائے۔“ میں نے

اُس کی بات نظر انداز کر دی۔ ”میں نہیں چاہتا کہ جیکب کے سلسلے میں کسی طرح بھی جین کا

نام درمیان میں آئے۔“

”نہیں آئے گا۔“ انکا نے یقین دلایا، پھر بولی۔ ”میں اب اپنے ضروری مشن پر جارہی

ہوں۔ میرے جانے کے کچھ دیر بعد میلبا تمہارے پاس ایک سفری بیگ لائے گی، تم رقم

نکال کر خالی بیگ اُسی کے حوالے کر دینا۔ ولیم سے گفتگو کرتے وقت خود پر قابو رکھنا اور اپنا

”تمہیں ہوٹل میں کسی دُشواری کا سامنا تو نہیں ہوا.....؟“ جین کے لہجے میں پیار تھا، اپنائیت تھی۔

”انہیں میری لاشی پر اعتراض تھا، لیکن تمہارا فون موصول ہونے کے بعد اُن کے ماتھے

کی ٹکٹیں دُور ہو گئیں۔“ میں نے مختصر اُردو اداسی۔

”آئی ایم سوری دولت علی۔“ جین نے معذرت کی۔ ”دوبارہ ایسا نہیں ہوگا۔ اس ہوٹل

کی کچھ کمزوریاں ہیں میرے پاس۔ مجھے فون کرنے میں دیر ہو گئی ورنہ ہوٹل کی انتظامیہ

ہاتھ باندھے تمہارے انتظار میں کھڑی ہوتی۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں آتے وقت تمہاری ماں سے نہیں مل سکا۔“ میں نے بات

بدلی۔ ”ویسے میرا خیال ہے کہ انہیں میرے چلے آنے پر کوئی صدمہ یا افسوس نہیں ہوا ہوگا۔“

”مام کی جگہ تم ہوتے تو تمہارے بھی وہی تاثرات ہوتے جو ان کے ہیں۔“ جین نے

سیدھی سادھی بات کی، پھر بڑے جذباتی انداز میں بولی۔ ”تمہیں صرف اپنی جین کی محبت

سے غرض ہونی چاہئے، دوسرے کیا سوچتے ہیں سوچنے دو.....“

”ولیم کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا.....؟“ میں روانی میں پوچھ بیٹھا۔

”یہ تمہیں اس وقت اچانک ولیم کا خیال کس طرح یاد آ گیا؟“ جین کے لہجے میں

حیرت تھی۔

”جین.....“ میں نے جلدی سے اپنی غلطی نبھانے کی کوشش کی۔ ”کیا تمہیں علم ہے کہ

جیکب نے جس عورت کو قتل کیا وہ کون تھی؟“

”فی الحال ہمارے افران ابھی تک سر جوڑے بیٹھے اس معے کو حل کرنے کی کوششوں

میں مصروف ہیں کہ وہ عجیب الحلقہ شخص کون ہو سکتا ہے جو گرفتاری کے بعد ہڈیوں کے ہنجر

میں تبدیل ہو گیا۔“

”کیا جیم نے.....؟“

”نہیں.....“ جین نے تیزی سے کہا۔ ”اُس نے میری خاطر جیکب کے نام پر زیادہ

زور دینے کی غلطی نہیں کی، ویسے ہو سکتا ہے کہ وہ اس کیس میں بھی تم سے مل کر تمہاری

رُوحانی قوتوں سے استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔“

”پریشان مت ہو۔ میرے کہنے پر اعتماد کرو۔ نہ تمہارا نام درمیان میں آئے گا نہ جیکب



”کیا بات ہے ولیم؟“..... میں نے بڑے دوستانہ انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ”تم آج خلاف توقع کچھ سنجیدہ نظر آ رہے ہو۔“

”آپ جین کے فارم ہاؤس سے منتقل ہو کر ہوٹل کیوں آ گئے؟“ ولیم نے پہلو بدل کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا وہاں آپ کو کسی قسم کی.....“

”کیا میں تمہارے جواب سے یہی اندازہ قائم کروں کہ تمہاری سنجیدگی کا سبب میرا جین کے فارم ہاؤس سے چلا آنا ہے؟“

”جی نہیں، لیکن.....“

”تمہارے دوست جم نے شاید تمہیں بتایا تھا کہ میرے پاس کچھ روحانی قوتیں بھی ہیں۔“ میں نے ولیم کی بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا۔ ”کیا میں جم کی بات درست ثابت کرنے کی خاطر اس کا کوئی نمونہ پیش کروں؟“

”میں پلنگ پر آپ کی حیرت انگیز صلاحیتوں کا اعتراف کر چکا ہوں۔“ ولیم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جاگ اٹھی۔

”میں نے تمہاری سنجیدگی کا سبب دریافت کیا تھا۔“ میں نے اپنی بات دہرائی۔

”جس وقت مجھے یہ پیغام ملا کہ آپ نے مجھے بلایا ہے اُس وقت بھی اتفاق سے میں آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“ اُس نے پہلو بدلا۔ ”اور اب بھی سنجیدگی سے اسی بات پر غور کر رہا ہوں کہ کیا یہ محض اتفاق تھا یا میری خوش نصیبی؟“

”تم میرے بارے میں کیا سوچ رہے تھے.....؟“ میں نے اُس کی آنکھوں کے ذریعے دل میں اُترنے کی کوشش کی۔ ارٹکاز اور مراقبے کی مشقوں نے مجھے تاریکی میں بھی بہت دُور تک دیکھنے کی قوت عطا کی تھی۔ میں نے ولیم کا بھید پالیا، مارٹینا کے قتل کی اطلاع نے اُس کا سکون برباد کر دیا تھا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ پلنگ پر میری نظروں نے جو ناقابل یقین مظاہرہ دیکھا کیا وہ محض نظر بندی کا کمال تھا؟ یا.....“

”تم جو کچھ سوچ رہے ہو وہ غلط ہے۔“ میں نے ٹھوس لہجہ اختیار کیا۔ ”تم جیسے نوجوان کو اتنی جلدی حوصلہ نہیں ہار دینا چاہیے۔“

”جی.....“ وہ صوفے پر کسمسایا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟“

خیال رکھنا۔“

انکاسرے اُتر گئی تو میں نے اُنھ کو غسل کیا، لباس تبدیل کیا، پھر وقت گزارنے کی خاطر ٹی وی آن کر دیا جس پر حسن اتفاق سے الفریڈ ہچکاک کی ایک شہرہ آفاق فلم چل رہی تھی۔ میں ذہنی طور پر تھکا ہوا تھا اس لئے ایڑی چیر پر بیٹھے ہی بیٹھے میری آنکھ لگ گئی۔ دروازے پر ہونے والی دستک کی آوازوں نے مجھے دوبارہ بیدار کیا۔ میں نے ٹی وی بند کر دیا، گھڑی پر نظر ڈالی تو احساس ہوا کہ شام ہو چکی ہے۔ میں نے اُنھ کو دروازہ کھولا، سامنے ولیم موجود تھا۔ ولیم کو دیکھ کر ایک لمحے کو میرے اندر رقابت کا جذبہ کلبلا یا لیکن میں نے اظہار نہیں ہونے دیا، اس وقت وہ میرا مہمان تھا۔ میں نے اُسے عزت سے خوش آمدید کہا، کوئی بات ضرور تھی جو ولیم اس وقت کچھ گم صم نظر آ رہا تھا۔ میں نے اُسے کچھ تہائی کا موقع فراہم کر دیا، واش روم میں جا کر منہ ہاتھ دھونے سے اعصاب پر طاری کسلندی قدرے دُور ہو گئی۔ باہر آ کر میں نے میلبا کو طلب کیا۔ اس وقت وہ چست لباس میں ملبوس تھی، شاید مجھے مرعوب کرنے کی خاطر اُس نے اپنے جسمانی خطوط کو اور اُبھارنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایک ادائے خاص سے مسکراتی بل کھاتی کمرے میں داخل ہوئی لیکن ولیم کو دیکھ کر اُس نے خود پر قابو پانے میں حیرت انگیز چابکدستی سے کام لیا۔ میں نے اُسے چائے کے ساتھ کچھ اسٹیکس لانے کا حکم دیا تو وہ واپسی کے لئے پلٹی، پھر اچانک رک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”سر۔ آپ کی ایک امانت ہے میرے پاس۔ میں نے دو تین بار دستک دی تھی، لیکن پھر آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”میری امانت.....؟“ میں نے چونک کر اُسے ٹوٹی نظروں سے دیکھا۔

”ایک سفری بیگ ہے سر۔ مجھے کاؤنٹر سے ہدایت ملی تھی کہ اسے آپ کے روم میں پہنچا دیا جائے۔“

”اوہ.....“ مجھے انکارانی کی بات یاد آ گئی۔ میں نے لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔ ”وہ بیگ بھی لیتی آنا.....“

میلبا اُلٹے قدموں واپس چلی گئی، خود کار دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے ولیم کی سمت دیکھا، وہ بدستور کھویا کھویا لگ رہا تھا۔

”اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں تو.....؟“

”میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔“

”پھر.....؟“ میں نے اُسے سنہلنے کا موقع دیا۔ ”لندن سے فرار ہونے کے بارے میں

کیوں غور کر رہے ہو.....؟“

ولیم بت بن گیا، پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ اُس کی جگہ میں ہوتا تو شاید

میری کیفیت بھی اس سے مختلف نہ ہوتی۔ میں نے اُسے جین کے سلسلے میں ٹٹولنے اور ہموار

کرنے کی خاطر بلوایا تھا، جین کو اُس کے حوالے کرنے سے پیشتر میں اُسے اچھی طرح

چھان پھنک کر اس بات کا یقین کرنا چاہتا تھا کہ وہ جین کے لئے اہل ہے بھی یا نہیں؟ اپنی

زندگی کی آخری پونجی کو میں کسی غیر محفوظ ہاتھوں کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا کرتا تو یہ

میری خود غرضی ہوتی۔ جین کے ساتھ صریحاً دھوکا ہوتا۔ حقیقت سامنے آنے کے بعد جین

مجھے کبھی معاف نہ کرتی۔ میں خود اپنی نظروں میں گر جاتا، میرا ضمیر ہمیشہ کچھ کے لگتا رہتا۔

میں نے فرار ہونے والی بات کہی تو ولیم چونک اٹھا۔ اُس کی آنکھیں پٹ پٹانے لگیں۔

اُس نے اپنے ہونٹ سختی سے سمیٹنے لئے، وہ حقیقت کے اظہار سے گریز کرنا چاہتا تھا۔ میں

نے زیادہ سخت رویہ اختیار کرنے کی ٹھان لی۔

”مارٹینا کے قتل کی اطلاع تمہیں کس طرح ملی؟“ میں نے براہ راست دھکتی رگ پر انگلی

رکھ دی۔

”اُس کی پرسنل سیکرٹری نے مجھے فون کیا تھا.....“ ولیم نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

”قاتل کے بارے میں کیا معلوم ہوا.....؟“ میں نے کچھ سوچ کر دریافت کیا۔

”محکمہ سرانفرسانی ابھی تک قاتل کے سلسلے میں بڑی رازداری سے کام لے رہا ہے۔“

اخباری نمائندے بھی کھوج میں لگے ہیں۔“

”تم نے براہ راست جم سے بات کی.....؟“

”نہیں.....“ ولیم نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”میں مقتولہ کے سلسلے میں جم سے کوئی

بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔“

”کیوں.....؟“ میں نے ولیم کی زبان سے حقیقت جاننے کی کوشش کی۔

”مسٹر دولت علی۔“ ولیم نے مجھے پریشان نظروں سے گھورا۔ ”اگر آپ اپنی روحانی

قوتوں سے معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں تو میں آپ سے زبان بند رکھنے کی درخواست

کروں گا۔“

”جو نو جوان سچ کا سامنا کرنے سے کترائے اُسے بزدل اور ڈرپوک.....“

”نہیں.....“ ولیم نے احتجاج کیا۔ ”میں بزدل یا ڈرپوک نہیں ہوں۔ لیکن اپنے ماضی کو

نہیں یادنا چاہتا۔“

ولیم کے چہرے پر خون کی تمازت اس بات کی غماز تھی کہ وہ اپنے اُبلے دامن پر کسی

غلاظت کا دھبہ برداشت کرنے پر آمادہ نہیں تھا، آنکھوں کی سرخی گواہ تھی کہ وہ سر اٹھا کر چلنے

کی خاطر کوئی بھی قیمت ادا کر سکتا تھا۔ اُسے اپنی بدنامی گوارا نہیں تھی۔ مجھے ولیم کا احتجاج

پسند آیا۔ اُس کی نظروں میں دولت اور شہرت کے مقابلے میں عزت زیادہ اہم تھی۔

کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی، ولیم نظریں جھکائے بیٹھا ہونٹ کاٹا رہا۔ میں اُس

کے چہرے پر اُبھرنے والے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا، میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر اُسے

جین کے لئے منتخب کر لیا۔ وہ ٹھوس ارادوں کا مالک تھا، پہاڑوں سے ٹکرا جانے کا حوصلہ رکھتا

تھا، انکارانی نے بھی کچھ سوچ سمجھ کر ہی اس کا انتخاب کیا ہوگا۔

میلبا ٹرائی گھسیٹتی کمرے میں داخل ہوئی۔ ہم دونوں سنہل کر بیٹھ گئے۔ ٹرائی کے نچلے

حصے میں براؤن رنگ کا ایک سفری بیگ موجود تھا، میں سمجھ گیا اس بیگ میں انکا نے میرے

لئے دولت فراہم کرنے کا بندوبست کیا ہوگا۔ ٹرائی قریب آئی تو میں نے لا پرواہی سے بیگ

کو اٹھا کر ایک طرف ڈال دیا۔ میلبا نے میرا اشارہ پا کر اسٹیکس سرو کیا، پھر کافی بنانے میں

مصروف ہو گئی۔

”جم سے تمہاری ملاقات کو کتنا عرصہ ہوا.....؟“ میں نے ولیم سے دوستانہ انداز میں

دریافت کیا۔

”زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال۔“ ولیم نے بتایا۔ ”ہماری پہلی ملاقات ایک ٹینس میچ میں

ہوئی تھی، میری طرح جم کو بھی ٹینس کھیلنے سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ اتفاق سے اسٹیڈیم

میں ہماری نشست ساتھ ساتھ تھی۔ سارا بھی جم کے ہمراہ تھی۔ ان دونوں کے درمیان اس

بات پر بحث ہو رہی تھی کہ میچ کا فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟ اتفاق سمجھ لیں کہ میری زبان پر

میرے پسندیدہ کھلاڑی کا نام آ گیا۔ جم اُس کے حق میں نہیں تھا۔ مجھ سے ڈنر کی شرط لگا

بیٹھا۔ میرا کھلاڑی جیت گیا۔ اُس روز ہم نے ایک ساتھ ڈنر کیا۔ پھر ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے دوستی میں تبدیل ہو گیا۔“ ولیم مجھے اپنے بارے میں بتاتا رہا، میں سن رہا۔ مجھے خوشی تھی کہ اُس کے چہرے سے تناؤ کی کیفیت بتدریج چھٹنے لگی تھی..... میلبا اپنے فرائض انجام دے کر رخصت ہو گئی تو میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

”ولیم۔ کیا تم مجھے یہ حق دو گے کہ میں تم سے تمہارے مستقبل کے بارے میں کچھ دریافت کر سکوں؟“

”ایک شرط پر۔“ اُس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلو بدلا۔ ”آپ میرے ماضی کے سلسلے میں جم، سارا یا مس جین سے کچھ نہیں کہیں گے۔“

ولیم کی زبان سے جین کا نام سن کر مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ان دونوں کے ستارے ملانے کے لئے انکارانی اپنا کام شروع کر چکی ہے۔ میں نے جواب میں صرف مسکرائے پراکتفا کی، پھر کافی کا ایک گھونٹ لے کر بولا۔

”جم اور سارا نے تمہیں میرے بارے میں کیا بتا رکھا ہے.....؟“ میں نے مزید وضاحت کی۔ ”خاص طور پر میری نجی زندگی کے بارے میں۔“

”میں نے اسی سوال کے پیش نظر یہ معلوم کرنے کی جسارت کی تھی کہ آپ نے جین سے دُوری کیوں اختیار کر لی؟“ ولیم نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”جم نے ایک بار سرسری طور پر ذکر کیا تھا کہ جرمنی والے مشن کے دوران آپ اور جین ایک دوسرے سے خاصے قریب ہو گئے تھے۔ سارا کو یقین تھا کہ آپ جین کو شریک زندگی بنانے کا فیصلہ کر کے سب کو حیران کر دیں گے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ آپ اچانک ہندوستان واپس چلے گئے، جین تنہا رہ گئی، آپ کی واپسی کی راہ دیکھتی رہی، پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ جین جس کے ہزاروں امیدوار تھے، سب کو مایوس کر گئی۔ سارا اور جم کا خیال تھا کہ وہ آپ سے وابستہ ہو کر لندن کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دے گی لیکن ایسا نہیں ہوا.....“

ولیم میری کتاب زندگی کے ایک اہم باب کے دریدہ اور اراق پلٹتا رہا، میں دل کی دھڑکنوں کو سنبھالے خاموش بیٹھا اپنی قسمت کی محرومیوں پر ماتم کرتا رہا، کانٹوں پر لوٹا رہا۔ اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ جین اب بھی میرا دم بھرتی تھی، متعدد بار میرے سینے کی کشادگی میں

سٹ پچی تھی۔ میں نے بار بار اُسے بہت قریب سے دیکھا تھا، اتنے قریب سے کہ ہمارے دل کی دھڑکنیں ایک ہو جاتیں، سانسیں آپس میں گھلنے ملنے لگتیں، میں اُس کے جسم کے ایک ایک نشیب و فراز سے واقف تھا، کئی بار اُس کی آنکھوں کی مستی میں ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ قدم رپٹنے لگتے تو کبھی وہ عین وقت پر خود کو سنبھال لیتی، کبھی میں اُس کی پاکیزگی کا بھرم قائم رکھنے کی خاطر دامن بچا جاتا۔ اُس کی گفتگو کا ترنم اب بھی میرے وجود میں کھٹکتا تھا، میں اُس کی دراز زلفوں سے کھیلا تھا، اُس کے لعب دہن کا ذائقہ ابھی تک میری زبان پر محفوظ تھا۔ میں جسم تھا، وہ رُوح تھی اور.....

”مسٹر دولت علی۔ کیا آپ میری بات سن رہے ہیں؟“ ولیم کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو جین کے حسین نخیل کے خواب ٹوٹ کر بکھر گئے، ریزہ ریزہ ہو گئے۔ انکارانی نے جاتے جاتے مجھے محتاط رہنے کی تاکید کی تھی۔ میں جذبات کی طغیانی میں بہتا ہوا دُور تک چلا گیا، غلطی کا احساس ہوا تو میں نے خود کو سنبھالا، ولیم کو اپنی کیفیت سے بے خبر رکھنے کی خاطر مجھے بروقت سوجھ گئی۔

”مجھے حیرت ہے کہ تم لوگ کافی پی کر کبھی غنودگی کی حالت سے دوچار نہیں ہوتے۔“ میں نے سر جھٹک کر جوابی لی، پھر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ ”تم ابھی جین کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔“

”میں یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ جین نے آپ کو روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی.....؟“ ولیم نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

”مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔“ میں نے سنجیدگی اختیار کی۔ ”دوسری وجہ جین کی ماں تھی جو جین کی شادی کے مسئلے پر ہمیشہ لڑکے کے اسٹیش کی بات شروع کر دیتی ہے، تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ تمہارے موجودہ اسٹیش سے مطمئن ہو جائے گی؟“

”مم..... میں سمجھا نہیں؟“ ولیم شپٹا گیا..... ”میرا ذکر کہاں سے آ گیا.....؟“

”کیوں؟“ میں نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ”کیا یہ غلط ہے کہ تم جین کو پسند کرنے لگے ہو؟“

”آپ نے مجھے کس مقصد کے لئے بلایا تھا؟“ دل کا چور پکڑے جانے پر اُس نے موضوع بدلنا چاہا۔

”یہ بتانے کی خاطر کہ جین نے بھی تمہیں پسند کر لیا ہے۔“ میں نے ولیم کو بڑی دُور

”مگر.....“ ولیم نے اپنے ذہن میں کلبلا تے کسی خدشے کی وضاحت کرنی چاہی۔ میں نے موقع نہیں دیا۔

”اگر تمہیں میری روحانی قوتوں پر اعتماد ہے تو سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔“ پھر میں نے موضوع بدل دیا۔ ”میں لندن میں شاید زیادہ دن نہ رہ سکوں۔ ہندوستان جا کر مجھے بہت بارے ضروری کام نمٹانے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میرے جانے سے پہلے تم اور جین ایک ہو جاؤ۔“

”کیا آپ نے صرف یہی کہنے کی خاطر مجھے بلایا تھا؟“ ولیم کے چہرے پر طاری سنجیدگی کے عقب سے خوشیاں جھانکنے لگیں۔

”ہاں.....“ میں نے دل پر جبر کر کے کہا۔

”ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟“

”پوچھو.....“

”کیا جم نے آپ کے اور جین کے بارے میں جو کہانی سنائی تھی وہ.....“

”جب تم بھی اسے کہانی کے نام سے موسوم کر رہے ہو تو پھر حقیقت کیوں سمجھ رہے ہو؟“ میں نے بڑی خوبصورتی سے اُسے ٹال دیا۔ ”کہانی صرف کہانی ہوتی ہے، لوگ زیب داستان کے لئے کچھ ترمیم اور اضافہ کر کے اسے سچائی کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔“

ہمارے درمیان تا دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے ولیم کو مختلف زاویوں سے ٹولا، مختلف موضوعات پر اُس سے بحث کی، کھیل و تفریح سے لے کر عالمی سیاست جیسے سنجیدہ ٹاپک پر بھی تبادلہ خیالات کیا۔ وہ ہر اعتبار سے میری کسوٹی پر پورا اُترتا، مجھے انکارانی کے انتخاب کی داد دینی پڑی۔

ولیم گئے جانے کے بعد دروازے پر دوبارہ ہلکی سی دستک کی آواز اُبھری۔ میں نے دروازہ کھولا تو میلبا سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”آپ کے مہمان چلے گئے؟“ اُس نے معنی خیز انداز میں اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا اظہار محنوں کی خفیف جنبش سے کیا۔ مدہم نروں میں بولی۔ ”اجازت ہو تو مدتن سمیٹ لوں؟“

میلبا کی ایک ایک ادا کا فرانہ تھی۔ اُس کے بولنے کا انداز، آنکھوں میں چھلکنے والی

گوئی سے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”اگر تمہیں میری صلاحیتوں کا اعتراف ہے تو سب کچھ میرے اوپر چھوڑ دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں اور جین کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر سکے گی۔“ میں نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم عنقریب اتنے دولت مند بننے والے ہو کہ وہ مفلوج بوڑھی عورت بھی تمہاری گرویدہ ہو جائے گی۔“

”لیکن جم اور سارا نے تو مجھ سے کچھ اور کہا تھا۔“ ولیم نے کسمساتے ہوئے دہلی زبان میں کہا۔

”دوسروں کی بات پر غور مت کرو۔ اُس وقت کا انتظار کرو جو تمہیں آسمان کی بلند یوں تک پہنچانے والا ہے۔“ میرا لب و لہجہ سحر انگیز ہو گیا۔ ”دولت علی کا علم کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ مگر اپنی کامیابی کے لئے تمہیں میری ایک شرط ماننی پڑے گی، مارٹینا کا بولناک انجام تمہارے لئے قسمت کے دروازے کھول چکا ہے۔ تمہیں خود پر جبر کر کے ان حقائق کا سامنا کرنا ہوگا جو تلخ ہونے کے باوجود تمہارے لئے مستقبل میں کامیابی کے تمام راستے کھول دیں گے۔“

ولیم نے کوئی جواب نہیں دیا، اُس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مارٹینا کے حوالے سے اپنا ماضی کریدنے کے حق میں نہیں ہے۔ میں اُس کو بغور دیکھتا رہا، دولت انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ دولت کے حصول کی خاطر انسان اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے، بڑے بڑے جان لیوا خطرات میں بے خطر چھلانگ لگا دیتا ہے، ولیم کو تو گھر بیٹھے اُس کا جائز حق مل رہا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو مارٹینا جیسی عورت کی غلاظت سے دور رکھنے کا خواہشمند تھا، میری نگاہوں میں اُس کی قدر اور بڑھ گئی۔

”تم نہیں چاہتے کہ اپنا جائز حق حاصل کرنے کی خاطر تمہاری عزت پر کوئی حرف آئے؟“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”آپ کا اندازہ درست ہے۔“ اُس نے مختصر جواب دیا۔

”بے فکر ہو جاؤ.....“ میں نے ٹھوس لہجہ اختیار کیا۔ ”تمہیں اس ضمن میں کسی کے سامنے نظریں جھکانے کی نوبت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن مارٹینا کے قبضے میں موجود ایک ایک ٹکڑا تمہارا ہے۔ وہ تمہیں مل کر رہے گا۔“



خواب آورستی، مناسب جسم کا لوچ، لمبھانے کا سلیقہ، اُس کے وجود میں روپوش کسی طاقتور مقناطیس کی کشش، محاوروں اور روزمرہ کے استعمال کی سادگی میں پرکاری، چھریے بدن کی مہک اور معصومیت میں چھپی دلاویز شوخی، تین مختصر اور لمبھ لہجہ بھر کے آئے سامنے کے باوجود اُس نے جس انداز میں اپنی ساحرانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا وہ بڑا ہوش ربا تھا۔ اُس نے برتن سیٹنے کی اجازت طلب کی تھی، میرا دل چاہا کہ اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں لیکن میں نے ضبط کا مظاہرہ کیا۔ جلد بازی سے کام لینے کی غلطی نہیں کی۔ جنرل منیجر نے بڑی انکساری سے مجھے باور کرایا تھا کہ اس حسینہ دلنواز کو میری خدمت پر مامور کیا گیا ہے، میں کسی اور وقت بھی اُس کی خدمات کے معیار کو جی بھر کے پرکھ سکتا تھا۔ میں دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ بل کھاتی اندر داخل ہوئی، میز پر بکھرے سامان کو بڑے سلیقے سے سمیٹ کر ٹرائی پر رکھا، پھر ٹرائی کھینچتی میرے قریب سے باہر چلی گئی۔ اُس کے جسم سے ابھرنے والی گلون کی مہک نے میرے وجد کو دوبارہ گنتگنانے پر اکسایا۔ میں نے دروازہ بند کر لیا.....

شام کو میں یونہی ٹہلتا ہوا باہر چلا گیا۔ سفری بیگ سے میں نے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر احتیاطاً جیب میں ڈال لی۔ لندن میں قدیم طرز کی عمارتیں، ہر وقت ماحول پر قبضہ جمائے رکھنے والی طلسمی کھر، دُھند کی اُجلی باریک چادر، کچھ یادگار چیزیں، چند بیش قیمت نوادرات، برٹش میوزیم، رُسوائے زمانہ ہائیڈ پارک، ڈاؤننگ اسٹریٹ، ملکہ برطانیہ کا شاہی محل، مادام تساؤ کا حیرت انگیز طلسم خانہ جہاں دنیا کی بڑی بڑی شخصیتوں کے مومی مجسموں کو اُن کے مقامی روایتی لباس میں سمو کر اس چابکدستی سے میوزیم میں جگہ جگہ رکھا جاتا ہے کہ بھوکے پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ مجھے کسی لمحہ، کسی بل وہاں گھومنے پھرنے والوں کو اپنی زبان میں مخاطب کر کے حیران کر دیں گے۔ زمین دوز نظام کے تحت رات دن مختلف منزلوں کی سمت دوڑتی بھاگتی تیز رفتار ٹیوب ٹرینیں، دریائے ٹیمز کا خوبصورت نظارہ جس کا ذکر اکثر شعراء نے اپنے کلام میں بھی کیا ہے۔ دُھویں کی کٹھنوں میں ڈوبے ہوئے شراب خانے، غلاظتوں میں لتھڑے ہوئے پب (PUB) جہاں لندن کی اپنی تہذیب بھی ”پب“ کے اندر ہونے والی بے باک ہل بازی اور بے شرم حرکتوں سے شرمانے پر مجبور ہو جاتی ہے، بڑے بڑے نائٹ کلب جہاں جوا کھلے عام ہوتا ہے، سڑکوں

”بچی“ پہن کر گھومنے والی نوجوان حسینائیں جنہیں دیکھنے کی خاطر شرفاء بھی ہنکھکیوں سے کام لیتے ہیں، پارکوں اور شاہراہوں پر کھلے عام بوس و کنار میں مصروف جوڑے جو دیکھنے والوں کی فکر سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ لندن میں اس کے سوا اور کیا رکھا ہے؟ میں خاص طور پر براہینن بیچ (BRIGHTEN BEACH) کے علاقے کا ذکر کروں گا۔ عام سمندری ساحلوں کی طرح یہاں بھی ساحل پر ناکافی لباس میں لمبوس ہر عمر کی خواتین اوندھی سیدھی پڑی نظر آتی ہیں۔ جسم کی برطانوی نائش کے لئے انہیں کسی اجازت نامے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی علاقے میں واقع ”گنگوں کا کلب“ یہاں کی بے راہ روی اور ”روشن خیالی“ کے ”تاہوت میں آخری کیل“ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کلب میں صرف ننگے داخل ہوتے ہیں۔ یہاں کے قوانین کو حکومت کا تحفظ بھی حاصل ہے۔ میں اختصار سے کام لوں گا، جس ایک حمام میں سب ننگے ہوں، وہاں تہذیب، شرم و حیا کی حیرت بھی دیدنی ہی ہوگی.....!

ساری چیزیں میری دیکھی بھالی تھیں، میں وقت گزاری کے لئے ایک ”پب“ میں چلا گیا جہاں شراب کی بدبو اور سگار، سگریٹ کے کثیف دُھویں نے ہلکی کھر کی شکل اختیار کر لی تھی۔ تمام میز پر تھیں۔ بار کاؤنٹر کے ساتھ رکھے سٹولوں میں سے ایک دو سٹول خالی نظر آرہے تھے۔ شراب میں بہکے ہوئے شرایوں کے فلک شکاف قہقہوں اور شکار کی تلاش میں میزوں کے گرد منڈلانے والی تجربہ کار پیشہ ور لڑکیوں کے ہنگاموں سے کان پڑی آواز صاف نہیں سنائی دے رہی تھی۔ میں نے عیاشی کے ان گھٹیا اور بدنام اڈوں کے بارے میں صرف سن رکھا تھا، قریب سے دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہو رہا تھا۔ میرے لئے وہاں قدم جما کر کھڑا رہنا دُشوار ہو گیا۔ اس ننگے اور بے ہودہ ماحول میں میرا جی متلانے لگا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے واپسی کے لئے قدم موڑے تو ایک بے باک خاتون نے میرا راستہ روک لیا۔ وہ شاید تاڑ چکی تھی کہ میں تنہا ہوں۔ اُسے بھی اپنی دُھلتی عمر کے سبب کوئی دوسرا میسر نہیں آیا تھا۔ اُس کے چہرے پر لتھڑا ہوا میک اپ دیکھ کر میرا جی متلانے لگا۔ نشے میں ہوتا تو شاید میں بھی اُسے پری یا حور سمجھ کر قبول کر لیتا..... میں نے کترا کر گزرتا چاہا، اُس نے بڑی بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ بائیں آنکھ کی پلکوں کو ماہرانہ انداز میں جھپکاتے ہوئے لگاوت سے بولی۔

”کدھر جاتا یو اینڈین پرنس، ہمارا ساتھ آؤ، ہم تمہارا لوتلی نس (LONE LINESS)

دور کر دے گا۔“

وہ میری تنہائی دور کرنے کی بات کر رہی تھی، میرا دم اُس کے قرب سے اور زیادہ گھٹنے لگا۔  
”گھبراتا کیوں میں؟“ اُس کی تجربہ کار نظروں نے میری بے چینی بھانپ لی۔ ”پہلی  
واری سب نروس ہوتا۔“ اُس نے کسی اتالیق کی طرح میری رہنمائی کی۔ ”ایک لمبا پیگ  
حلق سے نیچے اتاریں گا تو ایک دم فٹ ہو جائے گا۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو میڈم۔“ میں نے اُسے شستہ انگریزی میں ٹالنے کی کوشش کی۔  
”مجھے اپنے ساتھی کی تلاش تھی۔ وہ یہاں نہیں ہے۔“

”بھول جاؤ اُسے۔“ وہ مجھے انگریزی بولتا دیکھ کر اور بے باک ہو گئی۔ ”لائف  
انجوائے کرو۔ ابھی ٹائم ہے، وقت گزر گیا تو صرف یادیں باقی رہ جائیں گی۔ یادیں گزرے  
وقت اور دھلتی جوانی کو واپس نہیں لاسکتیں۔“

مجھے حیرت ہوئی، وہ جان کیٹس کی کسی مشہور نظم کا ترجمہ سنا رہی تھی۔ میں آنکھیں  
پھاڑے اُس کی علمی قابلیت اور جنسی بے راہ روی کا موازنہ کرتا رہا۔

”تم غیر ملکی ہو، میں سیاحوں کے ساتھ اُلٹی چھری استعمال نہیں کرتی۔“ اُس نے پھر  
بازاری عورتوں کی طرح آنکھیں منکنا شروع کر دیں۔ ”اولٹی تھرٹی پاؤنڈ فائل انجوائمنٹ۔“  
”نان سنس۔“ میں برداشت نہ کر سکا تو پیئٹر ابدل کرختی سے بولا۔ ”گٹ لاسٹ۔“

میرا خیال تھا کہ ”گٹ لاسٹ“ کی تلخی کا زہر پینے کے بعد وہ میرا اچھا چھوڑ دے گی،  
ایسا نہیں ہوا۔ اُس کی نگاہوں کی مستی کی جگہ دہشت گردی کا رنگ ابھر آیا۔ ہاتھ کے  
اشارے سے اُس نے قریب کھڑے ہوئے ایک ایسے شخص کو آواز دی جو شکل ہی سے کوئی

شہرہ پشت بد معاش نظر آتا تھا، میلی کچیلی جینز کے اوپر اُس نے کسی قسم کا لباس پہننے کی  
ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔ مقصد شاید اپنے گٹھے ہوئے جسم کی نمائش تھا، سر پر اُس نے  
گہرے سرخ رنگ کا زو مال باندھ رکھا تھا، وہ قریب آیا تو عورت نے اپنی برہمی کا اظہار کیا۔

”اؤگر۔۔۔۔۔ یہ بلیک انڈین (کالا آدمی) تمہارا رس بری کو گٹ لاسٹ بولا، اپنی زبان  
میں گالی نکالا۔“

ایسے موقعوں پر عموماً عورتیں مردوں کو بھڑکانے کی خاطر جھوٹ کا سہارا لیتی ہیں۔ مجھے یہ  
بھی علم ہے کہ دنیا کے ہر خطے کی جسم فروش یا مجرمانہ ذہنیت رکھنے والی عورتوں کی پشت پر کسی

نہ کسی مافیا یا بڑے بد معاش کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے جو اُس کے تحفظ کے عوض ایک معقول رقم  
بطور لگان وصول کرنے کا حقدار ہوتا ہے۔ اس بد قماش عورت نے بھی خود کو ”رس بری“ کہہ  
کر سو یا اڈاگر کی ”غیرت“ کو لالکا راتھا۔

”زندگی چاہتا ہے یا کتوں جیسی موت؟“ اڈاگر نے سینے کی مچھلیاں پھڑپھڑاتے ہوئے  
مجھے نیونٹو انظروں سے گھورا۔ اُس کی آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی۔

میں ”پب“ میں ہنگامہ کر کے اپنی رسوائی نہیں چاہتا تھا اس لئے خون کے گھونٹ پی کر  
سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”زندگی۔۔۔۔۔“

”اوکے۔۔۔۔۔“ اڈاگر نے اپنی دریا دلی کے ساتھ ساتھ اپنی دادا گیری کا ثبوت پیش کیا۔  
رنجی سانپ جیسے انداز میں پھنکارتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولا۔ ”جسٹ پے ہر ٹو ہنڈرڈ  
پاؤنڈ ز اینڈ گٹ آؤٹ۔۔۔۔۔ یو پاسٹرڈ۔“

میرے وجود میں مخفی قوتیں کسمانے لگیں۔ میں نے دیدہ و دانستہ جیب سے نوٹوں کی  
گڈی نکالی، دوسو کے بجائے تین سو پونڈ کے کرارے نوٹ بے بسی کے عالم میں ”رس بری“

کے حوالے کئے اور ہارے ہوئے جوار یوں جیسے انداز میں قدم مارتا ”پب“ سے باہر آ گیا۔  
پھر وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ سو سو پونڈ کے نوٹوں کی گڈی دیکھ کر اڈاگر کی نگاہوں  
میں ابھرنے والی چمک میری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی، مجھے یقین تھا کہ وہ اس

گڈی کو باپ کا مال سمجھ کر حاصل کرنے کی خاطر میرے پیچھے ضرور آئے گا۔  
میں ”پب“ سے نکل کر قریب نظر آتے والے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف آٹھ دس قدم ہی اٹھا

سکا تھا کہ اڈاگر کی ٹھوس آواز میرے کانوں میں گونجی۔  
”رُک جاؤ مائی ڈیئر۔۔۔۔۔“

میں نے پلٹ کر اڈاگر کی سمت دیکھا۔ اُس کے سیدھے ہاتھ میں کشمیری ساخت جیسا  
لہجہ چل والا خنجر چمک رہا تھا، وہ سرعت سے قدم مارتا مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر آ کر

رُک گیا، مدھم مگر خوفناک آواز میں بولا۔  
”زندگی عزیز ہے تو کرنسی نکال کر میرے حوالے کر دو اور خاموشی سے دفع ہو جاؤ۔“

”میں نے سارے نوٹ تمہیں دے دیئے تو خود کیا کروں گا؟“ میں نے اُس پاس کا  
جائزہ لیا۔ پب اور ٹیکسی اسٹینڈ کے درمیان ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ سڑک

کا ہاتھ میرے سر پر ہے، وہ آئندہ بھی میرے کام آسکتا تھا۔

”ٹشی چپ کیوں ہو برادر۔ سب خیر تو ہے؟“ ہرنام سنگھ نے میری خیریت دریافت کرنی شروع کر دی۔ ”کوئی الٹی سیدھی گل ہے تو اپنے اس تابعدار کو دس دو، واہ گرو دی سو، میں تو اڈی خاطر جان بھی.....“

”میں بخیر و عافیت ہوں ہرنام سنگھ۔“ میں نے اکتائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”اچھا ہوا جو تم وقت پر مل گئے۔ مجھے ہوٹل تک پہنچا دو۔“

”اک گل پوچھوں برادر۔ برا تو نہیں مناؤ گے؟“ ہرنام سنگھ نے میرے جواب کا انتظار

کئے بغیر ہی سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”کہیں تم موج میلہ کرنے تو لندن نہیں آئے ہو.....؟“

میں نے محسوس کر لیا کہ ہرنام سنگھ نیک دل آدمی تھا، بک بک کرنا اور بال کی کھال نکالنا

اس کی عادت تھی، شاید وحشی کی جدائی نے اس کے دل و دماغ پر اچھے اثرات مرتب نہیں

کئے تھے۔ وہ اگر اپنی بیوی کے ساتھ کسی انگریز کے ساتھ بھاگ جانے کی بات مجھ سے کر

سکتا تھا تو میرے بارے میں بھی کسی دوسرے کے سامنے زبان پر قابو پانا اس کے لئے

دُشوار ہوتا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ارٹھکاڑ کیا، ہرنام سنگھ کے تصور کو ذہن میں بیدار کر کے اُسے

خوس لہجے میں مخاطب کیا۔

”ہرنام سنگھ، اپنے دماغ سے یہ بات نکال دو کہ تم نے ابھی کچھ دیر پہلے مجھے کہاں

دیکھا تھا۔“

”نکال دیا برادر۔“ اُس نے معمول جیسے انداز میں فرمانبرداری سے کہا۔

”تم نے مجھے کسی باب کے سامنے نہیں دیکھا تھا۔“

”بالکل نہیں دیکھا تھا۔“

”ہماری ملاقات بیکرز اسٹریٹ پر ایک شاپنگ مال کے سامنے ہوئی تھی۔“

”آہو۔ میں اپنی کڑی دھنٹی نوں لہرہاسی کٹھی مل گئے۔“ ہرنام کے ذہن میں پھر

دھنٹی ابھر آئی۔ افسردہ لہجے میں بولا۔ ”صبح سے شام تک ایک سے دودھ کر ایک بھلی چنگی،

گوری چٹی کڑیاں ساڑی کیب وچ سفر کر دی ہیں۔ پر وہ کھوتے دی جینی نہ جانے کتھے فرگئی؟

واہ گردوی سو، وہ بس ایک واری مجھے مل جائے، میں اُس کے ٹوٹے.....“

”ہم کو اُسی ہوٹل تک جانا ہے جہاں تم ایک بار پہلے لے گئے تھے۔“ میں نے اُس کی

تقریباً سنان پڑی تھی۔ لندن کے باب آبادی سے فاصلے پر ہوتے ہیں تاکہ اگر کوئی ہنگامہ ہو تو شرفاء کو پریشانی سے نہ دوچار ہونا پڑے۔ ”میں تمہیں پانچ سو پاؤنڈ شرافت سے دے سکتا ہوں۔“ میں نے اپنا اطمینان کرنے کے بعد فیاضی کا ثبوت دیا۔ ”اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔“

”مرنا پسند کرو گے؟“ اڈگر نے گھن گرج کے ساتھ ہی اپنا خنجر والا ہاتھ خوفناک انداز

میں بلند کیا۔ اُس کا لہجہ ظاہر کر رہا تھا کہ انسانی خون بہانے میں وہ کسی پس و پیش کا عادی

نہیں ہے۔

میرے پاس وقت کم تھا۔ میں نے جھکائی دے کر خود کو بچایا، پھر دل میں پریم لال کا

نام لے کر اڈگر کی طرف پھونکا تو اُس کا جسم شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا..... خنجر اُس کے

ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل سرک پر گرا اور اذیتناک انداز میں لوٹ پوٹ

ہونے لگا۔ اُس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پریم لال کی آتما نے شاید مجھے

بچانے کی خاطر اُس کی قوت گویائی بھی چھین لی تھی۔ آگ کے شعلے اڈگر کو روست بنانے

میں مصروف تھے۔

میں نے وہاں رکنے کی غلطی نہیں کی۔ تقریباً دوڑتا ہوا ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب پہنچ کر

سائنس درست کرنے کی خاطر رُکا تو ایک ٹیکسی ڈرائیور تیزی سے نکل کر میرے سامنے آ

گیا۔ میں نے اُسے دیکھا تو دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، وہ ہرنام سنگھ تھا.....!!

”ٹشی..... اکتے..... اس لعنتی جگہ پر؟“ ہرنام سنگھ نے ایک ہی سانس میں رُک رُک کر

حیرت کا اظہار کیا۔ ”باب دے سامنے یہ آگ کس نے لا دی؟ زیادہ چڑھ گئی ہوگی ماں

دے محسم نوں۔ یہاں سے نکل چلو برادر..... آؤ..... میرے نال چلو۔“

میں نے ہرنام سنگھ کے سوالات کے جواب نہیں دیئے۔ اُس کے ساتھ قدم ملاتا خاموشی

سے جا کر اُس کی ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ اچھے خاصے موڈ کا ستیاناس ہو گیا تھا، میں نے پشت گاہ

سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ مجھے اڈگر کی موت کا غم نہیں تھا۔ وہ جس راہ کا مسافر تھا

اُس کا اختتام کسی ایسے ہی موڑ پر ہوتا تھا۔ میں اُسے کیفر کردار تک نہ پہنچاتا تو کل کلاں کو کوئی

دوسرا ٹھکانے لگا دیتا۔ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ پریم لال کی آتما نے ہسپتال میں جو کہا

تھا وہ غلط نہیں تھا۔ اڈگر کی موت سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی تھی کہ پریم لال کی مہمان خُشتی

بات درمیان سے اُچک لی۔

”مینوں یاد ہے برادر۔ پانچ درش سے لندن کی اونچی نیچی سڑکوں پر ڈول رہا ہوں۔“  
میں نے ہر نام سنگھ کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا، وہ پھر گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح بچے لگا۔ کیب ہوٹل کے صدر دروازے پر جا کر رُک کر اُس نے تیزی سے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا۔ میں نے اترتے اترتے موسو پاؤنڈ کے پانچ نوٹ نکال کر اُس کی جیب میں ڈالے تو بڑی اپنائیت سے میرا ہاتھ تھام کر بولا۔

”میں نے تمہیں برادر کہا ہے۔ ٹی مینوں شرمندہ کرتے ہو۔“

ہر نام سنگھ کے لہجے میں خلوص تھا، محبت تھی۔ میں نے اڈگر سے پانچ سو پاؤنڈ میں سودا طے کرنا چاہا تھا مگر موت اُس کا مقدر بن گئی۔ ہر نام سنگھ زیادہ انعام کا مستحق تھا۔ میں نے اُسے سمجھا بھجا کر رخصت کر دیا۔ اس بار صدر دروازے پر تعینات ہوٹل کے کارندوں نے مجھے روکنے کی جسارت نہیں کی۔ خود کار دروازہ میرے وزن کے بوجھ سے کھل گیا۔ میں سینہ تانے اندر داخل ہوا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے روم سروس کو کافی کا آرڈر دیا، پھر کافی پیتے وقت مجھے جین کی ایک بات یاد آگئی، اُس نے کہا تھا کہ جم، مارٹینا کے قتل کا معرہ حل کرانے کے سلسلے میں مجھ سے رابطہ قائم کرے گا۔ میں اس مسئلے کو ٹالنا چاہتا تھا، مارٹینا کی موت کے سلسلے میں جیکب کا نام بھی درمیان میں آتا، جین بھی ملوث ہو جاتی جو مجھے منظور نہیں تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر جم کو فون کیا، دوسری جانب سے سارا کی مانوس آواز سنائی دی۔

”مجھے جم سے بات کرنی ہے.....“ میں نے دہی آواز میں کہا۔

”تم..... تم دولت علی۔“ سارا میری آواز سن کر چپکنے لگی۔ ”میرے کان دھوکا نہیں کھا سکتے۔ میں تمہاری آواز کو لاکھوں میں پہچان سکتی ہوں۔“  
”کیسی ہو سارا؟“ میں نے اُس کی خیریت دریافت کی۔

”میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ تمہاری عمر طویل ہوگی۔ یقین کرو، ابھی میرے اور جم کے درمیان تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ تم نے فون کر کے مجھے حیران کر دیا، کہاں سے بات کر رہے ہو؟“

میں نے ہوٹل کا نام اور روم نمبر بتایا تو وہ یلخت سنجیدہ ہو گئی۔

”ہاں، مجھے یاد آیا۔ جین نے آج ہی جم کو بتایا تھا کہ تم اُس کے فارم ہاؤس سے ہوٹل نکل ہو گئے ہو۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟ جم بتا رہا تھا کہ جین تمہارے جانے سے افسردہ ہے۔“  
”کچھ ضروری کام درپیش تھے جو میں شہر سے دُور رہ کر نہیں کر سکتا تھا۔“ میں نے بہانہ تراشا۔

”جم کو بھی ایک اہم دفتری معاملے میں تمہاری ضرورت پیش آگئی ہے۔ ٹھہرو..... میں بات کرتی ہوں۔“

چند لمحے بعد جم کی آواز ابھری۔ ”ہیلو دولت علی۔“ اُس نے عجلت کا مظاہرہ کیا۔ ”تم اس وقت مصروف تو نہیں ہو؟“

”کافی کی چسکیاں لے رہا ہوں۔“ میں نے بے تکلفی سے جواب دیا۔

”میں گاڑی بھیج رہا ہوں، تم میری طرف آ جاؤ۔ گپ شپ رہے گی۔“

”سارا بتا رہی تھی کہ تمہیں پھر کسی دفتری معاملے میں میری ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“ میں نے اُسے کریدا۔

”فون پر نہیں.....“ جم نے محتاط انداز اختیار کیا۔ ”تم آ جاؤ، ہم اکٹھے ڈنر کریں گے، پھر اطمینان سے گفتگو ہوگی۔“

”آج معاف کر دو جم۔“ میں نے اُسے ٹالنے کی خاطر کہا۔ ”میں نے کسی کو وقت دے رکھا ہے۔“

”کون ہے وہ خوش نصیب؟“ جم کی آواز مدہم ہو گئی، اُس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”فون پر نہیں.....“ میں نے اُسی کے انداز میں کہا۔ ”کل رات کے ڈنر کے بعد اطمینان سے گفتگو ہوگی۔“

”اس وقت میری یاد کیسے آگئی؟“ جم نے فون کرنے کی وجہ جاننا چاہی۔

”کیوں؟ کیا تمہیں یاد کرتا بھی کسی خطرناک جرم کے احاطے میں آتا ہے.....؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

”باتوں میں اڑانے کی کوشش مت کرو دولت علی۔ میں تمہاری ماورائی اور زوہانی قوتوں کا معترف ہوں، تم نے میرے اُنہرے حواسِ احسان کیا ہے وہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا، تم مدد نہ کرتے تو اتنی جلدی میری ترقی کبھی نہ ہوتی۔ لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم



لیونارڈو کے علاوہ اپنے سابقہ مرحوم شوہر کی جائیداد پر بھی قبضہ جمائے بیٹھی تھی۔ اُس کے لواحقین بھی سامنے آ سکتے تھے، بات طول پکڑ جاتی۔ ایک وقت میں کئی سروں پر پھدکتے پھرنا انکا کے لئے دُشوار نہیں تھا لیکن عدالت کی کارروائی، وکیلوں کی بحث، گواہوں کے بیانات اور قانونی موٹو گانوں میں بھی وقت صرف ہو سکتا تھا۔

ذہن کو سکون دینے کی خاطر میں نے میلبا کو طلب کیا، وہ میرے اندازے سے زیادہ تجربہ کار اور معاون ثابت ہوئی۔ میں نے اُسے انعام دینے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ کئی رات تک وہ میرے پہلو میں بیٹھی خوبصورت باتیں کرتی رہی، سرسہلائی رہی، اپنے قرب کی تپش سے میرے تھکے ہوئے اعصاب کو سکون بخشی رہی۔ پھر وہ کس وقت میرے پاس سے اٹھ کر گئی؟ مجھے یاد نہیں!.....



نے اس وقت مجھے بلا مقصد فون نہیں کیا ہوگا..... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں، میں جانتا ہوں کہ تم ایک ذہین آفیسر ہو۔“ میں نے سنجیدگی سے بات بنانے کی کوشش کی۔ ”دراصل میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا تھا، اپنے ذاتی معاملے میں۔“

”کیا وہ بات کل نہیں ہو سکتی.....؟“

”میں سارا کے سامنے اس کا ذکر مناسب نہیں سمجھتا۔“ میں نے بدستور سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ایک خاص وجہ سے میرا فوری طور پر ہندوستان جانا ضروری ہو گیا ہے اسی لئے جین کے فارم ہاؤس سے گلو خلاصی حاصل کی ہے، اُسے میرے جانے کا علم ہو جاتا تو کبھی ہوٹل منتقل ہونے کی اجازت نہ دیتی۔“

”میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ تمہیں پہلے میرا ایک اہم معاملہ سلجھاؤ ہوگا۔“

”ٹھیک ہے، لیکن لندن میں میرا قیام ہفتے بھر سے زیادہ ممکن نہیں.....“ میں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی خاطر کہا۔ ”میرے بعد تمہیں جین کا خیال رکھنا ہوگا، میں کوشش کروں گا جلدی واپس لوٹ آؤں۔“

”اس کے علاوہ بھی مجھے تمہاری دس شرطیں منظور ہیں، لیکن تمہیں ہر قیمت پر پہلے مجھے درپیش تھی سلجھانی ہوگی۔“

جم سے رابطہ منقطع کرنے کے بعد بھی میں اُسی کے بارے میں سوچتا رہا، بات اُلجھنی نظر آ رہی تھی۔ ولیم کسی قیمت پر اپنے معاملے میں مارٹینا والے حادثے کی تشہیر پسند نہیں کر رہا تھا اور جم اپنے مفاد میں مارٹینا کے قتل کا سبب اور قاتل کی شخصیت کو سامنے لانے کی جان توڑ کوششوں میں لگا تھا۔ میرا فیصلہ اپنی جگہ تھا۔ میں جین کی وجہ سے ولیم کو نہ صرف اُس کا جائز حق دلانا چاہتا تھا بلکہ جین ہی کی وجہ سے جیکب کا نام درمیان میں نہیں لانا چاہتا تھا جسے انکا کی پراسرار قوتوں نے محکمہ سرانفرسانی والوں کے لئے ایک لائیو مچھ بٹا دیا تھا۔ مجھے اس سکون کے بیچ کوئی ایسا راستہ تلاش کرنا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لائیو بھی نہ ٹوٹے۔ انکا ہوتی تو پلک جھپکتے میں سارے مسئلوں کا حل نکل آتا، وہ ولیم کی جائیداد کا فیصلہ کرانے کی غرض سے پانچ دن کا کہہ کر گئی تھی لیکن اُسے اپنے مقصد کے حصول میں زیادہ وقت بھی لگ سکتا تھا۔ بات اگر صرف ولیم کے حقوق کی ہوتی تو کام آسان تھا لیکن مارٹینا

”کیوں.....؟“

”اس کا جواب تلاشی کے بعد دیا جائے گا۔“ پولیس آفیسر نے جیب سے سرچ وارنٹ نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

سرچ وارنٹ دیکھ کر میرا ذہن بھک سے اڑ گیا۔ میرا دل چاہا اس کاغذ کے حقیر ٹکڑے کے اُس کے منہ پر مار دوں۔ انہیں قبل از وقت باور کراؤں کہ بمیل احمد خان کو چھیڑ کر وہ خود اپنے پیروں پر کھڑا ہی مار رہے تھے لیکن میں خون کے گھونٹ پی کر چپ رہا۔ رات میں نے بے میں بھی اسی لئے کسی ہنگامے سے گریز کیا تھا کہ میں اخبار کی شہ سرخیوں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں الجھ جاتا تو ہندوستان واپسی میں دیر ہو جاتی۔

میں دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ کمرے میں آ گئے۔ معا میرے ذہن میں انکارانی کا خیال ابھرا۔ اُس نے رخصت ہوتے وقت خاص طور پر تاکید کی تھی کہ میں سفری بیگ سے کُرسی نوٹ نکال کر اُسے میلا کو واپس کر دوں۔ انکا اندھیروں میں دُور تک دیکھنے کی عادی تھی۔ اُس نے محسوس کر لیا ہوگا کہ سفری بیگ کمرے میں موجود ہونے کی صورت میں میری الجھن بڑھ سکتی ہے۔ میں ولیم سے گفتگو میں ایسا مخور ہا کہ انکا کی ہدایت پر عمل نہ کر سکا۔ اب وقت نکل چکا تھا۔

پولیس آفیسر کو زیادہ اٹھا بیچ نہیں کرنی پڑی۔ سفری بیگ اُسے پہلی الماری کھولتے ہی مل گیا۔ اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میرے قریب آ کر اُس نے بیگ فضا میں بلند کر کے میری نظروں کے سامنے کر دیا۔ مجرم کو نروس کرنے کا یہ بھی ایک انداز ہوتا ہے۔ پولیس آفیسر کا خیال تھا کہ میں بیگ کے دستیاب ہوتے ہی گڑبڑا جاؤں گا، ہاتھ پیر چھوڑ دوں گا۔ اگر اُس نے ایسا سوچا تھا تو یہ اُس کی بھول تھی۔ میں نے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ میری نگاہوں میں تلخیوں کا رنگ اور گہرا ہو گیا۔

”یہ بیگ کس کا ہے مسٹر دولت علی؟“ اُس نے زہر خند سے پوچھا۔

”تم نے اسے میرے کمرے سے حاصل کیا ہے اس لئے میرے سوا اور کس کا ہو سکتا ہے؟“ میں نے دہک آواز میں جواب دیا۔

”کیا آپ بتا سکتے ہو کہ اس بیگ میں کیا ہے.....؟“

”مکمل کر بات کرو آفیسر۔“ میں نے اُسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”تم اس معمولی سفری

دروازے سے بلند ہونے والی پُر شور آواز سن کر میں ہڑبڑا کر اٹھا، کوئی شدت سے متواتر دروازہ پیٹ رہا تھا۔ میری پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ میں جس لباس میں تھا اُسی میں اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر ہوٹل کا منیجر ایک باوردی پولیس آفیسر اور دو سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا۔ میلا بھی ایک طرف سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ ہوٹل کے ایک دو کارندے بھی تھے۔ میں ایک لمبے کو گھبرا گیا۔ صبح آٹھ نو بجے کے درمیان کسی ہوٹل کے دروازے پر پولیس کی موجودگی خالی از علت نہیں ہو سکتی تھی۔

”مسٹر دولت علی آپ ہی ہیں؟“ پولیس آفیسر نے مہذب لہجے میں سوال کیا۔

”جی ہاں.....“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ہوٹل کے جنرل منیجر کا بیان ہے کہ محکمہ سرغرسانی کی لیک معزز لیڈی آفیسر مس جین مارنڈا نے آپ کا خیال رکھنے کے لئے خاص طور پر فون کیا تھا۔“ پولیس آفیسر نے مجھے سرتاپا گھورتے ہوئے دریافت کیا۔ ”آپ مس جین کو کس طرح جانتے ہیں؟“

”یہ میرا قطعی نجی معاملہ ہے۔“ میں نے رُ دکھے لہجے میں جواب دیا۔ ”میں غیر ضروری سوالات کے جواب دینے کا عادی نہیں ہوں، آپ اس وقت اپنے آنے کا مقصد بیان کریں۔“ میرے لہجے کی لچکی میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ پولیس آفیسر کے چہرے پر بھی تاؤ کی کیفیت پیدا ہونی شروع ہو گئی۔

”کیا ہم اندر بیٹھ کر سہولت سے بات نہیں کر سکتے؟“ اُس نے مجھے تیکھے انداز میں مخاطب کیا۔

”سوری۔“ میں نے لحاظ و مروت کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ”تم نے مجھے سوتے میں ڈسٹرب کیا ہے، میں اس وقت اخلاق کی جھوٹی نمائش نہیں کر سکتا۔“

”مجھے آپ کے کمرے کی تلاشی لینی ہے۔“

بیگ سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟

”تم نے اس بیگ کو جس میں سو سو پونڈ کے نئے نئے نوٹوں کی گڈیاں موجود ہیں چوری کیا ہے۔“ پولیس آفیسر کا لہجہ یکفخت کرخت ہو گیا۔ ”میں تمہیں اس جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔“

”ہوش کرو آفیسر۔“ میں نے اُسے چیلنج کیا۔ ”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ بیگ میں نے چوری کیا ہے؟“

”ثبوت یہ بیگ بذات خود ہے..... اس کے گواہ یہ لوگ ہیں جن کی موجودگی میں، میں تمہیں جھکڑیاں پہنا کر اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ پولیس اسٹیشن پہنچ کر تم سب کچھ اگل دو گے۔“

”اپنی اوقات سے تجاوز مت کرو آفیسر۔“ میرے اندر لازوال قوتیں کسمانے لگیں۔ ”تم ایک معزز شخص کی بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔“ میری آواز میں گھن گرج پیدا ہونے لگی۔ ”بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے تم میرے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کر سکتے۔ میں تمہارے خلاف چمک عزت کا دعویٰ دائر کرنے کا حق رکھتا ہوں۔“

پولیس آفیسر میری دیدہ دلیری پر بل کھا کر رہ گیا۔ میلبا بھی مجھے حیرت سے گھورنے لگی۔ ”ہمارے ملک میں قانون اور عدالتی انصاف بڑا صاف و شفاف ہوتا ہے مشر دولت علی۔“ پولیس آفیسر جس کا نام لوئیس آرتھر تھا، انتہائی سرد لہجے میں بولا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں کہ تم مزاحمت کی فضول کوشش کیوں کر رہے ہو؟ یہ حربے تمہارے کسی کام نہیں آئیں گے۔“ اُس نے الفاظ چباتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”تمہاری اطلاع کے لئے یہ بھی بتا دوں کہ مس جین مارٹن.....“

”نہیں، میں تمہیں کسی اور کا نام درمیان میں لانے کی اجازت نہیں دوں گا۔“ میں نے مضطرب لہجے پر قبضہ کر کے احتجاج کیا۔ ”تم نے میرے اوپر ایک جھوٹا الزام عائد کرنے کی کوشش کی ہے، اسے ثابت کئے بغیر تم مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔“ پولیس آفیسر نے مجھے ایک لمحے کو بے حد غور سے دیکھا۔ میرے لہجے کی ترشی اور کلامی سے اُس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی ہوگی۔ اُس کا اندازہ تھا کہ میں بیگ سامنے آ جانے کے بعد ہتھیار ڈال دوں گا۔

”مشر دولت علی۔“ اُس نے کچھ توقف کے بعد سرسرا تے لہجے میں سوال کیا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس بیگ میں کتنی رقم موجود ہے؟“

”نہیں.....“ میں نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ ”میں ذاتی اخراجات کا باقاعدہ حساب کتاب رکھنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”کوئی اندازہ.....؟“

”اندازے وہ لگاتے ہیں جنہیں خود پر اعتماد نہیں ہوتا۔“

”کیا تم نے اس بیگ سے کچھ رقم نکال کر خرچ بھی کی ہے؟“ اُس نے پینتر بدلا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ کل شام تم نے کچھ وقت ہوٹل سے باہر بھی گزارا ہے، ممکن ہے شاپنگ بھی کی ہو۔“

”امکانات کی بات کر کے تم اپنی کمزوری کا ثبوت دے رہے ہو۔“ میں نے اُسے چلانے کی کوشش کی۔ ”ذمہ دار پولیس آفیسر ٹھوس اور دو ٹوک بات کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔“

”ہم نے اُس کاؤنٹر کلرک کو بھی حراست میں لے لیا ہے جس نے میلبا کے ذریعے یہ بیگ تم تک پہنچایا تھا۔“ اس بار اُس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہیں یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ میں نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تم جس کاؤنٹر کلرک کی بات کر رہے ہو اُس نے غلطی سے تمہیں میرے کمرے کا نمبر بتا دیا ہو۔“

پولیس آفیسر نے مجھے چیستی نظروں سے گھورا۔ ”کیا تم شرافت سے ہمارے ساتھ تعاون نہیں کرو گے؟“

”تم بھول رہے ہو کہ تمہاری بیہودہ اور فضول گفتگو کے کچھ گواہ بھی کمرے میں موجود ہیں جواز الہ حیثیت عرفی کے مقدمہ میں میرے لئے بے حد کارآمد ثابت ہوں گے۔“

پولیس آفیسر میری ڈھٹائی پر تھلا گیا۔ اُس نے ایک سپاہی کو ہونٹ کاٹنے ہوئے اشارہ کیا جو ہاتھ میں فائل دبائے کھڑا تھا، آفیسر کا اشارہ پا کر اُس نے فائل سے ایک فوٹو اسٹیٹ کی ہوئی فہرست نکال کر میرے حوالے کر دی۔ میں نے کاغذ پر غور کیا تو ایک ٹاپے کو گھبرا گیا۔ اُس پر انگریزی حروف کے ساتھ ساتھ کچھ نمبروں کا اندراج بھی تھا۔ میں سمجھ گیا یہ

ان نوٹوں کے نمبر تھے جو بیک میں موجود تھے جسے ابھی تک کھولا نہیں گیا تھا۔ جس بینک نے وہ لسٹ جاری کی تھی اُس کا نام بھی جلی حروف میں نظر آ رہا تھا۔ بینک منیجر کے دستخط اور نمبر بھی موجود تھے۔ میرے خلاف جو ثبوت تھے اس میں کوئی جھول نہیں تھا۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا پولیس آفیسر کی تیز آواز میرے کانوں میں دوبارہ گونجی۔

”کیا تم اب بھی مزاحمت کا ارادہ رکھتے ہو.....؟“

”نہیں.....“ میں نے فیصلہ کن آواز میں جواب دیا۔ ”تم کاغذی کارروائی مکمل کرو۔“ میرا لہجہ بتدریج سرد ہوتا گیا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کس قماش کے آفیسر ہو۔ میں اب بھری عدالت میں تمہیں تمہاری حیثیت کا احساس دلاؤں گا۔“

ہندوستان ہوتا تو میرے سخت جملے کی پاداش میں مجھے کسی کال کوٹھڑی میں بند کر کے پہلے مادرِ زاد برہنہ کیا جاتا، پھر روٹی کی طرح دھتک دیا جاتا، کوئی رحم نہیں کیا جاتا۔ اگر مر جاتا تو خاموشی سے راتوں رات مجھے جلا کر میری راکھ دریا برد کر دی جاتی، زندہ رہتا تو زد و کوب کے نتیجے میں ناقابلِ مرمت جسمانی ٹوٹ پھوٹ سے تنگ آ کر زندگی کی آخری سانس تک موت کی دعائیں مانگتا رہتا۔ لیکن وہ ہندوستان نہیں، لندن تھا جہاں مجرموں کے ساتھ اُس وقت تک انسانیت سوز سلوک نہیں کیا جاتا جب تک وہ از خود اپنے جرم کا اقرار نہ کرے یا عدالت کوئی حتمی فیصلہ نہ سنا دے۔

پولیس آفیسر نے قانونی کارروائی شروع کی، بیک سے کرنسی نوٹ نکال کر انہیں گنا گیا، اُن کے سارے نمبر فہرست سے ملتے تھے۔ صرف وہ کرنسی نوٹ کم تھے جو میں خرچ کر چکا تھا۔ میں صوفے پر آرام سے بیٹھا کاغذی کارروائی دیکھتا رہا، میری موجودگی میں مشیر نامہ تیار کیا گیا، گواہوں کے دستخط اور بیان لئے گئے۔ میلبا نے اس سفری بیک کے سلسلے میں وہی بیان دیا جو پہلے مجھے دے چکی تھی۔ اُس نے کاؤنٹر کلرک کے کہنے پر وہ بیک میرے کمرے تک پہنچایا تھا۔

مجھے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ میں چاہتا تو پولیس کے کارندے اندھے ہو جاتے، وہ ساری زندگی کمرے کی ایک ایک شے کو اُلٹتے پھرتے رہتے لیکن بیک اُن کے ہاتھ نہ لگتا۔ میں انہیں اپنی قوتوں کے ذریعے دروازے ہی سے واپس لوٹا سکتا تھا، میں ایک اشارہ کرتا، پولیس آفیسر میرے تلوے چاٹنے لگتا، ساری کاغذی کارروائی دھری کی دھری رہ

جاتی، میرے لئے سب کچھ ممکن تھا۔ میں نے بدری نرائن اور اُس کے چیلوں کو پورے ہندوستان میں کہیں پناہ نہیں لینے دی تھی۔ میں نے بھی اپنا بہت کچھ کھویا تھا لیکن جیت میری ہی ہوئی۔ بدری نرائن کتوں کی موت مارا گیا۔

چین کے فارم ہاؤس میں قیام کے دوران میں نے ارتکاز اور مراقبہ کی مشقیں کبر کے کھوٹی ہوئی قوتیں دوبارہ حاصل کر لی تھیں۔ پب کے باہر اڈگر کا انجام اس بات کی دلیل تھی کہ پریم لال کی آتما بھی میری پشت پناہی کر رہی ہے، میں انکارانی کو آواز دیتا وہ سارے کام چھوڑ کر واپس آ جاتی۔ پولیس آفیسر اور اُس کے ساتھی گنگی کا ناچ ناچنے لگتے۔ لیکن میں نے جان بوجھ کر درگزر سے کام لینے کی ٹھان لی۔ ڈگڈگی بہر حال میرے ہاتھ میں تھی، میں جب چاہتا اُسے بجانے لگتا۔ وہ سب اُس کی تال پر تھرکنے لگتے۔ ہر بات میرے اختیار میں تھی لیکن میں ضبط سے کام لے رہا تھا۔

کاغذی کارروائی مکمل ہو گئی۔ پولیس آفیسر کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ مجھے حقارت سے گھور کر بڑے زہریلے لہجے میں بولا۔

”کیا تم خود اٹھو گے یا مجھے اپنے کارندوں کو تمہاری ڈنڈا ڈولی کرنے کی زحمت دینا پڑے گی۔“

پولیس آفیسر کا لہجہ تضحیک آمیز تھا۔ میں نے اُسے خشکی نظروں سے گھورا، میرے اندر اٹھل پھٹل شروع ہو گئی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میلبا مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کل رات وہ میری بانہوں میں کھیل رہی تھی، اس وقت مجھے پولیس کے سامنے بے بس دیکھ کر اُس کے دل پر جانے کیا گزر رہی ہوگی۔ میرے جسم پر شبِ خوابی کا ڈھیلا ڈھالا لباس موجود تھا۔

”تم چلو آفیسر، میں لباس تبدیل کر کے آتا ہوں۔“ میں نے سرد لہجے میں پولیس آفیسر کو مخاطب کیا۔ اُس نے بڑی پھرتی سے ریوالتور نکال کر مجھ پر تان لیا۔

”تم اسی لباس میں میرے ساتھ چلو گے۔“ اُس کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا۔ ”تھکڑی پہن کر۔“ اُس نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا، وہ تھکڑی لئے میری طرف بڑھنے لگا۔

مجھے اُن نادانوں کے انجام پر ہنسی بھی آرہی تھی اور غصہ بھی۔ انہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں تھا، میں تیور بدل لیتا تو میری آتش انتقام سے جھنڈے والی چنگاریاں شہد کی مکھنوں

سفاک لہجہ اختیار کیا۔

”دولت علی، ہمیں سختی پر مجبور نہ کرو، ورنہ ہمیں تم جیسے مجرموں کو سیدھا کرنے کے اور بھی

طریقے آتے ہیں۔ میری بات مان لو، شرافت سے جھکڑی پہن لو.....“

میں نے بے بسی سے ہونٹ بھیج لئے۔ کلدیپ کی آتما نہ آتی تو قیامت آجاتی، میں

پولیس آفیسر کو جلا کر رکھ کر دیتا، اس ہوٹل کو رکھ کا ڈھیر بنا دیتا جہاں میری توہین ہوئی تھی،

سب کچھ تبس نہیں کر ڈالتا، پھر جو بھی ہوتا.....!

زمین پر گرے ہوئے سپاہی نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی، اُس کی نگاہوں سے نفرت

جھانک رہی تھی، وہ ڈیل ڈول میں مجھ سے زیادہ تھا اس لئے دھوکا کھا گیا۔ پولیس آفیسر

کے اشارے پر دوسرا سپاہی بھی اپنے ساتھی کی مدد کو آگے بڑھا، میں نے اس بار مزاحمت

نہیں کی، ایک سپاہی نے مجھے جھکڑی پہنا دی، پھر اپنے آفیسر سے بولا۔

”سر، یہ مٹا ہے، اس کا بایاں ہاتھ مصنوعی ہے۔“

”اوہ.....“ پولیس آفیسر نے گردن ہلاتے ہوئے سنجیدگی کا اظہار کیا۔ ”ہمیں چھان

بین کرتے وقت زیادہ احتیاط کرنی ہوگی، ہو سکتا ہے کہ یہ سرد خانوں میں پڑی ہوئی مفرور

مجرموں کی فائلوں میں سے کوئی ایک ہو، اگر ایسا ہوا تو ہم یقیناً ایک بڑے انعام کے مستحق

ہوں گے۔“

میں نے ہونٹ سختی سے بھیج لئے، جانے کے ارادے سے قدم اٹھائے تو دروازے کے

سامنے جمع لوگ کائی کی طرح چھٹ گئے۔ آفیسر ریوالورتا نے میرے ساتھ تھا۔ مجھے نیچے

لے جانے کی خاطر مسافروں کی بجائے سامان والی لفٹ استعمال کی گئی، میں لفٹ رکنے پر

باہر آیا، لاؤنج میں خاصی بھیڑ تھی۔ میں پولیس آفیسر کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا تیزی سے

باہر آ گیا۔ کسی نے کوئی توجہ نہیں دی، آفیسر کے علاوہ سپاہی بھی صورت حال سے بے خبر

تھے۔ باہر پولیس کی گاڑی موجود تھی، مجھے پچھلی نشست پر دونوں سپاہیوں کے درمیان بٹھایا

گیا، آفیسر اٹلی سیٹ پر بیٹھ گیا، گاڑی حرکت میں آئی تو میں نے داہنے ہاتھ میں دبی ہوئی

جھکڑی آفیسر کی گود میں اُچھالتے ہوئے سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

”اے سنبھال کر رکھو آفیسر۔ پھر کسی اور کے کام آئے گی۔“

جھکڑی دیکھ کر پولیس آفیسر کے علاوہ دونوں سپاہی بھی اس طرح چونکے جیسے ابھی تک

کی طرح پلٹ کر اُن کے جسم بھنبھوڑ ڈالتیں، لہو لہان کر دیتیں، انہیں بھاگنے کا راستہ نہ ملتا، وہ

زمین پر گھٹنے ٹیک کر گر گزرنے لگتے، میری منت سماجت شروع کر دیتے، لیکن میں ضبط سے

کام لے رہا تھا۔ پولیس آفیسر نے جین مارٹن کا نام لے کر مجھے کمزور کر دیا تھا۔ میں قانون

سے طاقت کے دو دو ہاتھ کر لیتا تو جین بلاوجہ بدنام ہوتی۔ مجھے اُس کی رسوائی منظور نہیں تھی۔

”سنو آفیسر۔“ میں نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔

لیکن جھکڑی پہنانے کا حکم واپس لے لو۔ یہ میری توہین ہوگی۔“

”ایک ملزم کی زبان سے توہین کا لفظ سن کر مجھے ہنسی آرہی ہے۔“ اُس نے توہین آمیز

انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم مجھے اچھے لگے ہو دولت علی۔ مجھے اگر وقت ملا تو

تم سے جیل میں بھی کبھی کبھی ملاقات کے لئے ضرور آؤں گا۔“

پانی سر سے اُونچا ہونے لگا۔ سپاہی نے قریب آ کر میرا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی تو میں

نے ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ زمین پر دُور جا گرا۔ میں نے اپنی تمام مخفی قوتوں کو آنکھوں میں سمیٹا۔

میں پولیس آفیسر کو بتانا چاہتا تھا کہ اُس نے جمیل احمد خان پر ہاتھ ڈال کر اپنی موت کو دعوت

دی ہے۔ لیکن اسی لمحے ایک مانوس نسوانی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

”درگزر سے کام لو جمیل، اس سے کسی شکتی کا چٹکار جین کی راہ میں دُشواریاں کھڑی کر

دے گا۔“

میں تڑپ کر رہ گیا۔ وہ میری کلدیپ کی آواز تھی۔ میں نے پچل کر کہا۔ ”یہ مجھے لوہے کا

زیور پہنانے کی بات کر رہے ہیں۔ کیا ان حرام زادوں کی بات مان لوں؟“

”میں تمہیں صرف خون خرابے سے روک رہی ہوں۔“ کلدیپ نے افسردہ لہجے میں

جواب دیا۔ ”میں جانتی ہوں جمیل۔ تم جھکڑی پہن کر لوگوں کے سامنے جاؤ گے تو تمہارا

اچھان ہوگا۔“

”پھر میں کیا کروں.....؟“ میں نے تلملا کر پوچھا۔

”دُور اندیشی سے کام لو..... مہاراج کی شکتی بھی تمہارے ساتھ ہے۔ زراش مت ہو،

دھیرج سے کام لو.....“

میں نے کلدیپ کو پھر مخاطب کیا، اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اس کی رُوح کو

زیادہ دیر ٹھہرنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ پولیس آفیسر نے میری وحشت دیکھ کر کرحشت اور



کاغذ اٹا پلٹتا رہا، پھر اُس نے فائل بند کر کے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا، نگاہوں نگاہوں میں تولتا رہا، اپنے معیار کی خاص کسوٹی پر پرکھتا رہا پھر بڑے مہذب لہجے میں بولا۔  
”مسٹر دولت علی، ہماری پولیس نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی؟“  
”جی نہیں.....“ میں نے مختصر آکھا۔

”کیا تم اپنا جرم تسلیم کرتے ہو.....؟“

”میں فی الحال اس ضمن میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔“ میں نے سپاٹ لہجہ اختیار کیا۔  
”کیس کی باقاعدہ سماعت شروع ہوگی تو کھل کر دو بدد باتیں کرنے میں زیادہ لطف آئے گا۔“  
”تمہیں فائل کی تیاری میں ہمارے تفتیشی آفیسر سے کوئی شکایت ہو تو بیان کر سکتے ہو۔“ جج نے مجھے ایک موقع اور دیا۔

”سوری می لارڈ.....“ میں نے زہر خند سے جواب دیا۔ ”میں اپنے تِرپ کے پتے قبل از وقت استعمال کرنے سے گریز کروں گا۔“

”پولیس نے ایک ہفتے کے لئے تمہارے جسمانی ریمانڈ کی درخواست کی ہے، تمہیں اس سلسلے میں بھی اپنا موقف بیان کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔“

”شکریہ یور لارڈ شپ۔“ میں نے اس بار قدرے سنجیدگی سے کہا۔ ”فائل آپ کے سامنے ہے، مسٹر آرتھر نے میرے خلاف قانون کا گھیرا تنگ کرنے میں کسی بجل سے کام نہیں لیا، ساری دستاویز مکمل ہیں، پولیس نے میرے بچاؤ کے لئے کوئی چور راستہ نہیں چھوڑا ہوگا، بڑی دیانت داری سے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ سارے ثبوت انتہائی ٹھوس اور مربوط ہیں، میں سزا سے نہیں بچ سکوں گا۔“ میں نے ایک لمحے کو گردن گھما کر لوئیس آرتھر کی سمت دیکھا، وہ بڑے ادب سے انٹشن پوزیشن میں کھڑا تھا۔ میں جج سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ ”مسٹر آرتھر نے میرے ساتھ ابھی تک کوئی بدسلوکی نہیں کی، میرا خیال ہے کہ یہ ایک ذمہ دار، فرض شناس اور تجربے کار آفیسر ہیں لیکن.....“ میں نے جان بوجھ کر تھوڑے توقف کے بعد معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”تمام دستاویز اپنے سامنے مکمل کرانے کے باوجود اگر آپ کے معزز آفیسر کو میرے جسمانی ریمانڈ کی ضرورت بھی ہے تو انہیں حسب فضا اس کا موقع دیا جائے۔“

جج نے کسمسا کر مجھے بخیر غور دیکھا، وہ میرے جیلے کی گہرائی تک پہنچ گیا تھا۔ ہاتھ میں

خواب غفلت سے دوچار تھے۔ پولیس آفیسر نے بڑی سرعت سے پلٹ کر مجھے بغور دیکھا، اُس کی آنکھیں پٹ پٹانے لگیں۔ جو کچھ ہوا وہ کم از کم اُس کے لئے ضرور ناقابل یقین تھا۔ میں نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا، سیٹ کی پشت سے سرٹکا کر کلدیپ کے بارے میں سوچنے لگا جس نے بروقت مداخلت کر کے صحیح سمت میں میری رہنمائی کی تھی۔

میری طاقت کے ایک ہی کرشمے نے اُن کے سارے کس بل نکال دیئے۔ پولیس آفیسر آرتھر راستے بھر خاموش بچھا کی سوچ میں گم رہا، میرے دائیں بائیں بیٹھے دونوں سپاہی بھی بار بار کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ راستہ کسی ادھم چوکڑی کے بغیر کٹ گیا مگر مجھے پولیس اسٹیشن لے جا کر لاک اپ کر دینے کے بعد آرتھر پھر شیر ہونے لگا۔

”دولت علی، تم نے ہتھکڑی ہاتھوں سے اُتارنے کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ تمہارا تعلق یقیناً کسی خطرناک بین الاقوامی تنظیم سے ہے، ہم بہت جلد تمہاری اصل شخصیت کا سراغ لگالیں گے۔“

”کیا میں تمہیں تمہاری متوقع کامیابی پر پیشگی مبارکباد پیش کر سکتا ہوں؟“ میں نے بذلہ سنجی سے کام لیا۔

”دوچار گھنٹے اور اطمینان کا سانس لے لو۔“ وہ تمللا کر بولا۔ ”کورٹ کے سامنے پیش کر کے پہلے ہم تمہارا جسمانی ریمانڈ حاصل کریں، پھر اطمینان سے تفصیلی گفتگو ہوگی۔“

میں نے جواب میں اُسے مسکرا کر دیکھا، پھر بچ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں میرے ذہن میں مختلف خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے، میں اپنی قوتوں کے ذریعہ اُس فائل کو جلا کر راکھ بھی کر سکتا تھا جو آرتھر نے بڑی محنت اور جانفشانی سے تیار کی تھی۔ مشیر نامہ، گواہوں کے بیانات، کرنسی نوٹ اور سفری بیگ سب کچھ راکھ ہو جاتا، آرتھر ٹاپتارہ جاتا، صرف نوٹوں کے حروف اور ہند سے تبدیل کر دیتا تو پولیس کو جان چھڑانی مشکل ہو جاتی، میں اُن پر ہنک عزت کا دعویٰ کر دیتا، جھوٹا مشیر نامہ تیار کرنے پر آرتھر کو سزا ہو جاتی، میرے کردار پر کوئی داغ نہ آتا۔ اور بھی بہت کچھ ممکن تھا مگر میں نے محل سے کام لیا، کلدیپ کی بھٹکتی ہوئی آتما نے کہا تھا کہ اگر میں نے کوئی ہنگامہ کیا تو جین کے لئے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ میں نے کلدیپ کی بات مان لی۔

دو گھنٹے بعد مجھے کورٹ میں پیش کیا گیا۔ جج نے میری فائل کا بغور مطالعہ کیا، ایک ایک

دبے قلم کو پُر خیال انداز میں آہستہ آہستہ کچھ دیر فائل پر مارتا رہا، اُس کے چہرے کے تاثرات غمازی کر رہے تھے کہ وہ ریمانڈ کے حق میں نہیں ہے۔ کچھ غور و خوض کے بعد اُس نے آر تھر کو مخاطب کیا۔

”آفیسر۔ کیا آپ جسمانی ریمانڈ کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں؟“

”لیس یور آنر۔“ آر تھر نے دنگ آواز میں جواب دیا۔

”کیا فائل میں موجود کاغذات کے علاوہ بھی کسی ثبوت کی تلاش ہے.....؟“

”لیس یور آنر.....“ آر تھر نے کٹکیوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔

”ہمیں ملزم کے سابق چال چلن کی چھان بین بھی کرنی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ سرد خانے میں پڑی ہوئی کوئی ڈیڈ فائل (DEAD FILE) دوبارہ حرکت میں آجائے۔“

”میں آپ کے جیلے کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔“ فاضل جج نے سنجیدگی سے اپنا اختیار استعمال کیا۔

”یور آنر.....“ آر تھر نے وضاحت شروع کی۔ ”ملزم کی گرفتاری کے وقت یہ اہم بات ہمارے علم میں آئی کہ اس کا اُلٹا ہاتھ کہنی کے پاس سے کٹا ہوا ہے، اس کی جگہ مصنوعی ہاتھ لگایا گیا ہے، اکثر مسلم ممالک میں کہنی یا کلائی کے پاس سے سیدھا یا اُلٹا ہاتھ کاٹ دینے کی سزا رائج ہے۔ اس سزا کا اطلاق ان مجرموں پر ہوتا ہے جو یا تو کسی سنگین جرم میں ملوث پائے جاتے ہیں یا کسی اخلاقی کم ظرفی کے گھناؤنے مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اکثر بین الاقوامی تنظیموں کے مفرور مجرم بھی منکر پرش ضائع کرنے کی خاطر بذات خود ہاتھ کٹوانے کی اذیت کو خوشی خوشی گوارا کر لیتے ہیں۔ ایسے اقرار کو قانون کی اصطلاح میں خطرناک مجرم کہا جاتا ہے۔“

آر تھر میرا بایاں ہاتھ کٹا ہونے کی رعایت سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ وہ جو الفاظ استعمال کر رہا تھا وہ میرے خون کی گردش کو تیز کرنے کے لئے بہت کافی تھے۔ وہ بد بخت مجھ پر ”اخلاقی کم ظرفی“ اور ”گھناؤنے مرض“ کا الزام بڑی خوبصورتی سے تراش رہا تھا۔ میں نے نچلا ہونٹ پوری شدت سے دانتوں تلے بھیج لیا۔ میرے ہونٹ مل جاتے تو تھلکے مچ جاتا۔ بھگدڑ شروع ہو جاتی، عدالتوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا، آر تھر کو اُس کی کھٹیا وضاحتوں کا ایک اور ثبوت مل جاتا۔ میں اُسے نیکی نظر سے گھورتا رہا، میں نے اپنے

دل میں اُسے ایک عبرتناک سزا دینے کی ٹھان لی۔

”میں نے فی الحال صرف ایک ہفتے کے جسمانی ریمانڈ کی استدعا کی ہے۔“ آر تھر نے کسی گھماں آفیسر کی طرح بڑی معصومیت سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ ہمیں قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کچھ مزید وقت بھی درکار ہو، حالات پر منحصر ہے۔“ اُس نے شانے اُچکاتے ہوئے بات ختم کی۔ جج کچھ سوچتا رہا، پھر اُس نے میری جانب دیکھا۔

”مسٹر دولت علی، کیا آپ عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کا ہاتھ کاٹے جانے کی اصل وجہ کیا تھی؟“

”مجھے ایک کارا ایکسٹنٹ کے بعد یہ اذیت برداشت کرنی پڑی۔ ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ اگر ہاتھ نہ کاٹا گیا تو زہر باد کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔“ میں نے ایمانداری سے حقیقت بیان کی، پھر آر تھر کو دیکھ کر جج سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ ”میں نے جو سچائی بیان کی ہے اس کا کوئی کاغذی ثبوت نہیں ہے میرے پاس..... یہ بھی ممکن ہے کہ میں مسٹر لوکیس آر تھر اور قانون کی نظروں میں دھول جھونکنے کی خاطر غلط بیانی سے کام لے رہا ہوں۔“ میرے لہجے میں زہر کی تلخی سراپت کر گئی۔ ”اخلاقی کم ظرفی اور گھناؤنے مرض میں مبتلا شخص اپنے آپ کو قانونی شکنجوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر ہمیشہ اوجھے جھکنڈے اختیار کرتا ہے، محبت اور جنگ میں تمام حربوں کا استعمال جائز ہے۔“

فاضل جج کو میری گفتگو کا انداز پسند نہیں آیا۔ اُس نے برا سامنہ بنا کر پولیس کی درخواست پر سات پوم کے جسمانی ریمانڈ کا حکم صادر کر دیا۔ آر تھر کا سینہ کچھ اور چوڑا ہو گیا۔ میں اُس کی بد نصیبی پر مسکرانے لگا۔ واپسی پر ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ مجھے پولیس اسٹیشن لا کر دوبارہ لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔

میں بڑی لا پرواہی سے فرش پر بیٹھا دیوار سے ٹیک لگائے، آر تھر کو کوئی مناسب سزا دینے کے بارے میں غور کر رہا تھا جب آر تھر دوبارہ نظر آیا۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ اُس کے ہمراہ جین، ولیم اور جرم بھی تھے، سب ہی کے چہروں سے حیرت ٹپک رہی تھی، جین سب سے زیادہ مغموم اور اُداس نظر آ رہی تھی۔ میں اُن سب کے استقبال کے لئے مسکراتا ہوا اُٹھا۔

”دولت علی.....“ جین نے سلاخوں کے قریب پہنچ کر نرمی سے آواز میں پوچھا۔ ”یہ سب کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ مجھے ولیم نے فون پر اخبار کے حوالے سے اطلاع دی تو مجھے

اپنی قوت سماعت پر دھوکا ہوا۔ میں ولیم کو راستے سے لیتی ہوئی برق رفتاری سے دفتر پہنچی تو وہاں جم بھی حیرتوں میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔ جم نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ تمہیں عدالت لے جایا گیا ہے۔“ جین ایک ہی سانس میں سب کچھ کہتی چلی گئی۔ ”مجھے بتاؤ دولت علی حقیقت کیا ہے؟ تم جین پر اعتماد کر سکتے ہو۔“

ولیم کی بے چین نگاہوں میں بھی سینکڑوں سوالات مچل رہے تھے۔ جم بھی خاصا الجھا نظر آ رہا تھا۔ لیکن اُس نے ذہانت سے کام لیا، جین کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے تسلی دی، پھر بڑے سلجھے لہجے میں آخر سے مخاطب ہوا۔

”کیا ہم اپنی ذمہ داری پر تمہاری اجازت سے کسی علیحدہ کمرے میں دولت علی سے کچھ بات چیت کر سکتے ہیں؟“

آخر نے بے بسی سے شانے اچکا کر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ محکمہ سرانصرسانی کے اعلیٰ اور ذمہ دار آفیسروں کی درخواست رد کرنا شاید اُس کے اختیار میں نہیں تھا، ہمیں ایک علیحدہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جین کی اضطرابی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس نے پوری قوت سے ولیم کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا، غم اور تکلیف کی شدتوں کو برداشت کرنے کا یہ بھی ایک انداز ہوتا ہے۔ میرے دل کو چر کا سا لگا، خوشی بھی ہوئی کہ جین نے جم کی بجائے ولیم کو اپنے غم میں شریک کرنے کو ترجیح دی۔ شاید انکارانی کی کوششیں باور آور ثابت ہو رہی تھیں۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ جین اور ولیم شادی کے مقدس رشتے میں گندھ جائیں۔ لندن میں میرا کام ختم ہو جاتا۔ پھر دنیا کی کوئی طاقت میرا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔ میں پہلی فرصت میں ہندوستان کی سمت پرواز کر جاتا، قانون کے تقاضے اور جسمانی ریماڈ کے احکامات دھرے کے دھرے رہ جاتے۔

کمرے میں کچھ دیر خاموشی کا تسلط رہا، جو کچھ ہوا تھا اس نے ان سب کے دماغ کی چولوں کو ہلا کر رکھ دیا ہوگا، وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دولت علی جو روحانی قوتوں کے حیرت انگیز کارناموں اور کمالات سے کبھی اپنی شہرت کا جھنڈا لہرا چکا تھا، وہ چوری جیسے معمولی جرم کا ارتکاب بھی کر سکتا ہے۔ اخبار نے کیا کچھ لکھا، میرے علم میں نہیں تھا۔ لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ مشرق کے سلسلے میں مغربی ذہن میں ہمیشہ مخفی خیالات جنم لیتے ہیں۔ وہ خود غرض اور کینہ پرور ہوتے ہیں، دوسروں کو خود سے آگے نکلتا دیکھنا گوارا نہیں کرتے،

پسماندہ ملکوں کو قرض کے بوجھ تلے دبا کر سود در سود وصول کرنے کے فن سے خوب واقف ہیں۔ ترنگے کو یونین جیک سے اوپر دیکھنا انہیں نہ کل منظور تھا نہ آج۔ جم، ولیم اور جین سب ہی اسی تہذیب کے نمائندہ تھے، اسی رنگ و نسل سے تعلق رکھتے تھے، ان کی رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا تھا جو ایشیائی ممالک کو کمتر سمجھتے تھے، گندی رنگ پر وہ اپنی حیا و شرم، اپنے عزم و غیرت، اپنا حسن، اپنے جسم کی رعنائیاں سب کچھ بڑے فخر سے قربان کر سکتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ مشرق کی مردانہ وجاہتیں زیادہ ہڈ کشش ہوتی ہیں، ان کی تسکین زیادہ بہتر انداز میں کرنے کے فن سے واقف ہوتی ہیں۔ لندن کی سڑکوں پر مقامی لڑکیاں بڑے فخر اور شان سے ہندوستانیوں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر چلتی ہیں۔ جسمانی رشتوں اور نزاکتوں کے معاملے میں بھی وہ آقا اور غلام کے چوری چھپے کھیلنا پسند کرتی ہیں، آقا خدمت کے فن سے ناواقف ہوتا ہے، غلام کو آقا کو خوش کرنے کے سینکڑوں نئے معلوم ہوتے ہیں۔

میرے ذہن میں آقا اور غلام کی بلندی اور پستی کا امتیازی فرق مختلف زاویوں سے اپنی شکلیں بناتا باگڑتا رہا، اُن کے چہروں کے رنگ گرگٹ کی طرح بدلتے رہے۔ پھر محبت اور شیدائیت کا رنگ غالب آ گیا۔ جین نے مجھ سے اپنا مستقبل وابستہ کر رکھا تھا، وہ میری تلاش میں ہندوستان کے گلی کوچوں کو چھانتی پھری تھی۔ میری خاطر اُس نے اپنی ماں کو ناراض کر دیا تھا، میں اُس کی نس نس میں دوڑ رہا تھا، انکارانی نے اُسے ولیم کی طرف جھکانے کی خاطر کیا کچھ کیا؟ میں ناواقف تھا لیکن اس وقت جین کی آنکھیں بھیگی بھیگی اور سرخ نظر آ رہی تھیں۔ ولیم نے جب اُسے میری گرفتاری اور اس کے محرکات کے بارے میں خبر دی ہوگی اس وقت جین کا نازک دل ضرور دھڑکا ہوگا، وہ ہکا بکا رہ گئی ہوگی۔ اُس نے یہی کہا تھا کہ وہ ولیم کی بات کو مذاق سمجھی تھی لیکن حقیقت کا انکشاف ہونے کے بعد اُس کی حالت ضرور غیر ہوئی ہوگی۔ اُس کے معصوم ذہن میں نہ جانے کیسے کیسے خیالات کلبلائے ہوں گے۔ اُس کے خوابوں کو ہلکا ہی سہی، لیکن ایک دھچکا ضرور لگا ہوگا۔ مجھے لاک اپ میں دیکھ کر اُس کی غزالی آنکھیں چھلک اٹھیں تھیں، لباس بھی اُس کے دل کی دھڑکنوں میں آنے والی طغیانی کو پوشیدہ نہیں رکھ سکا۔ اُس کے اختیار میں ہوتا تو شاید وہ آخر کو گولی مار دیتی۔ جس نچ نے میرے جسمانی ریماڈ کی درخواست پر اپنے حکم نامے کے ساتھ دستخط کئے تھے،

تسکین پہنچائی۔ میں اسی روز تمہارے ہاتھوں فروخت ہو گیا تھا جب تم نے میرا اسٹیس (STATUS) بڑھا کر جین کے برابر کھڑا کرنے کا سہانا خواب دکھایا تھا۔ مجھے بھی اپنی خدمت کا ایک موقع دو، محبت کا جذبہ تمام طبقاتی، نسلی اور علاقائی جذبوں اور مصلحتوں سے بلند ہوتا ہے۔ آزما کر دیکھو تو سہی، میں سفید فام نسل کا نمائندہ ہونے کے باوجود بے مردتی سے آنکھیں نہیں پھیروں گا، آزمائش صداقت کی کسوٹی ہے اور صداقت تمام خوبیوں سے بلند ہوتی ہے۔“

”میرے کام لو ولیم، میرے عزیز.....“ میں نے اُسے پلکوں کی ایک ہلکی جنبش کی زبانی پیغام دیا۔ ”وقت کا انتظار کرو، تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔ ابھی تو کھیل کی شروعات ہوئی ہے۔“

ہمیں علیحدہ کمرے میں آئے دس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے لیکن دس منٹ کا مکمل سکوت..... ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں، جیسے ہم نے کسی غرق ہوتے ہوئے جہاز سے ایک لائف بوٹ حاصل کر کے سمندر کی بھری ہوئی موجوں میں چھلانگ لگادی تھی اور اب لائف بوٹ میں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ کس سمت جانا ہے؟ کنارہ ملے گا بھی یا نہیں؟

جین زیادہ برداشت نہ کر سکی تو ایک دم سے پھٹ پڑی۔

”دولت علی۔ کہہ دو کہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ میں نے جو سنا وہ غلط ہے، جو کچھ میری نظروں نے دیکھا وہ ایک خواب تھا، بہمل اور بیہودہ خواب، جس کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔“

”میرے کچھ کہنے نہ کہنے سے اب کیا فرق پڑے گا؟“ میں نے جان بوجھ کر دل گرفتہ لہجہ اختیار کیا۔ میں جم کے ان متوقع سوالات سے دامن بچانا چاہتا تھا جو اُس کے ذہن میں مارٹن کے پراسرار قتل کے بارے میں کلبلا رہے ہوں گے۔ جنکب کو شناخت کر لینے کے بعد اُس کے جسم سے گوشت غائب ہوتا دیکھ کر اُس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہوں گی، قانون کی تحویل میں صرف ہڈیوں کا ایک بچر تھا جس کی ہتھکڑیاں خود ہی ڈھیلی پڑ کر اتر چکی ہوں گی۔

سارا، جم یا جین، کسی کے علم میں نہیں تھا کہ انکارانی کون ہے؟ کن حیرت انگیز قوتوں کی مالک ہے؟ کیسی کیسی شرارتیں اُس کے ننھے وجود میں چھپی ہیں؟ وہ کیسے کیسے ناقابل یقین

اُس کا خون پی جاتی، اُس فائل کے پرزے پرزے کر کے ہوا میں بکھیر دیتی جس کی بنیاد پر اخباروں نے میرے اوپر مگدگی اُچھالی تھی۔ لیکن جذبات کا وہ طوفان مغربی تہذیب کے پروردہ دلوں اور ذہنوں میں جس شدت سے سر اُبھارتا ہے اس سے زیادہ سرعت سے سمندر کی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے، وہ نظم و نسق کے معاملے میں بڑے مہذب ہوتے ہیں، ایک ہل میں بھڑکتے ہیں دوسرے ہل کے دُور رس نتائج کے پیش نظر ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ ہندوستان یا دوسرے ممالک میں جہاں ناخواندگی کا تناسب زیادہ ہوتا ہے انتقام کی آگ نسل در نسل سر نہیں ہوتی۔ لاتعداد زندگیاں اس آگ میں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں، معصوم بچوں جیسے بچے بھی مجلس کراہی نیند کی آغوش میں سو جاتے ہیں۔ ان ہی حالات سے فائدہ اُٹھا کر انہیں ”دہشت گرد“ قرار دیا جاتا ہے۔

جین ڈبڈبائی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں میز کی ایک طرف تھا، دوسری جانب ولیم، جین اور جم برابر برابر بیٹھے تھے۔ جم کسی گہری سوچ میں غرق تھا، میں اُس کا محسن تھا، ضرور میری گتھی سلجھانے کی خاطر ذہنی گھوڑے دوڑا رہا ہوگا۔ ولیم کے چہرے کے تاثرات ذرا مختلف تھے۔ میری اُس کی محض دو ملاقاتیں ہوئی تھیں مگر میری باتوں نے اُسے برا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اُس کے دل میں جین کی محبت کے جراثیم پہلے سے موجود تھے، وہ اپنے ماضی سے خوفزدہ تھا یا پھر ستاروں پر کند پھینک کر ناکامی کے خیال سے ڈرتا تھا جو اُس نے انکشاف نہیں کیا تھا، ممکن ہے جم کی زبانی میرا اور جین کا ذکر سن کر اُس نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا ہو لیکن میں نے جین اور اُس کی وابستگی کا ذکر چھیڑا تو اُس کی آنکھوں میں اُبھرنے والی چمک دیدنی تھی۔ میں جانتا تھا وہ میرا بے دام غلام بن گیا تھا، میری خاطر ہر قربانی پیش کر سکتا تھا، اس وقت وہ خاموش تھا لیکن اُس کی آنکھیں مجھ سے مخاطب تھیں، میں اُن کی آواز سن رہا تھا۔

”مسٹر دولت علی۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم نے جین کو میری جھولی میں ڈال کر مجھے خرید لیا ہے۔ میری حیثیت جین اور جم کے مقابلے میں بڑی کمتر سہی مگر تم ایک بار مجھے آزما کر دیکھو، مجھے حکم دو، میں تمہارا سارا جرم اپنے سر لینے کو تیار ہوں۔ اقرار جرم کے بعد انعام قانون اس کے پس منظر میں جھانک کر اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کرتا، اقرار جرم کی پاداش میں سزا سنا کر فائل بند کر دیتا ہے۔ تم نے میری دیرینہ خواہش کا احترام کیا، میری محبت“



ایک دن مخصوص جاپ مکمل کرنے کے بعد اُسے حاصل کر لے، انکا کا اُس کے سامنے بس نہیں چلتا تھا، وہ اُس پنڈت یا پجاری کے ہر حکم کی تابع ہوتی ہے، اُس کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتی تھی اور.....

میں ”انکارانی“ کی لازوال، پراسرار اور ناقابل یقین قوتوں کی وضاحتوں میں اُلجھ گیا۔ آپ انکا کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں، وہ صرف میری ہی نہیں، آپ کی بھی محبوبہ دُنوا ہے... میں جن کی بات کر رہا تھا جو آرتھر کے مقابلے میں زیادہ بڑے عہدے پر فائز تھی لیکن قانون کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی تھی، ایک ذمہ دار آفیسر تھی، محبت اور ذمہ داری کے احساس کے درمیان پھنس کر بڑی بے بس اور پریشان نظر آ رہی تھی، میرے جواب نے اُسے اور اُلجھا دیا۔

”یہ تم کیسی مایوسی کی بات کر رہے ہو؟“ اُس نے مجھے عجیب نظروں سے گھورا۔ ”میں تمہاری اس کیفیت کو کیا نام دؤں؟“

”ان باتوں سے کیا حاصل ہوگا؟“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”آرتھر نے جو کیس تیار کیا ہے اس میں کوئی چک، کوئی سقم، کوئی جھول ہوتا تو جج اُسے میرا جسمانی ریماڈ کیوں دیتا؟“ ”اب کیا ہوگا.....؟“ ولیم نے پہلی بار کسمسا کر زبان کھولی۔ ”کیا آپ اپنے کیس کا دفاع نہیں کریں گے؟ میں آپ کی طرف سے اچھے سے اچھا وکیل کھڑا کر سکتا ہوں، آپ پریشان نہ ہوں۔“ ولیم کے لہجے میں پیار تھا، غلوں تھا، اپنائیت تھی۔ میں نے شکر یہ نہیں ادا کیا، اُس کے جذبے کی سچائی پر مسکرا دیا۔ اس مسکراہٹ میں کوئی تصنع یا بناوٹ نہیں تھی۔

”آرتھر سے تمہاری کوئی پرانی دشمنی تو نہیں تھی.....؟“ جین نے ایک امکانی بات کہی۔ ”نہیں.....“ میرا جواب بڑا مختصر تھا۔

”تمہارے خلاف چوری کا کیس کیوں بنایا گیا؟“ وہ پھر جھلا گئی۔ ”میرا دل نہیں مانتا، کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جو تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ مجھے بتاؤ دولت ملی۔ وہ کیا بات ہے جس نے تمہیں آرتھر کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے؟ تم مجھے آج سے بیشتر کبھی اتنے بے بس نہیں نظر آئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب تم نے سلیمان بے کوئیکرول آدمیوں کی موجودگی میں.....“

”پرانی باتوں کا ذکر مت کرو جین۔“ میں نے جم کو سنانے کی خاطر کسمسا کر کہا۔

کارنامے انجام دے سکتی ہے؟ شعبہ اور بازی گری میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتی، اُس کے بچوں کی تیز چہن کی نشتر سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہے۔ فکشن، ہولناک، پراسرار اور ناقابل یقین کہانیوں کے موضوع پر لکھنے والوں کے ذہن انکارانی کی قوتوں کے خزانے کی گرد بھی نہیں چھو سکتے، ”مپا ڈگی“ سے کام چلانا اور بات ہے۔ مصر کے اسرار، ہزاروں سال پرانی میمیز (MUMMIES) کی دریافت، ان سے منسوب داستانیں، طلسم ہوش ربا، سب اپنی اپنی جگہ لیکن ”انکارانی“..... بالشت بھر کی وہ فتنہ جس نے خود اپنی مرضی سے میرے سر کا انتخاب کیا تھا، ایسی ایسی لازوال اور ہولناک قوتوں کی مالک تھی کہ ذہن کی رسائی بھی اُس کی ”ابتداء“ کو نہیں پہنچ سکتی۔ رام دیال کی ماں نے پنڈت پجاریوں کے مشورے کے بعد مجھے انکا کو قبضے میں کرنے کی ترغیب دی تھی۔ راتوں رات کھرب پتی بن جانے کے سہانے خواب دکھائے تھے، میں نے بیک جنبش زبان کوئی جنتز منتر پڑھنے سے انکار کر دیا۔ شاید میں نے بھی اگر ”انکارانی“ کو دیوی دیوتاؤں کا جاپ کرنے کے بعد حاصل کیا ہوتا تو میں بھی اُس کی لامحدود قوتوں کا بھید کبھی نہ پاسکتا.....

میرا اور انکا کا ساتھ چوتھائی صدی سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ اس عرصے میں بھی میں اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکا، جن لوگوں نے ”انکا“ کا مطالعہ کیا ہے وہ گواہ ہیں کہ جب پولیس کوشلیا کے قتل کے سلسلے میں چھان بین کر رہی تھی اُس وقت انکا نے میری ایک درخواست کے جواب میں بڑے شوخ انداز میں مسکرا کر کہا تھا..... ”اپنی انکا کے بارے میں تم بھی ابھی کچھ نہیں جانتے..... مجھے یہ شکایت ہی رہی ہے کہ کسی نے مجھ سے وہ کام ہی نہیں لیا جو میں اپنی حدود میں رہ کر بھی انجام دے سکتی ہوں..... سچی بات یہ ہے کہ میں جو کچھ کسی شخص کے لئے کر سکتی ہوں، وہ کسی کے ذہن میں ہی نہیں آ سکتا..... میں ذہنوں کو پلٹ دیتی ہوں لیکن اس کے لئے میری وہاں موجودگی ضروری ہے۔“..... جب تربیتی، انکا رانی کو حاصل کرنے کی خاطر ایک ویرانے میں منڈل میں بیٹھا جاپ کر رہا تھا اُس وقت بھی انکا نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ ”جیل، میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں، تم نے آج مجھے دل سے پکارا ہے..... سنو، دنیا کی تمام شیطانی طاقتیں اگر مل کر بھی مجھے پریشان کرنا چاہیں تو میں تنہا اُن کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ لیکن ایک طاقت ایسی ہے جس کے آگے میرا کوئی زور نہیں چل سکتا۔“..... میرے وضاحت طلب کرنے پر اُس نے بتایا تھا کہ جو شخص ایک



”حالات ہمیشہ یکساں، ایک جیسے نہیں رہتے۔ وقت کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔“  
 ”تم مجھے ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو..... جین کو؟“ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں  
 ڈال کر کہا۔ ”کل شام میں نے تم سے فون پر بات کی تو تمہارے لہجے میں اعتماد تھا، ایک  
 رات کے اندر اتنی بڑی تبدیلی رونما ہو سکتی ہے، میں نہیں مان سکتی دولت علی۔“  
 جم جو خاموش بیٹھا اپنی عقلمانی نظروں سے میرا ایکسرے (X-RAY) کر رہا تھا، اچانک  
 اٹھ کر باہر چلا گیا۔ شاید وہ میری کیس فائل کا مطالعہ کرنے گیا تھا۔  
 ”سنو دولت علی۔“ جین نے بڑے پیار سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”تم ہمیں  
 واقعات کی نوعیت اور اصلیت سے آگاہ نہیں کرو گے تو ہم تمہاری مدد کس طرح کریں گے؟“  
 ”میں جو کچھ کہوں گا تم اعتبار نہیں کرو گی۔“ میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ ولیم کی پریشانی اور  
 بڑھ گئی۔

”تم نے قبل از وقت یہ فیصلہ کیوں کر لیا؟“ جین تلملا کر بولی۔ ”تم کہہ کر تو دیکھو.....“  
 ”پولیس آفیسر نے میرے رُوم سے جو سفری بیگ برآمد کیا، وہ میرا نہیں تھا۔“ میں نے  
 سنہبل کر کہا۔ جم کے چلے جانے کے بعد میں نے جین کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔  
 ”پھر؟“ جین نے جذباتی انداز میں دریافت کیا۔ ”وہ کس کا بیگ تھا.....؟“  
 ”یہ مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔  
 ”تمہارے رُوم میں کس طرح آ گیا؟“ جین نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔ اُس کی جگہ  
 میں ہوتا تو میں بھی الجھنے لگتا۔

”رُوم ہوسٹس میلبالائی تھی۔“ میں نے بات جاری رکھی۔ انکارانی کے تذکرے اور خفا  
 ہو جانے والی رقم کو درمیان سے نکال کر ساری تفصیل بیان کر دی، جین کے چہرے پر غصے  
 اور حیرت کے طے جلے تاثرات اُبھر آئے۔ اُس نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا۔  
 ”کیا تم نے لوئیس آرتھر کو یہ تفصیل بتائی تھی؟“  
 ”نہیں.....“ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”میں نے اس کی ضرورت نہیں  
 محسوس کی۔“

”کیوں.....؟“

”ہر ملزم قانون کے پھندے میں آنے کے بعد کوئی نہ کوئی فرضی کہانی اپنے بچاؤ کی

خاطر ضرور سنا تا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آرتھر میری بات پر یقین نہ کرتا.....“  
 ”آپ نے دُور اندیشی کا ثبوت نہیں دیا میرے محترم۔“ ولیم دہلی زبان میں بولا۔  
 ”آپ کا بیان ریکارڈ پر آ جاتا تو ہمارا وکیل یہ موقف اختیار کر سکتا تھا کہ کسی نے آپ کو  
 بلاوجہ پھانسنے کی خاطر ایک منظم ڈرامہ اسٹیج کیا ہے۔“  
 ”میری بات غور سے سنو جین۔“ میں نے ولیم کی بات کا جواب دینے کی بجائے جین کو  
 رازداری سے مخاطب کیا۔ ”میں نے اس وقت تم سے جو بات کی ہے تم اس کا تذکرہ کسی اور  
 سے نہیں کرو گی..... جم سے بھی نہیں۔“  
 ”لیکن کیس فائل.....؟“

”جم کے آنے سے پہلے مجھے اپنی بات مکمل کر لینے دو۔“ میں نے جین کی بات اچکتے  
 ہوئے دہلی زبان میں کہا۔ ”میں جم پر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ میری روحانی قوتیں چھن چکی  
 ہیں، تمہارے علاوہ کچھ اور لوگ بھی مارٹینا کے مرڈر کیس کو تارکی میں رکھنا چاہتے ہیں،  
 میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو، مارٹینا کے نام کے ساتھ کچھ اور نام بھی روشنی میں آ جائیں  
 گے جسے میں پسند نہیں کرتا۔“

جین اور ولیم دونوں ہی میری بات سن کر اپنی اپنی نشست پر کسمانے لگے، مجھے مزید  
 وضاحت کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ جم دروازہ کھولتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے  
 چہرے پر بڑی گہمیر سنجیدگی مسلط تھی۔ میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ وہ میری کیس فائل کا  
 مطالعہ کر کے واپس آیا تھا۔ ممکن ہے آرتھر کے ساتھ تبادلہ خیالات بھی کیا ہو، میں دوبارہ  
 سنہبل کر بیٹھ گیا۔ جین اور ولیم دونوں کی نظریں میرے چہرے پر جمی تھیں، میرے آخری  
 جملوں نے دونوں کو چونکا دیا، مارٹینا کے حوالے پر دونوں ہی اپنے اپنے خول میں سمٹ گئے۔  
 ”آرتھر سے کوئی بات ہوئی؟“ جین نے دہلی زبان میں جم سے دریافت کیا۔

”دولت علی۔“ جم نے اُس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے براہ راست مجھے مخاطب  
 کیا۔ ”حقیقت کیا ہے یہ تم ہی بتا سکتے ہو۔ لیکن خود آرتھر کا خیال ہے کہ تم جان بوجھ کر کیس کو  
 الجھانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”اُس نے کوئی وجہ بھی ضرور بتائی ہو گی۔“ میں نے سپاٹ لہجہ اختیار کیا۔

”ہاں.....“ جم نے میری بے رخی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر اُس سفری بیگ سے

تمہارے لئے جو قانونی شکلیں تیار کیا ہے وہ بے حد مضبوط ہے۔“

”کل کیا ہوگا یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔“ جم کے جملوں نے مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں بھڑک اٹھا۔ ”تم لوگوں نے یہاں آکر دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا۔“ میں نے چھتا ہوا انداز اختیار کیا۔ ”میرے کیس میں تمہاری مداخلت نسلی امتیاز کے ماتھے پر شکنیں بھی ڈال سکتی ہے۔ میں نے اسی وجہ سے جان بوجھ کر تمہارے نام درمیان میں لانے کی غلطی نہیں کی تھی۔“

”تم..... دولت علی تم“ جین نے بڑے جذباتی انداز میں شکوہ کیا۔ ”تم ہمیں غیر سمجھ رہے ہو.....؟“

”ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔“ ولیم کسمانے لگا۔

”میرا مشورہ مان لو دولت علی۔“ جم نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”قانونی پیچیدگیوں کی تسلی سلجھانے کے لئے جوش سے نہیں، ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم نے آرٹھر کے لئے ہوٹل کے عملے کی موجودگی میں جو سخت نازیبا الفاظ اور جملے استعمال کئے اُسے اس کا ذکر ضرور ہے، لیکن میں تمہارے لئے اُس پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر سکتا ہوں۔“

”فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے خلاء میں گھورتے ہوئے مضطرب لہجے میں جواب دیا۔ ”درمیان میں کچھ ایسی رکاوٹیں آگئی ہیں کہ وقتی طور پر ماورائی قوتیں مجھ سے روٹھ گئی ہیں۔ یہ تعطل زیادہ عرصہ نہیں رہے گا، میری طاقت بحال ہو لینے دو، پھر میں آرٹھر کو بتاؤں گا کہ مضبوط شکنجے کیا ہوتے ہیں۔“

”کیا میں تمہارے بیان پر اعتماد کر لوں؟“ جم نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ بڑا گھاگ آفسر تھا، میرے فریب کے جال میں فوراً نہیں پھنسا۔

”تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔“ میں نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔ ”میں اس وقت پولیس کی تحویل میں ہوں اور تم.....“

”حماقت کی باتوں سے گریز کرو۔“ وہ میرے جواب میں چھپے طنز کو محسوس کر کے جھلا گیا۔ ”میں کسی اور بات پر غور کر رہا تھا۔“

”وہ بھی کہہ ڈالو جم۔“ میں نے اُسے ٹٹولنے کی خاطر مایوسی کا حربہ استعمال کیا۔ ”کوئی حسرت دل میں باقی نہ رہ جائے۔“

تمہارا کوئی تعلق نہیں تھا تو تمہیں اُسی وقت واپس کر دینا چاہئے تھا جب میلہ اسے تمہارے پاس لائی تھی۔“

میں نے جواب نہیں دیا، خاموش رہا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ جم اور آرٹھر کے درمیان اور کیا گفتگو ہوئی تھی؟

”آرٹھر کا کہنا ہے کہ اس بیگ میں دس دس ہزار پاؤنڈ کی دس گڈیاں تھیں۔ ایک لاکھ پاؤنڈ کی وہ رقم دو روز پہلے ایک مقامی بینک سے نکلوائی گئی تھی۔“ جم نے میرے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آرٹھر کو ہوٹل کے ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تم کل شام کچھ دیر کے لئے باہر گئے تھے اور.....“ جم جان بوجھ کر تھوڑے توقف سے بولا۔ ”ایک لاکھ کی رقم میں سے آٹھ سو پاؤنڈ کم ملے ہیں۔ ساری کاغذی کارروائی تمہاری اور گواہوں کی موجودگی میں ہوئی۔ تم نے اس بیگ کو اپنی ملکیت قرار دیا تھا؟ کیا یہ درست ہے؟“

”جم۔“ میں نے پینتر ابدلا۔ ”کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ تم کس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”میں صرف حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔“ جم نے اپنے جملے پر زور دے کر کہا۔ ”مجھے غلط سمجھنے کی کوشش مت کرو۔ ہم سب تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب تم ہمارے ساتھ تعاون کرو۔“

”اب وقت گزر چکا۔“ میں نے روکھائی سے جواب دیا۔ ”تمہارے یا میرے کہنے سے نہ آرٹھر اپنی رپورٹ تبدیل کرے گا نہ جج اپنے احکامات میں رد و بدل کرنے پر آمادہ ہو گا۔ بات اب عدالت میں ہی ختم ہوگی۔“

”میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔ لیکن اگر تفتیشی افسر کے رویے میں لچک پیدا ہو جائے تو کیس کی نوعیت بدل بھی سکتی ہے۔“

”سوری جم۔“ میں نے اپنا دو ٹوک فیصلہ سنا دیا۔ ”میں آرٹھر کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر تیار نہیں ہوں۔“

”کیا تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ سارے کاغذی ثبوت اور گواہوں کے بیانات تمہارے خلاف ہیں؟“ جم نے مجھے انجام سے ڈرانا چاہا۔ ”میں تمہاری کیس فائل پڑھ کر آ رہا ہوں۔ تم نے ہوٹل میں آرٹھر سے جو تلخ گفتگو کی اس نے اُسے اور بھڑکا دیا۔ اُس نے

”تم کہہ رہے ہو کہ تمہاری قوتیں چھن گئی ہیں جبکہ آر تھر کا بیان کچھ اور ہے۔“

”اوہ.....“ میں مسکرا دیا، جم کی بات نے مجھے معاملے کی تہہ تک پہنچا دیا۔ میں نے بڑی خوبصورتی سے بات نبھانے کی کوشش کی۔ ”آر تھر نے تم سے جو کچھ کہا وہ غلط نہیں ہے۔ اس ضدی آفسر نے میری درخواست کے باوجود مجھے ہتھکڑی پہنائی تھی۔ میں نے اُسے کھلی ہوئی ہتھکڑی واپس کر کے حیران کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اس مغرور آفسر کا سارا گھمنڈ توڑ دوں گا، وہ مجھے عزت کے ساتھ واپس ہوٹل چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا، میں نوٹوں کے نبر تبدیل کر دیتا آر تھر کو پسینے آ جاتے، جان چھڑانی مشکل ہو جاتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بعد ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میری قوتیں سلب ہو چکی ہیں۔ شاید میں نے کسی عمل میں جلد بازی سے کام لے کر بازی ہار دی مگر میں مایوس نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں زیادہ عرصہ بے بسی کا شکار نہیں رہوں گا۔“

جم میری حیرت انگیز صلاحیتوں کا معترف تھا، میں جرمن سائنسدان کے اغواء میں اُس کی مدد نہ کرتا تو عہدے میں ترقی ہونے کی بجائے اُس کی کارکردگی پر حرف آ جاتا، برلن میں اس وقت جین میرے ہمراہ ہوٹل میں موجود تھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی وحشتوں میں اضافہ ہو رہا تھا، ایک وقت ایسا بھی آیا جب اُس نے ہاتھوں میں دبا ہوا پستول میرے اوپر تان لیا۔ اگر بروقت جم نے اُسے فون پر اپنی کامیابی اور میری حیرت انگیز قوتوں کے اعتراف کا مژدہ نہ سنایا ہوتا تو وہ مجھے گولی مارنے سے بھی گریز نہ کرتی۔ جم اور جین دونوں میری طاقت کے کرشمے دیکھ چکے تھے۔ سارا تو میرے نام کا کلمہ پڑھنے لگی تھی۔ ماضی کی وہ ناقابل یقین باتیں اتنی جلدی جم کے ذہن سے دُھندلا نہیں سکتی تھیں۔

”میں مانے لیتا ہوں کہ تم جو کہہ رہے ہو وہ حرف بحرف درست ہے۔“ جم نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے۔ ”لیکن اگر تمہاری قوتیں.....“

”ہاں، میری توقعات غلط بھی ہو سکتی ہیں۔“ میں نے سنجیدگی سے جم کی بات کاٹ کر کہا۔ ”بہت کچھ ممکن ہے۔ میں نے غیب کے حالات بتانے کا دعویٰ بھی کبھی نہیں کیا، جیتی ہوئی بازی مات بھی ہو سکتی ہے مگر میں ایک مفروضے کے سبب اتنی جلدی شکست تسلیم نہیں کروں گا، دو پہلو ان اکھاڑے میں اترتے ہیں تو ایک کی جیت دوسرے کی ہار ہوتی ہے۔ تم بھی وقت کا انتظار کرو..... میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہارے یا جین کے نام پر کوئی

حرف آئے۔“

جم غمے میں پڑ گیا۔ ولیم نے غالباً میری مصلحتوں کو سمجھ کر خاموشی اختیار رکھی، جین بڑی جذباتی لڑکی تھی، کئی موقعوں پر اُس نے اپنے جذباتی عمل سے مجھے بھی ششدر کر دیا تھا، اس وقت بھی وہ چپ نہ رہ سکی۔

”دولت علی۔“ اُس نے پہلو بدل کر فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔ ”تم نے اپنے کیس کے دفاع کے لئے کیا سوچا ہے؟“

”ریمائڈ کی مدت ختم ہو لینے دو، آر تھر کو قانونی شکمنجوں کو اور مضبوط کرنے کے موقع سے محروم نہ کرو۔ اُسے اپنی صلاحیتیں آزمانے کا اختیار حاصل رہنا چاہئے۔“ میں نے بے پروائی سے مسکرا کر جین کو مطمئن کرنا چاہا۔ ”کیس کو عدالت میں پہنچنے دو، جج اور جیوری کو میدان میں آنے دو، پھر چھینا جھٹی میں زیادہ لطف آئے گا۔“

”میں تمہارے اس خیال سے صد فیصد متفق ہوں کہ اگر ہم نے اپنی موجودہ حیثیت میں تمہاری حمایت کی تو ہم پر غداری کا الزام بھی عائد ہو سکتا ہے۔ ہم حکومتی عتاب کا نشانہ بھی بن سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں ملازمت سے برطرف کر دیا جائے، ساری مراعات واپس لے لی جائیں..... اور بھی بہت سارے امکانات ہیں۔“ جین بڑی سنجیدگی سے ایک ایک لفظ پر زور دے کر جملے مکمل کرتی رہی۔

”مجھے خوشی ہے کہ میری بات تمہاری سمجھ میں آ گئی۔“ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”تم نے اپنے بارے میں ایک فیصلہ کر لیا، اب میرا فیصلہ بھی سن لو۔“ اُس نے مٹھیاں بھینچ کر بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ ”میں کل ملازمت سے استعفیٰ دے دوں گی۔ تمہارے ہندوستان جانے کے بعد جم کے مشورے پر میں نے قانون کی ڈگری حاصل کر لی تھی..... اب میں تمہارا کیس اپنے لئے ایک چیلنج سمجھ کر لڑوں گی۔“

میں شٹا گیا۔ وہ سرپھری لڑکی جو میری تلاش کی خاطر تنہا ہندوستان میں در بدر ہوتی رہی، کچھ بھی کر سکتی تھی۔ میں اُس کے حوصلوں اور قوت برداشت کا گواہ ہوں، وہ جم کی پرستار تھی، جم سارا کی زلفوں میں الجھا تو اُسے ٹوٹ کر بکھر جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اُس نے بڑی جرأت مندی سے خود کو سنبھالا، سارا سے کوئی شکوہ کوئی شکایت نہیں کی، جم کے شانہ بشانہ ایک ہی دفتر میں کام کرتی رہی، جم کا سہارا چھوٹ جانے کے بعد اُس نے

میرے اوپر تکیہ کیا، میں بھی جھوٹے دلا سے اور وعدے کر کے ہندوستان چلا گیا تو وہ پھر بے سہارا ہو گئی۔ اُس کی جگہ کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو شاید زندگی سے منہ موڑ لیتی لیکن جین نے ہمت نہیں ہاری، زندگی کی شاہراہ پر ثابت قدمی سے آگے بڑھتی رہی۔ وقت زیادہ گزر گیا، اُس کے انتہار کی آس ٹوٹنے لگی تو وہ میری تلاش میں نکل پڑی۔ اُس کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ مجھے موت کے منہ سے نکال کر، اپنی بانہوں میں سمیٹ کر دوبارہ لندن گھسیٹ لائی۔ وہ بڑی حوصلہ مند اور بڑی باہمت اور ٹھوس ارادوں کی مالک تھی، کچھ بھی کر گزرنے کی طاقت رکھتی تھی۔ میں ایک لمحہ کو ڈگمگا گیا، اُس کے چہرے پر پچھتے عزم کی پختگی نے مجھے ڈرا دیا، میں اُسے ولیم کے ساتھ وابستہ کر کے خوشگوار مستقبل سوچ کر واپسی کے بارے میں غور کر رہا تھا، وہ میری خاطر ملازمت چھوڑنے کی بات کر رہی تھی۔

اس موقع پر انکارانی موجود ہوتی تو جین کے سارے فیصلے دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ میں اشارہ کرتا، انکا جین کے سر پر چلی جاتی، اُس کے بچوں کی تیز جبین کے سامنے جین بے بس ہو جاتی۔ ہوتا وہی جو انکا چاہتی، وہ ذہن کو پلٹ دینے کی حیرت انگیز قوتوں کی مالک تھی لیکن اس کے لئے اُس کی موجودگی شرط تھی۔

”اب کیا سوچ رہے ہو دولت علی؟“ جین نے مجھے خیالات میں مستغرق پا کر بڑی اپنائیت سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں میری صلاحیتوں پر اعتقاد نہیں ہے؟ ایک بار آزمائش کا موقع دو، میں تمہیں یاپس نہیں کروں گی، آرتھر کو دانتوں پسینہ نہ آجائے تو نام بدل دینا۔“

”ایک آسان راستہ اور بھی ہے میرے پاس۔“ میں نے لوہے کو لوہے سے کاٹنے کی

شان لی۔

”وہ کیا.....؟“ جین کی نظروں میں اُمید کی کرنیں جھلملانے لگیں۔

”میں عدالت میں پہلی ہی پیشی پر اعتراف جرم کر لوں۔“ میں نے تلملا کر جواب دیا۔

”تم سب کی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔“

”تم ایسا نہیں کرو گے دولت علی.....“ جم نے تیزی سے کہا۔ وہ میری بات سن کر بوکھلا

گیا تھا۔

”دولت علی۔“ جین نے مجھے وحشت بھری نظروں سے گھورا۔ ”جانتے ہو تم کیا کہہ

رہے ہو؟ اقرار جرم کر لینے کے بعد تمہارے اوپر واپسی کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔

ہماری کوئی کوشش تمہارے حق میں کارگر نہیں ہوگی، عدالت تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گی۔ تیرا مکان سے نکل جائے تو واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ تم جان بوجھ کر اندھے کنویں میں چھلانگ لگانے کی بات کیوں کر رہے ہو؟ نہیں دولت علی۔ تم ایسی کوئی غلطی بھول کر بھی نہ کرتا، سن رہے ہو میں کیا کہہ رہی ہوں؟“

”نہیں..... مجھے کچھ نہیں سنائی دے رہا۔“ میں ڈپریشن میں مبتلا کسی ذہنی مریض کی طرح چیختا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں بہرا ہو گیا ہوں، پاگل ہو گیا ہوں، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

میری کوشش رائیگاں نہیں گئی، چیخ کی آواز سن کر دروازے پر مسلح سپاہی راقول تانے اندر آ گیا۔ جم نے موقع کی نزاکت کو بھانپ کر جین کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سکتے کی کیفیت سے دوچار تھی، کسی رو بوٹ کی مانند آہستہ آہستہ اٹھی، مجھے ویران نظروں سے گھورتی جم کے ساتھ قدم ملاتی باہر چلی گئی۔ ولیم بھی میرے غیر متوقع طرز عمل پر ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے نظریں اٹھا کر اُس کی جانب دیکھا، آنکھوں کی زبانی ایک خاموش پیغام دیا۔

”جین کا خیال رکھنا ولیم۔ اس وقت اُسے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔“

ولیم ششدر رہ گیا۔ اُس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن مسلح سنتری درمیان میں حائل ہو گیا۔ میں ہونٹ کا ٹالاک اپ کی سمت قدم بڑھانے لگا.....!



پانچ روز گزر گئے۔

جم اور جین کے آنے سے ایک فرق ضرور پڑا۔ آرتھر نے ان دھمکیوں پر عمل سے گریز کیا جس کا وہ اعلان کر چکا تھا لیکن میں اُس کے تیور دیکھ رہا تھا، اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ میرے خلاف کسی عیار دشمن کی طرح اندر ہی اندر بارودی سرنگیں بچھانے سے غافل بھی نہیں ہوا۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں شیطانی مسکراہٹ ابھر آتی۔ وہ مجھے باور کرانا چاہتا تھا کہ میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ رہوں، اُس نے صرف اپنا ہاتھ روک لیا ہے، زبان بند کر رکھی ہے لیکن اُس کا قلم فائل میں میرے خلاف زہر جمع کر رہا تھا۔

ہماری نگاہیں جب بھی چار ہوتیں، اُس کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کی چنگاریاں چمکنے لگتیں۔ میں لا پرواہی سے مسکرا کر جلتی پرتیل چھڑکنے کا کام انجام دیتا رہا۔ پانچ دنوں میں آرتھر نے متعدد بار مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا، وہ میرے ماضی کو کریدنے کی خاطر اُلٹے سیدھے، پیچیدہ، بے ہنگم اور بیہودہ سوالات کرتا، مجھے اُکسانے کی کوشش کرتا، اُس کے ماتحت مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے رہتے۔ میں نے اُن پر کوئی توجہ نہیں دی، کچھ میں ریٹگنے والے حقیر کیڑے سمجھ کر معاف کر دیتا۔ میرا اُن کا کوئی مقابلہ بھی نہیں تھا، وہ راستے کے پتھر تھے، میں جب چاہتا انہیں ٹھوکر مار کر علیحدہ کر دیتا۔ البتہ میں نے آرتھر کو سزا دینے کی ٹھان رکھی تھی۔ کیس عدالت کے زور برو جانے سے پہلے میں اس مردود کو اپنے خلاف کوئی اور موقع نہیں فراہم کرنا چاہتا تھا۔

پانچ دنوں میں صرف ولیم دو بار ملنے آیا، جم اور جین نہیں آئے۔ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ میں ان کی بات نہیں مانوں گا، مجھے یقین تھا کہ وہ دونوں میرے بچاؤ کی خاطر ضرور ہاتھ پیر چلا رہے ہوں گے۔ ولیم نے میرے کریدنے پر اس بات کا اقرار کیا کہ جین کا التفات اُس کی طرف بڑھتا جا رہا ہے، مجھے خوشی ہوئی۔ میرے استفسار پر اُس نے دبی

زبان میں یہ بھی انکشاف کیا کہ مارٹینا کے وکیل نے ایک بار اُس سے ملاقات کی تھی، ہر چند کہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا لیکن ولیم کا خیال تھا کہ وکیل ایک معقول رقم کے عوض مارٹینا کی تمام جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ اُس کے نام ٹرانسفر کرنے پر آمادہ ہو سکتا تھا۔ اُس کی تحویل میں مرحوم لیونارڈو یا مارٹینا کی تحریر کردہ کوئی ایسی قانونی دستاویز تھی جس کے سامنے آ جانے پر کورٹ کے طویل اور اُکتا دینے والے قانونی تقاضوں کے بغیر ہی کام بن جاتا۔ ولیم کل کر تفصیل بتانے سے گریز کر رہا تھا، میں اُس کی ہچکچاہٹ کی وجہ تاڑ گیا۔

”تمہیں کتنی رقم درکار ہوگی.....؟“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”آپ اپنا کیس ختم ہو لینے دیں، پھر دیکھا جائے گا۔“

”میں نے تم سے رقم کے بارے میں پوچھا تھا۔“ میرا الجھ اور گھبرہا گیا۔

”وکیل بہت زیادہ منہ پھاڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ ولیم نے دبی زبان میں جواب

دیا۔ ”بات میری بساط سے باہر ہے۔“

”اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ مارٹینا کے پہلے شوہر کے عزیز رشتہ دار بعد میں کوئی

شوغل نہیں کریں گے؟“

”وکیل کا کہنا ہے می نے اس ضمن میں ساری کارروائی پہلے ہی پکی کرالی تھی۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے کہا۔ ”تم پہلی فرصت میں وکیل سے مل کر دو ٹوک بات کر لو،

معاوضے کی فکر مت کرو۔ اس کی ادائیگی میری طرف سے شادی کا پیشگی تحفہ سمجھ کر قبول کر

لینا۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ بات عدالت تک جائے اور مارٹینا کے کیس کا گند تمہارے اور

جین کے مستقبل پر اثر انداز ہو۔“

”آپ نے ایک بات پر غور نہیں کیا۔“ ولیم کسمسا کر بولا۔ ”جین کو بعد میں بھی حالات

کا علم ضرور ہوگا۔“

”یہ ذمہ داری بھی میں لیتا ہوں۔“ میں نے بڑے اعتماد سے یقین دلایا۔ ”جین تم سے

کبھی تمہارے ماضی یا مارٹینا کے کردار کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہیں کرے گی۔“

ولیم نے میری بات مان لی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔

چھٹے روز میں رات کے کھانے کے بعد سونے کے ارادے سے لیٹا تھا کہ میرے سر پر

انکارانی کی آمد کا دھماکا ہوا..... میں نے عالم تصور میں اُس کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ



دینا۔ تم نے میری بات کا خیال نہیں رکھا.....“

”پہلے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا، اب خوشی ہو رہی ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ اس نے مجھے وضاحت طلب نظروں سے گھورا۔

”مجھ سے کوتاہی سرزد نہ ہوتی تو تمہارا یہ رنگ، یہ رُوپ، یہ چہرہ، یہ ادا کیسے دیکھتا؟“

میرے لہجے میں خوشی تھی۔

”بہت چمک رہے ہو جمیل صاحب۔“ انکارانی کے تیور بدلنے لگے۔ ”اصل بات کیا

ہے؟“

”تمہاری جدائی میں گھل رہا تھا۔“ میرا انداز شاعرانہ ہو گیا۔ ”تمہیں قیامت کے رُوپ

میں دیکھا تو بائیں کھل اٹھیں۔“

وہ میرا جواب سن کر پہلی رات کی کنواری دلہن کی طرح شرمانے لگی۔ پھر ایک توجہ شکن

انکارانی لے کر میرے سر پر آلتی پالتی مادرِ کر بیٹھ گئی، ہمارے درمیان کچھ دیر برسوں کے

چمڑے عاشق و معشوق کے گلے شکوے ہوتے رہے، پھر وہ بیٹھ بٹھ ہو گئی۔

”کل تمہیں عدالت کے رُودرو پیش کیا جائے گا۔ کیا ارادے ہیں؟ کچھ نہ کچھ تو ضرور

سوچا ہو گا۔“

”کل آنے دو، جو ہو گا تمہاری موجودگی میں ہو گا۔“

”مجھے تم سے ایک شکایت ہے جمیل۔“ وہ ٹھنک کر بولی۔ ”جب سے تم نے سید مجذوب

کی لاشی حاصل کی ہے، پریم لال مہاراج نے تمہارے سر پر ہاتھ رکھا ہے، نندا نے اپنی

لازوال تو تیں تمہیں سوپنی ہیں تم اپنی انکارانی کو خدمت کا موقع نہیں دیتے۔“

”انکارانی.....“ میں سید مجذوب کا نام سن کر بے تاب ہو گیا۔ ”میری کراماتی لاشی ہوٹل

میں رہ گئی۔ اُس کے بغیر.....“

”پریشان مت ہو۔“ انکا نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ لاشی اور تمہارا دوسرا چھوٹا موٹا سامان

جین کے پاس محفوظ ہے۔“

میں نے اطمینان کا سانس لے کر پوچھا۔ ”ولیم کے سلسلے میں تم نے کیا پیش رفت کی؟“

”تمہارے مشورے کے مطابق میں نے ایک شارٹ کٹ تلاش کر لیا ہے، مارٹینا کے

وکیل کو جائیداد کی منتقلی کا پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ میں نے اُسے قابو کر لیا ہے، لالچی آدمی

بڑی غضبناک نظر آرہی تھی، اُس کا گلاب جیسا چہرہ کسی پھٹتے ہوئے آتش فشاں کے دہانے

کا منظر پیش کر رہا تھا، اُس کی زنگسی آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے، غصے کی شدت سے

اُس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ میں نے انکارانی کو پہلی بار قیامت کے رُوپ میں دیکھا، مجھے

اُس کا وہ رُوپ بھی بے حد حسین نظر آیا۔ وہ میری پرستار تھی، میں اُس کا شیدائی تھا، ہمارے

درمیان چوتھائی صدی سے زیادہ کی رفاقت تھی، وہ میرے خیالات میں رچی بسی تھی، میرے

دل میں دھڑکتی تھی، میری سانسوں میں گھلی ملی رہتی تھی، میری ہلکوں پر شوخیاں کرتی تھی،

میں اُس کی ناز برداریاں کرتا، وہ خوشی سے تھرکنے لگتی۔ میرے اور انکارانی کے درمیان

”جسمانی رشتے“ کے علاوہ تمام دوسرے جائز اور ناجائز رشتے قائم تھے۔ وہ کسی پنڈت یا

پجاری کے سر پر چلی جاتی تو مجبور ہو جاتی، میری طرف سے آنکھیں پھیر لیتی، اپنے نئے آقا

کے حکم پر مجھے ناقابلِ برداشت حالات سے دوچار کرنے میں ذرا رعایت نہ کرتی..... جب

دوبارہ میرے سر پر واپس آتی تو شرمندگی اور ندامت کا اظہار کرنے لگتی۔ میں اُس کی

مجبور یوں سے واقف تھا، وہ میری محبوبہ تھی، میری آنکھوں کی ٹھنڈک، میرے دل کا قرار۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی ضرورت تھے۔ وہ اپنی مرضی سے میرے سر پر آئی تھی، میں نے

اُس کے حصول کی خاطر کسی پہاڑی گیمھا یا ویران اور سنان مرگھٹ کے قریب کسی منڈل

میں بیٹھ کر جاپ نہیں کیا۔ بڑے بڑے گیانی دھیانی پنڈت اسے حاصل کرنے کی خاطر

جان کی بازی لگا چکے تھے، کوئی قسمت سے کامیاب ہو جاتا تو انکا اُس کی غلام بن جاتی، جو

نا کام ہو جاتے انکا اُن کے خون کا ایک ایک قطرہ پی جاتی، خون اُس کی غذا تھی، اُس کی

کمزوری تھی۔ میں اُس کی نس نس، وہ میری رگ رگ سے واقف تھی۔

”کیا بات ہے جان من؟“ میں نے انکارانی کو چھیڑا۔ ”بڑی لال چلی نظر آرہی ہو۔“

”جمیل۔“ اُس نے مجھے شکایتی نظروں سے گھورا۔ ”یہ سب کیا ہے؟..... کب ہوا؟.....“

کیسے ممکن ہوا.....؟ تم نے مجھے آواز کیوں نہیں دی؟ کیا مجبوری تھی جو تم نے اپنی قوت کا

استعمال بھی نہیں کیا؟“ وہ ایک ہی سانس میں جانے کیا کیا سوال کرتی رہی، میں اُس کی

اپنائیت کے جذبات کو دل ہی دل میں سراہتا رہا۔ وہ خاموش ہوئی تو میں نے اُسے پوری

تفصیل سنا دی، اپنی مصلحتوں سے آگاہ کیا۔

”میں نے تم سے خاص طوع سے کہا تھا کہ سفری بیگ سے رقم نکال کر اسے واپس کر

ہے، بڑی لمبی رقم کا خواب دیکھ رہا ہے۔“ انکا نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔  
”اپنے انجام سے بے خبر ہے۔“

”میں تمہیں روکوں گا نہیں۔“ میں نے اُس کے آخری جملے کا مفہوم سمجھ کر جواب دیا۔  
”لیکن جلد بازی سے گریز کرتا، میں عدالت کی کارروائی کے بعد زیادہ دن لندن میں نہیں  
رکنا چاہتا۔“

”تم نے جین کے بارے میں کچھ دریافت نہیں کیا؟“

”اب کچھ کہنے سننے سے کیا فائدہ؟“ میں نے سردآہ بھری۔ ”میں کلدیپ کی آتما کے  
سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔ پریتم لال نے بھی یہی کہا تھا۔“

”اسی میں تمہاری بہتری بھی ہے۔“ انکا نے معنی خیز انداز میں جواب دیا پھر پیلو بدل  
کر بولی۔ ”جین تمہاری سچی پرستار ہے، یقین کرو جیل، اُس کا ذہن پلٹنے میں مجھے دانتوں  
پسینہ آ رہا ہے، بڑے مضبوط اعصاب اور ٹھوس ارادوں کی مالک ہے۔ میں نے اُس کے  
سلسلے میں زیادہ تیزی نہیں دکھائی۔ لیکن وہ اور ولیم دونوں میری مٹھی میں ہیں۔ سب کچھ اسی  
طرح ہوگا جیسے تم نے سوچا ہے۔“

میں جین کے مسئلے کو زیادہ نہیں کریدنا چاہتا تھا، کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔ انکا  
رانی میری ہم راز تھی، اُس نے بھی میرے چہرے کے تاثرات پڑھ کر خاموشی اختیار کر لی۔  
میں بڑی دیر تک آنکھیں بند کئے جین کے بارے میں سوچتا رہا، لندن میں قیام کے دوران  
وہی ایک لڑکی مجھے دوسروں سے بڑی مختلف نظر آئی تھی۔ میں چاہتا تو وہ خوشی خوشی میری  
بانہوں میں سمٹ جاتی، میں کسی بھنورے کی طرح اس کے مہکتے وجود کا سارا رس پی کر اڑ  
جاتا، بات طول نہ پکڑتی، جین کوئی دوسرا سہارا ڈھونڈ لیتی، میں کسی اور ڈگر نکل جاتا۔ لیکن  
دل میں ایک خلش کا نشان بن کر چھپتی رہتی، وقت نے مجھے اس خلش کے ہاتھوں تادم و شرمسار  
ہونے سے بچالیا.....!!

دوسری صبح مجھے پولیس کی گاڑی میں بٹھا کر عدالت لے جایا گیا۔ انکارانی غصے میں سچ  
تاب کھاتی رہی، کبھی وہ میری طرف دیکھتی اور کبھی ان مسلح افراد کو تحقارت سے گھورنے لگتی  
جو پوری طرح چوکس نظر آ رہے تھے۔ میں سر جھکائے بیٹھا رہا، عدالت کے احاطے میں  
پولیس اور کمانڈوز کا سخت پہرہ تھا، انکا اٹھ کر میرے سر پر ٹہلنے لگی۔

”جیل.....“ اُس نے بڑے خطرناک انداز میں سرگوشی کی۔ ”مجھ سے یہ سب کچھ  
برداشت نہیں ہو رہا۔ تم اجازت دو تو کچھ کھیل تماشے کرو؟ ان انگریزوں کو بھی احساس ہو  
کہ ہمارے بارے میں ان کی سوچ غلط ہے۔“  
”کچھ دیر اور انتظار کر لو، میری خاطر۔ میں تمہیں دل کی حسرتیں نکالنے کا پورا پورا موقع  
دوں گا۔“

”جیل.....“ انکا نے کسی ناراض محبوبہ کی طرح سردآہ بھر کر کہا۔ ”کیا تم ہمیشہ اسی انداز  
میں مجھ سے باتیں نہیں کر سکتے؟“

”تم بھی تو موسموں کی طرح رنگ بدلتی ہو۔“ میں نے اُسے پیار بھری نظروں سے  
گھورا۔ ”تعلی کی طرح ڈال ڈال، پات پات اڑتی پھرتی ہو۔“  
”اب شاید ایسا نہ ہو.....“ اُس نے جواب دیا۔ ”پریتم لال مہاراج کی مہمان نگرانی کو نیچا  
دکھانے کے بعد ہی کوئی تمہاری انکارانی کو چھین سکتا ہے۔ مجھے ہندوستان میں دُور دُور تک  
کوئی ایسا بلوان پنڈت پجاری نظر نہیں آ رہا۔“

”وقت بڑا بے رحم ہوتا ہے جانی من۔“ میں نے کہا۔ ”پہلے بھی تم بار بار میرے سر پر آ  
جاتی رہی ہو، پنڈت و پجاری ہندوستان میں خود رو جھاڑیوں کی طرح اُگتے ہیں۔ جب  
کہیں اور قدم جمانے کا موقع نہیں ملتا تو کسی مندر کی شرن (پناہ) میں چلے جاتے ہیں۔ تم  
گواہ ہو کہ کیسے کیسے حراخوروں نے تمہیں مجھ سے چھین لینے کی کوشش کی، تمہیں اُس وقت  
اطلاع ہوئی جب وہ منڈل میں بیٹھ کر جاپ منتر شروع کر چکے تھے۔ کون جانے کل پریتم  
لال سے بھی بڑا پجاری اچانک خم ٹھوٹ کر مقابلے پر آ جائے۔ اب ان باتوں سے کوئی فرق  
نہیں پڑتا، میں تمہارے ظلم سہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔“  
”دل جلانے کی بات کیوں کر رہے ہو؟ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میری کچھ مجبوریاں  
بھی ہیں۔“ انکا نے مجھے بجھے انداز میں کہا۔

”تمہاری مجبوریاں بھی مجھے تمہاری طرح پیاری ہیں۔“  
”سچ جیل؟“ انکا کا چہرہ گلاب ہو گیا۔ ”ایک بار پھر کہو، مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں  
آ رہا۔“

پولیس کی گاڑی رکی تو انکا نے پھر کسمسا شروع کر دیا، باہر سے گاڑی کا دروازہ کھولا

گیا، کمانڈوز نے حفظ ماتقدم کی خاطر گاڑی کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ میں اُن کی احتیاط پر خوش ہوا، وہ مجھ سے خائف نہ ہوتے تو ایک آدمی کی خاطر اتنے حفاظتی انتظامات کیوں کرتے؟ شاید آرثر ہتھکڑی والا اقدہ بھولا نہیں تھا، اُس کی کسی خفیہ رپورٹ کے پیش نظر پولیس کی ڈیمر ساری نفری موجود تھی۔

میں مسکراتا ہوا گاڑی سے نیچے اُترا۔ قانون کے مطابق میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہونی چاہئے تھی لیکن آرثر نے عقلمندی سے کام لیا، مجھے لوہے کے زیور پہنانے کی حماقت نہیں کی۔

”دیکھ رہے ہو جیل صاحب۔“ انکا نے سرسراتے ہوئے کہا۔ ”ایک تمہاری ذات کی خاطر کتنے بٹے کئے نو جوان اسلحہ لئے موجود ہیں۔“

”میں تمہا کب ہوں انکارانی؟ تم بھی تو میرے ساتھ ہو۔“

”تمہیں کسی دشمن کی نظر نہ لگ جائے۔“ وہ چپکے لگی۔ ”ایسی ہی پیاری پیاری باتیں کیا کرو، مجھے اچھے لگتے ہو۔“

”دولت علی.....“ آرثر قدم بڑھاتا میرے قریب آ کر دم آواز میں بولا۔ ”میں نے مسٹر جم کی وجہ سے تمہیں ہتھکڑی نہیں پہنائی۔ مجھے اُمید ہے کہ تم بھی اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی غلطی نہیں کرو گے۔“

”شکریہ مسٹر آرثر۔“ میں نے زہر خند سے جواب دیا، پھر سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

”یہ پولیس کے اتنے سارے مسلح افراد، سادہ لباس میں ملبوس کمانڈوز، کیا عدالت کے معائنے کی خاطر چیف جسٹس تو نہیں آرہے؟“

”اپنے کام سے کام رکھو۔“ وہ میرا طنز برداشت نہ کر سکا تو ہونٹ چبانے لگا۔

”کام تو اب شروع ہو گا میرے دوست۔“ میں نے اُسے تیز نظروں سے گھورا، پھر عدالت کی عمارت کی سمت قدم اٹھانے لگا۔

انکا میرے سر پر بار بار پہلو بدل رہی تھی، کئی بار وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھ چکی تھی جس میں بے چینی کا اظہار تھا، گھٹن تھی، میں اُس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر خاموش رہنے کی عادی نہیں تھی۔ میں ایک اشارہ کرتا، وہ ایسے ایسے شوٹے چھوڑتی کہ لوگ حیران رہ جاتے، عدالت کا سارا نظام، تمام نظم و نسق درہم برہم ہو جاتا، انگریزوں کی روایتی

انتظامی قابلیت دھری کی دھری رہ جاتی، ایک ہنگامہ کھڑا ہوتا، طوفان آ جاتا۔ مگر میں نے کچھ اور سوچ رکھا تھا اس لئے انکا کو ”کھلی چھٹی“ نہیں دی۔

مجھے عدالت کے باہر زیادہ دیر انتظار کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑی۔ میرا نام با آواز بلند پکارا گیا۔ مسلح سپاہیوں نے اشارہ کیا، میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

”جیل.....“ انکا پھر کسمسانے لگی۔ اگر ان لوگوں نے تمہارے خلاف زیادہ زبان درازی کی تو میں برداشت نہیں کروں گی۔“

”نہیں.....“ میں نے سنجیدگی سے اُسے سمجھایا۔ ”جب تک میں اشارہ نہ کروں، تم کوئی حرکت نہ کرنا۔“

”مجھے صرف دو منٹ کی اجازت دے دو۔“ انکا کی وحشت دیدنی تھی۔ ”میں آرثر کی ایسی مٹی پلید کروں گی کہ پورے شہر میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔“

میں نے انکا کو ضبط سے کام لینے کی تاکید کی۔ وہ ٹھنک کر رہ گئی۔ عدالت کے منصف نے ایک نظر بھر کر مجھے دیکھا، پھر کارروائی شروع کرنے کا حکم دیا۔ آرثر نے نگاہوں نگاہوں میں سرکاری وکیل کو اشارہ کیا، وہ پستہ قد، گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ شکل ہی سے خراٹ اور گرگ جہاں دیدہ نظر آ رہا تھا، اپنی نشست سے اٹھنے سے پیشتر اُس نے مجھے حقارت بھری نظروں سے سرتاپا دیکھا۔ سفید فام تھا، مجھ پر نسلی برتری کا زعب جمانے کی کوشش کر رہا تھا، نفسیاتی جھٹکنڈے اختیار کر رہا تھا۔ انکا ہونٹ چبانے لگی، میں خاموش رہا۔

وکیل سرکار کی دھواں دار تقریر شروع ہوئی، مشیر نامہ میں درج باتوں کو وہ طول دے کر، نمک مرچ لگا کر اس طرح بیان کر رہا تھا جیسے میں چوری کا نہیں، قتل عہد کا کوئی بے حد خطرناک اور مفرد مجرم تھا۔ اُس کا انداز بیان بڑا اثر تھا۔ جج بار بار سر ہلاتا رہا، جیوری کے ممبران جن میں دو خواتین بھی شامل تھیں، سنجیدگی سے میرا کیس سنتے رہے۔ سرکاری وکیل جرم کی نوعیت اور تفصیل کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی قانونی دفعات کا حوالہ بھی دیتا رہا، وہ حق نمک ادا کر رہا تھا، میں جیوری کے درمیان بیٹھی اُس سیاہ فام خاتون کو بار بار نکلیوں سے دیکھنے میں مصروف تھا جو یقیناً اقلیتی نمائندہ کی بنیاد پر شامل کی گئی تھی۔ اُس کا قد درمیانہ تھا، سیاہی مائل رنگت میں سرخی کی آمیزش نے اُس کا رُپ نکھار دیا تھا۔ اُس کے چہرے کے نقوش بے حد حسین تھے، آنکھوں میں چمک تھی، ہونٹوں پر لپ اسٹک کے دل آویز رنگ

”جی لارڈ.....“ میں نے مہذب لہجے میں جج کو مخاطب کیا۔ ”سرکاری وکیل کو سمجھایا جائے کہ قانون کے آداب کو ملحوظ خاطر رکھیں۔ جب تک میں عدالت کے کٹہرے میں نہ کھڑا ہوں، وہ مجھ سے کسی قسم کے سوال و جواب کا حق نہیں رکھتے۔ بہتر ہوگا کہ وہ جو فرضی کہانی سنار ہے ہیں اس میں کلی پسند نے لگانے پر زیادہ توجہ دیں۔“

جج نے سرکاری وکیل کو ٹوکا۔ میرا اعتراض حق بجانب تھا، جیوری کے ممبروں کی نظریں میری جانب اٹھنے لگیں۔ مورینا نے میری جسارت پر مسکرا کر داد دی تو اُس کے موتیوں جیسے دانت بھی جھلکانے لگے۔

سرکاری وکیل نے استغاثہ کی کارروائی سمیٹی تو پولیس کے گواہوں کو باری باری طلب کیا گیا۔ میں تفصیل سے گریز کروں گا، گواہوں کے بیانات وہی تھے جو میری موجودگی میں ہوٹل کے کمرے میں ریکارڈ کئے گئے تھے۔ سب سے آخر میں آرٹھر بڑی شان سے اپنے کسرتی جسم اور کلف شدہ یونیفارم کی نمائش کرتا ہوا کٹہرے میں جا کھڑا ہوا۔ میں پوری توجہ سے اُس کی لہجہ سنی سنتا رہا۔ اُس نے عدالت کو باور کرانے کی کوشش کی کہ میں نے جائے وقوعہ پر اُس کے ساتھ تعاون کرنے کی بجائے مزاحمتی کردار ادا کرنے کی کوشش کی جس کے سبب قانونی کارروائی کی تکمیل میں اُسے دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس نے آٹھ سو پونڈ کی کے سلسلے میں میرے اوپر خرد برد کا الزام لگانے کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیا کہ آٹھ سو پونڈ کی کمی اس بات کی دلالت کرتی ہے کہ میں نے وہ رقم کسی دوسرے بڑے مجرم کے ساتھ، جو ابھی تک سامنے نہیں آ سکا، کر چوری کی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں مذکورہ رقم کو خرچ کرنے سے گریز کرتا۔

”جیل.....“ انکا نے پوچھا۔ ”کیا یہ خبیث سچ کہہ رہا ہے.....؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آرٹھر نے میرے اوپر یہ الزام بھی عائد کیا کہ میں نے جسمانی ریمائنڈ کے دوران اُس کے ساتھ تعاون کرنے کی بجائے فرائض سے بددیانتی کرنے اور رشوت لے کر کیس کو کمزور کرنے پر بار بار اُسکا نے کوشش کی، مجھے حقارت بھرے انداز میں ”ننٹا“ کہا گیا، میرے کٹے ہوئے ہاتھ کے پس منظر میں کئی من گھڑت کہانیاں بیان کی گئیں، مجھے ایسا خطرناک مجرم اور دہشت گرد ثابت کرنے کی کوشش کی گئی جس نے اپنا جرم چھپانے کی خاطر فنگر پرفنس کے ناقابل تردید ثبوت سے بچنے کی خاطر خود

نے اُس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ وہ گداز جسم کی مالک تھی، اُس نے بالوں کی گندمی ہوئی بے شمار لٹوں کو اس خوبصورتی اور چابکدستی سے ترتیب دیا تھا جیسے کوئی کوڑیالا سانپ اپنے جسم کو سمیٹے محو خواب ہو۔ بالوں کی لٹوں میں پروئے ہوئے موتیوں کی چمک بھی دیدہ زیب تھی، میں پہلی ہی نظر میں اُس گل بدن کا اسیر ہو گیا۔ پریتم لال نے مجھے لگن منڈپ سجانے سے منع کیا تھا، موج میلہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ میں نے اُس کا فریاد ادا کو ایک رات کا مہمان بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

”اُس کا نام مورینا ہے جیل۔“ انکا نے پھدک کر میرے کندھے پر آ کر آہستہ سے سرگوشی کی۔ ”بڑی باغ و بہار طبیعت کی مالک ہے، خود کو بڑا سنبھال کر رکھتی ہے۔ اُس کے چاہنے والوں کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے لیکن آج تک کوئی اس چوٹی کو سر نہیں کر سکا۔ تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ عدالت کا جج بھی اس پر نظر رکھتا ہے۔ تمہارا انتخاب واقعی لاجواب ہے۔ میں اُس کے دل میں بھی تمہارے لئے نرم گوشہ محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن مورینا کے سلسلے میں اپنی انکارانی کو نظر انداز نہ کر دینا۔“ انکا ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

”منظور ہے.....“ میں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا تو اُس کی باپھیں کھل اٹھیں۔ پھر وہ موضوع بدل کر بولی۔

”تم نے کچھ اور بھی محسوس کیا؟“

”کیا.....؟“

”جم، سارا، جین اور ولیم میں سے کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔“

”ولیم کو میں نے منع کر دیا تھا۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”جم وغیرہ کا نہ آنا ہی اچھا ہے۔ وہ موجود ہوتے تو مجھے اپنے ارادوں میں دشواری پیش آتی۔ میں انہیں کسی بات کا گواہ نہیں بنا سکتا تھا۔ میری وجہ سے وہ بلاوجہ الجھ جاتے۔“

”تم نے کیا سوچ رکھا ہے؟“ انکا نے بڑی لگاؤ سے پوچھا۔ ”مجھے نہیں بتاؤ گے؟“

”مسٹر دولت علی.....“ سرکاری وکیل نے جو غالباً کٹھیوں سے میری حرکات و سکنات کا جائزہ بھی لیتا رہا تھا اچانک مجھے مخاطب کر کے پریشان کرنا چاہا۔ ”آپ غالباً پوری طرح متوجہ نہیں ہیں۔ بعد میں آپ کو اپنا دفاع کرتے وقت دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ اُس کے لہجے میں طنز تھا، برتری کا احساس نمایاں تھا۔

اپنے اوپر ظلم کیا، ایک ہاتھ ضائع کر دیا تاکہ قانون اندھیرے میں بھٹکتا رہے۔

انکا آرتھر کے بیان پر بیچ و تاب کھاتی رہی، میں چہرے پر معصومیت سجائے زبان خاموش سے اپنی مظلومیت کا اظہار کرتا رہا، جج اور جیوری کے افراد کی نگاہیں کبھی مجھ پر کبھی آرتھر پر منزلاتی رہیں۔ آرتھر کا طویل بیان ختم ہوا تو وہ فاتحانہ انداز میں قدم اٹھاتا کنہرے سے باہر آگیا۔

گواہوں کے بیان کے دوران فاضل جج نے بار بار مجھے جرح کرنے کا موقع دیا، میں انکار کرتا رہا، میرے ذہن میں صرف ایک ہدف کلبلا رہا تھا، میں نے دوسرے گواہوں کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

آخر میں مجھے کنہرے میں طلب کیا گیا، جیوری کے ممبران سنہیل کر بیٹھ گئے۔ جج نے پہلو بدلا، سرکاری وکیل اور آرتھر کے چہروں پر معنی خیز مسکراہٹ اُبھری، وہ مجھے ایک عام ہندوستانی سمجھ کر اپنی اکثریت اور نسلی برتری سے مرعوب کرنا چاہتے تھے۔ میں دل ہی دل میں اُن کی حرکتوں پر مسکراتا رہا۔

”مسٹر دولت علی۔“ جج کی بھاری بھر کم آواز اُبھری۔ ”کیا تمہاری جانب سے کوئی وکیل ہے؟“

”جی نہیں می لارڈ.....“ میں نے دیدہ و دانستہ کمزور آواز میں جواب دیا۔ انکا نے اٹھ کر میرے بالوں کے درمیان ٹہلنا شروع کر دیا۔ اُس کے تیور بدلنے لگے۔

”تم اگر چاہو تو یہ عدالت تمہاری درخواست پر کسی وکیل کی خدمات مہیا کر سکتی ہے۔“ ”شکریہ یور آنر۔“ میں اپنا کیس خود ہی نمٹانے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے غلاموں کے انداز میں عرض کیا۔ آرتھر اور سرکاری وکیل کی گردنیں اورتھ گئیں۔ وہ میرے مایوس اور مضطرب طرزِ تکلم پر خوش ہو رہے تھے۔

”ایک بار پھر غور کرلو۔“ جج نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔ ”عدالت کی کارروائی کے بیچ ذمہ اور قانونی باریکیوں کو ایک مستند وکیل ہی بہتر سمجھ سکتا ہے۔ بعد میں تم اپنا یہ حق استعمال نہیں کر سکو گے۔“

”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں یور لارڈ شپ۔“ میں نے تشکرانہ انداز میں سر کو خفیف جنبش دی، پھر سنہیل کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ گولی ایک بار چیخیر سے نکل جائے تو واپس

نہیں ہو سکتی۔ لیکن میں مشکور و ممنون ہوں مسٹر آرتھر کا جنہوں نے سوائے ایک اہم پہلو کے علاوہ تمام باتیں ایسی کی ہیں جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دینے کے لئے بہت کافی ہیں۔ وہ تمام نکتے اور حقائق جو سلطنت برطانیہ کے ایک معزز، ذمہ دار اور باصلاحیت پولیس آفیسر نے بڑی تفصیل سے عدالت کے رُوبرو بیان کئے ہیں وہ میری بے گناہی ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ میں مسٹر آرتھر کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔“

جج اور جیوری کے ممبران کے علاوہ سرکاری وکیل اور آرتھر کے منہ بھی کھلے کے کھلے رہے۔ سب مجھے تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ شاید میں نفسیاتی طور پر مفلوج ہو گیا ہوں، میرے ذہن اور اعصاب نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے جو میں اپنے سب سے بڑے حریف آرتھر کے بیان کی تائید کر رہا تھا۔ میرا بیان مجھے لمبی سزا کا مستحق بھی قرار دے سکتا تھا۔

”جیل.....“ انکا بھی ششدر رہ گئی۔ ”یہ تم نے کیا الٹی سیدھی باتیں شروع کر دیں، جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”مسٹر دولت علی۔“ جج نے پہلو بدل کر ہمدردی کا اظہار کیا۔ ”میں تمہیں پھر موقع دوں گا کہ سرکاری مراعات سے فائدہ اٹھا کر اپنے لئے کسی وکیل کی تقرری کی درخواست پر غور کرلو۔“

”میں غور کر چکا ہوں می لارڈ۔“ میں نے انکا کی بات نظر انداز کر کے جج کو مخاطب کیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میرا کوئی بیان، میری زبان سے نکلا ہوا کوئی جملہ، ایک لفظ بھی میرے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے، میں سزا کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہوں لیکن.....“ میں نے نظریں گھما کر جیوری کے ممبران کی طرف دیکھتے ہوئے جج سے بڑے بڑا اعتماد لہجے میں کہا۔ ”ایسا نہیں ہوگا یور آنر..... میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ مسٹر آرتھر کو دوسرے کنہرے میں میرے رُوبرو طلب کیا جائے تاکہ میں اپنے بیان کی تفصیل سے وضاحت کر سکوں۔“

عدالت کے حکم پر آرتھر میرے سامنے والے کنہرے میں آگیا۔ اب اُس کے ہونٹوں پر وہ معنی خیز مسکراہٹ نظر نہیں آرہی تھی جو کچھ دیر پیشتر موجود تھی۔ ہتھکڑی کا واقعہ شاید اُس کے ذہن میں دوبارہ اُبھر آیا ہوگا۔ وہ کچھ متفکر اور نروس بھی ہو رہا تھا۔ سمجھدار آفیسر تھا، سمجھ



رہا ہو گا کہ سارے دیگر گواہوں کو نظر انداز کر کے اُسے جرح کے لئے طلب کرنا خالی از علت نہیں ہو سکتا۔ میں نے عدالت سے اجازت طلب کی، پھر سنجیدگی سے بولا۔

”مسٹر آرثر، سب سے پیشتر میں آپ کے بیان پر شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔“  
آرثر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مجھے کی حالت سے دو چار تھا، بڑی کینہ تو ز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”میرے محترم اور محرز دوست۔“ میں نے پینتر ابدل کر اپنی بات کا آغاز کیا۔ ”آپ نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ میں نے جائے وقوعہ پر قانون کے ساتھ تعاون نہیں کیا، سرکاری کاموں میں بے جا مداخلت کا مرتکب ہوا جس کے سبب آپ کو دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔“  
”ہاں.....“ آرثر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں نے جو کچھ کہا وہ غلط نہیں تھا۔“  
”کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ سفری بیگ کے میرے کمرے میں پہنچنے کے اندازاً کتنی دیر بعد آپ تشریف لائے تھے؟“

”مجھے صحیح وقت کا اندازہ نہیں مگر میں بڑے یقین سے کہہ سکتا ہوں مجھے اٹھارہ یا بیس گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے تھے۔“

”گویا آپ دوسرے الفاظ میں اس بات کا اقرار کر رہے ہیں کہ میں کوئی عادی، پیشہ ور، خطرناک یا مفروضہ مجرم نہیں ہوں؟“ میں نے ٹھوس لہجے میں سوال کیا۔

”یہ محض آپ کی خوش فہمی ہے۔ میں نے عدالت کے زور وادب کوئی بات نہیں کی.....“  
”آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔“ میں نے آرثر کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا، پھر جج سے مخاطب ہوا۔ ”می لارڈ، مسٹر آرثر کا بیان ہے کہ سفری بیگ میرے زوم سے اٹھارہ یا بیس گھنٹے بعد برآمد کیا گیا..... یور آنرز۔ میں ایک عادی مجرم ہوتا تو اس سفری بیگ کو اتنی دیر اپنی تحویل میں رکھنے کی حماقت کبھی نہ کرتا، اُسے دوسرے یا تیسرے ٹھکانے پہنچا دیا گیا ہوتا۔“

جیوری کے ممبر مسکرانے لگے۔ خاص طور پر مورینا مجھے تعریفی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔  
”میں اسے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کہوں گا۔“ آرثر نے احتجاج کیا۔ ”ایک معمولی مجرم اور عادی مجرم میں یہی فرق ہوتا ہے۔ عادی مجرم کی حد سے زیادہ خود اعتمادی ہی پولیس کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے۔“

”مسٹر آرثر.....“ میں نے آرثر کو دیکھنے کی بجائے جیوری کے ممبران کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ کے خیال میں ایک عادی مجرم کو گرفتاری کے بعد ہتھکڑی لگانا ضروری نہیں ہے؟“

میں آرثر کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات نہیں دیکھ سکا، وہ ہتھکڑی کے حوالے پر ضرور شبٹایا ہوگا۔ عدالت میں چند ساعت خاموشی مسلط رہی، پھر جج کی آواز سنائی دی۔  
”مسٹر آرثر۔ آپ نے جواب نہیں دیا۔“

”میرے ساتھ پولیس کی نفری زیادہ تھی اس لئے میں نے.....“  
”آپ پھر غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔“ میں نے تیزی سے آرثر کی بات کاٹ کر اُسے گھورا۔ ”بات پولیس کی نفری کی نہیں، ایک عادی مجرم کو ہتھکڑی لگانے کی ہو رہی ہے۔“  
”میں نے کسی وجہ سے ہتھکڑی کا استعمال ضروری نہیں سمجھا۔“ آرثر نے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا آپ کسی وجہ سے“ کی تشریح سے عدالت کو مستفید فرمانا پسند کریں گے؟“ میں نے زہر خند سے آرثر کے ٹوٹے اعتماد کو ایک اور دھچکا پہنچانے کے سنہری موقع کو ضائع نہیں کیا۔

آرثر کا چہرہ خون کی شدت سے تمنا اٹھا۔ میں اُس کی بوکھلاہٹ کی وجہ سمجھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ عدالت کے زور و میری حیرت انگیز قوت کا اظہار کر کے اپنی سبکی برداشت نہیں کرے گا۔ میں نے دوبارہ مسکرا کر اُس کی مشکل آسان کر دی۔ ”اگر آپ کسی وجہ سے میرے سوال کے جواب سے گریز کر رہے ہیں تو میں زیادہ اصرار نہیں کروں گا۔“ میں نے دوسرا سوال کیا۔ ”آپ نے ابھی کہا تھا کہ میں نے جسمانی ریمانڈ کے دوران آپ کو رشوت دینے کی کوشش کی، فرائض کی انجام دہی سے غفلت برتنے پر اُکسایا۔“  
”ہاں، میں نے یہی کہا تھا.....“ آرثر نے سنبھل کر جواب دیا۔

”حیرت انگیز، مائی لارڈ.....“ میں نے جج کی طرف دیکھا۔ ”ایک عادی مجرم پہلے اٹھارہ گھنٹے تک ایک لاکھ پونڈ کی کثیر رقم خود اپنی تحویل میں رکھنے کی حماقت کرتا ہے، پھر دوسری حماقت یہ کرتا ہے کہ تمام ابتدائی قانونی دستاویز مکمل ہونے اور جسمانی ریمانڈ کے بعد رشوت کی پیشکش کرتا ہے۔ حالانکہ قانون سے گلو خلاصی حاصل کرنے کی خاطر ایک عام

مجرم کو بھی سب سے پہلے کسی نہ کسی طرح قانون کے شکنجوں سے گلو خلاصی حاصل کرنے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ کیا مسٹر آرثر کے بیان کا یہ جھول اس بات کی نشاندہی نہیں کرتا کہ میرے خلاف کیس کو پیچیدہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے؟.....“

”مسٹر آرثر۔ عدالت نے آرثر کو مخاطب کیا۔ ”آپ کا کیا کہنا ہے؟“

”مائی لارڈ.....“ آرثر نے اپنا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی۔ ”میں نے جو بیان کیا وہ حقیقت پر مبنی ہے، میرا سابقہ ریکارڈ اور کارکردگی.....“

”بات کو الجھانے کی کوشش نہ کریں مسٹر آرثر۔“ میں نے دیدہ و دانستہ قدرے جھلا کر کہا۔ ”جیوری کے معزز ممبران اس وقت یہاں آپ کی پرسنل فائل کے مطالعے یا آپ کی حسن کارکردگی چوکٹور یا کراس سے نوازے جانے کی تقریب میں شرکت کی غرض سے جمع نہیں ہوئے ہیں۔“

اس بار جیوری کے ممبران کے علاوہ جج بھی اپنے ہونٹوں پر ابھرنے والی بے ساختہ مسکراہٹ پر قابو نہ پاسکا۔ آرثر کا گڑبڑا جانا قدرتی امر تھا۔ انکا کی آنکھیں بھی پٹ پٹانے لگیں۔ حیرت سے بولی۔

”جیل، تمہارے یہ جوہر تو آج پہلی بار کھل رہے ہیں۔ ایمان سے نظر لگ رہی ہے تمہیں۔ اجازت ہو تو بلائیں لے لوں؟“

میں کچھ دیر کھڑے میں خاموش کھڑا جیوری کے ممبران کے درمیان ہونے والی کھسر پھسر سنتا رہا۔ میری نظریں خاص طور پر مورینا پر مرکوز تھیں جو شاید میرے حق میں بار بار ہاتھ اٹھا کر بڑی سنجیدگی سے قریب بیٹھے دوسرے ممبروں کو کسی خاص نکتے پر قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”جیل.....“ انکا نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”دیکھ رہے ہو اپنی بے دُم کی مورنی کو، تمہارے حق میں کیسا پٹر پٹر بول رہی ہے۔ مچھل خود تمہارے جال میں چھبنے کو مچھل رہی ہے۔“

مورینا کے لئے ”بے دُم کی مورنی“ والی اصطلاح سن کر میں دل ہی دل میں مسکرایا، انکا کی نظریں بدستور مورینا پر جمی تھیں، آرثر بری طرح بوکھلایا نظر آ رہا تھا، مجھے خوشی تھی اُس کے پاؤں آہستہ آہستہ اُکھڑ رہے تھے۔ میرے پاس دھماکہ کرنے کے لئے بازو دھکا خاصا

ذخیرہ موجود تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے آرثر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں مانے لیتا ہوں کہ غلطیاں انسانوں ہی سے سرزد ہوتی ہیں۔ آپ نے بھی ممکن ہے میرے سلسلے میں کاغذات تیار کرنے میں غلط کام مظاہرہ جان بوجھ کر نہ کیا ہو۔ بہر حال میں عدالت کا زیادہ قیمتی وقت برباد نہیں کروں گا۔“ میں سانس لینے کی خاطر زکا، پھر چیتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مسٹر آرثر، کیا آپ میری معلومات کے لئے یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ خطرناک عالمی دہشت گردوں اور قانون کی اصطلاح میں خطرناک مجرموں کا ریکارڈ مرتب کرنے اور محفوظ کرنے کے لئے ان کی کتنی انگلیوں کے فنکر پرنس لئے جاتے ہیں؟“

”آٹھ انگلیوں اور دو انگلیوں کے امپریشن لئے جاتے ہیں۔“ آرثر نے جواب دینے میں تاخیر نہیں کی۔

”کیا آپ کو اچھی طرح یاد ہے کہ دونوں ہاتھ کی تمام انگلیوں اور دونوں انگلیوں کے پرنس لئے جاتے ہیں؟“

”جی ہاں.....“ آرثر نے وضاحت کی۔ ”کسی خطرناک مجرم کا ریکارڈ محفوظ کرنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے..... ویسے ہم کسی ایک انگلی یا انگلیوں کے نشانات سے بھی مجرم تک پہنچ جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“

”کیا عادی مجرم بھی ان حقائق سے واقف ہوتے ہیں؟“ میں نے بڑی معصومیت سے دریافت کیا۔

”جی ہاں، آج کل تو چھوٹے موٹے چور اُچکے اور جیب کترے بھی قانون کے بارے میں بہت زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔“ اُس نے مجھے پرتل کی کوشش کی۔

”آپ نے بھری عدالت کے سامنے مجھے ٹٹا کہا، یہ الزام تراشی کی بد زور کوشش بھی کی کہ میں نے فنکر پرنس چھپانے کی خاطر جان بوجھ کر اپنا ایک ہاتھ ضائع کر دیا۔“ میری آواز کی ٹھن گرج بتدریج بڑھتی گئی۔ ”کیا بیان دیتے وقت آپ اپنی ان صلاحیتوں کو فراموش کر گئے تھے جن کی مدد سے آپ جانے دو وعدے برآمد ہونے والے کسی ایک انگلی یا انگلیوں کے فنکر پرنس کے ذریعے بھی مجرموں کا قلع قمع کر سکتے ہیں؟“

آرثر کے چہرے پر بارہ بجنے لگے۔ انکارانی میری بات کی تہہ کو پہنچ کر خوشی سے تالیاں

بجانے لگی۔ جیوری کے ممبران کے درمیان پھر چرمیگوئیاں شروع ہو گئیں، سرکاری وکیل آرتھر کی حمایت میں اُنٹھ کھڑا ہوا۔ عدالت سے مخاطب ہو کر بولا۔

”سی لارڈ، مسٹر آرتھر کی نیک نیتی اور بیان شک و شبہ سے بالاتر ہے، میں درخواست کروں گا کہ ملزم دولت علی کو مزید جرح سے روکا جائے۔ یہ بے سرو پا باتیں کر کے عدالت کا وقت ضائع کرنے کی ڈرامائی کوشش کر رہا ہے۔“

انکا کے تئو بد لنے لگے۔ میں نے اُسے روکنا چاہا لیکن وہ پل بھر میں کسی چھلاوے کی طرح میری نظروں سے اوجھل ہو گئی، شاید اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک اُٹھا تھا۔ سرکاری وکیل بدستور بولتا رہا۔

”میں مستند حوالوں سے عدالت کے رُوبرو یہ بات ثابت کر سکتا ہوں کہ ایشیا سے تعلق رکھنے والے اکثر مجرم عدالت کے رُوبرو اپنی مظلومیت ثابت کرنے اور ہمدردی حاصل کرنے کی خاطر لمبی چوڑی بے معنی باتیں کرتے ہیں، ان کی باتوں میں کوئی وزن نہیں ہوتا۔“ میں سرکاری وکیل کی بکواس سننے کی بجائے انکا کے سر سے اتر جانے کے بارے میں غور کر رہا تھا، وہ لائحہ ودقوتوں کی مالک تھی، لمحوں میں بازی پلٹ دینے کے لئے اُس کی پلکوں کی ایک جنبش بہت تھی۔ وہ انکا تھی۔ میری انکارانی..... میرے لئے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ میں اُسی کے بارے میں غور کر رہا تھا جب اچانک پریم لال کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

”چنانچہ کرنا بالک، میری شہتی تمہارے ساتھ ہے۔“

میں نے تیزی سے پلٹ کر بائیں جانب دیکھا، پریم لال مہاراج کی اتما مادی شکل میں کٹھرے کے ساتھ کھڑی تھی۔

”مہاراج۔“ میں نے عقیدت کا اظہار کیا۔ ”تم نے آنے کی زحمت کیوں کی؟ میرے لئے انکا ہی بہت ہے۔“

”میں تجھے کچھ دان کرنے آیا ہوں مورکھ، کلدیپ کی آتما نے مجھ سے بنی کی تھی، ہزاش مت ہو جانا۔ چٹان کی طرح طوفان کے سامنے ٹٹے رہنا، وجہ تیری ہی ہوگی۔“ پریم لال نے بڑی نحیف اور کمزور آواز میں کہا پھر اپنا پرف جیسا سرد ہاتھ میرے دائیں ہاتھ پر پھیرتا ہوا بولا۔ ”میں نے تجھ سے کہا تھا کہ ہاتھ ٹھیک کرالے۔ تیرا خیال تھا کہ تیری انکارانی کی شہتی بھی تیرا کٹنا ہوا ہاتھ ٹھیک نہیں کر سکتی۔ تو پریم لال کو بھول گیا تھا۔ کلدیپ کی من کی

بھاؤنا کو نہیں سمجھ سکا۔ وہ سندری تجھ پر جان چھڑکتی تھی، تیرے کارن کالی کو دیئے ہوئے وجہ پر اپنا کول شریر بلیدان کر گئی۔ میں بھی اُسے نہیں بچا سکا۔“ پریم لال کا استخوانی منجر کمر کھڑانے لگا۔ اُس کی گوشت پوست کی قید سے آزاد آہنی انگلیاں میرے بائیں ہاتھ پر رہتی رہیں۔ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”آج اسی سورگ باشی سندری کی بنی پر تیرا کٹنا ہوا ہاتھ تجھے واپس کر رہا ہوں، میری بات دھیان سے سن لے۔ جب تو کسی اچھے اور پوتر کام کے لئے من کی گہرائیوں سے وچار کرے گا تو تیرا یہ ہاتھ اسی طرح حرکت کرے گا جس طرح کٹنے سے پہلے کرتا تھا۔ کوئی ثابت نہیں کر سکے گا کہ تیرا ہاتھ کبھی کاٹ دیا گیا تھا۔ پرنو ایک بات گانٹھ کی طرح باندھ لے۔ کبھی اس ہاتھ سے کوئی غلط کام لینے کی سوچے گا تو یہ تیرے کسی کام میں نہیں آئے گا۔ میرا آشیر باد تیرے ساتھ ہے۔ بے کالی، بے بزرگ ملی۔“

پریم لال کا استخوانی منجر میری نظروں سے یکثرت اوجھل ہو گیا۔ اُس کے کہے ہوئے جملے میرے کانوں میں گونج رہے تھے، میرا اہل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے بائیں ہاتھ کو ہلکی سی جنبش دی، ایک ایک انگلی کو آہستہ آہستہ حرکت دے کر دیکھا، میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ میرا دل خوشی سے اُچھلنے لگا، میرا ذہن کلدیپ کے بارے میں سوچنے لگا۔ عدالت میں کیا ہو رہا تھا میں اس سے بے خبر تھا۔ لیکن پھر ہتھوں کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے سرکاری وکیل کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ میں دو پاؤنڈ کا پیتل کا وزن کرنے والا باٹ (WEIGHT) لئے کھڑا تھا۔ مجھے یاد آیا، کچھ دیر پہلے وہ میری باتوں میں وزن نہ ہونے کی بات کر رہا تھا اور اب اس وزن کرنے والے پیتل کے پیمانے کو تعجب اور حیرت انگیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا، وہ میری انکارانی کی ایک معمولی شرارت تھی جس نے سرکاری وکیل کی شخصیت کو بڑا مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔

”ہماری باتوں میں وزن کہاں سے ہو گا می لارڈ؟“ میں نے موقع سے فائدہ اُٹھایا۔

”وزن تو سرکاری وکیل کے ہاتھوں کا کھلوتا ہوتا ہے۔“

عدالت کا وقار برقرار نہ رہ سکا، سارا ماحول زعفرانی زار بن گیا۔ سرکاری وکیل کی وحشت اور بوکھلاہٹ دیدنی تھی۔

”آرڈر..... آرڈر.....“ ج نے لکڑی کا مخصوص ہمر (HAMMER) اُٹھا کر تین بار میز پر مارا تو قہقہوں کی آوازیں معدوم ہو گئیں، کسی کسی ہونٹ پر مسکراہٹ باقی رہ گئی۔ آرتھر

دوبارہ انٹن پوزیشن میں آگیا۔

”آپ بیٹھ جائیں۔“ جج نے سرکاری وکیل سے کہا، پھر روئے خن میری جانب متوجہ ہوا۔ ”مسٹر دولت علی، عدالت کے وقفے کا وقت قریب ہے۔ آپ اگر چاہیں تو میں کل کی تاریخ دے سکتا ہوں۔“

”میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ مجھے مسٹر آرثر سے صرف تین باتیں اور دریافت کرنے کا موقع دیا جائے، میں اپنی درخواست کے جواز میں یہ عرض کروں گا کہ بات اگر کل پرنٹل گئی تو سارا تسلسل ختم ہو جائے گا۔ جیوری کے ممبران کو بھی دوبارہ کڑیاں ملانے میں زحمت کا سامنا ہو سکتا ہے۔“

”آپ کو اجازت ہے۔ لیکن وقت کا خیال رکھا جائے۔“ جج نے عدالت میں مکی وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے میری درخواست منظور کر لی۔ اسی لمحے انکا میرے سر پر دوبارہ آگئی، کسمسا کر بولی۔

”تمہاری ناراضگی کے خیال سے جلدی آگئی۔ ورنہ میں نے سوچا تھا کچھ دیر موریتا کے بالوں میں بھی آرام کر لیتی۔ تم خفا تو نہیں ہو جیسی؟“

میں نے جواب میں انکا کو کچھ ضروری ہدایات دیں۔ وہ تیزی سے دوبارہ میرے سر سے اتر گئی۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ میں کیس کو جلد از جلد ختم کرنے کا خواہشمند تھا۔ میں نے آرثر کو اس بار قہر آلود نظروں سے گھور دیا۔ میں اُسے باور کرانا چاہتا تھا کہ اُس کا برا وقت قریب آچکا ہے، خطرے کی گھنٹی بجنے میں کچھ لمحے اور باقی رہ گئے ہیں۔ قسمت کی دیوی اُس سے رُوٹھنے کو پر تول چکی ہے، تباہی اس کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ اُس نے مجھے چھیڑ کر اپنی تباہی کو دعوت دی تھی۔

”مسٹر آرثر۔ آپ نے سن لیا ہوگا کہ عدالت کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اس لئے جو جواب بھی دیجئے گا، سوچ سمجھ کر دیجئے گا۔“ میں نے اُسے نفسیاتی طور پر کمزور کرنے کی خاطر کہا، پھر بے حد نفوس لہجے میں بولا۔ ”آپ جس وقت ہوٹل میں میرے کمرے میں تشریف لائے تھے اُس وقت آپ نے ایک ہی جیسے انداز میں تہہ کئے ہوئے دو کاغذات جیب سے نکالے تھے، سو سو پونڈ کے نوٹوں کی فہرست تیار کرتے وقت آپ نے براہ راست نوٹوں سے نمبر لینے کی بجائے ان دونوں لسٹوں میں سے ایک کو سامنے رکھ کر نمبر نقل کئے

تھے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ نے مشیر تارے میں وہی نمبر لکھے ہیں جو نوٹوں پر تھے یا غلطی سے غلط کیس بتانے کی جلدی میں غلط نمبر..... میرا مطلب یہ ہے کہ دوسرے کاغذ پر درج شدہ نمبر لکھ ڈالے؟“

”مم..... میں.....“ آرثر کا گڑبڑا جانا قدرتی امر تھا۔ اُس کے چہرے پر غصے کی شدت قابل دید تھی، ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے سوال کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔“

”مطلب اور مقصد دونوں بہت صاف ہیں مسٹر آرثر۔“ میں نے جیوری کے ممبران کی طرف ہاتھ اٹھا کر احتجاجی انداز میں جواب دیا۔ ”آپ نے میرے خلاف غلط کیس بنا کر بددیانتی کا ثبوت دیا ہے۔“

”آرڈر..... آرڈر.....“ جج نے مجھے تنبیہی نظروں سے گھورا۔ ”مسٹر دولت علی۔ آپ اپنے سوال پر دوبارہ غور کر لیں۔ ایک ذمہ دار آفیسر پر دھوکا دہی اور جلسہ سازی کا الزام اگر غلط ثابت ہوا تو آپ کو اس کی سزا سنائیں بھی ہو سکتی ہے۔“

”مئی لارڈ.....“ میں نے جج کی طرف رخ کیا، سر کو خفیف سا خم دے کر اُسے اپنے مہذب ہونے کا یقین دلایا، زیر لب مسکرا کر بولا۔ ”میں نے جو کچھ کہا ہے اس کی تصدیق کے لئے کسی کارندے کو کہیں دُور نہیں جانا پڑے گا۔ سو سو پونڈ کی کرنسی کا سر بمبر سفری بیگ اور کیس فائل دونوں عدالت کی تحویل میں ہیں۔ آپ بنفس نفیس تصدیق فرما سکتے ہیں۔ لیکن.....“ میں نے پلٹ کر زہر خند سے آرثر کو مخاطب کیا۔ ”مائی ڈیئر مسٹر آرثر۔ کیا یہ غلط ہے کہ آپ کو اپنے کسی معتبر ذرائع سے اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ میں نے کسی مقامی دوست کو فون کر کے ایک لاکھ پونڈ کی رقم طلب کی تھی۔ بعد ازاں آپ کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ مطلوبہ رقم کس بینک سے نکلائی گئی ہے؟ آپ بڑے آفیسر ہیں، آپ کی رسائی بھی دُور دُور تک ہوگی۔ بینک سے نوٹوں کی جاری کردہ نمبروں کی فہرست آپ کو کہاں سے ملی؟ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، لیکن.....“

”مائی لارڈ.....“ سرکاری وکیل احتجاجاً دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا۔ منہ سے جھاگ اُڑا لے ہوئے بولا۔ ”یہ شخص صرف عدالت کا وقت برباد کرنے کی خاطر بات کو طول دے رہا ہے، ہم ابھی عدالت کے رویرو اس کی بے سرو پا باتوں کی تصدیق کئے لیتے ہیں۔“

جج نے سر ہلا کر سرکاری وکیل کے مشورے کی تائید کی۔ جیوری کے ممبران اپنی اپنی

نشتوں پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ میں نے نکلیوں سے مورینا کی جانب دیکھا، وہ زیادہ سنجیدہ نظر آرہی تھی، انکا نے مجھے بتایا تھا کہ پھل خود میرے جال میں پھنسنے کو پھل رہی ہے۔ اس حسینہ دلوازا کا دل بھی ضرور دھڑک رہا ہوگا۔ میرا بیان غلط ثابت ہوتا تو اُس کی کوئی ہمدردی میرے کسی کام نہ آتی۔

سرکاری وکیل بری طرح بھنارہا تھا۔ آرتھر بھی غصے میں بیچ و تاب کھانے لگا۔ لیکن وہ نادان تھے۔ جمیل احمد خان سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ اگر انہیں علم ہوتا تو ”شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے“ کی حماقت کبھی نہ کرتے، دُور سے کترا کر نکل جاتے۔

عدالتی کارندوں نے بڑی عجلت سے کام لیا۔ لیکن اس کے بعد سب کے چہرے فق ہو گئے۔ سرکاری وکیل نے پھٹی پھٹی نظروں سے آرتھر کی سمت دیکھا تو آرتھر بھی گھبرا گیا۔ جیوری کے ممبران نے باری باری کرنی نوٹوں اور اُن کی مرتب شدہ فہرست کو دیکھا، سب ہی کی گردنیں شرم سے جھک گئیں، آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کرنی نوٹوں پر چھپے نمبروں اور فہرست میں درج شدہ نمبروں میں زمین آسمان کا فرق تھا..... غلاموں کے دیس کا ایک شخص سر بلند ہو رہا تھا، سفید فام چہرے زرد پڑ رہے تھے۔ عدالت میں سرگوشیاں ابھرنے لگیں، جج بھی انصاف کی کرسی پر کسمانے لگا۔ سرکاری وکیل سر ہٹام کر کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اُس کی وحشت دیدنی تھی، آرتھر اُس کی حالت دیکھ کر کپکپانے لگا، اپنی نظروں سے میرے بیان کی تصدیق کر لیتا تو منہ کے بل چکرا کر گر جاتا۔ میں اُن کے سٹے سٹے چہرے کو دیکھتا رہا، انکا رانی نے بل بھر میں بساط پلٹ دی، سب منہ تاپتے رہ گئے، ساری لن ترانیاں دھری کی دھری رہ گئیں، سب کو سانپ سونگھ گیا، آرتھر ہونٹوں کی طرح ایک ایک کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ جج کے حکم کے بغیر کٹہرے سے باہر نہیں آ سکتا تھا۔ دوسروں کے چہروں سے حالات کا اندازہ لگاتا رہا۔

خاصی دیر تک عدالت میں افراتفری طاری رہی، پھر جج نے آرڈر..... آرڈر کا نعرہ لگایا تو سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ جج کی شرمندگی بھی قابلِ رحم تھی۔ وہ اپنی تجاہل مٹانے کی خاطر آرتھر سے کچھ کہنا چاہتا تھا، میں نے موقع نہیں دیا، درمیان میں بول پڑا۔

”می لارڈ، میرا خیال ہے کہ معزز عدالت نے میرے بیان کی تصدیق کر لی ہوگی لیکن.....“ میں نے آرتھر کی سمت فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ ”ابھی میرے دو سوال باقی رہے“

میں ہیں۔ میں مسٹر آرتھر سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے بھری عدالت کے سامنے مجھے بتا کہ کر میری توہین کیوں کی.....؟“ میں نے اپنے مہذب لہجے میں موقع کی مناسبت سے تھوڑی سی تلخی بھی شامل کی۔ ”کیا برطانوی قانون کسی بھی اونے پونے آفسر کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ سرعام کسی معزز شہری، کسی سیاح کی پکڑی اُچھالتا پھرے.....؟ کیا سوری (SORRY) کا لفظ اسی مقصد سے ایجاد کیا گیا ہے کہ جب گردنیں شرم سے جھکنے لگیں، جب

بچاؤ کی کوئی دوسری صورت باقی نہ رہے تو سوری کہہ کر دامن بچالیا جائے اور.....“

”مسٹر دولت علی۔“ جج نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے مجھے تنبیہ کی۔ ”آپ الفاظ اور جملوں میں احتیاط سے کام لیں۔ ورنہ توہین عدالت کے مرتکب بھی ہو سکتے ہیں۔“

”سوری پورا آنر۔“ میں نے جان بوجھ کر لفظ ’سوری‘ پر زور دیا تو عدالت میں موجود ہر فرد زیر لب مسکرا دیا۔ آرتھر کسی زنجی سانپ کی طرح بار بار بل کھا رہا تھا۔ سرکاری وکیل بدستور سر پکڑے بیٹھا رہا۔

”مسٹر آرتھر.....“ میں نے پینتربدل کر گرم لوہے پر ایک اور ضرب لگائی۔ ”کیا آپ جج اور جیوری کے زور و دیہ ثابت کرنے کی زحمت گوارا کریں گے کہ میرا ایک ہاتھ مصنوعی ہے؟“

”اس حقیقت کو ثابت کرنے کی خاطر کسی ڈاکٹر یا سرجن کی ضرورت ہوگی۔“ آرتھر نے وقت حاصل کرنے کی خاطر بہانہ کیا۔

اسی لمحے انکا میرے سر پر آگئی۔ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”جمیل..... یہ کیا حماقت کر رہے ہو؟ میرا مشورہ غور سے سنو۔ اپنا مطالبہ واپس لے لو ورنہ جیتی ہوئی بازی ہار جاؤ گے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اپنی حدود میں رہ کر وہ کام بھی انجام دے سکتی ہوں جو کسی کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میری وجہ سے ایک ہاتھ سے محروم ہونا پڑا۔“ انکا کی آواز بھرا گئی۔ ”میں تم سے ہمیشہ شرمندہ رہوں گی جمیل۔ لیکن تمہارا ہاتھ دوبارہ اصل حالت میں لانا میرے اختیار میں نہیں ہے.....“

انکا مجھے روکتی رہی، میں نے اُس کی بات ایک کان سے سنی، دوسرے سے اڑا دی۔ وہ جھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی، اپنے تیز پنجوں کی چھین سے مجھے قابو کرنا چاہا تو میں نے جلدی سے کہا۔

”نہیں انکا رانی۔ نہیں..... اس وقت میرے ذہن کو معطل نہ کرنا۔ میں جو کچھ کر رہا



ہوں، کہہ رہا ہوں اس میں پورے ہوش و حواس کا دخل شامل ہے۔ تم بھی خاموشی سے تماشہ دیکھتی رہو۔“

”جلیل.....“ انکا نے تمللا کر کہا۔ ”تم سمجھ رہے ہو، میں کیا کہہ رہی ہوں؟ تمہارا بابا یاں ہاتھ مصنوعی ہے، اس میں زندگی کی حرارت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔“

جج نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر اگلی پیشی کا اعلان کر کے گلو خلاصی کرنی چاہی لیکن مورینا کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا، اُس کے تیور میں کڑنگی نظر آرہی تھی۔ میری رہائی یا عمر قید کی سزا سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ نسلی تعصب کا شکار ضرور نظر آ رہا تھا۔ اُس نے با آواز بلند عدالت کو اپنی خدمات پیش کرنے کی پیشکش کی۔ اُس کے لہجے سے غرور و تکبر جھلک رہا تھا۔

”مائی لارڈ میں ایک مستند اور معروف سرجن ہوں۔ میرا نام سرجن اسٹیورڈ جیمز ہے جس کی تصدیق عدالتی ریکارڈ اور میرے ساتھ موجود جیوری کے ایک دو ممبران سے بھی کی جاسکتی ہے۔“ وہ مجھ پر اپنی قابلیت کا سکھ جمانے کی خاطر کہہ رہا تھا۔ ”سرجری کے میدان میں ابھی تک کوئی ایسی ایجاد نہیں ہوئی جو کسی ٹوٹے ہوئے یا مصنوعی ہاتھ کو اصل کی طرح ظاہر کر سکے۔ سرجری کے نشانات بذات خود ایسا ثبوت ہیں جو ہلکے اور مدہم پڑنے کے باوجود مرتے دم تک انسانی جسم پر ضرور باقی رہتے ہیں۔ اگر عدالت اجازت دے تو میں دولت علی کا معائنہ کر کے محض دو منٹ میں ان کے بیان کی صحت کی تردید یا تصدیق کر سکتا ہوں۔“

”تم نے سنا جلیل صاحب.....“ انکا پھر پٹپٹانے لگی۔ اُس کی تشویش بچا نہیں تھی۔ ”سرجن اسٹیورڈ جیمز کیا دعویٰ کر رہا ہے؟ اس کا شمار چوٹی کے سرجنوں میں ہوتا ہے۔ چھوٹے موٹے مریض اس کی فیس سن کر ہی اپنا راستہ بدل دیتے ہیں۔ یہ کئی کارنامے انجام دے چکا ہے، بڑے بڑے لارڈ اس کی کمپنی میں نشست و برخاست کو اپنے لئے کما بڑے اعزاز سے کم نہیں سمجھتے۔“ انکا مجھے ہاتھ نچانچا کر سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ ”میں وقتی طور پر اس کا ذہن پلٹ کر جہارے حق میں بدلنے پر مجبور کر سکتی ہوں۔ لیکن اگر آرتھر تمہارا مصنوعی ہاتھ دیکھ چکا ہے تو آخری دم تک اپنی ہار قبول نہیں کرے گا..... بات بڑھ جائے گی۔“

میں انکا کی باتوں پر مسکراتا رہا، وہ بیچ و تاب کھاتی رہی۔ مجھے یقین تھا کہ انکارانی کے لئے بھی وہ لمحے یادگار ثابت ہوں گے جب وہ میرے ہاتھ کو حرکت کرتے دیکھے گی۔ سرجن

اسٹیورڈ میرے بیان کی تصدیق کرے گا تو آرتھر بھی دم بخود رہ جائے گا۔ سرکاری وکیل جو ابھی تک سر قہائے بیٹھا نوٹوں کے نمبروں اور فہرست کے تضاد پر اُلجھ رہا تھا شاید میرے ہاتھ کے اصلی ہونے کی تصدیق میں سرجن کے منہ سے ادا ہونے والا جملہ سن کر اپنا سر پیٹنا شروع کر دیتا۔ آرتھر کھڑے کھڑے کٹہرے میں حیرت سے ڈھیر ہو جاتا۔

عدالت نے سرجن اسٹیورڈ جیمز کی پیشکش قبول کر لی۔ انکا ہنسا کر رہ گئی۔ اُس نے میرے سر سے اترنا چاہا، میں نے اُسے اپنی قسم دلائی تو دھم سے سر پر بیٹھ گئی، مجھے تیز نظروں سے گھورنے لگی۔

سرجن سینہ تانے قدم بڑھاتا میرے کٹہرے کے قریب آ گیا۔ سرکاری وکیل نے بڑا امید نظروں سے سرجن کی سمت دیکھا، آرتھر کی نگاہوں میں بھی کامیابی کی کرنیں ٹٹمنانے لگیں۔ میں نے دیدہ و دانستہ وحشت اور جھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ایک ہی جھٹکے میں گریبان میں سیدھا ہاتھ ڈال کر قمیض کو ’جھڑے پھاڑ کر جسم سے علیحدہ کر دیا۔ سب سے پہلے انکا پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوئی۔ اُس نے اپنی دُور بین نظروں سے میرے ہاتھ کا جائزہ لیا، پھر خوشی سے اُچھل کر میرے بالوں کے درمیان دیوانہ وار تانچنے لگی۔ ہيجان انگیز انداز میں کوہلے مٹکانے لگی، اُس کی مسرت دیدنی تھی۔

آرتھر کو سکنتہ ہو گیا، اُس کی پلکوں نے جھپکنا بند کر دیا، دیدے پھٹے کے پھٹے رہ گئے، سرکاری وکیل کی حالت بھی آرتھر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ جیوری کے ممبران میری جرات پر پہلو بد لئے۔ صرف مورینا کے ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ میں نے جب اپنے بائیں ہاتھ کو حرکت دے کر سرجن کے سامنے فضا میں بلند کیا تو وہ بھی ششدر رہ گیا۔ خود میں بھی اپنے آپ کو ”طلسم ہوش رہا“ کا ایک فرضی کردار سمجھ رہا تھا۔ میرے ہاتھ پر کسی زخم، کسی معمولی خراش کا بھی کوئی نشان موجود نہیں تھا۔ میں نے بشکل اپنی حیرت کو ضبط کیا، پریم لال مہاراج کی مہان ہنستی کا اندازہ مجھے پہلی بار ہوا۔ جو کام انکا کے اختیار سے باہر تھا، وہ پریم لال کی آتما نے اپنی استخوانی اُگلیوں سے سرانجام دے ڈالا۔ مجھے اس وقت اپنی کلد پ بھی بڑی شدت سے یاد آئی۔ وہ میری خاطر کالی کے قدموں میں اپنی زندگی کی قربانی پیش نہ کرتی تو پریم لال کی رفاقت اُسے بھی کندھ بنا دیتی۔ میں متضاد کیفیتوں سے دوچار تھا جب سرجن اسٹیورڈ نے بہت غور و خوض کے بعد

ہوٹل کی انتظامیہ نے مجھے دوبارہ قیام سے روکنے کی کوشش کی۔ وہ ہوٹل کی بدنامی سے ڈرتے تھے۔ لیکن انہیں میرے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ عدالت نے میری شخصی ضمانت قبول کر لی تھی، وہ عدالت کے حکم کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے، سچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ انکا نے ہوٹل کے جنرل منیجر کو سبق دینا چاہا، میں اسے روک دیا۔ میری صرف ضمانت ہوئی تھی، کیس ختم نہیں ہوا تھا۔ میں نے فوری طور پر دنگا فساد کرنے سے گریز کیا۔ شام کو جم، سارا، ولیم اور جین بھی آ گئے۔ جم کو میری ضمانت کی خوشی تھی لیکن وہ میرے سابقہ رویے پر کچھ خفا تھا۔ سارا اور جین نے مجھے مبارکباد پیش کی، ولیم خاموش بیٹھا ہماری باتیں سنتا رہا۔

”جیل.....“ انکا نے مجھے آگاہ کیا۔ ”جم تم سے مارٹن کے سلسلے میں بات کرنے پر غور کر رہا ہے۔ تم اُسے ٹال دینا، ورنہ جیل کا نام سامنے آ جائے گا۔“

”کیا تم اُسے اس موضوع پر گفتگو کرنے سے روک نہیں سکتیں؟“

”میں کیا کچھ کر سکتی ہوں اس کا علم تمہیں کچھ دیر میں ہو جائے گا۔“ وہ رینگتی ہوئی میرے سر سے اتر گئی، میں نے اُسے روکا نہیں۔

”مجھے اپنے ذرائع سے عدالت کی پوری کارروائی کا علم ہو چکا ہے۔“ جین نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ آرتھر جیسے ذمہ دار آفسر نے تمہارے خلاف غلط کیس بنانے کی کوشش کیوں کی؟ خاص طور پر تمہارے کئے ہوئے ہاتھ کے سلسلے میں سرجن اسٹیورڈ جیمز کی تصدیق نے مجھے حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ اُس کا شمار برطانیہ کے چوٹی کے سرجنوں میں ہوتا ہے۔ مجھے بتاؤ دولت علی، یہ سب کیسے ممکن ہوا.....؟“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ میری ماورائی قوتیں چمن گئی ہیں۔“ میں نے جم کی وجہ سے غلط انداز اختیار کیا۔ ”میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں نے تمہیں یہ بھی باور کرایا تھا کہ میری

بڑے یقین سے اس بات کا اعلان کیا کہ میرے ہاتھ کی سرجری کبھی عمل میں نہیں آئی۔ اُس نے احتیاطاً میرے سیدھے ہاتھ کا بھی معائنہ کیا، پھر عدالت کی درخواست پر تحریری رپورٹ بھی لکھ دی۔ جج کی شش و پنج قابل دید تھی۔ اُس نے مجھے تیسرے سوال کا موقع دینے سے گریز کیا اور اگلی پیشی کا اعلان کر دیا۔ عدالت درخواست کر کے جیمبر کی سوت جانے لگا تو میں نے جرأت سے کام لے کر درخواست کی۔

”می لارڈ، آپ نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دی ہے۔ کیا مجھے بے قصور ہونے کے باوجود سات روز تک لاک اپ میں سلاخوں کے پیچھے رہنا ہوگا؟“

جج رُک گیا۔ اُس نے پہلی بار مجھے تحارت سے گھورا۔ میں شاید پہلا مجرم تھا جس نے عدالت درخواست ہونے کے بعد بولنے کی جسارت کی تھی۔ انکا موقع کی نزاکت بھانپ کر تیزی سے سر سے اتر گئی، جج کی قہر آلود نظروں میں ہل بھر میں ہمدردی کا رنگ گہرا ہونے لگا۔ انکا اُس کے سر پر تسلط جما چکی تھی۔

”مسٹر دولت علی۔“ اُس نے نرم آواز میں سوال کیا۔ ”کیا تم کوئی ضمانت پیش کر سکتے ہو؟“

”آپ بھی اس بات کے گواہ ہیں یور آنرز کہ مجھ کو بلاوجہ پھنسیا گیا ہے۔ سرکاری وکیل اور مسٹر آرتھر ابھی تک کسی بات کو ثابت نہیں کر سکے، نوٹوں کے نمبروں کا غلط اندراج، میرے ایک ہاتھ کا کٹنا ہونا، یہ میرے خلاف گھناؤنی سازشیں تھیں، جیوری کے ممبران بھی گواہ ہیں کہ میں نے ثابت کر دیا کہ.....“

”مسٹر آرتھر۔“ جج نے میری بات کاٹ کر آرتھر کی سمت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

”کیا آپ کو ملزم کی شخصی ضمانت پر رہائی پر کوئی اعتراض ہوگا.....؟“

”جج..... جی..... جی..... نہیں۔“ آرتھر نے ہکلاتے ہوئے جملہ ادا کیا۔ وہ بازی ہار چکا تھا، کوئی عذر نہ کر سکا۔

میری شخصی ضمانت منظور ہو گئی۔ سب حیران رہ گئے..... آرتھر ہونٹ کاٹا رہ گیا۔ میں نے ضمانت کے کاغذات کی خانہ بدی کی، پھر قدم اٹھا تا عدالت سے باہر آ گیا۔ سب ہی کی نظریں مجھ پر لگی تھیں۔ میں فاتحانہ انداز میں احاطے کے پچانگ کی سمت قدم بڑھانے لگا۔



تو تین کسی وقت مجھے واپس بھی مل سکتی ہیں۔ میری قسمت اچھی تھی جو بروقت میرے اندر ایک لہر دوڑ گئی اور سرجن اسٹیورڈ جیسے ماہر کی نظریں بھی دھوکہ کھا گئیں۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ جم کسمانے لگا۔ ”کیا سرجن نے تمہارے ہاتھ کا معائنہ نہیں کیا؟“

”تم شاید جرم سائنسدان کے اغوا کے حیرت انگیز اور تاریخ ساز واقعہ کو بھول گئے ہو۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ جم لا جواب ہو گیا۔ لیکن اُس کی نگاہیں یلکھتے چپکنے لگیں، مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”گویا اب کھوئی ہوئی طاقتیں تمہیں واپس مل چکی ہیں؟“

”ہاں.....“ میں نے تھوڑے توقف سے جواب دیا۔

”گڈ.....“ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر میرے صوفے پر آ گیا۔ ”تمہیں ایک کیس میں میری مدد کرنی ہوگی۔“ جم نے بڑے جوش لہجے میں کہا، پھر مارٹینا کے قتل اور جیکب کے سلسلے میں پوری روداد شروع سے آخر تک دہراتا چلا گیا۔

جیکب اور مارٹینا کے ذکر پر جین اور ولیم دونوں پہلو بدلنے لگے۔ میں نے جم کی بات کا فوری جواب نہیں دیا، آنکھیں بند کر کے کوئی ایسا راستہ اختیار کرنے کے بارے میں غور کرنے لگا جو جم کو بھی مطمئن کر دیتا، جین اور ولیم کی بے چینی بھی دور ہو جاتی۔ میں کچھ دیر سوچوں میں مستغرق رہا، پھر آنکھیں کھول کر جم کو سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

”میرا ایک مشورہ قبول کرو گے.....؟“

”کیا.....؟“ جم نے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

”مارٹینا کی کیس فائل بند کر دو۔“ میں نے خلاء میں گھورتے ہوئے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”میں محسوس کر رہا ہوں کہ اگر تم نے اس شخص کے بارے میں زیادہ چھان بین کی جسے تم نے جیکب کی حیثیت سے شناخت کیا تھا تو نادیہ شیطانی قوتیں تمہارا جینا دہر کر دیں گی۔ میں بھی تفصیل میں جانے کی غلطی نہیں کروں گا، فی الحال صرف یہ بتا سکتا ہوں تمہیں جس شخص پر جیکب کا گمان ہے وہ جیکب نہیں، ایک بھگتی ہوئی بدروح تھی جو مارٹینا سے انتقام لینا چاہتی تھی..... مجھے افسوس ہے، میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”وہ روح تھی تو ہڈیوں کے پنجر کی شکل میں بھی کیوں باقی رہی؟“ جم نے وکیلوں کی طرح جرح کی۔ ”اگر وہ جیکب کی شکل و صورت اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی تو مکمل طور پر غائب بھی ہو سکتی تھی۔“

”میرا کہا مان لو جم.....“ میں نے اُسے اپنے لب و لہجے سے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ ”تم ہمارا قاتلوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ میری نظریں جو دیکھ چکی ہیں اس پر اعتبار کر لو۔ جتنا کریدو گے، بات اتنی ہی پیچیدہ ہوتی جائے گی۔“

”میں تمہارے حیرت انگیز کارناموں کا چشم دید گواہ ہوں۔“ جم نے تھوڑے توقف سے کہا۔ ”میں تمہارا مشورہ قبول کر لوں گا لیکن ایک شرط پر..... تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ جیکب کہاں گیا؟ جب تک مجھے اُس کا کوئی ٹریس (TRACE) نہیں ملتا، اُس کی شخصیت میرے ذہن میں کلبلائی رہے گی۔“

”تم دولت علی کے سمجھانے کے باوجود اس بات پر کیوں بضد ہو کہ مارٹینا کے مرڈر میں جیکب ہی کا ہاتھ ہے؟“ جین نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے دلیل پیش کی۔ ”اگر تمہارے شے کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ جیکب کو میرے پاس ملازمت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا وہ براہ راست اپنا انتقام نہیں لے سکتا تھا؟“

”یہی سوالات مجھے بھی پریشان کر رہے ہیں۔“ جم اُلکھتے ہوئے بولا۔ ”کیس فائل بند کرنے کے لئے ہمیں کوئی نہ کوئی معقول وجہ تو بہر حال بتانی ہوگی۔“

”جم، میں تمہاری ذہنی کیفیت محسوس کر رہا ہوں۔“ میں نے پہلو بدل کر کہا۔ ”دنیا میں ایسے بے شمار حیرت انگیز، پراسرار اور ناقابل یقین واقعات رونما ہو چکے ہیں جن کے بارے میں آج تک کوئی توجیہ نہیں پیش کی جاسکی۔ بڑے بڑے ماہرین، سائنسدان اور عالم وقت بھی بغلیں جھانکتے رہ گئے۔ پراسرار علوم سے متعلق دانشوروں کا مشورہ یہی ہے کہ ایسے معاملات کی چھان بین سے گریز کیا جائے۔ ورنہ حالات اور سنگین صورت اختیار کر لیتے ہیں۔“

”میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ لیکن مارٹینا کے کیس میں یہ سوال بہر حال باقی رہ جاتا ہے کہ جیکب ملازمت چھوڑنے کے بعد کہاں روپوش ہو گیا؟“

”کیا تم کاغذات میں کہیں جیکب کا حوالہ دے چکے ہو.....؟“ میں نے اپنی تسلی کی خاطر دریافت کیا۔

”نہیں۔ لیکن میں ذاتی طور پر اُس وقت تک مطمئن نہیں ہوں گا جب تک جیکب کا کوئی سراغ نہ مل جائے۔“ جم نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”میں نے اُسے بذات خود مارٹینا کی لاش

کے پاس دیکھا تھا، میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میری نظروں نے دھوکہ نہیں کھایا۔“  
 جم ایک ذہین آفیسر تھا۔ وہ جو کہہ رہا تھا وہ غلط بھی نہیں تھا۔ یہ بات صرف میرے علم میں تھی کہ انکا کی لازوال قوتوں نے جین کو قانونی الجھنوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر جبکہ کو ہڈیوں کے بنجر میں تبدیل کر دیا تھا۔ میں جم کو کسی طرح مطمئن کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، میں نے ریسپورڈ اٹھالیا۔ کال جم کے دفتر سے کی گئی تھی۔ کوئی ماتحت جم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ریسپورڈ جم کی طرف بڑھا دیا۔  
 ”دولت علی۔“ سارا نے مجھے مخاطب کیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اگلی پیشی پر تم باعزت طور پر رہا کر دیئے جاؤ گے۔ جم بھی یہی کہہ رہا تھا۔“

”اس کے بعد ہم تمہاری صحت اور رہائش کا جشن ایک ساتھ منائیں گے۔“ جین نے بڑے خلوص سے کہا۔ ”تمہارے پاس آنے سے پیشتر میں اور ولیم راستے میں یہی پروگرام بنارہے تھے۔“

میرے دل پر ایک گھونسلہ لگا۔ میں کسمسا کر رہ گیا۔ انکا کی کوششوں نے جین اور جم کو ایک دوسرے سے خاصا قریب کر دیا تھا۔ لیکن میرے دل کے کسی گوشے میں جین کے ساتھ گزارے ہوئے تھنہ لحوں کی کچھ حسین یادیں باقی تھیں، سارا نے بھی جین کے جملے سے کچھ اندازے قائم کر کے اُسے چونک کر دیکھا، میں سارا کی توجہ بٹانے کی خاطر بول پڑا۔

”تمہیں یاد ہے سارا؟ میں نے رابرٹ کو بے نقاب کرنے کی خاطر کس طرح اُس سراغ رساں کے جسم میں تمہارے ڈیڈ لارڈ اسمتھ کی روح کو طلب کر کے گلو خلاصی حاصل کی تھی جو مجھ پر قاتل ہونے کا شک کر رہا تھا۔ اگر رابرٹ کی جیب سے زہر کی شیشی اور تمہاری طومرہ لڑی کے سوٹ کیس سے دو سو پونڈ دستیاب نہ ہوتے تو شاید میں پھانسی پر لٹک چکا ہوتا۔“  
 سارا کوئی جواب دینا چاہتی تھی کہ جم جو کچھ دُور کھڑا فون پر بات کر رہا تھا، بوکھلا ہوا درمیان میں آ گیا۔ اُس نے یقیناً کوئی ایسی خبر سنی تھی جس نے اُس کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔ وہ بری طرح زروس دکھائی دے رہا تھا۔ سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”دولت علی.....“ اُس نے مُردہ سی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ ”تم نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر میں نے مارٹینا کے کیس میں زیادہ چھان بین کی تو نادریدہ قوتیں میرا جینا دوبھر کر دیں گی۔“ اُس نے پریشانی کے عالم میں بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اپنی بات

جاری رکھی۔ ”ابھی فون پر میرے ماتحت نے اطلاع دی ہے کہ ہڈیوں کا بنجر جو ہماری تحویل میں تھا وہ بھی فرار ہو گیا.....“

”فرار ہو گیا.....؟“ جین نے حیرت سے وضاحت طلب کی۔ ”یہ تم کیسی عجیب بات کر رہے ہو؟ تم سے یقیناً سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔ ورنہ فرار ہونے والی بات.....“

”نہیں.....“ جم نے دیوانوں جیسے انداز میں جین کا جملہ کاٹ کر کہا۔ ”نہجمن مجھ سے اس قسم کا گھٹیا اور بیہودہ مذاق کرنے کی جسارت کبھی نہیں کر سکتا۔ جانتی ہو اُس نے فون پر مجھے کیا اطلاع دی ہے؟“

”کیا کہا ہے نہجمن نے.....؟“ جین اور سارا نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

”ہڈیوں کا وہ بنجر اچانک زندہ انسانوں کی طرح اُٹھ کر ٹھٹھا ہوا دفتر سے باہر چلا گیا، دفتر میں موجود عملہ اُسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتا رہا۔ باہر گیٹ پر تعینات ایک مسلح گارڈ نے جرات سے کام لے کر اُسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس وقت ہسپتال میں موجود ہے۔ دوسرے گارڈ کا بیان ہے کہ ہڈیوں کے اس ڈھانچے نے گارڈ کی مداخلت پر برہم ہو کر اتنی شدت سے ہاتھ گھما کر حملہ کیا تھا کہ اُس کے گال پر گہرا زخم پڑ گیا۔ تین دانت بھی ضائع ہو گئے۔“ جم نے وحشت کے عالم میں سلسلہ کلام جاری رکھا۔ نہجمن اس وقت زخمی گارڈ کے ساتھ ہسپتال میں موجود ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ آفس کے باہر سڑک پر گزرتے ہوئے راہگیروں نے کسی ڈھانچے کو نہیں دیکھا۔ نہجمن نے قرب و جوار میں واقع دکانداروں سے بھی تصدیق کر لی، کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ہمیں فوراً ہسپتال پہنچنا ہوگا۔“

جم بات گھل کر کے تیزی سے دروازے کی جانب لپکا۔ سارا اور جین بھی بوکھلائے ہوئے انداز میں جم کے تعاقب میں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ولیم نے بھی رُکنا مناسب نہیں سمجھا۔ جاتے جاتے اُس نے ایک سرسری نظر جھجھ پر ڈالی لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ میں بھی ایک لمحے کو دم بخود رہ گیا۔ پھر میرے ذہن میں انکا کا کہا ہوا جملہ گونجنے لگا.....

”میں کیا کچھ کر سکتی ہوں، اس کا علم تمہیں کچھ دیر میں ہو جائے گا۔“

میں اُٹھ کر کمرے میں ٹھہرنے لگا۔ انکا کی قوت کا وہ انوکھا کرشمہ میری معلومات میں ایک خوشگوار اضافہ تھا۔ میں بے چینی نے اُس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا، وقت گزرتا رہا۔ رات کا کھانا میں نے اپنے کمرے میں ہی کھالیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور کہیں اُلجھ گئی ہوگی ورنہ

سے ایک اشارے پر اپنی جان بھی بھینٹ دینے کو ہر دم تیار رہتے ہیں۔“

”پنڈت نول کشور؟“ میں نے اپنے ذہن کو ٹٹولا۔ ”میں یہ نام پہلی بار سن رہا ہوں۔“

”ہاں۔ پہلے وہ زیادہ مشہور نہیں تھا۔ لیکن کالی کے مندر کا پروہت ہونے کی وجہ سے اس نے بہت جلد شہرت کے ساتھ ساتھ ایک اُنچا مقام حاصل کر لیا ہے۔ کالی اس پر بہت زیادہ مہربان ہے، بڑا کمینہ، خصلت، عیار اور خطرناک آدمی ہے۔ اتنا خطرناک کہ اس سے زیادہ عمر کے پنڈت پجاری بھی اُس کے سامنے زبان کھولتے ڈرتے ہیں۔ حکومتی مشینری کے سربراہ آروہ عہدیدار بھی اُس کی کسی بات کی مخالفت کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ تم جبک کے استخوانی بنجر کا قصہ پاک کرنے کی خاطر میرے سر

سے اتری تھیں۔“ میں نے لا پرواہی کا مظاہرہ کیا۔ ”کیا رہا.....؟“

”جب تم سب کچھ جم کی زبانی سن چکے ہو تو مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہو.....؟“ وہ آہستہ پالٹی مار کر میرے سر پر بیٹھ گئی۔

”میری معلومات میں تمہاری حیرت انگیز صلاحیتوں کے ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔“ میں مسکرا کر بولا۔ ”ہڈیوں کا ایک بنجر پولیس کی تحویل سے نکل کر بھاگا، سر اسراروں کے اعلیٰ دماغ معطل ہو گئے، ایک گارڈ شدید زخمی، اپنے تین دانت گنوا بیٹھا، دوسرے گارڈ کی ہتلون خوف سے زرد ہو گئی، متاثرہ علاقے میں سخت خوف و ہراس، پولیس کے مسلح دستے شہر میں گشت لگاتے پھر رہے ہیں، تمام ہوائی اڈوں پر تعینات سیکورٹی کے عملے کوریڈ الرٹ کا سگنل، شہر کے وسطی علاقے میں ایک ریٹائرڈ فوجی افسر کا حیرت انگیز بیان، اُس نے ایک انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے کو فضا میں دو سو فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے دیکھا، پہلی نظر میں وہ یہی سمجھا تھا کہ سائنسدانوں نے نئی ساخت کا لٹا کا طیارہ ایجاد کیا ہے، ایک خاکروب نے ہڈیوں کے بنجر کو بیت اللہ کی عقبی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے دیکھا تو دہشت سے اُس کا ہارٹ فیل ہو گیا، شہر میں افراتفری، صاحب اقتدار لوگ سر جوڑے بیٹھے عوام کی بہتر خدمت پر غور و خوض کر رہے ہیں، وزیر داخلہ نے اس واقعہ کا سخت نوٹس لیا ہے، ایک پولیس کانفرنس کے دوران انہوں نے حسب معمول بڑے ٹھوس اور دجنگ لہجے میں کہا کہ طرم کو کیفر کردار تک پہنچانے میں حکومت کسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرے گی، قانون شکنی اور دہشت گردی میں ملوث افراد سے آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے گا، اخباری نمائندوں نے

واپسی میں اتنی دیر نہ لگائی۔

میں نے وقت گزارنے کی خاطر میلبا کو طلب کیا۔ وہ سہمی سمٹی کمرے میں داخل ہوئی۔ عدالت میں گواہی دینے کے بعد شاید وہ مجھ سے خوفزدہ تھی، اُس کے چہرے پر شادابی و تروتازگی کی بجائے سنجیدگی مسلط تھی۔ اس کیفیت میں بھی وہ حسین نظر آ رہی تھی۔

”میں معذرت خواہ ہوں سر۔“ اُس نے مدہم اور معصوم لہجے میں صفائی پیش کی۔ ”اگر میں گواہی نہ دیتی تو ہوٹل کی انتظامیہ مجھے برطرف کر دیتی، پولیس کے افسران اور کارندے کبھی میرا پیچھا نہ چھوڑتے۔ میں..... بڑی مصیبت میں.....“

”جو ہو چکا اُسے خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔“ میں نے فیاضی کا ثبوت پیش کرنے کی خاطر اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ اُسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ میں نے پیش قدمی کی، آگے بڑھ کر اُس کے سہمے ہوئے حسن کو بانہوں میں سمیٹا تو اُس کے چہرے کی رنگت نکھرنے لگی۔ وہ ذہین بھی تھی اور تجربہ کار بھی۔ پہلے بھی ایک بار میزبانی کے خاص فرائض کے نازک مرحلے سے گزر چکی تھی.....!!

رات میں کس وقت سویا مجھے یاد نہیں۔ دوبارہ انکا کے بچوں کی تیز جبین سے میری آنکھ کھلی تو رات کے تین بج رہے تھے۔ میلبا میرے پہلو میں بکھری پڑی تھی۔ میں نے انکا کی طرف دیکھا، وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ تیور بتا رہے تھے کہ اُس کے پاس میرے لئے کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ میں نے کوئی سوال نہیں کیا، کچھ دیر خاموشی کے بعد اُس نے خود ہی کہا۔

”جیل۔ ہمیں ہندوستان واپسی کے لئے اب اپنا رخت سفر باندھنے میں جلدی کرنی پڑے گی۔“

”کوئی نئی اطلاع.....؟“

”ہاں.....“ انکا نے ہونٹ کاٹتے ہوئے پُر خیال انداز میں جواب دیا۔ ”ہر دوار میں بارہ برس بعد ہونے والا کبھ کا میلہ پورے زور و شور سے جاری ہے، ہندوستان کے تمام بڑے پنڈت اور پجاری دُور دُور سے میلے میں شرکت کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ اُن میں ہر دوار میں واقع کالی کے بڑے مندر کا مہان پجاری پنڈت نول کشور بھی شامل ہے جو آج کل بڑی تیزی سے سر اُبھار رہا ہے۔ ہزاروں پنڈت اور پجاری اُس کے چیلے ہیں جو اُس



جب وزیر موصوف کو بتایا کہ بات کسی دہشت گرد یا اجتماعی زیادتی میں ملوث کسی فرد کی نہیں بلکہ انسانی ہڈیوں کے پراسرار پنجر کی ہے تو انہوں نے ڈاؤس پر رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھایا، تیزی سے غناغٹ پانی پیا، پھر کانفرنس کو اگلے روز پر ملتوی کر کے واپس چلے گئے۔ دو گھنٹے بعد موصوف نے پولیس کے سربراہ کو اپنے دفتر میں طلب کر کے نادر شاہی حکم دیا کہ مجرم خواہ کوئی بھی ہو، اُسے بلا رعایت چوبیس گھنٹوں کے اندر گرفتار کیا جائے..... اگلے چوبیس گھنٹوں میں پنجر سے متعلق نہایت اہم اور سنسنی خیز اطلاعات متوقع ہیں۔“ میں نے زندہ دلی کا ثبوت دینے کی خاطر بائیں آنکھ دبا کر انکا سے کہا۔ ”اگر کل کے اخبارات میں اس قسم کی چھوٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ تمہاری اعلیٰ کارکردگی کا ذکر آجائے تو تم راتوں رات عالمی شہرت حاصل کر لوگی، پورے لندن میں تمہارے نام کا ڈنکا بجا شروع ہو جائے گا۔ بڑے بڑے پوسٹر نمایاں شاہراہوں پر اونچی اونچی بلڈنگوں پر لگے نظر آئیں گے۔ ہر زبان پر ایک ہی نام ہوگا..... انکارانی..... انکارانی..... انکارانی۔“

میری باتوں سے انکا کے چہرے کی سنجیدگی کا فور ہو گئی، خوشیاں مچنے لگیں۔

”میں یہی چاہتی ہوں جمیل۔ کہ تم ہمیشہ اسی طرح چبکتے رہو۔“ اُس نے والہانہ نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بہت دکھ جھیلے ہیں، بڑے صدمے برداشت کئے ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو اُس کا دل پھٹ جاتا۔ وقت نے تمہیں کبھی دو گھڑی آرام سے بیٹھنے کی فرصت نہیں دی۔ ایک ایک کر کے سب تمہارا ساتھ چھوڑ گئے، میری وجہ سے تمہیں اپنے ایک ہاتھ سے.....“ انکا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا، چونک کر بولی۔ ”تم نے ابھی تک مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ تمہارا ہاتھ کس طرح ٹھیک ہوا؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے اُسے گھورا۔ ”کیا میں نے جو قوتیں حاصل کی ہیں“ میرے کسی کام نہیں آسکتیں؟“

”کھلمپ یا پرتیم لال مہاراج.....؟“ انکا نے بڑی خوبصورتی سے میری بات ٹالنے ہوئے دریافت کیا۔

”پرتیم لال۔“ میں نے عقیدت سے جواب دیا۔  
”ہاں، مہاراج کی فحقی اپرم پار ہے، کھلمپ زندہ ہوتی تو مہاراج اُسے بھی آکاش کی بلندیوں سے اس پار پہنچا دیتے۔“

کھلمپ کا نام سن کر ماضی کی یادوں نے سر اُبھارتو میرے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ انکا کو غلطی کا احساس ہوا تو جلدی سے موضوع بدلنے کی خاطر میلبا کے بکھرے ہوئے جسم اور بے ترتیب لباس کی سمت اشارہ کر کے بولی۔

”اے اٹھا کر دفغان کر دجیل۔ مجھے تمہاری یہ بے شرمی اب ایک آنکھ نہیں بھاتی۔“

”یہ راستے بھی تم ہی نے دکھائے ہیں انکارانی۔“ میں نے ماضی کے جھروکوں میں جھانکا۔ ”تمہیں وہ دن یاد ہیں جب میں اپنے وطن اور والدین سے دور ایک بلڈنگ کے معمولی فلیٹ میں رہتا تھا، سوا سو روپے ماہانہ تنخواہ کی خاطر ایک دفتر میں کلرک کرتا تھا، بھوک لگتی تو کسی سستے سے ہوٹل میں جا کر کھانا کھا لیتا، چائے کی خواہش ہوتی تو فلیٹ پر اپنے ہاتھ سے تیار کر لیتا، رام دیال کی ماں نے سب سے پہلے مجھے تمہیں حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے انکار کر دیا، زندگی بڑے سکون اور آرام سے بسر ہو رہی تھی۔ میں راتوں رات کروڑ پتی بننے کا قائل نہیں تھا۔ لیکن تم نے..... ہاں انکارانی، تم نے از خود میرے سر پر قبضہ جمالیا، تمہارے ہی کہنے پر میں نے اُس موٹے کرچین افسر کا سر پھاڑ دیا جس نے دفتر لیٹ پہنچنے پر مجھے سخت سست کہا اور ملازمت سے برطرف کر دیا تھا۔ میں کوئی اور ملازمت ڈھونڈ لیتا مگر تم نے مجھے اپنے اشاروں پر ناپچنے کو مجبور کر دیا، تم اپنے نوکیلے بچوں کی تیز چھین سے میرے اعصاب پر قبضہ جمالیتی تھیں، میں تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔“ میں نے ایک طویل سانس لے کر بات جاری رکھی۔ ”ایک بار میں نے بڑی عاجزی سے درخواست کی تھی کہ اپنے لئے کسی اور کا انتخاب کر لو۔ تم نے سرد لہجے میں میری التجا رد کر دی۔ اس کے بعد ہماری رفاقت بدھتی گئی۔ دولت اور شہرت ہر انسان کی بنیادی کمزوری ہے۔ تم نے مجھے فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا، میں نے بھی ہواؤں میں اڑنے کا ڈھنگ سیکھ لیا۔ یہ سب تمہاری ہی نوازشیں ہیں۔“

میں نے ایک لمحے کو خاموش ہو کر انکا کے چہرے کے بدلنے والے تاثرات کا جائزہ لیا، پھر بے تکلفی سے بولا۔ ”تمہیں ایک بات بتاؤں انکارانی، جب تم میرے سر پر آئی تھیں اُس وقت میں نے اپنے ذہن کے کیٹوس پر ایک ڈیڑھ بالشت کی لڑکی کی خیالی تصویر بنائی تھی، نازک، حسین، خوبصورت ناک نقشے والی، اُس کے چہرے پر ہلا کا حسن تھا، اُس کے گلاب کی پتھریوں جیسے نازک ہونٹوں پر مسکراہٹیں رقص کرتی تھیں، جمیل جیسی نیلی آنکھوں میں

کنول تیرتے نظر آتے، اُس کا گفتگو کا انداز بڑا دلبرانہ ہوتا، وہ مجھے عالم تصور میں بڑی شرمیلی شرمیلی، بھولی بھالی اور معصوم معصوم سی نظر آتی تھی لیکن.....“

”لیکن کیا جمیل؟“ انکا نے پیمان انگیز انگڑائی لے کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ سنی بھرے انداز میں بولی۔ ”کیا اب میں کسی سے کم ہوں؟ ایمان سے کہنا۔“ تمہیں میری قسم۔“ میں جواب میں مسکرا دیا۔ میلا کسمانے لگی۔ اُس نے خوابیدہ انداز میں مجھے ہاتھ بڑھا کر دوبارہ قریب کھینچنے کی کوشش کی، رات اُس نے کچھ زیادہ پی لی تھی جس کا خمار ابھی تک ذہن پر طاری تھا۔ انکا لال پیلی ہو گئی۔

”جمیل، اسے گھٹیت کر کرے سے باہر پھینک آؤ۔ ورنہ میرا جذبہ رقابت اسے جلا کر راکھ کر دے گا۔“

میں سمجھ رہا تھا کہ انکا نے بناوٹی غصے کا اظہار کیا تھا، میں نے اُس کی بات رکھ لی۔ میلا کو جگا کر جانے کو کہا تو اُس کی آنکھوں میں شکوے شکایت کے رنگ گھلنے لگے۔ اُس نے کوئی احتجاج نہیں کیا، لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی، لباس سمیٹتی خاموشی سے باہر چلی گئی۔

”تم نے غور کیا جمیل صاحب؟“ انکا نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”یہ سفید فام معاشرے کی پروردہ لڑکیاں کس قدر بے شرم، بے باک اور آوارہ مزاج ہوتی ہیں۔ اُدپر سے اُچلی، اندر سے میلی۔“

”تم نے جیکب کا کیا کیا؟“ میں نے موضوع بدل دیا۔

”میں نے اُس کے استخوانی پنجر کو دریا برد کر دیا۔“ اُس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ جم اب بھول کر بھی تم سے اُس کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کرے گا۔“

”ہمیں جین اور ولیم کے معاملے کو بھی خوبصورتی سے نمٹانا ہو گا۔“ میں نے دل پر پتھر رکھ کر کہا۔

”تم میرے ہونے کوئی فکر نہ کرو۔ میں تمہاری اگلی پیشی سے پہلے مارٹینا کے وکیل کو قابو کر کے تمام جائیداد ولیم کے نام منتقل کراؤں گی۔ اُن دونوں کی شادی بھی ہو جائے گی۔ اس کے لئے مجھے تمہارے سر سے دو ایک روز پھر دُور رہنا ہو گا۔“

”جو کچھ کرنا ہے جلدی کر ڈالو۔ میں بھی انسان ہوں، پتھر نہیں۔“ میں نے آزدگی کا اظہار کیا۔ ”جین کی شادی کے بعد لندن میں میرا دل نہیں لگے گا۔“

”ہمیں ویسے بھی جانا ہو گا۔“ انکا سنجیدگی سے بولی۔ ”میں پنڈت نول کشور کا ذکر بلا وجہ نہیں کر رہی۔ اُس نے اور اُس کے گرگوں نے سر جوڑ کر تمہارے خلاف مشورے کرنے شروع کر دیئے ہیں، ہمیں اُن کو بروقت کوئی سبق پڑھانا ہو گا۔“

”نول کشور کو مجھ سے کیا پر خاش ہے.....؟“

”وہ بد ذات بدری نرائن کا ہمنوا تھا۔“ انکا نے سرد لہجے میں کہا۔ ”پہلے بزدلوں کی طرح الگ تھلک بیٹھا تماشا دیکھتا رہا، اب دو چار جنتر منتر سیکھ لئے ہیں تو اُونچا اُڑنے کے خواب دیکھ رہا ہے، ہمیں اُس کا جھٹا توڑنا ہو گا ورنہ وہ کجمر غلام نہیں بیٹھے گا۔ کالی کے آشیر داد نے اُسے بڑا گھمنڈی بنا دیا ہے، اُونچے سُروں میں بات کرنے لگا ہے۔“

”کیسی عجیب بات ہے۔“ میں نے زہر خند سے کہا۔ ”جب کمپالا اور ننذا کی تعلیم نے مجھے صلح و آتش کے ساتھ زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھایا اُس وقت بھی میں سکون کی زندگی نہیں گزار سکا۔ میں نے شاکہ منی کے قدموں تک پہنچنے کے بعد زندہ رہنے کی خاطر اپنے انداز، اپنے تیور بدل ڈالے لیکن نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ بدری نرائن کو امر لال جیسے مہمان پنڈت کی خوشنودی حاصل ہو گئی، دشمنوں نے پھر میرے گرد گھیرا جنگ کرنا شروع کر دیا، میں ٹکراؤ سے بچنے کی خاطر خود پر جبر کرتا رہا، درگزر سے کام لیتا رہا، ظلم برداشت کرتا رہا..... پھر ایک دن میرے اندر بھری ہوئی بارود پر کوئی چنگاری ایسی گری کہ میں بھڑک کر شعلہ بن گیا۔ میں نے ایک ایک کر کے سب کو تھس تھس کر دیا۔ بدری نرائن کتوں کی موت مارا گیا۔ امر لال کا عبرتناک انجام بھی تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ میری کلدیپ نے کالی کے قدموں میں زندگی کا نذرانہ پیش کر دیا، سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں موت کا منتظر تھا جب جین نے آ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ لندن آتے وقت میں نے تم کو بھی الوداع کہہ دیا۔ میں باقی زندگی سکون سے گزارنا چاہتا تھا مگر قسمت نے میرے قدموں میں چکر لکھ دیا ہے، اب تم بتا رہی ہو کہ پنڈت نول کشور میرے خلاف سر اٹھا رہا ہے، پر تم لال نے بتایا تھا کہ امر لال کا نوجوان بیٹا چندرا بھی کہیں منڈل میں دھونی رمائے بیٹھا ہے، فتنے پھر جاگ رہے ہیں، میں کب تک برسرِ پیکار رہوں گا؟..... کب تک؟ کبھی سکون سے زندگی گزارنے کا موقع ملے گا بھی یا نہیں؟“

”ایسی مایوسی کی باتیں مت کرو جمیل۔“ انکا میرے جذبوں میں بھونچال آتا دیکھ کر شیشا

”میں چکن سینڈوچ اور کافی پسند کروں گا۔“ میں نے اُس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اُس نے کھڑے کھڑے میرا آرڈر نوٹ کیا، پھر مشینی انداز میں واپس چلی گئی۔ میں نے دوبارہ باہر سڑک پر رواں دواں زندگی کے ہنگاموں میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ کچھ دیر بعد وہی ویٹرس بڑی نفاست سے میز پر میرا آرڈر سرور کر رہی تھی۔ میں دلچسپی سے اُسے دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ میری نگاہوں کی تپش پا کر وہ بھی میری سمت ضرور دیکھے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انکا سر پر ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔ وہ پل بھر میں میری گردیدہ ہو جاتی، میرے قدموں میں بکھرنے، میری ہانہوں میں سینٹنے کو اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتی۔ میں اپنی قوتوں سے بھی اس پتھر دل نوخیز دوشیزہ کو کھٹلا سکتا تھا مگر میں نے گریز کیا۔ پریتم لال کے علاوہ نندانے بھی مجھے منع کیا تھا کہ ماورائی قوتوں کا غلط استعمال انسان کو غلط راہ پر ڈال دیتا ہے۔ انسان، انسان نہیں رہتا نفس کا غلام بن جاتا ہے۔ نفس پرستی اُسے صراطِ مستقیم سے دور کر دیتی ہے، وہ بھٹک جاتا ہے، گمراہ ہو جاتا ہے، مگر اہی اندھیروں کی پیداوار ہے۔ اندھیرے زیادہ پائیدار نہیں ہوتے، بہت جلدی دم گھٹنے لگتا ہے، قوتیں چھین جانے کا خطرہ بھی لاحق ہوتا ہے۔

نندا کہا کرتا تھا۔ ”ضبط سب سے بڑی نیکی ہے، اس کے سوانیکی کچھ نہیں ہوتی۔ ضبط کرنے کی مشق کر۔ تیرے اندر نئے نئے جوہر پیدا ہوں گے۔ ایثار اور ضبط قائم رکھے گا تو دھرتی کی کوئی شکتی تجھے کشت نہیں پہنچا سکے گی، کوئی دکھ نہیں ہوگا، من شانت رہے گا۔ یہی منش کے لئے سب سے بڑا سکھ ہے۔ میں تجھے انسان بنانا چاہتا ہوں..... انسان جو اس پانی سنسار میں آکر جانور بن جاتا ہے۔ میرا کہا مان تو آنکھوں کی کھڑکی بند کر دے، من کے دوار کھول لے۔ تجھے ہر طرف شانتی ہی شانتی نظر آئے گی..... اپنی دنیا میں واپس جانے کے بعد بھی نندا کی باتیں یاد رکھنا، میری باتیں گرہ سے باندھ لے۔ سنسار میں اہسا، درگزر، تیاگ اور تپسیا کے سوا کچھ اور نہیں رکھا، باقی جو نظر آتا ہے وہ سب دھوکا ہے، فریب ہے۔ میں تجھے جو شکتی دان کر رہا ہوں کبھی اس کا غلط استعمال نہ کرنا، سب کچھ سینٹ کر رکھنا۔ ہاں..... اگر دشمن تیرے پیچھے لگ جائیں، تیرا سکھ چین زبردستی چھیننے کی کوشش کریں تو اپنے بچاؤ کے کارن قدم اٹھا سکتا ہے.....“

گئی۔ ”میں ہوں نا تمہارے ساتھ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“  
 ”پہلے بھی تم میرے ساتھ تھیں۔“ میں مسکرا دیا۔ ”کسی کے ساتھ ہونے نہ ہونے سے کچھ نہیں ہوتا انکارانی، انسان بڑا بے بس، بڑا لاچار ہے۔ اسے اپنی کرنی آپ بھگتنی پڑتی ہے۔“

انکا سے کوئی جواب نہیں بن پڑا، پہلو بدلنے لگی۔ میں نے بھی بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ رات گزر گئی، صبح میں دیر سے بیدار ہوا، انکا سر پر نہیں تھی۔ میں نے اُٹھ کر غسل کیا، تیار ہو کر نیچے چلا گیا۔ ہوٹل کا منیجر لاؤنج میں کھڑا کسی امریکی سیاح سے پبلک ریلیہنگ کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس کی پیشانی ٹھکن آلود ہو گئی۔ میں مسکراتا ہوا ڈانٹنگ ہال کی طرف نکل گیا، وہاں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ میں نے اپنے لئے ایسی نشست کا انتخاب کیا جہاں بیٹھ کر میں باہر کا نظارہ بھی کر سکتا تھا، آس پاس کوئی اور نہیں تھا۔ میں باہر سڑک پر دوڑتے بھاگتے لوگوں اور گاڑیوں کے ہجوم کو دیکھنے لگا۔

”میں کوئی خدمت کر سکتی ہوں سر؟“ ایک نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، ایک نو عمر سیاہ فام ویٹرس ہاتھ میں آرڈر بک لئے کھڑی پروفیشنل انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھے جیوری کی ممبر مورینا یاد آ گئی۔ میں اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ اُس کے پاس کسی ہندوستانی کے لئے زیادہ وقت نہیں تھا، میں واقف تھا، سیاہ فام طبقے کے غیر ملکی سفید فام افراد سے زیادہ گھٹنے ملنے سے پرہیز کرتے ہیں، رنگ و نسل کے معاملے میں بہت زیادہ حساس اور قدامت پسند ہوتے ہیں، ٹورسٹ کے ساتھ بھی زیادہ بے تکلف ہونے اور گھٹنے ملنے سے پرہیز کرتے ہیں، امریکہ کی طرح وہ لندن میں بھی اپنی الگ تھلک کالونیوں میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ حقیقت کیا ہے؟ میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا لیکن سفید فام لوگوں نے اپنے سیاہ فام شہریوں کے لئے جرائم میں ملوث ہونے اور منشیات کی عیلت میں مبتلا ہونے سے متعلق بڑی کہانیاں بتا رکھی ہیں، نفرت کا اظہار کرنے سے ڈھنگ بھی نرالے ہوتے ہیں۔

”اس وقت کچھ کوریگولر بریک فاسٹ نہیں مل سکے گا۔“ اُس نے دیوار گیر کلاک کی سمت دیکھ کر مہذب انداز میں کہا۔ ”ہم وقت کی پابندی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ مین غیر ملکی مہبانوں کے لئے.....“

انفات کی جھلکیاں بھی محسوس کی تھیں۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجے تو اس کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے، زبردستی کے سودے میں نقصان کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ مورینا کے سلسلے میں انکا کی فرمائش بھی مجھ پر قرض ہو چکی تھی، میں نے ایک عرصے سے اُسے انسانی خون فراہم کرنے کا معاہدہ توڑ رکھا تھا۔ اُس نے کبھی تجدید عہد کے لئے تقاضا بھی نہیں کیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں ہوٹل سے باہر آ گیا۔ لندن کا موسم ہمیشہ خوشگوار رہتا ہے۔ میں دو تین گھنٹوں تک بازاروں کا بے معنی چکر لگاتا رہا، ونڈو شاپنگ سے دل بہلاتا رہا، چین سے وابستہ یادوں کو بھلانے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ لندن سے واپسی کی اطلاع کسی کو نہ دوں گا، چین کو الوداع کہنے کے بعد کسی اور سے رخصتی مصافحہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

دوپہر کو تھکا ہارا ہوٹل واپس آیا تو کاؤنٹر کلرک نے بتایا کہ جم کے دفتر سے کئی فون آچکے ہیں۔ میں نے کمرے میں جا کر کچھ دیر آرام کیا، پھر جم کو کال کیا۔

”دولت علی، تم کہاں چلے گئے تھے؟ میں تمہیں متعدد فون کر چکا ہوں۔“ فون جم ہی نے ریسو کیا تھا۔ گفتگو کے انداز ہی سے بوکھلاہٹ عیاں تھی۔

”بہت زیادہ پریشان لگ رہے ہو.....؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ اس وقت مجھے کسی ٹائٹ کلب میں جا کر خوشیاں منانی چاہئیں؟“

”مارٹینا کا کیس اُلجھ گیا ہے شاید۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے تمہیں پہلے ہی

مشورہ دیا تھا کہ جیکب کو ذہن سے نکال دو۔“

”خاک ڈالو جیکب اور مارٹینا پر۔“ وہ رو دینے والی آواز میں بولا۔ ”تمہیں اب میرے

لئے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا، اس کے بغیر میں تمہیں لندن سے واپس جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔“

”بات کیا ہے.....؟“

”جمن نے مجھے انفارم کرنے کے بعد اوپر کے افسروں کو بھی حالات کی اطلاع دے

دی۔ گارڈ کے زخمی ہونے کی وجہ سے وہ بہت زورس ہو گیا تھا۔“ جم نے سلسلہ کلام جاری

رکھتے ہوئے کہا۔ ”اب اوپر سے مجھے حکم ملا ہے کہ دس روز کے اندر اندر مارٹینا کے قاتل یا

قاتلوں کا سراغ لگاؤں۔ تاکامی کی صورت میں مجھے معطل بھی کیا جاسکتا ہے، سزا کے طور پر

میرے ذہن میں نندا کی نصیحتیں گونجتی رہیں، نظریں سیاہ فام حسینہ کے حسن و جمال کا طواف کرنے میں مشغول تھیں۔ نندا نے جو کچھ کہا وہ سچ تھا لیکن اس کے بعد جو میرے اوپر ہتی وہ بھی جھوٹ نہیں ہے۔ میں نے اپنے بچاؤ، اپنے تحفظ کی وجہ سے نندا کی باتوں کو فراموش کر دیا۔ درگزر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ بات حد سے تجاوز کرنے لگے تو زندگی برقرار رکھنے کی خاطر انسان کو اپنا دفاع کرنا پڑتا ہے۔ میں نے بھی بات حد سے گزر جانے کے بعد بدری نرائن کو مارنے کی ٹھانی تھی، جب تک میں صبر و تحمل سے کام لیتا رہا وہ شیر بن کر میرے تعاقب میں لگا رہا۔ جب میں نے مُد کر اُس کی آنکھوں سے آنکھیں چارکیں تو گیدڑ بن کر کالی کے مہان سیوک امر لال کی اوٹ میں دبک گیا۔ اوجھ بھٹکنڈے اختیار کرنے لگا، بیچڑوں کی طرح دُور کھڑا تالیاں بجا بجا کر میرے ساتھ مذاق کرتا رہا۔ میں نے اُس کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کر دیا۔ امر لال بھی کلدیپ سے بچنے لڑانے کی حسرت دل میں لئے جہنم رسید ہو گیا۔ آگ بھڑکی تو میری کلدیپ بھی اس کے شعلوں سے دامن نہ بچا سکی۔ کلدیپ کا ساتھ چھوٹا تو میری زندگی اندھیری ہو گئی۔ نندا نے جو چراغ روشن کئے تھے وہ بھی بجھ کر دھواں دینے لگے۔ انہسا کی تعلیم، درگزر اور ضبط سے کام لینے کی ساری نصیحتیں دھری کی دھری رہ گئیں..... میں چین کے جذبوں سے ہار کر لندن چلا آیا، کلدیپ کی جدائی مجھے اندر ہی اندر کھوکھلا کرتی رہی۔ میں نے خودکشی کی ٹھانی لی، پر تیم لال عین وقت پر درمیان میں نہ آ جاتا تو کہانی ختم ہو جاتی۔ اُس نے مجھ سے زندہ رہنے کا وعدہ لیا، کلدیپ کے ادھورے مشن کو پورا کرنے کا احساس دلایا، میری پشت پناہی کا وعدہ کیا، میرا حوصلہ بڑھایا تو میں زندگی کی طرف واپس لوٹ آیا، چین کے فارم ہاؤس میں دو مہینے تک ارتکاز اور مراقبہ کی مشق کے بعد میں نے اپنی کھوئی ہوئی قوتیں دوبارہ حاصل کر لیں۔ لیکن ان قوتوں کا غلط استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ میں چاہتا تو بے نیازی کا اظہار کرنے والی سیاہ فام لڑکی کا غرور اور تکبر توڑ دیتا، مخفی قوتوں کو نظروں میں سمیٹ کر اُسے گھورتا، وہ جل کر راکھ ہو جاتی، میرے ہاتھ کچھ نہ آتا۔ انکا پلک جھپکتے میں اُسے میری آغوش کی زینت بنا سکتی تھی۔ میں اُس کی غیر موجودگی میں صرف آنکھیں سینک سکتا تھا، میں نے اسی پر اکتفا کی۔ وہ ناشتہ سرو کر کے چلی گئی۔ میں اُسے ذہن سے جھٹک کر مورینا کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ سیاہ فام حسینہ بھی مجھے پہلی نظر میں اچھی لگی تھی۔ اُس کی نظروں میں، میں نے اپنے لئے

ہیڈ کوارٹر میں پوسٹنگ ہو سکتی ہے۔“

”گویا بڈیوں کے پنجر کی شیطانی قوتوں نے تمہیں پریشان کرنا شروع کر دیا۔“ میں نے جان بوجھ کر مکھم انداز اختیار کیا۔

”میں اسی وقت تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ تفصیل سے بیٹھ کر بات ہوگی۔“

”نہیں.....“ میں نے سنجیدگی سے اُسے ٹالنے کی کوشش کی۔ ”موجودہ حالات میں تمہارا بار بار میرے پاس آنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”کیوں.....؟“

”ہر بات کی وجہ جاننے کی خدمت کیا کرو۔ میں نے تمہیں پہلے بھی تنبیہ کی تھی۔“ میں نے قدرے درشت آواز میں جواب دیا۔

”دولت علی۔ میری مدد کا وعدہ کرو۔“ جم بچوں کی طرح نہیں کرنے لگا۔ ”اگر دس روز کے اندر تم نے کوئی حل نہ تلاش کیا تو میں کسی کومنڈ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔“

”ایسا ہوتا ہے جم۔ میں بھی کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہوں۔“ میں نے کمزور آواز میں کہا۔ ”ایک جموٹے کیس میں ملوث ہونے کے بعد اب ہوٹل والوں کے برتاؤ میں بھی زمین آسمان کا فرق پیدا ہو گیا ہے۔“

”کس کی موت آئی ہے جو میرے ہوتے ہوئے تمہاری طرف نیڑھی نظروں سے دیکھے۔“ میرا تیر ٹھکانے پر بیٹھا۔ جم کو میری مدد درکار تھی، وقت پر انسان گدھے کو باپ بنا لیتا ہے میں تو اُس پر ایک احسانِ عظیم پہلے بھی کر چکا تھا۔ وہ اگر جردار آواز میں بولا۔ ”دولت علی، مجھے اُس کا نام بتاؤ، صرف دس منٹ کے اندر اندر تمہیں احساس ہو جائے گا کہ جم تمہارے لئے کیا کر سکتا ہے۔“

”میں کسی فرد واحد کی بات نہیں کر رہا۔“ اس بار میں نے سرد لہجہ اختیار کیا۔ ”ہوٹل کی پوری انتظامیہ بے اعتنائی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ میں نے زمین اور نالی میں ریگنے والے کیڑوں کی طرف نظر نہیں اٹھائی۔ ورنہ اگر چاہتا تو.....“

”میں سمجھ گیا دولت علی۔“ جم میرے جملوں کا مفہوم بھانپ گیا۔ ”میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔ لندن میں تمہیں ہمیشہ میرے مہمان کی حیثیت حاصل رہے گی اور کوئی میرے مہمان کی طرف سے غفلت کا مرتکب ہو۔ ایسا دوبارہ کبھی نہیں ہوگا۔“

”جم.....“ میں نے دل ہی دل میں مسکرا کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں شاید دس روز تک لندن میں نہ ٹھہر سکوں۔ میری واپسی ضروری ہے۔ لیکن جانے سے پہلے تمہارا کام ہو جائے گا۔ ایک بات اور بھی ذہن نشین کر لو۔ تم میری واپسی والی بات کا تذکرہ کسی اور سے نہیں کرو گے، سارا سے بھی نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ لیکن.....“

میں نے جم کو بات مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا، ٹھوس لہجے میں بولا۔ ”بڈیوں کے پنجر نے ایک بے گناہ گارڈ کو زخمی کر کے ان پابندیوں کی خلاف ورزی کی ہے جو نایدیدہ قوتوں پر بھی عائد ہوتی ہیں۔ تم تفصیل معلوم کرنے کی ضد نہ کرنا۔ میں اب تمہیں اتنا اور بتا سکتا ہوں کہ بڈیوں کا فرار ہو جانے والا پنجر بھی کسی خطرناک شخصیت کے اشارے پر عمل کر رہا تھا۔“

”دولت علی.....“ جم نے تھکے تھکے لہجے میں اپنی ضعیف الاعتقادی کا ثبوت دیا۔

”تمہاری پراسرار باتیں میرے سر سے گزر رہی ہیں۔ پہلے تو تم نے کہا تھا کہ وہی بدزوح اپنا انتقام لینے کی خاطر.....“

”صرف آم کھانے سے تعلق رکھو۔“ میں نے اُس کا جملہ درمیان سے اُچکتے ہوئے خشکی کا اظہار کیا۔ ”پیڑ گننے کی حماقت کرو گے تو شاید ملازمت سے بھی ہاتھ دھو پڑ جائے..... میں کوشش کروں گا کہ اصل مجرم سامنے آ کر مارٹینا کے قتل کے سلسلے میں اعتراف جرم کر لے۔“

میں نے جملہ مکمل کرنے کے بعد فون کریڈل پر واپس رکھ دیا۔ جم نے میرے اندازے کے مطابق دوبارہ فون کرنے کی غلطی نہیں کی۔ وہ میری باتوں سے یقیناً خوفزدہ ہو گیا ہوگا۔ اب وہ دو اور دو چار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ انکا نے بڈیوں کے پنجر کے ساتھ جو خطرناک کھیل کھیلا تھا اُس نے محکمہ سرانصرسانی کے اعلیٰ دماغوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ سر جوڑے بیٹھے منطقیں بگھا رہے ہوں گے، اپنا قیمتی وقت برباد کرنے میں مصروف ہوں گے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہوں نے بلیک میجک کرنے والے دو چار شعبہ بازوں کو بھی جمع کر رکھا ہو۔ میں جانتا تھا وہ تفتیح اوقات کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے، ڈور کا کوئی سرا اُن کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ انکارانی کی لازوال قوتیں اُن کی ذہنی رسائی کی پہنچ سے بھی بالاتر تھیں۔ میں نے جم سے پیچھا چھڑانے کی خاطر اُسے بڑی دوراندیشی سے دُور دور رہنے کی تاکید کر دی تھی۔ وہ میری ذات سے چپک جاتا تو بہت سارے کام ادھورے رہ جاتے۔



میں فون بند کر کے کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کے ارادے سے لیٹنا چاہتا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے ہونٹوں پر مٹی خیز مسکراہٹ ابھر آئی، مجھے علم تھا کہ اس وقت بغیر طلب کئے کون آیا ہوگا؟ میں نے اٹھ کر اعتماد سے دروازہ کھولا، میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ دروازے پر ہوٹل کا وہی منیجر ہاتھ باندھے کھڑا تھا صبح مجھے دیکھ کر جس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی تھی۔ جم نے میری شکایت پر عمل کرنے میں خاصی عجلت کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں نے منیجر کو گھور کر دیکھا، پھر نفرت سے منہ پھیر کر دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

”سر.....“ وہ غلاموں کے انداز میں ہاتھ باندھے میرے پیچھے لگا رہا۔ جم نے یقیناً ہوٹل کی انتظامیہ کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہوگا ورنہ سفید فام لوگوں کی تنی ہوئی گردنیں کم از کم کسی ہندوستانی کے آگے جھکنا گوارا نہیں کرتیں۔

”کیا ہوٹل کی انتظامیہ مجھے دو چار روز اور برداشت نہیں کر سکتی؟“ میں نے دیدہ و دانستہ جھلا کر کہا۔ پلٹ کر اُس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھے۔

”آپ کا اندازہ غلط ہے سر۔ میں دراصل کسی اور وجہ سے.....“

”میں سمجھ رہا ہوں سر منیجر۔“ میرے لہجے کی تلخی کچھ اور سوا ہوگئی۔ ”میں نے صبح تمہاری پیشانی پر ابھرنے والی آڑی ترچھی سلوٹوں سے ایک نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔ تم اور تمہارے کارندے مجھے سکون سے نہیں رہنے دیں گے۔ ٹھیک ہے۔“ میں نے اس بار پلٹ کر ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”مجھے صرف آج کی رات اور گزار لینے دو، صبح میں ہوٹل چھوڑ دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

”آپ ہوٹل نہیں چھوڑیں گے سر.....“ اُس نے بدستور دونوں ہاتھ ناف پر باندھ رکھے تھے، گردن جھکائے بڑی لجاجت سے بولا۔ ”اگر آپ نے ہوٹل چھوڑ دیا تو ہماری ملازمتیں بھی ختم ہو جائیں گی۔“

”میرا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہے ہو.....؟“ میں نے اُس کی بے بسی پر سنجیدگی سے ایک تھپڑ اور رسید کیا۔

”آئی ایم سوری سر۔“ اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”ہم نے آپ کو پہچاننے میں غلطی کی تھی۔ میں معافی کا خواستگار ہوں۔ مالکان نے بھی معذرت کی درخواست کی ہے، آئندہ آپ کو کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ عملے کے تمام ارکان بخوشی سے ہدایت کر دی گئی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے اس بار زہر خند سے کہا۔ ”تم لوگ آئندہ سے میرا بوٹ پالش کرنے سے بھی انکار کی جرأت نہیں کرو گے، کیوں منیجر، میں نے غلط تو نہیں کہا؟“

منیجر نے نظریں جھکا لیں، ہاتھ ملنے لگا۔ میں نے تحکمانہ انداز میں ”گٹ آؤٹ“ کا فرمان جاری کیا۔ وہ کسی پالتو کتے کے انداز میں دم ہلاتا واپس چلا گیا، میری رگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں چاہتا تو براہ راست انتظامیہ کے لوگوں کو اپنی قوتوں کے ذریعے تلوار چاٹنے پر مجبور کر سکتا تھا لیکن ایک گندی رنگت رکھنے والے کے اشارے پر ایک سفید فام دوسرے سفید فام کو جھکنے اور ہاتھ جوڑ کر معافی طلب کرنے پر مجبور کرے، اس کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے.....!!

تین دن گزر گئے..... اس دوران جم اور جین دونوں کے فون آتے رہے۔ جم نے شاید جین کو بھی براہ راست مجھ سے ملنے کو منع کر دیا تھا۔ انکا میرے سر پر واپس نہیں آئی۔ جین کی طویل باتوں سے مجھے اندازہ ہوتا رہا کہ انکا اپنے کام بڑی تیزی سے منسار رہی ہے۔ جین، ولیم کا ذکر کرتی تو میرے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے۔ میں موضوع بدل دیتا۔ جین کچھ دیر بعد کسی اور بہانے سے پھر ولیم کا تذکرہ چھیڑ دیتی۔ تیسری رات میں میلبا کی کمر میں بائیں ڈالے، بالکونی میں کھڑا ہر طرف پھیلی گہری دھند کی لطیف ٹھنڈ سے لطف اندوز ہو رہا تھا جب ولیم آگیا۔ میلبا میرا اشارہ پا کر چلی گئی۔ ولیم کے چہرے پر خوشی دمک رہی تھی۔ میلبا کے جاتے ہی وہ بے اختیار مجھ سے گلے لگ گیا۔ اُس کا انداز والہانہ تھا، مجھے خوشی ہوئی۔ انکا نے غالباً مارینا کے وکیل کو اپنے اشاروں پر ناپنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو آج تمہیں وہ سب کچھ مل گیا جس کے تم جائز حقدار تھے۔“

”میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں؟“ اُس کی آنکھیں نمناک ہونے لگیں۔

”اگر میرا کوئی اپنا بزرگ بھی ہوتا تو وہ نہ کرتا جو آپ نے کیا ہے۔ میں آپ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا گا، آج آپ کی اُن ماورائی قوتوں کا بھی قائل ہو گیا جن کے قصے ہم بیان کرتا تھا۔“

”بھول جاؤ اُن سب باتوں کو۔“ میں نے اُسے ہنسنے کا اشارہ کیا۔ ”یہ بتاؤ کہ اب اپنے گھر میں کب منتقل ہو رہے ہو؟“

”کبھی نہیں.....“ وہ یکبخت جذباتی ہو گیا۔ ”اُس گھر کے در و دیوار سے ایسی تلخ یادیں

وابستہ ہیں کہ شاید میں وہاں ایک لمحہ بھی سکون کا سانس نہ لے سکوں۔ ماضی کی باتیں مجھے کچھ کے لگاتی رہیں گی۔“

”پھر کیا سوچا ہے.....؟“

”میں اُس گھر کوچ ڈوں گا، ایک نیا گھر آباد کروں گا۔“ وہ مجھے اپنے آئندہ کے منصوبے بتاتا رہا، میں توجہ سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ اُس نے درمیان میں ایک بار بھی جین کا نام نہیں لیا۔ شاید وہ ابھی تک سارا اور جم کی ان باتوں کی نفی نہیں کر سکا تھا جو اُسے میرے اور جین کے بارے میں بتائی گئی تھیں۔ میں اُس کی معصومیت، اُس کے خلوص، اُس کے جذباتوں کو محسوس کرتا رہا۔ اچانک وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں، اس شرط پر کہ آپ اسے رد نہیں کریں گے۔“

”مجھے منظور ہے۔ لیکن ایک وعدہ تم بھی کرو۔“ میں نے فرار کے ایک راستے کی گنجائش نکال کر کہا۔ ”تم کوئی ایسی بات نہیں کہو گے جس سے مجھے دکھ پہنچے۔ خلوص اور محبت انمول ہوتے ہیں، ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔“

ولیم میری بات سن کر کسمپاسی لگا، سوچ میں پڑ گیا۔ میں اُس کی ذہنی کشمکش کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ ”ایک صورت ہے جو تمہاری شرط اور میری بات کا حل نکال سکتی ہے۔“

”وہ کیا.....؟“ ولیم نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”کچھ نہ کہو.....“ میں نے بزرگانہ لہجے میں بڑے پیار سے کہا۔

”آپ بہت گریٹ، بڑے عظیم ہیں مشر دولت علی۔“ ولیم نے لا جواب ہو کر کہا۔ ”میں

آپ کے احسانوں کا بدلہ کبھی نہیں چکا سکوں گا۔“

”تم اور جین ساتھ ہو کر خوشگوار زندگی گزارو، میرے لئے یہی سب سے بڑا انعام ہو گا۔“ میں نے دل پر پتھر رکھ کر کہا۔ ”نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔ جین سے شادی کے مسئلے پر تمہاری کوئی بات ہوئی؟“

”جین ایک دو روز میں آپ سے ملنے کے بعد کوئی آخری فیصلہ کرے گی۔“

میں نے زبردستی مسکرائے کی کوشش کی، ولیم کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا، میں اُس کے جملے پر غور کرنے لگا۔ ”جین مجھ سے ملنے کے بعد کوئی آخری فیصلہ کرے گی۔“ میرے ذہن میں

آندھیاں چلنے لگیں، ان گنت سوالات گڈمڈ ہونے لگے۔ کیا جین انکا کی کوششوں کے باوجود مجھے فراموش نہیں کر سکی؟ کیا ابھی تک اس ہنڈولے پر جھول رہی ہے جس پر میں اُس کے ساتھ تھا؟“

میرا ذہن دسویں سو سالوں سے دو چار تھا جب میلہ دوبارہ آگئی۔ وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی مانوس ہو گئی تھی۔ مجھے اندازہ تھا سفید فام عورتیں، گندمی رنگ والے مشرقی شہزادوں کے والہانہ اور پُر زور انداز محبت کی شیدائی ہوتی ہیں۔ میں جین کے خیالوں میں بکھرا تھا۔ میلہ نے مجھے اپنی ہانہوں میں سمیٹ کر لوری دی تو وقتی طور پر سکون آ گیا۔ ایک رات اور گزر گئی۔

صبح میں نے ناشتہ اپنے کمرے میں منگوا لیا، میری پیشی میں صرف دو دن اور رہ گئے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے جین کو فون کیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی ہے۔ اس کا مجید معلوم کر لینے کے بعد ہی میں بساط کے ٹہروں کی چالیں بدلنے پر غور کر سکتا تھا۔ تین گھنٹیاں بچنے کے بعد دوسری جانب سے ماریا کی گنگنائی آواز سنائی دی۔

”کیسی ہو ماریا.....؟“

”اوہ، مشر دولت علی۔“ اُس کے لہجے میں خوشی کے رنگ چھلک اُٹھے۔ ”میں ابھی آپ کو یاد ہی کر رہی تھی۔“

”کیوں؟“ میں نے شوخی سے دبی زبان میں سوال کیا۔ ”کیا مورگن پھر چلا گیا؟“

”اب وہ مجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گا۔“ ماریا کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ”پہلے ہی اپنی حرکت پر بہت شرمندہ ہے۔“

”مجھے کیوں یاد کر رہی تھیں؟“

”آپ میرے محسن جو ہیں۔“ اُس نے بڑی اپنائیت کا اظہار کیا۔ ”میں، آپ کو اکثر یاد کرتی ہوں۔“

”جین کہاں ہے.....؟“

”لباس تبدیل کر رہی ہیں۔ ویٹ کریں، میں بلاتی ہوں۔“

”ہیلو، دولت علی۔“ ایک منٹ بعد جین کی آواز سنائی دی۔ اُس کے لب و لہجے میں خوشیاں ہمک رہی تھیں۔ ”اس وقت کیسے یاد کر لیا؟“

”تم سے شکوہ کرنا تھا۔“ میں نہ چاہنے کے باوجود کہہ گیا۔ ”تین روز سے تمہاری صورت نظر نہیں آئی۔“

”جم نے کیس کی پریشانیوں کی وجہ سے روک رکھا تھا، شاید تم نے اُسے دُور رہنے کی تاکید کی تھی؟“

”وہ تاکید صرف جم کے لئے تھی تمہارے لئے تو.....“ میں کہتے کہتے رک گیا۔

”تم چپ کیوں ہو گئے؟“ جین نے سوال کیا۔ ”کیا کہنا چاہتے تھے؟“

”مم..... میں تم سے ملنا چاہتا ہوں جین۔“ میں نے سنجیدگی سے سنبھل کر کہا۔ ”کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

”تم نے فون کرنے میں جلدی کر دی، مجھے اچانک دیکھتے تو حیران ہو جاتے۔“

”کیا مطلب؟“ میں پوچھا۔

”میں تمہاری ہی طرف آرہی ہوں، کہیں نکل نہ جانا۔“ جین نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میرے ذہن میں پھر کھلبلی شروع ہو گئی۔ وہ دفتر کے معاملات میں وقت کی بڑی پابند تھی۔ میں نے نظریں گھا کر گھڑی کی سمت دیکھا، آدھے گھنٹے بعد اُسے دفتر پہنچنا تھا اور وہ میری طرف آرہی تھی۔ میں تھکے تھکے انداز میں راکنگ چیئر پر بیٹھ کر اُس کا انتظار کرنے لگا۔

چالیس منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے اُٹھ کر دروازہ کھولا، جین میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اُس کے انگ انگ سے سرتیں پھوٹ رہی تھیں۔ سفید لباس میں وہ کوئی حور نظر آرہی تھی۔ میں بت بن گیا، دل میں اُمندتے ہوئے طوفان کو روکنے کی جدوجہد کرنے لگا، جین کو اندر آنے کا راستہ بھی نہیں دیا۔

”بہت ناراض ہو دولت علی؟ اندر آنے کو بھی نہیں کہو گے؟“ جین کی مترنم آواز قوتِ

سماعت سے ٹکرائی تو مجھے غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے شاہانہ انداز میں اُس کا استقبال کیا۔

وہ مسکراتی، بل کھاتی اندر آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے جان بوجھ کر اُس کے سامنے والا

صوفہ منتخب کیا، درمیان میں شیشے کی گول میز بھی حائل ہو گئی۔ آگ اور پٹرول کا یکجا ہو جانا

مناسب نہیں تھا۔ جین نے میری اس حرکت کو محسوس کیا، بس ایک ثانیہ اُس کی کشادہ

پیشانی پر کچھ سلوٹیس اُبھریں، پھر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں مشرق کی اسی تہذیب اور احتیاط کی دلدادہ ہوں۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”تم مجھ سے دُور کیوں بیٹھے، اس کی وجہ میں جانتی ہوں۔“ اُس نے لہک کر جواب

دیا۔ ”مجھے تمہاری دوستی پر ہمیشہ فخر رہا ہے، اس وقت بھی جب ہم برلن میں ایک ساتھ ہوٹل

میں ٹھہرے تھے جم کے بعد بھی تم نے ایک اچھے دوست کی طرح میری دلجوئی کی تھی،

ہندوستان سے لندن آنے کے لئے بھی تم نے میری بات رد نہیں کی۔ ہم آئندہ بھی ہمیشہ

ایک دوسرے کے اچھے دوست ثابت ہوں گے۔“

میں گنگ رہ گیا، حیرت سے جین کو دیکھنے لگا۔ کل تک وہ میرے پہلو میں مچلنے کو

مضطرب رہتی تھی، میرے قرب کو اپنے لئے زندگی کی علامت سمجھتی تھی، اُس کے جسم کے

بیشتر حصوں پر میرے لبوں کی مہر ثبت تھی۔ میں نے اُسے ہر رنگ، ہر ڈھنگ، ہر لباس میں

بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اس وقت وہی جین مجھے ہمیشہ اپنی دوستی کا یقین دلانے کی کوشش

کر رہی تھی، انکا نے اُس کی برین واشنگ میں بڑی مہارت سے کام لیا تھا۔

”جانتے ہو دولت علی۔ میں اس وقت دفتر سے چھٹی لے کر تمہارے پاس کیوں آئی

ہوں؟“ جین نے میرے چہرے پر اُبھرنے والے نازک احساسات کا نوٹس نہیں لیا، اُس

کے معصوم چہرے پر دھنک کے قرمزی رنگ بکھر رہے تھے۔ میں سمجھ گیا وہ ولیم کے ساتھ

شادی کرنے کی خاطر مجھے صرف دوست سمجھ کر مشورہ کرنے آئی تھی، میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”تمہیں یاد ہے جین۔“ میں نے کہا۔ ”جب مارٹینا کی ہولناک موت کے بعد میں ہوٹل

نقل ہوا تھا، اُس وقت جیکب کے سلسلے میں تم نے مجھے فون کیا تھا، درمیان میں ولیم کا ذکر

بھی آ گیا تھا۔ تم نے اُس وقت شکوہ کیا تھا کہ میں درمیان سے کوئی بات حذف کرنے کی

کوشش کر رہا ہوں اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ کچھ دنوں بعد چونکا دینے والے انکشاف

کروں گا۔“

”لیکن تم نے آج تک مجھے وہ راز کی بات نہیں بتائی.....“ جین نے مجھے چیکھی نظروں

سے گھورا۔ اُس کا انداز مجبوزبانہ تھا۔

”انکشافات اگر مناسب وقت پر کئے جائیں تو ان کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”میں جانتا ہوں تم اس وقت مجھ سے کس مقصد سے ملنے آئی ہو۔ میں نے اس

انکشاف والی بات کو بھی آج ہی کے دن کی خاطر بہت سنبھال کر رکھا تھا۔“ میں نے پہلو بدل کر بات جاری رکھی۔ ”تم آج مجھ سے ولیم کے بارے میں مشورہ کرنے آئی ہو اور ولیم نے بھی مجھے دوست سمجھ کر تمہارے بارے میں اپنی پسند اور چاہت کا اظہار کیا تھا۔“

جین کے چہرے پر ہککشاں دسکنے لگی، زندگی کے شوخ رنگ بکھرنے لگے۔ ان رنگوں میں میرا خون جگر بھی شامل تھا۔ میں نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ”ولیم ہر لحاظ سے تمہارے لئے مناسب اور بہترین انتخاب ثابت ہوگا۔ صرف ایک دشواری ہو سکتی ہے۔“

”وہ کیا.....؟“ جین نے سہم کر دریافت کیا۔

”اسٹیٹس..... (STATUS)“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”ممکن ہے کہ تمہاری بوڑھی ماں کو.....“

”اب ایسا نہیں ہوگا دولت علی۔“ جین نے اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ ”ولیم نے مجھے کل ہی بتایا ہے کہ اُس کی کسی عزیزہ نے مرتے وقت اُس کے نام اپنی ساری جائیداد منتقل کر دی تھی۔ ولیم نے کروڑوں کی رقم کو غلط کاموں میں ضائع نہیں کیا، سنبھال کر رکھا ہے۔ اب وہ میری پسند کا مکان خریدنے کو کہہ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری زندگی خوشگوار گزرے گی۔“

”شادی کب کر رہی ہو.....؟“ میں نے بظاہر خوشی کا اظہار کیا۔ میرے دل کے ویرانوں میں دھول اڑ رہی تھی، گرم اور تیز آندھی کے جھکڑ چل رہے تھے۔

”اسی ضمن میں تم سے مشورہ کرنے آئی ہوں.....“ جین اٹھ کر میرے قریب آ گئی۔

”تم میرے واحد دوست ہو دولت علی، میں تمہارے پُر خلوص مشوروں سے نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتی ہوں۔“

”ولیم کا کیا خیال ہے؟“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ایسٹر (EASTER) میں ابھی بیس دن باقی ہیں۔ ولیم کا خیال ہے کہ ایسٹر کا مبارک دن ہمارے لئے مناسب رہے گا۔“ جین نے شرمانے کی کوشش کی تو اور قیامت بن گئی۔ اُس کے قرب کا احساس، اُس کے بدن کی تیش مجھے جھلسانے لگی۔ میں نے ضبط سے کام لیا، جین کو ولیم کے منتخب کردہ دن پر شادی کا مشورہ دیتے وقت مجھ پر کیا گزری، الفاظ ان احساسات و کرب کا احاطہ نہیں کر سکتے.....!

دوپہر کا کھانا جین نے میرے ساتھ ہی کھایا۔ وہ چلی گئی تو میری آنکھیں چھلک اٹھیں۔

کلہ یپ کے بعد ایک آخری سہارا ملا تھا وہ بھی چھن رہا تھا۔ پریم لال کی مرضی بھی یہی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ میں جل کے اوپر ہی اوپر تیرتا رہوں گا، جل کی تہہ میں غوطہ نہیں لگا سکوں گا۔ میں نے اُس سے عہد کیا تھا کہ لگن منڈپ سجا کر کلہ یپ کی رُوح کو اذیت نہیں پہنچاؤں گا، میں کلہ یپ کے نام پر گئے گئے عہد نہیں توڑ سکتا تھا۔

”صبر سے کام لو جمیل.....“ انکا کی مانوس آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ”میں جین کے سر پر تھی اس لئے تمہارے پاس نہیں آ سکی۔ اُس کے ذہن کو پلٹنے میں مجھے پہلی بار دشواری کا سامنا کرنا پڑا، تمہارے پیار کے تناور درخت کی جڑیں ابھی تک اُس کے وجود میں باقی ہیں، ولیم سے شادی کے بعد بھی وہ تمہیں فراموش نہیں کر سکے گی۔ لیکن.....“

”کوئی اور بات کرو انکارانی.....“ میں نے انکا کو جین کے تذکرے سے روک دیا۔ وہ بھی ملول نظر آ رہی تھی، میرے سر پر اُداس کھڑی ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ میں نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔ ”جینک کی ہڈیوں کے پنجر کے فرار نے جم کے لئے نئی پریشانیاں کھڑی کر دی ہیں۔ اُس نے مجھ سے مدد کی درخواست کی ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔ تم نے اُس سے جو وعدہ کیا ہے وہ بھی میرے علم میں ہے۔“ انکا تھکے تھکے انداز میں بولی۔ ”پانچ دنوں سے ایک لمحہ بھی آرام نہیں کر سکی۔ کبھی اس کے، کبھی کسی اور کے سر پر پھدکتی پھر رہی ہوں۔ لیکن تم پریشان نہ ہو، جم کی پریشانی دُور ہو جائے گی، اس کے علاوہ تمہارے لئے ایک خوشخبری بھی ہے میرے پاس، اگلی پیشی پر تمہیں باعزت طور پر رہا کر دیا جائے گا، جیوری کے ممبران اور جج کا متفقہ فیصلہ ہے کہ تم بے گناہ ہو۔ رقم کا سفری بیک بھی تمہیں واپس مل جائے گا۔ مورینا نے جیوری کی طرف سے سب سے زیادہ تمہاری حمایت کی ہے، آرتھر کے ستارے گردش میں آ جائیں گے، اُسے ملازمت برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔“

”تم نے رہائی کی خبر سنا کر سینے سے ایک بوجھ ہلکا کر دیا۔“ میں نے سر آہ بھر کر کہا۔

”میں پہلی فلائٹ سے لندن کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنے کی کوشش کروں گا۔“

انکا نے مجھے نظر بھر کر دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں میرے لئے ایک سوال مچل رہا تھا۔

”جمیل، کیا تم جین کی شادی میں بھی شریک نہیں ہو گے؟“..... لیکن اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا، میرے چہرے پر اُداس کے سائے منڈلاتے دیکھے تو زخموں کو کریدنا مناسب

نہیں سمجھا، ایک طویل جمائی لے کر سر پر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد اُس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز میری سماعت سے ٹکرانے لگی۔ میں نے اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھا، پھر خود بھی بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ جین کی جدائی کا تصور، اُس کی رفاقت میں بیتی ہوئی حسین یادیں مجھے پریشان کر رہی تھیں۔ میں ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہوتا چلا گیا.....!

کوئی دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔ میں بوکھلا کر اٹھا، کمرے میں گھپ اندھیرا طاری تھا۔ شام کے سات بجے تھے، انکا میرے سر پر نہیں تھی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا، اندر آنے والا مجھے اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر کر دُور تک اندر لے آیا۔ اندھیرے کے سبب میں اُسے شناخت نہ کر سکا۔ ایک لمحے میں سینکڑوں پریشان کن خیالات ابھرے۔ میں جوابی کارروائی کی خاطر سوچ رہا تھا کہ ہم کی چٹکھاتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی۔

”دولت علی یو آر گرینڈ، مائی ڈیئر سٹ فرینڈ، آلی لو یو..... آلی لو یو۔“ جم خوشی میں چیخ رہا تھا۔ ”تم ناقابلِ تغیر ہو۔ مجھے تم پر فخر ہے، سب کچھ کیسے ہوا؟ میں نہیں جانتا لیکن سارے افسرانِ انگلش بدندان رہ گئے، سب کی آنکھیں جیرالڈ کو تھکڑی میں جکڑا دیکھ کر پٹنار ہی ہیں۔ سب حیران ہیں، کسی کو یقین نہیں آ رہا کہ جیرالڈ جیسا خطرناک اشتہاری ملزم جو گزشتہ دس سالوں سے پولیس کے لئے سر درد بنا ہوا تھا، میرے ہاتھوں چوہے کی طرح پکڑا جاسکتا ہے، اُس کی زندہ یا مُردہ گرفتاری پر تین لاکھ پاؤنڈ کا انعام بھی تھا دولت علی، میری جان، مجھے بتاؤ، یہ کیسے ممکن ہوا.....؟“

بات میری سمجھ میں آگئی، انکا کی غیر موجودگی اور جم کی اُچھل کود نے تمام گرہیں کھول دیں۔

”جم، پلیز.....“ میں نے اُس کے شکجے سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ ”اپنی گرفت ڈھیلی کرو، مجھے روشنی کر کے اس بات کا اطمینان کر لینے دو کہ تمہارا ذہنی توازن ٹھیک بھی ہے یا جیرالڈ کی گرفتاری نے تمہیں دیوانہ کر دیا ہے؟“

جم کو اندھیرے کا احساس ہوا، اُس کی گرفت کمزور ہو گئی۔ میں نے کمرے کی لائٹ روشن کیں، جم کا چہرہ خوشی سے تھمتار ہا تھا۔ ”میں نے تمہیں سوتے میں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ اُس نے میرے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے تاسف کا اظہار کیا۔

”میں جو عمل تمہارے لئے کر رہا تھا اس کے لئے اندھیرا مشروط تھا۔“ میں نے

اگر یزوں کی ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”مجھے تفصیل بتاؤ، جیرالڈ کو گرفتار کرنے میں تمہیں کوئی جدوجہد تو نہیں کرنی پڑی؟“

”اُسے اچانک اپنے آفس میں دیکھ کر میں کچھ پریشان ضرور ہوا تھا۔“ جم نے صوفی پر ڈھیر ہو کر کہنا شروع کیا۔ ”مگر میری حاضر دماغی کام آگئی، کوئی اشتہاری مجرم جس کے سر کی قیمت تین لاکھ پونڈ مقرر کی گئی ہو، خرگوش نہیں ہوتا جس کی آنکھوں کو تیز روشنی سے چکا چوند کر کے دبوچ لیا جاتا ہے..... جیرالڈ کے ہاتھ میں امریکن کولٹ تھا جس کی گولی دیوار کو بھی چیر پھاڑ کر نکل جاتی ہے۔ ہماری کئی ٹیمیں اُسے متعدد بار گھیر چکی ہیں لیکن وہ ہر بار ایک دو افسران کو موت کے گھاٹ اُتار کر چھلاوے کی طرح نکل جاتا تھا۔“ جم پہلو بدل کر بولا۔

”جس وقت جیرالڈ نے سرد اور سفاک لہجے میں مجھے ہینڈ زاپ کرنے کو کہا تو میری رُوح بھی فنا ہو گئی۔ میں اپنے آفس میں بالکل تنہا تھا، جس الماری کے قریب میں کھڑا تھا وہاں سے الارم بیل (ALARM BELL) بھی دُور تھی۔ موت کو سر پر منڈلاتا دیکھ کر بڑے بڑے سورماؤں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔ لیکن مجھے بروقت سوچھ گئی، میں نے جیرالڈ کی پشت کی سمت دیکھ کر ڈونٹ شوٹ (DON'T SHOOT) کے الفاظ ادا کئے تو وہ بھی میری اداکاری سے دھوکا کھا گیا، وہی ایک لمحہ مجھے درکار تھا، میں نے بل بھر میں بازی پلٹ دی۔“

”یہ محض ڈینگیں مار رہا ہے جیل.....“ انکا نے میرے سر پر واپس آتے ہوئے شونف سے کہا۔ ”جیرالڈ کو دیکھ کر اس کی چٹون ترتر ہو گئی تھی، میں جیرالڈ کے سر پر نہ ہوتی تو وہ اس کا کچومر بنا کر رکھ دیتا، بڑے ہی مضبوط اعصاب اور قوتِ ارادی کا مالک تھا۔ میں نے دونوں پیروں کے تمام پنجے اس کے سر میں چھوڑ رکھے تھے لیکن وہ اس طرح پچل رہا تھا جیسے اس کی شریانوں میں خون نہیں، چار سو چالیس دولت کا کرنٹ دوڑ رہا ہو..... جم تو اُس کی آواز سن کر ہی کپکپانے لگا تھا۔“

”کیا جیرالڈ نے مارٹینا کو قتل کرنے کا اقرار کر لیا؟“ میں نے انکا کی بات ختم ہوتے ہی جم سے دریافت کیا۔

”ہاں.....“ جم نے افسرانہ انداز میں جواب دیا۔ ”اُس نے اس بات کا اقرار بھی کر لیا کہ قتل اُس نے اپنے ہاتھوں سے کیا تھا، بعد میں اُس نے ایک بد رُوح کو وہاں جیکب کی شکل میں اس لئے بھیج دیا کہ جین کا سر درمیان میں لا کر محکمہ سر اغر سانی پر کچڑا اُچھال سکے۔“



گردش کرتا ہے۔“  
میں کاک ٹیل خون کی اصطلاح پر مسکرا دیا، رات ہماری واپسی دیر سے ہوئی۔ ہوٹل کا عملہ جم کی صرف ایک ”ڈوز“ سے سدھ گیا تھا، میں جتنی بار اُن کے سامنے سے گزرتا، اُن کے سر جھک جاتے، میں گردن اکڑا کر گزر جاتا۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ میں لفٹ کی طرف جانے کی خاطر کاؤنٹر کے قریب سے گزرا تو ایک نو عمر حسینہ مسکراتی بل کھاتی کاؤنٹر سے باہر آ کر بولی۔

”سر..... میڈم چین آپ کو دو بارفون کر چکی ہیں۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، سر کو خفیف انداز میں ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ رات زیادہ ہو چکی تھی، مجھے چین کے روزمرہ کے معمولات کا علم تھا، وہ جلدی سونے کی عادی تھی، میں نے اُسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

دوسری صبح ناشتہ کرنے کے بعد میں نے ہندوستان واپسی کے لئے سیٹ بک کرانی پھر چین کی طرف چلا گیا۔ اُس روز اتوار تھا، چین چھٹی والے دن دیر تک سونے کی عادی تھی، انکا راستہ بھر شوخیان کرتی رہی، میں مسکراتا رہا۔ وہ ساتھ نہ ہوتی تو وقت گزارنا مشکل ہو جاتا۔ کیب فارم ہاؤس پر رُکی تو پہلے ماریا سے مل بیٹھ ہو گئی۔ وہ کسی کام سے باہر آئی تھی، مجھے ٹیکسی سے اُترتا دیکھ کر قریب آ گئی۔ میں نے اُسے نہر تاپا بہت غور سے دیکھا، مورگن کے آجانے کے بعد وہ جسمانی طور پر پہلے سے زیادہ تروتازہ نظر آرہی تھی۔

”کیسی ہو ماریا.....؟“

”آپ کی مہربانی سے بہت خوش ہوں۔“ اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”کبھی مجھے بھی یاد کرتی ہو یا مورگن کے آنے کے بعد فراموش کر دیا؟“ میں نے دبی آواز میں سرگوشی کی، وہ میرے جملے کا مفہوم سمجھ کر اور گلنار ہو گئی۔ میں اُس کے ساتھ ساتھ مکان میں داخل ہوا، چین ڈیرینک گاؤن میں ملبوس لاؤنج میں بیٹھی کسی میگزین کے اوراق پلٹ رہی تھی۔ قریب ہی اُس کی ماں وہیل چیئر پر موجود تھی۔ چین نے مجھے خلاف توقع دیکھا تو خوشی سے دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اُس کی ماں نہ ہوتی تو شاید میں اُس کے ہونٹوں کو آخری بار چوم لیتا لیکن یہ حسرت بھی دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ چین نے مجھے ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب ہی بٹھالیا، چین کی ماں مجھے تشکرانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”میرا ایک مشورہ ذہن نشین کر لو۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”چین اور جیکب کا تذکرہ تمہاری رپورٹ کے درمیان کہیں بھی نہ آنے پائے، ورنہ دوسری بار شاید میں بھی تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں۔“

”اوکے باس۔“ جم نے اٹھ کر مجھے باقاعدہ سلیوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اب اجازت چاہوں گا۔ صرف تمہارا شکریہ ادا کرنے کی خاطر آ گیا تھا، ورنہ دفتر میں اس وقت بھی بڑے بڑے افسران اور اخباری نمائندوں کی بھیڑ لگی ہے۔ تمہاری وجہ سے مجھے جو عزت اور شہرت ملنے والی ہے اس کا پیشگی شکریہ، میں تم سے دوبارہ بہت جلد ملاقات کروں گا۔“  
جم چلا گیا تو میں نے انکا کی سمت دیکھا جو ابھی تک جم کی لن ترانی پر بیچ و تاب کھا رہی تھی۔ میں نے روم سروس کو کافی کا آرڈر دیا، پھر ایک صوفے پر بیٹھ کر تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ایک مرحلہ اور طے ہوا..... کل صبح میں واپسی کے لئے سیٹ بھی بک کرالوں گا۔“

”میں سمجھ رہی ہوں جمیل کہ تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ لیکن اپنی انکا کے ہوتے تم کوئی غم نہ کرو، حالات بدلتے رہتے ہیں۔“ انکا نے مجھے ڈھارس دی، پھر مدھم لہجے میں بولی۔ ”چین کے فارم ہاؤس کب چلو گے.....؟ چین کے علاوہ اُس کی بوڑھی ماں سے بھی مل لینا، تمہاری ایک قیمتی شے بھی وہاں رکھی ہے..... سیڈ مجذوب کی لاشی، اُسے جلدی میں بھول نہ جانا، ہو سکتا ہے کہ کبھی وہ مجھ سے زیادہ تمہارے کام آئے۔“

انکا اپنی باتوں سے میرا دل بہلاتی رہی۔ کافی نے میرے اعصاب پر تناؤ کی کیفیت کو کچھ کم کر دیا۔ رات کا کھانا میں نے پکا ڈلی اسٹریٹ کے ایک شاندار ہوٹل میں کھایا، انکا ہوٹل میں بھی اپنی شرارتوں سے لوگوں کو حیرت زدہ کرتی رہی۔ میں اُس کی شوخیوں کا مقصد سمجھ رہا تھا، وہ میری خاطر کھیل تماشے کر رہی تھی۔ میں کھانا کھا کر ہوٹل سے نکلا تو انکا نے بڑی رازداری سے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

”یہاں سے کچھ فاصلے پر سوہو کا علاقہ ہے، جہاں تہذیب کا عریاں رقص ہوتا ہے، پکا ڈلی کا ریڈ لائٹ ایریا بھی قابل دید ہے، یہاں برطانوی حسیناؤں کے علاوہ غیر ملکی شکاری لڑکیاں بھی اپنے حسن کا جال لئے شکار کی تلاش میں گھومتی پھرتی ہیں۔“ انکا نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ”سنائے کہ اُن کے جسم میں کاک ٹیل (COCKTAIL) خون

مورگن بھی اُس کے پیچھے پیچھے تھے۔  
 ”دولت علی۔“ جین نے مجھ سے رستی مصافحہ کرتے ہوئے بڑے لاڈ سے کہا۔ ”میری شادی پر تمہیں کوئی ایسا آئٹم پیش کرنا ہوگا جو سارے مہمانوں کو حیرت زدہ کر دے۔“  
 ”میں دوسروں کی بات نہیں کرتا۔“ میں نے دل مسوس کر جواب دیا۔ ”البتہ تم ضرور حیران رہ جاؤ گی۔“

جین کے فارم ہاؤس سے واپسی پر انکا ساتھ نہ ہوتی تو شاید میرا دل پھٹ جاتا، اب صرف وہی میری مونوس وغنوار رہ گئی تھی۔ میرے ڈکھ سکھ کی رفیق۔ میں سید مجذوب کی لالچی کو سینے سے لگائے بیٹھا رہا، انکا میرے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر معصوم معصوم شرارتیں کرتی رہی، لطیفے سناتی رہی۔ سفر آسانی سے کٹ گیا.....!

دوسرے روز میں عدالت میں پیش ہو گیا۔ دو کیس کے بعد میرا نام پکارا گیا۔ میں سینہ تانے کٹھن میں جا کھڑا ہوا، آرتھر کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سرکاری وکیل بھی اپنی نشست پر بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ شاید انہیں بھی فیصلے کی بھٹک مل گئی تھی۔ حج اپنے سامنے رکھی فائل پر جھکا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ میں نے جیوری کے ممبران کی طرف دیکھا، مورینا سے میری نظریں چار ہوئیں، آج وہ خاص طور پر بن سنور کر آئی تھی۔ میں اُس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکا۔ اُس کے انگ انگ سے مستی پھوٹ رہی تھی۔  
 ”دیکھ رہے ہو جیمیل؟“ انکا نے سرگوشی کی۔ ”آج یہ کیسی پٹاخہ لگ رہی ہے۔ تمہیں اپنا وعدہ تو یاد ہے.....؟“

”تم جانتی ہو انکارانی۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”آج رات میری روائگی ہے۔ صبح دو بجے کی فلائٹ سے میں لندن کو گڈ بائی کہہ کر ہندوستان کے لئے پرواز کر جاؤں گا۔ جاتے جاتے مجھے کچھ ضروری کام بھی سرانجام دینے ہیں۔“  
 ”میں تمہارے سارے کام کر دوں گی، تم میری خاطر تھوڑا سا وقت نکال لو۔“ انکا، مورینا کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہم آرتھر کو کوئی سبق دیئے بغیر چلے گئے تو اُسے باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب تم خوب سمجھ رہے ہو جیمیل۔“ انکا نے کسمسا کر جواب دیا۔ ”تم جانتے ہو کہ

”اب تو آپ خیریت سے ہیں؟“ میں نے معنی خیز لہجہ اختیار کیا۔ وہ میرے جملے میں چھپا طنز بھانپ گئی۔  
 ”میں تمہاری شکر گزار ہوں دولت علی۔“ وہ کسمسا کر بولی۔ ”تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گے۔“ اُس کے لہجے میں شرمندگی کا اظہار گھلا ہوا تھا۔  
 ”میرے ساتھ میرے کمرے میں چلو۔“ جین نے اُٹھتے ہوئے مجھے ہاتھ تھام کر کھینٹا۔ ”مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔“  
 میں جین کے ساتھ اُس کے کمرے میں چلا گیا۔ اُس نے جبرالڈ کی گرفتاری پر حیرت کا اظہار کیا، میرا شکریہ ادا کرتی رہی۔ پھر اُس نے ولیم کی بات چھیڑ دی، میں دل پر پتھر رکے مسکراتا رہا۔ اُس کی باتیں ختم ہوئیں تو میں نے اُسے یاد دلایا۔  
 ”کل عدالت میں میری پیشی ہے۔“

”پریشان مت ہو دولت علی۔“ اُس نے پیار سے میرا ہاتھ تھام کر یقین دلایا۔ ”میرا دل گواہی دیتا ہے کہ کل تم باعزت طور پر رہا کر دیئے جاؤ گے، جم کا بھی یہی خیال ہے۔“  
 ”ہاں.....“ میں نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”مجھے رہائی مل جائے گی، اس کے بعد میں ہندوستان چلا جاؤں گا۔“  
 ”میری شادی میں تو شرکت کرو گے نا؟“ جین نے مجھے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا، پھر پہلو بدل کر بولی۔ ”یہیں لندن میں کیوں نہیں رہتے؟ ہندوستان میں اب تمہارے لئے کیا رکھا ہے؟“

”تم کہتی ہو تو ضروری کام نمٹا کر واپس آ جاؤں گا۔“ میں نے جین سے آخری جھوٹ بولا۔ انکا کسمسا کر رہ گئی۔

مجھے جین کے اصرار پر دوپہر کے کھانے کے لئے رُکنا پڑا۔ سب ہی میری آؤ بھگت میں لگے رہے، ماریا پیش پیش تھی، مورگن نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جین کی بوڑھی ماں کی نگاہیں بھی بار بار مجھ سے ایک ہی بات کہتی رہیں۔

”مجھے معاف کر دینا دولت علی، میں نے تمہارے بارے میں غلط اندازے لگائے تھے، تم بالکل مختلف ثابت ہوئے.....“  
 میں کھانے سے فارغ ہو کر جانے لگا۔ جین مجھے ٹیکسی تک رخصت کرنے آئی۔ ماریا اور

خون میری غذا ہے، تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مجھے انسانی خون کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب تم بڑی پابندی سے میری ضرورت کا خیال رکھتے تھے، اب میں تم سے اصرار نہیں کرتی، کسی اور ذریعے سے اپنی غذا کا بندوبست کر لیتی ہوں۔ لیکن آج مورینا کے چہرے کی ملاحت دیکھ کر میری بھوک بھڑک اٹھی ہے، اُس کا گداز جسم، اُس کے بھرے بھرے گال، میں نے کبھی کسی سیاہ فام عورت کا خون نہیں پیّا۔ سنا ہے ان کے خون میں ایک خاص لذت ہوتی ہے۔ سن رہے ہو جمیل؟ میرے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے ہیں، آج تم اپنی انکارانی کی درخواست رد نہ کرنا۔ میں تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“

میں نے ایک عرصے بعد انکا کے لب و لہجے میں وہی خوفناک غراہٹ سنی جو پہلے اکثر سنا کرتا تھا۔ مورینا کو وہ ایسی خونخوار بلی کی طرح گھور رہی تھی جو کسی کبوتر کو شکار کرتے وقت ہر خطرے سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ میں کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ جج کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”مسٹر دولت علی، تم نے گزشتہ پیشی پر عدالت سے پولیس آفیسر مسٹر لوئیس آرتھر سے تین باتیں دریافت کرنے کی اجازت چاہی تھی۔ عدالت نے تمہیں اس کا موقع دیا تھا۔ تم دو باتیں دریافت کر چکے ہو، کوئی ایک آخری بات رہ گئی ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ یہ عدالت تمہیں ایک خاص وجہ سے مسٹر آرتھر سے کوئی مزید سوال کرنے کا موقع فراہم نہیں کر سکتی۔“

”گویا یہ معزز عدالت اپنے وعدے سے منحرف ہونے کا اعتراف کر رہی ہے۔“

میرے لہجے میں طنز تھا۔

”تم جو چاہو سوچو، عدالت کسی کے ذہن پر پہرے نہیں بٹھا سکتی۔“ جج نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ انکا میرے سر پر پہلو بدلنے لگی۔ جیوری کے ممبران ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ مورینا کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں پر اُداسی کے بادل تیرنے لگے، آرتھر کی نگاہوں میں اُمید کی کرن ٹٹمناے لگی، سرکاری وکیل چونک کر جج کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہونے لگیں، ایک لمحے کو عدالت کے وسیع ہال میں موت کا سناٹا طاری رہا، پھر جج نے مجھے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

”مجھے اس بات کا اعلان کرتے ہوئے کوئی جھجک نہیں محسوس ہو رہی کہ تمہارے کیس کا

فیصلہ لکھا جا چکا ہے۔ قانون کی رو سے تم اگر چاہو تو اس عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل کا حق رکھتے ہو۔“ جج نے تھوڑا توقف کیا، عدالت میں پھر گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ انکا کی وحشت قابل دید تھی۔ جج کی آواز دوبارہ گونجی۔

”جیوری کے ممبران کی متفقہ رائے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اور قانونی دستاویز کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ عدالت تمہیں مسٹر آرتھر سے تیسری بات دریافت کرنے کا موقع دینے بغیر..... باعزت طور پر بری کرتی ہے اور مسٹر آرتھر کو پابند کرتی ہے کہ وہ دس روز کے اندر اندر تحریری وضاحت پیش کریں کہ انہیں تمہارے خلاف غلط کیس بنانے کے جرم میں ملازمت سے معطل کیوں نہ کر دیا جائے۔ یہ عدالت سرکاری وکیل کو حکم دیتی ہے کہ وہ اپنی موجودگی میں تمہاری رقم فی الفور پولیس سے واپس دلائے۔ تم تفصیلی فیصلے کی نقل ایک ہفتے بعد حاصل کرنے کے مجاز ہو گے۔“

جج فیصلہ سنانے کے بعد اپنے چیمبر میں چلا گیا، انکا نے میرے سر پر دھمال شروع کر دی۔ آرتھر کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی، مورینا کے ہونٹوں پر دوبارہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ جیوری کے دوسرے ممبران جج کے فیصلہ سنانے کے انوکھے انداز پر ہنس ہنس کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ میں آرتھر کو نفرت اور حقارت بھری نظروں سے گھورنے لگا جو سکتے کی کیفیت سے دوچار تھا۔ سرکاری وکیل نے سفری بیگ اور ننانوے ہزار دو سو پونڈ کی رقم واپس کرنے میں خاصی ثبوت کا مظاہرہ کیا۔ وہ مجھ سے رقم گننے کی درخواست کر رہا تھا۔ میں نے اُس کی تیار کردہ رسید پر رقم گنے بغیر بے پرواہی سے دستخط کئے اور سفری بیگ اٹھا کر باہر آ گیا..... ہوٹل پہنچنے سے پہلے میں نے مشرقی روایت کے پیش نظر ننانوے ہزار ایک پونڈ کا بینک ڈرافٹ جین کے نام تیار کر لیا۔ میں نے وہ بینک ڈرافٹ ایک مختصر الوداعی پیغام کے ساتھ ایئر پورٹ سے فارم ہاؤس کے پتے پر بھیجنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ انکا نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ اُس نے مورینا کے سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہے۔ میں نے اُسے ٹولنا مناسب نہیں سمجھا۔

دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد میں سونے کے ارادے سے لیٹ گیا، شام کو میں نے ہوٹل کا حساب چکٹا کر دیا۔ اُن سے میں نے یہی کہا کہ میں اپنے ایک مقامی دوست کے گھر منتقل ہو رہا ہوں، یہ تاکید بھی کر دی کہ میرے سلسلے میں اپنی زبان بند ہی رکھیں۔ وہ جم سے

خوفزدہ تھے، مجھے یقین تھا کہ میری ہدایت کی خلاف ورزی نہیں کریں گے.....!

ہوٹل سے نکل کر میں نے ایک کیب ڈرائیور کو انگیج کیا اور لندن کی سڑکوں کے بے معنی چکر لگانے لگا۔ جین سے جدائی کا خیال مجھے بری طرح ڈس رہا تھا۔ میں کسی زمانے میں عیاشی کے لئے مے نوشی کرتا تھا۔ اُس روز میں نے ایک بار میں رُک کر غم غلط کرنے کی خاطر تین پیگ حلق میں انڈیل لئے۔ مجھے بار میں جاتا دیکھ کر کیب ڈرائیور نے حساب کرنے کی درخواست کی، عام طور سے لندن میں ایسا نہیں ہوتا لیکن ڈرائیور نے اپنی ایک مجبوری اور وقت کی تنگی کا اظہار کیا تھا اس لئے میں نے اُسے جانے دیا۔ میں نے کافی عرصے بعد پتی تھی اس لئے میرے قدم تھوڑے تھوڑے ہٹنے لگے۔ لیکن میرے ہوش و حواس پوری طرح کام کر رہے تھے۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا کسی دوسری کیب کا انتظار کر رہا تھا جب ایک میرون رنگ کی لمبی سی گاڑی میرے سامنے آ کر رُک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر مورینا کو دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔

”آپ، مسٹر دولت علی.....“ اُس نے بڑی بے تکلفی کا اظہار کیا۔ ”کہاں جانا ہے؟“

”جہاں آپ لے جانا چاہیں۔“ میں روانی میں کہہ گیا۔ شاید نشے کا اثر تھا جس نے مورینا کو دیکھ کر مجھے بے باک بنا دیا تھا۔ اُس نے میری بات کا برا نہیں مانا، ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا۔ میں نے اُس کی دعوت رد نہیں کی۔ گاڑی دوبارہ حرکت میں آئی تو میں نے ڈیش بورڈ کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں تفریح کے ارادے سے نکلا تھا لیکن اطلاعاتاً عرض ہے کہ میں آج رات دوبجے کی فلائٹ سے واپس ہندوستان جا رہا ہوں۔ مجھے گیارہ بجے ایئر پورٹ پہنچنا ہے۔ آپ کا ایک قرض چکنا کرنا تھا اس لئے ساتھ بیٹھ گیا۔“

”ڈونٹ وری۔ میں آپ کو وقت سے پہلے ایئر پورٹ پہنچا دوں گی۔“ اُس نے مترنم آواز میں جواب دیا، پھر مسکرا کر بولی۔ ”قرض والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”آپ نے جیوری کی ایک معزز اور معتبر ممبر ہونے کے باوجود جس طرح میرے حق میں رائے دی میں اس کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔“

”حیرت انگیز.....“ اُس نے ایک خاص ادا سے شانے اچکا کر دریافت کیا۔ ”آپ کو کیسے علم ہوا کہ میں نے آپ کو سپورٹ کیا تھا؟“

”اگر میں صاف گوئی سے کام لوں تو آپ خفا تو نہیں ہوں گی؟“ میں نے اُس کے سراپا

کا جائزہ لیا۔ وہ جیتی جاگتی قیامت نظر آ رہی تھی۔

”علم نجوم.....؟“ اُس نے میری طرف قاتلانہ نظروں سے دیکھا۔

”جی نہیں..... آپ کی مخمور اور حسین آنکھیں جودل کا بھید نہیں چھپاتیں.....“ میں نے شاعرانہ انداز اختیار کیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”اپنے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ مورینا کا لہجہ معنی خیز تھا۔ وہ اتنی جلدی مجھ سے بے تکلف ہو جائے گی، مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ میں نے جسارت سے کام لے کر اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ہمارے درمیان سے رکی تکلف کی عارضی دیوار سرکنے لگی۔ بے تکلفانہ گفتگو کا دور شروع ہوا تو میرے جسم پر چیونٹیاں ریگنے لگیں۔ میرے ہاتھ کی شونخیاں حدود سے تجاوز کرنے لگیں۔ کچھ شراب کا اثر تھا، کچھ مورینا کے مہکتے گداز جسم کا سحر انگیز نشہ، ضبط کے بندھن ٹوٹنے لگے۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد مورینا نے گاڑی ساحلی علاقے میں ایک الگ تھلک بنے خوبصورت ہٹ کے سامنے روکی۔ ہم نیچے اترے۔ سرد ہوا کے جھونکوں نے ہمارا استقبال کیا، وہ بے تکلفی سے میرا ہاتھ تمام کے ہٹ کے اندر لے گئی جس کی نفاست اور قیمتی اشیاء قابل دید تھیں لیکن میرے لئے اس وقت سب سے زیادہ قیمتی شے مورینا تھی جو قدم قدم پر میرے جنون کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی، مجھ سے بڑھ چڑھ کر بے باکی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

میں اُس کے گداز وجود کو ہانہوں میں سیٹے بستر پر دراز ہوا تو اچانک مجھے انکا کا خیال آ گیا۔ میں نے اُسے دیکھنے کی کوشش کی، وہ سر پر موجود تھی۔ میں مسکرا دیا، سمجھ گیا کہ اُس نے عدالت میں مورینا کے بارے میں کہی ہوئی اپنی بات منوانے کے لئے کون سا راستہ اختیار کیا ہے؟ مورینا کا شراب خانے کے سامنے گاڑی روک کر میرے ساتھ بے تکلفی سے پیش آنا، مجھے لفٹ دینا، ساحلی علاقے کی اُس پرسکون ہٹ تک لانا، میری شونخیوں کو برداشت کرنا، سراہنا، یہ سب یوں ہی تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس کی پشت پر انکارانی کا ہاتھ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ مورینا کے سر کو اپنا مورچہ بنا چکی تھی۔ راوی میرے حق میں چین لکھتا تھا۔ میں وقت گزاری کی خاطر ہوٹل سے نکلا تھا، غم غلط کرنے کی خاطر میں نے شراب کا سہارا لیا تھا۔ مجھے سکون کی تلاش تھی۔ جین کا تصور مجھے بے چین کر رہا تھا۔ مورینا نے ہانہیں پھیلا کر

میرے نفس کو اُکسایا، میں سب کچھ بھول کر اُس کی بانہوں میں سمٹ گیا، اُس کی ایک ایک حرکت بچان اُگیز تھی، مجھے وقت کا احساس نہیں رہا۔ مورینا جیسی سیاہ فام حسینہ، اُس کے جسمانی نشیب و فراز اور پُر سکون ماحول میسر ہو تو وقت کا دھیان کس سمجھت کو رہ سکتا ہے؟ میں بھی اُس کے وجود میں تحلیل ہو کر ہر فکر سے بے نیاز ہو گیا۔ وہ سرکش موج کی طرح ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔ میں ماہر پیراک کی طرح ہاتھ پاؤں چلاتا رہا۔ ساحل پر پہنچ کر دونوں نڈھال ہو گئے۔ اُس کی سانسیں بکھرنے لگیں۔ میری طوفانی شدتیں بھی نڈھال ہو گئیں!

”دولت علی!“ اُس نے میرے کشادہ سینے پر سر رکھ کر بڑی بے حیائی سے اعتراض کیا۔

”تم گندی رنگت کے لوگ ہمارے ساتھیوں سے زیادہ وحشی ہوتے ہو، کسی ظالم درندے کی مانند اپنے شکار کو بھنھوڑ ڈالنے کی خوب تمہاری فطرت میں رچی بسی ہوتی ہے۔ مجھے تم لوگوں کا یہ انداز اچھا لگتا ہے۔ جہاں کھل کر بات کرنے کی اجازت نہ ہو، وہاں گفتگو کا مزہ نہیں آتا..... یو آزیلی ونڈرفل!“

مورینا ساری رات گزارنے کے موڈ میں تھی۔ انکا نے میرے سر پر آکر کہا۔

”تم نے کہا تھا کہ گیارہ بجے ایئر پورٹ پہنچنا ہے۔ اس وقت ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ دیر مت کرو، میری خاطر گول میز سے پھل کاٹنے والا چاقو اٹھا کر مورینا کے اٹھتے ہوئے سینے میں گھونپ کر نکل جاؤ، باہر گاڑی موجود ہے۔ کسی بات کی فکر نہ کرنا، میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔“

میں نے سر پر نگاہ ڈالی۔ انکا کے چہرے پر آدم خور درندوں جیسی تمام علامتیں موجود تھیں۔ میرے لئے یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر انکا کی فرمائش کی تکمیل کی۔ مورینا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُس کے سینے سے گاڑھا گاڑھا خون بھل بھلانے لگا..... کمرے میں ”سڑپ، سڑپ“ کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ انکا نے خون پینے کا عمل شروع کر دیا ہے۔ میرا نشہ ہرن ہو گیا۔ میں نے برق رفتاری سے لباس پہنا، باہر آکر گاڑی سٹارٹ کی، ہٹ سے ہوٹل اور ہوٹل سے سینڈ کی لاٹھی اور ایک سفری بیگ اٹھا کر ایئر پورٹ پہنچنے پہنچنے ساڑھے گیارہ بج گئے۔ میں نے گاڑی پارکنگ لاٹ میں چھوڑنے سے پہلے تمام مکملہ فکر پرش مناد بچے تھے۔ مجھے زیادہ فکر بھی نہیں تھی۔ لندن سے میرا تعلق ختم ہونے میں زیادہ دیر نہیں رہ گئی تھی۔

بورڈنگ کارڈ حاصل کرنے کے بعد میں نے بینک ڈرافٹ اور چین کے نام مختصر پیغام والے لفافے کو سپر ڈاک کیا، فضائی کمپنی کی خاتون کی مترنم آواز بار بار مائیک پر ابھر رہی تھی۔ وہ مسافروں سے جہاز میں بیٹھنے کی درخواست کر رہی تھی۔ دو بجنے میں پانچ منٹ باقی رہ گئے تو میں نے چین کے نمبر ڈائل کئے۔ چھ سات گھنٹیوں کے بعد دوسری طرف سے چین کی نیند میں ڈوبی آواز ابھری۔

”چین.....“ میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں شادی کی پیشگی مبارکباد پیش کرتا ہوں، ولیم کے ساتھ خوش رہنے کی کوشش کرنا۔“

”دولت علی، تم..... تم نے اس وقت رات کے دو بجے مجھے شادی کی مبارکباد دینے کی خاطر سوتے سے جگایا ہے؟“ چین نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا، پھر پریشان لہجے میں پوچھا۔ ”تم خیریت سے تو ہو؟..... کہاں سے فون کر رہے ہو؟“

”میں ایئر پورٹ سے بول رہا ہوں۔“ میں نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”آدھے گھنٹے بعد میرا جہاز لندن کی سرزمین چھوڑ کر فضا میں بلند ہو جائے گا۔ اپنا خیال رکھنا، زندگی رہی تو شاید پھر کسی موڈ پر تم سے.....“

”دولت علی۔“ چین نے تڑپ کر بے چینی کا اظہار کیا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم نے مجھ سے ملنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور میری شادی.....“

”خدا حافظ چین۔“ میں نے ریسپورنڈ پر رکھ دیا اور گیٹ نمبر اٹھارہ کی سمت تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ میرے دل کی کیا کیفیت تھی، اس کا صحیح اندازہ کون لگا سکے گا.....؟؟





لندن سے میری واپسی کی اطلاع سن کر جین دیوانی ہو گئی ہوگی۔ اُس نے بہت کچھ سوچا ہوگا، مختلف امکانات اُس کے ذہن میں کلبائے ہوں گے، اُس کی رات کی نیند خراب ہو گئی ہوگی۔ شاید اُس نے سارا کوفون کیا ہو؟ جم کوٹھولا ہو؟ جم سے میری اچانک واپسی کی بات کی ہو، پھر تھک ہار کر اپنے دل کی دھڑکنوں میں گم ہو گئی ہو.....

وقت آہستہ آہستہ ریگ رہا تھا۔ میرے برابر کی نشست خالی تھی۔ میں نے جین کو ذہن سے نکال کر ہندوستان کے بارے میں غور کرنا شروع کر دیا، پریم لال نے مجھ سے عہد کیا تھا کہ جو کام کلدیپ ادھورے چھوڑ گئی وہ مجھے نمٹانے ہوں گے۔ اُسی نے بتایا تھا کہ پنڈتوں اور پجاریوں کی ٹولی پھر میرے خلاف محاذ آراء ہو رہی ہے۔ بدری نرائن کے سر پھرے چیلوں نے اُس کی چٹا کی راکھ کو ایک لٹیا میں محفوظ کر لیا تھا، دریا برد نہیں کیا، سر جوڑ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ میرے کر یا کرم کے بعد ہی وہ اپنے گرو کی راکھ کو تبت کی کسی چوٹی پر بکھیریں گے۔

امر لال کے اکلوتے بیٹے چندرانے بھی میرے خلاف کچھ ٹھان رکھی تھی، اُس نے اپنے خون سے ماتھے پر تلک لگا کر کالی کے قدموں میں بیٹھ کر قسم کھائی تھی کہ جب تک وہ اپنے باپ کا انتقام چکنا نہیں کرے گا، کسی عورت کے جسم کو ہاتھ نہیں لگائے گا، پریم لال کی اطلاع کے مطابق وہ وندھیا چل کی کسی پہاڑی گھاٹی میں آسن بجائے بیٹھامہان تختی حاصل کرنے کی خاطر جاپ میں گن تھا۔ انکا نے مجھے پنڈت نول کشور کے بارے میں بتایا تھا کہ ہردوار میں بیٹھامہان پجاریوں کی فوج تیار کر رہا تھا، کالی کے مندر کا بڑا پروہت ہونے کی وجہ سے اُس کی رسائی دُور دُور تک تھی۔ ہزاروں نا عاقبت اندیش پجاری اُس کے اشارے پر سرھڑکی بازی لگانے کو تیار بیٹھے تھے، نول کشور میرے بدترین دشمن بدری نرائن کا ہوا تھا۔ پہلے وہ بزدلوں کی طرح دُور بیٹھامہان بدری نرائن کے بھیانک انجام پر سر پیٹتا رہا، اب اُسے کالی کی خوشنودی حاصل ہوئی تو مجھے ٹھکانے لگانے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

لندن میں سکون کی زندگی گزارنے کے بعد مجھے ہندوستان جانے کی کیا ضرورت تھی؟ کلدیپ نے امر لال کو جس طرح کتوں کی موت مارا تھا اس کا ایک ایک منظر میرے ذہن، میرے دل و دماغ پر نقش تھا، کلدیپ نے پہل نہیں کی تھی۔ امر لال کو کلدیپ کی آشیر باد نے گھمنڈی بنا دیا تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کلدیپ نے میری خاطر اپنی زندگی

برٹش ایئر لائنز کے دیو پیکر طیارے نے زمین سے فضا کی بلندیوں کی طرف پرواز کی تو جین سے میرا تمام رشتہ جیسے کچے دھاگے کی مانند ٹوٹ گیا۔ اُس کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔  
”دولت علی، میری شادی پر تمہیں کوئی ایسا آئیٹم پیش کرنا ہوگا جو سارے مہمانوں کو حیرت زدہ کر دے“

میں اُس کی شادی پر لندن میں ہوتا تو اُس کی آخری خواہش ضرور پوری کرتا۔ ایسے ہنگامے کرتا کہ سارا انگلستان ششدر رہ جاتا۔ وہ بھی کیا یاد کرتے کہ کسی ہندوستانی سے پالا پڑا ہے۔ لیکن میں نے خاموشی سے واپسی کا پروگرام مرتب کر لیا۔ اب وہاں رکنے سے فائدہ بھی کیا تھا؟ میں جین کو کسی اور کی بانہوں میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے زندگی کے آخری لمحوں میں مجھے اپنی بھرپور جوانی کی بیساکھی کا سہارا دیا تھا، اُس کے احسان بے شمار تھے۔ میں نے اُسے ولیم کے محفوظ ہاتھوں میں سوئپ کر کچھ حساب بے باق کر دیا۔ لیکن اُس کے قرب کے حسین، مہکتے، گنگناتے لمحوں کو اس سے قریب رہ کر یکسر نظر انداز کر دینا میرے اختیار میں نہیں تھا، سو میں نے جین ہی سے نہیں، لندن سے بھی منہ موڑ لیا۔

جین کی یاد آئی تو میں نے نشست کی پشت سے سرٹکا کر آنکھیں بند کر لیں، میرے ذہن کی اسکرین پر گزرے دنوں کی تلخ و شیریں یادیں ریگنے لگیں، جین سے دُور رہنے کی خاطر میں نے ماریا کو اپنی عارضی دلہن کی کا ذریعہ بنالیا، جین کے فارم ہاؤس سے منتقل ہو کر ہوٹل کی رہائش اختیار کی جہاں میلبا جیسی معصوم مگر تجربہ کار حسینہ میرا دل بہلاتی رہی۔ مجھے سیاہ فام مورینا کی یاد آئی جسے دیکھ کر انکا بھی دیوانی ہو گئی تھی۔ وہ لندن میں میرا آخری شکار تھی۔ اُسے ساحلی علاقے کی ہٹ میں چھوڑ کر میں ایئر پورٹ چلا آیا، انکا ابھی تک اُس کے کھولتے خون کی سرد پڑتی حرارتوں کو اپنے وجود میں منتقل کرنے میں مصروف ہوگی۔

بھینٹ دینے کا وعدہ کر کے کالی کا اعتماد حاصل کیا ہوگا۔ وہ ایک ایک کر کے اپنے ترکش کے سارے تیر آزماتا رہا، کلدھپ اذیتیں برداشت کرتی رہی، چٹان کی طرح کھڑی رہی، کسی موقع پر اُس کے قدم نہیں ڈمگ گئے۔ پھر جواب میں کلدھپ نے پلٹ کر وار کیا تو امر لال جان بچانے کی خاطر اس پرانے مندر کی طرف بھاگا جہاں مالا کو قید کیا گیا تھا۔ کلدھپ نے اُس کی تمنا نہیں پوری ہونے دی۔ امر لال کی موت بڑی عبرت ناک تھی۔ بدری نرائن اور امر لال کی موت کے بعد کھیل متا شے ختم ہو گئے تھے۔ کلدھپ کی موت کے بعد میں تنہا رہ گیا، مجھے زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں رہا۔ میں نے انکا کو بھی سر سے دُور کر دیا، بھینٹی کی فٹ پاتھ پر موت کے انتظار میں ایڑیاں رگڑتا رہا۔ اُس وقت بھی کسی نے میری سمت آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔ اُن کے دلوں پر جمیل احمد خان کی دھاک بیٹھی تھی، بدری نرائن اور امر لال کی موت نے انہیں خوفزدہ کر رکھا تھا، وہ چوہوں کی طرح بلوں میں دبک گئے، کوئی ایک بھی ایسا مرد ثابت نہیں ہوا جو میرے سامنے آتا، مجھ سے آنکھ ملا کر بات کرتا۔ اب چوہنیوں کے پر کل رہے تھے.....!

پریم لال نے لندن کے ہسپتال میں عین وقت پر سامنے آ کر میرا راستہ نہ کاٹا ہوتا تو کہانی ختم ہو چکی ہوتی۔ کوئی رونے والا نہ ہوتا۔ رکن الدین کو موت کی خبر ملتی تو قفل اور فاتحہ کی رسم ادا کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا؟ چچا اور اُن کے گھر والے بھی آنسو بہانے کے بعد دوبارہ زندگی کے ہنگاموں میں گم ہو جاتے۔ شبن خان کف انوس ملتا رہ جاتا۔ ایک تین ایسی تھی جو بڑے دنوں تک میری جدائی کا سوگ مناتی رہتی۔ میں نے اور کلدھپ نے اُسے بیٹیوں کی طرح اپنایا تھا۔

ترکین کی یاد آئی تو میرا دل تڑپ اٹھا، وہ غریب بھی میری وجہ سے دوبار میرے دشمنوں کی کیننگی کا شکار ہو چکی تھی، وہ بد ذات مجھے کمزور کرنے کی خاطر اوچھے جھکنڈے استعمال کرتے تھے۔ اب بھی انہیں علم ہوگا کہ میرے واقف کاروں میں سے کون کہاں کہاں ہو گا؟ ہندوستان میں میری واپسی اُن کے لئے پھر وبال جان بن سکتی تھی لیکن میں پریم لال کی بات نہیں نال سکا، کلدھپ نے میری خاطر اپنی جوانی کی خوشیوں اور اُمنگوں سے منہ موڑ کر میسور کی پہاڑیوں پر زندگی بتادی۔ منڈل میں بیٹھی مجھے مضبوط کرنے کی خاطر دیوی دیوتاؤں کے لئے جاپ کرتی رہی، امر لال سے مجھے بچانے کی خاطر اُس غریب نے کالی

کے چہنوں میں قربانی پیش کرنے کا عہد کر لیا۔ وہ اپنا فرض پورا کر کے دنیا سے منہ موڑ گئی۔ میں اُس کے ادھورے کام پورے کرنے کی بجائے منہ چھپا لیتا تو میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہ کرتا۔ ایک پھانس سینے میں جھپتی رہتی.....!

میں اپنے خیالات میں مستغرق تھا جب ایک نسوانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔  
”مسٹر، یہ لاشی سیٹ سے ہٹا لیجئے..... پلیز۔“

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا، وہ ایک حسین دوشیزہ تھی، اندر کے اکھاڑے کی کوئی اپسرا تھی، پری تھی، حور تھی جو بڑی تمکنت سے کھڑی سید مجذوب کی اس لاشی کی طرف اشارہ کر رہی تھی جو میں نے خالی سیٹ سے نکادی تھی۔ مجھے تعجب ہوا، جہاز کو ایئر پورٹ سے روانہ ہوئے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا، وہ اچانک کہاں سے نمودار ہو گئی؟

”یہ میری سیٹ ہے.....“ اُس نے میری حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بڑے پُر وقار لہجے میں کہا۔ ”میں جہاز میں سوار ہونے کے بعد ایئر ہوسٹس کی اجازت سے اپنے ایک واقف کار کے ساتھ کچھ دیر کے لئے فرسٹ کلاس میں چلی گئی تھی، جہاز میں کچھ اور نشستیں بھی خالی ہیں۔“ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے تکلفی سے بات جاری رکھی۔ ”اگر آپ کہیں تو میں کسی دوسری خالی سیٹ پر.....؟“

”جی نہیں.....“ میں نے جلدی سے سید مجذوب کی لاشی اپنی طرف کر لی۔ اُس کے مہکتے وجود سے دُوری اختیار کرنا کفرانِ نعمت سے کم نہیں تھا۔ قرب و جوار میں بیٹھے ہوئے بیشتر مسافر اُسے حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ صرف دیکھے جانے کے نہیں، چاہے جانے کے قابل تھی۔ میرا بس چلتا تو اُسے اپنی پلکوں پر بٹھا لیتا، دل کی گہرائیوں میں چھپا لیتا۔

وہ اپنے قیامت جسم کو ہلکا سا بل دے کر خالی نشست پر بیٹھی تو اُس کے بدن کی خوشبو مجھے مسحور کر گئی۔ میری نظریں اُس کے سراپا میں گم ہو گئیں۔ وہ دراز قد اور سیس بدن تھی، قدرت نے اُسے بڑی فرصت میں تخلیق کیا ہوگا، اُس کے جسم کے ایک ایک نشیب و فراز اپنی مثال آپ تھے، میری نظریں بہکنے لگیں۔ اُس کی بکھری ہوئی دراز زلفیں شانوں پر ناگوں کی طرح بل کھا رہی تھیں۔ اُس کی شبنی آنکھیں، اُس کے چہرے پر کھیلتی ہوئی مدہم معصوم مسکراہٹ، اُس کے ہونٹوں کا گداز، اُس کے گلابی گالوں کا نکھار، صراحی دار گردن،

سینے کا زیروہم، لباس کی سرسراہٹ، بھیننی بھیننی خوشبو جو ذہن کو خوابوں کی دنیا کی سیر کرائے، سب کچھ قابل دید تھا۔ وہ قدرت کی تخلیق کا ایک حسین و جمیل شاہکار تھی۔ متحرک مجسمہ تھی، میں اُس کے حسن کی رعنائیوں میں غرق ہو گیا۔ میں نے اپنی زندگی میں ان گنت حسین چہرے دیکھے تھے، مجھے اُن کے قرب کی لذتوں سے سرشار ہونے کا شرف حاصل تھا، وہ میری آغوش میں کھلی کتاب کی طرح پڑی رہتی تھیں، میں انہیں ورق ورق پڑھتا تھا۔ لیکن وہ ان سب سے منفرد تھی۔ میری حسن شناس نگاہوں کے لئے ایک نادر اضافہ تھی۔ مجھے اُس کے ہم سفر ہونے پر فخر محسوس ہوا۔ دوسروں کی نگاہوں میں رقابت کے جذبے پھیلنے لگے۔

”آپ تنہا ہیں.....؟“ میں نے مہذب لہجے میں دریافت کیا۔

”جی نہیں.....“ اُس کے شیریں لبوں کو جنبش ہوئی۔ شوخی سے بولی۔ ”آپ بھی تو ساتھ ہیں۔“

میں لا جواب ہو گیا۔ سینکڑوں مسافروں سے بھرے جہاز میں اُس کی بے باکی کا کیا جواب دیتا؟

”آپ کا شبہ نام.....؟“ اُس نے مجھے کسمسا تا دیکھ کر مترنم لہجے میں دریافت کیا۔

”جمیل احمد خان.....“ میں نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔ اُس کے ماتھے کی بندیا دیکھ کر مجھے اُس کے ہندو ہونے کا شبہ ہوا تھا۔ اُس نے میرا شبہ نام پوچھ کر میرے شبے کی تصدیق کر دی۔

”میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ اُس کے لہجے میں تاسف اتر آیا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ کسی وچار میں گم تھے جب میں نے.....“

”جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”یونی لندن کے کچھ ساتھیوں کو یاد کر رہا تھا۔“

”آپ لندن کس لئے آئے تھے؟“

”سیر و تفریح کی خاطر.....“

”کوئی اور آپ کے ساتھ نہیں آیا.....؟“

”نہیں.....“ میں نے جان بوجھ کر مختصر جواب دیا۔

”اوہ.....“ اُس نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”پھر تو آپ بڑا اکیلا محسوس کرتے

ہوں گے۔“

”کرتا تھا..... اب نہیں۔“

”تباہ کیا ہو گیا.....؟“ وہ میری بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکی۔

”اب آپ جو ساتھ ہیں۔“ میں نے جسارت سے کام لیا، اُسی کا جملہ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ واپس لوٹا دیا۔

”خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ وہ مسکرا دی۔ ”سفر اچھا کٹ جائے گا۔“

”میں آپ کو کس نام سے مخاطب کروں؟“ میں نے حسن کی سرکشی کو شکمیوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”امریتا.....“

”سندر نام ہے، بالکل آپ ہی کی طرح.....“ میں روانی میں کہہ گیا۔ اُس نے برا نہیں منایا، مسکرانے لگی۔

ہمارے درمیان اجنبیت کا احساس ختم ہونے لگا۔ میں نے اُسے ٹٹولنے کی خاطر دریافت کیا۔

”آپ لندن کس کے پاس گئی تھیں.....؟“

”تھا ایک کام.....“ اُس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتی۔“

”آپ کے پتا جی کیا کرتے ہیں.....؟“

”لباسنر ہے۔“ اُس نے سرگوشی کی۔ ”آپ اتنی جلدی جلدی سب کچھ پوچھ لیں گے تو باقی کیا رہ جائے گا؟“

جہاز کا عملہ ڈرنکس کی ٹرائی لئے آمیا تو مسافر کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔ ہمارے درمیان ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ امریتا بہت جلدی مجھ سے کھل مل گئی تھی۔ مجھے اس کی اُمید نہیں تھی۔

”ایک بات پوچھوں آپ سے، برا تو نہیں منائیں گے؟“ اُس نے جوس کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔

”آپ ایک نہیں دس باتیں پوچھ سکتی ہیں۔“ میں نے فیاضی کا ثبوت پیش کیا۔

”بھگوان نہ کرے آپ کو ناگوں کا کوئی روگ تو نہیں ہے؟“

”یہ اندازہ آپ نے کیسے لگایا.....؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”آپ کے ساتھ یہ لاشی دیکھ کر.....“ امریتا نے لاشی پر نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ.....“ میرے ذہن میں سیدھڑوب اُبھر آیا۔ ”یہ میرے ایک دوست کی نشانی ہے۔ میں اسے کبھی خود سے جدا نہیں کرتا۔“

”دوست..... اور..... لاشی، بڑی حیرت کی بات ہے۔“ اُس نے بڑا لطیف طعنے لگا۔

”ہر شخص سے پھول ملنے کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔“ میں نے معنی خیز انداز اختیار کیا۔

”کیوں نہیں کی جاسکتی؟“ وہ بڑے قاتلانہ لہجے میں بولی۔ ”تن اُجلا ہو، من میں میل

نہ ہو، بول سچے ہوں تو منش کی منو کا منائیں اوش پوری ہوتی ہیں۔“

”آج کل ایسے دل والوں کو تلاش کرنے کی خاطر پوری دنیا کھگانے پڑے گی۔“ میں

نے دیدہ و دانستہ افسردگی کا اظہار کیا۔ ”اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔“

”آپ مجھے اندر سے دُکھی نظر آتے ہیں۔“ وہ کھانے سے ہاتھ روک کر مجھے دیکھنے لگی۔

اُس کی غزالی آنکھوں میں مستیاں ناچ رہی تھیں۔

”ہونٹوں کی مسکان کبھی کبھی دھوکہ بھی دے جاتی ہے۔“ میں نے زبردستی مسکرانے کی

کوشش کی۔ ”دل کا بھید ہر کوئی نہیں جان سکتا۔“

”آپ کا کوئی اپنا چھڑ گیا ہے شاید۔“ امریتا نے اپنائیت سے پوچھا۔ ”کون تھا.....؟“

”آپ جل پانی کرتی رہیں۔ میں نے اُسے اُکسانے کو کہا۔“ میں اپنی کھانا چنے بیٹھ

گیا تو آپ بور ہو جائیں گی۔ دوسرے کے دُکھ کون بانٹا ہے؟“

”ایک بات کہوں.....؟“

”کہئے.....“ میں نے سرد آہ بھری۔

”مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاسکتا۔“ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ نشو سے ہاتھ صاف

کرتے بولی۔ ”زندہ رہنے کے کارن بڑے پاپڑیلے پڑتے ہیں، بڑی کھٹنیاں بھونگی پڑتی

ہیں، لوہا زنگ پکڑ لے تو کسی کام کا نہیں رہتا، یہی حال منش کا ہے، کوئی روگ لگے اور اس کا

بر وقت علاج نہ کرایا جائے تو وہ اور بگڑ جاتا ہے۔ جیون کھٹارے کو کھینچنے کے لئے زور تو لگاتا

پڑتا ہے، ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جانے سے کام نہیں چلتا، ایک راستہ کھوتا ہو جائے تو دوسرا

کھوجنا پڑتا ہے، جیون پر ماتما کی سب سے سندر دین ہے، اس کی سندر تا کو بڑھانے کی

خاطر کانٹوں کی نہیں، مہکتے پھولوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو روٹھ جائے اُسے منایا جاسکتا

ہے، جو چھڑ جائے اُسے بھولنا پڑتا ہے، یہی دنیا کی ریت ہے۔ جو اس ریت کو توڑ دے وہ

بھیز سے الگ ہو جاتا ہے، اکیلا بھٹکتا رہتا ہے، اپنی منزل سے دُور ہوتا چلا جاتا ہے۔“ وہ

بڑی روانی سے زندگی کا فلسفہ بیان کر رہی تھی۔ ”ندی کے دو پاٹ کی مثال لے لیں، وہ

آپس میں کبھی نہیں ملتے لیکن پانی کا بہاؤ جاری رہتا ہے، بہاؤ ٹھننے لگے تو جیون تیا ڈمگانے

لگتی ہے، اسے کنارہ نہیں مل پاتا، کہیں راستے میں ٹھپ ہو جاتی ہے۔ اسے آگے بڑھانے

کے لئے منش کو اپنی قسقی استعمال کرنی پڑتی ہے۔ وہ نراش ہو جائے تو کہانی آگے نہیں بڑھ

سکتی، کہانی کو آگے بڑھانے کی خاطر کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑتا ہے.....“ وہ سانس لینے کوڑکی۔

”آپ نے کہاں سے سیکھ لیں یہ باتیں؟“ میں سوال کر بیٹھا۔

”سنسار کی بھیز چال نے سکھا دیں۔“ اُس کے گداز ہونٹوں پر ایک اُداس تبسم بچل کر رہ

گیا۔ ”جو چیزیں اوپر سے سندر نظر آئیں، کوئل دکھائی دیں، اندر سے بھی ان کا اتنا ہی سندر

ہوتا ضروری نہیں ہوتا۔ کنویں کی گہرائی کا اندازہ لگانے کے کارن نیچے جانا پڑتا ہے، ہر چمکنے

والی چیز سونا نہیں ہوتی، رسوں کو بھانے کے لئے، سماج میں پگ کی جھوٹی شان برقرار

رکھنے کی خاطر چاندی پر سونے کا پانی چڑھانا پڑتا ہے، طمع کئے ہوئے زیوروں، گہنوں سے

کام چلانا پڑتا ہے، سرخ جوڑے میں لپٹی سہی سہائی نئی ٹوبلی دِلہن کے ماتھے پر جھللاتے،

جھلک کرتے ٹیکے کی بھاگیہ (قسمت) میں کیا لکھا ہے؟ یہ کون جان سکتا ہے.....؟“

”مت کیجئے ایسی باتیں۔“ میں اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو نہ پاسکا۔ اُسے ٹوک کر

بولاً۔ ”کہیں آپ کو میری نظر نہ لگ جائے۔“

وہ بولتے بولتے رُکی تو مجھے یوں لگا جیسے فضا کی ساری نفیسی ختم ہو گئی ہو، سارے

سازوں کی آواز ایک ساتھ خاموش ہو گئی ہو۔ میری بات سن کر اُس کی مخمور نگاہوں میں جگنو

چمکنے لگے، ستارے جھلملانے لگے۔ اُس کی بنجیدگی میں مسرتوں کے رنگ گھلے تو وہ اور زیادہ

حسین بن گئی، اُس کی نگاہیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اُسے شاید خوشی تھی کہ وہ میرا

دُکھ بانٹنے میں کامیاب ہو گئی۔ میرے سینے میں ارمان ٹھاٹھیں مار رہے تھے۔ قرب و جوار

کی نشستوں پر بیٹھے ہوئے مسافروں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے، وہ میری قسمت پر

رُشک کر رہے تھے، میرا سینہ فخر سے اور تن گیا۔ میں حسن و جمال کے اس شاہکار کو دالہانہ

نظروں سے دیکھ رہا تھا جو میرے ایک جیلے سے خاموش ہو کر کسی حسین مجسمے کی طرح اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھی اُس معصوم پیر بہوٹی کی مانند جو راسی آہٹ پا کر اپنے سرخ مخملی جسم کو اپنے وجود میں سمیٹ کر ہر خطرے سے بے نیاز سمجھنے لگتی ہے۔ امریتا بھی میرے جذبات میں اٹھنے والی طفیلی سے بے خبر تھی۔

”اتنے غور سے میرے چہرے پر کیا تلاش کر رہی ہو.....؟“ میں نے بے تکلفی بڑھانے کی خاطر ”تم“ کا صیغہ استعمال کیا۔

”میں آپ کو کیا سمجھوں؟“ اُس کے لبوں کو جنبش ہوئی تو دانتوں کے موتی نکھرتے نظر آئے۔ اُس نے بڑی معصومیت سے بات جاری رکھی۔ ”کوئی شاعر، کوئی چتر کار، مصنف، نغمہ نگار، کوئی سنگتراش یا..... جاوگر؟“

”اس کے علاوہ بھی بہت سارے شعبے باقی رہ جاتے ہیں۔“ میں نے دبی زبان میں کہا۔ ”وہ آپ بتا دیں.....؟“ اُس نے اپنی صراحی دار گردن کو ذرا خم دے کر اپنی تمام تر توجہ میری جانب مبذول کر لی۔

”تم مجھے کوئی دیوانہ بھی کہہ سکتی ہو، کوئی راہ بھٹکا ہوا مسافر جس کی کوئی منزل نہ ہو، کوئی دیوداس، مہذب، عقل و خرد سے بیگانہ کوئی پاگل، کوئی پجاری جو دیوی کے چرنوں پر سارا جیون بھینٹ کر دینے کے بعد بھی شانت نہیں ہوتا، بیاکل ہی رہتا ہے۔“

”آج اگر میں یہ فلائٹ مس کر دیتی تو مجھے ہمیشہ ڈکھ رہتا۔“ امریتا کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ”وہ کیوں.....؟“ میں انجان بن گیا۔

”آپ جیسا مترنہ مل پاتا.....“ اُس کے جیلے میں بڑی گہرائی تھی، اُس کی آنکھوں سے چھلکنے والی شراب مجھے مدھوش کر گئی۔

”جانتی ہو امریتا، مسافر ایک دوسرے سے کیوں ملتے ہیں؟“ میں نے اُسے اپنے تجربے کی بھٹی میں پکھلانے کی خاطر ایک طویل سانس لے کر پوچھا۔

”کیوں.....؟“ وہ مجسم اضطراب نظر آنے لگی۔

”ایک دوسرے سے چھڑ جانے کی خاطر.....“

”ضروری تو نہیں.....“ اُس نے بڑی اپنائیت کا اظہار کیا۔ ”ساتھ آٹھ گھنٹے کا سفر کسی مسافر کی آخری منزل نہیں ہوتا۔ لگن بچی ہو، پریم پوتر ہو اور من میں کسی سے ملنے کی آشا ہو تو

جیون کے کسی موڑ پر کبھی بھی، کہیں بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔“

”ہاں، تم شاید ٹھیک کہتی ہو۔ منٹ کو اتنی جلدی نراش نہیں ہوتا چاہئے۔“

”آپ نے ہندی زبان باقاعدہ سیکھی ہے یا مجھے خوش کرنے کی خاطر بول رہے ہیں؟“ اُس کے لہجے میں شوخی تھی، شرارت تھی۔ میں نے موقع ضائع نہیں جانے دیا، اُس کی نیلگوں آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”تمہیں خوش کرنے کی خاطر تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“

”ج.....؟“ وہ اور زیادہ بے تکلف ہو گئی۔ ”مجھے یقین نہیں آتا.....“

”آرما کر دیکھ لو۔“ میں نے اُس کی نگاہوں میں چھلکتے ہوئے ساغر میں ڈوب جانے کی جسارت کی، اُس نے حلقی کا اظہار نہیں کیا، بڑی محبوبیت سے ہونٹوں پر تبسم سجا کر بولی۔

”آزما کر دیکھ لو۔“ میں نے اُس کی نگاہوں میں چھلکتے ہوئے ساغر میں ڈوب جانے کی جسارت کی، اُس نے حلقی کا اظہار نہیں کیا، بڑی محبوبیت سے ہونٹوں پر تبسم سجا کر بولی۔

”کیا مطلب.....؟“ میں چونکا، میرے ذہن میں اُن لا تعداد مہ جینیوں کے چہرے ابھر کر گڈمڈ ہونے لگے جو کسی نہ کسی انداز میں میرے تصرف میں آ چکی تھیں۔ کبھی کسی سے رات کے اندھیرے میں انکارانی نے ملاقات کرادی، کبھی سابقہ تجربوں کی روشنی میں، میں نے کسی پر کند ڈال دی، میں نے ان مہ جینیوں، شعلہ بدن حسیناؤں، زہرہ جینیوں کی کوئی فہرست مرتب نہیں کی تھی۔ کس کس کو یاد رکھتا؟ کسے بھول جاتا؟ کون کہاں ملی تھی؟ کن حالات میں میری سرکشی اور بدنصیبی کا شکار ہوئی تھی؟ کسے یاد تھا.....؟

میرے ذہن میں کھلبلی مچ گئی، میں ماضی کی تاریک کوٹھڑی میں دفن چہروں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا، شاید کوئی امریتا سے ملتی جلتی صورت نظر آ جاتی تو میں کوئی خوبصورت بہانہ تراش کر اُسے بھلا دیتا..... مجھے مایوسی ہوئی، ماضی کے دُھندلوں سے کوئی ایسی صورت نہیں ابھری جس پر امریتا کا گمان کیا جاسکتا۔ وہ اُن سب سے منفرد تھی۔ ہٹنی پر چھلتے مہکتے تازہ گلاب کی مانند۔ اُس کی آنکھوں کی معصومیت، چہرے کا بھولپن، بدن کی سوندھی سوندھی خوشبو اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ ابھی تک کسی مرد کی آغوش کی تیش کی آنچ نے اس کے کوئل جسم تک شرف باریابی کا اعزاز حاصل نہیں کیا۔ یہ میرا مشاہدہ تھا، ایک تجربہ کار شکاری کی سوچ تھی جس میں کسی ترمیم اور اضافے کی گنجائش نہیں تھی۔

”پھر..... وہ کون تھی؟“ میں اپنے آپ سے اُلجھنے لگا، کئی دوسووں نے مجھے گھیرنے کی



کوشش کی۔ ”ممکن ہے وہ مجھے کسی اور طرح سے جانتی ہو؟ اس نے کہیں کسی کے ساتھ مجھے دیکھ لیا ہو..... میری روندی ہوئی لڑکیوں میں سے کسی نے اسے میری داستان سنا دی ہو..... اسے کہیں سے میری تصویر کے دوسرے رخ کی بھنک مل گئی ہو.....“ بہت سارے امکانات تھے، سچائی کی راہ پر چلنے والوں کو دنیا بہت جلد فراموش کر دیتی ہے، وہ اکثریت میں زیادہ نہیں ہوتے، گناہ کے راستوں پر مسافروں کی بھیڑ بھاڑ زیادہ ہوتی ہے پھر بھی انہیں یاد رکھا جاتا ہے، عنوان سے خاکے بنائے جاتے ہیں، خاکوں سے کہانی اُبھرتی ہے، کہانی میں زیب داستان کے لئے رنگ بھرے جاتے ہیں تاکہ سننے والا متاثر ہو، افسانوں میں اسی طرح جوڑ لگتے جاتے ہیں، بات ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک منتقل ہوتی رہتی ہے، یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا، ہمیشہ جاری رہتا ہے، سینہ بہ سینہ چلتا رہتا ہے۔ نیک پروین کی باتیں ذہنوں میں زیادہ دنوں بسیرا نہیں کرتیں، اُمر او جان آدا گھٹکھر و باندھے دل و دماغ میں تھرکتی رہتی ہے۔

امریتا کا جملہ میرے ذہن میں سیارے کی طرح گردش کرتا رہا۔ میں نے اپنی زندگی کی پوری لغت کھنگال ڈالی، مجھے اس کا کوئی سراغ، کوئی سرانہیں ملا۔

”کیا سوچنے لگے.....؟“ امریتا کی آواز مندر کی گھنٹیوں کی طرح میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں کسمسا کر رہ گیا، کیا جواب دیتا؟

”آپ مسلمان ہیں، آواگون پر یقین نہیں رکھتے، اس لئے اُلجھ گئے۔“ اُس نے معصومیت سے کہا۔ ”میں نے آپ کو چھیڑنے کی خاطر یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔ شاید ہم پچھلے جنم میں کبھی مل چکے ہوں.....“

”آپ دشواس رکھتی ہیں ان باتوں پر.....؟“ میں نے اطمینان کا سانس لے کر پوچھا، دل سے ایک بوجھ اُتر گیا۔

”پہلے نہیں تھا، آج کچھ کچھ ہو رہا ہے۔“ اُس نے پھر ایک مکھم بات کہہ دی۔

”میں سمجھا نہیں.....؟“ میرے دل کا چور پھر خوفزدہ ہو گیا۔

”اگر میں پچھلے جنم میں آپ سے نہ ملی ہوتی تو اتنی جلدی بے تکلف نہ ہوتی۔“ وہ مسکراتے مسکراتے یلکھت سنجیدہ ہو گئی۔ ”آپ پہلے پرش ہیں جسے دیکھ کر مجھے یوں جان پڑا جیسے میں آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔“

”میں اسے اپنی خوش قسمتی کہوں؟“ میں نے اُسے شوخ نظروں سے دیکھا۔ ”اپنے جسم پر چنگی بھر کر تصدیق کروں کہ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا؟“

”میں نے آپ سے ایک جھوٹ بھی بولا ہے۔“ اُس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے مسکرا کر اعتراف کیا۔ ”میں فرسٹ کلاس میں کسی واقف کار کے ساتھ نہیں، اپنے گرو کے ساتھ بیٹھی ہوں۔ آپ کو جہاز میں چڑھتا دیکھ کر مجھے ایسا ہی لگا..... جیسے میں آپ کو پہلے سے جانتی ہوں، بہت سوچا وچار کے بعد آپ سے ملنے کی ٹھان لی۔ گرو مہاراج سے ایک سیٹیل سے ملاقات کا بہانہ کر کے آئی ہوں۔ اب آگیا (اجازت) دیں۔ زندگی رہی تو پھر کبھی ملاقات ہوگی۔“

وہ مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اُٹھی۔ میں نے اُسے روکنا چاہا، وہ مجسم شراب تھی، حلق کے نیچے اُترنے سے پہلے نشہ کر گئی تھی۔ میرے حلق میں کانٹے چبھنے لگے، جسم پر شہد کی کھیاں ڈنک مارنے لگیں، پانی سے بھرا گلاس سامنے ہو اور ایک قطرہ بھی پیاسے کے حلق میں نہ ٹپکے تو پیاس کی شدتیں اور بڑھ جاتی ہیں، میں بھی اسی کیفیت سے دوچار تھا۔ وہ آہستہ سے کمر کو لوٹاؤ کر سیٹ کے درمیان سے نکل گئی۔ جاتے جاتے اُس نے اپنے کھانے کی ٹرے میرے سامنے رکھ دی۔ میری بے چین نظریں اُس کا تعاقب کرتی رہیں۔ وہ ڈار سے پھڑکی کسی بہنی کی طرح چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی فرسٹ کلاس میں چلی گئی۔ درمیان میں پردہ حائل ہو گیا۔ حسرتیں مچل کر رہ گئیں۔ اُس کے وجود کا مہکتا مسکراتا عکس میرے ذہن میں اُترتا رہا۔

امریتا کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن کسی میں ہی اُسے دل کے تاروں کو چھو لینے کا فن آگیا تھا۔ میں بڑی دیر تک اُسی کے بارے میں سوچتا رہا، ایئر ہوسٹس آئی۔ کھانے کی ٹرے دیکھ کر کاروباری مسکراہٹ اُس کے لبوں پر پھیل گئی۔

”سر..... آپ نے کچھ کھا نہیں.....؟“

خوبصورت یونیفارم میں اُن کا دراز قد بھلا لگ رہا تھا۔ وہ خوش شکل تھی، میک اپ کے کمال نے اُس کے حسن کو اور تیار کر دکھار دیا تھا، تنگ یونیفارم اُس کے جسم سے دھینگا مشقی کرتا نظر آ رہا تھا۔ یہ سب من چلے مسافروں کے دل بھلانے کے ڈھنگ ہوتے ہیں۔ پرانے جال میں نئی مچھلیاں نہر بہنتیں۔ میں نے بھی کھیل کے میدان میں پہلی بار قدم

نہیں رکھا تھا، اب ریٹائرمنٹ کا وقت قریب آنے کو تھا، میری تجربہ کار نگاہوں میں دھول نہیں جھونکی جاسکتی تھی۔ ایئر ہوسٹس ایک کاغذی پھول تھی، مہک سے بے نیاز۔ امریتا تروتازہ گلاب تھی جس کی نازک پتھڑیوں پر کسی بھنورے کی نظر نہیں پڑی تھی۔ بڑا فرق تھا دونوں میں۔

”بھوک نہیں ہے.....“ میں رسماً مسکرا دیا۔

”آپ کی ساتھی کہاں چلی گئیں؟“ اُس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

”فرسٹ کلاس میں.....“ میں سنجیدہ ہو گیا۔ وہ خاموشی سے برتن سمیٹ کر چلی گئی۔ میں نے مسافروں کی سمت دزدیدہ نظروں سے دیکھا، اب کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ سب کے دل کو تیار آ گیا تھا۔ میں نے آنکھ بند کر کے دوبارہ پشت سے سر نکال لیا۔ سید مجذوب کی لاشی کو میں نے ٹانگوں کے درمیان محفوظ کر رکھا تھا، میرے ذہن پر بدستور امریتا کا تصور کلبلارہا تھا، میں اُسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس کی معصوم باتیں صدائے بازگشت بن کر میرے کانوں میں گونج رہی تھیں، مجھے کسی کروٹ چین نہیں مل رہا تھا۔ معا میرے دل میں ایک خیال اُبھرا۔ میں نے ارتکاز اور مراقبے کی بے شمار مشقیں کر رکھی تھیں، میں دُور ہونے کے باوجود امریتا کے قریب پہنچ سکتا تھا، اُس کے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر معلوم کر سکتا تھا کہ اُس نے مجھ سے جو باتیں کی تھیں اس میں کیا جچ تھا، کیا جھوٹ تھا؟ میں اُس کے ذہن میں گھس کر اُسے دوبارہ اپنے پاس آنے کا حکم دے سکتا تھا۔ میرے پاس پراسرار طاقتوں کے ذخیرے کی کوئی کمی نہیں تھی، انکا ہوتی تو ایک اشارے میں میری مشکل آسان کر دیتی، امریتا نہ چاہنے کے باوجود میرے قریب آ جاتی۔ میں پھر اُس کی خوبصورت جھپٹ چھڑا سے محفوظ ہونے لگتا، انکا اُس کے سر پر بیٹھی رہتی، مسافروں کی نگاہیں پھر ہماری طرف اٹھنے لگتیں۔ اُن کے دلوں پر آ رہے چلتے، میں مسکراتا رہتا۔ ہم کھل مل کر باتیں کرتے رہتے، مجھے کچھ دریافت کرنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی، امریتا از خود اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیتی، کوئی راز، راز نہ رہتا۔ لیکن انکا اس وقت میرے سر پر نہیں تھی۔ ابھی تک سیاہ فام مورینا کا ”کاک ٹیل“ خون پینے میں مصروف ہوگی۔ نہ ہونی تو پلک جھپکتے میں واپس آ جاتی۔

میں نے ارتکاز کا حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اسی وقت میرے سر پر ایک

خوشگوار دھماکہ ہوا..... میں نے عالم تصور میں دیکھا، انکارانی میرے سر پر موجود تھی۔ اُس کا چہرہ خون کی طاقت و غدا حاصل کر لینے کی وجہ سے تہمتا رہا تھا۔ قدھاری انار کی مانند اُس کے ہونٹوں کی لالی بڑھ گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں خمار ہی خمار تھا۔ دونوں ہاتھ کولہوں پر جمائے میرے بالوں کے درمیان کھڑی مجھے بڑی خمار آلود نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”کاک ٹیل خون کا تجربہ کیسا رہا.....؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ایک دم ایک سیلنٹ..... ونڈر فل۔“ انکا نے نشے میں لڑکھڑاتے ہوئے کسی حسین، کافر ادا فرنگن کی نقل اُتاری۔

”بہت خوش نظر آ رہی ہو..... انکارانی۔“

”نو، نو.....“ وہ کوہے منکانے لگی۔ ”انکا نہیں..... صرف رانی کہو جیل، اپنے دل کی رانی، کون آف ہارٹ۔“

”میں نے تمہارے بہت رُوپ دیکھے ہیں، آج ایک نئے رُوپ میں نظر آ رہی ہو.....“ میں مسکرا دیا۔

”نظر مت لگاؤ مائی سویٹ ہارٹ۔“ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر ایک ادا سے بولی۔ ”بہت عرصے بعد میری خواہش کی تکمیل ہوئی ہے، مورینا کے خون کی لذت..... اُف..... آہ.....“ انکا ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ ”میں نے تم سے غلط نہیں کہا تھا، سیاہ فام عورتوں کے خون کی لذت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ میرے حسن کے نکھار کو ذرا تنقیدی نظروں سے دیکھو، کیا اس وقت میں کسی مس یونیورس سے کم نظر آ رہی ہوں؟ ایمان سے فیصلہ کرنا، ڈنڈی مارنے کی نہیں ہوگی، تمہیں میری قسم۔“

”تم تو ہمیشہ سے سدا بہار ہو، البتہ آج تمہارے جو بن پر ایک نیا نکھار دیکھ رہا ہوں۔“ ”جیل.....“ انکا نے مجھ کو بانہ انداز میں سرد آہ بھری۔ ”ایسی ہی پیاری پیاری باتیں کیا کرو..... اُداس مت ہوا کرو۔“

”یہ اداکاری کب تک جاری رہے گی؟“ میں نے پہلو بدل کر کہا۔ ”مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں بھی کرنی ہیں۔“

”مجھے تمہیں ستانے میں مزہ آتا ہے۔“ جواب میں وہ سر پر اوندھی لیٹ گئی، دونوں کہنیوں کو بالوں پر ٹیک کر اپنا چہرہ ہتھیلیوں پر رکھ کر بڑے مستانہ انداز میں ٹانگیں فضا میں

آگے پیچھے لہراتے ہوئے بولی۔ ”تم قسمت کے بڑے دھنی ہو جیسے، بڑے بڑے پنڈت پجاری مجھے حاصل کرنے کے لئے برسوں منزل میں بیٹھے جا پرتے رہتے ہیں لیکن کامیاب نہیں ہوتے۔ کوئی کسی مرگھٹ کے ویرانے میں میرے خواب دیکھتے دیکھتے لڑھک جاتا ہے، چیل کوئے اُس کی بوٹیاں نوج ڈالتے ہیں، کوئی کسی برف پوش پہاڑی کی گکھا میں بیٹھے بیٹھے سردی سے اکڑ کر جم جاتا ہے، اس کی چتا کو آگ بھی نصیب نہیں ہوتی..... ایک تم ہو، وہ پہلے شخص جس نے انکارانی کا دل موہ لیا۔ میں نے خود سے تمہارے سر پر سیرا کر لیا۔“

”اور کچھ.....؟“

”ہاں.....“ انکا نے بڑے جذباتی انداز میں جواب دیا۔ ”آج میں نے پہلی بار تمہیں اپنا دل چیر کر دکھانے کی کوشش کی ہے، آج مجھے مت ٹوکنا جیل، آج صرف مجھے بولنے دو، تم سنتے رہو۔“

”جلدی جلدی کہہ ڈالو، میرے پاس وقت کم ہے.....“

”ایسی بے رخی سے بات مت کرو۔“ وہ ٹھنک کر بولی۔ ”آج تم نے میرے جو بن کے نکھار کی بات کی ہے، مجھے اچھا لگا۔ یقیناً جانو، اگر میں حقیقت کا رُوپ اختیار کر سکتی تو تمہاری زندگی میں میرے سوا کوئی دوسری عورت قدم رکھنے کی جرأت نہ کر پاتی۔ میں رُوپ بدل بدل کر تمہارے اندر چھپے ہوئے شیطان کو گدگداتی رہتی، تم سے چمیلیں کرتی، تمہارے دل کو گرماتی، تم اپنے داؤچ اختیار کرتے، میں اپنی اداؤں سے تمہیں دیوانہ کر دیتی، مزہ دو آتش ہو جاتا۔ کبھی میں رُودھ جاتی، تم میری ناز برداریاں کرتے، کبھی تم خفا ہو جاتے تو میں تمہارے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول جاتی، میرا قرب تمہاری خفگی کی ساری پول کھول دیتا.....“

”باقی آئندہ.....“ میں نے موضوع بدل دیا۔ ”تم نے لندن سے روانگی سے قبل آر تھر کو مزہ چکھانے کی بات کی تھی؟“

”ارے ہاں.....“ انکا اٹھ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی، سنجیدگی سے بولی۔ ”میں تمہیں بتانا بھول گئی کہ اب پولیس آفیسر لوئیس آر تھر کو دن میں تارے نظر آنے لگیں گے۔“

”میں سمجھا نہیں.....“ میں نے وضاحت طلب کی۔

”ایک طرف اُس غریب کو اپنی ملازمت بچانے کے لئے عدالت میں اس بات کا

تحریری وضاحتی جواز پیش کرنا ہو گا کہ اُس نے تمہارے خلاف جھوٹا کیس بنانے کی غلطی کیوں کی؟ دوسری طرف مورینا کی لاش اُس کے گلے پڑ جائے گی۔“

”مورینا کی لاش سے آر تھر کا کیا تعلق؟“ میں چونکا۔

”وہ تمہیں جس ہٹ میں لے گئی تھی وہ کسی اور کی نہیں..... آر تھر کی ملکیت تھی۔“ انکا کے گلابی ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی، چٹخارہ لیتے ہوئے بولی۔ ”وہ کار بھی آر تھر کے ایک قریبی دوست کی تھی جسے تم ایئر پورٹ پر چھوڑ آئے ہو۔ آر تھر گلے گلے پھنس چکا ہے۔ مورینا کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سامنے آئے گی تو پورے لندن میں کہرام مچ جائے گا۔ میں نے اُس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں چھوڑا..... پولیس آفیسر کا دوسرا خطرناک رُوپ، اُس نے جیوری کی ایک ممبر کو رپ کر کے کا بعد اُس کا خون پی ڈالا، فلوں کا ڈریکولا انسانی شکل میں..... اخبار کی یہ سرخیاں تھلکے بچا دیں گی، ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو گا، خود آر تھر بھی اپنے بارے میں یہ سب کچھ سننے کے بعد عیش کھا کر گر پڑے گا، بڑے بڑے دماغ چکرا جائیں گے، لوگ سہم کر راتوں کو گھر سے نکلنا چھوڑ دیں گے۔“

”کچھ کل کے بارے میں بھی زور کر لو.....“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ بمبئی ایئر پورٹ پر کچھ لوگ ہمارے سوا گت کے لئے تیار بیٹھے ہوں۔“

”میں تمہارا اشارہ سمجھ گئی.....“ انکا اٹھ کر میرے سر پر ٹیلے لگی۔ اُس کے چہرے کے تاثرات گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگے، ایک لمحہ پیٹر وہ موج مستی کی باتیں کر رہی تھی، آر تھر کو چوہے دان میں پھنسا کر خوش گپیوں میں مگن تھی اور اب اُس کے چہرے پر بھڑکتی آگ کے شعلوں کی لپٹ کپکپا رہی تھی..... ”تم فکر مت کرو جیل، میں جو تمہارے ساتھ ہوں.....“

”تم اُس وقت بھی میرے ہمراہ تھیں جب اُس زامزادے امر لال نے اپنے جنت منتر سے میری معصوم کلدیپ کو بدری نرائن کی موجودگی میں بنگا کر دیا تھا، اُس غریب کے ننگے بدن پر بڑے بڑے آبلے آگ آئے تھے۔ میں بھی ششدر رہ گیا تھا، کلدیپ کا کالی کو دیا ہوا وچن کام نہ آتا تو میری اور تمہاری قوتیں دھری کی دھری رہ جاتیں۔ لن ترانیوں کا بھرم خاک میں مل جاتا، ترکی تمام ہو جاتی، امر لال کے اشارے پر وہ حرامی بدری نرائن، میرا سب سے بڑا دشمن، میرا سر کاٹ کر کسی بڑے مندر کے دروازے پر لٹکا دیتا..... پجاریاں

نہیں رکھتی۔ اس کے لئے وقت اور فاصلوں کی کوئی قید نہیں، اندھیرے اس کا راستہ نہیں روک سکتے، طوفان کی شدتیں اُسے دیکھ کر اپنا رخ بدل دیتی ہیں۔ وہ جس پر بجلی بن کر ٹوٹی اُسے جلا کر راکھ کر دیا، میں نے جو چاہا اُس نے پورا کیا۔ وہ میری پابند نہیں تھی۔ میں نے اُسے حاصل کرنے کی خاطر نہ بدن پر بھڑکتا ملا، نہ پیشانی پر زردی تھوپی، نہ حصار میں بیٹھ کر کوئی جتر منتر پڑھے۔ وہ از خود میرے سر پر آ گئی۔ اُس نے مجھے اذیتیں پہنچائیں، ایک ہاتھ سے بھی محروم کر دیا، لیکن ان اذیتوں کے مقابلے میں اُس کے احسانات بے شمار ہیں۔ ہمارے درمیان بس اچانک ایک رشتہ قائم ہو گیا۔ وہ میری زندگی کا ایک الٹو انگ بن گئی..... وقتی جدائی ہم دونوں کے پیروں میں مجبوریوں کی بیڑیاں ڈال دیتی، وہ کسی دوسرے کے قبضے میں چلی جاتی تو غیروں کی طرح نظریں پھیر لیتی۔ جب دوبارہ واپس آتی تو میرے گن گانے لگتی۔ میں اُس کا عاشق تھا، وہ میری محبوبہ تھی۔ میری خوشی کی خاطر اُس نے بڑے بڑے معرکے سر کئے تھے۔ میں بھی کئی بار اُس کی خاطر موت کے منہ میں چھلانگ لگا چکا تھا۔

میں انکا کو سر پر ٹپلتے دیکھتا رہا، اُس کی اضطرابی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی وہ ہونٹ چبانے لگتی، کبھی ٹپلتے ٹپلتے رک کر اس طرح خلاء میں گھورنے لگتی جیسے کسی خطرے کی بوسونگہ رہی ہو۔ کبھی اس طرح ہاتھ ملنے لگتی جیسے کسی غلطی پر کف افسوس مل رہی ہو۔ میں نے اُسے اس قدر بے چین کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”کس غم میں دُلی ہو رہی ہو انکارانی؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ.....“

”تمہارا اندازہ غلط نہیں تھا۔“ اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”انہیں تمہاری واپسی کی خبر ہو گئی ہے۔“

”اچھا ہے.....“ میں زہر خند سے بولا۔ ”زندگی میں ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا، ہنگامے دوبارہ شروع ہوں گے تو وقت گزرنے کا احساس نہیں ہو گا۔“

”وہ تمہاری وحشتوں کی کہانی نہیں بھولے۔“ انکا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”پنڈت نول کشور نے کالی کے پورے مندر کے گرد منڈل کھینچ رکھا ہے، خود اندر بیٹھا اپنے جیلوں کو پیادوں کی طرح آگے بڑھنے پر اُکسار ہا ہے۔“

”میں جانتا ہوں، تم منڈل میں داخل نہیں ہو سکتیں۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں

اور دیو داسیاں کالی کی شان میں بھجن الہ اپنے لگتیں، میری کہانی ختم ہو جاتی۔ تم کسی اور کے سر پر چلی جاتیں۔“

”ایسی باتیں مت کرو جیل۔“ انکا نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اس بار ویسا نہیں ہو گا۔“

”پھر کیا ہو گا.....؟“ میں نے جھلا کر پوچھا۔ ”کیا تم جادو کی چھڑی گھماؤ گی اور وہ سب بھجورے بن کر ٹھکنے لگیں گے؟“

”مجھے سوچنے دو۔“ انکا کے چہرے پر طاری سنجیدگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ میں اُس کے تیور دیکھتا رہا، میں جانتا تھا وہ کمزور نہیں ہے، لازوال قوتوں کی مالک تھی، زمین کے اندر گھپ اندھیروں میں جھانک سکتی تھی، سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر سکتی تھی۔ اُس کے بچوں کی تیز چھین انسانی ذہن کو پہناتا نہ کر سکتی تھی۔ کسی بھی شخص کو اپنا معمول بنا کر اُس کا بھید جان سکتی تھی، اشاروں پر نچا سکتی تھی۔ پریتم لال کے علاوہ کلدیپ کی آتما نے بھی مجھے انکا کی قوتوں سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ انہوں نے غلط نہیں کہا ہو گا لیکن میں انکا کی مجبوریوں سے بھی واقف تھا، پر اسرار قوت رکھنے والوں پر بھی کچھ پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ کئی موقعوں پر میں نے انکا کو سہم کر نظریں چراتے بھی دیکھا تھا، پریتم لال کو دیکھ کر اُس کے چہرے کا رنگ فق ہو جاتا تھا، کلدیپ کی موجودگی میں وہ میرے سر سے اُتر جاتی..... سادھو جگد یو بھی اُسے ایک بار جاپ منتر کے ذریعے قابو کر کے میرے حوالے کر چکا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہندوستان کے بڑے بڑے جفاوری پنڈت اور پجاری انکا کے حصول کی خاطر جاپ کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انکا ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ لیکن دیوی دیوتاؤں کے معاملے میں وہ بھی ایک خاص حد تک محدود رہنے کی پابند تھی۔

جو میری ماضی کی داستان پڑھ چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ بالشت بھر کی وہ فتنہ میری زندگی میں کیا کیا گل کھلا چکی ہے۔ وہ میرے سر پر نہ آتی تو یہ سارے ہنگامے بھی نہ ہوتے، نہ مجھے اس کی کہانی رقم کرنی پڑتی، نہ آپ کو اس کا انتظار رہتا۔ مگر اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انکا ایک حیرت انگیز طلسمی قوت کا نام ہے۔ وہ جب مسکراتی ہے تو فطرت کی تمام رنگینیاں اُس کے ننھے سے وجود میں سمٹ آتی ہیں۔ جب اُس کی آنکھوں سے شعلے لپکتے ہیں تو بڑے بڑے سورما کانپ اُٹھتے ہیں، وہ دشمنوں پر قہر بن کر ٹوٹنے میں اپنا ثانی

جواب دیا۔

”جیل۔“ اُس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”تم جو کہہ رہے ہو، وہ غلط نہیں ہے۔ میری مجبوریوں کا فائدہ اٹھا کر دشمن تم پر وار کر جاتے ہیں، لیکن تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ تمہارے ساتھ مہاراج پریتم لال کا آشیر باد بھی ہے، سید مجذوب کی کراماتی لاشی بھی ہے، نندا کے خون سے اشان کر کے تم نے جو شکلیاں حاصل کی تھیں اس کا ذکر کپالا بھی کر چکا ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں پریتم لال کے سر پر تھی تو تم نے مجھے بھی دھکار دیا تھا، میں اُس وقت پریتم لال کی غلام تھی، اُس کے قبضے میں تھی۔ میں تمہاری لال پہلی آنکھیں دیکھ کر آگ بگولا ہو گئی، میں نے تمہیں قابو کرنے کی کوشش کی لیکن تم پر میرا کوئی وار کارگر نہ ہو سکا، میں نے تمہیں یہ بات پہلے نہیں بتائی۔“

”آج کیا ضرورت پیش آگئی.....؟“ میں نے بیزاری کا اظہار کیا۔

”میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ تم نول کشور کے مقابلے میں زیادہ شکست کے مالک ہو مگر..... جوش میں آ کر ہوش سے بیگانہ ہو جاتے ہو۔ میری بات بھی نہیں سنتے۔ اس بار ایسا مت کرنا۔“ انکا نے میری سابقہ غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے بل کھا کر کہا۔ ”کجنروں کے ساتھ جنگ کرتے وقت تمہیں میرے مشوروں کا خیال رکھنا ہوگا۔ ہم دونوں مل کر ہزاروں پنڈت پجاریوں کا کر یا کرم کر سکتے ہیں، میری بات دھیان میں رکھنا، بھول مت جانا۔“

”کل کی فکر چھوڑو انکارانی، میں نے یونہی ایئر پورٹ پر سواگت والی بات کہہ دی تھی۔“ میں نے ذہن پر طاری کسمندی دور کرنے کی خاطر بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ ”جو مقدر میں رقم کر دیا گیا اسے کوئی نہیں ٹال سکتا، کل کے غم میں گھلنے کی بجائے جو کچھ آج ہاتھ آ رہا ہو اُسے سینے میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔“

”تم مجھے اندر سے کچھ بے چین نظر آ رہے ہو۔“ انکا نے مجھے ٹٹولنے کی کوشش کی۔ ”کیا بات ہے؟ مجھے نہیں بتاؤ گے؟“

”ہم جس جہاز میں سفر کر رہے ہیں اس میں ایک قیامت بھی ساتھ ہے۔“ میں نے امریتا کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے وہ میرے ساتھ بیٹھی کسی اور دنیا کی سیر کر رہی تھی، اُس کی نگاہوں میں جادو تھا، بڑی مقناطیسی شخصیت کی مالک تھی، میرے دل میں نقب لگا کر چلی گئی۔ میں مسافروں کی وجہ سے اُس کا ہاتھ نہیں تھام سکا، اس

سے پہلے میں نے اُس جیسی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔“

”کہاں چلی گئی.....؟“

”فرسٹ کلاس میں۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”اپنے گرو کے پاس.... چیلانا پتارہ گیا۔“

”گرو کے پاس.....؟“ انکا کی نگاہوں میں تجسس کا رنگ ابھرنے لگا۔ اُس نے خلاء میں مگھورنا شروع کیا۔ اُس کی آنکھیں حلقوں میں بڑی تیزی سے گردش کر رہی تھیں، گرو کا لفظ سن کر وہ نہ جانے کس فکر میں مبتلا ہو گئی تھی۔

”تم اُس کے سر پر چلی جاؤ انکارانی۔“ میں نے بے چینی کا اظہار کیا۔ وہ ساتھ ہوگی تو سفر آسانی سے کٹ جائے گا۔“

”جیل۔“ انکا نے میری بات نظر انداز کر کے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”اس جہاز میں بھی ہمارے لئے ایک خطرہ موجود ہے۔ مجھے دیکھنا پڑے گا کہ تم کس گرو کی بات کر رہے ہو۔ وہ جو کوئی بھی ہے، میری نگاہوں سے بچ نہیں سکے گا، تم کچھ دیر صبر کر لو۔ میں ابھی اپنا ڈکار تلاش کر کے واپس آتی ہوں۔“

انکا میرے سر سے اترنے کو پر تول رہی تھی جب جہاز کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ مسافروں کے چہرے زرد پڑ گئے۔ مائیک سے میزبان خاتون کی آواز ابھرنے لگی۔

”مسافروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنی حفاظتی بیلٹ باندھ لیں۔ جہاز کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے، معمولی سی فنی خرابی پیدا ہو گئی ہے جسے ماہرین کچھ دیر میں ٹھیک کر لیں گے..... شکریہ۔“

”یہ جھوٹ ہے.....“ انکا تمللا کر بولی۔ ”جہاز فنی خرابی کی وجہ سے نہیں، کسی اور وجہ سے ڈمگیا ہے۔“

”اور کیا وجہ ہو سکتی ہے.....؟“

”ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم نہیں دیکھ سکتے جیل، لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ دھوئیں کی ایک چادر میری نظروں کے سامنے پھیل رہی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں.....؟“ میں نے سید مجذوب کی لاشی پر گرفت مضبوط کر لی۔

مسافروں کے ہونٹ متحرک نظر آنے لگے۔ وہ موت سے نجات حاصل کرنے کی خاطر



اپنے اپنے انداز میں دُعائیں مانگ رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر خوف طاری تھا۔ کچھ دیر پہلے خوش گپیوں میں مصروف افراد اب سہمے سہمے بیٹھے تھے۔ ایک ہی جھٹکے نے اُن کے سارے حوصلے پست کر دیئے، شکلوں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ مہ جبینیں اپنی اپنی نشستوں پر پہلو بد لئے لگیں، موت کے تصور نے انہیں ہراساں کر دیا تھا۔ جہاز نے دوسرا جھٹکا کھایا تو ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ گیا۔ متعدد مرد و خواتین کھٹی کھٹی آواز میں چیخ اُٹھے۔ انکا وحشت سے آنکھیں پھاڑے کچھ تلاش کر رہی تھی، مسافروں کی چیخ کی آوازیں سن کر ایک ایئر ہوسٹس قدم بڑھاتے سامنے آگئی۔

”آپ لوگوں نے افراتفری پھیلانے کی کوشش کی تو ہمیں مزید دُشواریوں کا سامنا درپیش ہوگا۔“ اُس نے ہاتھ میں دبے مائیک پر بلند آواز میں کہا۔ ”پلیز، ہمارے ساتھ تعاون کریں، اپنی اپنی نشستوں پر سکون اور اطمینان سے تشریف رکھیں۔ ہمارے فضائی انجینئرز نے فنی خرابی دریافت کر لی ہے، پانچ دس منٹ بعد ہم دوبارہ سکون سے سفر کر رہے ہوں گے۔“

انکا کی نظریں کسی دبیز چادر کے اس پار دیکھنے میں مصروف تھیں۔

”تم کیا محسوس کر رہی ہو.....؟“ میں نے اس بار اُسے ٹھوس لہجے میں مخاطب کیا۔

انکا کی آنکھوں نے ادھر ادھر دیکھنا بند کر دیا۔ اُس کی نظریں میری نشست سے دو قطار آگے بیٹھے ہوئے ایک ایئر عمر کے مسافر پر جم گئیں، اُس کے تیور غضبناک ہونے لگے۔

”میں نے اُسے پالیا ہے۔“ اُس نے ادھیڑ عمر والے مسافر کو قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”جہاز میں کوئی فنی خرابی نہیں ہوئی، یہ سب اُسی پنڈت نول کشور کی حرازدگی معلوم ہوتی ہے جو دُور بیٹھا کھیل تماشے کر رہا ہے۔“

”تم نے کسے پالیا ہے.....؟“ میں نے جھلا کر پوچھا۔ ”مجھے کھل کر بتاؤ، تم کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا محسوس کر رہی ہو.....؟“

”اُس نیلے کوٹ والے کو دیکھ رہے ہو جو معصوم بنا بیٹھا بے پرواہی سے میگزین کے ورق اُلٹ پلٹ کر رہا ہے۔“ انکا نے ادھیڑ عمر والے کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں نے تم سے دُھویں کی جس دبیز چادر کا ذکر کیا تھا وہ سٹ کر اُسی نیلے کوٹ والے کے جسم میں داخل ہوئی ہے۔ میں اس کے سر پر جا رہی ہوں۔ جب تک اُسے قابو نہیں کیا جائے گا جہاز معمول کی

پرواز اختیار نہیں کر سکتا۔“

”کون ہے وہ.....؟“ میں نے پہلو بدل کر دریافت کیا۔

”وہ خود کچھ بھی نہیں ہے، کسی دوسرے کے اشارے پر درمیان میں آ گیا ہے۔“ انکا پُر خیال انداز میں بولی۔ ”تم نے ریموٹ سے چلنے والے کھلونے دیکھے ہیں، نیلے کوٹ والا صرف ایک کھلونا ہے جسے کوئی اور کنٹرول کر رہا ہے۔ وہ ہمیں دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں، الجھانے کے سنے دیکھ رہے ہیں، خود کو بچانے کی خاطر بے زبان بکروں کی قربانی پیش کرنے پر تہل گئے ہیں۔ تم فکر نہ کرو، میرے بچوں کی چہمن ابھی دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دے گی، تم دیکھنا اُس چندال کی زبان ابھی کسی فر فر چلتی ہے۔“

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن انکا رینگ کر سر سے اتر گئی۔ میں اندھیرے میں ہاتھ پیر مارنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا؟ میں تنکھویوں سے نیلے کوٹ والے کو دیکھتا رہا، انکا کے سر سے اترنے کے کچھ لمحوں بعد وہ بڑے اطمینان سے اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا، کوٹ اُتار کر نشست پر ڈال دیا، پھر قمیض اُتارنے لگا تو کئی مسافروں کی نظروں میں آ گیا۔ ایک اسٹیورڈ تیزی سے لپکتا اُس کے قریب پہنچا۔

”آپ آرام سے بیٹھ جائیں جناب۔ ابھی جہاز.....“

اسٹیورڈ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا، نیلے کوٹ والے نے بڑے اطمینان سے اسٹیورڈ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اُسے پیچھے ہٹانا چاہا، اسٹیورڈ حیرت انگیز طور پر اُچھل کر کئی فٹ دُور جا گرا۔ میرا ماتھا ٹھکنے لگا، وہ کوئی طاغوتی قوت ہی تھی جس نے اسٹیورڈ کو گیند کی مانند اُچھال دیا تھا۔

”اشوک.....“ برابر والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی نوجوان خاتون نے نیلے کوٹ والے کو حیرت بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔ ”تم دیوانے تو نہیں ہو گئے ہو؟“

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ قمیض اُتار کر خاتون کے چہرے پر ڈال دی، اب وہ پتلون کے بٹن کھول رہا تھا۔ میں سمجھ گیا، انکا کے بچوں کی تیز چہمن نے اُس کا دماغ اپنے قبضے میں کر لیا ہوگا، وہ اُسی کے اشارے پر عمل کر رہا تھا، شاید انکا اس طرح میرے دشمنوں کو باور کرانا چاہتی تھی کہ انہوں نے جمیل احمد خان کو گھیرنے کی کوشش کر کے خود اپنے پیردوں پر کھاڑی ماری ہے۔

”مسٹر.....“ جس خاتون کے چہرے پر اشوک نے قمیض پھینکی تھی اُس کے برابر والی

سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص جو ذیل ڈول میں اشوک سے کہیں زیادہ تندرست و توانا نظر آ رہا تھا چیخ کر بولا۔ ”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا.....؟“

اسٹیورڈ کی مدد کو جہاز کے عملے کے ایک دو افراد اور بھی آ گئے۔ اشوک نے پتلون بھی اتار کر پھینک دی۔ انڈرویز اور بنیان میں وہ بڑا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ خواتین مسافروں نے نظریں جھکا لیں۔ عملے کے افراد اُس کی طرف لپکے لیکن اس سے پہلے ہی اشوک نے اُس شخص کے گلے پر ہاتھ ڈال دیا جس نے اُسے لٹکانے کی جسارت کی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اُس نے مسافروں کے علاوہ عملے کے افراد کو بھی خوفزدہ کر دیا۔ اشوک نے اپنے سے دو گنے زیادہ ذیل ڈول والے کو ایک ہاتھ سے اس طرح گردن تھام کر اٹھالیا جیسے وہ پلاسٹک کا بنا ہوا ہو۔

”تم.....“ اشوک نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ ”تم نے ابھی میرے دماغ کے بارے میں کچھ ریمارکس پاس کئے تھے، میں سن نہیں سکا۔ کیا تم اپنا جملہ دہرا سکتے ہو.....؟“

”نہیں..... نہیں۔“ فضا میں جھولتا ہوا شخص گھکھکیانے لگا۔ ”میں نے..... کچھ..... کچھ نہیں کہا..... مجھے معاف کر دو۔“

ذرا سی دیر میں جہاز کے اس حصے میں جہاں اشوک موجود تھا مسافروں کی بھیڑ لگ گئی، عملے کے افراد کا حوصلہ بڑھا، اُنہوں نے آگے بڑھ کر اشوک کو دیوچ لیا۔ میں خاموش بیٹھا دل ہی دل میں مسکراتا رہا، جہاز نے ڈگمگانا بند کر دیا۔ اس کی پرواز معمول پر آ گئی۔ باہر کا موسم خوشگوار تھا۔ اندر انکا دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھانے کی خاطر اپنی لازوال قوتوں کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس قسم کے کھیل تماشے میرے لئے نئے نہیں تھے، میرے ذہن میں صرف ایک سوال کلبل رہا تھا۔ ”اشوک کو کس نے قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی تھی.....؟“

میری نظریں بدستور اشوک پر جمی تھیں جسے عملے کے افراد نے پکڑ رکھا تھا۔ کچھ دیر پوچش اُس کی طاقت کے کرشمے نے بہتوں کو ششدر کر دیا تھا، اب وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے موقع کی نزاکت کو محسوس کر رہا تھا، حواس باختہ نظر آ رہا تھا، ایک ایک کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اُس نے واویلا شروع کر دیا۔

”چھوڑ دو..... بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو، میں نردوش ہوں، میں نے کچھ نہیں کیا۔“

جہاز کے عملے کے افراد نے اُسے گھٹیت کر پگن کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔

اشوک کے اندر پھر شیطانی قوت جاگ اُٹھی۔ اُس نے کپکپا کر دونوں ہاتھ جھٹک دیئے۔ جن افراد نے اُسے مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا وہ ادھر ادھر بکھر گئے۔ اشوک کی نگاہوں میں پھر وحشت نظر آنے لگی، مسافروں نے سیٹوں سے اُٹھ کر ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا۔ اشوک کی نگاہیں شعلے اُگلنے لگیں۔ اُس نے بلند آواز میں گرج کر کہا۔ ”اب کسی نے میرے شریر کو ہاتھ لگایا تو اُسے جلا کر بھسم کر دوں گا، میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ جیون پیارا ہے تو بھاگ جاؤ۔ میری شکتی اگر جہاز کو جھٹکے دے سکتی ہے تو تم کو بھی ایک ایک کر کے نرک میں جھونک سکتی ہے.....“

اشوک واہی تباہی بکاتا رہا، عملے کے افراد ہیم کر پیچھے ہٹ گئے۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا اُسے دلچسپ نظروں سے دیکھتا رہا، کھیل کی ابتداء ہو چکی تھی۔ نول کشور کے گرگوں نے شاید مجھے خوفزدہ کرنے کی خاطر اشوک کے جسم میں آگ بھردی تھی۔ انکا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ پنڈت نول کشور دو چار جنتز منتر سیکھ کر اپنی اوقات بھول گیا ہے، خود منڈل میں چھپا بیٹھا تھا، دوسروں کو میرے خلاف آگے بڑھا رہا تھا۔ اُس ذلیل پنڈت نے میری اور بدری نرائن کی جنگ کا آخری تماشہ نہیں دیکھا تھا، دیکھ لیا ہوتا تو خم ٹھونک کر میدان میں کودنے کی غلطی کبھی نہ کرتا۔ امر لال بھی کالی کے زعم میں کلدیپ سے فکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ اُس کی عبرتناک موت کی کہانی بھی سن لی ہوتی تو نول کشور میرے مقابلے پر آنے کی جسارت کبھی نہ کرتا، اُسے میری وحشتوں کا علم نہیں ہوگا، دوسروں کی زبانی بدری نرائن اور امر لال کی موت کے من گھڑت قصے سن کر اُس کی غیرت نے جوش مارا ہوگا، دیوی دیوتاؤں کے مقابلے پر ایک مسلمان کا جھنڈا بلند دیکھ کر وہ اندر ہی اندر ضرور تلملایا ہوگا۔ پہلے مقابلے پر نہیں آیا، پردوں میں چھپا بیٹھا خوف سے کپکپاتا رہا۔ اب کالی کے مندر کا بڑا پروہت بن جانے کے بعد اُس کی رگ حمیت پھڑ پھڑانے لگی۔ دھرم کے نام پر پنڈت پجاریوں کی فوج جمع کر رہا تھا، جمیل احمد خاں کو لٹکانے کی بھول کر رہا تھا۔

میرے اندر اٹھل پھٹل شروع ہو گئی۔ انہی پنڈت پجاریوں نے میری زندگی کا سکون لوٹا تھا، ایک ایک کر کے جینے کے سارے سہارے چھین لئے، میں کمپالا کی ہدایت پر اپنا سکی تعلیم پر عمل کرتا رہا، شاکھ مٹی کی زندگی کے زریں اصولوں کو اپنا کر سکون سے وقت گزارنے کی کوشش کی تو وہ پھر میرا راستہ کاٹنے لگے۔ میں نے ضبط سے کام لیا۔ ندانے مرتے

”اس جہاز پر ایک گرو گھنٹال بھی براجمان ہے۔“ اشوک نے سینہ ٹھونک کر بلند آواز میں کہا۔ ”میں اُسے مقابلے کی دعوت دیتا ہوں، وہ میرے سامنے آ جائے۔ دوسری شکل میں مجھے کوئی اور اوپائے کرنا ہوگا۔“

اچانک جہاز کو ایک اور شدید جھٹکا لگا، سیٹوں کے درمیان کھڑے ہوئے مسافر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے، ایک رے سے ٹکرائے، کچھ اوندھے منہ فرش پر گر پڑے، خود اشوک بھی اپنے آپ کو نہ سنبھال سکا، میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا، مجھے امریتا کی رُسوائی منظور نہیں تھی، گرو سامنے آ جاتا تو مسافروں کی آوارہ نظریں اُس سیسے بدن کے جسم کو بھی میلا کرنے سے باز نہ آتیں۔ میں نے انکا کو واپس بلانے کی بجائے آگے بڑھ کر سید مجذوب کی لاشی گھما کر اشوک کو ماری، وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے جانور کی طرح بلبلانے لگا، دوڑ کر میرے قدموں سے لپٹ گیا، رقت بھری آواز میں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”مجھے شاکر دو مہاراج۔ مجھ سے بڑی بھول ہو گئی، میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔“

مسافروں کی نظریں حیرت سے میری سمت اُٹھنے لگیں۔ انکا میرے سر پر واپس آ گئی، کسمسا کر بولی۔ ”تم نے یہ کیا حماقت کی.....؟ تمہیں درمیان میں نہیں آنا چاہئے تھا۔“

”اشوک نے گرو کو کیوں لکارا تھا.....؟“ میں نے سر دلچے میں پوچھا۔

”اُسے میں نے مجبور کیا تھا.....“

”کیوں.....؟“

”مجھے غلط مت سمجھو۔“ انکا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اشوک صرف ایک کھلونا ہے، اس کا ریموٹ کنٹرول کسی دوسرے کے پاس ہے۔“

”گرو کا نام درمیان میں کیسے آ گیا.....؟“ میں نے برہمی کا اظہار کیا۔

”تم کچھ نہیں سمجھ رہے ہو۔“ انکا تمللانے لگی۔ ”کوئی میری آنکھوں کے درمیان دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کر رہا تھا، میں اس دیوار کو توڑنا چاہتی تھی.....“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے.....“ میرا الجھن تلخ ہو گیا۔

”تم..... تم اپنی انکارانی پر شبہ کر رہے ہو.....؟“ انکا کی نگاہوں میں شکوہ تھا۔

”تم نے بہت کھیل تماشا دکھائے، اب مجھے بھی کچھ من مانی کر لینے دو۔“

”میرا مشورہ مان لو جیل۔“ اُس نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”پہلے بھی تم نے جوش میں آ

مرتے مجھے جو مہمان شکلیاں دان کی تھیں اگر میں اُن میں سے کسی ایک کا مظاہرہ کرتا تو دشمنوں کے سینے جھلس جاتے، اُن کے جسموں پر آبلے پڑ جاتے، پریتم لال کا نام لے کر اُن کی بربادی کا خیال دل میں لاتا تو سب تہس نہس ہو جاتے، میدان صاف ہو جاتا، میں اکیلا دندناتا پھرتا، کوئی مقابلے پر آنے کی جرأت نہ کرتا، میں جدر سے گزرتا وہ میرے قدموں پر سر رکھنا اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتے، میں ٹھوکریں مارتا آگے گزر جاتا، وہ ہاتھ باندھے گر گڑراتے رہتے، قصہ پاک ہو جاتا، کوئی اندیشہ، کوئی خطرہ سر اٹھانے کی کوشش نہ کرتا، میں نے سر جھکا کر کمپالا کے بتائے ہوئے راستوں پر قدم رکھا تو وہ گلی کے کتوں کی طرح بھونکنے لگے..... پریتم لال نے شاید اسی لئے مجھے خودکشی کے ارادے سے روکا تھا، اُس نے مجھے کلدھپ کے پھوڑے ہوئے ادھورے کاموں کو پورا کرنے کی تلقین کی تھی، اُس کی دُور رس نگاہوں نے میرے اندر جھانکنے کے بعد ہی کچھ فیصلہ کیا ہوگا، اُسے میری طاقت کا علم مجھ سے زیادہ تھا، نہ ہوتا تو مجھے پنڈت پجاریوں کی سرکوبی کی ذمہ داری کبھی نہ سونپتا۔ وہ مہمان پجاری تھا، بڑی مہمان شکلیوں کا مالک تھا۔

مجھے میسور کا واقعہ یاد آیا۔ میں نے مالا کو چھیڑنے کی کوشش کی تو پریتم لال کے لاغر، کھڑکھڑاتے جسم کی تمام ہڈیاں چنچنے لگی تھیں، کلدھپ خوفزدہ ہو کر اُس کے قدموں میں گر پڑی، انکا نے کسمسا نا شروع کر دیا۔ میں نے اُس کے قدموں میں گر کر اپنی غلطی کی معافی طلب کی۔ اُس نے انکا کو میرا خون پینے کا حکم دیا، انکا بھی انکار کی جرأت نہ کر سکی۔ اسی پریتم لال نے جب لندن کے ہسپتال میں سید مجذوب کی لاشی دیکھی تو حیرت سے اُس کی آنکھیں پٹ پٹانے لگیں، سکتہ کی کیفیت سے دوچار ہو گیا، مجھے اُس کا جملہ یاد آیا، پریتم لال نے بڑی حیرت بھری آواز میں کہا تھا۔

”مجھے مجبور نہ کر..... میں اس پوتر لاشی کے بارے میں اپنی زبان نہیں کھول سکتا..... کیوں اتنا سمجھ لے کر اگر میں اپنی تمام شکلیاں دان کر کے بھی اس لاشی کو حاصل کر سکتا تو یہ سودا میرے لئے بہت سستا ہوتا، اسے بہت سنبھال کر رکھنا، کھومت دینا.....“

میرے پاس انکا کی پراسرار قوت بھی تھی جو اس وقت اشوک کے سر پر بیٹھی دشمنوں کو اپنی قوت کی ایک جھلک دکھانے میں مصروف تھی۔ میں ایک تماشائی کی حیثیت سے خاموش بیٹھا رہا۔

ڈھلک گئی..... سب دم بخود رہ گئے۔

میں پلٹ کر اپنی نشست پر ڈھیر ہو گیا۔ اشوک کی بیوہ دھاڑیں مار رہی تھی، لوگوں نے نہ پکڑا ہوتا تو شاید وہ بھی جان دینے سے گریز نہ کرتی۔ جہاز کے عملے کے علاوہ مسافروں کی بڑی تعداد مجھے معنی خیز نظروں سے گھورنے لگی۔ انکا علیحدہ بیچ و تاب کھا رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

انکا کے بارے میں اشوک کے جملے میرے وجود کے سناٹے میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے۔ میں کوئی نتیجہ نہ اخذ کر سکا.....!!



کر.....“

”ہاں.....“ میں جذباتی ہو گیا۔ ”میں پہلے بھی ہوش گنوا کر بہت کچھ کھو چکا ہوں، بہت کچھ نہیں..... سب کچھ۔ اب کیا باقی رہ گیا..... ایک میری ذات ہے، اسے بھی کھو جانے دو، زندگی کی پرواہ کس بد نصیب کو ہے.....“

”میں ہاتھ جوڑتی ہوں، میرا کہنا مان لو۔ تم درمیان سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ میں اس دیوار کو نہیں توڑ سکوں گی جو ابھی تک میری نظروں کے سامنے ہے۔“ انکا کا اضطراب بڑھنے لگا۔

”نہیں مہاراج، نہیں.....“ اشوک دیوانوں کی طرح چیخ کر بولا۔ ”اس کا کہنا نہ مانا، بڑے گھائے میں رہو گے۔“

”تم.....“ میں نے چونک کر اشوک کو دیکھا۔ ”تم کس کی بات کر رہے ہو.....؟“

”جب تم سمجھ رہے ہو مہاراج تو میری زبان کیوں کھلواتے ہو؟“

”کون ہو تم.....؟“ میں نے اُسے تیز نظروں سے گھورا، مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، اشوک نے یقیناً انکا کو دیکھ لیا تھا۔ مگر یہ کیسے ممکن ہوا.....؟ میرے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ چلنے لگے۔

”اپنا سیوک سمجھ لو مہاراج، میں تمہارے چہروں میں اپنے جیون کی بھینٹ دے کر اس دیوار کو درمیان سے ہٹا دوں گا، تمہارے سر پر بیٹھی سندری دیوار کے اس پار نہ دیکھ سکے گی، اسی میں تمہاری مکتی ہے۔“

”جیل.....“ انکا بھی حیرت سے اُچھل پڑی۔ ”سن رہے ہو، یہ کیا کہہ رہا ہے؟“ میں بھی شپٹا گیا۔ میں نے ارتکاز میں جا کر اشوک کی اصلیت معلوم کرنے کی ٹھانی، لیکن مجھے اس کا موقع نہیں ملا، اشوک نے دیوانوں کی طرح اپنا سر ادھر ادھر مارنا شروع کر دیا، خود کو لوہان کر ڈالا۔ جو عورت قریب بیٹھی تھی، دوڑ کر اُس کے خون میں لتھڑے جسم سے پلٹ کر دھاڑیں مارنے لگی۔

”پران ناتھ، یہ تم کیا کر رہے ہو؟ میں کس کے سہارے زندہ رہوں گی؟“

”مجھے آگیا دو مہاراج۔ میرا سے پورا ہو گیا۔“ اشوک نے عورت کے بین کرنے پر دھیان نہیں دیا، میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا، پھر اُس کی گردن ایک طرف

کے درمیان تناہوا پردہ سرکا دیا، مجید کھل گیا، پریشانیاں بڑھ گئیں۔

میں نے اُسٹا کر آنکھیں کھولیں، جہاز کے عملے نے اشوک کے خون کے دھبے مٹانے میں بڑی عجلت سے کام لیا تھا، اشوک کی لاش کے علاوہ اُس کی بیوہ بھی نظر نہیں آئی۔ مسافروں کے چہرے دُھواں دُھواں نظر آرہے تھے، جب میں امریتا کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا اس وقت اُن کی آنکھوں میں رقابت کے جذبے کلبلا رہے تھے، اب وہ مجھے بار بار دیدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں سے خوف مترشح تھا، اشوک کی پشت پر کون تھا؟ میں یہ نہ جان سکا مگر اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس نادیدہ قوت نے بساط کا رخ اپنے حق میں کر لیا تھا، نہ انکا دیوار پاش پاش کر سکی نہ میرا ارتکار کبھی کام آسکا، سب کچھ اتنی جلدی پیش آیا کہ عقل حیران رہ گئی۔

میرے دشمنوں نے یقیناً خود کو منظم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہوگا، وہ میری واپسی کی بھنگ پاتے ہی صف آراء ہو گئے۔ ہندوستان کی سرزمین پر قدم ٹکانے کا موقع نہیں دیا، فضا میں ہی پہلا وار کر گئے، میں کوئی جوابی کارروائی نہ کر سکا۔ وہ دُور بیٹھے میرے اضطراب کا تماشا دیکھ رہے ہوں گے، انکا کی ناکامی پر ناناچ گا رہے ہوں گے، خوشیوں سے اُن کے دل سرشار ہوں گے، پہلی کامیابی حاصل کر لینا بڑی بات ہوتی ہے، انسان کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں، وہ زیادہ منظم ہو جاتا ہے، اعتماد بڑھ جاتا ہے۔ کامیابی کے سنے دیکھنا شروع کر دیتا ہے، اپنی صفوں کو نئے انداز سے ترتیب دیتا ہے، منصوبے بناتا ہے، اس پر غور کرتا ہے پھر بڑے یقین سے دوسرا قدم آگے بڑھاتا ہے، پہلی کامیابی اُسے فتح کے راستوں پر گامزن کرنے میں بڑی مؤثر ثابت ہوتی ہے، میرے دشمن ان ہی کیفیتوں سے دوچار ہوں گے۔ انہوں نے پنڈت نول کشور کے سامنے اپنی کامیابی، اپنے کارناموں کا احوال بڑھا چڑھا کر سنایا ہوگا، نول کشور کا سینہ اور تن گیا ہوگا۔ اُس نے اپنے گرگوں کو شاباش دی ہوگی۔ کالی کے قدموں میں قربانیاں پیش کی ہوں گی، بھنگ اور شراب کے پیالے بھی حرکت میں آئے ہوں گے، کئی دیوداسیاں اپنے کنوارے بچوں سے ہاتھ دھو بیٹھی ہوں گی۔ ہنگاموں کے درمیان اُن کی چیخوں کی آوازیں پنڈت پجاریوں کے شور شرابے میں دب کر رہ گئی ہوں گی۔ خوشیوں کا جشن بھرپور انداز میں مناتے وقت چھوٹی موٹی بھول چوک کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ میں کئی بار اپنی نظروں سے یہ کھیل تماشے دیکھ

اشوک میرے ذہن میں کسی سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

جو حالات پیش آئے تھے وہ میرے لئے حیران کن تھے، انکا نے کہا تھا کہ اُس کے اور اشوک کے درمیان دُھوئیں کی ایک چادر حائل ہے جسے وہ گرانا چاہتی تھی، اشوک انکا کے بیان کے مطابق ایک کھلونا تھا جسے ریوٹ کے ذریعہ کوئی اور کنٹرول کر رہا تھا۔

”کون تھا وہ.....؟“

انکا پراسرار قوتوں کی مالک تھی، میرا ماضی اور انکا کا وجود ایک دوسرے سے مربوط تھا۔ میں اُس کی تمام صلاحیتوں کا علم رکھتا تھا، وہ میری رگ رگ سے واقف تھی لیکن اشوک کے سلسلے میں اُس کی بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ کہیں نہ کہیں کوئی سقم ضرور تھا جو میرے ذہن کو الجھا رہا تھا، ایک سوال رہ رہ کر میرے وجود میں چکر رہا تھا۔

”اگر اشوک محض ایک کھلونا تھا جسے کوئی دوسری قوت دُور بیٹھی اپنے اشاروں پر نچا رہی تھی تو اُس نے انکا کو کس طرح دیکھ لیا؟ انکا کی باتیں کس طرح سن لیں؟ وہ میرا دشمن ہوتا تو مجھے انکا کی باتوں پر عمل کرنے سے کیوں روکتا؟“

میرے دل و دماغ میں جنگ جاری تھی۔ میں اشوک کے معرکہ کو جتنا حل کرنا چاہتا تھا وہ اتنا ہی اُلجھتا جاتا۔ اُس کی لاش میرے راستے کی دُشواری بن سکتی تھی، مرتے وقت اگر وہ بد بخت مجھے مہاراج کہہ کر مخاطب نہ کرتا تو میرے پاس دامن بچانے کی خاطر کئی جواز موجود تھے، میں سینکڑوں بہانے تراش سکتا تھا، لیکن مرنے والے کی بیوہ گواہ تھی کہ میرے لاشی مارنے کے بعد ہی اس حرامزادے نے اچانک کینچی بدلی تھی، لاشی کی کرامت تھی یا کسی نادیدہ قوت کا کرشمہ جس نے انکا کو بے نقاب کر دیا، اس سے پیشتر میرے اور انکا کے درمیان ہونے والے راز و نیاز کو پریم لال، سادھو جگدیو اور بدری نرائن کے علاوہ کوئی نہیں سن سکتا تھا، مطلب واضح تھا، کسی مہمانِ مہنتی کے مالک پنڈت یا پجاری نے انکا اور اشوک



چکا تھا۔ محبت اور جنگ میں کسی حربے کے استعمال کی ممانعت نہیں ہوتی، سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ میں بھی کئی موقعوں پر انکا کے منع کرنے کے باوجود بدری نرائن کی تلاش میں کالی کے مندر میں دندنا تا ہوا گھس چکا تھا۔ جن پجاریوں نے میرا راستہ روکنے کی حماقت کی، میرے غضب کا شکار ہو گئے۔ جن پجاریوں نے ہاتھ باندھ کر بنی کی، میں نے اُن کے سندر شریر پر اپنی وحشتوں کی مہر لگا دی، روندنا ہوا آگے بڑھ گیا۔ مجرذ زندگی گزارنا آسان نہیں ہوتا، آگ اور پٹرول کا ساتھ ہو تو ایک چنگاری بھی بڑی تباہ کاریوں کا سبب بن جاتی ہے۔ پجاریں اور دیو داسیاں بھی کسی چنگاری، کسی شعلے سے کم نہیں ہوتیں، اُن کے اُجلے اور بے داغ دامن کی کہانیاں محض فریب ہیں، ہٹے کٹے پجاری اور سرمنڈے پنڈت امرت رس پی کر بیکتے ہیں تو جانے کتنی معصوم پجاریں ان کی لپیٹ میں آ کر عزت و عفت کا بھرم کھو بیٹھتی ہیں، انہیں دبا کر رکھا جاتا ہے، زبان کھولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ کوشش بھی نہیں کرتیں، خون ایک بار منہ کو لگ جائے تو پھر عادت بن جاتا ہے۔ ہوا زیادہ بھردی جائے تو غبارہ دھماکے سے پھٹ جاتا ہے۔ لاوا زیادہ بھر جائے تو آتش فشاں بھی اپنا منہ کھول دیتا ہے۔ کئی لوگ کام آجاتے ہیں، کئی بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں، ان کی جگہ نئی آبادیاں اُگ آتی ہیں۔ یہی حال پجاریوں اور دیو داسیوں کا بھی ہے۔ جو زبان کھولنے کی جرأت کرتی ہے یا تو اُس کی زبان کاٹ دی جاتی ہے یا پاپ کا الزام لگا کر دیوی کے چرنوں میں بلی چڑھا دیا جاتا ہے۔ دوسری خوف سے زبان پر تالے ڈال لیتی ہیں..... وقت کا پیرہہ گھومتا رہتا ہے۔ میں عجیب ذہنی کرب میں مبتلا تھا، انکا کی پراسرار قوتیں بھی کسی کام نہ آسکیں۔ میں بھی اشوک کی اصلیت بے نقاب کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ میں خود کو بڑا مجبور محسوس کر رہا تھا۔ اشوک کو دُور بیٹھ کر ذہنی طور پر کنٹرول کرنا ممکن تھا لیکن اُس کی بینائی کو اتنی بصیرت عطا کر دینا کہ وہ انکا کو دیکھ سکے حیرت انگیز بات تھی۔ وہ شخص یقیناً فوق الفطرت قوتوں کا مالک تھا جس نے اشوک کے ذریعے مجھے اپنی برتری کا پیغام دیا تھا، طرح طرح کے قیاس میرے ذہن میں گھر کرنے لگے، عجیب عجیب خیالات مجھے اُلجھانے لگے۔ انکا نے کہا تھا کہ اشوک صرف معمول ہے، عامل کہیں اور بیٹھا ہے۔ اُس نے دھوئیں کی دھیر چادر کو بھی نظروں کے سامنے لہراتا دیکھ لیا تھا۔ لیکن میری مداخلت نے کھیل خراب کر دیا۔ نادیدہ قوت نے اشوک کو مار کر سارے نشانات مٹا دیے، میرے لئے پریشانیاں کھڑی کر

دیں۔

میں نے ابھی شکست تسلیم نہیں کی تھی، بلکہ یوں کہا جائے کہ جمیل احمد خان نے اپنی زندگی کی لغت سے شکست اور نا کامی کے الفاظ کاٹ دیئے تھے تو غلط نہ ہوگا۔ میری داستان المناک پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میں نے تنہا ہونے کے باوجود ہندوستان کے پنڈت پجاریوں کی ناک میں دم کر رکھا تھا، بدری نرائن جیسا مہان پنڈت بھی مجھ سے دُور بھاگتا تھا، امر لال اُس کی پشت پناہی کو نہ اُٹھ کھڑا ہوتا تو بدری نرائن کا انجام زیادہ بھیانک ثابت ہوتا۔ جب کمپالا سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی، میں نے ارتکا ز اور مراقبے کی مشقوں کے بارے میں صرف سنا تھا، عمل نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھی میں نے کبھی قدم پیچھے ہٹانے کی غلطی نہیں کی۔ میں نے کئی موقعوں پر انکا کے مشورے بھی قبول نہیں کئے، مجھے اپنی اس غلطی کے عوض نقصان بھی اُٹھانا پڑا لیکن مایوسی نے بھی کبھی میرے حوصلے پست نہیں کئے، میری وحشیتیں اور بڑھ گئیں، اگر میں ڈر پوک ہوتا تو پریم لال کے لاکھ کہنے کے بعد بھی ہندوستان واپسی کا ارادہ کبھی نہ کرتا، لندن میں میرے لئے کس بات کی کمی تھی؟ انکا میرے ساتھ تھی، میں دل کھول کر عیش کر سکتا تھا، سکون و آرام سے زندگی گزار سکتا تھا۔

نشیب و فراز سے گھبرا جانا بزدلی ہے، زندگی کے گراف میں اگر اُتار چڑھاؤ نہ ہوتا تو کوئی لطف بھی نہیں ہوتا۔ ایک ہی ڈگر پر چلتے چلتے انسان بہت جلد اُکتا جاتا۔ راستوں کے درمیان موڑ نہ آئیں تو سفر زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ جس نے اشوک کو کنٹرول کیا تھا میں اُس سے خائف نہیں تھا، وہ سامنے ہوتا تو میں اُسے مردوں کی طرح للکارتا لیکن وہ چھپ گیا۔ میرا ذہن اُس کو تلاش کرنے کے سلسلے میں اُلجھ رہا تھا، پشت سے چھرا گھونپنے والوں کو مرد نہیں، بزدل کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ آنکھ بھولی کھیلنا بچوں کو زیب دیتا ہے۔ مرد میدان چھپ کر وار نہیں کرتے، سامنے آ کر، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک دوسرے کو للکارتے ہیں، زندگی تھیلی پر رکھ کر پھرنے والے بدمست لوگ موت سے نہیں ڈرتے، موت اُن سے کتراتے رہتی ہے.....

میں نے انکا کی طرف نظر ڈالی، وہ ملی جلی کیفیت میں مبتلا تھی۔ کبھی وہ مضطرب انداز میں سر ڈال دیتی، کبھی اُس کی نگاہوں میں انکار بھڑک اُٹھتے، چنگاریاں چمکنے لگتیں، وہ ضرور مجھ سے شاکھی ہوگی۔ میں نے اُس کا کہا نہیں مانا، ورنہ شاید وہ اس موڑی پنڈت یا پجاری کو

بے نقاب کرنے میں کامیاب ہو جاتی جو سانپ کی طرح ایک بے گناہ کو ڈس کر نکل گیا، ہم لیکر پیٹتے رہ گئے۔

”اب سوگ منانے سے کیا حاصل ہوگا انکارانی؟“ میں نے اُسے سپاٹ لہجے میں مخاطب کیا۔ ”جو ہونا تھا ہو چکا.....“

جواب میں انکا نے مجھے خشکیوں نظروں سے دیکھا، پھر ہونٹ چبانے لگی۔

”میرا خیال ہے مورینا کا، کاک ٹیل خون تمہیں راس نہیں آیا..... آئندہ سیاہ فام

عورتوں کے خون سے پرہیز ہی کرنا۔“

انکا میرے طنز پر پھر گئی۔ اُس کی آنکھوں میں طاغوتی قوتوں کا بھیاں تک قص شروع ہو گیا، نگاہوں میں خون اتر آیا۔ لیکن غیض و غضب کی یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی، شاید اُس نے میرے سینے کی گہرائیوں میں جھانک کر میرے کرب کا اندازہ لگالیا تھا چنانچہ جلد ہی موم کی طرح پکھل کر بولی۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ جوش میں مت آنا۔ تم نے میری بات نہیں مانی، وہ جو بھی تھا اُسے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔“

”اچھا ہوا.....“ میں نے مسکرا کر دل کی بھڑاس نکالنی چاہئے۔ ”پہلے ہی موقع پر غریب تمہارے یا میرے ہاتھوں مارا جاتا تو اُس کی حسرتیں دل کی دل ہی میں گھٹ کر رہ جاتیں۔“ ”وہ تمہاری غلطی سے فائدہ اٹھا کر کوئی ہلاکت خیز وار کر جاتا تو.....؟“ انکا نے کسمسا کر سوال کیا۔

”تو کیا ہوتا.....؟“ میں نے بے پروائی کا اظہار کیا۔ ”دو فریقوں کی جنگ میں ہمیشہ ایک کو شکست ہوتی ہے۔ وہ کامیاب ہوتا تو میں مارا جاتا۔ مجھے زندگی کی کوئی تمنا بھی نہیں ہے۔“

”جلجھکی..... دل جلانے والی باتیں کیوں کر رہے ہو؟“ انکا تملتا کر بولی۔ ”میں نے تمہیں دُور اندیشی سے کام لینے کا مشورہ دیا تھا، جلدی میں کوئی قدم اٹھانے سے پرہیز کی درخواست کی تھی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے اُسے ٹٹولنے کی خاطر دریافت کیا۔ ”کیا اشوک کی موت میں پنڈت نول کشور کا ہاتھ نہیں ہو سکتا؟“

”نہیں.....“

”تم اس قدر یقین سے کس طرح کہہ سکتی ہو؟“

”جھیل.....“ انکا نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ”میرا تمہارا جنم جنم کا ساتھ ہے۔ تم میری طاقت سے بخوبی واقف ہو، میرے امکان میں کیا ہے کیا نہیں، تم بارہا اس کا تجربہ کر چکے ہو، آج انجان کیوں بن رہے ہو.....؟“

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ میں نے زو کھے لہجے میں کہا۔ انکا کی کہی بات نظر انداز کر گیا۔

”اشوک کے مرتے ہی میں نے سب سے پہلے پنڈت نول کشور کی خبر لی تھی۔“ انکا نے میری بے رخی کا اثر لیتے ہوئے اُداس آواز میں جواب دیا۔ ”وہ اس وقت کالی کے پجاریوں کو پرشاد بانٹنے میں مصروف ہے۔ میری بات کا یقین کرو، نول کشور کے فرشتوں کو بھی جہاز پر ہونے والے حادثے کا کوئی علم نہیں ہے۔“

”اشوک کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے انکا کو چھیڑنے کی خاطر مسکرا کر کہا۔ ”کیا وہ خوش نصیب نہیں تھا جو مرنے سے پیشتر تمہارے حسن کا دیدار کر گیا؟ تمہاری مدد آواز سن لی اُس نے؟“

”بات مذاق میں مت ٹالو.....“ انکا نے اٹھ کر میرے سر پر ٹھٹھکا شروع کر دیا۔ ”اشوک نے مجھے دیکھ لیا، میری تمہاری باتیں بھی سن لیں، یہ معمولی بات نہیں ہے۔ اُس کی پشت پر جو بھی تھا مہمان شکتی کا مالک تھا۔ اُس نے تمہیں میری صلاح نہ ماننے کو کہا تھا، اس کی بات کا معرہ حل ہو جائے تو میں اس کے پرکھوں کو بھی ڈھونڈ نکالوں گی جس نے مرنے والے کو اتنی شکتی دان کر دی تھی کہ وہ انکا کو دیکھ سکے۔“

”تمہارے حسن کا نظارہ تو مہاراج پر تمل لال بھی کر چکا ہے۔ سادھو جگد یو بھی فیضیاب ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کلہ پپ نے بھی تمہیں ضرور دیکھا ہوگا۔ اور بھی کئی نام میرے ذہن میں گردش کر رہے ہیں۔ تمہارے وہ آقا جو تمہیں کئی بار مجھ سے چھین چکے ہیں، یاد ہے تمہیں.....؟“

انکا کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا، اُسے میری تلخ باتوں سے ڈکھ پہنچا تھا، اُس نے اظہار نہیں کیا، بڑی ہمت سے میری کڑوی کیلی باتوں کا زہر پی گئی، غصہ سے کام لے

کر بولی۔

”میں پورے دشو اس سے کہہ سکتی ہوں کہ اشوک کے پیچھے کسی ایسی ہی شکلی کا ہاتھ ہے جو مہاراج پریتم لال، امر لال اور تمہاری کلدیپ سے کم مہا نہیں ہو سکتی۔ یہ بدری نرائن، ترینی، شیو چرن، سادھو جگدیو اور پنڈت ہری چرن کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ تمہاری انکارانی کو کسی دوسرے کی نظر میں لاسکیں۔“

میں انکا کی بات سن کر چونکا، اگر اس کا اندازہ درست تھا تو میرے لئے احتیاط شرط تھی، میرے اعصاب جھنجھٹانے لگے، انکا کی پراسرار قوتیں لازوال تھیں، وہ میری محبوبہ، دلنواز تھی، میری عاشق تھی، پرستار تھی، میری محنت تھی، وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی، دغا نہیں کر سکتی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لمحوں لمحوں کے گواہ تھے۔ اُس کا عشق سچا تھا، وہ میرے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتی تھی، اُس نے غلط نہیں کہا تھا۔ اگر وہ کسی اور وجود میں سامنے آنے کا اختیار رکھتی تو شاید میری زندگی میں نرگس، مالارانی اور کلدیپ کو کبھی نہ آنے دیتی۔ ان سیمیں بدن زہرہ جبینوں کو بھی میرے پاس پھٹکنے کی اجازت نہ دیتی جو میری بانہوں میں چمکتی رہتی تھیں، انکارانی میری دشتوں کا تماشہ دیکھتی رہتی، پھر بڑی حسرت سے آنکھیں موند کر کرٹ لے لیتی۔ وہ میری دوست تھی، میری صلاح کار تھی، رفیق تھی، آشنا تھی، ہم دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ میں ہزاروں موقعوں پر اُس کی وفا کو آزا چکا تھا، وہ مخلص تھی، مہربان تھی، کروٹ کروٹ میری شریک رہ چکی تھی۔ میں اُس کی وفا پر شک نہیں کر سکتا تھا۔

”کیا سوچنے لگے جمیل.....؟“ اُس نے مجھے الجھتا دیکھ کر بڑے پیار سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ اشوک کی پراسرار موت کے سلسلے میں پولیس مجھے بھی ضرور ٹٹولے گی؟“

”فکرت کرو، میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔“ اُس نے بڑی لگاؤ سے کہا، پھر رینگ کر میرے سر سے اُتر گئی۔ اُس نے واپسی میں دیر نہیں لگائی، میں اُس کے جانے کے بعد پھر اشوک کا معہ حل کرنے میں الجھ گیا تھا جب مجھے اُس کی آمد کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، وہ کسی خیال میں مستغرق تھی، بڑی سنجیدہ سنجیدہ ہی نظر آرہی تھی۔

”کوئی نئی اطلاع.....؟“

”ہاں.....“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”اشوک کی لاش کو کچن میں رکھا گیا ہے۔ اُس کی بیوہ کے علاوہ کسی کو ادھر جانے کی اجازت نہیں ہے، قریب بیٹھے مسافروں کو درخواست کر کے دوسری خالی سیٹوں پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ میں جہاز کے کپتان کے سر پر بھی گئی تھی، اُس نے جیٹی ایئر پورٹ پر اپنے آفس کو حادثے کی اطلاع دے دی ہے، صرف تمہاری نہیں، اشوک کے آس پاس بیٹھے دوسرے مسافروں سے بھی پوچھ گچھ ہوگی۔ ہو سکتا ہے کچھ افراد کو تفتیش کی خاطر بمبئی میں کچھ دنوں کے لئے رُکنے پر بھی مجبور کیا جائے۔“

”اشوک کی بیوہ کی کیا رائے ہے اپنے شوہر کی موت کے بارے میں؟“ میں نے پرسپیکل تذکرہ دریافت کر لیا۔

”وہ ابھی تک اشوک کی موت کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے۔“ انکا تھوڑے توقف سے بولی۔ ”میں نے سب سے پہلے اُسی کے ذہن کو پڑھا ہے، اشوک ایک سلجھا ہوا بردبار اور ذہین شخص تھا، اُس کی پوری زندگی میں کبھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا، میرا مطلب ہے کوئی ایسا واقعہ یا ایسی قابل ذکر بات نہیں ہوئی جو اُسے فائر عقل ثابت کر سکے۔ جس انداز میں وہ آج نظر آیا اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا، وہ اپنی دھرم پتی رنجنی کو بہت پیار کرتا تھا، اُن کی شادی دس سال پیشتر ہی ہوئی تھی۔ قسمت کی بات ہے کہ اُن کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ لیکن آج کل رنجنی کے اندر ایک زندگی کلبلارہی ہے، دو ماہ بعد وہ ایک بچے کو جنم دے گی۔ ایسے موقع پر اشوک کی موت نے اُس کو ہلا کر رکھ دیا ہے، کبھی وہ سر پٹنے لگتی ہے کبھی سکتے کی حالت سے دوچار ہو جاتی ہے۔“ انکا نے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”رنجنی کے من میں تمہارے خلاف کوئی زہر نہیں ہے، لیکن وہ یہ بات ضرور سوچ رہی ہے کہ تم نے اشوک کو لاشی کیوں ماری تھی.....؟“

”اور کچھ.....؟“ میں نے پہلو بدل کر پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہیں کچھ دنوں بمبئی میں رُکنا پڑے گا۔“ انکا نے کہا۔ ”اچھا ہی ہے، اسی بہانے ترنمین اور سید غوث سے بھی تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔“

”تم نے ابھی پنڈت نول کشور کے بارے میں کہا تھا کہ وہ اشوک کی موت کے حادثے سے بے خبر ہے.....؟“ میں نے کچھ سوچ کر دریافت کیا۔ ترنمین اور سید غوث کا نام سن کر میرا دل مچلا تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر موضوع بدل دیا۔

تھی کہ انکا بھی اشوک کے معاملے میں الجھ کر اُسے فراموش کر چکی تھی۔ میں امریتا کے حسین تصور سے دل بہلا رہا تھا جب ایک سوال بڑی سرعت سے میرے ذہن میں ابھرا۔ ”انکا نے اشوک کے سر پر مسلط ہونے کے بعد اُس کو گرو کو لکارنے پر کیوں مجبور کیا تھا؟ کیا وہ گرو وہی تھا جس کا ذکر امریتا نے کیا تھا یا انکا کا اشارہ کسی اور گرو کی طرف تھا.....؟“

”خواتین و حضرات توجہ فرمائیں۔“ مائیک پر اعلان شروع ہوا۔ ”میں اس فلائٹ کی سینئر ایئر ہوسٹس اسٹینی جان آپ سے مخاطب ہوں، آپ سے درخواست ہے کہ اپنی نشستوں کو درست کر لیں اور سیفٹی بیلٹ باندھ لیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اب سے پندرہ منٹ بعد ہم بمبئی کے انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر لینڈ کریں گے۔ میں کیپٹن کی جانب سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے برٹش ایئر لائنز کے ذریعے سفر کیا اور آئندہ بھی ہمیں خدمت کا موقع دیتے رہیں گے۔“

خواتین و حضرات، پرواز کے دوران جو اتفاقیہ حادثہ پیش آیا ہم اس کے لئے معذرت خواہ ہیں، آپ سے ایک بار پھر درخواست ہے کہ اپنی اپنی نشستیں درست کر لیں، سیٹ بیلٹ باندھ لیں اور جہاز جب تک رُک نہ جائے اپنی اپنی نشستوں پر اطمینان اور سکون سے بیٹھے رہیں..... شکریہ۔“

اعلان کے مطابق ٹھیک پندرہ منٹ بعد طیارے نے لینڈ کیا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا، انکا بھی بیدار ہوئی۔ سید مجذوب کی لاشی بدستور میرے ہاتھ میں تھی، مسافروں کے چہروں پر اب سکون نظر آ رہا تھا۔

جہاز کے رُکنے کے بعد مسافروں نے اپنا اپنا سامان سمینا شروع کیا۔ پہلے فرسٹ کلاس اور برنس کلاس کے مسافروں کو اترنے کی اجازت ملی، میرے اختیار میں ہوتا تو اُڑ کر امریتا تک پہنچ جاتا لیکن حالات نے اجازت نہیں دی۔ کچھ دیر بعد اکاٹومی کلاس کے مسافروں کی طویل قطار میں بھی حرکت پیدا ہو گئی۔ میں بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا آگے بڑھنے لگا۔ جہاز کے بعد برج سے گزر کر وسیع ہال میں پہنچا تو وہاں پولیس کی بھاری تعداد پہلے سے موجود تھی۔ ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہاتھ میں بیلے لئے سینہ تھانے کھڑا تھا، مجھے اُس کی شکل کچھ جانی پہچانی لگی۔ اُس کے ساتھ دو انسپکٹر بھی تھے۔

جہاز کے عملے اور رنجنی کی نشاندہی پر چار مسافروں کو روکا گیا، میں بھی اُن میں شامل

”ہاں، میں نے یہی کہا تھا۔“ انکا نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”تم کیا سوچ رہے ہو؟“

”تم نے بتایا تھا کہ اُس مردود پنڈت نے کالی کے مندر کے چاروں طرف منزل کھینچ رکھا ہے؟“

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہی ہوں۔“ انکا کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”میں کسی منزل میں داخل نہیں ہو سکتی لیکن کسی کے سر پر نیچے چھو کر اپنے حکم پر نچا سکتی ہوں۔ میں نے چڈٹ نول کشور کے ایک چیلے کو اپنا معمول بنا کر مندر میں بھیجا تھا۔ جب وہ باہر آیا تو میں نے اُسی سے ساری بات معلوم کر لی.....“

”یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم اب ذہنی طور پر بالغ ہوتی جا رہی ہو.....“

”جھیل.....“ انکا نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”میں نے تم سے تزئین کا ذکر کیا تھا، تم بات گول کیوں کر گئے.....؟“

”میں فی الحال اپنوں سے دُور رہنے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے سر دآہ بھری۔ ”پچھلی بار میرے دشمنوں نے مجھے گھیرنے کی خاطر میرے رفقاء، میرے عزیزوں کو بلاوجہ اذیت سے دوچار کیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس بار بھی وہ اپنے گھٹیا پن کا مظاہرہ کریں۔ میں صورت حال کو پوری طرح سمجھ لینے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھاؤں گا۔“

”اسی طرح دُور اندیشی سے کام لیا کرو.....“ وہ چپک کر بولی۔

”طنز کر رہی ہو؟“ میں نے انکا کو تیز نظروں سے دیکھا، وہ کوئی جواب دینے کی بجائے ہاتھوں کا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر روٹ لے کر لیٹ گئی۔ میں اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔

مسافروں کی نظریں بار بار میری سمت اُٹھ رہی تھیں۔ میں نے نشست سے سر نکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرے ذہن میں پھر اشوک کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ ابھرا۔ انکا نے مجھے اُس کی بیوہ رنجنی کے بارے میں جو کچھ بتایا اُسے جان کر مجھے ڈکھ ہوا۔ میں نے طے کر لیا کہ رنجنی کی مدد کرنے سے کبھی غافل نہیں ہوں گا، میں اشوک کی پراسرار موت کا ذمہ دار نہیں تھا لیکن رنجنی کے غم میں ضرور شریک ہو سکتا تھا۔

میں بڑی دیر تک حالات کے تانے بانے سلجھاتا رہا، میرے ذہن میں امریتا کا حسین تصور بھی ابھرا، میرا دل اُسے ایک نظر اور دیکھنے کو مچا۔ میں نے ضبط کا مظاہرہ کیا۔ جو حالات پیش آ چکے تھے اس کے تحت امریتا سے ملاقات کا ماحول خوشگوار نہیں تھا، مجھے خوشی

تھا۔ باقیوں کو جانے کی اجازت مل گئی۔ رنجنی کی حالت غیر ہو رہی تھی اس لئے اُسے باہر لے جایا گیا۔ ڈپٹی اور اُس کے ساتھ انسپکٹر مجھے اور میرے ساتھ رکنے والے باقی تین مسافروں کو نگاہوں نگاہوں میں ٹٹولتے رہے۔ ڈپٹی کی نظر بار بار میری جانب اُٹھ رہی تھی۔ وہ میرے ہاتھ میں دہلی لالھی کو بغور دیکھ رہا تھا، دہلی زبان میں انسپکٹروں کے ساتھ ساتھ کھسر پھسر بھی کر رہا تھا۔

میرے لئے وہ چویشن نئی نہیں تھی، پہلے بھی متعدد موقعوں پر پولیس سے میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ میں چاہتا تو اُن کے ذہنوں کو تسخیر کر کے اُن کی نگاہوں کے سامنے سے گزر جاتا، وہ مجھے روکنے کی ہمت نہ کر سکتے۔ لیکن بعد میں میری تلاش شروع ہو جاتی، بات بڑھ جاتی۔ میرے ساتھ ”مفرور“ کا دم جھلا لگا دیا جاتا۔ چنانچہ میں صبر سے کام لیتا رہا۔ دوسرے تین افراد خاصے مضطرب نظر آ رہے تھے۔ خاص طور پر بھاری ڈیل ڈول والے اُس شخص پر لرزہ سا طاری تھا جس نے پتلون اتارتے وقت اشوک کو لگا رکھا تھا۔

ہمارے پاسپورٹ پولیس نے قبضے میں لے لئے تھے۔ اُن کی نظریں پاسپورٹ میں درج ضروری کوائف پر بھی منڈلا رہی تھیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ گزرنے کے بعد ہمیں پولیس کی کار میں کسی تھانے پر لے جایا گیا۔ تھانے پہنچنے تک ڈپٹی یا انسپکٹروں نے ہم سے کسی قسم کی پوچھ گچھ نہیں کی، مہذب انداز میں پیش آتے رہے۔ تھانے پہنچ کر ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ دو مسلح گارڈ ہماری نگرانی پر تعینات کر دیئے گئے۔ انکا میرے سر پر بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ اُس کی بے چینی دیدنی تھی، کبھی وہ کچھ دیر کے لئے میرے سر سے اتر جاتی، کبھی دوبارہ آ جاتی۔

”کس اضطراب سے دوچار ہو رہی ہو میری جان؟“ میں نے اُکتاہٹ دور کرنے کی خاطر انکا کو پیار بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔

”تم نے ڈپٹی کو پہچانا.....؟“

”ہاں، آں.....“ میں بے پرواہی سے بولا۔ ”صورت کچھ جانی پہچانی لگ رہی ہے۔“ ”تمہاری اس کی ملاقات شبنم خان کے قمار خانے اور اڑے پر ہو چکی ہے، اُس وقت یہ انسپکٹر تھا، بڑا چلتا پرزہ آدمی ہے۔“ انکا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”اس کی ترقی میں اس کی خوبصورت اور نوجوان بیوی سروجنی کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ پہلے یہ ایک چھوٹے سے مکان

میں رہتا تھا، سروجنی سے شادی کرنے کے بعد اس کی قسمت کی لاٹری کھل گئی، کئی حقدار افسروں کو نظر انداز کر کے اسے انسپکٹر سے ڈپٹی بنا دیا گیا۔ اب چوپائی کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتا ہے جہاں بڑے بڑے کروڑ پتی رہتے ہیں، بڑا کائیاں اور کینہ خصلت ہے، میٹھی چھری کی طرح..... سروجنی کی وجہ سے اُونچے حلقوں میں بھی دُور دُور تک پہنچ رکھتا ہے۔ اس سے محتاط رہنے کی کوشش کرنا، تھانے میں برف خانے کے چمار کی طرح اکڑتا ہے، افسروں سے بھی نہیں ڈرتا۔ گھر پر سروجنی کو لکشی سمجھ کر اس کے تلوے چاٹا رہتا ہے۔“

”تم سروجنی کے سلسلے میں میرا اشتیاق بڑھا رہی ہو۔“ میں نے سرسراتی آواز میں جواب دیا۔

”فکرت کرو، میں اُسے بھی تمہاری آغوش میں مچلنے پر مجبور کر دوں گی۔“

میں انکا سے چٹخارے لے لے کر سروجنی کی باتیں کرتا رہا۔ وہ مجھے ڈپٹی اور سروجنی کے بارے میں ایک ایک بات تفصیل سے بتاتی رہی۔ اندر سے بلاوے آنے شروع ہو گئے، باری باری ایک شخص کو ایک وقت میں طلب کیا گیا۔ میرا نمبر سب سے آخر میں آیا، انکا پہلو بدلنے لگی۔ میں اُس کے اضطراب کا مقصد سمجھ رہا تھا، سروجنی کے ذکر کے دوران وہ کئی بار نگاہوں نگاہوں میں درخواست کر چکی تھی کہ میں خود کو قابو میں رکھوں، بے لگام ہونے کی کوشش نہ کروں، جوش سے پرہیز کروں، ہوش سے کام لوں۔ میں نے اسے کھل کر کہنے کا موقع نہیں دیا، سروجنی کا ذکر میرے لئے زیادہ لذت انگیز تھا، پولیس سے میری پرانی شناسائی تھی۔ میں نے جین کے فارم ہاؤس میں دو ماہ تک ارٹنگاز اور مراقبہ کی مشقیں کرنے کے بعد بہت ساری قوتیں دوبارہ حاصل کر لی تھیں۔ مجھے کسی بات کا ڈر یا خوف نہیں تھا۔

ڈپٹی کے کمرے کے باہر مجھے بیس منٹ تک کھڑا رکھا گیا، میں سمجھ رہا تھا کہ نفسیاتی حربوں سے کام لیا جا رہا ہے۔ میں نے کوئی احتجاج نہیں کیا، دیوار سے ٹیک لگائے انکا سے سروجنی کی باتیں کرتا رہا..... جب دروازے پر کھڑے سنتری نے اشارہ کیا تو میں نے قدم بڑھائے۔

”یہ لالھی باہر چھوڑ دو.....“ سنتری نے مجھے ٹوکا۔ اُس کا لہجہ توہین آمیز تھا۔

”نہیں.....“ میں نے فیصلہ کن لہجہ اختیار کیا۔ ”یہ لالھی میرے ساتھ جائے گی۔“

انکا تیزی سے میرے سر سے اتر گئی، سنتری کا رویہ یلغخت تبدیل ہو گیا۔ ”ناراض کیوں



انسپکٹر میری صاف گوئی پر شپٹا گیا۔ ڈپٹی نے اصل موضوع چھیڑ دیا۔

”کیا تمہیں علم ہے کہ ہم نے تمہیں یہاں تک لانے کی زحمت کیوں گوارا کی ہے؟“  
اُس کے لہجے میں رعونت تھی۔

”جی ہاں۔“ میں نے اپنے اندازِ گفتگو میں کوئی تبدیلی لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ”اُس مسافر پر جس کا نام اشوک تھا، اچانک ہی دیوانگی کا دورہ پڑا تھا، تفصیل آپ کو میرے ساتھ آنے والے دوسرے مسافر بھی بتا چکے ہوں گے۔“

”اشوک کی بیوہ کا کہنا ہے کہ تم نے اشوک پر لاشی سے حملہ کیا تھا.....“ ڈپٹی کی تیز نظریں میرے وجود کا انکسار کرنے میں مصروف تھیں۔

”جہاز میں افراتفری پھیل رہی تھی، عملے کے افراد بھی گواہی دیں گے کہ مرنے والا کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے محض ڈرانے کی خاطر اُس پر لاشی کا ایک ہلکا سا وار کیا تھا۔“

”جمیل احمد خان یا دولت علی۔“ ڈپٹی نے پہلو بدل کر قدرے درشت لہجے میں سوال کیا۔ ”کیا یہ دونوں مسلمانوں کے نام نہیں ہیں؟“

”میں نے کب انکار کیا.....؟“ میں مسکرا دیا۔ ڈپٹی کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔  
”اشوک نے مرتے وقت تمہیں مہاراج کہہ کر مخاطب کیا تھا، کچھ اور باتیں بھی کی تھیں؟“

”جی ہاں، میں پورے دشواس سے نہیں کہہ سکتا۔ پرنٹو ایسا ہی جان پڑتا تھا جیسے اُس کی بدھی میں کوئی گڑبڑاوش پیدا ہو گئی تھی۔“ میں نے مہاراج کے حوالے سے ٹیٹ ہندی میں جواب دیا۔ ”سچ کیا ہے، پر ماتما جانے.....“

”ہندی اچھی خاصی بول لیتے ہو.....“ ڈپٹی کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ ”کہاں سے سیکھی؟“  
”بھارت ورث میں جنم لیا، بیہیں پلا بڑھا، پروان چڑھا آپ جیسے مہاراجوں کی سجا میں اٹھا بیٹھا تو بولی بھی آ گئی۔“

”اشوک نے تمہیں مہاراج کیوں کہا تھا.....؟“ ڈپٹی نے پینتر بدل کر دریافت کیا۔  
”مرنے والا تو دھرتی سے سارے سمبندھ توڑ کر بھگوان کو پیارا ہو گیا، اُس کے من میں کیا تھا وہی بتا سکتا تھا۔“ میں نے معصومیت سے کہا، ڈپٹی کے علاوہ انسپکٹر بھی تلملا کر رہ گیا۔

ہوتے ہو مہاراج، تم لاشی لے جانا چاہتے ہو تو بڑے شوق سے لے جاؤ۔“

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، ڈپٹی ایک میز پر بیٹھا تھا، ایک انسپکٹر اُس کے بائیں ہاتھ پر موجود تھا، کمرے میں اُن دونوں کے سوا مجھے کوئی اور نظر نہیں آیا۔ میں قدم بڑھاتا میز کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ انکا میرے سر پر دوبارہ آ گئی۔ ڈپٹی کی تیز نظریں میرے چہرے پر جھپٹ لگیں، انسپکٹر نے ایک نظر لاشی پر ڈالی پھر سپاٹ لہجے میں بیٹھنے کو کہا۔ میں خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا پاسپورٹ سامنے میز پر موجود تھا۔ مجھے بلانے سے پیشتر شاید وہ دوبارہ اس میں درج معلومات کو کھنگال چکے تھے۔

”تمہارا شہ نام.....؟“ ڈپٹی نے سنبھل کر میٹھے سروں میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”خاکسار کو جمیل احمد خاں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔“

”جمیل احمد خاں۔“ اُس نے میرے نام کو دہراتے ہوئے اپنی یادداشت کو کریدا۔ اُس کے تیور بدلنے لگے۔ ”میں شاید تم سے پہلے بھی کہیں مل چکا ہوں۔“

”یہ تم نے کیا غضب کر دیا.....؟“ انکا نے مجھے غلطی کا احساس دلایا۔ ”پاسپورٹ میں تمہارا نام دولت علی درج ہے۔“

مجھے بھی جلد بازی کا احساس ہو گیا، مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا، اس کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ میں نے بوکھلانے کی غلطی نہیں کی، ڈپٹی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

”میں مصروف آدمی ہوں، دیس بدلیں پھرتا رہتا ہوں، روزانہ سینکڑوں افراد سے ملاقات ہوتی ہے، پولیس افسران کی بڑی تعداد بھی مجھ سے واقف ہے، ہو سکتا ہے آپ سے کبھی ملاقات ہوئی ہو۔“

”تم نے اپنا نام جمیل احمد خان بتایا ہے مگر.....“ انسپکٹر نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ میں اس کا مقصد سمجھ گیا، اُسے مزید کچھ کہنے کا موقع دینا مناسب نہیں تھا، میں نے مسکرا کر خود اقرار کر لیا۔

”پاسپورٹ میں میرا نام دولت علی درج ہے، آپ شاید یہی کہنا چاہتے تھے۔“

”ہاں، لیکن تم نے.....“

”یہ میری مجبوری ہے انسپکٹر۔“ میں نے لاپرواہی سے شانے اچکاتے ہوئے اُس کی بات پھر کاٹ دی۔ ”آپ اسے کوئی بھی رنگ دے سکتے ہیں۔“

میرے سر سے اتر گئی۔ جاتے جاتے اُس نے دبی زبان میں پھر مجھ سے ہوش برقرار رکھنے کی درخواست کی، میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”انکارانی، تم کچھ دیر کے لئے انسپکٹر کی نگاہوں پر پردہ ڈال دو، اس کی قوتِ سماعت معطل کر دو۔ ڈپٹی کو میں سنبھال لوں گا۔“

صورت حال بڑی تیزی سے تبدیل ہونے لگی، انسپکٹر کو غصے میں کھڑا ہوتا دیکھ کر ڈپٹی بھی آپے سے باہر ہو گیا، غرا کر بڑے خونخوار لہجے میں بولا۔

”تم اپنی اوقات سے بڑھ رہے ہو مہاشے، دماغ ٹھنڈا رکھو، ورنہ تمہاری ساری اکڑنوں دوسرے راستے سے نکلواؤں گا۔“

”ڈپٹی.....“ میں نے جواب میں اُسے غضبناک نظروں سے گھورا۔ ”تم جس کرسی پر بیٹھے اکڑ رہے ہو جانتے ہو یہ تمہیں کس کے کارن ملی ہے؟ وہ سندری میرے کہنے پر تم سے شادی نہ کرتی تو تمہارا بھوش بھی خطرے میں پڑ جاتا، تم چوپائی کے اپارٹمنٹ کی بجائے اس سے فٹ پاتھ کی کسی جھونپڑی میں پڑے ہوتے۔ وہ فائل تمہاری اڑھی میں آخری کیل ثابت ہوتی جس میں تمہاری رشوت خوری کی تمام رام کہانی موجود تھی۔ میں سرودھنی کے کہنے پر ریکارڈ روم سے وہ فائل غائب نہ کرانا تو اب تک تمہاری پتلون نہ جانے کب کی اتر چکی ہوتی۔“

میں انکا کی فراہم کردہ اطلاعات سے فائدہ اٹھاتا رہا، ڈپٹی کی آنکھیں پٹیٹانے لگیں۔ میں نے اُس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا، وہ سمندر کی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا، انسپکٹر بت بنا کھڑا رہا، انکا کے تیز پنجوں نے اُس کو یقیناً قابو کر لیا ہوگا، ڈپٹی نے اپنے پیر میز سے ہٹا لئے، دزدیدہ نظروں سے انسپکٹر کی طرف دیکھا، شاید یہ بات اُسے کھک رہی تھی کہ میں نے ایک ماتحت کے سامنے اُس کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا، اُسے ششدر کر دینے کا ایک اور موقع میرے ہاتھ آ گیا۔

”اس کی چننا مت کرو.....“ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”میں نے اس کے کانوں پر ہاتھ جمار کھا ہے۔ جب تک میں نہ چاہوں، یہ ہماری باتیں نہیں سن سکتا.....“

”تم..... تم.....“ ڈپٹی کو میری بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ منہ سے گفارتھا۔ میں نے اُس کو کمزور پڑتا دیکھ کر ایک اور بھر پور ضرب لگائی، اپنی لاشی اٹھا کر انسپکٹر کی نظروں کے

”سنبھلو جیل.....“ انکا نے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔ ”تمہاری باتیں جلتی پرتیل کا کام کر رہی ہیں۔“

”تم چننا مت کرو انکارانی۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ”اس وقت اگر میں ڈر گیا تو ان کے حوصلے اور بڑھ جائیں گے جنہوں نے تمہاری نظروں کے سامنے دھوئیں کی چادر تان دی تھی، اینٹ کا جواب ہمیشہ پتھر سے دیا جاتا ہے، ڈپٹی کتنے پانی میں ہے یہ میں بھی دیکھ رہا ہوں۔“

انکا نے کچھ کہنے کی بجائے ہونٹ بھیجنے لئے۔ ڈپٹی نے اپنی ریوالونگ چیئر پیچھے کر کے دونوں ٹانگیں اٹھا کر میز کے کونے پر رکھ لیں۔ اس طرح وہ مجھے باور کرانا چاہتا تھا کہ میں اس کی تحویل میں ہوں، میں نے زیادہ زبان درازی کی تو وہ اپنے سپاہیوں کو طلب کر کے میری چوڑی اڈھیڑے کا فرمان بھی جاری کر سکتا تھا۔ اُس کی نگاہوں میں نفرت اور حقارت کے ملے جلے تاثرات ابھرنے لگے۔ تھوڑے وقفے کے بعد اُس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

”جس جگہ تم بیٹھے ہو، اسے تھانہ کہتے ہیں۔ اور میں یہاں کا ڈی ایس پی ہوں۔ یہاں کیول میرا حکم چلتا ہے۔ میرے ایک اشارے پر اچھے اچھوں کے کس بل نکال دیئے جاتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہوتا.....؟“

ڈپٹی کا آخری جملہ میرے لئے کھلچیلچ تھا۔ میں کمزوری دکھاتا تو وہ اور سرچڑھنے کی کوشش شروع کر دیتا۔ میں اُسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ کس شخص سے دشمنی مول لے رہا ہے۔ میں نے کوئی جواب دینے کی زحمت نہیں گوارا کی، اُسے تیز نظروں سے گھورنے لگا۔ انکا میرے سر پر کسمسے لگی، انسپکٹر کی پیشانی پر بھی بل نمایاں ہو گئے۔ وہ ڈپٹی کا چپیتا لگتا تھا اس لئے بول پڑا۔

”شرافت کی زبان نہیں سمجھو گے تو ہمیں مجبوراً تمہارے ساتھ دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔“

”تم اپنی چونچ بند ہی رکھو انسپکٹر.....“ میں نے پورے طعنائی سے انسپکٹر کو مخاطب کیا۔

”جب دو بڑے بات کر رہے ہوں تو بچوں کا درمیان میں بولنا اچھا نہیں لگتا۔“ انسپکٹر کو مجھ سے اتنے تلخ جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ غصے میں کانپتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ انکا ایک وقت میں کسی ایک ہی شخص کو نشانہ بنا سکتی تھی۔ انسپکٹر کو بے قابو ہوتا دیکھ کر تیزی سے

سے انکار نہیں کرے گا۔ اس بار معاف کر دو، دوبارہ کبھی بھول چوک نہیں ہوگی۔  
 ”اپنی زبان میں اپنے آدمیوں سے بھی کہہ دینا کہ میرا راستہ کھونا کرنے کی کوشش نہ کریں۔“ میں نے سینہ تان کر کہا۔ ”ابھی کچھ دنوں رہوں گا تمہاری بمبئی میں۔ ہو سکتا ہے تمہاری سندری کے درشن کرنے بھی آ جاؤں۔“  
 ”بڑی کرپا ہوگی.....“ ڈپٹی نے عاجزی کا اظہار کیا۔ ”آپ کے آنے سے ہمارے بھاگیہ اور کھل جائیں گے۔“

”سروجنی سے ابھی میرا ذکر مت کرنا۔ وہ میرا سننے کی تو ملنے کو بے چین ہو جائے گی۔“  
 ”جو حکم مہاراج.....“  
 میں واپسی کے لئے پلٹا تو ڈپٹی قدم بڑھاتا دروازے تک آ گیا۔ وہ میرا بے دام غلام بن چکا تھا۔ میں نے دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو ڈپٹی نے بڑی انکساری سے درخواست کی۔  
 ”مہاراج، مجھے شاکر دیا تو میرے انسپکٹر کی گستاخی بھی معاف کر دو، میں اُسے تمہارے بارے میں سمجھاؤں گا۔“

”دھیرج رکھو۔“ میں نے ٹھوس لہجہ اختیار کیا۔ ”میرے جانے کے کچھ دیر بعد تمہارا انسپکٹر بھی میرے کشت سے مکتی پا جائے گا۔ اسے کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں، دوبارہ ہوش میں آنے کے بعد یہ سب کچھ بھول چکا ہوگا۔“

ڈپٹی ہاتھ باندھے کھڑا رہا، میں مونچھوں پر تاؤ دیتا کمرے سے باہر آ گیا۔ تھانے سے باہر نکل کر میں نے ایک ٹیکسی پکڑی، ڈرائیور کو تاج ہوٹل چلنے کی ہدایت دے کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد انکا بھی سر پر آ گئی۔ بڑی مسرور نظر آرہی تھی۔ اُس کی نگاہوں میں میرے لئے پیار ہی پیار بھرا تھا۔ خاموشی سے میرے سر پر آلتی پالتی مارے بیٹھی مجھے والہانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں کچھ دیر چپ رہا، پھر میں نے انکا کو چھیڑنے کی خاطر سنجیدگی سے کہا۔

”میں سمجھ رہا ہوں تمہاری خوشی کا مطلب۔ لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔“

”کیا ہوا جمیل.....؟“ انکا نے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

سامنے لہراتا ہوا بولا۔

”کچھ پٹائی دے رہا ہے انسپکٹر۔ یا اندھے ہو گئے؟ ابھی بڑے غصے میں سانپ کی طرح بل کھا کر اٹھے تھے، کیا وہی ناگ سوگھ گیا تمہیں، بت بنے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟ ایک ہی جنت میں چت ہو گئے۔ دیکھ لیا چونچ کھولنے کا انجام۔ وردی کے زعم میں بڑے لال پیلے ہو رہے تھے۔ اب تمہاری حزم خانی کہاں تک کر رہ گئی؟“

میں انسپکٹر کی شان میں گستاخیاں کرتا رہا، ڈپٹی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔  
 ”تم نے مجھ سے شبنم خان کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا؟“ میں نے لاشی نیچے رکھ کر ڈپٹی کو بازاری انداز میں آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ”میری تمہاری ملاقات وہیں ہوئی تھی۔ تم اُس کے قمار خانے اور اڈوں پر کس لئے جاتے تھے؟ کچھ یاد آ رہا ہے یا میں بتاؤں؟“  
 ”مجھ سے بھول ہو گئی۔“ ڈپٹی نے بزدلوں کی طرح ہتھیرا ڈال دیے۔ شبنم خان کے حوالے پر ممکن ہے اُسے یاد آ گیا ہو کہ وہ وہاں کن لڑکیوں کی تلاش میں گیا تھا، میری اُس کی ملاقات کن حالات میں ہوئی تھی۔ لیکن اُس کے دل میں چور تھا، حرام کی کمائی کا خوف مرتے وقت تک رشوت خوروں کے ذہن سے کن کھجورے کی طرح پلٹا رہتا ہے، ڈپٹی تو ابھی زندہ تھا، سیر کے سامنے سوا سیر آ جائے تو وہ دم دبالتا ہے۔ ڈپٹی بھی انہی کیفیات کا شکار تھا، عاجزی سے کہنے لگا۔

”میں آپ کو پہچان نہیں سکا ورنہ.....“

”ورنہ بڑے گھائے میں رہتے۔“ میں نے میز سے اپنا پاسپورٹ اٹھا کر جیب میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”اب میرے لئے کیا حکم ہے؟ تم میری چڑی اُدھیرنے کا ارمان پورا کرو گے یا.....“ میں نے دیدہ دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”میں شام چاہتا ہوں مہاراج۔“ ڈپٹی نے ہاتھ جوڑ لئے۔ ”میں آپ کو بغیر جل پانی کے نہیں جانے دوں گا، آپ کی سیوا کر کے مجھے خوشی ہوگی۔“

”سیوا کرنے کے مواقع تمہیں ملتے رہیں گے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”جب تک سروجنی کا دھیان رکھو گے میرا آشیر باد تمہارے ساتھ رہے گا۔ میں نے جس دن تمہارے سر سے ہاتھ اٹھالیا، تمہارا جیون کانٹوں میں الجھ جائے گا۔“

”نہیں مہاراج نہیں.....“ ڈپٹی ہاتھ باندھ کر گھلیا نے لگا۔ ”سیوک تمہاری کسی بات

کا میجر چھوٹے موٹے افراد کو گھاس بھی نہیں ڈالتا۔ لیکن اُس کی بھی کچھ کمزوریاں ہیں جو ڈپٹی سے دیتا ہے۔ بڑا چلتا پرزہ آدمی ہے، ڈپٹی کے سامنے دُم بھی ہلاتا رہتا ہے اور اُس کے ذریعے اپنا کام بھی نکالتا رہتا ہے۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجاتی ہے، تم بھی یہ گریکھ لو۔“

”نصیحت کر رہی ہو.....؟“

”مشورہ دے رہی ہوں۔ ماننا نہ ماننا تمہارے اختیار کی بات ہے۔“

میں نے انکا سے یہ نہیں پوچھا کہ ڈپٹی کو میرے تاج ہوٹل میں ٹھہرنے کا علم کس طرح ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ انکا نے اپنے پنجے اُس کے سر میں جھسک کر اپنا غلام بنالیا ہوگا۔ پھر ڈپٹی کے فرشتے بھی اُس کے کسی حکم کی پیروی کرنے سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ انکا تھکی تھکی تھی۔ اُس نے میرے سر کے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ جلد ہی اُس کے ہلکے ہلکے خراٹے میرے کان میں گونجنے لگے۔

بہمنی کی جانی پہچانی شاہراہوں سے گزرتے ہوئے مجھے تزیین یاد آگئی۔ ماضی کے دُھندلکوں سے گرد چھٹنے لگی۔ مجھے یاد آیا، میں چچا جان کے ساتھ بنارس جانے کی خاطر فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں سوار تھا، ڈبے میں ہم دونوں کے سوا کوئی تیسرا نہیں تھا۔ تزیین الہ آباد کے اسٹیشن سے ہوا کے ایک معطر خوشگوار جھونکے کی طرح ہمارے ڈبے میں داخل ہوئی۔ میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ اُس کی عمر بمشکل سترہ اٹھارہ کے درمیان رہی ہوگی لیکن وہ حسن مجسم نظر آرہی تھی، اُس کی ایک ایک ادا کا فرانہ تھی۔ عمر اُس کی بالی، قد سرو جیسا، چہرہ شاداب، آنکھیں مینانہ، ادائیں دلربانہ، خدو خال تکیے، چال مستانہ، زلفیں ناگنوں کی طرح بل کھتی ہوئیں، آنکھیں بہنیں جیسی، انداز میں تمکنت.....

وہ قدرت کی تحقیق کا ایک منفرد، معصوم اور حسین شاہکار تھی۔ میں حسن پرست تھا۔ وہ زندگی کی نازک ذرا پر کسی عیسیٰ کی مانند کھل اُٹھنے کے مراحل سے گزر رہی تھی، میرے اندر ایک ہلچل سی بہہ ہوئی لیکن کوئی بات ضرور تھی کہ میری نظروں میں اُس کے لئے میل نہیں تھا، میرا دل اُس کی طرف نہ ہنچ رہا تھا مگر ہوس کے جذبوں میں ایک معمولی سا ارتعاش بھی نہیں ہوا۔ میں اُس کی معصومیت میں گم ہونے لگا۔ مجھے اپنی زنگس یاد آگئی، زنگس کا سایہ تزیین کے خدو خال۔ اس کے انگ انگ میں موجود تھا۔ وہ زنگس کا عکس نظر آرہی تھی۔ میرے دل کے زخم پرے ہوئے۔

”مجھ سے بھول ہو گئی۔“ میں ہاتھ مسلنے لگا۔ ”مجھے ڈپٹی کو اُسی وقت مار دینا چاہئے تھا جب اُس نے مجھے ترچھی نظروں سے دیکھا تھا۔“

”تم نے اچھا کیا جو اُسے معاف کر دیا۔“ انکا نے مجھے احساس دلانے کی کوشش کی۔

”تم نے جس انداز میں اُس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ ڈالا، وہ لا جواب تھا۔ اب وہ تمہارا غلام بن چکا ہے۔ آئندہ بھی تمہارے کام آتا رہے گا۔ جانتے ہو اُس نے انسپکٹر کے ہوش میں آنے کے بعد کیا کہا تھا؟“

”کیا.....؟“

”وہ اپنی خوش قسمتی کا اظہار کر رہا تھا کہ اشوک کی موت کی تفتیش کے بہانے تمہارے جیسے دھرماتما سے ملاقات ہو گئی۔“

”مجھے ہموار کرنے کی کوشش مت کرو، میں نے طے کر لیا ہے کہ پہلی فرصت میں ڈپٹی کا کریا کرم کر دوں گا۔“ میں نے بگڑے ہوئے تیور سے جواب دیا۔

انکا مجھے حیرت سے گھورنے لگی۔ پھر مسکرا کر بولی۔ ”تمہاری یہ ادا مجھے پسند آئی۔ اسی طرح شوخ شوخ باتیں کیا کرو۔“

”کیا مطلب.....؟“ میں نے اُسے تیز نظروں سے گھورا۔

”میں تمہاری انکارانی ہوں جمیل صاحب، جو دلوں کا بھید بھی جان لیتی ہوں۔“ انکا ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر بولی۔ ”کیا یہ غلط ہے کہ تم جان بوجھ کر مجھے تنگ کرنے کی کوشش کر رہے ہو.....؟“

میں جواب میں مسکرا دیا، پھر تھوڑے توقف سے بولا۔

”جانتی ہو اس وقت ہم کہاں جا رہے ہیں.....؟“

”تم پریشان مت ہو۔“ انکا نے پاؤں پسار کر لاپرواہی سے جواب دیا۔ ”تاج میں تمہارے نام سے کمرہ بک ہو چکا ہے، ایک نئی جھلملاتی کار تمہارے مصرف میں رہا کرے گی۔ جب تم میجر سے ملو گے تو تمہیں اپنی اہمیت کا احساس ہو جائے گا۔“

”میں جانتا ہوں، تم ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہو۔“

”غلط سمجھ رہے ہو۔“ اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”تاج میں تم ڈپٹی کے مہمان کی حیثیت سے رہو گے۔ اُسی نے میجر کو فون کر کے تمہارے لئے خاص ہدایات دی ہیں۔ تاج

انکا نے بتایا کہ وہ لکھنؤ کی ایک طوائف کی بیٹی ہے۔ الہ آباد میں اپنے پہلے مجرے کے سلسلے میں آئی تھی، لاکھوں دلوں کو گھائل کر کے جا رہی تھی۔ لکھنؤ کے بڑے بڑے عزت دار نواب اور رئیس زادے اس کے لئے بڑھ چڑھ کر بولیاں لگا رہے تھے۔ مجھے انکا کی بات پر یقین نہیں آیا، ترمین کے معصوم، بھولے بھالے چہرے کی پاکیزگی گواہی دے رہی تھی کہ اس جسم کو کسی مرد کا ہاتھ نہیں لگا..... البتہ ترمین کے ساتھ جوادھیر عمر کی عورت ڈبے میں سوار ہوئی تھی وہ بڑی گھاگ اور جہاں دیدہ نظر آرہی تھی، کھیلی کودی معلوم ہوتی تھی۔ جب تک ترمین میری ہمسفر رہی، میری بے چین نظریں اُس کے چہرے کی معصومیت، اُس کے مہکتے مسکراتے وجود کا طواف کرتی رہیں۔ بعد میں کلدیپ نے بتایا تھا کہ ترمین بھی طوائف زادی ہے، اُس کی ماں نے پیشہ ترک کر کے ایک رئیس کے ساتھ شادی کر لی تھی، ترمین نے دنیا میں جب آنکھ کھولی، اس وقت اس کی ماں کا تعلق کسی بالا خانے سے نہیں تھا لیکن اُس کی خالہ اشرفی بیگم نے بہن سے اپنا انتقام لینے کی خاطر اُس کا گھر اجاڑ دیا، ترمین کو طوائف بنا دیا۔ مگر اس نے جلد بازی میں ترمین کی سودے بازی نہیں کی، اس کا بھاؤ بڑھانے کی خاطر اپنے تجربوں سے کام لیتی رہی۔ درمیان میں، میں آگیا۔ میں نے اُسے اپنی نرگس کا پرتو سمجھ کر اشرفی بیگم سے چھین لیا، بڑے ہنگامے ہوئے، بڑے بڑے نوابین نے مجھے درمیان سے ہٹانا چاہا، اشرفی بیگم نے اپنے پرانے آشناؤں کی غیرت کو لٹکارا، غنڈوں کو پیچھے لگا دیا، میں نے ہار نہیں تسلیم کی، جو بھی سامنے آیا اُسے ٹھوکر مار کر راستے سے ہٹا تا گیا۔ کلدیپ بھی ترمین سے بیٹی کی طرح پیار کرنے لگی۔ پھر میں اُسے سید غوث کے محفوظ ہاتھوں میں سوپ کر دوسرے کھیزوں میں الجھ گیا۔ اب بمبئی میں آیا تو ترمین اور نرگس کی یادیں پھر تڑپانے لگیں۔

ٹیکسی رُکی تو میں نے ہڑ بڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ تاج ہوٹل میں ٹیکسیوں کا داخلہ ممنوع تھا لیکن مجھے نہیں روکا گیا تھا۔ تاج ہوٹل کا منیجر میرے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گیا، وہ میرے استقبال کو پہلے سے باہر موجود تھا۔ میں نے سر پر نظر ڈالی، انکا موجود نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ بمبئی جیسے شہر میں تاج جیسے ہوٹل کا منیجر کیوں میرے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا تو منیجر نے ایک پستہ قد کے آدمی کو میرے سامنے پیش کیا۔ وہ دوہرے جسم کا ایک ہٹا کٹا شخص تھا جس کے چہرے پر گھنی مونچھیں خاصی خطرناک لگ

رہی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں نظر آنے والی خوفناک چمک اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ خطرات سے کھیلنے کا عادی رہ چکا ہے، موت سے ڈر کر بھاگنا اُس کے اصول کے خلاف رہا ہوگا۔ اکیلا کئی آدمیوں پر بھاری پڑ سکتا تھا، اپنے حلیے اور چہرے کے خطرناک تاثرات کے برعکس اُس نے بڑے ڈھنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا، کوٹ کی جیب پر زرد اور سفید رنگ کے ملے جلے ریشمی دھاگوں سے "P" کا انگریزی حرف کڑھا ہوا تھا۔

"اس کا نام پرتھوی ہے....." منیجر نے مہذب لہجے میں پستہ قد والے کا تعارف کرایا۔ "یہ آپ کی گاڑی کا ڈرائیور ہے۔ ہمارے بھروسے کا آدمی ہے۔ آپ اس پر اعتماد کر سکتے ہیں، جب بھی آپ کو اس کی ضرورت ہو، استقبالیہ کو مطلع کر دیں، یہ آپ کو صدر دروازے پر گاڑی سمیت تیار ملے گا۔"

"ڈپٹی سے میرا شکریہ ادا کر دینا۔" میں نے شان بے نیازی سے منیجر کو مخاطب کیا۔ "اب میں کچھ دیر آرام کروں گا۔"

منیجر، پرتھوی کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ سید مجذوب کی لالچی الماری میں رکھی، پھر نیم گرم پانی سے غسل کیا تو ذہن کا غبار چھٹنے لگا۔ میں نہا کر باہر نکلا تو انکا سر پر آگئی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ الماری میں میرے ساڑے کے بے شمار لباس موجود ہیں۔ میں نے ایک ہلکے لباس کا انتخاب کیا۔

"اب کیا ارادے ہیں.....؟" میں بالکونی میں آرام کرسی پر بیٹھا تو انکا نے مسکرا کر پوچھا۔ "کچھ شغل کرو گے؟ تاج میں آج کل ایک روسی طائفہ مقیم ہے، ایک سے بڑھ کر ایک ہوش اڑا دینے والی گداز جسم کی حسینائیں موجود ہیں۔"

"پرتھوی کیسا آدمی ہے.....؟" میں نے انکا کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ "کیا ایک ہندو پر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟"

"غنڈوں، بد معاشوں اور دہشت گردوں کا کوئی دین دھرم نہیں ہوتا۔" انکا بولی۔ "پرتھوی بڑی خوبیوں کا مالک ہے، جوڈو کراٹے کا ماہر ہے، ہر قسم کے اسلحہ کے استعمال سے بھی واقف ہے۔ خنجر زنی کی وارداتوں میں بڑے بڑے اُستادوں کے کان کتر سکتا ہے، دست بدست لڑائی کے فن سے بھی واقف ہے۔ دو سال کی قید مشقت کی سزا بھی کاٹ چکا ہے، کسی سدھائے... شکاری کتے کی طرح مالک کے ایک اشارے پر کسی کا بھی نینوا



دبوج سکتا ہے۔“

”مالک کون ہے.....؟“

”ہوٹل کا میجر اور ڈپٹی مل جل کر پرتھوی کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ لیکن جس کی ڈیوٹی سوئپ دی جائے اس سے بھی غداری نہیں کرتا۔“ انکا نے بڑے یقین سے کہا۔ پھر ٹھنک کر بولی۔ ”جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم کسی اور کی بات کیوں کرتے ہو.....؟“

”انکارانی.....“ میں سنجیدہ ہو گیا۔ ”تم واقف ہو کہ میں نے جین جیسی وفادار حسینہ سے کیوں منہ موڑ لیا، میرے ہندوستان واپس آنے کی وجہ بھی جانتی ہو۔ تم ہی نے بتایا تھا کہ میرے دشمنوں کو میری واپسی کی اطلاع مل چکی ہے، وہ حرکت میں آنے کے لئے منصوبے بنا رہے ہوں گے، خود کو منظم کرنے میں مصروف ہوں گے، صلاح مشورے کر رہے ہوں گے۔ دشمنوں کو سنبھلنے کا موقع دینا دانشمندی کے خلاف ہے۔ تم گواہ ہو، میں بدری نرائن کو ڈھیل نہ دیتا، گر بہ کشتن روزِ اول کے اصول پر عمل کرتا، شروع شروع میں اُس کا سر چل دیتا تو آج اس قدر تہانہ ہوتا۔“

”پھر تم نے کیا سوچا ہے.....؟“

”ہر دوڑ چلتے ہیں.....“ میں نے ٹھوس اور سرد لہجہ اختیار کیا۔ ”پنڈت نول کشور بھی کیا یاد کرے گا کہ اُس کا واسطہ کس سر پھرے سے پڑا ہے، وہاں اُس کے چیلے اور حاشیہ بردار بھی اکٹھے ہوں گے۔ میں اُسے مردوں کی طرح للکاروں گا، پھر جو بھی ہو۔ اچھا ہے کہ قصہ جلدی ختم ہو جائے، وہ تتر بتر ہو گئے تو مجھے پھر اُن حرا مزادوں کے پیچھے مارا مارا پھرنا پڑے گا۔ جنگ ایک محاذ پر ہو تو فیصلہ بھی جلدی ہو جاتا ہے، کئی محاذ کھل جائیں تو توجہ بٹ جاتی ہے۔“

”میں ابھی تمہیں ہر دوڑ جانے کا مشورہ نہیں دوں گی۔“ انکا کسمسانے لگی۔

”کیوں.....؟“ میں مسکرا دیا۔ ”میری موت کے تصور سے ڈرتی ہو.....؟“

”ایسی منحوس باتیں زبان پر مت لایا کرو جمیل۔“ اُس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”تمہاری طرح میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ پہلے اس درخت کو جڑ سے کاٹ دیا جائے جس کے نیچے تمہارے دشمن سر جوڑ کر مشورہ کرتے ہیں۔ لیکن تم نہیں جانتے، پنڈت نول کشور بڑا کینہ خصلت دشمن ہے، وہ کھل کر سامنے نہیں آئے گا، منڈل میں بیٹھا دوسروں کو آگ میں

جھونکتا رہے گا۔ کچھ عرصہ انتظار کر لو، میں کوئی نہ کوئی ایسا راستہ ضرور ڈھونڈ نکالوں گی کہ وہ خود بوکھلا کر منڈل سے باہر آ جائے۔“ انکا نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”تم پہلے بھی منڈل توڑنے کا تماشہ دیکھ چکے ہو۔ اس بار ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ نول کشور نے تمہارے آنے کی اطلاع پا کر اپنے کچھ ہرکارے وندھیا چل کی طرف دوڑائے ہیں جہاں امرالال کا سپنولا چندرا، ایک برفانی گکھا میں ڈھونی رمائے بیٹھا مہان شکتی حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔“

”چندرا.....“ میں نے مٹھیاں بھینچ کر غضبناک لہجے میں کہا۔ ”تیرے باپ نے بدری نرائن کی حمایت میں کھڑا ہو کر میری کلدیپ کو میسور کی پہاڑیوں سے نیچے اُترنے پر مجبور کر دیا تھا، وہ درمیان میں نہ آتا تو کلدیپ کو کالی کا آشیر باد حاصل کرنے کی خاطر اپنی زندگی کا نذرانہ کبھی نہ پیش کرنا پڑتا۔ تیرا گھمنڈی باپ کلدیپ اور کالی کے معاہدے کی بھٹک نہ پا سکا، کلدیپ نے ہاتھ کے اشاروں سے اُس بد بخت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اُس کی موت اذیتناک ثابت ہوئی۔ لیکن میں تجھ سے اپنی کلدیپ کا اتنا بھیاںک اور خوفناک انتقام لوں لگا کہ تیری پلید آتما بھی کبھی شانت نہ ہو سکے گی۔ میں تیری بوٹیاں جیل کوؤں کو کھلاؤں گا، تجھے چتا کی آگ بھی نصیب نہیں ہوگی۔“

میں عالم تصور میں چندرا سے مخاطب تھا۔ میرے جنون میں ہر لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ میں بے قابو ہو رہا تھا، میری وحشتیں بڑھتی جا رہی تھیں، کلدیپ کی یاد نے مجھے دیوانہ کر دیا، میں پاگل ہو گیا، عقل و خرد سے بیگانہ ہونے لگا۔

”ہوش میں آؤ جمیل۔“ انکا کی آواز میری قوتِ سماعت سے ٹکرائی۔ ”اپنے آپ کو سنبھالو، ورنہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھو گے۔“

”دفع ہو جاؤ میرے سر سے۔ کوئی اور ٹھکانہ تلاش کر لو، مجھے نصیحتیں مت کرو۔“ میں پوری قوت سے چیخا۔ ”چلی جاؤ..... میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں تمہارے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہوں، سنا تم نے، مجھے تمہاری کوئی ضرور..... رو..... رت..... رت.....“

میں اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ انکا میرے سر پر تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کے باریک بنجوں کی تیز چھن ہر لمحہ شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا، میرے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں ماؤف ہو گئیں، میرا ذہن گھپ اندھیروں

میں ڈوبتا چلا گیا۔

وقت کی رفتار تھم گئی، میں ہر بات سے بے نیاز ہو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو میں بالکونی میں اپنے بستر پر تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ہلکی ہلکی دھند طاری تھی۔ تاج ہوٹل کے کمرے میں دھند کا ہونا تعجب خیز بات تھی۔ شاید انکا کے باریک بنجوں کی تیز چیمین نے میری بصیرت پر اثر ڈالا ہو، مجھے کم نظر آنے لگا ہو، میں جسے دھند سمجھ رہا تھا وہ میری نظروں کی کمزوری بھی ہو سکتی تھی جس نے ہر شے کو دھندلا دیا ہو، انکا کی وجہ سے میں ایک بار اپنی سیدھی آنکھ سے بھی محرم ہو چکا تھا۔ انکا اُن دنوں تربیتی کے سر پر تھی۔ میں نے اُس کی غیر موجودگی میں تربیتی کی زندگی کا منہوس چراغ گل کرنے کی کوشش کی، انکا نے مجھے ایک آنکھ سے محروم کر دیا۔ میں بعد میں تربیتی کے اشاروں پر ناپنے کو آمادہ ہوا تو اُس نے انکا کے ذریعے میری بے نور آنکھوں کو دوبارہ روشن کرادیا۔ مگر اُس وقت اور بات تھی، اُس وقت تک میں صرف انکا کا محتاج تھا۔ اب میرے اندر نندا کی بخشی ہوئی ماورائی قوتیں موجود تھیں، پریم لال کا آشیر باد حاصل تھا، ارتکاز اور مراقبہ کی مشقوں نے مجھے حیرت انگیز طاقتوں سے مالا مال کر رکھا تھا۔

”نہیں.....“ میرے نیم بیہوش ذہن نے کہا۔ ”انکارانی ایسا کوئی عمل نہیں کر سکتی جو میرے لئے نقصان دہ ثابت ہو۔“ خود انکا نے مجھے بتایا تھا کہ پریم لال نے اُسے میرے پاس لانے سے پیشتر کہا تھا کہ اب وہ صرف اُس کی آتما کے دائرہ اختیار میں ہے، جب تک اُس کی آتما انکا سے دستبردار نہیں ہوگی کوئی دوسرا پنڈت یا پجاری اس کو قابو نہیں کر سکے گا۔ ایسی صورت میں انکا سے کسی جارحانہ رویے کی امید نہیں کی جاسکتی تھی، وہ جانتی تھی کہ پریم لال کی آتما میری پشت پر تھی۔

”پھر وہ دھند کیسی تھی.....؟“ میں نے غور کرنے کی کوشش کی لیکن ذہن نے ساتھ نہیں دیا، میرے دل کی دھڑکنیں یلخت تیز ہونے لگیں۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم اور ذہن کی ساری قوتیں مجھ سے چھین لی گئی ہوں، میں مفلوج ہو کر رہ گیا تھا، میری آنکھیں دیکھ سکتی تھیں، میرے کان سن سکتے تھے لیکن میرا جسم حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے زور لگا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اپنی جگہ سے ذرا بھی جنبش نہ کر سکا، میں نے سر پر نظر ڈالی، دھند کی چادر اتنی دبیز نہیں تھی کہ میں قریب کی چیز بھی دیکھنے سے قاصر رہتا۔ انکا میرے سر

پر نہیں تھی، وہ میرے ذہن کو وقتی طور پر معطل کر کے کہیں چلی گئی تھی..... ”کہاں...؟“ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں نے بیہوشی سے قبل پنڈت نول کشور کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ پیش قدمی کرتا، اُس پر چھپٹ پڑنے کی سوچ رہا تھا۔ انکا نے مجھے میرے ارادے سے روکنے کی کوشش کی۔ میں اُسے بتانا چاہتا تھا کہ مچان پر بیٹھ کر جنگل کے بادشاہ کا شکار کھیلنے والے مرد نہیں ہوتے۔ جو شیر کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر گولی داغنے کی ہمت اور حوصلہ رکھتے ہیں وہی شکاری کہلانے کے مستحق بھی ہوتے ہیں۔ لیکن انکا نے میری بات نہیں سنی، بات امر لال کے بیٹے چندرا کی آئی تو میرے ماضی کے درکھل گئے، مجھے اپنی کلدھپ یاد آگئی۔ میں بے قابو ہو گیا، میری وحشتیں حد سے گزرنے لگیں تو انکا نے مجھے ہر سکون رکھنے کی خاطر اپنے باریک اور تیز بنجوں کا نشتر لگا کر مجھے بیہوش کر دیا۔ پھر.....

شاید میری بیہوشی اور انکا کی غیر موجودگی میں میرے دشمنوں کو وار کرنے کا موقع مل گیا، وہ غافل نہیں ہوں گے، گھات لگائے بیٹھے ہوں گے، ایک ایک لمحے کی خبر رکھتے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہیں میرے تاج میں ٹھہرنے کی اطلاع مل گئی ہو۔ اُن کا کوئی بھیدی بھی کہیں آس پاس منڈلا رہا ہو، اُسے کسی پہنچے ہوئے پنڈت یا پجاری سے بھٹک لگنی ہو کہ میدان صاف ہے، اُس نے پھرتی سے کام کیا ہو، کوئی زہریلا انجکشن لگا کر مجھے مفلوج کر کے نکل گیا ہو۔ میرے خشک ہونٹوں پر مایوسی کی زرد مسکراہٹ ابھر آئی۔

”جمیل احمد خان، اب تمہارا وقت پورا ہوا، بہت دنوں سینہ تان کر دندنا تے پھرے، کلدھپ کی فحشٹی اور پریم لال کی پرارتھنا تمہیں بچاتی رہیں، انکا کے پراسرار وجود نے تمہیں بڑے عیش کرائے، تم نے جو مانگا وہ ملا، جو چاہا وہ پورا ہوا۔ لیکن کب تک؟ کبھی نہ کبھی تو تمہاری زندگی کے چڑھتے سورج کو بھی ڈوبنا تھا، گہن لگنا تھا۔ جو پیدا ہوتا ہے اُسے ایک دن موت کا ذائقہ بھی ضرور چکھنا پڑتا ہے۔ انکا، کلدھپ اور پریم لال سے بھی بڑی ایک قوت ہے جو پوری کائنات کی مالک ہے، جو کچھ تمہیں نظر آتا ہے، جو تم دیکھ نہیں سکتے، وہ سب کچھ اُس کی نظروں میں ہوتا ہے۔ وہ خود مختار ہے، موت اور زندگی دونوں اُس کے اختیار میں ہیں۔ اُس سے کہاں تک بھاگ سکتے ہو؟ ایک نہ ایک دن تو تمہیں مرنا تھا، بچھتانے سے کیا حاصل ہوگا؟ اب بھی کچھ سانسیں تمہارے پاس امانت رہ گئی ہیں، فائدہ

اٹھ لو، اُس کے سامنے جھک جاؤ، ہاتھ جوڑ لو، گزر گزرا کر معافی مانگو۔ یہ وقت بھی گزر گیا تو ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔“

میرا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگا، مجھے پریتم لال یاد آیا، اُس نے کہا تھا کہ مجھے کلدیپ کے ادھورے کام پورے کرنے ہیں۔ وہ مہان شکستوں کا مالک تھا، زمین کی تہوں اور سمندر کی گہرائیوں میں بھی جھانک سکتا تھا۔ دیوی دیوتاؤں نے اُسے لازوال قوتوں سے نواز رکھا تھا۔ وہ مرنے کے بعد بھی ہڈیوں کے پنجے کے روپ میں میرے سامنے آگیا تھا مگر شاید وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ میری زندگی کا سفر پورا ہونے کا وقت قریب آچکا ہے۔

موت کا تصور بڑا ذہیناک تھا..... میں نے زور لگا کر پھر اُٹھنے کی کوشش کی، مجھے اس بار بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ میں نے عالم تصور میں چیخ چیخ کر انکا کو آوازیں دیں، پریتم لال کی آتما کو مدد کے لئے پکارا، کلدیپ کو یاد کیا۔ میری نگاہوں تلے اندھیرے لپکنے لگے، دل کی دھک دھک تیز ہو گئی، پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دھند کو چیرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دم گھٹنے سے پیشتر شاید ایسا ہی کرب، ایسی ہی وحشتیں طاری ہوتی ہیں، ڈوبنے والا شخص ہاتھ پیر چلانے سے باز نہیں آتا، آخری سانس تک جدوجہد جاری رکھتا ہے، ڈوبتا ہے، ابھرتا ہے، پھر ڈوبنے لگتا ہے، زندگی کی اس دم اکھڑنے تک قائم رہتی ہے، امیدیں سہارا دیتی ہیں، جینے کی آرزو ختم نہیں ہوتی، زندہ رہنے کو اُکساتی رہتی ہے۔ میری حالت غیر ہو رہی تھی..... میں اُس مچھلی کی طرح پھڑپھڑانے لگا جو پانی سے نکل کر خشکی میں آگئی ہو۔ مجھے اپنا وجود بیچ مجدھار میں غرق ہوتا نظر آ رہا تھا جب ایک من موہ لینے والی سریلی نسوانی آواز میرے کانوں میں گونجی.....

لیکن مجھے یوں لگا جیسے میں تپتے ہوئے ریگستانوں میں بھٹکتا بھٹکتا کسی نخلستان میں پہنچ گیا ہوں، اُس آواز میں سحر تھا، جادو تھا، کشش تھی، زندگی کی حرارت کا احساس تھا، زندہ رہنے کی نوید تھی۔ میں چونکا، مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم کی تمام بندشیں ایک ایک کر کے ٹوٹ گئی ہوں۔ میری نظروں کے سامنے سے دھند کی چادر سرک گئی، میری بینائی پوری طرح بحال ہو گئی۔ میں حرکت کرنے کے قابل ہو گیا..... میں نے کروٹ بدلی، آواز کی سمت دیکھا تو زندہ رہنے کی آرزوؤں میں ابال آنے لگا، دل کی ڈوبتی حرکتوں کو ٹھہرا آگیا۔

میں اُسے آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا، وہ کسی مندر کی کمن پجارن نظر آ رہی تھی۔

پجارنوں کے لباس میں سمٹی سمٹائی میری نگاہوں کے سامنے کھڑی تھی، اُس کے معصوم چہرے کا تقدس اُس کی پاکیزگی کا گواہ تھا، اُس کی نگاہوں میں بھولپن تھا، اُس کے ہونٹوں کے گداز میں زندگی ہی زندگی تھی، اُس کے خدوخال، اُس کا حسن، اُس کے چہرے پر کھیلتی حیا کی شرمیلی مسکان، لچک کر کھڑا ہونے کا انوکھا انداز، بدن کی خوشبو، لباس کی سادگی میں پرکاری، گھنیری دراز پلکیں، ایک ایک ادا قیامت تھی۔ بادامی آنکھوں میں کاجل کی ڈور نے اُس کے حسن کو دو آتشہ بنا دیا تھا۔

”کون ہو تم.....؟“ میں نے پوچھا۔

”پجارن۔“ وہ مدھم مدھم سُر میں بولی۔ ”تم بیا کل تھے، میں تمہارا من بہلانے کو آگئی۔“

”تمہارا نام.....؟“ میں نے پلکیں جھپکائے بغیر دریافت کیا۔ ڈر تھا کہ کہیں وہ خواب

ٹوٹ نہ جائے۔

”کجرا..... پجارن کجرا۔“ اُس نے لجا کر جواب دیا۔

”تمہیں میری بے چینی، میری وحشتوں کا علم کیسے ہو گیا.....؟“

”دیوتا کی سیوا کرنا تو پجارن کا دھرم ہوتا ہے مہاراج۔“ اُس کی نگاہوں میں کنول تیرنے لگے۔ ”تم نے من سے مجھے آواز دی میں آگئی۔ میرے بڑے بھائیہ کہ اسی بہانے تمہارے درشن ہو گئے۔“

”تم نے میری پکار سن لی تھی؟“

”ہاں مہاراج..... ایک من دھڑکتا ہے تو دوسرے کو بھی اس کی خبر مل جاتی ہے، اسی کو جنوگ کہتے ہیں۔“ وہ پھولوں سے لدی شاخ کی مانند لپکنے لگی، نظریں جھکا کر مدھم لہجے میں بولی۔ ”جوت سے جوت ہوتی ہے، پرکھوں نے یہی کہا ہے۔“

”تم آگئیں، میرے من کو قرار آگیا.....“ میں نے اپنے کے مخملی جسم کو بغور دیکھا۔

”گرو دیو بھی یہی بھاشن دیتے ہیں۔“ اُس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”کوئی بیا کل

ہو، کوئی کشت بھوگ رہا ہو تو اُس کی سیوا کرنا بڑے پن کا کام ہے۔“

”تم رہتی کہاں ہو.....؟“ میں نے دبی زبان میں پوچھا۔

”مندر میں۔“ وہ معصومیت سے بولی۔ ”دیوی کے چٹوں میں۔“

”اگر میں تمہیں اپنے من مندر میں چھپا لوں؟“

”نہیں مہاراج۔“ وہ لجا گئی۔ ”ایسی باتیں پجارن کو شو بھانہیں دیتیں۔ شریر کا شریر میں کھل جانا پاپ ہوتا ہے۔ منٹ ایسے راستے پر چلے تو بھٹک جاتا ہے، اس کی منو کا منائیں کبھی پوری نہیں ہوتیں، سارا جیون گھور اندھیرے میں بیت جاتا ہے، مرنے کے بعد نرک میں جاتا ہے۔“

”تم کس مندر میں رہتی ہو.....؟“ میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

”یہاں سے پچھتم کی اور چلو تو چار پانچ کوس دُور دُور گا مائی کا ایک مندر آتا ہے، اُسی مندر کی ایک کٹی میں رہتی ہوں۔“ اُس نے بھولپن سے جواب دیا۔ ”پنڈت اوم پرکاش نے دیا کھا کر مجھے شرن دے رکھی ہے۔“

”وہاں تمہارے ساتھ اور پجارنیں اور پجاری بھی رہتے ہوں گے؟“

”ہاں.....“ اُس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ”تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟“ ”تمہیں کسی پجاری سے پریم نہیں ہوا.....؟“ میں نے نقلی آواز میں سوال کیا، وہ شرما گئی۔ لا جوتی کی مانند خود اپنے ہی وجود میں سمٹنے لگی۔

”کیسی مورکھوں جیسی باتیں کر رہے ہو مہاراج، پریم تو کیول دیوی دیوتاؤں کے ساتھ ہوتا ہے، منٹ تو بھٹکتا رہتا ہے۔ بھٹکنے والوں سے کیا پیار کرنا.....؟“

”کبھی کسی پجاری نے تمہارا ہاتھ نہیں تھاما؟“ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کجرا کی معصوم باتیں میرے دل پر اثر کر رہی تھیں۔ میں سب کچھ بھول کر اُس کے حسین وجود میں گم ہونے لگا۔ ”ہٹے کٹے پجاری کبھی بھنگ چڑھا کر شیطان بھی بن جاتے ہیں۔“

”پھول تو کانٹوں کے بیج ہی کھلتے ہیں مہاراج.....“ وہ بڑی حسرت سے بولی۔ ”کوئی تو ڈلیا جاتا ہے، کوئی ڈالی پر ہی سوکھ کر مرجھا جاتا ہے، جس کے بھوش میں جو لکھ دیا گیا، وہ اوش پورا ہوتا ہے، پنڈت اوم پرکاش مہاراج بھی یہی کہتے ہیں۔“

”اوم پرکاش نے تمہیں کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھا؟“ میں نے سرسرا تے لہجے میں دریافت کیا۔

”کئی بار دیکھ چکے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”مندر میں اور بھی پجارنیں ہیں، پر نتوہ مجھے سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ میرا من اُداس ہوتا ہے تو میں اُن کے چرنوں میں ڈنڈوت کرنے چلی جاتی ہوں۔ اُن کی بڑی کرپا ہے میرے اوپر۔“ وہ پلکیں تیز تیز

بچپکاتے ہوئے بولی۔ ”میں زیادہ اُداس ہوتی ہوں تو وہ میرا من شانت کرنے کے لئے مدھ کا پیالہ بھی دیتے ہیں، اُسے پی کر میرے من کو شانتی مل جاتی ہے، میں سارے دُکھ درد بھول جاتی ہوں، کبھی کبھی میری آنکھ بھی لگ جاتی ہے۔ جب دوبارہ اُٹھتی ہوں تو اپنی کٹی میں ہوتی ہوں۔“

میرے اندر لٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی۔ میں جان گیا کہ پنڈت اوم پرکاش اُسے مدھ (شراب) کا پیالہ دے کر مدھ ہوش کر دیتا ہوگا۔ بے ہوشی کے عالم میں کجرا کے سندر شریر سے کھیلتا ہوگا، اپنی پیاس بجھاتا ہوگا، پھر کسی پجاری کے ذریعہ اسے اس کی کٹی میں بھیج دیا جاتا ہوگا۔ پجاری اپنا خراج الگ وصول کرتے ہوں گے۔ مندر اور پاٹھ شالاؤں میں اس قسم کی کہانیاں بڑی عام ہوتی ہیں، دیوی دیوتاؤں کے نام پر وقف کر دی جانے والی معصوم، کم عمر اور بھولی بھالی لڑکیاں جس ماحول میں پرورش پاتی ہیں اسی کو زندگی سمجھ کر قبول کر لیتی ہیں۔“ کجرا نے جس معصومیت سے اپنی بربادی کی کہانی سنائی اسے سن کر میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون کھول اُٹھا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں سے بے خبر تھی، لیسروں کو اپنا محافظ سمجھ رہی تھی۔

”تمہارے ماما پتا..... دوسرے بڑے کہاں رہتے ہیں؟“ میں نے اُسے کریدنے کی خاطر سوال کیا۔

”بھگوان جانے.....“ وہ اُداس ہو گئی۔ ”جب میں بہت چھوٹی تھی اسی سے میری ماں مجھے دیوی کے چرنوں میں ڈال گئی تھی۔ اوم پرکاش مہاراج نے یہی بتایا ہے۔“

”میں تمہیں کیسا لگتا ہوں.....؟“ میں نے موضوع بدل دیا۔

”تم..... تم تو مہاراج ہو، مہان شکتیوں کے مالک۔“ کجرا بڑی عقیدت سے بولی۔

”تمہارے سائے تلے بیٹھ کر سنانے کو من کرتا ہے، جیون کا سارا سوا دتمہارے چرنوں میں ہی تو ہے۔ اوم پرکاش مہاراج نے یہی کہا تھا۔“

”اور اگر میں کہوں کہ تم میرے چرنوں میں جیون پتا دو..... تو؟“

”بات میرے بس میں ہوتی تو میں کبھی انکار نہ کرتی، سارا جیون تمہارے چرنوں میں پتا دیتی، ایک بل کے لئے بھی تمہاری گھنیری چھایا سے دُور نہ جاتی لیکن.....“

”لیکن کیا کجرا؟“ میں نے تڑپ کر اُس کے چہرے پر ابھرنے والی مایوسی کا سبب

کبھی کامیاب نہ ہوگا، اُس کی موت، اُس کا انت تمہارے ہاتھوں ہوگا، تم اُسے اپنے چنوں تلے روند دو گے، اُس کے شریک کو آگ لگا دو گے، اُس کے نرک میں جانے کے بعد پھر کوئی مسلا ہماری طرف آنکھیں اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گا، اُن کا سارا گھمنڈ ٹوٹ جائے گا اور..... اور اس کے بعد.....“

سجرا نے شرما کر پلکیں جھکالیں، میری نگاہیں اُس کے حسن کے نکھار کا جائزہ لے رہی تھیں، میرے اندر لاؤ بھڑک رہا تھا، لاوا اُبل رہا تھا، وہ معصوم فتنہ جو میرے سامنے کھڑی تھی، جمیل احمد خان کا دل بہلانے نہیں آتی تھی، میرے کسی دشمن کی آغوش کو گرمانے کو بھیجی گئی تھی، میرا ماتھا ٹھنکا، مطلب صاف تھا، تاج میں میرے علاوہ پنڈت نول کشور کا کوئی ایسا چیلہ بھی ضرور موجود تھا جس پر پنڈت اوم پرکاش بھی مان کر رہا تھا۔ میرے اندر کھلبلی شروع ہو گئی۔ میں نے جلد بازی نہیں کی، احتیاط سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

”تم کچھ کہتے کہتے چپ کیوں ہو گئیں؟..... جو کچھ من میں ہے کھل کر کہہ ڈالو۔“

”مہاراج اوم پرکاش نے کہا تھا کہ وجہ تمہاری ہوگی۔“ سجرا اپنی اوڑھنی کا کونہ دانتوں میں دبا کر بل دیتے ہوئے مدھر آواز میں بولی۔ ”دشمن کو چتا کی آگ میں جھونکنے کے بعد تم اگر مجھے اپنی سیوا کے لئے مانگو گے تو مہاراج انکار نہیں کریں گے۔“

”میرا نام جانتی ہو.....؟“ میں نے مسکرا کر سوال کیا۔

”تمہارا شبہ نام بھی تمہاری ہی طرح سندر ہے.....“ وہ شرما کر مدھم آواز میں بولی۔

”مہاراج کالی داس.....“

مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ہو گئی۔ میں نے سجرا کو زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا، بات بگڑ جاتی تو ایک شکار میرے ہاتھ سے نکل جاتا۔ میرے خون کی گردش تیز ہونے لگی، میں سوچنے لگا، سجرا میرے سامنے موجود ہے، کیوں نہ اسے ہاتھ بڑھا کر دبوچ لوں، اس کے نازک جسم کو پھول کی طرح مسل کر رکھ دوں، ایک ایک پگھڑی کو نوچ کھسٹ کر ہوا میں منتشر کر دوں، خاک میں ملا دوں۔ لیکن میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ میری نظروں میں کھب گئی تھی۔ میں اسے بعد میں بھی حاصل کر سکتا تھا، پہلے اُس زہریلے ناگ کالی داس کا سر چلنا ضروری تھا جو تاج ہی کے کسی کمرے میں کنڈلی مارے، میری موت کی گھات لگائے بیٹھا تھا۔

پوچھا۔ ”تم چپ کیوں ہو گئیں.....؟“

”اوم پرکاش مہاراج نے کہا تھا کہ میں گھڑی دو گھڑی تمہارا دل بہلا کر واپس آ جاؤں۔ میں اُن کا کہا نہیں ٹال سکتی۔“

”پنڈت اوم پرکاش نے میرے بارے میں تم سے اور کیا کہا تھا.....؟“ میں نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔ سجرا کی بات سن کر معامیرے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ وہ کسی اور کے دھوکے میں بھٹک کر میرے کمرے میں آ گئی ہے۔ میں مسلمان تھا، وہ ایک مندر کی پجاری تھی، تربیت کے دوران اُسے یہ بات بھی ضرور سکھائی گئی ہوگی کہ مسلمانوں سے دُور رہے، اُن کے سائے سے علیحدہ رہنے کی کوشش کرے، نفرتوں کا درس دیا گیا ہوگا، اور نہ جانے کیا کیا زہر گھٹی میں گھول کر پلایا گیا ہوگا۔ اُس کا جسم چندن تھا، اُس کی آنکھوں میں شراب بھٹی تھی، وہ کسن تھی، گداز جسم کی مالک تھی، پنڈت اوم پرکاش اُس جیسی خوبصورت پجاریں سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ جانے کتنے پجاری اور دیوداس بھی اس پر دانت جمائے بیٹھے ہوں گے۔ وہ اُسے ایک مسلمان کی خدمت پر مامور کرنے پر کیسے آمادہ ہو سکتے تھے؟ کہیں نہ کہیں کوئی خلاء ضرور موجود تھا۔

”وہ تمہارے معر ہیں، تم انہیں جانتے ہو۔ پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو.....؟“ وہ معصومیت سے بولی۔ اُس کی آواز میں ترنم تھا، اُس کے لہجے میں راگنی تھی۔

”سجرا.....“ میں نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے پیار سے کہا۔ ”مجھے بتاؤ،

پنڈت اوم پرکاش نے تمہیں کیا حکم دیا تھا؟ کیا بتایا تھا میرے بارے میں؟“

”مہاراج نے مجھے بتایا تھا کہ تم بھی پنڈت نول کشور مہاراج کے جتھے میں شامل ہو، تمہاری ہتھکی اپرم پار ہے، تم نے بڑی کٹھن تپتیا کے بعد وہ استھان حاصل کیا ہے جو دوسروں کو نہیں ملتا۔“ سجرا نے میری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیئے، میں نول کشور کا نام اُس کی زبان سے سن کر پہلو بدلنے لگا، سجرا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اُسے زندہ نہ چھوڑتا، اُس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نول کشور کو بطور تحفہ روانہ کر دیتا۔ لیکن وہ ایک حسین پجاری تھی، جس میں میری کمزوری تھی، نول کشور میری نفرت کی انتہا تھا۔ میں کسی آخری نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ سجرا کی مدھر آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔

”وہ دشت جو سات سمندر پار سے ہمارا بیڑی بن کر آیا ہے وہ اپنے ناپاک ارادوں میں



طرف دیکھنے لگا۔ وہ خطرے کی بوسوگھ چکا تھا، میں نے اُسے سنہلنے کا موقع نہیں دیا۔ میں پریم لال کی سوچی ہوئی قوت کو ایک بار پہلے بھی آزما چکا تھا، میں نے اُس وقت بھی اُس کا نام سچے دل سے لے کر سوچا۔

”کجرا کے بیان کے مطابق پنڈت کالی داس، پنڈت نول کشور کی بساط کا ایک مہرہ اور میرا دشمن ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو اسے خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ کر خود کشی کر لینی چاہئے.....“

پریم لال نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ میں جب بھی کسی جائز کام کے لئے سچے دل سے اُس کا نام لے کر کسی خواہش کا اظہار کروں گا، وہ ضرور پوری ہوگی۔ میں پنڈت کالی داس کو گھورتا رہا۔ میری سوچ مکمل ہونے کے بعد اُس کے چہرے کے تاثرات بڑی سرعت سے تبدیل ہونے لگے، اُس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا، اُس کے قدم لڑکھڑانے لگے، اُس نے سنہلنے کی کوشش کی لیکن سنہل نہ سکا، لڑکھڑا کر زمین پر گرا..... اُس کے ہاتھ مٹینی انداز میں گردن کی طرف بڑھنے لگے، پھر اچانک وہ اس طرح فرش پر ہاتھ پاؤں چلانے لگا جیسے اُس کو اپنے انجام کی خبر مل گئی ہو۔ اُس کے جسم کے جوڑ پھوٹوں میں کھنچاؤ کی شدت صاف نظر آرہی تھی، وہ پوری جدوجہد کر رہا تھا کہ اُس کے ہاتھ گردن سے دور رہیں۔ موت اور زندگی کا بھیانک نائک کچھ دیر جاری رہا، مگر وہی ہوا جو میں نے دل میں سوچا تھا۔ کالی داس کی تمام تر کوششوں کے باوجود اُس کے ہاتھوں کا ٹھنڈہ گردن میں پڑ گیا۔ پریم لال کی آتما کی مہمان خشتی کہیں دُور بیٹھی میری خواہش کو پورا کر رہی تھی، کالی داس تڑپتا رہا، موت کے چنگل سے نجات پانے کی خاطر آخری وقت تک اُس نے اپنی کوشش ترک نہیں کی لیکن وہ پریم لال کی خشتی کا توڑ کرنے میں ناکام رہا۔ اُس کی آنکھیں حلقوں سے اُبل کر باہر آ گئیں، جسم تڑپ تڑپ کر ساکت ہو گیا تو میں نے آنکھیں کھول لیں۔

میرے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ پجاری کجرا کی بھول نے میرے ایک دشمن کو جہنم رسید کر دیا۔ میں سوچنے لگا کالی داس کی موت کی اطلاع پنڈت اوم پرکاش اور نول کشور کو ملے گی تو ان کے سینوں پر سانپ لوٹ جائیں گے۔ وہ پراسرار طاقت بھی ششدر رہ جائے گی جس نے جہاز پر اشوک کو انکا کو دیکھنے اور سننے کی قوت بخشی تھی، میرے دشمنوں کی صفوں میں کہرام مچ جائے گا، وہ میری طرف سے غافل نہیں ہوں گے،

”کس وچار میں گم ہو گئے مہاراج.....؟“ کجرا کی آواز کا ترنم جاگا۔ میں خیالوں کی دنیا سے ہوش میں آ گیا۔

”اب جاؤ کجرا.....“ میں نے سنجیدگی سے قدرے بدلے ہوئے انداز میں اُسے مخاطب کیا۔ ”تمہارے آنے سے میرے من کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ پنڈت اوم پرکاش سے میرا پرنام کہنا، مجھے ایک ضروری جاپ یاد آ گیا، دشمن کونٹ کرنے کے کارن اس جاپ کو ترنت کرنا ضروری ہے، تم سندر ہو، میری نظروں کو بھاگتی ہو۔ میں پھر کبھی اطمینان سے نہیں سبوا کا موقع دوں گا۔“

”بھول نہ جانا مہاراج.....“ وہ روانی میں کہہ گئی۔ پھر ہاتھ باندھ کر سنجیدگی سے بولی۔ ”میں چلتی ہوں، مجھے آ گیا دو۔“

میں نے پنڈت پجاریوں کی طرح سیدھا ہاتھ بلند کر کے اُسے آ شیر باد دیا، وہ پھول کی شاخ کی طرح چٹکی، پھر اُلٹے قدموں چلتی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ میں سنہل کر بیٹھ گیا، انکا ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ حالات کی سگن لینے گئی ہوگی۔ میں پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔ کجرا کے آجانے سے میرے اوپر طاری کسلندی کی تمام کیفیتیں چھٹ چکی تھیں، میں تروتازہ ہو گیا تھا، میں نے انکا کی واپسی کا انتظار ضروری نہیں سمجھا، بستر پر ہی یوگا کی مشق کرنے کے انداز میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا، آنکھیں بند کر کے ارتکاز میں مستغرق ہو گیا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا، میری نگاہوں کے سامنے سے درود پوار کی زکاوٹیں سرکنے لگیں، میرے اندر کی روشنی بڑھتی گئی، مجھے ایک دروازہ نظر آیا جس پر پیتل کے ہندسوں سے چار سواٹھائیس درج تھا، میرے اندر نندا کی بخشی ہوئی قوتیں بیدار ہو کر کروٹیں لینے لگیں، میری نظریں دروازے سے گزر کر اندر کمرے میں پہنچ گئیں۔ ہر شے صاف نظر آنے لگی۔

دراز قد کا ایک ہٹا کٹا شخص جسم پر لنگوٹی باندھے فرش پر آسن جمائے بیٹھا تھا، اُس کی آنکھیں بند تھیں، ہونٹ متحرک تھے، کسی جاپ میں مگن تھا۔ میری نظریں اُس کے چہرے سے ٹکرائیں تو اُس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں، اُس کی سرخ سرخ آنکھیں حلقوں کے درمیان تیزی سے حرکت کرنے لگیں۔ شاید اُس نے بھی میری بھنک پالی تھی۔ کسی ربڑ کی گیند کی طرح تیزی سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا، پھٹی پھٹی نظروں سے کمرے میں چاروں

کا، اسی ہونٹ کے ایک کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔  
 ”اُس نے خودکشی کر لی ہوگی.....؟“ میں نے بے پرواہی سے کہا۔ ”اپنے ہاتھوں اپنا  
 گلا گھونٹ لیا ہوگا۔“

”کیا مطلب؟“ انکا نے چونک کر مجھے دیکھا، کچھ توقف سے بولی۔ ”جیل، تم مجھ سے  
 کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو؟“  
 ”مجھے کالی داس کی بھنگ مل گئی تھی انکارانی۔“ میں نے اعتراف کر لیا۔ ”اُسے میں نے  
 ٹھکانے لگا دیا۔“

”تمہیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟“ وہ شپٹانے لگی۔  
 ”نہیں، مجھے اپنے کمرے سے کہیں جانے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔“  
 ”سمجھ گئی، تم نے پریم لال یا نندا کی کسی شکتی کو آزمایا ہوگا۔“ انکا نے مسرت کا اظہار  
 کیا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم نے سمجھداری سے کام لینا شروع کر دیا..... آئندہ بھی دورانہدشی  
 سے کام لینا۔“

”تمہیں میرا ایک ضروری کام کرنا ہوگا.....“ میں نے سنجیدگی سے کہا، پھر اُسے کجرا  
 پجارن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ انکا تیزی سے ریگتی ہوئی میرے سر سے اتر گئی۔  
 میں نے اُسٹھ کر ٹھلنا شروع کر دیا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا، انکا جلدی واپس آ گئی۔  
 اس بار اُس کے چہرے پر اُلجھن کے گہرے تاثرات مسلط تھے، اس طرح ہونٹ چبارہی  
 تھی جیسے کسی معصے کا حل تلاش کر رہی ہو۔

”کیا ہوا.....؟“ میں نے تیزی سے دریافت کیا۔ ”کیا اُن درندوں نے اُس معصوم،  
 بھولی بھالی پجارن کو روند ڈالا، مار دیا اُسے؟“

”یہ بات نہیں ہے.....“ انکا نے خلاؤں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے جواب  
 دیا۔ ”کوئی شکتی تمہیں گھبرنے کے لئے لمبے داؤچ کر رہی ہے، اشوک کے بعد پنڈت کالی  
 داس، دونوں مجھے ایک ہی سلسلے کی کڑی نظر آ رہے ہیں۔ کوئی پردے کی آڑ میں بیٹھا کٹھ پتلی  
 کے کھیل تماشے دکھا رہا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”میں پجارن کجرا کو پوری طرح کھگال کر آ رہی ہوں..... کیا تم یقین کرو گے کہ وہ

ممکن ہے پنڈت کالی داس کے علاوہ کوئی اور بھی میری نقل و حرکت پر نظر رکھنے پر مامور ہو۔  
 جب نول کشور کو علم ہوگا کہ میں اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا اور کالی داس کا کریا کرم ہو گیا  
 تو اُن کے ذہنوں پر بجلی ٹوٹ پڑے گی، عقل دنگ رہ جائے گی، وہ خود کو اور منظم کرنے کی  
 تدابیر اختیار کریں گے، زیادہ محتاط ہو کر مجھے پھانسنے کے لئے نئے جال بنیں گے۔ دوسرا  
 وار بہت سوچ سمجھ کر کریں گے لیکن..... کجرا کا کیا بنے گا؟..... میرے ذہن میں یہ خیال  
 تیزی سے اُبھرا۔ وہ غلطی سے میری ذات پر ایک احسان کر گئی تھی مگر پنڈت کالی داس کی  
 بھیانک موت کی خبر سن کر اسے ضرور کریدا جائے گا، وہ وضاحتیں کرے گی تو نگاہوں میں آ  
 جائے گی، دشمن بھانپ لیں گے کہ اسی کی غلطی سے ایک قیمتی مہرہ ہٹ گیا، پھر.....

”پجارن کجرا کا انجام کیا ہوگا؟ کیا وہ اُسے اپنے عتاب کا نشانہ بنانے کی خاطر روند  
 ڈالیں گے؟ کوئی بھیانک سزا دیں گے؟ معاف کر دیں گے یا کالی کے چرنوں پر بھینٹ  
 چڑھا دیں گے؟“

میں ابھی کجرا کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ انکا سر پر آ گئی، وہ بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔  
 پہلے اُس نے مجھے بیہوش کر دینے پر معذرت پیش کی، پھر چپک کر بولی۔ ”تمہارے لئے  
 میرے پاس کئی اہم خبریں ہیں۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، انکا نے کہنا شروع کیا۔

”نول کشور نے جو آدمی چندرا کے پاس روانہ کئے تھے وہ واپس آ گئے، چندرا نے  
 منزل کے اندر بیٹھے بیٹھے ایک اُننگی اٹھا کر کچھ اشارہ کیا تھا، خیال ہے کہ چندرا ایک ماہ تک  
 منزل سے باہر آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ جب تک وہ وندھیا چل سے واپس نہیں آتا  
 نول کشور بھی کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔“

”اور کچھ.....؟“

”میں ایک اور پنڈت کا بھی پتہ کر کے آئی ہوں، پنڈت اوم پرکاش، یہاں سے پانچ  
 کوس کی دُوری پر دُرگا دیوی کا ایک شاندار مندر ہے، اوم پرکاش وہاں کا بڑا پجاری ہے، نول  
 کشور کا خاص آدمی ہے۔ بازو سمجھ لو۔“

”کوئی اور اطلاع.....؟“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ہاں.....“ انکا چپک کر بولی۔ ”تمہارا ایک اور دشمن کام آ گیا۔ کالی داس نام تھا اُس

ہفتہ دس دنوں سے ایک لمحے کے لئے بھی دُرگادیوی کے مندر سے باہر نہیں نکلی۔ نول کشور کی طرح پنڈت اوم پرکاش نے بھی مندر کے چاروں طرف حصار کھینچ رکھا ہے، اُس کے حکم کے بغیر کوئی پجاری بھی باہر نہیں نکلتا.....“

”پھر وہ کجرا کون تھی جس نے مجھے پنڈت کالی داس کے بارے میں بتایا تھا؟“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ انکا بھی کسی سوچ میں مستغرق ہو گئی.....!!

میرے قدم لفٹ سے باہر آئے تو کئی نگاہیں میری جانب اٹھ گئیں۔ وہ میرے چلیے کو تاج میں ٹھہرنے والوں کی حیثیت سے پچائش کر رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر معنی خیز سنجیدگی مسلط تھی، آنکھیں عقاب کی مانند ہجوم میں گردش کر رہی تھیں۔ میں پرتھوی کو تیار رہنے کا حکم دے کر نیچے آیا تھا، بیرونی ہال میں مہکتے جسم منڈلا رہے تھے، تاج کی گہما گہمی اور وہاں کے رومانٹک ماحول کو دُور بیٹھ کر محسوس نہیں کیا جاسکتا، وہاں کے ٹھاٹھ باٹھ وہی بہتر جانتا ہے جو وہاں کبھی مقیم رہ چکا ہو۔ چھوٹے موٹے افراد دُور ہی سے نظریں سینک کر دل کو تسلی دے لیتے ہیں۔

میں جلدی میں تھا، میرے ذہن میں ابھی تک کجرا پجارن کے معے کے کئی ممکنہ اشارے گڈمڈ ہو رہے تھے، انکا نے جو کہا تھا وہ غلط نہیں ہو سکتا تھا، وہ بھی گہری سنجیدگی سے دوچار تھی، میں لوگوں کے درمیان سے قدم بڑھاتا بیرونی دروازے کی سمت جا رہا تھا جب ایک لمبا تڑنگا شخص میرے سامنے آ گیا۔ اُس کے جسم پر بڑا قیمتی سوٹ موجود تھا۔ میں نے اُسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا، وہ ایس پی رومی شکر تھا۔ کلا کے قتل کے کیس میں کئی بار میرا اُس کا آمتنا سامنا ہو چکا تھا۔ پہلے اُس کے بال گہرے سیاہ تھے، اب ان میں کہیں کہیں سفیدی بھی جھلک رہی تھی۔

”مقاطا رہنا جمیل۔“ انکا نے تیزی سے کہا۔ ”یہ کبھی ایس پی رومی شکر ہوا کرتا تھا، آج کل ڈی آئی جی ہے، کالی داس کے سلسلے میں بہت سارے سادہ لباس والے آس پاس موجود ہیں، ایک ایک کو نظروں میں کھنگال رہے ہیں۔“

”جناب کا شہد نام دریافت کر سکتا ہوں؟“ رومی شکر نے مہذب لہجے میں دریافت کیا، نگاہوں کے تاثرات غمازی کر رہے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کو کریڈر رہا ہے، اُس کی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

گا۔ جلے جلوس نکالنے کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ پنڈت اوم پرکاش بھی جھلایا ہوا ہے۔  
ایسی صورت میں اگر تم نے.....“

”بوکھلایا ہوا آدمی بڑی آسانی سے شکار ہو جاتا ہے۔“ میں نے لا پرواہی سے جواب دیا۔  
”تم کیا کرنا چاہتے ہو.....؟“ انکا کسمسانے لگی۔

”کالی داس کی آتما تنہا ہوگی انکارانی۔“ میں زہر خند سے بولا۔ ”تنہائی انسان کو ڈسنے  
لگتی ہے، ایک سے دو ہوں تو وقت آسانی سے گزر جاتا ہے۔“

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اوم پرکاش نے بھی مندر کے چاروں طرف حصار کھینچ رکھا  
ہے۔“ انکا نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”یہ بات تم نے اُس وقت بھی بتائی تھی جب بدری نرائن نے کالی کے مندر میں پناہ  
لے رکھی تھی لیکن میں ساری رکاوٹیں توڑ کر وہاں گیا تھا۔“ میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

”تمہیں تو میرے ماضی کی سطر سطر یاد ہوگی۔“  
”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ انکا نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”میں تمہاری دشمن  
نہیں ہوں۔“

”دوست ہو تو پھر دوستی بھاؤ..... مجھے روکنے کی کوشش فضول ہوگی۔“ میرا جواب  
فیصلہ کن تھا۔

”کالی داس کے بعد پنڈت اوم پرکاش.....“ انکا نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”ہر  
طرف اُگم بھڑک اُٹھے گی، ابھی پنڈت نول کشور نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے، اُس کی  
زبان پر تمہارا نام آگیا تو پورے ہندوستان کی پولیس تمہارے پیچھے لگ جائے گی، طوفان  
اُٹھ کھڑے ہوں گے۔“

”خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو.....؟“ میری پیشانی پر بل پڑ گئے۔  
”ایسی جلی کٹی باتیں مت کرو جیل۔“ انکا بے چینی سے پہلو بدل کر بولی۔ ”تم میری  
قوتوں سے ناواقف نہیں ہو، میں ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتی ہوں۔ لیکن جہاں پر اسرار قوتوں  
کے ٹکراؤ کا معاملہ درپیش ہو وہاں مجھے کچھ پابندیوں کا بھی لحاظ کرنا پڑتا ہے۔“

”میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ تم کیا کر سکتی ہو، کیا نہیں میں یہ بھی جانتا  
ہوں۔ لیکن میرا فیصلہ اٹل ہے۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تم اگر خطرہ محسوس کر رہی ہو

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ میں نے زود کھے لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کو نہیں جانتا۔“  
”لیکن میں صرف.....“ اُس نے کچھ کہنا چاہا۔

”پلیز.....“ میں اُس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”میں بلاوجہ سر راہ عام لوگوں سے اس  
انداز میں بے تکلف ہونے کا عادی نہیں ہوں۔“

”نام بتانے میں کیا حرج ہے؟“ اُس نے دوبارہ اصرار کیا۔ انکا تیزی سے میرے سر  
سے اتر گئی۔ اسی لمحے ایک اور سادہ لباس والا تیزی سے قدم اٹھاتا قریب آیا۔ اُس نے  
مدھم لہجے میں روی شکر سے کچھ کہا۔ بات یقیناً اہم ہوگی۔ روی شکر اُس کے ساتھ چلا گیا،  
انکا میرے سر پر واپس آ گئی۔

”روی شکر تمہیں پہچان نہیں سکا۔ میں نے اُس کے ذہن کو بھڑکا دیا ہے۔“  
میں قدم بڑھاتا باہر آ گیا۔ میجر نے غلط نہیں کہا تھا، پرتھوی ایک لمبی جھلملاتی کار کے  
قریب کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے بڑی مستعدی سے آگے بڑھ کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔  
”کہاں چلنا ہے سر.....؟“ پرتھوی نے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے دریافت کیا۔

”یہاں سے مغرب کی جانب تقریباً نو دس میل کے فاصلے پر دُرگا دیوی کا ایک مندر  
ہے، میں وہیں جانا ہے۔“

پرتھوی نے اثبات میں سر کو جنبش دی، پھر بڑی پھرتی اور مہارت سے گاڑی کھلی سڑک  
پر لے آیا۔

”تم اس وقت دُرگا دیوی کے مندر کیوں جا رہے ہو.....؟“ انکا نے مجھے گہری نظروں  
سے دیکھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے.....؟“

”یہ مناسب نہیں ہوگا جیل۔“ انکا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”تم نہیں جانتے کہ کالی  
داس کس شہرت کا مالک تھا، عام آدمی کا معاملہ ہوتا تو ڈی آئی جی روی شکر کبھی سامنے نہ آتا،  
کسی ماتحت کی ڈیوٹی لگا دیتا۔ اس وقت کالی داس کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح  
پورے شہر میں پھیل چکی ہے۔ بڑے بڑے سینٹھ اور ساہوکار، پولیس اور حکومت کے اعلیٰ  
عہدیداروں کو فون کھڑکھڑا رہے ہیں، پنڈت پجاریوں نے پولیس ہیڈ آفس کے آس پاس  
جمع ہونا شروع کر دیا ہے، اُن میں اشتعال پھیل رہا ہے۔ بڑے پیمانے پر احتجاج کیا جائے

تو میں تمہیں کسی بات کے لئے.....“

”اس کے آگے کچھ نہ کہنا.....“ انکا نے احتجاج کیا، پھر سنجیدگی سے بولی۔ ”اگر تم نے دل میں پنڈت اوم پرکاش کے کریا کرم کی شان لی ہے تو پھر میں تمہارے ساتھ ہوں۔ لیکن میرے مشوروں کو ٹھکراتا مت۔“ اُس کے آخری جملے میں عاجزی تھی، انکسار تھا۔

میں نے حامی بھر لی۔ انکا کو قرار آ گیا، وہ پھر کسی سوچ میں گم ہونے لگی۔ میں نے ٹوک کر نرمی سے پوچھا۔

”میں پہلی بار تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں، وہ کون سی طاقت ہے جو تمہارے راستے میں دیوار بن رہی ہے؟“

”وہ کوئی غیر معمولی طاقت ہی ہو سکتی ہے جسے دیوی دیوتاؤں کی حمایت بھی ضرور حاصل ہوگی۔ ایسا نہ ہوتا تو اشوک کے فرشتے بھی نہ مجھے دیکھ سکتے نہ میری آواز سن سکتے۔“ انکا نے بے بسی سے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں اس پر اسرار قوت کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ جب بھی روشنی کی ایک کرن ابھرتی ہے، گھپ اندھیرے لپک کر اسے اپنی اوٹ میں چھپا لیتے ہیں، پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ یہ پنڈت اور پجاری میرے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، اگر خوفزدہ نہ ہوتے تو منزل میں بیٹھ کر میرے سپنے دیکھنے کی بجائے سینہ ٹھوک کر سامنے آتے۔ لیکن آج تک ایسا کوئی جہاں پرش جنم نہیں لے سکا۔“

”میرے بارے میں بھی کچھ کہہ ڈالو.....“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”تمہاری بات اور ہے جمیل۔“ وہ اُچھل کر میرے کندھے پر آ گئی، تو بہ شکن انگڑائی لے کر بولی۔ ”تمہاری محبت نے تو انکا کو بے دام غلام بنا لیا ہے۔ لیکن جب تم الجھ کر باتیں کرتے ہو تو ذرا اچھے نہیں لگتے۔“

ہمارے درمیان اسی پر اسرار قوت کی بات ہوتی رہی جس نے اشوک اور انکا کے درمیان سے تمام پردے سرکا دیئے تھے، جس نے پجارن کبرا کو میرے سامنے لا کھڑا کیا تھا جبکہ انکا کا کہنا تھا کہ کجرا نے ہفتہ دس دن سے دُرگا دیوی کے مندر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ یہ باتیں غور طلب تھیں۔ ہو سکتا تھا کہ کوئی بوٹی دے کر کبرا حاصل کرنے والا لمبا داؤ کھیل رہا ہو، مجھے اندھیرے میں رکھنے کی خاطر، خوش فہمی میں مبتلا کرنے کے لئے دو چار پنڈت پجاریوں کی قربانی پیش کر کے مغرور کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ آدم خور شیر کو شکار

کرنے کی خاطر بھی بکروں اور بھیڑوں کو رستی سے باندھ کر بطور چاراپیش کیا جاتا ہے، شکاری دُور چھپا بیٹھا رہتا ہے، موقع ملتے ہی گولی داغ دیتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی انسان کو بھی غلطیاں کرنے پر اُکساتی ہے، کوئی ایک ذرا سی بھول اُس کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔ شاید وہ میرے ساتھ بھی کوئی ایسا ہی سانپ اور سیڑھی والا کھیل، کھیل رہے ہوں۔ ممکن ہے ماضی کے تلخ تجربوں نے انہیں ہوشیار کر دیا ہو، بازی مات کرنے کے لئے انہوں نے نئی چالیں سوچ رکھی ہوں۔ وہ بدری نرائن اور امر لال کا بھیا تک اور عبرتناک انجام دیکھ چکے تھے۔ سابقہ تجربوں کی روشنی میں انہوں نے مجھے غلط فہمی کا شکار کرنے کی خاطر نئے جال بن لئے ہوں گے، اشوک اور کالی داس کی جینٹل پیش کر لینے کے بعد وہ مجھے اور ڈھیل بھی دے سکتے تھے، کسی ایسے موقع کا انتظار کر رہے ہوں کہ جب وہ اچانک جال کی دُور بھر پور انداز میں کھینچیں تو میں نکل نہ سکوں، اُن کے جال میں پھنس کر بے بس شکار کی طرح پھڑ پھڑاتا رہ جاؤں۔ اور بھی بہت کچھ ممکن ہو سکتا تھا.....!!

پرتھوی، اسٹیئرنگ پر بیٹھا بڑی مستعدی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ نہ میں نے اُسے مخاطب کیا نہ اُس نے از خود بات کرنے کی کوشش کی، تجربہ کار اور کھیل کودا بند انظر آتا تھا۔ معا میرے ذہن میں ایک نکتہ تیزی سے ابھرا..... پرتھوی ذات کا ہندو تھا، غلط راستے کے مسافر بھی مذہب اور دھرم کے معاملے میں سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ بیکے ہوئے شرایینوں کو بھی میں نے اکثر مندر اور مسجد کے سامنے سے گزرتے وقت ہاتھ جوڑ کر بندگی کرتے دیکھا ہے۔ دُرگا دیوی کے مندر کے بڑے پجاری پنڈت اوم پرکاش کی موت کا کھیل دیکھ کر پرتھوی بھی جذباتی ہو سکتا تھا۔

”پرتھوی.....“ میں نے کچھ سوچ کر اُسے ٹٹولنا شروع کیا۔ ”تاج کے منیجر اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ تم بڑے کارآمد اور قابل بھروسہ آدمی ہو.....“

”اپنی زبان سے ڈینگیں مارنا اور خود کو پھنے خان بتانا مردوں کی شان نہیں ہوتی سر۔“ پرتھوی نے سلجھتے ہوئے معصوم انداز میں کہا۔ ”جو عین وقت پر بازی پلٹ دے وہی مہرہ سب سے کارآمد ہوتا ہے، کون کتنے پانی میں ہے، اس کا اندازہ اُسی وقت ہوتا ہے جب گوت پھنس جائے۔“



خلاف زبان نہیں کھولے گا۔ بڑا نڈر، بے خوف اور خطرناک آدمی ہے۔ تمہاری طرح یہ بھی خوبصورت لڑکیوں اور حسین عورتوں کا شیدائی ہے، اپنی اصطلاح میں انہیں سویت ڈش کہتا ہے۔“

ڈرگا دیوی کے مندر کے گنبد کا کلس دُور سے نظر آنے لگا تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ انکا بھی سنجیدہ نظر آنے لگی۔ میں نے پرتھوی سے گاڑی سوگڑ دُور ہی روکنے کو کہا۔ اُس نے میرے حکم کی تعمیل میں ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں سے پورا مندر صاف دکھائی دے سکے۔ میں گاڑی سے اترنے لگا تو اچانک مجھے اپنی ایک غلطی کا احساس بڑی شدت سے ہوا۔ میں تاج سے جلدی میں روانہ ہوتے وقت سید مجذوب کی لائٹس اپنے کمرے میں ہی بھول آیا تھا۔ پرتھوی دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ میں گاڑی سے باہر آیا تو اُس نے دبی زبان میں پوچھا۔ ”سیوک کے لئے کیا حکم ہے.....؟“ اُس کا لہجہ بے حد ٹھوس اور معنی خیز تھا۔

”تم گاڑی میں بیٹھ کر آرام کرو۔“ میں نے بھاری بھر کم لہجہ میں جواب دیا۔ ”ضرورت ہوئی تو تمہیں پھر کبھی خدمت کا موقع دیں گے۔“

میں نے جواب کا انتظار کئے بغیر ڈرگا دیوی کے مندر کی طرف قدم بڑھانے شروع کر دیئے۔ انکا کسمسانے لگی، میں اُس کی مجبوری سمجھ رہا تھا، مجھے اُس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جو قارئین میری داستان المناک پڑھ چکے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میں نے کلکتے میں بھی کالی کے سب سے بڑے مندر میں گھس کر اپنے جنون کا اظہار کیا تھا۔ کئی چھوٹے موٹے پنڈت اور پجاری میری وحشتوں کا شکار ہو گئے تھے۔

میں مندر سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر رُک گیا۔ میں نے کچھ چیزیں پڑھ کر خود پر دم کیا، اپنے گرد حصار باندھا پھر دوبارہ قدم بڑھانے لگا۔ ڈرگا دیوی کا وہ مندر اس وقت باہر سے خالی نظر آ رہا تھا۔ اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے، کچھ گاڑیاں ادھر ادھر پارک تھیں، یہ سب وہاں پوجا پانٹھ یا پھر اپنی کوئی منت پوری ہو جانے کے بعد چڑھاوا چڑھانے کے لئے آنے والوں کی تھیں۔ مندر جوں جوں قریب آتا گیا، میرے اندر کلدھپ کے انتقام کا جذبہ آگ پکڑنا گیا۔ میں نے قریب پہنچ کر مندر کی سیڑھیوں پر پہلا قدم رکھا تو انکا نے کہا۔

”جھیل، تم میری مجبوری جانتے ہو، میں مندر میں نہیں جاسکتی۔“

”تم باہر انتظار کرو انکارانی۔“ میں نے دبنگ لہجہ میں کہا۔ ”میں جلدی واپس آنے کی

”تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں مسلمان ہو کر ڈرگا دیوی کے مندر کس لئے جا رہا ہوں؟“ میں اصل موضوع کی طرف آ گیا۔

”مجھے آپ کی سیوا کرنے کا حکم دیا گیا ہے سر۔ میں صرف اپنے کام سے کام رکھنے کا عادی ہوں۔“

”اور اگر کسی وقت مجھے تمہاری ضرورت پیش آ جائے تو.....؟“

”پرتھوی کو صرف اشارہ کر کے دُور کھڑے ہو جائیے گا، میں خود اپنا سر کاٹ کر آپ کے چرنوں میں رکھ دوں گا۔“ اُس نے بڑے اعتماد اور اطمینان سے جواب دیا۔ انکا خاموش بیٹھی پرتھوی کو لگا ہوں لگا ہوں میں تولتی رہی۔ شاید وہ میرا مقصد بھانپ چکا تھی۔

”ایک پنڈت سے مجھے کچھ پرانا حساب بیاق کرنا ہے۔“ میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں اُسے.....“

”میں سمجھ گیا سر، آپ کیا جانا چاہتے ہیں۔“ پرتھوی میری بات کاٹ کر بولا۔ ”ہم جیسے لوگوں کا کوئی دین دھرم نہیں ہوتا۔ جو سے پر کام آ جائے اُسی کو دیوتا سمجھتے ہیں، آپ مجھے پنڈت مہاراج کا نام بتا کر خود دُور رہیں، بڑی کر پا ہوگی سیوک پر..... آپ کے لین دین کا سارا معاملہ میں چکنا کر دوں گا، آئندہ کے لئے آپ کو دشواں بھی ہو جائے گا۔“

”پکڑے گئے تو.....؟“ میں نے کہا۔ ”تھرڈ ڈگری اور پولیس کے ڈرائنگ روم ٹریینٹ کے آگے بڑے بڑے حرم خان بھی چھین بول دیتے ہیں..... سارا کھایا پیا باہر آ جاتا ہے، زبان قینچی کی طرح فر فر چلنے لگتی ہے۔“

پرتھوی کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ ابھری، بے پرواہی سے بولا۔ ”میں جب بھی پولیس کے زرخے میں پھنسا، ہمیشہ خم ٹھونک کر مقابلے پر مجا رہا، کبھی اسٹن دیکھا کر تانہ دوں کی طرح بھاگنے کی کوشش نہیں کی، آپ مجھ پر دشواں کریں سر۔ سرکاری جہان خانے میں بھی دونوں وقت بڑی پابندی سے بھوجن پانی ملتا ہے۔ ڈپٹی صاحب کی کرپا سے سنتری جھک جھک کر پرنام کرتے ہیں۔ عمویت ڈش بھی ملتی رہتی ہے، آج تک کبھی کسی دشمن کے ساتھ دھوکا نہیں کیا، آپ تو مالک ہیں۔“

”یہ پرتھوی بڑے کام کا آدمی ہے جھیل۔“ انکا نے کہا۔ ”جتنا دُور نظر آ رہا ہے اس سے دو گنا نیچے بھی ہے، تم اس پر آنکھ بند کر کے اعتماد کر سکتے ہو، یہ مر جائے گا لیکن تمہارے

کوشش کروں گا۔“

”جو قدم بھی اٹھانا محتاط ہو کر اٹھانا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انکار یک کر سر سے اتر گئی۔ میں نے سیرمیاں چڑھنی شروع کر دیں۔ مندر میں آنے جانے والے پجاری اور پجاریں مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ وہ میرے حلیئے اور چال ڈھال سے میری ذات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے کسی کو اہمیت نہیں دی، سیرمیاں عبور کر کے مندر میں داخل ہو گیا جہاں ایک وسیع و عریض چبوترہ نظر آ رہا تھا۔ میرے بائیں جانب دُرگا دیوی کا وہ بڑا دروازہ تھا جس میں داخل ہو کر لوگ دیوی کے درشن کرتے تھے۔ داہنی جانب خوبصورت لان تھا جہاں کئی پجاری بیٹھے رام نام جب رہے تھے۔ لان اور مندر کی اندرونی عمارت کے درمیان سے ایک روش بل کھاتی ہوئی پچھلی سمت جاتی نظر آ رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس طرف رہائشی کمرے اور مہمان خانے موجود ہو سکتے تھے۔ مندر خاصا بڑا تھا، وہاں کسی اجنبی کا کسی کو تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر روش کی طرف قدم اٹھانے شروع کئے تو لان میں بیٹھے اکثر پجاری میری طرف متوجہ ہو گئے۔ شاید اُس حصے کی طرف جانے کی عام اجازت نہیں تھی۔ میں اُن کی نگاہیں پڑھ رہا تھا لیکن قدم اٹھا کر پیچھے لوٹنا دانشمندی کے منافی تھا، اُن کا شک یقین میں بدل جاتا، میری پریشانیاں بڑھ جاتیں۔ پنڈت اوم پرکاش تک پہنچنے سے پہلے ہی میں دنگا فساد شروع کر دیتا تو وہاں موجود پجاری بھوکے بھیڑیوں کے طرح مجھ سے لپٹ جاتے، بھنبھوڑ ڈالنے کی خاطر کسی کوتاہی کا مظاہرہ نہ کرتے، میں اُن سے اُلجھ جاتا تو پنڈت اوم پرکاش کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ بھی لاحق تھا۔ میں ایسا کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔

میں نے اپنی رفتار قدرے مدہم کر دی، میرے ذہن میں مختلف خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ انکانے کہا تھا کہ اوم پرکاش نے مندر کے چاروں طرف حصار باندھ رکھا ہے، میں نے بھی خود کو محفوظ کر لیا تھا۔ دو مختلف قوتیں جب ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں تو دھماکا ضرور ہوتا ہے۔ دوسروں کو اس کی آواز سنائی نہیں دیتی لیکن متعلقہ افراد ضرور آگاہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن مجھے کوئی جھک نہیں لگانا ہی کوئی ایسا احساس ہوا کہ میں کسی نا دیدہ زکاوٹ سے ٹکرا کر گزرا ہوں۔ چبوترہ ختم ہو رہا تھا، روش قریب آ رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھ رہا تھا کہ

اچانک دو بڑے کئے پجاری میرے دائیں بائیں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ وہ اتنے دبے قدموں سے آئے تھے کہ مجھے اُن کی آہٹ بھی سنائی نہیں دی۔ دونوں کے سر گھٹے ہوئے تھے جن پر لمبی لمبی چٹیاں لہرا رہی تھیں..... وہ مجھے مٹھلوک نظروں سے گھور رہے تھے۔ اُن کا مجھے یوں نفرت بھری نظروں سے ٹکر ٹکر گھورتا خالی از علت نہیں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کالی داس کی موت کی خبر نے انہیں محتاط رہنے پر مجبور کر دیا ہو، میں اُن کی بھیڑ میں اجنبی تھا۔ وہ مجھے صرف کھگانے کی خاطر آنکھیں لال پیلی کر رہے ہوں، میں نے اپنے قدم روک لئے۔

”منہ اٹھائے کدھر بڑھتے جا رہے ہو مہاشے؟“ ایک نے مجھے تلخ لہجے میں مخاطب کیا۔ اُس کی پیشانی پر داہنی جانب کسی گہرے زخم کا نشان موجود تھا۔ اپنے ساتھی کے مقابلے میں وہ زیادہ ٹیڑھی کھیر دکھائی دے رہا تھا۔

”مایا کی تلاش میں آیا ہوں پجاری مہاراج۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”مایا کی تلاش؟“ اُس نے مجھے یوں گھورا جیسے دیوانہ سمجھ رہا ہو۔ اکڑ کر بولا۔ ”کیا بکتا ہے مورکھ؟ یہ دُرگا دیوی کا مندر ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے سادگی سے کام لیا۔ ”مایا نے مجھے یہی کہا تھا کہ وہ دُرگا دیوی کے مندر میں ملے گی۔“

”تمہارا نام.....؟“ دوسرے نے اکڑ کر سوال کیا۔

”تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو.....“ میں نے اُس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں دھن دولت کی نہیں، اپنی استری کرن مایا کو کھوجنے آیا ہوں، ایک بالک کی آشنا نے اُس کے جیون کی ساری خوشیاں چھین لی ہیں۔ بہت علاج کرائے، بڑے جتن کئے پر تو اُس کی منو کا منا پوری نہیں ہوئی، کسی دیا لو پجاری نے اُسے پنڈت اوم پرکاش مہاراج کے چرنوں میں ڈنڈوت کر کے اپنی پتا سانے کو کہا تھا۔ وہ یہیں کہیں ہوگی۔ تم مجھے مہاراج کا پتہ بتاؤ، ہو سکتا ہے وہ مجھے جانتے ہوں۔“

”مندر میں کبھی پہلے نہیں آئے؟“ اوم پرکاش کا نام سن کر اُن کے لہجے میں تبدیلی آ گئی۔ ”تم نے صحیح پچانا پجاری مہاراج۔“ میں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”دوسرے دھندوں سے کبھی اتنی فرصت نہیں ملی کہ دیوی درشن کو آتا۔ اب آگیا ہوں تو آئندہ بھی آتا رہوں گا۔“

”مہاراج سے ملنا ہو تو اترتے چندرما کے آخری منگل وار کو آنا۔“ زخم کے نشان والے

ساتھی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”جاشمو، تو مہاراج کو کئی تک چھوڑ آ، میں باہر کا دھیان رکھتا ہوں۔“

میں نے اُس پجاری کا ہاتھ بے تکلفی سے تمام لیا جسے شمو کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ ہم دونوں روش سے گزر کر پچھلے حصے کی طرف آ گئے۔ راستے میں کئی پجاری اور پجاریں ملیں، وہ سب شمو سے رام رام کرتے رہے، میں آرام سے قدم اٹھاتا رہا۔ مندر کے عقب میں بھی ایک لان تھا جس کے بیچ و بیچ سنگ مرمر کا خوبصورت فوارہ بنا ہوا تھا۔ فوارے کے احاطے کی منڈ پر کئی پجاریں ہیجان انگیز لباس پہنے بیٹھی نازک نازک ہاتھ بڑھا کر فوارے سے پھواری شکل میں نکلنے پانی سے انکھیلیاں کر رہی تھیں، تھقبے لگا رہی تھیں، ایک دوسرے سے چہرے چھاڑ میں مصروف تھیں۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے اُن حسیناؤں کے جھرمٹ میں پچان کجرا کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے نظر نہیں آئی۔ میں نے شمو کو کجرا کے سلسلے میں ٹٹولنے کا ارادہ کیا، پھر کچھ سوچ کر اس پر عمل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

مندر کے عقبی حصے کے لان کو عبور کرنے کے بعد ایک دورا ہا نظر آیا۔ شمو بڑھکیں جانب گھومنے کے بعد رُک گیا۔ سامنے ایک محراب نما دروازہ بنا تھا جس کے بعد وہ سیڑھیاں صاف نظر آ رہی تھیں جو غالباً زمین دوز حصے کی طرف جاتی تھیں۔ میں کسی حیرت سے دوچار نہیں ہوا، بڑے مندروں میں راستوں کی بھول بھلیوں کا جال کچھ اسی طرح بنا جاتا ہے کہ عام آدمی اس میں بھٹک کر گم ہو جائے۔ مجھے اس کا تجربہ دو تین بار پہلے بھی ہو چکا تھا۔

”ان سیڑھیوں سے اتر کر اُلٹے ہاتھ کو گھوم جانا۔“ شمو نے میری رہنمائی کی۔ ”دونوں طرف پجاریوں کے کمرے بنے ہوں گے، تم راستے کے ساتھ ساتھ آگے چلے جانا، جہاں راستہ بند ہوگا وہاں چند اوم پرکاش مہاراج کا خاص سیوک تمہیں نظر آ جائے گا، وہ تمہیں مہاراج تک پہنچ دے گا۔ پرنتو ایک بات کا دھیان رکھنا، مہاراج کے خاص سیوک سے زیادہ باتیں کرنے یا اُلجھنے کی حماقت بھول کر بھی نہ کرنا، وہ اندر جانے کی آگیا (اجازت) نہ دے تو اُلٹے قدموں واپس آ جانا۔“

”میں تمہارا بیکار کبھی نہ بھولوں گا۔“ میں نے شمو سے ہاتھ ملاتے وقت ایک بار پھر اُس کے ذہن میں یہ بات بٹھادی کہ وہ میرا ذکر کسی اور سے نہیں کرے گا۔ وہ اثبات میں گردن کو جنبش دے اُلٹے قدموں واپس چلا گیا۔

نے خشک انداز میں کہا۔ ”مہاراج اُسی دن ملتے ہیں۔“

”مجھے نراش مت کرو۔“ میں نے ایک اور بہانہ تراشا۔ ”میں بمبئی کا باسی نہیں ہوں، کلکتہ سے آیا ہوں، کرن مایا کو لے کر واپس نہ گیا تو میری بنی بنائی عزت خاک میں مل جائے گی۔“

لان میں بیٹھے ہوئے پجاریوں کی نظریں بھی مجھ پر جمی تھیں۔ جن بٹے کئے پجاریوں نے میرا راستہ روکا تھا وہ کسی قیمت پر مجھے آگے بڑھنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھے، بات اُلجھتی جا رہی تھی۔ میں نے کرن مایا کا نام لے کر انہیں اپنی فرضی مظلومیت کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اُن کے دو چار ساتھی اور آ جاتے تو بات خراب ہو جاتی۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کرنے کی ٹھان کر ایک لمحے کو آنکھیں بند کر لیں۔ اپنی تمام تر قوتیں ایک مرکز پر جمادیں، وہ ایک نقطہ وہ ایک مقصد جہاں تک ارتکاز کے ذریعہ پہنچنے کا درس مجھے نندا اور کمپالا نے دیا تھا، اُسی ایک لمحے میں مجھے اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا، میری نگاہوں میں وہ برقی رو، وہ پراسرار قوتیں جمع ہو گئیں جو دوسرے پر عمل تو نیم کر سکتی تھیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر دونوں کو باری باری تیز نظروں سے دیکھا، اُن کے کس بل نکلنے لگے۔ میرے ارتکاز کا کمال تھا کہ وہ پل بھر میں میری نظروں کے سحر کا شکار ہو گئے۔ میں نے لان پر بیٹھے ہوئے پجاریوں کی توجہ ہٹانے کی خاطر مسکرا کر زخمی پیشانی والے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ٹھوس مگر مدہم آواز میں کہا۔

”تمہارے من میں میرے لئے کوئی کھوٹ نہیں ہے، تم دونوں میرے پرانے مٹر ہو۔ مجھے پہلے سے جانتے ہو۔“

”ہاں مہاراج.....“ جواب میں اُس نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔ ”ہم تمہیں بہت عرصے سے جانتے ہیں۔ اس بار تم نے بہت دنوں بعد چکر لگایا، کہاں رہے اتنے دنوں.....؟“ اُس کی آواز میرے عمل کے مطابق اتنی اُدنی تھی کہ لان پر بیٹھے ہوئے پجاریوں تک پہنچ گئی۔ وہ اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔

”تم مجھے چند اوم پرکاش تک پہنچاؤ گے۔ لیکن اس کا ذکر کسی اور سے نہیں کرو گے۔“ میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

”تم کہتے ہو تو نہیں کریں گے۔“ اُس نے بڑی فرمانبرداری سے جواب دیا، پھر اپنے

”نہیں.....“ وہ تلملا کر بولی۔ ”کس کجرا کی بات کر رہے ہو.....؟“  
 ”پجارن کجرا کی.....“ میں نے دروغ گوئی سے کام لیا۔ ”اُس نے مجھ سے یہیں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ اُس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہاں کجرا نام کی کوئی پجارن نہیں رہتی..... چھوڑو میرا ہاتھ۔“

”تمہارا کیا نام ہے.....؟“ میں نے اپنی قوتوں کو سمیٹ کر اُس کے وجود کے اندر جھانکا، وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی تھی۔ اُس کی شکل ہو بہو پجارن کجرا سے ملتی تھی۔ دونوں کو ساتھ کھڑا کیا جاتا تو شاید میری تجربہ کار نظریں بھی کوئی فرق نہ تلاش کر سکتیں، مگر وہ کجرا نہیں تھی۔

”تمہیں میرے نام سے کیا کام؟“ وہ اچانک شیرنی کی طرح بپھر کر بولی۔ ”چھوڑ دو میری کلائی۔ نہیں تو شور مچاؤں گی۔“

”شما کر دینا سندری.....“ اُس کی شور مچانے والی دھمکی کا رگڑ ثابت ہوئی، میں اس وقت پنڈت اوم پرکاش سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا تھا لہذا معذرت طلب لہجے میں بولا۔ ”مجھ سے تمہیں پچھاننے میں بھول ہو گئی۔“ میں نے اُس کی کلائی چھوڑ دی۔

”دشٹ.....“ اُس نے کلائی مسلتے ہوئے اپنے غصے کا اظہار کیا، پھر تیزی سے پلٹ کر بھاگ گئی۔

میرے پاس وقت کم تھا، میں نے پجارن کجرا کے معاملے کو زیادہ طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں پہلی فرصت میں پنڈت اوم پرکاش کو ٹھکانے لگا دینے کا خواہشمند تھا، کالی داس کے بعد اوم پرکاش کی موت کی خبر سن کر پنڈت نول کشور کو اندازہ ہو جاتا کہ اُس نے جمیل احمد خان کے خلاف محاذ بنا کر اپنی موت ہی کو دعوت دی ہے۔ ایک ہی دن میں دو بڑے پنڈتوں کی چتاؤں کو آگ لگائی جاتی تو اس کا دھواں بھی زیادہ دُور تک پھیل جاتا، جو پجاری نول کشور کے جھنڈے تلے صف آراء ہو رہے تھے اُن میں کھلبلی مچ جاتی۔ محبت اور جنگ میں کسی حربے کا استعمال ناجائز نہیں سمجھا جاتا، دھرم کرم کے نام پر لوگ جذباتی ہو جاتے ہیں، لیکن وہ جنگ کی صورت حال سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ انہیں اس کا علم نہیں ہوتا کہ موت کو سر پر منڈلاتا دیکھ کر بڑے بڑے سوراؤں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں، ایک بم

آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے قدم بڑھا کر نیچے اترنے والی سیڑھیوں کو طے کرنا شروع کیا۔ راستے میں کوئی نہیں ملا، سیڑھیوں کے اختتام پر بھی دورا سے نظر آئے، شہبوز نے رہنمائی نہ کی ہوتی تو شاید میں بھٹک جاتا۔ میں اُس کے کہنے کے مطابق بائیں ہاتھ والے راستے پر آگے بڑھنے لگا۔ دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ کسی کمرے سے بھجن کی آواز اُبھر رہی تھیں، کہیں سے نسوانی قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں تیز تیز قدم بڑھا رہا تھا کہ اچانک ایک دروازہ کھلا، ایک پجارن اتنی تیزی سے فلاںچیں بھرتی باہر نکلی کہ سنہلے سنہلے بھی مجھ سے ٹکرائی۔ میں نے اُس کا چہرہ دیکھا تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ کجرا کے سوا اور کوئی نہیں تھی.....!

”شما کرنا مہاراج.....“ اُس نے بڑی اجنبیت سے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ”میں تمہیں دیکھ نہیں سکتی تھی۔“

وہ کترا کر جانے کے لئے گھومی، میں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کی کلائی تھام لی۔ وہ پلٹ کر مجھے سوالیہ نظروں سے گھورنے لگی۔ میں اسے اداکاری نہیں کہہ سکتا۔ کجرا کی نگاہوں میں اُبھرنے والے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ اُسے میری جسارت گراں گزری تھی۔ مجھ سے پہلے ملی ہوتی تو اتنی کامیاب اداکاری کبھی نہ کر سکتی۔ اُس کی عمر میں ابھی وہ چنگلی نہیں آئی تھی جو دوسروں کو غلط فہمی کا شکار کر دیتی ہے، عورتوں کے سلسلے میں میرا تجربہ بھی کم نہیں تھا۔ ان تمام باتوں کے علاوہ انکا نے بھی بڑے یقین سے کہا تھا کہ پجارن کجرا ہفتہ دس دن سے ایک بل کے لئے بھی مندر سے باہر نہیں نکلی۔ حقیقت کیا تھی؟ میں یہ جاننے کے لئے مضطرب ہو گیا۔

”تم نے داسی کا ہاتھ تھام کر اچھا نہیں کیا۔“ اُس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مہاراج کو خبر ہو گئی تو دونوں دیوی کے چرنوں پر بھینٹ چڑھا دیے جائیں گے۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔ اسی میں تمہاری مکتی ہے۔“ اُس نے ہاتھ جھٹک کر چھڑانا چاہا، میری گرفت اور سخت ہو گئی۔ خوف کے احساس سے اُس کا حسن اور نکھر گیا..... سینہ دھونکی کی طرح حرکت کرنے لگا۔ وہ کسی ایسی ہرنی کی طرح غصے میں پیچ و تاب کھا رہی تھی جس کا پاؤں کلیں بھرتے ہوئے کسی آہنی ٹکٹے میں آگیا ہو۔

”تم کجرا ہو.....؟“ میں نے دبی آواز میں پوچھا۔



پھٹتا ہے۔ ان گنت افراد بڑی گیند کی طرح فضا میں اُچھلتے ہیں، ان کے جسم کے اعضاء دُور دُور تک بکھر جاتے ہیں، کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ جو جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جنگ میں جاتے ہیں، وہ اپنے اپنے مورچوں میں آہنی چٹان کی طرح قدم جمائے رہتے ہیں، جو بزدل اور کمزور دل کے مالک ہوتے ہیں وہ ہتھیار چھوڑ کر بھاگ لیتے ہیں، اس طرح لڑنے والوں کی نفی کم ہوتی رہتی ہے، دشمن پر خوف و ہراس کے بادل منڈلانے لگتے ہیں۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ میرے دشمنوں کی صف میں انتشار پیدا ہو، مورچہ چھوڑنے والوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی پنڈت نول کشور کی پیشانی پر اتنی ہی زیادہ غور و فکر کی شکلیں ابھریں گی، وہ جتنا غور کرے گا اتنا ہی اُلجھتا جائے گا، اُلجھن اور فکر انسان کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیتی ہے، وہ اندر سے کھوکھلا ہونے لگتا ہے، بدری زائن کے سلسلے میں نرم پالیسی اختیار کر کے میں نے جو تلخ تجربے حاصل کئے تھے اب ان کی تلافی ضروری تھی۔ پنڈت نول کشور کے ذہن پر تاہر توڑ کئی ضربیں لگتیں تو اُس کا ڈمگ جانا یقینی تھا۔ ایک بار منصوبے ناکام ہو جائیں تو نئی راہیں تلاش کرنے میں تھوڑا وقت لگتا ہے، شطرنج کے عالمی ماہرین اور چیمپئن بھی ایک مہرہ پٹ جانے کے بعد کسمسانے لگتے ہیں، دوسری چال چلنے سے پیشتر نئے سرے سے بازی کا نقشہ جمانا پڑتا ہے۔

اشوک کو سامنے لاکر میرے دشمنوں نے اعلان جنگ کر دیا تھا، وہ کسی پیادے کی طرح بلاوجہ پٹ گیا۔ اب میری باری تھی، میں انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ کجرا پجارن کون تھی؟ میں نہیں جانتا تھا لیکن اُس نے سامنے آکر میرے لئے ایک آسان محاذ کھول دیا تھا، وہ نہ آتی تو مجھے اپنے بغل میں چھپے ہوئے کالی داس کا شبہ بھی نہ ہوتا۔ میں نے کالی داس کو موت کے گھاٹ اتار کر انہیں باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ میں اُن کی گھٹیا چالوں سے بے خبر نہیں ہوں، میرے جسم پر وہ نہیں، کئی آنکھیں ہیں جو چاروں طرف دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، اس کا دوسرا ثبوت پنڈت اوم پرکاش کی موت ہوتی۔ انہیں اندازہ ہو جاتا کہ میں مچان پر بیٹھ کر شکار کھیلنے کا عادی نہیں ہوں۔ شیر کی کچھار میں گھس کر بھی گولی چلانے سے دریغ نہیں کرتا۔ مجھے یقین تھا کہ اوم پرکاش کی موت کی اطلاع اُن کے ذہنوں پر بجلی بن کر ٹوٹے گی، ایک لمحے کو اُن کے ذہن معطل ہو جائیں گے۔ دھرم کرم کا پرچار کرنے والوں کی جدائی انہیں کمزور کر دے گی، اُن کے کریاکم کی خبر جنگ کی آگ کی طرح

پھیلے گی، بہتوں کو سانپ سونگھ جائیں گے۔ وہ میرے مقابلے پر آنے کی جرأت نہیں کریں گے، اپنی اپنی پناہ گاہوں میں دبکے بیٹھے رہیں گے۔ میں ان پر یکے بعد دیگرے چرے لگاتا رہوں گا.....!

میرے ذہن میں گرم آندھی کے تیز جھکڑ چل رہے تھے، میں نے رفتار تیز کر دی۔ شہو نے میری غلط رہنمائی نہیں کی تھی، راستہ آگے جا کر ختم ہو گیا تھا، سامنے ایک لکڑی کا مرصع دروازہ نظر آ رہا تھا جس پر دیوی اور دیوتاؤں کی اشکال بھی بڑی مہارت اور چابکدستی سے اُبھاری گئی تھیں۔ دروازے پر ایک دیو قامت پجاری کھڑا مجھے کینہ تو ز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس جیسے تن و توش کا پجاری میری نظروں سے پہلے کبھی نہیں گزرا۔ مجھے شہو کی بات یاد آئی، اُس نے مجھے بھیخت کی تھی کہ اگر پجاری مجھے اندر جانے کی اجازت نہ دے تو میں اُلٹے قدموں واپس لوٹ آؤں۔ میں لوٹ جانے کے لئے وہاں نہیں پہنچا تھا، میرا ارادہ اٹل تھا، اس میں ترمیم کی کوئی گنجائش یا چلک نہیں تھی۔ البتہ مجھے اپنی ایک غلطی کا احساس ضرور ہو رہا تھا، میں نے راہداری میں ملنے والی پجارن کو چھوڑ کر کسی دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ وہ مجھے ”دشٹ“ کے خطاب سے نواز کر کچھتی بل کھاتی چلی گئی، بڑے غصے میں تھی۔ ممکن ہے اُس نے اوپر جا کر اپنی کسی سہیلی سے بھی ذکر کیا ہو، بات سے بات نکل کر پھیل چکی ہو، ہو سکتا ہے کسی پجارن نے مندر کے بڑے کرتا دھرتا تک پہنچا دی ہو، وہ حرکت میں آچکے ہوں یا آنے والے ہوں..... دیو قامت پجاری مجھے پلکیں جھپکائے بغیر گھور رہا تھا میں نے بل بھر میں ارتکاز اور مراقبہ کی ایک مشق کی، پھر ٹھوس لہجے میں بولا۔

”مجھے پنڈت اوم پرکاش جی سے ملاقات کرنی ہے۔“

”تمہارا نام.....؟“ اس نے کھر درے لہجے میں سوال کیا۔

”دولت رام.....“ میں نے دولت علی کی مناسبت سے دولت رام کہہ دیا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“ پجاری نے اپنا شبہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”ادھر کے نہیں

معلوم ہوتے، میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“

”میرے پاس سے کم ہے۔“ میں نے اپنی اہمیت کا اندازہ دلانے کی خاطر اُس کے

سوال کو نظر انداز کر دیا۔ ”مجھے مہاراج سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ اُس نے میری بات سے مرعوب ہوئے بغیر



سر دلچے میں کہا۔

”مہاراج سے جا کر میرا نام بتا دو، انہوں نے درشن دینے سے انکار کیا تو میں واپس لوٹ جاؤں گا۔“ میں نے کچھ سوچ کر محتاط انداز میں جواب دیا۔

”مہاراج نے انکار کر دیا تو ضروری بات کا کیا بنے گا.....؟“ اُس کے لہجے میں شکوک و شبہات کلبلانے لگے، آنکھوں میں نظر آنے والی سرخی کا رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا۔ میں نے ضبط سے کام لیا۔

”کرنا کیا ہے، جس نے سندیس بھیجا اُسے جا کر بتاؤں گا کہ مہاراج تک پہنچ نہیں ہو سکی۔“

”تمہیں نیچے تک کون لایا تھا.....؟“ اُس نے توقف سے دریافت کیا۔

”شبھو.....“ میں نے جواب دینے میں غلٹ سے کام لیا۔

”اُس نے میرے بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتایا؟“ پجاری کے لہجے میں تکبر اتر آیا۔

”کیوں اتنا کہا تھا کہ اگر تم مہاراج تک جانے کی آگیا نہ دو تو میں پگ موڑ کر واپس چلا جاؤں۔“

”تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے؟“ اس بار پجاری نے نفرت بھرے انداز میں کہا۔ ”کیا میں

تمہیں مہاراج تک جانے دوں گا؟“

”تمہارے من کا حال میں کیسے جان سکتا ہوں؟“ میں نے بے پروائی سے شانے

اچکا ئے۔

”لیکن میں تمہارے من کا بھید جان چکا ہوں۔“ وہ زہر خند سے بولا۔ ”تم کون ہو؟

.....کہاں سے آئے ہو؟ مہاراج تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اتنے بیا کل کیوں نظر آ

رہے ہو.....؟“

”یہ جھوٹ کہہ رہا ہے، تمہیں بے نقاب کرنے کے کارن بے پر کی چھوڑ رہا ہے، اس کی

باتوں میں مت آ جانا۔“ ایک نسوانی آواز میرے ذہن میں گونگی۔ میں نے وہ آواز پہلے

نہیں سنی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی میری رہنمائی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر کیوں؟ وہ مجھے

کیسے جانتی تھی؟ ایک پجاری کے مقابلے میں میری حمایت کا کیا مقصد تھا؟

میرے ذہن میں وسوسے جاگ رہے تھے جب وہی آواز دوبارہ اُبھری۔ اس بار میں

نے پہچان لیا، وہ میری کلدیپ کی آواز تھی..... میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

”سے گزر گیا تو پچھتاؤں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”کلدیپ، میری زندگی، میری جان، تم.....“

”باتوں میں سے بربادمت کرو جیل، میری آتما پر جو پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں، میں

انہیں نہیں توڑ سکتی۔ تم مہاراج پر یتیم لال کو کیوں بھول رہے ہو؟ اُن کا شبہ نام کیوں نہیں

لیتے.....؟“ کلدیپ کی آواز میں تڑپ تھی، اُس کی رُوح کے کرب کا اندازہ کر کے میں بھی

تڑپ اُٹھا۔ اُس غریب نے میری خاطر پوری جوانی سنان اور ویران پہاڑیوں میں بتا

دی، اُس کی موت بڑی دردناک تھی، اب مرنے کے بعد اُس کی بے چین رُوح بھی مجھے

راستہ دکھا رہی تھی۔

”کلدیپ.....“ میں دل ہی دل میں چیخ اُٹھا۔ ”تمہارے بنا زندگی بھی موت سے کم

اُڑیٹا تک نہیں ہے، میرا گلا گھونٹ دو، مار ڈالو مجھے، اپنے ساتھ لے چلو، اب زندگی کی کوئی

تمنا نہیں رہی۔“

ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے سے ٹکرا کر گزرا تو میں ہوش میں آ گیا۔ میں اس

علامت کو بھانپ گیا کلدیپ کی رُوح مجھے ایک اشارہ دے کر رخصت ہو گئی تھی، ہٹا کٹا

پجاری مجھے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا، میری خاموشی نے اُس کے شبے کو اور ہوا دے دی۔

”کہاں گم ہو گئے بھولے رام.....“ اُس نے حقارت سے کہا۔ ”تم یہاں زندہ سلامت

آ تو گئے ہو، واپس کیسے جاؤ گے؟“

میں نے کلدیپ کی آتما کے اشارے پر پر یتیم لال کے تصور کو ذہن میں اُجاگر کر کے کہا۔

”مہاراج، اس سے مجھے تمہاری سہائتا کی ضرورت ہے، تمہاری مہبان محنتی اپرم پار ہے،

اس بٹے کئے پجاری کو میرے راستے سے ہٹا دو۔“

”مورکھ، یہ دُرگا دیوی کا پوتر استھان ہے۔“ پجاری نے مجھے کرخت لہجے میں لکارا۔

”یہاں کیول دیوی کا راج ہے، تیرے من میں کھوٹ نہ ہوتا تو اس طرح ہونٹ بند کئے نہ

کھڑا رہتا۔ میں مہاراج کا سیوک ہوں، میں تجھے بتاؤں گا کہ کتنے بیسی کے ساتھ ہوتے

ہیں۔ تیرا انت بھیا نک ہوگا، میں سمجھ گیا پاپی، تو اندر سے وہ نہیں جو اوپر سے نظر آ رہا ہے۔

ٹھہر جا، میں ابھی تجھے مزہ چکھاتا ہوں۔“

پجاری کے ہاتھ فضا میں بلند ہوئے، میں نے بھی تیور بدل کر اُسے گھورا۔ جینتر ابدل کر حملہ کرنے کی ٹھان لی، لیکن دوسرے ہی لمحے میرا دل خوشی سے اُچھل پڑا، پرتم لال کی آتما نے میری آواز سن لی تھی۔ پجاری کے تیور یکفخت بدل گئے، اُس نے ہاتھ نیچے گرا لئے، بڑی عاجزی سے بولا۔

”مجھے شاکر دینا مہاراج، میری آنکھیں تمہیں پہچاننے میں دھوکا کھا گئیں، مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔“

وہ ہاتھ باندھ کر راستے سے ہٹ گیا۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ایک دروازہ قد پجاری مرگ چھالے پر بیٹھا صندل کی لکڑی کی مالا جپ رہا تھا، مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھیاں ہٹم گئیں، اُس کے چہرے پر سکون ہی سکون نظر آ رہا تھا، مجھے دیکھ کر اُس نے مالا ایک طرف رکھ دی، مرگ چھالے سے اُٹھ کر قالین پر آ گیا۔ اُس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔

”بیٹھ جاؤ۔۔۔“ اُس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”کہو، کیسے آتا ہوا۔۔۔؟ کس نے بھیجا ہے۔۔۔؟“

میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“

”میرے بڑے بھائی مہاراج کہ تمہارے درشن ہو گئے۔“ میں نے دل ہی دل میں مسکرا کر کہا۔ ”میں نراش ہو کر واپس چلا جاتا تو ایک کاٹنا من میں کھٹکتا رہتا۔“

”بیا کل نظر آتے ہو۔۔۔۔۔؟“

”پہلے تھا، اب نہیں ہوں، تم جوں گئے۔“ میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ اوم پرکاش نے مجھے اس بار بڑی توجہ سے دیکھا، پھر کسمسا کر بولا۔

”تم نے ابھی تک اپنا پرچے (تعارف) نہیں کرایا۔“

مجھے حیرت تھی کہ رام پرکاش میری اصلیت نہیں جان سکا، اگر جان چکا تھا تو اس قدر مطمئن کیوں دکھائی دے رہا تھا؟ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم تو دُرگا دیوی کے مندر کے بڑے رکھوالے ہو، میرا خیال تھا کہ تم مجھے پہلی ہی نظر میں پہچان لو گے، مجھے اپنا تعارف نہیں کرانا پڑے گا۔ لیکن اگر تم میری زبان سے میرا نام جاننا چاہتے ہو تو سنو، میرا نام جمیل احمد خان ہے۔ یہ بھی جان لو، کہ کالی داس کے بعد اب دوسرا نمبر تمہارا ہے۔“ میں نے اُسے حقارت سے گھورا۔ ”کوئی آخری خواہش ہو تو کہہ ڈالو، دوبارہ موقع نہیں ملے گا۔“

پنڈت اوم پرکاش میرا نام سن کر آنکھیں پینپانے لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں

اتنی آسانی سے دعدنا ہوا اُس کے کمرہ خاص تک پہنچ جاؤں گا۔ ایک لمحے تک وہ خاموش رہا، پھر حیرت انگیز پھرتی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں شعلے چمکنے لگے، بڑے سرد لہجے میں بولا۔ ”پاپی، دیوی دیوتاؤں اور پنڈت کے پجاریوں سے زیادہ چھیڑ چھاڑ اچھی نہیں ہوتی۔ میں جانتا ہوں کہ کس کی شکتی نے تجھے اتنا نڈر اور بے خوف بنا دیا ہے، اسی مہان شکتی کے کارن تو ابھی تک اس دھرتی پر سانس لے رہا ہے۔ میرا کہا مان، دُم دبا کر اُلٹے قدموں واپس لوٹ جا، اسی میں تیری مکتی ہے۔“

”مجھے تمہاری یہ باتیں سن کر کوئی تعجب نہیں ہو رہا۔“ میں نے زہر خند سے کہا۔ ”اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔“

”تو۔۔۔۔۔ تو پنڈت اوم پرکاش کا ایمان کر رہا ہے۔“ وہ غصے سے لرزنے لگا۔ اُس کے تیور خطرناک ہو گئے، کسی زہریلے سانپ کی طرح بل کھا کر بولا۔ ”میری خاموشی کو میری کمزوری نہ سمجھ مورکھ، میں اس پوتر استھان کو تیرے گندے خون سے پلید نہیں کرنا چاہتا۔ یہ بھی جان لے کہ میں دُرگا دیوی کی شرن میں ہوں، تو دُرگا کی شکتی سے زیادہ مہان نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ چلا جا، میں کہتا ہوں میری نظروں سے دُور ہو جا۔۔۔۔۔“ وہ چیخنے چلانے لگا، منہ سے جھاگ اُڑانے لگا۔ ”میرا ہاتھ اُٹھ گیا تو بھاگنے کا راستہ نہیں ملے گا۔“

”امر لال نے بھی ایسے ہی دعوے کئے تھے، نتیجہ کیا نکلا؟ میری کلدیپ نے اُس کے کلوے کلوے کر کے مندر کی سیڑھیوں پر بکھیر دیا۔ بدری نرائن کو میں نے لتھاڑ لتھاڑ کر خارش زدہ کتوں کی موت مارا، تمہارا انجام بھی بھیا تک ہو گا۔“

میں نے اچانک فضا میں اُچھل کر بھرپور ٹھوکر اُس کے ننگے پیٹ پر ماری۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے سنبھل گیا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، اُس نے ہاتھ اٹھا کر زور سے جھٹکا۔۔۔۔۔ بھڑکتے ہوئے شعلے میری طرف لپکنے لگے۔ میں نے پھرتی سے فرش پر لیٹ کر پیروں کی قینچی بنائی، اوم پرکاش نے چٹا چاہا لیکن اُسے کامیابی نہیں ہوئی، میں نے اُس کے قدموں کے درمیان قینچی پھنسا کر قلابازی کھائی تو وہ بھی منہ کے بل زمین پر گرا۔ میں نے مرگ چھالا کے قریب رکھی ہوئی پیتل کی وزنی لٹیا اٹھا کر اُس کے سر پر دے ماری، وہ بلبلانے لگا۔ میں نے سنبھل کر دوسری ضرب زیادہ شدت سے لگائی، اُس کے سر سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ میں نے لٹیا ایک طرف پھینک کر اُسے دبوچنے کی کوشش کی لیکن وہ تپ کر

میری گرفت سے نکل گیا۔ بڑا سخت جان وقع ہوا تھا، دست بدست جنگ میں ایک لمحے کی مہلت بھی ایک حریف کو دوسرے پر حاوی کر دیتی ہے۔ اوم پرکاش میری گرفت سے آزاد ہوا تو اُسے جوابی کارروائی کا موقع مل گیا۔ اُس نے کوئی جنتر پڑھ کر پھونک ماری، میرے سارے جسم میں سونیاں جھینکنے لگیں۔ میں نے سنبھلنا چاہا، اُس نے موقع نہیں دیا، دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے انگلیاں جھینکنے لگا۔ میرے جسم پر دھکتے ہوئے انگاروں کی بارش شروع ہو گئی، میں کرب سے چیخ اٹھا۔ اوم پرکاش کا بھیا نک تہقہ میری قوت سماعت سے ٹکرایا۔

”بڑے پر نکل آئے تھے تیرے، بڑا گھمنڈی ہو گیا تھا.....“ اُس نے عمارت سے کہا۔

”اُونچے سروں میں بول رہا تھا۔ دو ہی جھکوں میں چیں بول گیا پانی، نکل گئی ساری اکڑوں۔“

میرے اوپر آگ برس رہی تھی، جسم پر آبلے نمودار ہونے لگے، میں نے ہمت نہیں ہاری۔ زندگی کی آرزو ہوتی تو شاید میں کمزور پڑ جاتا، لیکن میں سر ہیلی پر رکھ کر آیا تھا، میں نے ڈوبتے ہوئے ذہن پر قابو پا کر ننذا کے بتائے ہوئے ایک عمل کو آزمایا، اوم پرکاش کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، اُس کے جنتر منتر کے بیر میرے اوپر آگ برسا رہے تھے لیکن اب وہ انگارے میرے جسم کو نہیں چھو رہے تھے، میرے بدن کے قریب آکر ادھر ادھر بکھر جاتے تھے۔

”آٹھویں پھاڑے کیا دیکھ رہا ہے حرام کے تخم.....“ میں نے اوم پرکاش کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی خاطر لکار کر کہا۔ ”تیرے پاس ڈرگا کی تختی ہے، اسے بھی اپنی مدد کے لئے بلا لے۔ جو منتر باقی رہ گئے ہوں وہ بھی آزمالے، سارے کھیل تماشے کر لے، پھر میں تیری کھاٹ کھڑی کروں گا۔“

اوم پرکاش میری گالی برداشت نہ کر سکا، پاگل ہو گیا۔ پینترے بدل بدل کر اپنے جنتر منتر آزمانے لگا۔ میں نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی، اپنی جگہ اطمینان سے لیٹا رہا، اوم پرکاش نے شروع میں کہا تھا کہ وہ اُس تختی سے واقف ہے جو میری پشت پناہی کر رہی ہے، اُس کا اشارہ پریم لال کی طرف تھا، ننذا کی بخشی ہوئی قوتیں اُس کے علم میں نہیں تھیں۔ میں اپنے گرد حصار باندھ چکا تھا، اس حصار سے باہر نکلنے کی حماقت کرتا تو مارا جاتا۔ دوسری طرف اوم پرکاش دیوانگی کی کیفیت سے دو چار تھا، وہ یکے بعد دیگرے مجھے تہس نہس کر ڈالنے کی حسرت دل میں لئے اپنی جھولی کے جنتر منتر خرچ کر رہا تھا۔ کبھی میرے

چاروں طرف زمین سے زہریلے سانپ بلبلاتے ہوئے نکل آتے، مجھے ڈسنے کی خاطر بار بار پھن کاٹھ کر حملہ آور ہوتے مگر حصار سے ٹکرا کر واپس لوٹ جاتے، کبھی چھت سے اُبلتا ہوا پانی برسنے لگتا، درو دیوار ٹوٹ کر میرے اوپر گرتے نظر آتے۔ وہ بھانپ گیا تھا کہ میں نے منڈل کھینچ رکھا ہے۔ اس منڈل کو توڑنے کی خاطر وہ زور لگاتا رہا۔ پھر اُس نے کچھ سوچ کر ہاتھ روک لئے، گرج کر بولا۔

”مرا مزادے، منڈل میں چھپ کر جان بچا رہا ہے۔ مرد ہے تو باہر نکل کر مقابلہ کر۔ کب تک اپنا بچوں کی طرح پزار ہے گا؟“

”تو نے بھی مندر کے چاروں طرف حصار قائم کر رکھا تھا۔“ میں نے اُسے غصہ دلانے کی خاطر کہا۔ ”خود بخود کی طرح اندر چھپا بیٹھا رہا، میں نے تیرے منڈل کو توڑ دیا، تیرے سارے دیوی دیوتا مل کر بھی میرا راستہ نہیں روک سکے۔ میں سب کی نظروں میں ڈھول جھونک کر تجھ تک پہنچ گیا۔ اب تو بھی اپنی تختی آزمالے..... نطفہ تاحقیق۔“

اوم پرکاش نے تملنا کر پاؤں زمین پر مارے، زلزلہ آ گیا۔ چھٹ ٹوٹ کر میرے اوپر گرے لگی۔ زمین پھٹ گئی، ہر طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو دھوکا کھا جاتا، میں کلدیپ اور امر لال کے درمیان ہونے والی خوفناک جنگ دیکھ چکا تھا۔ امر لال کو کالی کی حمایت حاصل تھی لیکن وہ کلدیپ کے عزم کے سامنے زیادہ دیر قدم نہ جما سکا، مجھے وہ وقت یاد آیا جب بدری نرائن نے مجھے کلدیپ تک پہنچنے سے روکنے کے لئے میسور کی پہاڑیوں پر پنڈت پجاریوں کی ٹولی بٹھادی تھی، وشنو داس اُن کی کمان کر رہا تھا، وہ تعداد میں بے شمار تھے، میں تنہا تھا۔ اُن کے روکے بھی نہیں رکا، انکا میری رہنمائی کرتی رہی، میں اپنی قوتوں کے بل پر سب کا قلع قمع کرتا ہوا کلدیپ تک پہنچ گیا..... وہ بغلیں جھاکتے رہ گئے۔ اُن کی ترکش کا کوئی تیر کار گر ثابت نہ ہوا۔ اب اوم پرکاش اکیلے چنے کی طرح بھاڑ پھوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میری زبان سے پنڈت پجاریوں اور دیوی دیوتاؤں کے بارے میں نازیبا الفاظ سن کر اوم پرکاش پھر آپے سے باہر ہونے لگا۔ اُس نے اپنا انگوٹھا زخمی کر کے خون کے قطرے میری سمت اُچھالے، میری نظروں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔ میں نے ارتکاز کا عمل کیا تو تاریکی کے بادل چھٹنے لگے۔ میں نے مسکرا کر اوم پرکاش کو دیکھا تو وہ بے قابو ہو کر میری

طرف بڑھا، غصے اور جھلاہٹ کی انتہا انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ اوم پر کاش بھی غیض و غضب کے عالم میں یہ بھول گیا کہ میں نے حصار کھینچ رکھا ہے۔ اُس نے قریب آ کر مجھے ٹھوکر مارنے کی حماقت کی، وہی ایک لمحے مجھے درکار تھا۔ حصار سے ٹکرا کر وہ لڑکھاپا تو میں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ تو ازن برقرار نہ رکھ سکا، مرگ چھالے پر اُردن سے منہ گرا۔ میں نے جھپٹ کر اُسے دبوچ لیا۔ اُس کے گلے پر میری انگلیوں کا گھنچہ اتنی تیزی سے تنگ ہونا شروع ہوا کہ اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ کچھ دیر میرے بوجھ تلے دبا پھڑ پھڑاتا رہا، پھر اُس کا جسم اکڑنے لگا، اُس کی آتما اور شریر کا بندھن ٹوٹ رہا تھا جب مندر کی گھنٹیوں کی آواز کا شور میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ شاید اوپر والوں کو بھنگ مل گئی تھی کہ نیچے کیا ہو رہا ہے؟ وہ گھنٹیاں بجا کر خطرے کا اعلان کر رہے تھے۔ میں اوم پر کاش کے اکڑتے ہوئے جسم کو نفرت سے ٹھوکر مار کر اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر نکلنے کے ارادے سے دروازے کی سمت لپکا لیکن دروازہ ایک جھٹکے سے بند ہو گیا..... میں چوہے دان میں پھنس کر رہ گیا۔ وہ میرے لئے فرار کے تمام راستے مسدود کر رہے تھے۔ شاید وہ میری طاقت سے ناواقف تھے۔ میں نے نندا کے خون سے نہا کر جو قوتیں حاصل کی تھیں اُن کے سامنے لوہے کی دیوار بھی پتھ تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر ہاتھ رکھ کر دھکا دیا، وہ ایک ہی جھٹکے میں ٹوٹ کر دُور جا پڑا۔

”زک جاؤ جمیل احمد خاں.....“ ایک نسوانی آواز کی گھن گرج درو دیوار سے پھوٹی ہوئی میرے کانوں میں گونجی۔ ”آج تم نے دُرگا کی مہان شکتی کو للکارنے کی بھول کی ہے، آج دھرتی کی ساری قوتیں مل کر بھی تمہیں نہیں بچا سکیں گی، تمہارے اُچھل کود کرنے کا سے ساپت ہو گیا، آج کل دیپ کی بھگتی تمہارے کسی کام نہیں آئے گی، پریم لال کی آتما بھی تمہاری سہانیا کرنے کی بھول نہیں کرے گی، تمہارا انت بھیا تک ہو گا۔ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ.....“

میں نے اُس آواز کو کوئی اہمیت نہیں دی، اس قسم کی گیدڑ بھکیاں میرا راستہ نہیں روک سکتی تھیں، وقت کی نزاکت کو محسوس کر کے میں نے وہاں سے جلد از جلد نکل بھاگنے کی سوچی۔ مجھے اپنی طاقت پر اعتماد تھا، پنڈت پجاری میرا راستہ نہیں روک سکتے تھے، دس بارہ مارے جاتے، باقی جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ میں نے قدم بڑھانے کی کوشش کی

لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی، زمین نے جیسے میرے قدم جکڑ لئے تھے، کسی غیر مرئی طاقت نے مجھے پوری طرح اپنے شکنجوں میں دبوچ رکھا تھا..... میں نے ایک ایک کر کے ساری قوتوں کو آزمایا لیکن کسی میں کامیابی نہیں ہوئی۔ شاید اُس نسوانی آواز نے غلط نہیں کہا تھا، میرا وقت پورا ہو چکا تھا..... وقت پورا ہو جائے تو ساری مدافعتی قوتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں، بے بسی مقدر بن جاتی ہے، ایک آخری سانس باقی رہ جاتی ہے جس کے خارج ہونے کے بعد جسم اور رُوح کا تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے۔

اچانک مجھے اپنے اطراف اندھیرا پھیلتا محسوس ہوا۔ میں نے دیکھا، دھوئیں کے بادل چاروں طرف سے نمودار ہو کر میری جانب پلغار کر رہے تھے، میں ابھی زندہ تھا، سانس کا تسلسل قائم تھا، میں دیکھ سکتا تھا، سن سکتا تھا مگر اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکتا تھا۔ کثیف دھوئیں کا حجم میرے گرد بڑھتا جا رہا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا، سانس لینا دُشوار ہو گیا..... میں نے آنکھیں بند کر لیں، اپنی آنکھوں سے اپنی موت کا تماشا کون دیکھتا ہے.....؟

زندگی کے ایوان میں میرے وجود کے ستون ڈمگانے لگے۔ کھیل ختم ہونے کا وقت تیزی سے قریب آ رہا تھا جب مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا ہو..... مجھے ہنسی آ گئی، موت کا تصور شدت اختیار کر جائے تو اس قسم کے واہے سنبھالا دینے کی خاطر ڈوبتے ذہن کے گھپ اندھیروں میں بجھتے ہوئے دیے کی لوکی مانند ٹھٹھانے لگتے ہیں۔ میں بھی کسی حسین فریب کا شکار ہو رہا تھا، ایسا لگا جیسے میرے قدم زمین چھوڑ کر فضا میں بلند ہو رہے ہیں۔ شاید رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر رہی تھی، میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولنا چاہیں لیکن کامیاب نہ ہو سکا، میرے احساسات بڑی سرعت سے منجمد ہو رہے تھے۔ میں ہر احساس سے بے نیاز ہو کر کسی بحرِ خار میں ڈوبتا چلا گیا۔

وقت کی رفتار تھم گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں زندہ تھا یا مر گیا۔ مرنے کے بعد لمحوں کا شمار کون کرتا ہے؟ بیہوشی کی کیفیت میں بھی سود و زیاں کا خیال نہیں رکھا جاسکتا۔ مجھے مطلق یاد نہیں کہ میرے اوپر کیا گزری؟ بس اتنا یاد ہے کہ میرے ذہن پر جی برف آہستہ آہستہ پکھلی شروع ہو چکی تھی، مجھے کہیں دُور سے گھوڑوں کے ہنہانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، کوئی میرے سر پر نشتر چھا رہا تھا۔ میرے حواس آہستہ آہستہ بحال ہو رہے تھے۔ میں جہاں بھی تھا کھلے آسمان کے نیچے تھا۔ میں نے اپنی یادداشت کو کریدنا شروع کیا، گزری



تو میں اس وقت زندہ کس طرح ہوتا.....؟  
 ”میں پونا کے ریس کورس میں کیا کر رہا ہوں؟“ میں نے انکا سے صورت حال معلوم کرنے کی کوشش کی۔

”تم نے میرے منع کرنے کے باوجود ایک غلط گھوڑے پر داؤ لگا دیا تھا، نتیجہ تمہارے سامنے ہے، کپڑے تک اتر گئے۔“ انکا نے جملے کے انداز میں جواب دیا۔

”پر تھو کہاں ہے؟“ میں نے اُس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

”ابھی تک مندر کے باہر کھڑا تمہاری واپسی کی راہ دیکھ رہا ہوگا۔“ وہ تمللا کر بولی۔

”میرے لئے کیا حکم ہے.....؟“ مجھے انکا کے غصے پر جھلاہٹ نہیں ہوئی، پیار آنے

لگا۔ وہ میری مونس و غنوار تھی، میری ہمدرد تھی، میرے ساتھ تھی، نہ ہوتی تو میں کیا کر لیتا؟

”اب ہوش میں آگئے ہو تو کچھ دیر انتظار کرو، میں ابھی آتی ہوں۔“ اُس نے مجھے گھور

کر کہا، پھر رینگ کر سر سے اتر گئی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انکا نے غلط نہیں کہا تھا، میں نے قرب و جوار کا جائزہ لیا تو اندازہ

ہوا کہ میں پونا کے ریس کورس میں گھوڑوں کے اصطبل کے قریب موجود تھا۔ غالباً کچھ دیر قبل

بارش بھی ہوئی تھی جو زمین گیلی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے ماضی کے گزرے دن یاد آ گئے، کبھی

میں پونا کے اسی ریس کورس میں بڑی شان سے مدجبینوں کے ساتھ آیا کرتا تھا، انکا میرے

سر پر بیٹھی جیتنے والے گھوڑوں کی نشاندہی کرتی رہتی، میں نازنینوں کو ٹپ دیتا، وہ جیت

جاتیں، میرے اور اُن کے درمیان فاصلے گھٹنے لگتے۔ دولت میں بڑی قوت ہوتی ہے،

بڑے بڑے سینٹھ سا ہو کار میرے آگے پیچھے منڈلاتے رہتے، میں جدھر سے گزرتا ہجوم

میرے ساتھ ساتھ ہوتا، وہ اس بات کی ٹوہ میں لگے رہتے کہ میں کس گھوڑے پر بازی لگاتا

ہوں، وہ بھی اندھا دھند اسی نمبر پر دولت کی بارش کر دیتے۔ میں اُن کے درمیان فخر سے

سینہ تانے کسی خوب رو حسینہ کی کمر میں ہاتھ ڈالے گھومتا رہتا۔ دن بھر یہی مشغلہ رہتا۔ رات کو

وہ حسن کی دیوی میری بغل میں ہوتی، انکا میرے سر پر بیٹھی فرضی حسن و عشق کے تماشے

دیکھا کرتی، کبھی اُس کی فرمائش پر میں کسی لڑکی کا جسم زخمی کر کے اُس کے حوالے کر دیتا، وہ

خوش ہو جاتی۔ خون اُس کی غذا تھی، غذا سے پیٹ بھر لینے سے بعد وہ بھی تروتازہ نظر آنے

لگتی۔ میرے اور انکا کے درمیان راز و نیاز شروع ہو جاتے، وہ مجھ سے انکھیلیاں کرتی، میں

باتیں ذہن میں تازہ ہوئیں تو میں کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا، آنکھیں پھاڑ کر اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کوئی لقمہ ووق میدان تھا جہاں میں گیلی زمین پر پڑا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں اُنھنے لگا تو انکا کی آواز سنائی دی۔

”لیٹے رہو..... تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

میں نے سر پر نظر ڈالی، انکا کسی بیوہ کی طرح بڑی اجڑی اجڑی اور اداس نظر آرہی تھی۔

”میں کہاں ہوں؟“ میں نے مدھم لہجے میں سوال کیا۔

”پونا کے ریس کورس میں۔“ انکا نے رُوحے انداز میں جواب دیا۔ اُس کے لہجے میں

تلخی تھی۔

”تم شاید مذاق کر رہی ہو.....“ میں نے اُسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”میں بمبئی میں

دُرگا دیوی کے مندر میں چنڈت اوم پرکاش کا کریا کرم کرنے گیا تھا، پونا کس طرح آگیا؟“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ مندر کے چاروں طرف منڈل کھینچ دیا گیا ہے، تم نے میری

بات نہیں سنی۔“ انکا نے کسمسا کر مجھے شکایتی نظروں سے گھورا۔ ”تم نے پھر اپنی من مانی

شروع کر دی ہے۔“

”کیا بات ہے انکارانی؟“ میں نے اُسے وضاحت طلب نظروں سے گھورا۔ ”تمہارا

لہجہ کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا ہے۔“

”ایک نظر اپنے حلیے پر بھی ڈال لو، تمہیں میری جھلاہٹ کا اندازہ ہو جائے گا۔“

میں نے اندھیرے میں اپنے جسم پر نظر ڈالی، ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا، مجھے ہنسی آ گئی۔

میرے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی، میں کھلے آسمان کے نیچے مٹی میں لتھڑا مادر زاد رنگا

پڑا تھا۔ شاید اوم پرکاش کے پیروں نے میرے کپڑے جلادئیے تھے۔ مجھے ایک ایک بات

یاد آنے لگی۔ میں نے اپنے حریف کے مُردہ جسم کو ٹھوکر مار کر فرار ہونے کی کوشش کی تو لکڑی

کا مضبوط اور مرصع دروازہ ایک جھٹکے سے بند ہو گیا تھا۔ میں نے دروازے کو اپنی قوت سے

اُکھاڑ پھینکا لیکن کسی نے میرے قدم جکڑ لئے، کوشش بسیار کے باوجود میں خود کو اُس نادیدہ

نسوانی آواز کی قید سے آزاد نہ کرا سکا، دھوئیں کے بادلوں نے مجھے دم گھٹ کر مرنے پر مجبور

کیا۔ میں اذیت میں مبتلا تھا جب کسی نے میرا بازو تھام لیا، مجھے اپنے قدم زمین سے اُٹھتے

ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے ان باتوں کو دہم سمجھا تھا لیکن وہ حقیقت تھی۔ حقیقت نہ ہوتی



اُس کے ناز اٹھاتا، کبھی میں رُوٹھ جاتا وہ مناتی، کبھی وہ کسی دوسرے پنڈت پجاری کے قبضے میں چلی جاتی تو میرے برے دن آ جاتے.....!

ایک دن اسی ریس کورس کے باہر پنڈت تر بنی داس نے مجھے فقیر سمجھ کر بھیک دی تھی، اُن دنوں انکا اُس کے سر پر تھی۔ میں بھکاریوں کی زندگی بسر کر رہا تھا میری اور انکا کی رفاقت جنم جنم کی تھی، اُس کی وجہ سے میری زندگی میں نشیب و فراز آتے رہے۔ اب میں نے جو تو تیس حاصل کر لی تھیں اس کے بعد انکا کی برتری ختم ہو گئی تھی۔ لیکن پریتم لال اور کلدھپ نے کہا تھا کہ میں انکا سے خود کو علیحدہ نہ کروں، وہ ہمیشہ میرے لئے کارآمد ثابت ہوگی۔ آڑے وقتوں میں کام آئے گی۔ وہ میری محبوبہ تھی، اُس نے مجھے فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچایا تھا، اُس کی ذات سے میری حیات کی کئی تلخ و شیریں یادیں وابستہ تھیں۔ وہ میرے خون میں رچ بس گئی تھی۔ میں اُسے اپنے وجود سے علیحدہ نہیں کر سکتا تھا۔

میں انکا کے خیال سے اپنے ذہن کو بہلاتا رہا، ایک بار مجھے بے اختیار ہنسی بھی آ گئی۔ میں نے سوچا اگر اسی وقت رات کا گھپ اندھیرا نہ ہوتا، دن کا اُجالا ہوتا، پونا کے ریس کورس میں لوگوں کا ہجوم ہوتا، حسینوں کے تہقے گونج رہے ہوتے، اُن کے بدن کی خوشبو سے فضا لہک رہی ہوتی اور میں اچانک اُن کے روبرو اسی حالت میں نمودار ہو جاتا تو لوگوں کی کیا کیفیت ہوتی؟..... میرے ذہن میں مختلف خیالات اُبھر رہے تھے لیکن ایک سوال بار بار کلبلارہا تھا، وہ ہاتھ کس کا تھا جس نے مجھے موت کے چنگل سے نجات دلائی تھی؟ گھنٹیوں کی گونج کے درمیان اُبھرنے والی نسوانی آواز نے کہا تھا کہ میں موت سے نہیں بچ سکتا، اُس نے واشگاف الفاظ میں دعویٰ کیا تھا میں جس شکنجے میں جکڑا گیا تھا اس سے کلدھپ کی بھگتی بھی نجات نہیں دلا سکتی، پریتم لال کی مہمان شکنجے بھی میری کوئی مدد نہیں کرے گی۔ اُس آواز نے جو کچھ کہا، کچھ سوچ کر ہی کہا ہوگا۔ اُسے مکمل یقین ہوگا کہ پریتم لال یا کلدھپ کی آتما اُس کے مقابلے پر سامنے آنے کی غلطی نہیں کرے گی..... وہ نسوانی آواز کس کی تھی جو درود یوار سے اُبھر رہی تھی؟ جس کے اُبھرتے ہی میری تمام قوتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں؟.....

میں نادیدہ ہاتھ کے بارے میں سوچ رہا تھا جب انکا دوبارہ میرے سر پر آ گئی۔  
”جلدی کرو جمیل..... میں ایک بڑے سیٹھ کے ڈرائیور کو ساتھ لے آئی ہوں، وہ اصطبل کے عقبی حصے کی جانب گاڑی لئے کھڑا ہے، تم اُس کا لباس پہن کر گاڑی میں بیٹھ کر

نکل چلو، ہمیں پو پھٹنے سے پیشتر بمبئی پہنچنا ہے، ورنہ کھیل خراب ہو جائے گا۔“  
میں نے انکا کی ہدایت پر عمل کرنے میں دیر نہیں کی۔ وہ میری رہبری کرنے لگی۔ میں قدم مارتا اصطبل کے عقبی حصے کی سمت اُس مقام تک پہنچ گیا جہاں سیاہ رنگ کی ایک قیمتی کار کھڑی تھی۔ کار کا ڈرائیور اسٹیرنگ پر سر رکھے بیٹھا تھا۔ دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں جھجکا تو انکا نے کہا۔

”دُرومت..... میں نے اُسے بے ہوش کر دیا ہے۔ وہ تین گھنٹوں سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔“

میں نے عجلت سے کام لیا۔ ڈرائیور کا لباس اتار کر پہن لیا، اُسے اٹھا کر ایک طرف آڑ میں ڈال دیا کہ دُور سے نظر نہ آ سکے، پھر ایک طویل عرصے بعد میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹ کر گاڑی اشارت کی اور اُس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ فاصلہ تیزی سے طے ہونے لگا۔ انکا میرے سر پر بیٹھی کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ اُس کی آنکھیں رہ رہ کر اس انداز میں چپکنے لگتیں جیسے وہ کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں اُس کی اضطرابی کیفیت دیکھتا رہا۔ اُس کی بے چینی بلا وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ میں خاموش بیٹھا کار ڈرائیور کرتا رہا، انکا نے کسمسا شروع کیا تو میں نے پوچھا۔

”تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو، کیا بات ہے؟“

”آگے رُکاؤ میں کھڑی کی جا رہی ہیں، وہ تمہیں پھانسنے کی کوشش کریں گے؟“

”کس جرم کی پاداش میں؟“

”تاج ہوٹل میں پجاری کالی داس مارا گیا، دُرگا دیوی کے مندر میں پنڈت اوم پرکاش کی لاش ابھی تک نگاہوں کا مرکز بنی پڑی ہے۔ مندر میں داخل ہونے کے بعد تمہیں بہت سارے پجاریوں نے دیکھا ہوگا، تمہاری نظریں بھی دو چار پجاریوں کے گدرائے ہوئے جسوں کی طرف ضرور اٹھی ہوں گی۔ تاج میں ڈی آئی جی روی شنکر نے تمہارا نام جاننے کی کوشش کی تھی، اُس کا ماتحت بلانے نہ آتا تو وہ کریدنے سے کبھی باز نہ آتا۔“ انکا نے سپاٹ لہجے میں اپنی بات جاری رکھی۔ ”پرتھوی گاڑی لئے دُرگا مندر کے باہر تمہاری راہ تک رہا ہے۔ تم اس وقت بمبئی میں ہونے کی بجائے پونا سے واپس لوٹ رہے ہو، کیا یہ تمام باتیں پولیس کو تمہارے خلاف ہوا دینے کے لئے ناکافی ہیں؟“

مجھے انکا کا کھر درالہ پند نہیں آیا۔ ”تم جمیل احمد خاں سے مخاطب ہو انکارانی۔“ میں نے تیوری پر بل ڈال کر سرد آواز میں کہا۔ ”وقت نے مجھے ابھی اتنا بے بس نہیں کیا کہ میں خود کو کسی کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں، کچھ تو میں میری اپنی بھی ہیں۔“

”تو توں کا غلط استعمال ہی تمہارے لئے نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے۔“ وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ اُس کی نظریں اس وقت بھی دُور منڈلاتے کسی خطرے کو دیکھ رہی تھیں۔

”تم طنز کر رہی ہو.....؟“ میں نے اُسے تیز نظروں سے گھورا۔

”نہیں..... تمہارے گن گا رہی ہوں۔“ اُس نے عجیب لہجے میں کہا۔

میں برداشت نہ کر سکا۔ میں نے جھلا کر گاڑی روک دی۔ انکا کا جواب دیکھتے ہوئے سرخ تو بے پر پانی کا چھینٹا ثابت ہوا، میرا دماغ گھوم گیا۔

”میرے سر سے اُتر جاؤ۔“ میں نے جھلا کر کہا۔ ”میں تمہارے بغیر بھی حالات کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔“

”گاڑی چلاتے رہو.....“ انکا نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”تمہیں ہر حالت میں صبح ہونے سے پیشتر بمبئی پہنچنا ہے۔“

”میں تمہیں ہندوستان میں چھوڑ کر لندن گیا تھا۔“ میں پہلو بدل کر بولا۔ ”میں نے کہا تھا، تم سر پر رہو گی تو زندگی سکون سے نہیں گزرے گی، ہنگامے جنم لیتے رہیں گے، اپنے ذہن پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کرو، میں نے رام دیال کے فلیٹ پر بھی اُس وقت تمہارے حصول سے انکار کر دیا تھا جب پنڈت پجاری اور رام دیال کی ماں بھی مجھے مستقبل کے حسین خواب دکھا کر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی..... تمہاری یادداشت میں یہ بات بھی ضرور محفوظ ہو گی کہ پریم لال مہاراج کی سفارش پر میں نے تمہاری رفاقت قبول کی تھی۔ اُس کی آتما تمہیں اپنے ساتھ لندن نہ لائی ہوتی تو تم اس وقت اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کبھی نہ کر پاتیں.....“

”جمیل.....“ انکا نے جواب میں کچھ کہنا چاہا۔

”نہیں.....“ میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ”مجھے بول لینے دو۔ مواد اندر رہ جائے تو ناسور بن جاتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تم نہ ہوتیں تو جمیل احمد خاں کو وہ شہرت نہ نصیب ہوتی جو آج حاصل ہے۔ میں نے کیا کھویا کیا پایا، اس کی کہانی ایک چوتھائی صدی سے زیادہ

طویل عرصے پر محیط ہے۔ میں گڑے مردے نہیں اکھاڑوں گا، زندگی کا بھی کھاتہ کھول کر لمحوں لمحوں کا حساب بھی بے سود ہے۔ تم نے مجھ پر بڑے احسان کئے۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں، زندگی کے سفر میں قدم قدم پر نشیب و فراز آتے جاتے ہیں۔ سنگ میل احساس دلاتے رہتے ہیں کہ کتنی مسافت طے ہو گئی، کتنی باقی رہ گئی، کل کیا ہو گا، کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن آج کا یہ لمحہ، یہ ساعت ہمارے اختیار میں ہے، آج ہمیں آخری بار ایک فیصلہ کر لینا چاہئے، ہمیشہ کے لئے علیحدگی کا فیصلہ۔“ میں نے دل پر جبر کر کے آخری جملہ ادا کیا۔

”گاڑی چلاؤ جمیل۔“ انکا نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”وقت گزر رہا ہے۔ خطرات بڑھ رہے ہیں۔“

”خطرات بڑھتے ہیں تو بڑھنے دو۔“ میں جذبات کی رو میں بہنے لگا۔ ”چت یا پٹ کا کھیل تو سدا سے جاری ہے۔ پانسہ صحیح پڑ جائے تو پو بارہ ہو جاتا ہے، نصیب چمک اُٹھتا ہے، قسمت کی دیوی مہربان ہو جاتی ہے، پیادے کی ایک چال غلط ہو تو بازی مات ہو جاتی ہے۔ تم کو مجھ سے زیادہ میرے جنوں اور وحشتوں کا اندازہ ہو گا۔ زندگی کی تمنا کس بھڑوے کو ہے۔ تم میری فکر مت کرو۔ چھوڑ دو میرا ساتھ، کسی اور کے سر پر ٹھکانا کرلو، چندرا کے سر پر چلی جاؤ۔ وہ خوشی سے دیوانہ ہو جائے گا، پنڈت نول کشور کو درشن دو، وہ کپڑے پھاڑ کر پاگلوں کی طرح تاپنے لگے گا، دنیا میں تمہارے چاہنے والوں کی کمی نہیں ہے۔“

”تم اس وقت شاید ہوش میں نہیں ہو.....“ انکا سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں تو.....؟“ میں نے جھلا کر سوال کیا۔

”مجھے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا ہو گا۔“ اُس کے اندازِ مخاطب کا رنگ تبدیل ہونے لگا۔ درشت لہجے میں بولی۔ ”مجھے مجبور نہ کرو.....“

”تم نے کہا تھا کہ پریم لال کی آتما نے تمہیں پابند کیا تھا کہ تمہیں میرا حکم تسلیم کرنا ہو گا۔“ میں نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ ”میرے سر پر تمہارا قیام اب اسی فیصلے سے مشروط ہو گا، سناتم نے؟“

”مہاراج نے ایک حکم اور بھی دیا تھا۔“ وہ تملانا اُٹھی۔ ”مجھے ہر حال میں تمہاری حفاظت کا خیال رکھنا ہو گا۔ تم اس وقت خطرے میں ہو، میں ایسی حالت میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ

سکتی۔“

”لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم.....“

”معاطلے کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“ اُس نے میرا جملہ کاٹ دیا۔ شپٹا کر بولی۔

”جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں تمہیں نظر نہیں آرہا۔“

”ایسی کیا چیز نظر آگئی جو تمہاری لازوال قوتیں بھی سہی سہی نظر آرہی ہیں؟“ میں نے

اُس کی بات ہنسی میں اڑا دی۔ ”کلدیپ کی آتما نے تو کہا تھا کہ تم اپنی مہان ہمتی سے

پہاڑوں کو بھی دھول کی طرح اڑا سکتی ہو۔“

انکا نے کوئی جواب نہیں دیا، مجھے حیرت سے گھورنے لگی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اُسے میری

باتوں سے دُکھ پہنچ رہا ہے۔ میں نے بھی اُسے سر سے اتر جانے والی بات جھلا کر کہی تھی۔

اس میں مرضی کو کوئی دخل نہیں تھا، غصے کی شدت میں جو میرے منہ میں آیا کہتا چلا گیا۔ میں

یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ پراسرار قوتوں کے معاطلے میں ہم دونوں میں سے کس کا پلڑا

بھاری تھا لیکن ایک بات طے تھی، ہم دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر خوش نہیں رہ سکتے

تھے۔ میرا اُس کا ساتھ گوشت اور ناخن جیسا تھا، جدا ہوتے تو اذیت کا احساس ضرور ہوتا۔

”کسی فیصلے میں دُشواری پیش آرہی ہے انکارانی؟“ میں نے اپنے رویے میں ہلکی سی

لچک پیدا کی۔ ”گوٹ کہاں پھنس گئی؟“

”ایسی باتیں مت کرو جمیل، میرا دل پھٹ جائے گا۔“ اُس کے چہرے پر کرب کے

بادل منڈلانے لگے۔ زندگی میں پہلی بار وہ مجھے بڑی افسردہ نظر آرہی تھی۔

”ایک درخواست کروں.....؟“ میں نے اُسے چھیڑنے کی خاطر سنجیدگی برقرار رکھی۔

”جو باقی رہ گیا ہے۔“ وہ بھی کہہ ڈالو۔“ اُس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

”میرے سر پر رہنا چاہتی ہو تو بڑے شوق سے رہو مگر اپنا حکم مسلط کرنے کی بھول

دوبارہ کبھی نہ کرنا۔“ میں نے پہلو بدل کر کہا۔ ”میں اپنے فیصلے خود بھی کر سکتا ہوں۔ تم شہر

کے اندیشے سے دُبلا ہونا چھوڑ دو۔“

”اور کچھ.....؟“ اُس نے سر آہ بھری۔ بڑی مضطرب نظر آرہی تھی۔

”نہیں.....“ میں نے اُسے تنکھی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”جو کہنا تھا کہہ چکا،

اب کوئی گنجائش نہیں رہی۔“

انکا میرے آخری جملے کی تلخی بھی زہر کا گھونٹ سمجھ کر پی گئی۔ اُس کی غزالی آنکھوں میں

آنسوؤں کی نمی تیرنے لگی۔ اُس نے بڑی حسرت سے میری آنکھوں میں جھانکنا پھر تیزی

سے ریٹکتی سر سے اُتر گئی۔ میں اُسے روک بھی نہ سکا، مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے اُس

کے ساتھ اتنی بے زنجی سے نہیں پیش آنا چاہئے تھا، میرے ذہن میں کلدیپ کی آتما کے

کہے ہوئے جملے گونجنے لگے..... ”بدری نرائن اور امر لال سے جنگ لڑتے وقت اگر تم نے

انکا کا کہا مان لیا ہوتا تو شاید مجھے پریتم لال کا استھان نہ چھوڑنا پڑتا۔ تم منڈل سے باہر نہ

نکلے تو امر لال تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا..... انکا کے مقابلے میں تم نے زیادہ شکلیاں

پراپت کر لی ہیں، مجھے خوشی ہے۔ لیکن میری ایک بات گرہ سے باندھ لو، انکا کی باتوں کو

ہمیشہ دھیان سے سننا، سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا، وہ بڑی عظیم اور حیرت انگیز قوتوں کی مالک

ہے۔ اگر چاہے تو پہاڑوں کو بھی دھول کی طرح اڑا سکتی ہے..... سید مجذوب کی لاشی بھی

سنجھال کر رکھنا۔ ہو سکتا ہے کبھی وہی تمہارا آخری سہارا ثابت ہو.....“

انکا نے مجھے دُراگ دیوی کے مندر میں بھی جانے سے منع کیا تھا۔ میں نے اُس کا کہا نہیں

مانا، پنڈت اوم پرکاش میرے جنون کا شکار ہو گیا۔ اُسے مارنے کی آرزو پوری ہو گئی۔ پھر

کسی نادیدہ قوت نے میرے پاؤں زمین سے جکڑ دیئے، میری ساری قوتیں سلب ہو گئیں،

میں موت اور زندگی کے درمیان اپا بھجوں کی طرح اپنے حسرت ناک انجام پر غور کر رہا تھا

جب ایک ہاتھ نے میرا بازو تھام کر اٹھا لیا، میرا ذہن مُجمد ہو گیا۔ دوبارہ ہوش آیا تو میں پونا

کے ریس کورس کے میدان میں پڑا تھا۔

”اگر اس وقت انکا نے میری مدد نہ کی ہوتی؟ لباس اور کارفرماہم نہ کی ہوتی.....؟“ میں

نے سوچا۔ پھر خود اپنے آپ پر جھلا کر رہ گیا۔ اُس نے اگر میری غلطی پر اپنی ناراضگی کا

اظہار کیا تھا تو غلط نہیں کیا تھا، وہ حق بجانب تھی، میں ہی اپنے غصے پر قابو نہ پاسکا۔

انکا کی اضطرابی کیفیت بلاوجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ آگے میری راہ میں

رُکاؤں کھڑی کی جارہی تھیں، میرے دشمن مجھے پھانسنے کی گھات لگائے بیٹھے تھے، انکا نے

کہا تھا کہ پو پھننے سے پیشتر میرا سبھی واپس پہنچنا ضروری تھا۔ وہ بار بار گاڑی چلانے پر

اصرار کرتی رہی، میں اُس کے خلوص پر تیر و نشتر چلاتا رہا، وہ کب تک برداشت کرتی.....؟

میری وحشت، میرے جنون نے ایک بار پھر میرا راستہ کھوٹا کر دیا، سید مجذوب کی

متبرک لائھی میں پہلے ہی تاج ہوئل میں بھول آیا تھا، اب انکا بھی الجھ کر میرے سر سے اتر گئی..... پریم لال کی آتما نے لندن کے ہسپتال میں کہا تھا..... ”تیرے بھاگیہ میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ اوش پورا ہوگا..... خود کو چٹان بنا لے..... پھر کی اتنی ٹھوس موتی بن جا جس پر آندھی، برکھا اور سرد گرم کا بس نہیں چلتا، پرتو میری نظریں تیرے بھوش کو ٹنول چکی ہیں..... تو جل کے اوپر ہی اوپر تیرا رہے گا، جل کی تہہ میں غوطہ نہیں لگا سکے گا..... جو کام ادھورے رہ گئے ہیں وہ تجھے پورے کرنے ہوں گے..... اس کام کے لئے تجھے بڑے پاؤں بیلنے ہوں گے، بڑا کٹ اٹھانا پڑے گا.....“

وقت کسی برق رفتار پرندے کی مانند پر پھیلائے اڑا جا رہا تھا، میں نے بکھرے ہوئے ذہن کو سمیٹا، گاڑی کو دوبارہ گیر میں ڈالا، ہیڈ لائٹس آن کیں تو گھپ اندھیرا چھٹ گیا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، سڑک ویران تھی۔ ہر سمت سنائے کا راج تھا۔ میرے پیر کا دباؤ ایکسیلیٹر پر بڑھتا گیا، گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی.....!!



جیسے جیسے فاصلہ گھٹتا جا رہا تھا، میرے اندر اعتماد کی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ انکا میرے سر پر نہیں تھی، میں اُس کے بغیر بھی زندگی گزار چکا تھا۔ وہ ہوتی تو کچھ آسانیاں ضرور مل جاتیں، مجھے اپنی غلطی کا احساس تھا لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ذہن میں بھرے بارود میں کوئی چنگاری اپنا کام کر جاتی ہے، دھماکے ہونے لگتے ہیں، انسان سوچنے سمجھنے کے باوجود بہکنے لگتا ہے، شعور اور لاشعور کی کشمکش میں اپنی بڑائی کا احساس ہمیشہ غالب آتا ہے، کسی حادثے سے بچنے کی خاطر کوئی جان بوجھ کر ایکسیلیٹر پر دباؤ نہیں دالتا..... اس کے ذہن میں یہی خیال کلبلاتا ہے کہ بریک دبا کر گاڑی روک دی جائے، لیکن اعصاب پر اگر کوئی الجھن، کوئی پریشانی مسلط ہو تو وہ لاشعوری طور پر بریک پر پاؤں رکھنے کی بجائے ایکسیلیٹر ہی دباتا چلا جاتا ہے، انکا کے ایک جملے نے بھی میرے ذہن میں بھرے بارود پر چنگاری کا کام کیا۔ میں اُس وقت ذہنی طور پر پریشان تھا، وہ مجھے میری کوتاہیوں کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ میں ہتھے سے اکھڑ گیا، زبان کو بریک نہیں لگا سکا، جومنہ میں آیا کہتا چلا گیا۔ وہ کسی خطرے کی بوسوگھ رہی تھی، بار بار مجھے گاڑی چلانے کی ہدایت کر رہی تھی۔ میں نے اُس کا کہا ماننے سے انکار کر دیا، وہ میرے سر سے اتر گئی، میں تنہا رہ گیا۔

میرے ذہن میں اس وقت بھی دُرگادیوی کے مندر سے پوتا کے ریس کلب تک کے واقعات گڈمڈ ہو رہے تھے، کئی سوال، جواب طلب تھے، وہ کس کی قوت تھی جس نے فرار ہوتے وقت میرے پیر زمین سے جکڑ لئے تھے؟ وہ کس کی آواز تھی جس نے مجھے باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ کلدیپ کی بھگتی اور پریم لال کی مہان شکتی بھی میرے کام نہ آ سکے گی؟ وہ ناویدہ ہاتھ کس کا تھا جس نے مجھے موت کے چنگل سے نجات دلانی تھی.....؟ میں بڑی بنجیدگی سے حالات پر غور کر رہا تھا جب اچانک مجھے یوں لگا جیسے میں گاڑی میں تنہا نہیں، کوئی اور بھی میرے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ میرا دہم بھی ہو سکتا تھا، ممکن ہے انکا

واپس آگئی ہو، کسی کونے میں منہ پھلائے زوٹھی بیٹھی ہو۔ اس بات کی منتظر ہو کہ میں اُسے مخاطب کروں، مناؤں، اپنی غلطی کا اعتراف کروں۔ میں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ مجھے اپنے ذہن کو سمیٹ کر اُن خطروں کے لئے بھی تیاری کرنی تھی جن کی نشاندہی انکا نے کی تھی۔ آگے زکاؤٹیں کھڑی کی جا رہی تھیں، میرے دشمن مجھے پھانسنے کے لئے جال ڈالے بیٹھے میرے منتظر ہوں گے! میں چاہتا تو گاڑی واپس موڑ کر بمبئی جانے کی بجائے پونا کے راستے کسی اور طرف نکل جاتا، وہ گھات لگائے بیٹھے رہ جاتے۔ صبح ہوتی تو میری تلاش شروع ہوتی، اس وقت تک میں اُن کی دسترس سے بہت دُور نکل چکا ہوتا۔ جب دوبارہ آمنا سامنا ہوتا تب دیکھا جاتا۔ پہلے بھی کئی بار میرے اور اُن کے درمیان آنکھ مچولی ہو چکی تھی، لیکن میں نے بھاگنا مناسب نہیں سمجھا، بھاگنا ہی ہوتا تو لندن سے واپس کیوں آتا.....؟

انکا نے صبح سے پہلے میرا بمبئی واپس پہنچنا ضروری سمجھا تھا، اُس کے پشت پر یقیناً کوئی مصلحت ہوگی، میری بھلائی ہوگی۔ میں نے گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی، ذہن کو سمیٹ کر ارتکاز کے عمل میں ڈوبنے کی کوشش کی تو یکھنت کسی کے سانس لینے کی آواز میری قوتِ سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے وہ آواز بہت واضح طور پر سنی تھی۔ میرا وہم نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے رفتار کم کی، گردن گھما کر پچھلی نشست اور درمیانی غلاء کا جائزہ لیا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال بڑی سرعت سے اُبھرا..... ”دُرگا کے مندر میں جو نسوانی آواز درو دیوار سے اُبھری تھی وہ دُرگا دیوی کی آواز ہی رہی ہوگی، تبھی اُس نے بڑے اعتماد سے کلدھپ اور پریم لال کی مہانِ شکتی کے بارے میں کہا تھا کہ وہ میرے کسی کام نہیں آ سکیں گی۔ ممکن ہے اس وقت بھی دُرگا کی شکتی سانس کی آواز بنا کر مجھے ارتکاز اور مراقبے کے عمل سے روکنا چاہتی ہو.....“

میں سنبھل کر بیٹھ گیا، خود کو یکسو کر کے میں نے تمام تر توجہ ایک نقطے پر جمع کی، وہ ایک نقطہ جس کے سوا کچھ اور نظر نہ آئے، اسی ایک آسودہ مرکز تک پہنچنا ارتکاز کا کمال ہے، میری کوششیں باور آور ہونے لگیں جب میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا..... کوئی نادیدہ قوت میرے آڑے آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ارتکاز اور مراقبے کی مشقوں سے اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ ایک مانوس آواز میرے کانوں میں گونجی۔ میں خوشی سے اُچھل پڑا، وہ میری کلدھپ کی آواز تھی۔

اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”تم نے انکا کی بات نہ مان کر اچھا نہیں کیا جمیل، اُس نے غلط نہیں کہا تھا۔ جو وہ دیکھ رہی تھی تم نہیں دیکھ سکتے تھے.....“

”کلدھپ.....“ میں نے بے چینی کا اظہار کیا۔ ”تمہارے بنا دل نہیں لگتا۔ کوئی ایسا راستہ بتاؤ جو درمیان کے اندھیروں کو دُور کر سکے۔“

”میرے پاس سے کم ہے.....“ اُس نے اُداس لہجے میں جواب دیا۔ ”سے سے پہلے اور بھاگیہ سے زیادہ کسی منش کو نہ کچھ ملا ہے، نہ ملے گا۔“

”پھر..... میں کیا کروں.....؟“ میرا اضطراب بڑھنے لگا۔

”دھیرج سے کام لو، خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔“ اس بار اُس نے ٹھوس لہجہ اختیار کیا۔ ”منزل تک پہنچنے کے کارن تمہیں کئی موڑ کاٹنے ہوں گے۔ جو لکھا جا چکا ہے، وہ اٹل ہے، باقی سب دھوکا ہے۔“

”کجرا پچارن کون ہے.....؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ مجھے یکھنت کلپنا یاد آگئی جو کلدھپ کا دوسرا روپ تھی۔ میں ایک عرصے تک اُسے نہ پہچان سکا، ساتھ ساتھ قدم ملا کر چلنے کے باوجود اجنبیت کی دیوار حائل رہی۔

”دُرگا دیوی کے مندر میں تم جس سے ملے اُس کا نام نندنی تھا.....“

”لیکن کجرا اور اُس میں.....“

”ہاں..... میں نے تاج ہوٹل میں اُس کے شریر کو کچھ سے کے لئے اپنا لیا تھا۔ اگر وہ کالی داس تک پہنچ جاتی تو وہ پنڈت تمہارے لئے خطرناک ثابت ہوتا۔“ کلدھپ نے وضاحت کی۔ ”نندنی کو کجرا کا نام دے کر میں نے تمہیں کالی داس کے خطرے سے خبردار کیا تھا۔ میں یہی چاہتی تھی کہ اُس کا کاٹنا تمہارے راستے سے نکل جائے..... تم نے اوم پرکاش تک جانے میں بہت جلدی کی، انکا نے تمہیں سمجھایا بھی تھا۔“

”وہ آواز کس کی تھی جو مجھے مندر میں سنائی دی تھی.....؟“ میں نے تیزی سے سوال کیا۔ مجھے دُرگا کہ کلدھپ کی آتما واپس نہ چلی جائے۔

”وہ..... وہ دیوی کی آواز تھی۔ اُسی کی مہانِ شکتی نے تمہیں بے بس کر دیا تھا۔ میری آتما بھی تڑپی، پرتو میں اُس سے تمہاری کوئی سہا نہیں کر سکی، دھرتی کی ساری شکلیاں مل کر بھی تمہیں دیوی کے کشش سے مکتی نہیں دلا سکتی تھیں۔“



”مگر میں.....“

”تم قسمت کے دہنی ہو جو تمہاری کوئی نیکی کام آگئی۔“ کلدیپ میری بات کاٹ کر بولی۔ ”میری بات دھیان سے سنو تمہیں، اب کسی جلد بازی سے کام نہ لینا، بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا، انکا کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ وہ تمہارے بہت کام آئے گی۔“

”وہ ہاتھ کس کا تھا جس نے.....“

”میں جا رہی ہوں۔“ جواب میں کلدیپ نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”گاڑی کو کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کرو اور.....“

اور کے بعد کلدیپ نے کچھ بھی نہیں کہا..... کہا بھی ہو گا تو مجھے سنائی نہیں دیا، ساٹھ ستر میل کی رفتار سے بھاگتی ہوئی کار کے اگلے دونوں ٹائر ایک ہولناک دھماکے کی آواز سے پھٹے..... اسٹیرنگ پر میرے ہاتھ کی گرفت اس اچانک افتادے ڈھیلی پڑ گئی۔ میں اُچھل کر چھت سے ٹکرایا، پھر جیسے بھونچال آگیا..... گاڑی کئی فلا بازیاں کھاتی ہوئی دُور جا کر رُکی۔ میرا وجود بھی گردش میں آ کر گاڑی کے اندر ہی اندر اُپر نیچے ہوتا رہا..... میرا جسم پھوڑے کی مانند ڈھک رہا تھا۔ میں بڑی مشکل سے گاڑی کا شیشہ توڑ کر باہر نکلا، میرے بدن کا ایک ایک جوڑ مل گیا تھا۔ میں نے باہر نکل کر ذرا دم لینے کی کوشش کی، گاڑی سڑک کے کنارے ڈھلان کے قریب رُکی تھی، میں اندھیرے میں اندازہ نہ لگا سکا، اپنے ہوش بحال کرنے کی خاطر لینے کی کوشش کی مگر توازن برقرار نہ رکھ سکا، نشیب کی سمت لڑھکتا چلا گیا۔ درد کی شدت سے میری چیخ نکل گئی، پھر سکتے طاری ہو گیا..... تباہ شدہ گاڑی کا پٹرول ٹینک پُر شور دھماکے سے پھٹا، آگ اور دُھوئیں کے مرغولے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اگر میں نشیب میں نہ لڑھکتا، ایک لمحے کی دیر ہو جاتی تو شاید میرا وجود بھی خوفناک آگ کی بھٹی کی لپیٹ میں آ کر چرما جاتا..... بڈیوں کا سراغ بھی نہ ملتا، دیوی دیوتاؤں کی مہمان شکلتیاں بھی ٹاپتی رہ جاتیں۔

میں کچی زمین پر پڑا بھڑکتی آگ کے شعلوں کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر میرے ذہن میں خطرے کا احساس کلبلا یا تو اٹھ کر واپسی کے راستے کی طرف دوڑنے لگا۔ میرا جوڑ جوڑ احتجاج کر رہا تھا، اندھیرے میں کئی بار ٹھوکر کھا کر گرا لیکن ہمت نہیں ہاری۔ میں نے جلد از جلد اُس مقام سے دُور نکل جانا چاہا۔ آگ کے شعلوں نے پیش آنے والے حادثے کی خبری دُور تک کی ہوگی۔ میرے دشمن بھی چونک سکتے تھے..... وہ صورت احوال

معلوم کرنے کے لئے قریب آتے تو انہیں میرا سراغ مل جاتا۔ مجھے چوہے کی طرح پکڑا جانا منظور نہیں تھا، میں کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا کسی محفوظ مقام تک پہنچنا چاہتا تھا۔

جسم کی ساری توانائیاں خرچ کر کے میں کبھی دوڑنے لگتا، کبھی طاقت جواب دینے لگتی تو دوڑنا موقوف کر کے لمبے لمبے قدم بڑھانے لگتا۔ لیکن کب تک؟ آدھے گھنٹے بعد ہی میری ہمت جواب دے گئی۔ میں جائے حادثے سے بمشکل چھ سات فرلانگ دُور جا سکا۔ خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا، آگ کے شعلے ابھی تک میرے سہمے ہوئے وجود پر کپکپا رہے تھے، میں بار بار پلٹ کر اُن شعلوں کو دیکھنے لگتا۔ کلدیپ کی بے چین رُوح مجھے اسی حادثے سے باخبر کرنے کو آئی تھی۔ میں نے اُسے باتوں میں الجھالیا۔ اُسے اطلاع دینے میں دیر ہو گئی لیکن قسمت کی دیوی مہربان تھی جو میں بچ گیا۔

میرا سانس بری طرح پھول رہا تھا، پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے پڑنے لگے، میرے جسم میں اتنی سکت نہیں تھی کہ مزید دوڑ بھاگ کر سکتا۔ سڑک پر دُور دُور تک کوئی ٹریفک نظر نہیں آ رہا تھا، میں نے سوچا۔ ”اگر سڑک عبور کر کے دوسری سمت نکل جاؤں تو اندھیرے میں کچھ دیر بیٹھ کر سستایا جاسکتا ہے.....“ اپنے ارادے کی تکمیل کی خاطر میں نے زور لگا کر قدم بڑھانے کی کوشش کی، اُسی لمحے کسی نے مجھے گھپ اندھیرے میں لڑکھڑاتا دیکھ کر اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا..... میرا اُپر کا سانس اُپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ جو بھی تھا، مضبوط جتنے کا مالک تھا۔ اُس نے میرے بوجھ کو بڑی آسانی سے سنبھال لیا تھا۔ اُس کی گرفت میں بلا کی قوت تھی، میرے دل کی حرکت تیز ہو گئی، میرے ذہن میں دُسو سے جاگ اُٹھے۔ اتنی رات گئے اس ویرانے میں کون تھا جس نے مجھے گرتے ہوئے تھام لیا؟ کوئی نیک بندہ مجھے اذیت میں دیکھ کر میری مدد کو آگیا؟ قریب کسی جھونپڑی میں رہنے والا کوئی شخص جو بھڑکتی آگ کے شعلے دیکھ کر صورتحال معلوم کرنے کی خاطر نکل پڑا؟ ڈاکوؤں کے گروہ کا کوئی فرد جو کار میں گزرتے ہوئے لوگوں کو لوٹنے کے ارادے سے چمپا بیٹھا ہو؟ مجھے بھی کوئی بڑا شکار سمجھ کر جھپٹ پڑا..... یا میرا کوئی دشمن جسے میری تلاش تھی.....؟

”کون ہو تم.....؟“ میں نے فہمت بھری آواز میں دریافت کیا۔

”اپنا متر سمجھ لے۔“ اُس نے ٹھوس آواز میں جواب دیا۔ ”ادھر سے گزر رہا تھا، آگ کے شعلے دیکھ کر رُک گیا، تجھے دیکھا تو ادھر چلا آیا۔“

بولنے والے کے لہجے میں دشمنی کا کوئی عنصر شامل نہیں تھا، میں نے خود کو سنبھال کر اُسے دیکھا، وہ کوئی پنڈت یا پجاری تھا جس کے جسم پر صرف گہرے رنگ کی ایک دھوتی نظر آ رہی تھی، سینے پر بڑے بڑے سیاہ بالوں کا جنگل پھیلا ہوا تھا، سرگٹھا ہوا تھا، کشادہ پیشانی پر صندل اور سیندور کی آڑی ترچھی بل کھاتی لکیریں نظر آ رہی تھیں، گلے میں موٹے موٹے دانوں اور سوکھے پھولوں کی کئی مالائیں جھول رہی تھیں، وہ خاصا بھاری بھر کم شخص نظر آ رہا تھا، اندھیرے کے باوجود اُس کی بڑی بڑی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میں اُس کے تن و توش کو سہمی سہمی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اُس نے مجھے دوست کہا تھا، لیکن کوئی پنڈت یا پجاری میرا دوست نہیں ہو سکتا تھا۔ شاید اُسے میری ہی تلاش تھی، اندھیرے کے سبب مجھے پہچان نہیں سکا، میری اصلیت کو بے نقاب کرنے کی خاطر چرب زبانی کا حربہ استعمال کر رہا تھا۔ ”من ہی من میں کیا وچار کر رہا ہے بالک؟“ اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اس دھرتی پر کون ایسا بھاگوان ہے جس پر کوئی پتا نہ پڑی ہو، پرتو مہارش وہی ہے جو کھنایوں کو بھوگنے کی شکتی رکھتا ہو۔ میرا من کہتا ہے کہ تجھ پر بھی کوئی پتا آن پڑی ہے۔“

”ہاں.....“ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں بمبئی جا رہا تھا، جلدی میں تھا، لیکن گاڑی کے ٹائر پھٹ گئے۔ رفتار تیز تھی، میں گاڑی کو سنبھال نہ سکا، وہ الٹ پلٹ کر بھسم ہو گئی، میں زندہ بچ گیا۔“

”اب کس دشا (سمت) میں جانے کی سوچ رہا ہے، پورب یا پچھم؟“

”تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا.....؟“ میں نے اُس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے دبی زبان میں پوچھا، مکمل اعتماد کے بغیر میں اُسے اپنے من کا بھید نہیں بتا سکتا تھا۔ یہ بھی میری خوش قسمتی تھی کہ میری پشت شعلوں کی طرف تھی، میں اُس کے چہرے کو دیکھ سکتا تھا لیکن وہ پس منظر میں بھڑکتی ہوئی آگ کے سبب میرے خدو خال کو پوری طرح جانچنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

”سیوک کو پرتاپ کہتے ہیں۔“ اُس نے نام بتا کر پھر اپنا سوال دہرایا۔ ”تو نے بتایا

نہیں، کدھر جانے کا دھیان ہے؟ بمبئی یا واپس پونا؟“

میں نے نظر گھا کر سڑک کی سمت دیکھا، مجھے اُس کی گاڑی کہیں نظر نہیں آئی۔

”کس دبدھا میں پڑ گیا مورکھ؟“ اس بار پرتاپ نے اُستائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ترنت کوئی فیصلہ کر لے، مجھے بھی دُور جانا ہے۔“

”میں چلا جاؤں گا مہاراج، تم میری وجہ سے پریشان مت ہو۔“ میں نے اُسے ٹالنے کی کوشش کی۔ ”تمہاری بڑی کرپا جو تم نے مجھے گرتے سے سنبھال لیا۔ میں تمہارا یہ احسان یاد رکھوں گا۔“

”من میں کچھ، زبان پر کچھ.....“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”میں تیری دبدھا کا کارن سمجھ رہا ہوں۔“

”تم کیا سمجھ رہے ہو.....؟“ میں نے خود کو لا پرواہ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ میری خود اعتمادی آہستہ آہستہ بحال ہو رہی تھی۔

”پرتاپ کے مطلب سمجھتا ہے؟“ اُس نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”جس کے اندر گرمی بھری ہو۔ جو اُونچے وچار رکھتا ہو، گیانی ہو، جس کے من کا اُجالا اندھیروں کو دُور کر سکے، کسی اُونچے استھان پر براجمان ہو، دوسروں کی سیوا کرنا اپنا دھرم سمجھتا ہو اور کسی دُکھیارے کے کام آ سکے۔ تو بھی مجھے بیا کل نظر آ رہا ہے، جو کچھ تیرے من میں ہے کھل کر بتا دے.....“

بیرا گیوں سے کیا پردہ؟“

”میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا مہاراج۔“ میں نے جھوٹ بولا۔ ”تم اپنا راستہ سنبھالو، میں کوئی اور سواری پکڑ لوں گا۔“

میرا جواب سن کر پرتاپ کے چہرے پر بیزارگی اور جھلاہٹ کے طے جلے تاثرات اُبھرے۔ وہ میرے طرز عمل سے اُکتا کر واپس جانے کے لئے پر تول رہا تھا جب میں منہ پھیر کر جائے حادثہ کی طرف دیکھنے کی حماقت کر بیٹھا۔ میرا چہرہ روشنی میں آیا تو پرتاپ کی نگاہیں چمک اُنھیں۔ وہ جاتے جاتے رک کر مجھے پوری توجہ سے دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات یلکھت تبدیل ہو گئے۔ میں اپنی حماقت پر شپٹا کر رہ گیا۔ شاید اُس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اُس کی عمر مجھ سے کہیں زیادہ تھی، لیکن اُس کے توئی میرے مقابلے میں بہت زیادہ مضبوط نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے ٹکٹکی باندھے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

”میرمی بات مان لو مہاراج۔“ میں نے دیدہ و دانستہ بے پرواہی کا مظاہرہ کیا۔ ”میرے پیچھے میرے کچھ اور واقف کار بھی چلے ہوں گے، مجھے جلدی تھی اس لئے انہیں چھوڑ کر نکل پڑا۔ وہ کچھ دیر میں آ جائیں گے، میں اُن کے ساتھ نکل جاؤں گا۔“

”نہیں بالک، نہیں.....“ پرتاپ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر میں بھی تجھے چھوڑ کر چلا گیا تو تیرے لئے سارے دوار بند ہو جائیں گے، تجھے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملے گا۔ پکھیر و اکیلا ہو تو جال نہیں توڑ سکتا.....“

میں پرتاپ کی باتیں سن کر چونکا، اُس کے لب و لہجے کی تبدیلی بلامقصد نہیں تھی۔ اُس کی نظروں میں ابھرنے والی چمک غمازی کر رہی تھی کہ وہ میری اصلیت جان چکا ہے، معنی خیز گفتگو کا انداز چغلی کھا رہا تھا کہ وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا..... مگر کیسے.....؟ کون تھا وہ؟..... مجھے کیسے جانتا تھا؟ کیا چاہتا تھا.....؟

”میں تیری بات مان کر چلا جاتا بالک تو بڑا اندھیر ہو جاتا۔ سارے کئے کرائے پر پانی پھر جاتا۔“

”میرا خیال ہے تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو۔“ میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ ”میں وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔“

”تیری نظریں بھی دھوکہ کھا رہی ہیں بالک۔“ اُس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”میں بھی اوپر سے جو نظر آ رہا ہوں، اندر سے وہ نہیں ہوں۔ خاص طور پر تیرے لئے.....“

”تم میری ذات پر کس کا شبہ کر رہے ہو.....؟“ میں نے بے زحنی کا اظہار کیا۔

”کس کو ہانکنے کی غلطی کر رہا ہے.....؟“ پرتاپ نے مجھے دلچسپ نظروں سے گھورا۔ ”وہ ٹھیک ہی کہا کرتا تھا، تو نے اگر تن کو اُجلا کر کے من کو مار لیا ہوتا تو امر ہو جاتا، آکاش کی بلندیوں پر تیرتا پھرتا، دھرتی کے گورکھ دھندوں سے تیرا کوئی سمبندھ، کوئی رشتہ نانا نہ ہوتا، پر تو قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے، کوئی شکستی اس پر سیاہی نہیں پھیر سکتی۔“

میں گڑبوا گیا۔ پرتاپ جس زبان میں بات کر رہا تھا وہ میری جانی پہچانی تھی۔ وہ معمولی پنڈت پجاری نہیں تھا، اُس کی نظریں میرے ذہن کی گہرائیوں میں غوطہ لگا رہی تھیں، میرے دل کی گہرائیوں میں جھانک رہی تھیں۔ میرے لئے ضروری ہو گیا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دوں، موقع کی نزاکت مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ میں پنڈت ادم پر کاش کے بعد کسی اور پجاری کے خون سے ہاتھ رنگوں، لیکن پرتاپ میرے راستے کی دیوار بن کر جما کھڑا تھا، اُس کے قدم زمین سے اُکھاڑنے کی خاطر میرے لئے پراسرار قوت کا استعمال ناگزیر ہو گیا۔ میں نے پریم لال کا نام لے کر پرتاپ کو راستے سے

ہٹانے کی کوشش کی، مجھے اپنے ارادے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ میں نے ارتکاز کا عمل کرنے کو سوچا لیکن اپنے بکھرے ہوئے ذہن کو سمیٹ کر یکسوئی نہ حاصل کر سکا۔ میرے اوپر پھر جنون طاری ہونے لگا، وحشتیں بڑھنے لگیں۔

”من کو شانت رکھ بالک۔“ پرتاپ نے مجھے بڑی سنجیدگی سے ٹوکا۔ ”زیادہ پھڑپھڑانے کا وچار من سے نکال دے۔ ہر ایک سے پنچڑانے کی مت سوچا کر۔ سیاہ و سفید کی پرکھ کرنا سیکھ لے۔“

”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔“ میں نے اکتاہٹ کا اظہار کیا۔ ”وہ سندری ہوتی تو تیری مشکل آسان کر دیتی۔“ پرتاپ نے میرے سر کی سمت دیکھا۔ ”کہاں چھوڑ آیا اُس پھلجھڑی کو؟ آج میں بھی اُس کے درشن کر لیتا، جنم جنم کی آشنا پوری ہو جاتی۔“

”تم.....“ میں حیرت سے اُچھل پڑا۔ ”تم کس سندری کی بات کر رہے ہو.....؟“ ”وہی جس کے بارے میں کیول سنا ہی سنا ہے، دیکھنے کی آشنا پوری نہیں ہوئی۔“ اُس نے حیرت بھری آواز میں کہا۔ ”وہ کہا کرتا تھا کہ ڈیڑھ بالشت کی وہ سندری بڑی نٹ کھٹ، بڑی شوخ، بڑی چنچل ہے، نت نئے کھیل تماشے کرتی ہے، ایسے ایسے نائک رچاتی ہے کہ منش دانستوں تلے اُننگی دینے پر مجبور ہو جاتا ہے..... کہاں چھپا رکھا ہے اُسے بالک؟“ پرتاپ، انکا کی بات کر رہا تھا۔ اُس نے کبھی انکا کے درشن نہیں کئے تھے، کسی نے اُسے انکا کی شونیوں اور شرارتوں کے بارے میں تفصیل سے بتا رکھا تھا۔ میں شپٹانے لگا۔ ”پھر وچاروں میں ڈبکی کھانے لگا۔“ اُس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”کھرے اور کھوٹے کی پہچان کیا کر۔“

”تم..... مجھ سے کیا چاہتے ہو.....؟“ میں نے جھلا کر سوال کیا۔ ”میرا ہاتھ پکڑ لے..... میرے ساتھ نکل چل، کہیں آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

میرا کہا مان لے، سے بیت رہا ہے۔ ”تمہاری باتیں مجھے الجھا رہی ہیں مہاراج۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں بات کی۔ ”کیا جانتے ہو تم میرے بارے میں؟“ ”کہاں سے شروع کروں؟“ پرتاپ نے ہاتھ ملتے ہوئے خشک آواز میں کہنا شروع

کیا پہچان سکے گا؟“ پرتاپ نے بل کھا کر کہا۔ ”کب تک لقا کیوڑ کی طرح دم اور گردن کو ساتھ ملائے رکھے گا، کتنی فلاں بازیاں کھائے گا مورکھ، کبھی جمیل احمد خان، کبھی دولت علی..... اور کوئی سندرسا نام کھوج لے، کوئی نیا روپ دھار لے۔“

میں پرتاپ کی کڑوی کیلی باتیں سنتا رہا، اُس کے چہرے کو گھورتا رہا۔ معاً مجھے یاد آ گیا کہ میں نے اُسے پہلے کہاں دیکھا تھا؟ لندن سے روانگی کے وقت ایئر پورٹ پر مسافروں کی بھیڑ میں ایک بار وہ میرے سامنے آیا تھا، پھر کتر کر نکل گیا۔ لندن کے حوالے سے مجھے امریتا بھی یاد آئی، اُس کی میری ملاقات جہاز پر ہوئی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ فرسٹ کلاس میں اپنے کسی گرو کے پاس بیٹھی تھی..... ”تو کیا..... کیا وہ گرو پرتاپ ہی تھا؟“ میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا تو پرتاپ مسکرانے لگا۔

”میرے متر پر تیم لال نے بھی تجھ سے یہی کہا تھا بالک... من کی آنکھیں کھلی رکھا کر۔“

”میں نے تمہیں مہاراج کے ساتھ نہیں دیکھا۔ کبھی مہاراج نے بھی تمہارا ذکر نہیں کیا..... کیا ہوتا تو میں تمہیں ضرور یاد رکھتا گرو پرتاپ۔“

”پرتاپ نہیں..... کیول گرو کے نام سے یاد رکھ۔“ اُس نے نرمی سے کہا۔ ”میرے دوسرے جان کار بھی مجھے گرو کے نام سے جانتے ہیں۔“

”میرے لئے اب کیا حکم ہے.....؟“ میں نے اُس پر اعتماد کر لیا۔

”سندری نے غلط نہیں کہا تھا۔“ گرو نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”بھور ہونے سے پہلے تیرا بمبئی پہنچنا ضروری ہے، چل میرے ساتھ، میں تیری مشکل آسان کر دوں گا.....“

”لیکن وہ راستے میں جال ڈالے بیٹھے ہوں گے؟“ میں ہچکچانے لگا۔ ”آسانی سے میرا

پچھا نہیں چھوڑیں گے۔“

”جب گرد کہا ہے تو پھر گرو کی آگیا کا پالن بھی کر.....“

میرے پاس گرو کے حکم کی تعمیل کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا، وہ سڑک کی جانب قدم بڑھا چکا تھا۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہو لیا۔ انکا نے کہا تھا میرے دشمن مجھے گھیرنے کی کوشش کریں گے، دُرگا کی آواز نے مندر کے پجاریوں کو پنڈت اوم پرکاش کی موت سے باخبر کر دیا تھا۔ وہ مندر کے سب سے بڑے پروہت کی لاش دیکھ کر دیوانے ہو گئے ہوں گے، کالی داس کی چتا کو آگ لگنے سے پہلے پنڈت اوم پرکاش کے انجام کی خبر

کیا۔ ”میمسور کی پہاڑیوں پر لے چلوں جہاں ایک بھولی بھالی سندری کو اشان کرنا دیکھ کر تیرے من میں پاپ چھلنے لگا تھا..... اُس مہان پر تیم لال کی بات کروں جس کی مہان شکتی کے سہارے تیری انکارانی بھی بے بس ہو گئی تھی..... تیری کلدیپ نے جس کے چروں میں گر کر تیرے جیون کی بھکشا مانگی تھی..... تیری ایک بھول کی کارن اُس من موہنی صورت والی سندرنار کو پر تیم لال کی کنیا سنبھالی پڑی، آخری سانس تک وہ اُسی استھان پر بیٹھی تیرے پریم کی خاطر، تجھے مضبوط کرنے کے کارن دیوی دیوتاؤں کا جاپ کرتی رہی، پورا جیون بتا دیا، نیچے اُتری تو تیرے اوپر جان کی بھینٹ دے کر اپنا پیار امر کر گئی..... تو شہروں شہروں گھومتا رہا، رنگ رلیاں مناتا رہا، وہ تیرے نام کی مالا جھپتی رہی.....“ پرتاپ بڑی روانی سے میری کتاب زندگی کی ورق گردانی کرتا رہا، میں تصویر حیرت بنا خاموش کھڑا اُس کی باتیں سنتا رہا، اُس کی زبان چلتی رہی۔

”کیا کیا یاد دلاؤں تجھے؟ کون سا دوار کھولوں، کون سا بند کروں؟ تجھے زگس کی قبر پر لے چلوں جہاں اب کیول دھول اڑتی ہے..... مالا رانی کی بھگتی کی کہانی سناؤں، تربینی کا راگ الاپوں جس نے تجھے اپنے در کا بھکاری بنا لیا تھا؟ تو اُس کے اشاروں پر نچتا تھا..... بدری نرائن اور تیری مہا بھارت کے قصے چھیڑوں یا کلدیپ اور امر لال کے یدھ کا نقشہ کھینچوں؟ اُس گوری چنڑی والی میم کی رام کہانی سناؤں جس نے تجھے سہارا نہ دیا ہوتا تو کب کا مر کھ پ گیا ہوتا؟“

پرتاپ سانس لئے بغیر بولتا رہا۔

”اُن مہان شکتیوں کے گن گاؤں جو ابھی تک تجھے سہارا دیئے ہوئے ہیں۔ تو بڑا

بھاگوان ہے بالک، سورگ باشی پر تیم کی آتما ابھی تک تیری چچاڑی پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے، کلدیپ کبھی بار بار دیوی دیوتاؤں کے سامنے جھکنا پڑتا ہے، وہ مر کر بھی تیرے پریم میں دیوانی ہو رہی ہے، تجھے راستہ دکھانے کی خاطر بار بار تیرے پاس آتی ہے۔ اُسے کیا کیا کشت بھوگنا پڑتا ہے اور تو..... تو بار بار اُس کا کہا ٹال دیتا ہے، اُسے سکھ نہیں دے سکا تو اُس کی بیاکل آتما کو چین سے رہنے دے۔ کب تک اُسے تڑپاتا رہے گا.....؟“

”بس کرو مہاراج، بس کرو.....“ میں چیخ اٹھا۔ ”میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔“

”سندرناریوں کے کندن جیسے شریر پر تیری پاپی نظریں بھگتی رہیں گی تو کسی دوسرے کو



بجاریوں کے ساتھ اُسے رات کی تاریکیوں میں کسی ویران گوشے میں اس طرح گڈمڈ کر دیا ہاتا کہ وہ شرم سے چلی پڑ جاتی، آنکھیں چرانا بھی مشکل ہو جاتا۔ ممکن ہے فاضل جج بھی اُس کے درشن کی خاطر بار بار تاریکیوں میں دینا شروع کر دیتا۔ دوسرے کارندے بھی بھوکے بھیڑیوں کی طرح نندنی کے کول شریر کو بھینچوڑ ڈالنے کی خاطر دانت تیز کرنا شروع کر دیتے۔ کسی کو قاتل قرار دے کر چھانی کے پھندے پر لٹکا دینا کوئی مذاق نہیں ہے۔ استغاثہ کو ثابت کرنا پڑتا کہ میری تحویل میں کوئی طلسمی چراغ، کوئی جادوئی انگوٹھی تھی جس کے جن نے مجھے فرار ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ میرا وکیل دُرگا دیوی کو عدالت میں پیش ہونے کا مطالبہ کر بیٹھتا تو عدالت اور قانون دونوں بغلیں جھانکنے لگتے۔

فج ٹکنے کے بہت سارے راستے تھے لیکن میرا بروقت بہیمی پہنچنا ضروری تھا۔ میں سید مجذوب کی لاشی پکڑ کر گھباتا، سارے تتر بتر ہو کر رہ جاتے، کسی کو بھاگنے کا راستہ نہ ملتا۔ ڈکاریوں کے سارے جال پھندے ٹوٹ جاتے، پولیس کے اعلیٰ افسران بھی ششدر رہ جاتے، میں سینہ تانے دندنا تا پھرتا، پہلے بھی کئی موقعوں میں ایسے کھیل تماشے ہو چکے تھے۔ سید مجذوب کی متبرک لاشی کی تو بڑی بات تھی، میری انکارانی ہی نے برطانوی عدالت میں پولیس آفیسر آرتھر کونا کوں چنے چہوا دیے تھے۔ وہ حق پر تھا لیکن جج اور جیوری کے متفقہ فیصلے نے اُسے اختیارات کے ناجائز استعمال اور اپنی حدود سے تجاوز کرنے کا مجرم قرار دے دیا۔ سچا کیس جھوٹا ثابت ہو گیا، میں سینہ تانے آزادی کے ساتھ سب کی نظروں میں ڈھول جھونک کر عدالت سے باہر آ گیا۔

”سے ہمیشہ ایک سہان نہیں ہوتا بالک۔“ گرو کی ٹھوس آواز میرے کانوں میں گونجی تو میں چونکا۔ وہ میرے دل کی باتیں کھلی کتاب کی طرح خاموشی سے پڑھتا رہا، مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ اُس نے خود کو سورگ باشی پریم لال کا متر کہا تھا تو شاید غلط نہیں کہا تھا، میں مختاط ہو گیا۔ اُس نے سنجیدگی سے اپنی بات جاری رکھی۔ ”تو بڑا بھاگی (خوش قسمت) ہے جو ڈھیر ساری شکلیاں تیرے ساتھ ہیں، تجھ پر چھایا کئے ہوئے ہیں۔ لیکن تو نے دُرگا کو لاکا کر ٹھیک نہیں کیا، دیوی دیوتاؤں کی ہلکی اپرم پار ہوتی ہے۔ پر ماتا اُن کی رکھشا (حفاظت) کرتے ہیں، اُن کی پلکوں کا اشارہ بھی مہا پرشوں کے لئے بہت ہوتا ہے۔ تو پہلے بھی کئی بار یہی بھول کر چکا ہے جس کی سزا بھوگتا ہے۔ اب دوبارہ ایسی بھول مت کرنا ورنہ۔“

پورے شہر میں پھیل چکی ہوگی۔ سارے پنڈت پجاری میری تلاش میں نکل اُٹھے ہوں گے۔ پنڈت نول کشور کو اطلاع دی گئی ہوگی، اُس کے انتقام کی آگ اور بھڑک اُٹھی ہوگی۔ بڑے بڑے دھرماتماؤں نے پولیس کے اعلیٰ حکام کو فون کھڑکھڑائے ہوں گے، ہر طرف کھلبلی مچی ہوگی، وہ سب میری تکہ بوئی کرنے کی خاطر کونے کھدروں میں میری تلاش کر رہے ہوں گے۔ گواہی شہادت کے رجسٹر کھلے ہوں گے، بیٹی شاہدوں کے بیانات قلمبند کئے جا چکے ہوں گے، نندنی پجارن نے بھی انہیں اپنی کھاسائی ہوگی، کچھ لوگوں نے مجھے مندر میں داخل ہوتے دیکھا تھا، ممکن ہے ان کے اشارے پر پتھوی کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہو۔ پولیس کا ایک ڈپٹی بھی بیچ و تاب کھا رہا ہوگا، تاج ہوٹل کے منیجر کو بھی گھیرا جاسکتا تھا۔ گاڑی اور پتھوی دونوں کو اُسی نے میرے حوالے کیا تھا، اُس کے لئے بھی جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ انکا چاہتی تھی کہ میں پوچھنے سے پہلے بہیمی پہنچ جاؤں۔ اُس کے مشورے کے پیچھے کیا مصلحت تھی؟ میں نہیں معلوم کر سکا۔ وہ میری تلخ ترش باتیں سن کر سر سے اتر گئی تھی۔ میں نے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے، بہیمی میں میرے لئے سب سے قیمتی شے سید مجذوب کی لاشی تھی، میں کسی طرح پولیس کی گرفت میں آنے سے پیشتر تاج ہوٹل پہنچ جاتا تو پھر سینکڑوں بہانے تراشے جاسکتے تھے، دُرگا کی آواز کو پنڈت پجاریوں کا وہم بھی قرار دیا جاسکتا تھا۔ قانون میں بڑی گنجائش ہوتی ہے، گھاگ وکیلوں کے پیچیدہ سوالات بڑے بڑے دانشوروں کی عقل خط کر دیتے ہیں۔ میں صاف انکار کر دیتا کہ میں نے پنڈت اوم پرکاش کو نہیں مارا، وہ مندر کی کسی اندرونی سازش کا شکار ہوا ہوگا، میرا وکیل سوال کرتا۔ ”می لارڈ، جب مندر میں سینکڑوں پنڈت پجاری اور محافظ موجود تھے تو انہوں نے ایک اکیلے قاتل کو پکڑنے کی کوشش سے کیوں گریز کیا؟ وہ کس بات سے خوفزدہ تھے؟ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ جب مفروضہ قاتل کے ہاتھ میں کوئی مہلک ہتھیار بھی نہیں تھا؟“ استغاثہ داخل کرنے والے کے پاس کوئی معقول جواب نہ ہوتا، پجارن نندنی اپنا خوبصورت بدن سینتی، اوڑھنی میں جسمانی نشیب و فراز کو چھپاتی شہادت دینے کے لئے کبھرے میں قدم رکھتی تو بے شمار حریص نظریں اُس کے حسین وجود سے لپٹ جاتیں، وکیل سوالوں کی بوچھاڑ کرتے تو نندنی نگلی ہو جاتی۔ اُس پر بے شمار جھوٹے الزامات اس صفائی سے تراشے جاتے کہ وہ خود بھی فیصلہ نہ کر پاتی کہ کس بات سے انکار کرے؟ مندر کے



مجھے دھوکے میں رکھ کر پکڑنا چاہتے تھے۔ میں انہیں سڑک پر چلتا نظر آیا تو انہوں نے ساری روشنیاں جلادیں۔ پولیس کی مخصوص گاڑیوں پر سرچ لائٹس بھی ہوتی ہیں، ایسی ہی ایک تیز روشنی کا دائرہ ہمارے اوپر آ کر ختم گیا۔ گرو کے بڑھتے ہوئے قدم ختم گئے، وہ پلٹ کر روشنی سے آنکھیں لڑانے لگا، بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ مجھے اُس کے چہرے پر اُلجھن یا پریشانی کی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔ میرے لئے فرار کے راستے مسدود ہو گئے، وہ کئی گاڑیاں تھیں جو ہمارے قریب آ کر آگے پیچھے رُک گئیں، سرچ لائٹ کی تیز روشنی ہمارے چہروں پر مرکوز تھی، کئی گاڑیوں کے دروازے کھلنے کی آوازیں گونجیں۔ بہت سارے قدموں کی آوازیں ابھریں، شاید وہ ہمارے خلاف مورچہ بنا رہے تھے۔ گرو کے چہرے پر آہستہ آہستہ ناگواری کے تاثرات ابھرنے لگے۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر سینے کے کھڑا بھاگ دوڑ کی آواز سن رہا تھا۔ ”خبردار.....“ ایک بھاری بھر کم آواز ابھری۔ ”جہاں کھڑے ہو وہاں سے ہلنے کی کوشش بھی نہ کرنا، ورنہ بھون دیئے جاؤ گے۔“

گرو ہونٹ کانٹنے لگا۔ اُس کے تیور بدلنے لگے۔

”تم نے سواٹنگ بھرنے کی کوشش کی ہے مگر ہم نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم پوری طرح گھیرے جا چکے ہو۔“

میں نے کوئی بات نہیں کی، گرو کی طرح بت بنا کھڑا رہا۔ اور کر بھی کیا سکتا تھا.....؟

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو..... ہینڈ زاپ۔“ ایک اور آواز گرجتی ہوئی سنائی دی۔

گرو نے سنی ان سنی کر دی، اُس کا چہرہ غصے سے تھماتے لگا۔ میں دم سادھے کھڑا رہا۔

”تم نے سنا نہیں..... اپنے ہاتھ.....“

”ہینڈ زاپ پجاریوں سے ٹھٹھول کر رہا ہے پاپی.....“ اچانک گرو نے بڑے خوفناک انداز میں گرج کر کہا۔ ”اپنے کسی بڑے کو سامنے کر، اُسے میرا نام بتا دے..... میں گرو ہوں۔ گرو پرتاپ۔“

اس بار دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ ایک شخص روشنی میں نہایا ہماری طرف بڑھنے لگا۔ وہ قریب آیا تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں..... میں نے اُسے پہچان لیا، وہ ڈی آئی جی رومی شکر تھا جس نے مجھے ہوٹل سے نکلتے وقت بھی روکنے کی کوشش کی تھی لیکن ایک ماتحت کے آجانے سے اُسے مجھے کریدنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اب وہ

گرو کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

”ورنہ کیا.....؟“ میں نے وضاحت چاہی۔ ”تم بولتے بولتے خاموش کیوں ہو گئے؟“

”پریم لال نے تجھے موح میلہ کرنے کی اجازت دے رکھی ہے تو اُس کی اتما جانے۔“ گرو نے مکھم انداز میں کہا۔ ”پرتو میرا ایک اپدیش دھیان سے سن لے، چکور کی طرح چندرما تک اڑنے کی نہ سوچا کر، ساگر کی لہروں کی شکتی بڑے بڑے مہان پیرا کوں کو بھی سچ منجھدار میں غرق کر دیتی ہے..... دھرتی اور آکاش کے سچ ایک استھان ایسا ہے جس سے اونچا اڑنے کی اجازت میرے تیرے پرشوں کو نہیں ہے، تو بھی ایک ریکھا کھینچ لے، اس سے آگے جانے کا دھارمن سے نکال دے، اسی میں تیری مٹی ہے۔“

”ایک بات پوچھوں گرو؟“ میں نے اُس کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔

”کیا پوچھے گا.....؟“

”جو کچھ بیت چکی ہے اس کا انجام کیا ہوگا.....؟“ میں نے جان بوجھ کر کالی داس یا اوم پرکاش کا نام لئے بغیر گول مول انداز میں پوچھا۔ ”کیا میرے دشمن مجھے گھیرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟“

”جے بجرنگ ملی..... جے کالی..... جے بھولے ناتھ۔“ گرو نے نعرہ بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”تیرے من میں ابھی تک بھونچال سر مار رہا ہے، بھوش میں کیا لکھا ہے بھگوان کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ ہم کیول اپائے کر سکتے ہیں۔“

”تم شاید بتانا نہیں چاہتے.....“ میں نے شکوہ کیا۔

”دھیرج سے کام لے بالک، ابھی سے بیا کل ہونے لگا، ابھی تو پورا جیون تیرے سامنے پڑا ہے، اتنی جلدی کیا ہے تجھے.....؟“

میں تاڑ گیا گرو اپنے دل کا بھید نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے مجبور بھی نہیں کیا، اپنی خود اعتمادی کو سینٹے لگا۔ ہم سڑک پر آ کر پیچھے کی جانب واپس لوٹ رہے تھے۔ کچھ دُور جانے کے بعد مجھے ایک گاڑی نظر آنے لگی۔ وہ گرو کی ملکیت تھی۔ میں کچھ سوال کرنا چاہتا تھا کہ اچانک پوری سڑک پر تیز تیز روشنیاں ادھر ادھر تیرنے لگیں..... گرو نے پلٹ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔

میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ میرے دشمنوں نے دُور سے بھڑکتے شعلوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ صورت حال کا جائزہ لینے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی گاڑیوں کی لائٹس بجھا رکھی تھیں،

پورے لاؤ لشکر کے ساتھ آیا تھا، اُس کے پاس وقت کی کمی نہیں تھی۔ میں نے ذہن کو یکسو کر کے نندا کے بتائے ہوئے ایک عمل کو آزمانا چاہا، مگر وہ نے میرا ہاتھ زور سے دبا کر میری توجہ منتشر کر دی۔ اُس نے پوری قوت سے میرا ہاتھ تمام رکھا تھا۔

”تم..... گرو پر تاپ.....“ روی شکر نے قریب پہنچ کر گرو کو پہچانتے ہوئے بڑی عقیدت سے پوچھا۔ ”تم اس سے یہاں کیا کر رہے ہو مہاراج؟“

”ایک ضرورت کے کارن رُکنا پڑا۔“ گرو نے سرد لہجے میں جواب دیا، پھر تھکے انداز میں بولا۔ ”اپنے نادان چھو کروں کو باندھ کر رکھا کر، ان کی پلید زبان سے اچھے شبد نہیں نکلتے، اونچے سُروں میں اپنا راگ الاپنے لگتے ہیں۔ کسی دن میرا ہاتھ اُٹھ گیا تو ساری بولتی بند ہو جائے گی..... سن رہا ہے، میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”شما کر دو مہاراج۔“ روی شکر نے عاجزی کا اظہار کیا۔ ”وہ تمہیں پہچان نہیں سکے۔ ہمیں کسی اور کی کھوج تھی۔“

مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، میری آنکھیں پٹپٹانے لگیں..... میں روی شکر کے سامنے کھڑا تھا، وہ مجھے کھوجنے کی بات کر رہا تھا۔ شاید گرو کے ہاتھوں کے گرفت کا چسکا رہا تھا جس نے مجھے دوسروں کی نظروں سے اوجھل کر رکھا تھا، میرے اور دشمنوں کے درمیان پردہ تان دیا تھا۔ گرو ہنگامہ نہیں چاہتا تھا اسی لئے اُس نے ہاتھ دبا کر مجھے کسی مشق سے روکنے کا اشارہ دیا تھا۔ ڈی آئی جی روی شکر اس طرح بے پرواہ بنا کھڑا تھا جیسے میری موجودگی سے مطلق بے خبر ہو۔ میں نے بہت دیر بعد سکون کا سانس لیا۔

”کس کی کھوج میں سے برباد کر رہے ہو؟ کون گم ہو گیا ہے روی جی.....؟“ گرو نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”ہے ایک منش۔“ روی شکر نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

”ایک منش کے لئے اتنی ساری گاڑیاں، اتنے ڈھیر سارے لوگ.....“ گرو مسکرانے لگا۔

”تم بھی کہیں گرو سے مذاق تو نہیں کر رہے؟“

”نہیں مہاراج.....“ روی نے شپٹا کر کہا۔ ”میں سچ کہہ رہا ہوں، تم اُسے نہیں جانتے۔“

”کس کی بات کر رہا ہے؟“ گرو نے یلکھت سنجیدگی اختیار کر لی، بڑی رازداری سے مدھم آواز میں بولا۔ ”میں کوئی سہا سنا کر دوں؟“

”بڑی کر پا کر دو.....“ روی شکر نے بات بتانے کی کوشش کی۔ ”تمہارے درشن ہو گئے، یہ بھی ہمارے لئے بڑا نیک شگون ہے۔ اسٹاف سے بھول چوک ہو گئی، میں اس کے لئے شام چاہتا ہوں۔ اب آ گیا دو.....“

”جانے سے پہلے گرو کی ایک بات مان لے۔“ پر تاپ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”خود راستے سے ہٹ جا۔ جس کی کھوج میں ہے اُس کے لئے کسی اور کی ملی چڑھا دے۔ اپنے کسی دشمن افسر کو آگے بڑھا دے، تیرا راستہ صاف ہو جائے گا، بات بھی بنی رہے گی۔“

”میں سمجھا نہیں مہاراج؟“ روی شکر نے ہونٹ چباتے ہوئے گرو کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”تم کس کی بات کر رہے ہو.....؟“

”وہی جس کی تیری مڈ بھیڑ پہلے بھی ہو چکی ہے۔“ گرو نے ٹھوس آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”سندری کھلا اور کلن خان تو یاد ہوں گے تجھے؟ کھلا کو قتل کرنے کی گواہی سیوک رحمت

علی نے دی تھی، بعد میں وہ بھی مارا گیا، تیرے آدمیوں نے اُس مسئلے کو جھکڑی پہنا دی، پھر وہ اٹھائی گیرا کلن خان بیچ میں کود پڑا۔ اُس نے کہا تھا کہ اسی ٹخنے نے دس ہزار روپے دے کر اسے رحمت علی کو ٹھکانے لگانے پر مجبور کیا تھا، کلن خان بھی دھریا گیا اس کے بعد کیا

ہوا..... کچھ یاد ہے تجھے؟“ گرو نے سرسرا تے لہجے میں روی شکر سے پوچھا جو اپنی جگہ بت

بنا کھڑا حیرت سے اُس کی ایک ایک بات سن رہا تھا، میں اُس کی بوکھلاہٹ پر مسکرا دیا۔

”باقی لوگوں کے نام لوں گا تو کہانی بڑی لمبی ہو جائے گی.....“ گرو نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”تجھے تو یاد ہوگا؟ بات عدالت تک گئی تھی، کیس چلتا رہا، کئی موڑ آئے..... پر

نتیجہ کیا نکلا؟“ جمیل احمد خان کو نردوش جان کر آزاد کر دیا گیا، ساری فائلیں بھری کی بھری رہ گئیں، سب منہ دیکھتے رہ گئے.....“

”تم..... تم کیا کہنا چاہتے ہو مہاراج؟ کیا وہ اب بھی دوٹی نہیں ہے؟“ روی شکر نے کسمسا کر سوال کیا، میرا نام سن کر وہ شپٹانے لگا تھا۔

”مجھے کالی داس اور پنڈت اوم پرکاش کی موت میں کسی اور کا ہاتھ نظر آ رہا ہے۔ گرو کی وڈیا غلط نہیں ہو سکتی۔ میری بات گانٹھ سے باندھ لے۔“ گرو نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”جس نے بھی اُسے گھیرنے کی بھول کی، اُس کی کھات کھڑی ہو جائے گی۔ میں اس سے تجھے کیول اتنا ہی بتا سکتا ہوں۔“

”مہاراج..... کیا تم جانتے ہو کہ اس سے وہ کہاں ہوگا.....؟“ روی شکر نے پہلو بدل کر پوچھا۔

”ہاں..... وہ ہوٹل سے نکل کر جہاں گیا تھا، اب بھی وہیں ہے، اُس کا وہاں ہونا ہی اُس کے مزدوش ہونے کا ثبوت بھی ہے۔“

”تم مجھے اُس کا پتہ.....“

”نہیں.....“ گرو نے تیزی سے روی شکر کی بات کاٹ دی۔ ”دیوتا جس کی سہائتا کر رہے ہوں، جو مزدوش ہو، میں اُس کے بارے میں زبان نہیں کھول سکتا... ادھیکار نہیں ہے مجھے۔“

گرو نے بلند آواز میں کئی نعرے لگائے، پھر اپنی گاڑی کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ میں نے اُس کا ہاتھ اور مضبوطی سے تھام لیا۔ روی شکر ہونٹ چباتا رہ گیا، بڑے طمطراق سے آیا تھا، بڑی مایوسی سے واپس چلا گیا۔ راستہ صاف ہو گیا تو گرو نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں اُس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا تو میرے ذہن میں کئی سوال گونجنے لگے..... وہ خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔

پنڈت کالی داس اور اوم پرکاش کو میں نے جہنم رسید کیا تھا لیکن گرو نے روی شکر سے کہا تھا کہ اس میں کسی اور کا ہاتھ ہے، وہ مجھے مزدوش قرار دے رہا تھا تو پھر دوٹی کون تھا.....؟ گرو نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ میں ہوٹل سے نکل کر جہاں گیا تھا، اب بھی وہیں موجود ہوں۔ جبکہ میں گرو کے ساتھ تھا۔ اُس نے روی شکر کو باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ جس نے بھی مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی اُس کی کھاٹ کھڑی ہو جائے گی۔ گرو نے ایسا کیوں کہا تھا؟ کیا اُسے علم تھا کہ کل کیا ہونے والا ہے یا محض اپنی شخصیت سے اُس نے روی شکر کو مرعوب کرنے کی کوشش کی تھی.....؟ اصلیت کیا تھی.....؟

”کیا ساری باتیں آج ہی سوچ لے گا.....؟“ گرو نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کچھ کل کے لئے بھی چھوڑ دے، اتنی جلدی کیا پڑی ہے؟ ابھی تو تجھے بڑے پاڑے ملنے ہیں، کچھ دیر سٹالے۔ آج ہی تھک گیا تو کل کیا کرے گا.....؟“

”گرو.....“ میں نے دبی زبان میں پوچھا۔ ”تم اس وقت مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

”میں نے کہا تھا..... کچھ دیر آرام کر لے۔“ گرو نے تھوڑے توقف سے جواب دیا۔ ”تو نے دُرگا کی شکتی کو لکار کر اچھا نہیں کیا۔ میری ایک بات دھیان سے سن..... دُرگا کی آواز کے جادو نے تیری تمام شکتی چھین لی ہے، تیرا کوئی جنتر منتر اکیس روز تک تیرے کسی

کام نہیں آئے گا، اکیس دن اور اکیس راتیں تیرے اوپر بہت بھاری ہیں۔ سے پورا ہونے تک کسی ایک استھان پر دم سادھ کر بیٹھ جا..... اُچھل کود کرے گا تو بڑے خجال میں پھنس جائے گا، میں بھی تیری کوئی سہائتا نہیں کر سکتا گا۔“

”تم جہاں لے جا رہے ہو کیا دُرگا کی شکتی وہاں تک رسائی نہیں حاصل کر سکتی.....؟“

”چپ ہو جا مورکھ.....“ گرو نے اُلجھتے ہوئے کہا۔ ”زبان کو تالا لگا لے ورنہ بڑے کھانے میں رہے گا۔ پریتم لال کا دھیان نہ ہوتا تو میں آج بھی تیرے راستے میں نہ آتا..... دُور ہی دُور سے روشنی دکھاتا رہتا۔“

”اب آگئے ہو گرو تو میری رہنمائی بھی کرو۔“ میں نے عاجزی کا اظہار کیا۔ ”تم جانتے ہو، میں اپنی مرضی سے اس آگ میں نہیں کودا، مجھے زبردستی دھکیلا گیا ہے۔ وہ مجھے سکھ سے نہیں رہنے دیتے، ٹانگ پکڑ کر کھینچتے رہتے ہیں، بدری نرائن، امر لال اور کلدیپ کے بعد ساری کہانی ختم ہو گئی تھی۔ میں دیس چھوڑ کر بدلیس چلا گیا، میں نے مرنے کی ٹھان لی تھی لیکن مہاراج پریتم لال کی آتما نے سامنے آ کر میرا راستہ روک لیا اور.....“

”گرو سب دیکھ رہا ہے، سب جانتا ہے۔“ اُس نے میری بات کاٹ دی، پہلو بدل کر ٹھوس آواز میں بولا۔ ”اکیس روز تک کوئی راگ نہ الاپ، کان میں زوئی ڈال کر ایک جگہ ٹکا بیٹھا رہ، دُرگا کے سراپ کا سے بیت جانے دے، اس کے بعد پھر اُچھل کود شروع کر دیتا۔“ میں نے فوری طور پر کچھ نہیں کہا، گرو کی بات سمجھ میں آرہی تھی، پنڈت اوم پرکاش کے مرنے کے بعد ہی دُرگا کی آواز سنائی دی تھی، اس کے بعد میری قوتیں مفلوج ہو گئی تھیں، نہ پریتم لال کا نام لینے کے بعد کوئی خواہش پوری ہوئی، نہ ندا کا سکھایا ہوا کوئی عمل کارآمد ہوا۔ کلدیپ کی بے چین روح بھی شاید مجھے یہی باور کرانے کی خاطر آئی تھی کہ ارکانز اور مراتب کا عمل میرے کسی کام نہیں آئے گا۔ اس نے بھی یہی کہا تھا کہ دُرگا کی آواز نے میرے ہاتھ پیر جکڑ دیئے ہیں، دنیا کی ساری قوتیں مل کر بھی مجھے نہیں بچا سکتی تھیں..... لیکن میں زندہ تھا، کسی نے میرا ہاتھ تمام کر مندر سے نکال کر دُور ویرانے میں پھینک دیا تھا.....

”وہ ہاتھ کس کا تھا؟ وہ کس کی عظیم قوت تھی جس پر دُرگا کی آواز کا جادو بے اثر ہو گیا.....؟“

اچانک میرے ذہن میں سیدہ جذوب کا تصور ابھرا۔ برکاتی شاہ کی یاد آئی، اُس کراماتی لاشی کا خیال جاگا جسے میں ہوٹل میں چھوڑ آیا تھا، پریتم لال کی آتما بھی اُس لاشی کو دیکھ کر چل

اُٹھی تھی، اُس نے کہا تھا کہ اگر اپنی زندگی بھر کی تمام ریاضتیں اور پراسرار قوتوں کے عوض بھی وہ اس متبرک لاشی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو بھی اُسے یہ سودا مہنگا نہ پڑتا..... کلدیپ نے بھی اس لاشی کو بہت سنبھال کر رکھنے کی تاکید کی تھی۔

”چھتا مت کر ہالک....“ گرو نے دبی آواز میں کہا۔ ”وہ پوتر لاشی بھی تجھے مل جائے گی۔ تیرے سوا وہ کسی اور کے کام نہیں آسکتی۔ تو بڑا بھگوان ہے جو کسی دیوانے کو تجھ پر دیا آگئی۔“ گرو کی بات سن کر میرے ذہن میں پھر وہ ہاتھ کلبلانے لگا جس کے آگے ڈرگا کی تمام مہان شکلیاں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔ میں نے گرو کو ٹٹولنا چاہا۔

”زیادہ وچار کرے گا تو پاگل ہو جائے گا۔“ گرو میرے سوال کرنے سے پہلے ہی کسمسانے لگا۔ ”میں نے کہا تھا، ایک ریکھا کھینچ لے، اس سے اُونچی اڑان لگانا چھوڑ دے..... سن رہا ہے، میں کیا کہہ رہا ہوں.....؟ فلا بازیاں کھانا بند کر دے، جو کچھ پراپت کر لیا ہے اسی پر ٹکا رہ، زیادہ پھڑپھڑائے گا تو بھٹک جائے گا۔ شانت ہو جا، اسی میں کتی ہے۔“ گرو نے مجھے بولنے کا موقع نہیں دیا، گلے میں پڑی سوکھے پھولوں کی مالا سے ایک پھول تو ڈکر میری طرف بڑھا کر کہا۔ ”لے..... اسے چبالے۔“

مجھے پریم لال یاد آ گیا، ایک بار اُس نے بھی مجھے اپنے تھیلے سے کھریا مٹی جیسی کوئی چیز نکال کر اُس پر جنتر منتر پھونک کر مجھے کھانے کو کہا تھا، اُسے کھانے کے بعد میں نے عجیب قوتیں حاصل کر لی تھیں۔ میں سچے دل سے پریم لال کا نام لے کر جو مانگتا مجھے مل جاتا۔ اب گرو پر تاپ مجھے اپنی مالا کا سوکھا پھول چبانے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر پھول منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔ اُس کا ذائقہ بے حد کڑوا تھا۔

”گرو کی بات ایک بار پھر دھیان سے سن لے۔“ اُس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”اکیس روز تک سارے پنکھ سمیٹ کر رکھنا۔ آسمان میں تھکلی لگانے کی بھول نہ کرنا.....“ میں نے جواب میں کچھ پوچھنا چاہا لیکن پھول کی کڑواہٹ بڑی تیزی سے میرے وجود میں سرایت کر گئی، میرا ذہن گھپ اندھروں میں ڈوبتا چلا گیا..... میں ہر احساس سے بے نیاز ہو گیا.....!!

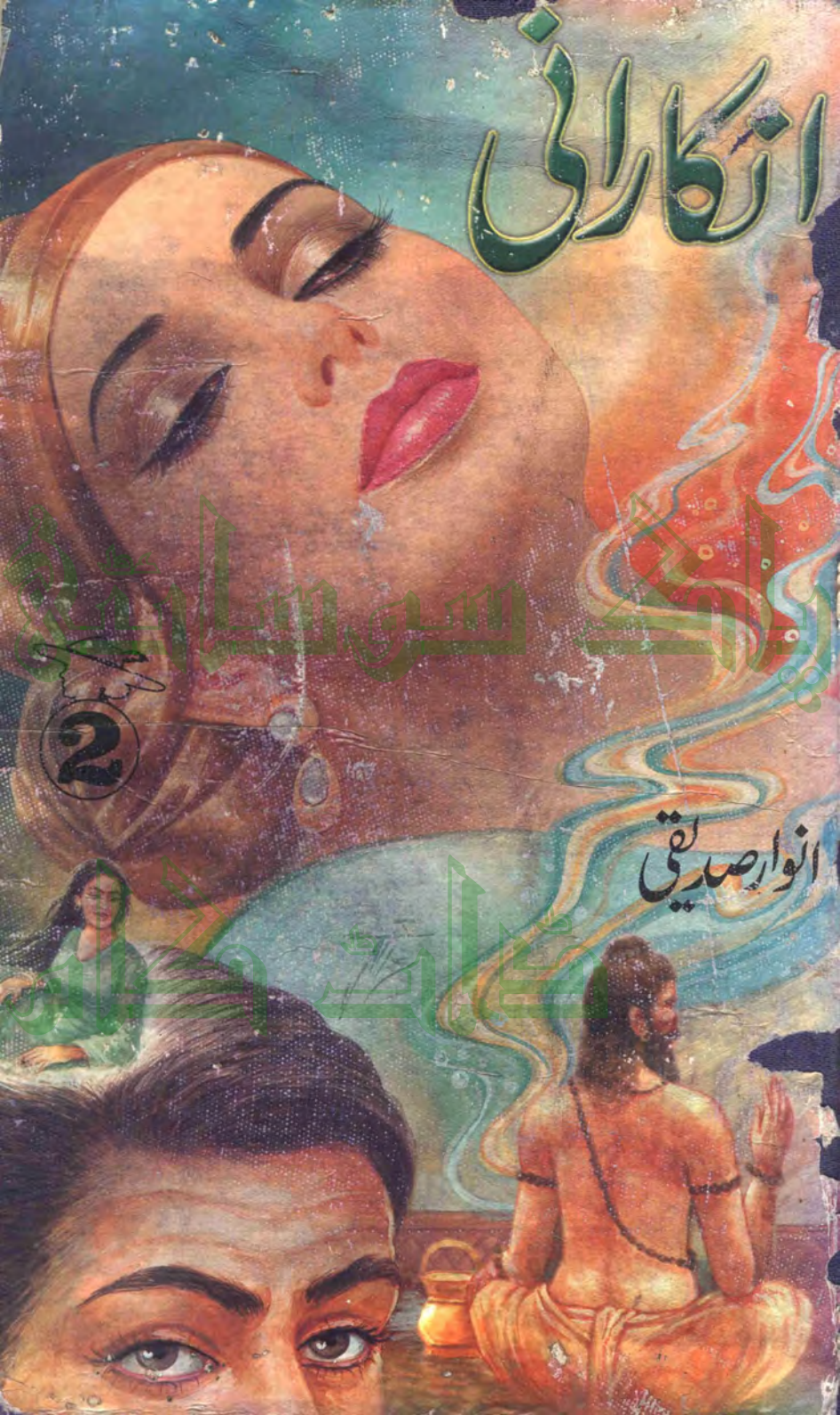


جیل احمد خان کی خوں چکاں داستان ابھی جاری ہے۔

بقیہ واقعات کے لئے جلد دوم کا مطالعہ کیجئے۔



# انکارانی



انوار صدیقی

2



وقت تھم کر رہ گیا، ہر شے منجمد ہو گئی، کتنا طویل سفر طے ہوا؟ مجھے کن کن راہوں سے گزرنا پڑا، کہاں روکا گیا؟ کتنے موڑ کاٹنے پڑے؟ میرے بارے میں جن لوگوں نے رُکا وہیں کھڑی کی تھیں، جال بچھائے تھے وہ خاموش تو نہیں رہے ہوں گے۔ روی شکر نے گرو کے ساتھ الجھنا مناسب نہیں سمجھا، خاموشی سے لوٹ گیا۔ لیکن ضروری نہیں تھا کہ دوسرے بھی گرو کو دیکھ کر سر جھکا لیتے، کچھ سر پھرے افسروں نے گرو کی بھی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی ہوگی، پنڈت پجاریوں کا ایک غول بھی میری تلاش میں اٹھ کھڑا ہوا تھا، وہ دُرگا دیوی کے پرستار تھے۔ دیوی کے مقابلے پر انہوں نے گرو کو گھاس نہیں ڈالی ہوگی۔ گرو مہان شستی رکھتا تھا، وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ میری خاطر اُس نے روی شکر کو بھی دھتکار دیا تھا، چھوٹے موٹے پنڈت پجاری اُس کے راستے کی دھول سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ پریم لال کا دوست تھا اسی لئے عین وقت پر میری مدد کو آ گیا تھا۔ وہ نہ آیا ہوتا تو روی شکر اور اُس کے گرگے میری تکہ بوٹی کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ دُرگا کے مندر میں میرے داخلے کے بہت سارے گواہ تھے۔ مجھے شکنجوں میں جکڑ دیا جاتا، پنڈت نول کشور کو خبر ملتی تو وہ بھی ہر دوڑ چھوڑ کر بمبئی آ جاتا۔ اُس کے دوسرے ساتھی بھی اکٹھا ہو جاتے۔ بمبئی کی شاہراہوں پر ٹریفک جام ہو جاتا، دُرگا کے چہیتے سڑکوں پر دھرنا جما کر بیٹھ جاتے۔ اُن کا ایک ہی نعرہ ہوتا۔ ”جیل احمد خان کو سرعام پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔“ عدالت بھی پجاریوں کے سیلابی ریلے کے آگے قدم نہ جما سکتی وہی ہوتا جو دُرگا کو منظور ہوتا۔

گرو نے مجھے واشگاف لفظوں میں سمجھا دیا تھا کہ دُرگا کی آواز نے مجھے اکیس روز کے لئے بے دست و پا کر دیا تھا۔ کوئی قوت میری مدد نہیں کر سکتی تھی، کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ دُرگا دیوی کے سامنے سر اٹھاتا۔ پریم لال کی آتما نے لندن کے ہسپتال میں مجھ سے عہد کیا تھا کہ کلدیپ کے نامکمل مشن کو پورا کرنے کے سلسلے میں وہ قدم بہ قدم میرا ساتھ

دے گا۔ لیکن دُرگا کے سراپ نے اُسے بھی سامنے آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ میری ساری قوتیں بھی چھن گئی تھیں، انکا پہلے ہی رُوٹھ کر سر سے اتر گئی تھی، گرو بھی نہ آتا تو کہانی ختم ہو جاتی، سارے جھگڑے منٹ جاتے۔

میرا ذہن تاریکی میں ڈوبا رہا، گرو کی مالا کے سوکھے پھول کی کڑواہٹ کا چٹکار تھا جس نے مجھے ہر فکر سے بے نیاز کر دیا۔ میں کتنی دیر بیہوشی کی کیفیت سے دوچار رہا؟ اس عرصے میں میرے اوپر کیا کیا مچتی؟ اس کے بارے میں شاید گرو ہی بہتر جانتا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ ایک نسوانی آواز نے مجھے دوبارہ ہوش میں آنے کا احساس دلایا تھا، میں اس آواز سے ناواقف تھا، مجھے وہ آواز کہیں دُور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

”مرلی سے بات ہوئی.....؟“ زندگی کا احساس دلانے والی اس کھنکٹی آواز نے کسی کو مخاطب کیا تھا۔

”لیس میڈم.....“ جواب میں ایک اور نسوانی آواز اُبھری۔ ”بات ہوگئی، لیکن وہ بہت زیادہ مصروف ہیں۔ واپسی میں سے لگے گا۔“

”تم نے اُسے بتایا تھا کہ میں بات کرنا چاہتی ہوں؟“ اس بار سوال کرنے والی کے لہجے میں غرور حسن بھی شامل تھا، اُس کی آواز میں تمکنت تھی، برتری کا احساس جھلک رہا تھا۔

”میں نے کہا تھا میڈم، لیکن.....“

”کیا جواب دیا مرلی نے؟“ اُس نے پوری بات سے بغیر جھلا کر دریافت کیا۔

”وہ ایک ضروری کام میں مصروف ہیں۔“

”کیا.....؟“ اُس کی آواز میں تکبر تھا۔ ”کیا وہ کام مجھ سے زیادہ ضروری ہے.....؟“

”میں دوبارہ کال کرتی ہوں میڈم۔“

”نہیں.....“ اُس نے پھنکارتے ہوئے تحکمانہ لہجہ اختیار کیا۔ ”کوئی ضرورت نہیں ہے اُسے کال کرنے کی..... اور سنو۔“ اُس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”اگر مرلی کا فون آئے، میرا پوچھتے تو کہہ دینا کہ میں مصروف ہوں، بات نہیں کر سکتی۔“

”اور اگر سراپ کی مصروفیت.....“

”شٹ اپ.....“ وہ جھلا گئی۔ ”سادھنا۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم اپنی اوقات بھولتی جا رہی ہو۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ تم میرے مقابلے میں مرلی کو.....“

”آئی ایم سوری میڈم۔“

”دگٹ لاسٹ.....“ جواب میں نفرت کا اظہار کیا گیا..... پھر

قدموں کی آواز اُبھر کر دُور ہوتی چلی گئی۔ دروازہ بند ہونے کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔

میرا ذہن آہستہ آہستہ جاگ رہا تھا، میری حس بیدار ہو رہی تھی، گرو کا ایک جملہ میرے

کانوں میں گونجا۔ اُس نے روی شکر کے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ میں ہوٹل سے

نکل کر جہاں گیا تھا وہیں موجود ہوں اور وہاں موجود ہونا ہی میری بے گناہی کا ثبوت بھی

ہے۔ اس وقت میں شاید اسی جگہ موجود تھا جس کا اشارہ گرو نے دیا تھا۔ وہی مجھے چھوڑ گیا ہو

گا، لیکن وہ ایسی کون سی جگہ تھی جو میرے لئے اتنی محفوظ ہو سکتی تھی؟

میرے ذہن میں گزری ہوئی باتیں ترتیب وار اُبھرنے لگیں۔ میں ذہنی جناسٹک میں

مصروف تھا جب بھیجی بھیجی خوشبو کا ایک معطر جھونکا میرے وجود کو گنگنانے لگا، مجھے احساس

ہوا جیسے کوئی میرے بہت نزدیک موجود ہے..... زندگی کے نشیب و فراز نے میری چھٹی حس

کو بڑا احساس بنا دیا تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں لیکن میں عالم تصور میں دیکھ رہا تھا کہ ایک

مغرور حسینہ میرے آس پاس کہیں منڈلا رہی ہے۔ وہ میرے ہوش میں آنے کی منتظر تھی۔

اُس کی بے چین نگاہیں میرے بند پپوٹوں کی ایک ایک جنبش کا جائزہ لے رہی ہوں گی۔

میں جہاں تھا وہاں میرے اور اُس کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ ہوتا تو اُس کی آواز بھی ضرور

سنائی دیتی۔ لیکن وہ کون تھی؟..... میں کہاں تھا.....؟ مرلی کون تھا.....؟

کئی سوالات میرے ذہن میں چکرانے لگے۔ میں نے آہستہ آہستہ کسمپاسا شروع کیا۔

کسی کی نرم گرم انگلیاں میری پیشانی پر حرکت کرنے لگیں۔ وہ انداز نفرت کا نہیں تھا،

میرے چہرے پر گرم گرم سانسوں کی مسور کن پیش اس بات کی دلالت کر رہی تھی کہ ایک

چہرہ میرے چہرے کے اوپر جھکا ہوا ہے..... اُس کے بدن کی سوندھی سوندھی خوشبو مجھے

گدگدا رہی تھی، اُس کی انگلیوں کا لمس مجھے بے چین کر رہا تھا۔

میں پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں، پھر پلکیں

بھپکا کر اُس چاند چہرے کو حیرت سے نکلنے لگا جو میری دسترس سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ میں

ذرا ہاتھ بڑھا کر شوخی کرتا تو سارے فاصلے پل بھر میں دُور ہو جاتے۔ وہ اس انداز میں جھکی

کھڑی تھی کہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکتی، میری آغوش میں ڈھیر ہو جاتی۔

حالات کے پیش نظر میں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ گرو نے بھی یہی تلقین کی تھی کہ اکیس روز تک میں اپنے پتکھ سمیٹ کر رکھوں، اُونچی اُڑان سے گریز کروں۔ میں نے نگاہوں کا زاویہ بدل دیا، میرے لئے وہ ماحول کسی طلسم خانے سے کم نہیں تھا۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُس حسین خوابگاہ کو دیکھنے لگا جس کی ایک ایک شے اپنا جواب آپ تھی۔ وہ کسی چھوٹے موٹے آدمی کی خوابگاہ نہیں ہو سکتی تھی، کسی راج محل کا ایک حصہ، ایک پُر سکون آرام گاہ محسوس ہو رہی تھی جسے قیمتی اشیاء، خوبصورت پینٹنگز، دبیز قالین اور حسین ساز و سامان سے آرائش دیا گیا تھا۔ میں جس مسہری پر لیٹا تھا وہ بھی بے حد آرام دہ تھی۔ لندن اور ہندوستان کے بڑے بڑے عالیشان ہوٹلوں کے کمروں کی سجاوٹ اور طلسمی ماحول نے بھی مجھے کبھی اتنا متاثر نہیں کیا تھا، میرے لئے لفظوں اور جملوں میں اس کا بیان ناممکن ہے..... رنگوں کا امتزاج، روشنیوں کے زاویے، ہر شے کا اُس کی مخصوص جگہ پر ہونا، سب کچھ ایک خواب سا لگ رہا تھا۔

”اتنے اچنبھے سے کیا دیکھ رہے ہو مہاراج.....؟“

میں اُس کی آواز سن کر چونکا، وہ اپنے بدن کو لوچ دیتی، لہراتی بل کھاتی میرے سامنے آ کر رک گئی، میری پلکوں نے جھپکنا بند کر دیا، میں اُس کے حسن کی رعنائیوں میں گم ہونے لگا۔ وہ کسی مصور کا خواب نظر آرہی تھی، کسی ماہر سنگ تراش کی ساری زندگی کا نچوڑ لگ رہی تھی جس میں قدرت نے رُوح پھونک دی تھی، اُسے اندر کے اکھاڑے کی اپسرائیں دیکھ لیتیں تو شرما کر سرنگوں ہو جاتیں، وہ کوئی حور تھی، کوئی پری تھی جو غلطی سے زمین پر اتر آئی تھی۔ اُس کے شریر کے ایک ایک انگ سے نفیگی پھوٹ رہی تھی۔ اُس نے جسم کی رنگت کی مناسبت سے لباس کا انتخاب بھی کیا تھا، لباس میں ہونے کے باوجود بے لباس بھی نظر آ رہی تھی۔ زلفوں کی گھنیری لٹیں اُس کے شانوں پر ناگوں کی طرح بل کھا رہی تھیں۔ مجھے بے اختیار مالا رانی یاد آ گئی..... وہ ہوشربا منظر دوبارہ آنکھوں میں گھوم گیا جب میں نے اُسے میسور کی پہاڑیوں میں ایک جھرنے پر سر تا پا عریاں غسل کرتے دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا وہ منظر میری زندگی کا حاصل تھا، میں دوبارہ کبھی اتنے حسین حادثے سے دوچار نہیں ہوں گا۔ لیکن مجھے اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ خواب گاہ میں موجود وہ کافر ادا حسینہ بھی مالا رانی سے کم نہیں تھی۔ میں محو ہو کر رہ گیا۔

”مہاراج، تم نے اپنی داسی کو پہچانا نہیں.....؟“ اُس کی آواز کا ترنم دوبارہ سنائی دیا تو میں سنبھل گیا۔

”تم.....؟“ میں نے کچھ کہنا چاہا، میری آواز کپکپا کر رہ گئی۔

”میں سروجنی ہوں مہاراج..... تمہارے چرنوں کی دُھول۔“

میں سروجنی کا نام سن کر چونکا۔ مجھے وہ سر پھرا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس یاد آ گیا جو مجھے جہاز پر مرنے والے اشوک نامی مسافر کے سلسلے میں مشکوک سمجھ کر تفتیش کی خاطر دوسرے افراد کے ساتھ اپنے دفتر لے گیا تھا۔ انکا نے وہیں مجھے پہلی بار سروجنی اور ڈپٹی کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا تھا۔ میں نے انکا کی فراہم کردہ معلومات سے فائدہ اٹھا کر ڈپٹی کو حیران کر دیا، وہ میرا بے دام غلام بن گیا تھا۔ اس وقت میں شاید چوپائی میں اُسی کے اپارٹمنٹ میں تھا جس کا ذکر انکا نے کیا تھا۔

میں سروجنی کو زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا لیکن اُس کا التفات، اُس کی گفتگو کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مجھے برسوں سے جانتی ہے۔ معا میرے ذہن میں انکارانی کا تصور ابھرا۔ میں دل ہی میں مسکرا دیا۔ وہ ذہنوں کو پلٹ دینے کی حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک تھی لیکن اُس کے لئے اُس کا مطلوبہ شخص کے سر پر ہونا لازم تھا۔ میں سمجھ گیا کہ سروجنی کے سر پر اس وقت میری انکارانی مسلط تھی۔ سروجنی کی زبان سے وہی الفاظ ادا ہو رہے تھے جو انکا چاہ رہی تھی۔ گرو نے اگر مجھے سروجنی کے اپارٹمنٹ پر پہنچا دیا تھا تو اس میں بھی اُس کی کوئی خاص مصلحت ضرور کارفرما ہوگی۔ انکا مجھے بتا چکی تھی کہ ڈپٹی کی پہنچ سروجنی کی وجہ سے بہت اُوپر تک تھی۔ وہ اپنے تعلقات کے بل بوتے پر اپنے افسروں کو بھی کسی قطار شمار میں نہیں گردانتا تھا۔ آفس میں شیر بنارہتا تھا لیکن گھر پر سروجنی کو لکشی سمجھ کر اُس کے تلوے چاٹنے کو بھی اپنے لئے اعزاز سمجھتا تھا۔

”سروجنی، ڈپٹی کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔“ انکارانی نے مجھے یہی بتایا تھا۔

میں سروجنی کو سر تا پا دیکھتا رہا۔ وہ حقیقتاً پرسش کے قابل تھی۔ نہ ہوتی تب بھی اس وقت اس کی خوابگاہ میرے لئے سب سے زیادہ محفوظ ترین پناہ گاہ تھی۔ گرو نے تمام اُونچ نیچ سوچنے سمجھنے کے بعد ہی میرے حق میں کوئی فیصلہ کیا ہوگا، ممکن ہے انکا بھی یہی چاہتی ہو، میرے لئے بھی حالات کے پیش نظر تاج ہوٹل واپس جانا مناسب نہیں تھا۔ میرے ذہن

میں بہت سارے سوالات اُبھر رہے تھے۔ سروجنی میری مشکل حل کر سکتی تھی۔

”مرلی کہاں ہے.....؟“ میں نے اُسے ٹٹولنے کی خاطر اندھیرے میں تیر چلایا۔

”تم شاید بھول گئے مہاراج.....“ سروجنی کرسی کھینچ کر میرے قریب بیٹھ گئی۔ ”ریشم کا یہ نام تم ہی نے پیار سے رکھا تھا۔“

مجھے وہ نیم پلیٹ یاد آگئی جو ڈپٹی کے کمرے کے باہر لگی تھی، اُس پر ریشم کھنا لکھا تھا۔ سروجنی گھر پر اُسے مرلی کے نام سے یاد کرتی تھی، میں نے مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی، اگر ریشم ہی کا نام مرلی تھا تو پھر سروجنی کو اُس کی لے پر ناچنا چاہئے تھا، جبکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔

”وہ گھر پر نہیں شاید.....؟“ میں نے سنجیدگی برقرار رکھی۔

”میں نے اُسے فون کیا تھا لیکن وہ کسی اہم کام میں مصروف ہے.....“ سروجنی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”اہم کام.....“ میں نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں کہا۔ ”دوسروں کی طرح وہ بھی بھٹکتا پھر رہا ہے۔“

”میں سمجھی نہیں مہاراج.....؟“ سروجنی نے یلخت پہلو بدل کر مجھے ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔

”وہ گھر سے کب گیا تھا.....؟“ میں نے سروجنی کو کریدنا شروع کیا۔

”سناڑھے آٹھ بجے۔“ اُس نے کہا۔ ”سادھنا بتا رہی تھی کہ دفتر سے کوئی ضروری فون آیا تھا۔“

”سادھنا.....؟“

”میری سیکرٹری کا نام ہے۔“

”کیا مرلی کو میرے آنے کی خبر نہیں ہے؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

”آپ رات کو تھکے ماندے آئے تھے مہاراج، ٹھیک سے بھوچن بھی نہیں کیا تھا۔“

سروجنی کہتی رہی۔ ”مرلی دیر سے واپس آیا تھا، میں نے آپ کی نیند خراب کرنے کی غلطی نہیں کی، میں نے سوچا تھا کہ صبح جب وہ آپ کو اچانک دیکھے گا تو خوشی سے اُچھل پڑے گا لیکن اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ صبح میں آپ کے کمرے میں تھی جب مرلی دفتر چلا گیا۔“

”صبح سے ابھی تک اُس کا کوئی فون نہیں آیا.....؟“

”نہیں مہاراج، لیکن آپ.....“

”تم نے برا کیا.....“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تمہیں مرلی

کورات ہی میرے آنے کی خبر کر دینی چاہئے تھی۔“

”بات کیا ہے.....؟“ سروجنی نے میرے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھتے ہوئے بے

چینی کا اظہار کیا۔ ”آپ کچھ یا کل معلوم ہوتے ہیں۔“

”تو نہیں سمجھ سکے گی۔“ میں گنہگار لہجے میں بولا۔ ”مرلی اور تیری بھلائی کی خاطر مجھے

یہاں سے جانا ہوگا۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے مہاراج؟“ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”اتنے عرصے بعد تو آپ

کے درشن ہوئے ہیں، ابھی تو ہم نے آپ کی کوئی سیوا بھی نہیں کی اور آپ جانے کی بات کر

رہے ہیں۔ ہم سے غلطی میں کوئی بھول ہوگئی ہو تو شاکر دیجئے۔“

میں نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، سروجنی نے کہا تھا کہ میں رات سے اُس کا مہمان

تھا، یہ بات میرے حق میں جاتی تھی۔ لیکن ریشم کھنا یا مرلی کو اس کی خبر نہیں تھی۔ میرے

ذہن میں اتھل پتھل شروع ہوگئی۔ اگر مرلی بھی رومی شکر کی اس ٹیم میں شامل تھا جو مجھے

تلاش کرتی پھر رہی تھی تو پھر اس کی بات میں کوئی وزن باقی نہ رہتا، اس کی گواہی کو اور بھی

بہت سارے نام دیئے جاسکتے تھے۔ بات اگر کسی عام آدمی کے قتل کی ہوتی تو شاید معاملہ اتنا

سنگین نہ سمجھا جاتا، مرلی کا بیان تسلیم کر لیا جاتا۔ لیکن دو بڑے دھرماتماؤں کا خون معمولی

بات نہیں تھی، کالی داس اور اوم پرکاش کا شمار چھوٹے موٹے پنڈت پجاریوں میں نہیں ہوتا

تھا، اس کے علاوہ دُرگا کی آواز مندر میں موجود تمام دیو داسیوں، پجاریوں اور دیگر لوگوں

نے بھی ضرور سنی ہوگی، گردنے بھی دبی زبان میں یہی کہا تھا کہ میں نے دُرگا کو لاکر غلطی

کی تھی۔ لیکن اُس نے رومی شکر سے میری موجودگی میں یہ بات بھی بڑے ٹھوس لہجے میں کہی

تھی کہ میں جہاں ہوں، وہاں میرا ہونا ہی میرے بے قصور ہونے کا ثبوت ہے۔

میں ابھی اسی شش و پنج میں گرفتار تھا کہ ایک اور حسینہ کمرے میں داخل ہوئی، اُس کے

ہاتھ میں فون دیکھ کر میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ سادھنا ہو سکتی ہے۔ میرا قیاس غلط

نہیں تھا، سروجنی کے چہرے پر اُبھرنے والے ناخوشگوار تاثرات اس بات کی غمازی کر

رہے تھے کہ اُسے سادھنا کی مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔  
 ”میڈم.....“ سادھنا نے جوشن بھانپ کر بڑی کمزور آواز میں کہا۔ ”سر کی کال ہے۔“  
 ”میں نے تمہیں کوئی حکم دیا تھا.....؟“ سروجنی اپنے غصے کے اظہار پر قابو نہ رکھ سکی، وہ  
 قہر آلود نظروں سے سادھنا کو گھور رہی تھی۔

”آئی ایم سوری میڈم، لیکن.....“ سادھنا نے بڑی معصومیت سے اپنی حیثیت کا  
 احساس دلانے کی کوشش کی۔

”اچھا ہوا جو اُس کا فون آگیا.....“ میں نے سادھنا کی مشکل حل کرنے کی خاطر سنجیدگی  
 سے کہا تو سروجنی بل کھا کر رہ گئی۔ اُس نے سادھنا کو قریب بلا کر فون اُس کے ہاتھ سے  
 جھپٹ لیا، پھر ہاتھ کے اشارے سے اُسے واپس جانے کا حکم صادر کرتے ہوئے بڑے  
 زور کے انداز میں گفتگو کی ابتداء کی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی پالتو کتے کو اس کی غلطی پر  
 سرزنش کر رہی ہو۔

میں سروجنی کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ لگا تا رہا۔ میری موجودگی کے سبب وہ  
 بڑی رعایت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اُس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ دوسری طرف سے بولنے  
 والا مرلی کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اُس نے گفتگو کے دوران میری موجودگی کی اطلاع بھی  
 دی، پھر دوسری جانب سے جو کچھ کہا گیا اسے بہت غور سے سنتی رہی۔ اُس کے چہرے پر  
 ایک رنگ آ رہا تھا، ایک چارہ تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر  
 قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”مرلی.....“ اچانک وہ بل کھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے بڑے سرد مگر ٹھوس لہجے میں  
 کہا۔ ”تم ابھی رومی سے رابطہ قائم کرو۔ اُسے کہو کہ مہاراج کل رات سے ہمارے مہمان  
 ہیں..... تم اگر رومی کی ٹیم میں شامل ہوتے تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ میں جانتی ہوں کہ اُس  
 ذی آئی جی کے بچے کی کیا اوقات ہے، اُسے میرا نام لے کر کہو کہ زیادہ ہیر و ہننے کا دھیان  
 من سے نکال دے ورنہ سڑکوں پر بھیک مانگتا نظر آئے گا..... فون پر بحث مت کرو، گھر آ  
 کر بات کرنا..... ہاں، میں مہاراج کے پاس ہوں۔“

سروجنی نے فون بند کر کے نفرت سے ایک طرف پھینک دیا۔ میں اُس کے تیور دیکھ رہا  
 تھا، روی شکر کا نام درمیان میں آنے کے بعد مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی

کہ مرلی کو بھی حالات کا علم ہو چکا ہے۔ انکارانی نے سروجنی کے بارے میں جو معلومات  
 فراہم کی تھیں وہ حرف بہ حرف درست تھیں۔ اُس کی پہنچ دُور تک نہ ہوتی تو شاید وہ کسی برسر  
 اقتدار ذی آئی جی کے لئے وہ الفاظ کبھی استعمال نہ کرتی جو میں اپنے کانوں سے سن چکا تھا۔  
 میں نے کچھ سوچ کر اُسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اُس کا غصہ کا فور ہو گیا، ہنستی مسکراتی  
 میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے گداز جسم کا لمس میری قوت برداشت کو آزمانے لگا۔  
 میرے ذہن میں کن کھجورے کلبلانے لگے۔ یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی کہ وہ ایک آبرو  
 باختہ حیدہ تھی، جس نے اپنے جوان جسم کی گرمی سے بڑے بڑے کارآمد لوگوں کے دلوں کو  
 پگھلایا ہوگا، اپنی کافر اداؤں کے سحر میں مبتلا کر کے اپنا غلام بنایا ہوگا، اُس کی پہنچ دُور دُور  
 تک ہوگی، اُس کی باتوں سے مجھے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اُس نے کچی گولیاں نہیں کھیلی  
 ہوں گی۔ اُس نے جن بڑے لوگوں کو نوازا ہوگا، اُن کی کمزوریاں بھی ضرور اپنی مٹھی میں  
 رکھی ہوں گی۔ روی شکر کیا بیچتا تھا، سروجنی کے ترکش کا ایک تیر حکومت کے اہم ستونوں کو بھی  
 لرزہ بر اندام کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا تھا، وہ ایک طاقتور مقتناطیس تھی جس کی کشش  
 کے سامنے بڑے بڑے سورما بھی پانی بھرنے پر آمادہ ہو سکتے تھے، اُس کی آنکھوں میں جادو  
 تھا، اداؤں میں بانگین تھا، اُس کے قرب میں وہ نشہ تھا جو انسان کو عقل و خرد سے بیگانہ کر  
 دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اُس کی نگاہ غلط انداز میں وہ میٹھا زہر تھا جو جنس مخالف کو  
 مفلوج کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ حشر بد اماں اس وقت میری دسترس میں تھی، انکا  
 رانی کی لازوال قوتوں نے اُسے میرے حق میں موم بنادیا تھا۔

میں نے سروجنی کا ہاتھ تھام کر آنکھیں بند کر لیں۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اپنی روحانی  
 قوتوں کے ذریعے عرش پر پرواز کر رہا ہوں۔ حقیقت اس کے برعکس تھی، میں اپنے پریشان  
 ذہن کو اُس کے جسمانی رابطے کے ذریعے پُر سکون رکھنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ مجھے  
 اپنے ارادے میں ناکامی نہیں ہوئی، سروجنی کے پُرکشش ہاتھوں کی لذت انگیز تپش میرے  
 اعصاب کو سکون پہنچانے میں بڑی موثر ثابت ہو رہی تھی۔ میں تا دیر خوابوں میں گم رہا تو  
 سروجنی کی مترنم آواز میرے کانوں میں گونجی۔

”کہاں گم ہو گئے مہاراج.....؟“ شاید اُس کے تجربے نے میری محویت کا راز بھانپ  
 لیا تھا۔



”تو..... تو چتا مت کر.....“ میں نے سنبھل کر اُسے فریب میں مبتلا کرنے کی کوشش کی۔ ”میرے من کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟ وہ سر پھرے مجھے کھوجنے کی خاطر ادھر ادھر کی خاک اڑاتے پھر رہے ہیں، مجھے پھانسنے کی خاطر سڑکوں پر جال ڈالے بیٹھے ہیں۔ میں چاہوں تو انہیں اندھا کر سکتا ہوں۔ وہ تمام زندگی ہاتھ ملتے رہیں تب بھی مجھے تلاش نہیں کر سکتے۔ لیکن میں نے کچھ اور سوچا ہے.....“

”تم نے کیا سوچا ہے مہاراج.....؟“ سروجنی نے پہلو بدل کر سوال کیا۔

”میں خود چل کر اُن کے پاس جاؤں گا۔“ میں نے زہر خند سے جواب دیا۔ ”اپنی وجہ سے میں تمہیں اور مرلی کو کسی مصیبت میں نہیں گرفتار ہونے دوں گا، اپنے ہاتھوں سے لگائے پودوں کو کون برباد کرتا ہے؟“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”ہمارے ہوتے ہوئے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم نے جو بیج بویا تھا وہ اب تناور درخت کا روپ دھار چکا ہے، مجھے سیوا کا سونے دو مہاراج۔ بچارن کے ہوتے ویوتا پر کوئی آنچ آئے، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اپنی داسی پر وشواس کرو، پوری سمیٹی کی پولیس مل کر بھی تمہارے اوپر ہاتھ ڈالنے کی غلطی نہیں کر سکتی....“

”مرلی گھبرا جائے گا.....“ میں نے سروجنی کو اور پکا کرنے کی خاطر سنجیدگی سے کہا۔

”میں اُس کی راہ میں کانٹے نہیں بکھیرنا چاہتا۔ تو میری فکر مت کر، ابھی وہ مورکھ لوگ میری قوت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ ذات پات کے چکر میں الجھ کر مجھے نیچا دکھانے کے سنے دکھا رہے ہیں، ان کا انجام خطرناک ہوگا، میں ڈھیل دے رہا ہوں، وہ اسے میری کمزوری سمجھ کر غزا رہے ہیں۔ جس دن میں نے دھول کی ایک چٹکی بھر کر اُن کی سمت اُچھال دی اُس دن انہیں بھاگے راستہ نہیں ملے گا۔ سب ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔“

”میں جانتی ہوں مہاراج، پرنتو تمہیں میری بنتی مانی پڑے گی۔“ وہ کافر ادا حسینہ مجھم التجا بن گئی۔ ”جیون میں کیول ایک بار اپنی داسی کو بھی سیوا کرنے کا موقع دو، میں تمہیں نراش نہیں کروں گی۔“

”مرلی کو آ لینے دے.....“ میں نے تھوڑے توقف سے کہا۔ ”دیکھیں، وہ کیا کہتا ہے؟“

”وہ میرے ہوتے کیا کہے گا.....“ سروجنی مسکرا کر بولی۔ ”تم میری بنتی سو بیکار کرلو، میں وچن دیتی ہوں کہ تمہارے دشمنوں کو تم تک پہنچنے سے پیشتر میری لاش سے ہو کر گزرنا ہوگا۔“

میں نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ میرے لئے گرو کی بات پر عمل کرنا ضروری تھا، اُس نے کہا تھا کہ دُرگا کا عتاب اکیس روز تک میرے اوپر بھاری رہے گا، میری اپنی قوتیں بھی پراسرار طور پر میرا ساتھ چھوڑ چکی تھیں، پر-تم لال کی آتما نے بھی دُرگا کی شستی سے نکرانے کا خیال دل سے نکال دیا ہوگا، اسی لئے سامنے نہیں آیا تھا۔ مجھے اکیس روز تک صبر سے کام لینا ضروری تھا۔ ماضی میں جلد بازی کا مظاہرہ کر کے میں بہت کچھ گنوا چکا تھا۔ حماقتوں کو دہرانا دانشمندی کے منافی ہوتا۔ میرے لئے گرو نے جس ٹھکانے کا انتخاب کیا تھا میں اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، اسی میں میری بہتری تھی۔

”تمہیں میری سوگند.....“ سروجنی کی آواز میرے کانوں سے نگرائی۔ ”کسی دبدھا میں من کو بے چین مت کرو، مجھے وچن دو مہاراج کہ تم داسی کو نراش نہیں کرو گے، ایک بار مجھے بھی سیوا کا ادھیکار بھیک دے دو۔“

میں نے آنکھیں کھول دیں، سروجنی کی آنکھیں نمناک دیکھ کر میں تڑپ اُٹھا۔ میں نے اس حسن مجسم کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لینے کا ارادہ کیا۔ وہ اگر داسی تھی تو پھر دیوتا کو اُس پر پورا پورا حق حاصل تھا، جذبات طوفان کی شکل اختیار کر لیں تو پھر پاپ اور پن کے بکھیڑوں میں کون پڑتا ہے؟ میں نے بھی اپنے ارادے کی تکمیل کی خاطر پیش قدمی میں پہل کرنے کی ٹھان لی۔ انکا سروجنی کے سر پر تھی، سروجنی میرے قدموں میں اپنی جوانی کی بھینٹ چڑھانے میں کسی پس و پیش کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن میرا حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی.....

مرلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ میں نے پھرے ہوئے جذبات پر قابو پانے میں بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا، سروجنی بدستور مسہری پر میرے قریب بیٹھی رہی۔ کچھ دیر تک مرلی میری آمد پر اپنی خوشی کا اظہار کرتا رہا، پھر اُس نے میرے استفسار پر جو کہانی سنا دی وہ میرے اندازے سے مختلف نہیں تھی۔

”بات اب پولیس کی حد سے بھی تجاوز کر چکی ہے، پنڈت پجاری اور سادھوؤں نے تھانوں کا گھیرؤ شروع کر دیا ہے، وہ ایک ہی راگ الاپ رہے ہیں کہ مجرم کو گرفتار کر کے سب کے سامنے پھانسی پر لٹکایا جائے۔ دوسری کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہیں.....“

”وہ کے مجرم سمجھ رہے ہیں.....؟“ میرے بجائے سروجنی نے ہونٹ چباتے ہوئے

سوال کیا۔

مرلی نے ڈرتے ڈرتے میری طرف اشارہ کیا، زبان سے میرا نام لینے کی ہمت نہ کر سکا۔  
 ”اُن کے پاس کیا ثبوت ہے کہ مہاراج دوشی ہیں؟“ سروجنی تمللا کر اُنھ کھڑی ہوئی۔  
 ”تم نے روی شکر سے بات کی؟ کیا تم نے اُسے بتایا کہ مہاراج کل رات سے ہمارے  
 مہمان ہیں؟ کیا جواب دیا روی نے؟“

”اُس نے میری بات سننے سے انکار نہیں کیا، لیکن کالی داس اور پنڈت اوم پرکاش کی  
 ااشوں نے پنڈت پجاریوں کو دیوانہ کر دیا ہے۔ باہر نکل کر دیکھو، زندگی کے سارے کاروبار  
 ٹھپ ہو گئے ہیں۔ ہر طرف آگ بھڑک رہی ہے، حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے  
 ہیں۔“ مرلی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”دُرگا کے مندر میں اوم پرکاش کی موت  
 کے بعد ایک آواز ابھری تھی جس نے جمیل احمد خان مہاراج کا نام لے کر کہا تھا کہ مہاراج  
 نے دُرگا دیوی کی مہان شمتی کو لاکار کر اچھا نہیں کیا، وہ آواز دُور دُور تک سنائی دی تھی۔  
 پنڈت پجاریوں کا کہنا ہے کہ دُرگا کی آواز ہی سب سے بڑا ثبوت ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا دُرگا دیوی اتنا بڑا جھوٹ بول سکتی ہے؟“ سروجنی نے مرلی  
 سے مخاطب ہو کر کہا۔ پھر وہ میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ”تاج ہوٹل کے  
 منیجر نے کل رات مہاراج کے آنے سے پہلے مجھے فون کیا تھا۔ اس کے علاوہ پرتھوی بھی گواہ  
 ہے جو مہاراج کو ہوٹل سے یہاں لایا تھا۔ کیا یہ دونوں ثبوت مہاراج کو نزدوش ثابت کرنے  
 کے لئے کافی نہیں ہیں؟“

”مجھے تمہاری باتوں پر دوشواس ہے، میں بھی مہاراج کو دوشی نہیں سمجھ رہا۔ لیکن اس سے  
 کسی سے کوئی بات نہیں کی جاسکتی۔“ مرلی نے بے بسی کا اظہار کیا۔ ”روی شکر نے وچن دیا  
 ہے کہ وہ اس طرف آنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ لیکن وہ اور اُس کے ساتھی ابھی تک مہاراج  
 کو کوئے کھدروں میں کھوجتے پھر رہے ہیں۔“

”پرتھوی کہاں ہے....؟“ میں نے پورے حالات سننے کے بعد مرلی سے دریافت کیا۔  
 ”تم پریشان مت ہو مہاراج.....“ سروجنی نے جواب دیا۔ ”پرتھوی تمہیں پھوڑ کر  
 واپس ہوٹل چلا گیا تھا، وہ اپنا آدمی ہے۔ پرکھا ہوا بندہ ہے۔ مر جائے گا لیکن اپنے بیان  
 سے نہیں پھرے گا۔“

”میرے سوا وہ کچھ اور بھی لایا ہوگا.....؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوال کیا۔  
 میرے ذہن میں سید مجذوب کی متبرک لالھی کا خیال کلبلا یا تھا۔ گرو نے یقین دلایا تھا کہ وہ  
 لالھی بچھل جائے گی، میرے علاوہ کسی اور کے کام نہیں آسکے گی۔

میرے سوال کے جواب میں سروجنی نے سید مجذوب کی لالھی لا کر مجھے پیش کی تو میرا  
 دل ایک انسانی مسرت سے سرشار ہو گیا۔ میری آنکھوں میں اُمید کی کرنیں چمکنے لگیں۔

”کیا بات ہے مہاراج؟“ سروجنی نے میری خوشی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہ  
 لالھی تمہیں بہت پیاری ہے.....؟“

”تو ان بھیدوں کو نہیں سمجھ سکے گی۔“ میں نے اُسے ٹالنے کی خاطر جواب دیا۔ پھر مرلی  
 سے بولا۔ ”تیرا کیا خیال ہے؟ کیا پنڈت اور پجاری میری گرفتاری کے بنا اپنی ہٹ سے باز  
 آجائیں گے؟“

”میں دوشواس سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ مرلی نے پہلو بدل کر کہا۔ ”ابھی کوئی بھی یقین  
 سے نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوگا۔ جہاں دھرم کی بات آجائے وہاں قانون کی شمتی بھی بے بس ہو  
 جاتی ہے۔“

”اگر پولیس کے کارندے یہاں تک پہنچ گئے تو.....؟“ میں نے لالھی پر اپنی گرفت  
 مضبوط کرتے ہوئے سوال کیا۔

مرلی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اُس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی اس سوال پر شیشا جاتا۔  
 ”وہ اگر یہاں تک آ بھی گئے تو انہیں خالی ہاتھ واپس جانا ہوگا۔“ سروجنی نے بڑے  
 یقین سے کہا۔ ”میں نے تمہیں وچن دیا ہے مہاراج، وہ میری زندگی میں تمہارے اوپر ہاتھ  
 ڈالنے کی ہمت نہیں کر سکیں گے۔“

میں سمجھ رہا تھا کہ سروجنی کی زبان سے انکارانی کے جیسے ادا ہو رہے ہیں۔ لیکن میں اس  
 بات سے بھی واقف تھا کہ دیوی دیوتاؤں کے معاملے میں انکا بھی میری کوئی مدد نہیں کر  
 سکے گی۔ مجھے پریتم لال یاد آ گیا، اُس نے لندن کے ہسپتال میں سید مجذوب کی لالھی دیکھ کر  
 کہا تھا اس میں طاقت کے ہزاروں خزانے پوشیدہ ہیں مگر میرے استفسار کے باوجود اُس  
 نے کچھ بتانے سے گریز کیا تھا۔ میں بدری نرائن کے سلسلے میں لالھی کی کچھ کرامات دیکھ چکا  
 تھا۔ اس متبرک لالھی نے امر لال کا منڈل توڑ دیا تھا۔ بدری نرائن بھی اس لالھی کے وار

کے بعد بلبلانے لگا تھا۔ اور بھی کئی واقعات میرے ذہن میں ابھر رہے تھے۔

گرو نے سروجنی کے اپارٹمنٹ کو میرے لئے محفوظ سمجھا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ میں اکیس روز تک اپنے کانپ ٹھڈے قابو میں رکھوں ورنہ کسی جنجال میں پھنس جاؤں گا۔ لیکن اگر پنڈت پجاریوں کا ریلادہاں آجاتا تو وہی اپارٹمنٹ میرے لئے چوہے دان بھی بن سکتا تھا۔ میں مختلف زاویوں سے درپیش صورت حال کا جائزہ لیتا رہا۔ گرو نے خلاف توقع عین وقت پر آکر مجھے پولیس ٹریپ سے بچالیا تھا، اُس نے میرا ہاتھ پکڑا تو پولیس والے اندھے ہو گئے۔ سرچ لائٹ کی تیز روشنیاں بھی میری تلاش میں ناکام ہو گئیں۔ وہ بے خبر ہوتا تو سامنے کیوں آتا؟ ”عین ممکن ہے کہ اس وقت بھی وہ کہیں اطمینان سے بیٹھا میری بوکھلاہٹ کا تماشا دیکھ رہا ہو.....“ میں نے سوچا۔ ”وہ پریم لال کا دوست ہونے کے ناطے میری مدد کر رہا تھا، مجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا، میری حفاظت کے لئے اُس نے یقیناً کچھ انتظامات ضرور کئے ہوں گے۔ اگر وہ مجھے ہاتھ تھام کر دوسروں کی نظروں سے اوجھل کر سکتا تھا تو سروجنی کے اپارٹمنٹ کے راستے میں ایسی رکاوٹیں بھی کھڑی کر سکتا تھا جن کا عبور کرنا میرے دشمنوں کے لئے آسان نہ ہوتا۔“

میں خیالات میں غرق تھا کہ معا ایک سوال بجلی بن کر میرے ذہن میں کوندا..... ”دُرگا کی آواز نے اگر اکیس روز تک مجھے مفلوج رکھنے کی خاطر تمام راستے بند کر دیئے تھے تو پھر گرو پر اس کا اطلاق کیوں نہیں ہوا؟ کیا گرو کو کسی خاص وجہ سے چھوٹ دی گئی تھی؟ اس رعایت کی پشت پر کیا مصلحت کا فرما تھی.....؟“

”تم کیا سوچ رہے ہو مہاراج.....؟“ مرلی نے پوچھا۔ ”کس بات کی چتا تمہیں پریشان کر رہی ہے.....؟“

”میری ایک بات مانے گا بالک.....؟“ میں نے مرلی کو سنجیدگی سے مخاطب کیا۔ سید مجذوب کی لاشی میں نے پوری مضبوطی سے تھام رکھی تھی۔

”تم حکم دو مہاراج.....“

”تو اپنے کسی واقف کار پولیس آفیسر کو فون کر کے یہاں بلا لے۔“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”یہ..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو مہاراج.....؟“ سروجنی نے احتجاج کیا۔ ”کیا تمہیں مجھ پر

یا مرلی پر بھروسہ نہیں ہے.....؟“

”بھروسہ نہ ہوتا تو اس وقت میں یہاں نہ ہوتا.....“

”پھر..... تم پولیس کو بلانے کی بات کیوں کر رہے ہو.....؟“

”تو نہیں سمجھ سکے گی سروجنی.....“ میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”میرا کہا مان لے، اسی

میں ہم سب کی بھلائی ہے۔“

”دو چار دن اور رُک جاؤ مہاراج، اس کے بعد کوئی آخری فیصلہ کرنا۔“ مرلی نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اس سے دُرگا کی آواز نے پنڈت پجاریوں کو اشتعال دلا رکھا ہے، وہ پاگل ہو رہے ہیں۔ تمہاری ایک جھلک دیکھ کر اُن کا جنون اور بھڑک اُٹھے گا۔ وہ مارنے اور مرجانے پر تلے بیٹھے ہیں، کسی کی بات نہیں سنیں گے، ذرا آگ سرد ہو جائے، پھر کچھ سوچنا.....“

”مجھے اپنے سے زیادہ تم دونوں کا خیال ہے۔“ میں نے انہیں ایک امکانی پہلو سے آگاہ کرنا چاہا۔ ”جہاں سوال زندگی اور موت کا آجائے وہاں انسان زندگی کو موت پر ترجیح دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، یہی مجبوری اُسے زبان کھولنے پر آمادہ کرتی ہے۔ فرض کرو، وہ پرتھوی پر یلغار کر دیں؟ اُس کے گلے پر خنجر رکھ کر سچ اُگنے کو کہیں؟ تاج ہوٹل کا میجر بھی میری یا تمہاری خاطر دیدہ و دانستہ موت کے کنوئیں میں چھلانگ نہیں لگائے گا، سچ جان لینے کے بعد وہ اور بپھر جائیں گے، تمہارے اس پُر سکون آشیانے کی ایک ایک تیلی اُن کی دیوانگی سے جل کر راکھ ہو جائے گی۔ وہ پوری عمارت کو کھنڈر بنا دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ تم نے اگر مجھے حوالات تک پہنچا دیا تو تمہاری وفاداری پر کوئی حرف بھی نہیں آئے گا، میں بھی محفوظ ہو جاؤں گا۔ لیکن..... تمہیں میری ایک شرط ماننی ہوگی۔“

”وہ کیا.....؟“ مرلی نے بڑی مُردہ آواز میں دریافت کیا۔

”یہ لاشی میرے ساتھ رہنے دی جائے.....“

”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے.....؟“ مرلی کسمسانے لگا۔

”تم ایک طرف ہو جاؤ مرلی.....“ سروجنی پھر کر بولی۔ ”یہ اپارٹمنٹ میرے نام ہے،

میری راج سبھا میں کیول میرا حکم چلے گا، تمہیں میرے اور مہاراج کے درمیان بولنے کا کوئی

ادھیکار نہیں ہے۔“

”شانت رہو سروجنی.....“ میں نے اُس کے بگڑتے تیور دیکھ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔  
 ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تیرے اندر سمندر کی بھری ہوئی لہریں سر اُبھار رہی ہیں۔ لیکن تو ابھی نادان ہے، کل کیا ہونے والا ہے؟ تو نہیں جانتی۔ میری بات مان لے، مجھے یہاں سے چلا جانے دے۔“

”میں جانتی ہوں مہاراج کہ تم مہان شکتیوں کے مالک ہو، میرے مقابلے میں تمہارا تجربہ بھی زیادہ ہے۔ تم بخوش میں جھانک سکتے ہو، تمہاری آگیا کا پالن کرنا میرا دھرم ہے۔ میں وچن دیتی ہوں کہ جیون میں پھر کبھی تم سے کوئی غنی نہیں کروں گی۔ لیکن آج تمہیں اپنی پجارن کا کہا ماننا ہوگا۔ آج تم نے تراش کر دیا تو میرا دل ٹوٹ جائے گا.....“

”سروجنی.....“ میں نے کچھ کہنا چاہا، اُس نے میری بات کاٹ دی۔  
 ”نہیں مہاراج..... نہیں۔“ اُس نے ہاتھ جوڑ لئے، میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ ”آج اپنی داسی کو کوئی حکم نہ دو، مجھے میرے من کی آشا پوری کر لینے دو۔ میں جی بھر کر تمہاری بھگتی کر لوں، تمہاری آرتی اُتار لوں، پھر تم جو کہو گے میں مان لوں گی۔“

”سروجنی کی بات مان لو مہاراج، میں بھی تم سے یہی پرا رتھنا کروں گا۔“ مرلی کے لہجے میں بھی التجا تھی۔

میں شش و پنج میں گرفتار ہو گیا۔ انکا کے علاوہ میری کلدیپ نے بھی بارہا یہی کہا تھا کہ میں جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کیا کروں۔ گرو نے بھی تاکید کی تھی کہ اکیس روز تک ہاتھ پیر مارنے کی غلطی نہ کروں، سید مجذوب بھی اشاروں کنایوں میں مجھے زندگی کے باریک فلسفوں اور معارف کی باتیں سمجھانے کی کوشش کرتا، اُس کی دقیق باتیں میرے سر سے گزر جاتیں، میں وضاحتوں کی درخواست کرتا تو وہ معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو جاتا، میں ہاتھ ملتارہ جاتا۔

سید مجذوب کی متبرک لاٹھی مل جانے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا تھا، بڑے غور و خوض کے بعد مرلی کے فلیٹ سے چلے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ سروجنی میرے پیروں کی زنجیر بن رہی تھی، کوئی اور موقع ہوتا تو میں اُس کی درخواست کو اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتا، اُس کے جسم کے گداز میں، نشیب و فراز میں گم ہو جاتا۔

”اپنا ارادہ بدل دو مہاراج..... میری خاطر۔“ سروجنی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا، پھر

میرے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ مرلی بھی اُس کی دیکھا دیکھی قریب آ گیا..... مجھے وقتی طور پر سروجنی کا فیصلہ قبول کر پڑا۔

”نھیک ہے.....“ میں نے اُس کی گھنیری زلفوں میں اُنگلیاں پھنسا کر کہا۔ ”میں تمہاری بات مانے لیتا ہوں.....“

سروجنی نے اپنا چہرہ اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا، پھر دوبارہ بے اختیار میرے قدموں سے لپٹ گئی۔ مرلی کے چہرے پر بھی اطمینان جھلکنے لگا.....!



زبان کھولنے کی جرات نہیں کرے گی۔ میں نے اس یقین کی وضاحت ضروری نہیں سمجھی۔  
اُس روز بھی سروجنی نصف رات گئے تک میرے پاس بیٹھی دنیا جہاں کی باتیں کرتی  
رہی۔ مرلی بھی قریب ہی بیٹھا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ فون مرلی نے اٹھا لیا، پھر ایک دو  
جملے ادا کرنے کے بعد اُس نے رائگ نمبر کہہ کر ریسور واپس رکھ دیا۔ اُس کے چہرے پر  
تشویش کے تاثرات اُبھرتے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اُس کی اضطرابی کیفیت بلاوجہ نہیں ہو  
سکتی تھی۔

”کس کا فون تھا.....؟“ میں نے لاپرواہی سے دریافت کیا۔

”مہاراج.....“ مرلی نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے کسمسا کر پوچھا۔ ”کیا  
آپ کسی ایسے آدمی کو جانتے ہیں جو میرے اپارٹمنٹ میں آپ کی موجودگی کے راز سے  
واقف ہو.....؟“

”کیا مطلب.....؟“ سروجنی چونک اٹھی۔ ”فون کرنے والے نے کیا کہا تھا؟“ اُس  
نے مرلی سے پوچھا۔ میرے ذہن میں بھی خدشات سرسرانے لگے۔

”اُس نے کیوں اتنا کہا تھا کہ اپنے مہمان کا پوری طرح دھیان رکھنا۔ سیوا میں کوئی کمی  
نہ ہونے پائے۔ اُس سے کہنا کہ پنکھ سمیٹے رکھے۔“

”کوئی نام نہیں بتایا تھا.....؟“ سروجنی کسی ناگن کی طرح بل کھانے لگی۔

”نہیں.....“ مرلی نے خلاء میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے رائگ نمبر کہنے

کے بعد اُس نے قہقہہ لگا کر لائن منقطع کر دی تھی۔“

”کون ہو سکتا ہے.....؟“ سروجنی نے خود کلامی کا انداز اختیار کیا، اُس کی کشادہ پیشانی  
پر اُبھرنے والی سلوٹیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوششوں میں  
مصروف ہے۔

”گرو.....“ میرے ذہن میں پرتاپ کا تصور اُبھرا۔ مرلی نے جو جملے ادا کئے تھے اس  
سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ گرو میری طرف سے بے خبر نہیں ہے۔

”اگر ایسا ہوا تو میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ سروجنی نے مٹھیاں بھینچ کر بڑے  
زہریلے انداز میں کہا۔ ”اُس کے شریر کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال دوں  
گی۔“

ایک ہفتہ گزر گیا.....

میں سروجنی کے اپارٹمنٹ تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ہر وقت میری پذیرائی میں لگی  
رہتی۔ مرلی کی زبانی مجھے حالات کا علم ہوتا رہتا، بمبئی کا سارا کاروبار دو روز تک ٹھپ رہا۔  
پھر پولیس کمشنر اور کچھ پنڈت پجاریوں کے سمجھانے سمجھانے پر سادھوؤں اور پجاریوں نے  
سڑکوں سے اپنا دھرتا اٹھا لیا، زندگی کے کاروبار معمول پر آنے لگے۔ لیکن مرلی کی اطلاع  
کے مطابق پولیس نے میری تلاش جاری رکھی تھی، جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے تھے۔

تاج ہوٹل کے منیجر نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ میں نے ہوٹل چھوڑتے وقت اپنے  
سارے واجبات ادا کر دیئے تھے، میں ہوٹل چھوڑ کر کہاں گیا.....؟ اس کے بارے میں  
اُسے کوئی علم نہیں تھا۔ پرتھوی کے کسی بیان دینے کی نوبت نہیں آئی، رومی شکر کے مشورے  
پر مرلی نے اُس کچھ دنوں کے لئے بمبئی سے باہر بھیج دیا تھا۔

خطرہ بظاہر ٹل گیا تھا لیکن بہت ساری باتیں وضاحت طلب رہ گئیں تھیں۔ مجھے بڑی  
شدت سے انکارانی کی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ اُس نے ابھی تک پلٹ کر میری خبر نہیں لی  
تھی۔ سید مجذوب کی لاشیں مل جانے کے بعد مجھے اپنے تحفظ کا یقین آ گیا تھا۔ میں اس اعتماد  
کی کوئی وضاحت نہیں کر سکتا مگر کوئی بات ایسی ضرور تھی جس نے مجھے ہر فکر سے بے نیاز کر  
دیا تھا۔ شاید سید کی روحانی قوتوں کا فیض تھا جس نے مجھے سنبھال رکھا تھا۔

سروجنی شب و روز میری دلجوئی میں لگی رہتی۔ ہر طرح سے میرا خیال رکھتی، رات گئے  
تک میرے بستر سے لگی دبیز قالین پر بیٹھی رہتی۔ لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ اُس نے  
سادھنا کو میرے کمرے میں آنے جانے سے منع کر رکھا تھا۔ میں نے ایک بار دبی زبان  
میں سروجنی سے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ کہیں سادھنا کی زبان دوسروں کے سامنے  
پھسل نہ جائے، جواب میں سروجنی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ سادھنا میرے بارے میں



”تمہارے ذہن میں کس کا نام ابھر رہا ہے؟“ مرلی نے چونک کر پوچھا۔  
 ”انکا ڈھانے والا کوئی گھر کا بھیدی ہی ہو سکتا ہے۔“ سروجنی کے تیز خطرناک ہونے لگے۔

”نہیں سروجنی..... نہیں۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر اُسے بے قابو ہونے سے باز رہنے کا اشارہ کیا۔ ”تیرے من میں جس کا نام ابھر رہا ہے وہ نزدوش ہے، میں سمجھ گیا کہ فون کس نے کیا تھا۔“

”وہ کون ہے مہاراج؟“ مرلی اور سروجنی نے یک زبان ہو کر سوال کیا۔

”میں اُس کا شبہ نام نہیں لے سکتا، صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہ بڑی مہان شکتیوں کا مالک ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ آنکھ بند کر کے دھرتی کے کسی کونے میں بھی پہنچ سکتا ہے۔ ساگر کی گہرائیوں میں غوطہ لگا سکتا ہے۔ وہ میرا دوست بھی ہے۔ نہ ہوتا تو میرا اتنا دھیان کبھی نہ رکھتا۔“

میں نے وہ وضاحت سادھنا کو سروجنی کے ممکنہ عتاب سے بچانے کی خاطر ضروری سمجھی۔ ”گھر کے بھیدی“ کے اشارے پر میں سمجھ گیا تھا کہ سادھنا کو شبہ کی نظروں سے شناخت کیا جا رہا ہے۔ میری بات سن کر سروجنی کا غصہ ختم ہو گیا، مرلی نے بھی مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلے گئے تو میں نے روشنیاں بجھا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں تھکا ہوا تھا اس لئے جلدی سو گیا۔

رات کے دوپہر گزر جانے کے بعد میں واش روم جانے کی ضرورت کے پیش نظر بیدار ہوا تو میرے کانوں میں کسی کے ہلکے ہلکے خراٹے لینے کی آواز گونجی..... وہ آواز میرے لئے غیر مانوس نہیں تھی۔ میں نے عالم تصور میں اپنے سر پر نظر ڈالی، میرا اندازہ غلط نہیں ثابت ہوا، انکارانی میرے سر پر اپنا نازک بدن سمیٹے، ہاتھوں کے تکیے پر سر رکھے بائیں کروٹ لیٹی چھوٹے چھوٹے خراٹے نشر کر رہی تھی، اُس کے چہرے پر تھکن کے گہرے تاثرات موجود تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُسے کئی راتیں جاگنے کے بعد دو گھڑی سونے کی فرصت ملی ہو۔ وہ کسی نو جوان بیوہ کی طرح لٹی لٹی اور سو گوار سی نظر آ رہی تھی۔ اُس کے پتلے پتلے نرم و نازک سے تراشیدہ ہونٹ جو ہمیشہ مسکراتے رہنے کے عادی تھے اس وقت بڑے پھیکے پھیکے سے دکھائی دے رہے تھے۔ میں اُسے پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ شاید میرے ناروا سلوک

نے اُس پر کوئی گہرا اثر چھوڑا تھا، بڑی بکھی بکھی لگ رہی تھی۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انکارانی میرے ڈکھ درد کی ساتھی تھی، میری ہم راز تھی، میری محبوبہ دلنواز تھی۔ مجھے بڑی شدت سے اُس کی واپسی کا انتظار تھا، وہ آگئی تھی لیکن بے سدھ پڑی سو رہی تھی، میں نے اُسے جگانا مناسب نہیں سمجھا، والہانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

مجھے یقین تھا کہ میری خاطر انکا کے شب و روز کتنی مصروفیت میں گزرے ہوں گے۔ میرے تحفظ کی خاطر وہ ادھر ادھر چکراتی پھری ہوگی۔ کبھی کسی پجاری کے سر پر کبھی روی شکر کا ذہن پلٹنے کی خاطر اُسے زور لگانا پڑا ہوگا، کبھی ان فیصلوں کو تبدیل کرانے کی خاطر جدوجہد کرنی پڑی ہوگی جو میرے خلاف صادر ہوئے ہوں گے۔ وہ سروجنی کے سر سے بھی دُور نہیں رہ سکتی تھی، میری خاطر اُس نے سادھنا کے دل و دماغ کو بھی ضرور کریدا ہوگا۔ چوکھی لڑتے وقت ایک ذرا سی غفلت بازی پلٹ دیتی ہے۔ انکا نے یقیناً کئی راتوں تک اپنی پلکیں نہیں جھپکی ہوں گی، اُسے پرستم لال نے میرے حوالے کیا تھا۔ پرستم لال نے مجھے خودشی سے روک کر کلہ پپ کے مشن کو پورا کرنے کا وعدہ لیا تھا۔ اُس نے انکارانی کو بھی میرے مستقبل کے بارے میں بہت ساری باتیں سمجھائی ہوں گی، مشورے دیئے ہوں گے، ساری اونچ نیچ سے آگاہ کیا ہوگا۔

میں انکا کے معصوم اور سو گوار چہرے پر نظریں جمائے اپنے خیالات میں مستغرق تھا جب اُس نے اچانک ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ شاید نیند میں بھی وہ میرے خیال سے غافل نہیں تھی، کسی خدشے کے معمولی سے احساس نے اُس کی نیند اچاٹ کر دی۔ اُس نے تھکن دُور کرنے کی خاطر بدن اکڑا کر طویل انگڑائی لی، پھر آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

”تم آگئیں.....؟“ میں نے اُسے بڑے پیار سے مخاطب کیا۔ ”میں کئی دنوں سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔ تمہارے بغیر دل نہیں لگ رہا تھا۔“  
 جواب میں انکارانی کے ہونٹوں پر ایک اُداس تبسم مچل اٹھا، وہ ابھی تک مجھ سے شامی تھی۔ اُس کی خفگی بجا تھی۔

”بہت زیادہ ناراض ہو.....؟“ میں بڑے لاڈ سے بولا۔ ”معافی کی کوئی گنجائش ہے؟“  
 ”جھیل.....“ وہ سر دھڑک رہی تھی۔ ”کبھی کبھی تمہاری باتیں میرے وجود میں نشتر بن کر اتر جاتی ہیں۔“

”مجھے احساس ہے۔ لیکن غصے اور دیوانگی میں زبان پر قابو نہیں رہتا.....“ میں نے اعتراف کر لیا۔

”دل سے کہہ رہے ہو.....؟“ اُس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

”تمہاری آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمیر پھل رہا ہے۔“ میں نے اصرار کیا۔ ”کچھ دیر اور آرام کر لو۔“

”اتنی محبت کا اظہار مت کرو جیل، تمہاری یہی باتیں مجھے تڑپا دیتی ہیں۔“

”اتنے دنوں کہاں رہیں.....؟“ میں نے پیار سے پوچھا۔

”کہاں ہو سکتی تھی.....؟“ اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”تمہارے دشمنوں کے راستے کاٹنے میں مصروف تھی۔“

”گرو پرتاپ کو جانتی ہو.....؟“

”تم بڑے خوش قسمت ہو جیل کہ گرو پرتاپ تمہاری مدد پر آمادہ ہو گیا۔ پر تيم لال مہاراج کے بہت سارے احسانات ہیں اُس پر، شاید وہ انہی احسانوں کا بدلا چکا رہا ہے۔ ورنہ.....“

”ورنہ کیا.....؟“ میں نے انکا کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے وضاحت چاہی۔

”بڑا دغلا اور کمینہ خصلت آدمی ہے۔ اُس کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔“ انکا نے کسمسا کر کہا۔ ”وہ درمیان میں نہ آ جاتا تو روی شکر کے آدمی تمہیں گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔“

”کیا تمہاری ساری قوتیں بھی دُرگانے چھین لی ہیں؟“

”نہیں.....“ انکا نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں براہِ راست کسی دیوی دیوتا کے تابع نہیں ہوں، لیکن پراسرار قوتوں کے درمیان بھی کچھ درجہ بندی ہوتی ہے، ایک دوسرے کے مرتبے کا خیال ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ مجھے بھی دُرگا دیوی کی آواز کا پاس ہے، میں براہِ راست تمہارے کسی کام نہیں آ سکتی لیکن اتنی بے بس بھی نہیں ہوں کہ تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان سینہ تان کر دیوار نہ بن سکوں۔“

جواب میں، میں نے اُس کے کچھوں کے برابر سینے پر نظر ڈالی تو شوخی سے پہلو بدل کر بولی۔

”تمہیں اس وقت بھی بد معاشی کی باتیں سو جھ رہی ہیں۔“

”تمہارا سب سے پرانا اور سچا عاشق ہوں میری جان۔“ انکا کی شوخی کو محسوس کر کے میں بھی تڑک میں آ گیا۔ بڑے ظلم ہے ہیں تمہارے۔ کیا مجھے اتنا حق بھی نہیں دو گی کہ میں تمہارے نشیے اعضاء سے ہی دل بہلا سکوں؟“

”حالات ابھی سازگار نہیں ہوئے ہیں جیل صاحب۔“ انکا سنجیدگی سے بولی۔ ”پنڈت نول کشور نے چندرا کی طرف پھر اپنے ہرکارے دوڑا دیئے ہیں۔ کالی داس اور ادم پرکاش کی موت اُن کے لئے بہت بڑا حادثہ ہے، میرا خیال ہے کہ اب چندرا بھی پہاڑیوں سے نیچے اترنے سے انکار نہیں کرے گا، میں اُس کی طرف سے بھی غافل نہیں ہوں۔“

”کیا دُرگا کو اس بات کا علم نہیں ہو گا کہ گرو پرتاپ نے میری مدد کی ہے.....؟“ میں چندرا کا نام سن کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”دیوی دیوتاؤں کی نظروں سے کوئی بات اوجھل نہیں ہوتی۔ دُرگا کو معلوم ہے کہ گرو پرتاپ نے تمہیں اُس کے عتاب سے بچانے کی غلطی کی ہے۔“ انکا کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ”کیا مطلب.....؟“

”کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں تمہیں قبل از وقت نہیں بتا سکتی لیکن ایک بات طے ہے۔ گرو کو اس کی نافرمانی کی سزا ضرور ملے گی۔“

”تم نے کبھی چندرا کو دیکھا ہے.....؟“

”تمہارے دل میں پھر کھد بد شروع ہو گئی؟“ انکا نے میری کیفیت بھانپ کر کہا۔ ”فی الحال اپنے دل و دماغ کو ٹھنڈا رکھو۔ گرو پرتاپ نے اکیس روز والی بات غلط نہیں کہی تھی۔ دو ہفتے اور گزر لینے دو، پھر دل کی ساری بھڑاس نکال لینا۔“

”میرا دل ایک ہی ماحول میں رہتے رہتے گھٹنے لگا ہے۔“ میں نے اپنے اضطراب کا اظہار کیا۔ ”چندرا اور پنڈت نول کشور کھلے میدان میں اپنے اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑا رہے ہیں، میں یہاں ایک اپارٹمنٹ میں بند بیٹھا ہوں۔“

”تم یہاں بھی اپنی دل بگنی کا سامان تلاش کر سکتے ہو.....“ انکا سر سے پھدک کر میرے کندھے پر آ گئی۔ بڑی لگاؤٹ سے بولی۔ ”سرو جی تمہاری داسی ہے، پجارن ہے، مندر میں تو چھوٹے موٹے پجاری بھی کسی سندر پجارن کو اپنی بانہوں میں دبوچ کر پیاس

بجھالیتے ہیں، تم تو سروجنی کے لئے دیوتا ہو، ایک بار بھولے سے اشارہ کر کے دیکھو، وہ تمہیں خوش کرنے کی خاطر تمہارے قدموں میں بچھ جائے گی۔“

”تم میرا ذہن بنانے کی کوشش کر رہی ہو.....؟“ میں نے انکا کا مفہوم سمجھ کر کہا تو اُس نے جھک کر میرے کانوں میں سرگوشی کی۔

”ایک راز کی بات بتاؤں تمہیں، سروجنی سادھنا سے جلتی ہے۔ اُس نے سادھنا کو تمہارے قریب پھکنے سے بھی منع کر رکھا ہے، کبھی ایک نظر بھر سادھنا کو دیکھو..... وہ زندگی کی لچکتی شاخ پر ایک بندکلی کی مانند چل رہی ہے، ابھی کسی بھنورے کی پیاسی نظر اُس تک نہیں پہنچی..... تم اشارہ کرو، میں اُسے پکے پھل کی طرح تمہاری آغوش میں ڈال دوں گی۔“

”کیا پنڈت نول کشور بمبئی نہیں آیا.....؟“ میں نے انکا کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ چندرا کا نام درمیان میں آ جانے سے میرے تن بدن میں ایک آگ سی بھڑک اُٹھی تھی، کلدیپ کے زخم پھر سے ہرے ہونے لگے۔ میں نے سوچا تھا کہ چندرا کو دندھیا چل کی پہاڑیوں سے نیچے اترنے کی زحمت نہیں ڈوں گا، خود سید تان کر اُس کے سر پر پہنچ کر لاکاروں گا، ایک بار تو اُس کی نگاہیں بھی مجھے خلاف توقع دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں۔ وہ حرامزادہ آخری سانس تک جمیل احمد خان کو فراموش نہ کر سکتا۔ مرنے کے بعد میرا تصور بھی اُس کی آتما کو کسی کروٹ چمین نہ لینے دیتا۔ وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ جس کے خلاف صف آراء ہونے کی خاطر وہ دنیا کے ہنگاموں سے دُور برفانی گھما میں بیٹھا دیوتاؤں سے لازوال قوتوں کی بھیک مانگ رہا ہے وہ سامنے آ کر اُسے منڈل سے باہر نکل کر مقابلے کی دعوت دے گا۔ اُس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے، ممکن ہے اُس کی حرکت قلب بند ہو جاتی، سکتے کے عالم میں اپنی جگہ ہمیشہ کے لئے جمجھ ہو کر رہ جاتا۔ مگر میری حسرت دل کی دل میں ہی رہ گئی۔ لندن سے روانگی کے بعد مجھے ہوائی سفر کے دوران اشوک سے اُلجھا دیا گیا، مرلی سے چھنکارا پا کر میں تاج ہوٹل پہنچا تو کلدیپ کی آتما نے پجارجن منڈنی کا جسم اپنا کر، کجرا کا نام اختیار کر کے میری توجہ پنڈت کالی داس کی طرف مبذول کرا دی۔ میں کالی داس سے بے خبر رہتا تو وہ اندھیرے میں وار کر جاتا۔ میں نے نندا کے علم اور اپنی قوتوں کو بروئے کار لا کر کالی داس کو اس طرح جہنم رسید کیا کہ سارے ہندوستان کی پولیس مل کر بھی قاتل کا سراغ نہیں تلاش کر سکتی تھی۔ کالی داس کے بعد میرے

”میرے ذہن میں پنڈت اوم پرکاش کا نام کھلبلانے لگا۔ میں نے اُسے بھی راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ چندرا میرے ذہن سے نکل گیا۔ اب میں دُرگا کے اکیس روز کے عتاب میں گرفتار تھا..... انکا میری توجہ ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی، میں نے کچھ اور ٹھان رکھی تھی۔“

”نہیں.....“ انکا نے میرے چہرے کے بدلتے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”پنڈت نول کشور بڑا گھاگ اور دُور اندیش آدمی ہے، جب تک چندرا واپس نہیں آ جاتا وہ کالی کے مندر میں ہی اپنے منڈل میں دیکا بیٹھا رہے گا۔ کالی داس اور اوم پرکاش کے انجام نے اُسے اور محتاط کر دیا ہے..... وہ اوچھا وار نہیں کرے گا، سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھائے گا۔“

”بدری نرائن نے بھی امر لال کی چھاؤں میں پناہ لینے کی کوشش کی تھی۔“ میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ ”تم اُن دونوں کا انجام دیکھ چکی ہو، چندرا اور نول کشور کا انجام اُن دونوں سے زیادہ بھیانک اور ہولناک ہو گا۔“

”مجھے اپنی ذات سے الگ مت سمجھو جمیل.....“ انکا نے بڑے خلوص سے کہا۔ ”میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ ایک ایک کر کے تمہارے راستے کی تمام زکاوٹیں دُور ہو جائیں۔ لیکن اس کے لئے ہمیں ایک سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کرنا ہو گا، جلد بازی میں غلط قدم اٹھا کر ہمیں کچھ حاصل نہیں ہو گا..... تم نے جہاز پر بھی اشوک کے سلسلے میں جذباتی فیصلہ نہ کیا ہوتا تو وہ شہتی میری نظروں سے اوجھل نہ رہتی جس نے میری نگاہوں کے سامنے دُھند کی چادر تان دی تھی۔“

میں نے انکا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، شاید وہ ابھی تک اس بات سے ناواقف تھی کہ جہاز پر گرو کی حیثیت سے کون سفر کر رہا تھا..... جہاز کے حوالے پر مجھے امریتا یاد آ گئی۔ اُس نے گرو کے ساتھ سفر کرنے کا ذکر کیا تھا لیکن میں گرو پر تاپ سے امریتا کے بارے میں بھی کچھ دریافت نہیں کر سکا۔ بے درپے پیش آنے والے واقعات نے اتنی مہلت ہی کہاں دی تھی؟

”ایک بات کہوں جمیل.....؟“

”کہو.....“

”اب تم بھی اپنی انکارانی سے اپنے دل کا بھید چھپانے لگے ہو۔“

”تم نے کیسے اندازہ لگا لیا.....؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”انکارانی....“ میں نے کچھ یاد کرتے ہوئے موضوع بدل دیا۔ ”رنجنی یاد ہے تمہیں....“

”تم اس وقت کیا سوچ رہے تھے، میں نہیں جان سکی۔“ انکا کے لہجے میں شکوہ تھا۔  
 ”پہلے میں تمہارے اندر جھانک لیتی تھی، لیکن اب تم نے بھی درمیان میں رکاوٹیں کھڑی کرنی شروع کر دی ہیں۔“

میں انکا کی بات سن کر چونکا، میرے ذہن میں ایک خیال بڑی سرعت سے اُبھر رہا تھا۔  
 ”گرو پرتاپ نہیں چاہتا ہوگا کہ انکا ہوائی سفر کے دوران امریتا اور اُس کے ہم سفر ہونے کے راز سے واقف ہو۔ اُس کی اپنی کوئی مصلحت ہوگی۔ شاید اُسی نے درمیان میں کوئی ہاتھ ڈال کر دیا ہو۔“

”اب کیا سوچ رہے ہو جمیل.....؟“

”میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ایک جگہ بیٹھے بیٹھے میرا دم گھسنے لگا ہے۔“

”کہاں جاؤ گے.....؟“

”جہاں بھی قسمت لے جائے۔“ میں نے لمبی سانس بھری۔  
 ”ایسی غلطی بھول کر بھی مت کرنا۔ بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔“

”مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہی ہو.....؟“

”میری مصروفیات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں سرجنی کے سر سے زیادہ دیر تک دور رہ سکتی۔ اُسے غافل کر کے مجھے باہر کی سن گن بھی لینی پڑتی ہے، تم نہیں جانتے۔ روی شکر کچھ کمزوریاں سرجنی کی مٹھی میں ہیں، اسی لئے اُس نے مرلی کی بات مان لی، لیکن وہ ہر کی تاک میں ہے، تم نے اگر اُسے موقع فراہم کر دیا تو بات بہت بگڑ جائے گی۔“ انکا بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”میری بات غور سے سنو جمیل۔ گرو پرتاپ تمہیں یہاں پہنچانے کے بعد اب دُرگاہ کے عتاب سے بچنے کی فکر میں مصروف ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ میرا خیال ہے کہ اگر اکیس دن پورے ہونے سے پیشتر تمہارے اوپر دوبارہ کوئی آفت آئے تو وہ بھی تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔“

”تم تو میرے ساتھ رہو گی.....؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنے دل سے جواب مانگو، وہ کیا کہتا ہے؟“ اُس نے بڑی حسرت سے مجھے دیکھا۔

”انکارانی....“ میں نے کچھ یاد کرتے ہوئے موضوع بدل دیا۔ ”رنجنی یاد ہے تمہیں....“

”اس وقت تمہیں اچانک رنجنی کی یاد کیسے آگئی؟“ انکا نے مجھے گہری نظروں سے گھورا۔  
 ”تم نے مجھے بتایا تھا کہ اشوک سے اُس کی شادی کو دس سال ہو چکے تھے، دو ماہ بعد رنجنی کے پاس وہ خوشی ہونے والی ہے جس کی حسرت دل میں لئے اشوک دنیا سے منہ موڑ گیا۔“

”قسمت کی بات ہے جمیل۔“ انکا اُداس ہو گئی۔ ”تمہیں یہ سن کر اور دکھ ہوگا کہ اشوک کے بعد اُس کے رشتے داروں نے رنجنی کو منحوس سمجھ کر اُس سے منہ پھیر لیا ہے۔ آج کل وہ اپنی بہن کے ساتھ ہے۔“

”میں اشوک کی موت کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ لیکن رنجنی کی ہر ممکن مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے حکم دو، تم اُس کی کیا مدد کرنا چاہتے ہو.....؟“

”کچھ ایسے حالات پیدا کر دو کہ اُس غریب کو سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا مل جائے، اُسے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے، کسی کے دست نگر اور محتاج نہ رہے، سکون سے زندگی گزار سکے۔“

”میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں، تم فکر مت کرو، میں رنجنی کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔“

میں انکا سے بڑی دیر تک باتیں کرتا رہا، وہ مجھے سرجنی، سادھنا اور روی شکر کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتاتی رہی۔ چندرا اور پنڈت نول کشور کے علاوہ کچھ اور سرپھرے پنڈت اور پجاری بھی جنہوں نے دو چار جنتر منتر سیکھ لئے تھے، میری گھات لگائے بیٹھے تھے، اُن کے بارے میں بھی انکا نے کئی اہم اور کارآمد باتیں بتائیں۔ میں غور سے اُس کی ایک ایک بات ذہن نشین کرتا رہا۔

”وہ دوبارہ میرے سر پر پاؤں پسا کر لیٹ گئی۔ مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ جب وہ مجھ سے ملے گی تو زور بھی ہوگی، مجھ سے میری سردمہری کی شکایت کرے گی، غصے کرے گی۔ لیکن اُس نے مجھے معاف کر دیا تھا، میری باتوں نے اُس کی تمام شکایتیں دور کر دی تھیں، وہ کسی بلبل کی طرح چپک رہی تھی، میں اُس کی باتیں سن رہا تھا، اُس کی

ایک ادا پر ثار ہو رہا تھا۔ بڑے دنوں بعد ہمارے درمیان خوشگوار ماحول میں چھیڑ چڑی ہو رہی تھی۔ انکا نے کروٹ لے کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے سادھنا کے بارے میں کیا سوچا.....؟“

”بڑی سفارش کر رہی ہو سادھنا کی۔“ میں نے اُسے ٹولنے کی کوشش کی۔ ”کہیں اُسوایہ نظروں سے گھورا۔“ پہلے تو تمہاری رال بڑی جلدی ٹپکتی تھی.....“

”آج تیس کسی اور کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”وہ ایک بار قابو آجائے تو سادھنا جیسی ہزاروں حسینائیں میری بانہوں میں مچلنا اپنے لئے کسی اعزاز سے کم نہ سمجھیں گی۔“

”سروجنی کی بات کر رہے ہو.....؟“ انکا کے لہجے میں تعجب تھا۔

”نہیں.....“ میں نے سر دواہ بھر کر جواب دیا۔ ”کچھ دنوں پیشتر وہ مجھے رات گئے پونا کے ریس کلب میں ملی تھی، بڑی رس بھری تھی۔ غصے میں قیامت لگ رہی تھی۔ شعلہ بدن،

غنجہ دہن، رشک چمن، حوریمین..... میں نے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔“

”پھر کیا ہوا.....“ وال گلی یا نہیں.....؟“ انکا نے شوخی سے پوچھا۔

”میرے اندر ایک اُبال آیا تھا..... وہ بام مچھلی کی طرح تڑپ کر ہاتھ سے نکل گئی۔“

”تم اتنے سیانے تو کبھی نہیں تھے جتنے بالغ اب ہو گئے ہو۔“ انکا نے پہلو بدل کر

جواب دیا۔ ”پہلے تم مجھ سے اپنے دل کی کوئی بات نہیں چھپاتے تھے، اب تم نے کتنا سیکھ

لیا ہے۔ میں سمجھ رہی ہوں جمیل صاحب کتم سادھنا کی بات کیوں ٹال رہے ہو؟“

”آج..... چھا۔“ میں نے قدرے محتاط ہو کر بے پرواہی کا مظاہرہ کیا۔ ”اب تم نے بھی

قد نکالنا شروع کر دیا.....“

”پریم لال مہاراج کی کچھ باتوں نے مجبور کر دیا ہے۔“ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔ ”ورنہ

میں اب بھی وہی انکا ہوں تم جس کے اشارے پر ناناچا کرتے تھے، یاد ہے نا.....؟“

انکا کے لہجے میں طنز تھا، سمندر جیسی گہرائی تھی۔ میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ اُس

کے اور پریم لال کے درمیان میرے سلسلے میں کوئی معاہدہ ضرور ہو چکا تھا جسے وہ مجھ سے

مخفی رکھنا چاہتی تھی۔

انکا نے جو کہا وہ غلط نہیں تھا، ایک زمانہ تھا جب میں اُس کی پلکوں کی جنبش پر تھرکنے کو

مجبور تھا، اُس کی کسی بات کو رد کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھ پر حکم چلانے کی

بوجھ میں ادا پر ثار ہو رہا تھا۔ بڑے دنوں بعد ہمارے درمیان خوشگوار ماحول میں چھیڑ چڑی ہو رہی تھی۔ انکا نے کروٹ لے کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے سادھنا کے بارے میں کیا سوچا.....؟“

”بڑی سفارش کر رہی ہو سادھنا کی۔“ میں نے اُسے ٹولنے کی کوشش کی۔ ”کہیں اُسوایہ نظروں سے گھورا۔“ پہلے تو تمہاری رال بڑی جلدی ٹپکتی تھی.....“

”آج تیس کسی اور کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”وہ ایک بار قابو آجائے تو سادھنا جیسی ہزاروں حسینائیں میری بانہوں میں مچلنا اپنے لئے کسی اعزاز سے کم نہ سمجھیں گی۔“

”سروجنی کی بات کر رہے ہو.....؟“ انکا کے لہجے میں تعجب تھا۔

”نہیں.....“ میں نے سر دواہ بھر کر جواب دیا۔ ”کچھ دنوں پیشتر وہ مجھے رات گئے پونا کے ریس کلب میں ملی تھی، بڑی رس بھری تھی۔ غصے میں قیامت لگ رہی تھی۔ شعلہ بدن،

غنجہ دہن، رشک چمن، حوریمین..... میں نے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔“

”پھر کیا ہوا.....“ وال گلی یا نہیں.....؟“ انکا نے شوخی سے پوچھا۔

”میرے اندر ایک اُبال آیا تھا..... وہ بام مچھلی کی طرح تڑپ کر ہاتھ سے نکل گئی۔“

”تم اتنے سیانے تو کبھی نہیں تھے جتنے بالغ اب ہو گئے ہو۔“ انکا نے پہلو بدل کر

جواب دیا۔ ”پہلے تم مجھ سے اپنے دل کی کوئی بات نہیں چھپاتے تھے، اب تم نے کتنا سیکھ

لیا ہے۔ میں سمجھ رہی ہوں جمیل صاحب کتم سادھنا کی بات کیوں ٹال رہے ہو؟“

”آج..... چھا۔“ میں نے قدرے محتاط ہو کر بے پرواہی کا مظاہرہ کیا۔ ”اب تم نے بھی

قد نکالنا شروع کر دیا.....“

”پریم لال مہاراج کی کچھ باتوں نے مجبور کر دیا ہے۔“ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔ ”ورنہ

میں اب بھی وہی انکا ہوں تم جس کے اشارے پر ناناچا کرتے تھے، یاد ہے نا.....؟“

انکا کے لہجے میں طنز تھا، سمندر جیسی گہرائی تھی۔ میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ اُس

کے اور پریم لال کے درمیان میرے سلسلے میں کوئی معاہدہ ضرور ہو چکا تھا جسے وہ مجھ سے

مخفی رکھنا چاہتی تھی۔

انکا نے جو کہا وہ غلط نہیں تھا، ایک زمانہ تھا جب میں اُس کی پلکوں کی جنبش پر تھرکنے کو

مجبور تھا، اُس کی کسی بات کو رد کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھ پر حکم چلانے کی



حالات کے خزانوں کو دیکھ لیا تھا، میں نے غصے میں آکر پنڈت ہرجن کو ٹھکانے لگا دیا۔ انکا دوبارہ میرے سر پر بے سیرا کرنے واپس لوٹ آئی۔

بڑی طویل کہانی ہے، بڑے المناک اور ناقابل یقین واقعات ہیں۔ انکا سے کئی بار میری رفاقت کا سلسلہ ٹوٹا، کئی بار جڑا۔ وہ میرے سر کو چھوڑ کر کہیں اور جانے کو آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ ہم نے متعدد بار سمجھوتا کیا، کئی بار وہ تنگ کر ڈھٹ جاتی، کبھی میں بھڑک کر اُسے نظر انداز کر دیتا، لیکن ان تمام تلخ و شیریں واقعات اور حادثات کے باوجود میں تسلیم کرتا ہوں کہ برسوں پر محیط ہماری طویل رفاقت نے ہمیں ایک دوسرے کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ ہمارے وجود گندہ کر رہ گئے تھے، ہم زیادہ دنوں جدا نہیں رہ سکتے تھے.....!

سانپ کے کاٹے کا لال نہیں ہوتا لیکن کسی اپنے کی ایک بات نشتر بن کر دل میں اتر جاتی ہے۔ چندرا اور پنڈت نول کشور کے خلاف میرے وجود میں بارود بھرا تھا، انکا نے ایسے میں ماضی کے زخم کریڈنے کی غلطی کی تو بارود میں آگ لگ گئی۔ میں اُسے تیکھی نظروں سے گھورنے لگا، وہ میرے خیالات پڑھ رہی تھی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا۔ وہ مجسم التجا بن گئی۔ ”تم جو سمجھ رہے ہو میرا وہ مطلب ہرگز نہیں تھا، اپنی انکارانی کو غلط مت سمجھو۔ میں جانتی ہوں کہ تم یہاں سے نکلنے کی سوچ رہے ہو، سادھنا کا ذکر چھیڑ کر میں تمہاری توجہ بٹانا چاہتی تھی۔ زندگی بچانے کی خاطر کبھی کبھی ماریا کا انجکشن بھی دینا ضروری ہوتا ہے..... میری بات کا یقین کرو جمیل..... میں نے تم سے صرف ایک شکوہ کیا تھا کہ تم نے میری بات ماننی چھوڑ دی ہے، میں پریم لال مہاراج کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے تمہاری بیٹی زندگی پر کوئی نشتر لگانے کی جسارت نہیں کی تھی۔ میں تو تمہیں صرف یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ گرو پرتاپ نے جو کہا ہے وہ غلط نہیں ہے۔ اکیس روز تمہارے اوپر بھاری ہیں، مقررہ مدت پوری ہوئے بغیر تمہارا سروجنی کے اپارٹمنٹ سے باہر جانا ٹھیک نہیں ہوگا..... پھر بھی اگر تمہیں میری بات ناگوار گزری ہے تو میں.....“

”مجھے اس وقت تنہا چھوڑ دو.....“ میں نے جھلا کر اُس کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔ ”اس وقت تمہاری وضاحتیں میرے اعصاب کو سکون پہنچانے کی بجائے اور مشتعل کر دیں گی۔ میں سن چکا ہوں کہ پریم لال نے تمہیں ہر قیمت پر میرا خیال رکھنے پر مامور کیا ہے، لیکن اس معاہدے میں میری کوئی مرضی شامل نہیں تھی۔ گرو پرتاپ نے جو کہا وہ بھی میرے

عادی تھی۔ اُس نے میری نرس کی ایک ذرا سی غلطی پر اُسے بھی معاف نہیں کیا۔ نرس میری زندگی کے احاطے میں خوشبو بکھیرنے والا سب سے مہکتا پھول تھی۔ میرے پیار کی خاطر اُس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا، اپنے والد اصفہانی صاحب کی دولت اور شہرت کو ٹھکر کر میری ہم سفر بن گئی تھی۔ وہ میرے ڈکھ درد کی شریک تھی، میری نمکسار تھی، انکا کے شکنجوں سے نجات دلانے کی خاطر اُس نے بزرگان دین کے مزاروں پر جا کر جھولی پھیلانے کی ٹھان لی۔ انکا کو اُس کے ارادوں کی بھنگ مل گئی، میں نے انکا کو جوابی انتقامی کارروائی سے باز رکھنے کی خاطر محنت سمجحت کی مگر اُس نے سبق دینے کی خاطر مجھے ایک ہاتھ سے محروم کر دیا۔ نرس کی عصمت بھی داغدار ہو گئی..... میں ہاتھ ملتا رہ گیا۔

ماضی کا بھیا نک تصور ابھرا تو میں کسمانے لگا، میرے اندر چھپے آتش فشاں کا لاوا کھدکھدانے لگا۔ میری داستانِ حیات پڑھنے والے گواہ ہیں کہ میں نے واقعات کو من و عن بیان کرنے میں کبھی کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ جو گزری، وہ قلمبند کرتا چلا گیا۔ میرے بھیا نک واقعات کا طویل سلسلہ کبھی ڈھکا چھپا نہیں رہا، میں چاہتا تو بہت سے واقعات حذف کر جاتا، کوئی میری ذات کی پرچھائیں کے ساتھ ساتھ نہیں چل رہا تھا، کوئی گواہ نہیں تھا میں کیسے کیسے عجیب و غریب حالات سے دوچار ہوتا رہا، میں نے اپنی زندگی کے کچھ لمبے بڑے عذاب میں گزارے تھے۔ سڑکوں پر بھیک مانگتا پھرا تھا، تربیتی مجھے ٹھوکریں مارتا، میں اُس کے حکم پر روندے ہوئے خوبصورت جسموں کو ٹھکانے لگانے کا مذموم کام انجام دیتا رہا۔ میں نے کبھی کوئی پہلو چھپانے کی کوشش نہیں کی، کبھی پارسائی کا دعویٰ نہیں کیا، خود کو پھنے خان بنا کر بھی نہیں پیش کیا۔ لیکن میرے اندر آگے بڑھنے کی ایک لگن ضرور موجود تھی۔ میں اپنے اندر شاہین کا دماغ، عقاب کی نظریں، لومڑی کی سی چال اور آدم خود شیر کا عزم اور حوصلہ پیدا کرنے کی تگ و دو میں لگا رہا۔ دشمنوں کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر زندہ رہنے کی آرزو میرے کمزور وجود میں ایک ننھے پودے کی طرح پروان چڑھتی رہی، مجھے نا کا می نہیں ہوئی، قسمت نے یاوری کی، میں چٹان بن گیا، انکا بھی ششدر رہ گئی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب انکا پنڈت ہرجن کے سر پر تھی، وہ اپنے کسی آقا کے حکم کی سرتابی کی جرأت نہیں کر سکتی تھی، اُس نے مجھے ہرجن کے آگے جھکنے پر مجبور کیا، میں نے انکار کر دیا۔ دانتلہانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکی۔ اُس کی دُور بین نظروں نے میرے اندر چھپے ہوئے

نہیں تھی کہ مجھے اُس کے حصول میں دُشواری ہوتی، میں ایک اشارہ کرتا بوتل کی کاک خود بخود کھل جاتی، وہ گھر کی مالکہ تھی، پہلا حق بلاشبہ اُسی کا تھا، بعد میں وہ سادھنا کو بھی خدمت کا موقع دے سکتی تھی، لیکن جب ذہن اُلجھا ہو، گھٹن کی شدت وحشتوں اور جنون کو ہوا دے رہی ہو اُس وقت انسان کو ہری ہری نہیں سمجھتی۔ میں جس خوبصورت بیچرے میں تیار تھا وہاں کے دروازے بھی بند نہیں تھے لیکن مجھے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی، اسی احساس نے میرے اندر جوار بھائے کی کیفیت پیدا کر دی تھی، صبر کی برداشت نہیں تھی مجھ میں۔ میں ساری پابندیوں کو بالائے طاق رکھ کر وہاں سے بھاگ نکلنے کی سوچ رہا تھا، میرے دشمن آزاد فضا میں سانس لے رہے تھے، اپنی مرضی سے جی رہے تھے۔ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش دم سادھے ایک گوشے تک محدود رہوں، یہ مجھے منظور نہیں تھا۔

پہلے بھی کئی بار میں نے مصلحتوں کو نظر انداز کیا تھا، دل کے کہنے پر عمل کیا تھا، مجھے اپنی غلطیوں کی پاداش میں اذیتناک حالات سے دوچار ہونا پڑا، میری حماقت سے میرے اپنوں کو بھی نقصان ہوا لیکن مجھے کبھی اس کا ملال نہیں ہوا۔ دو فریق لڑتے ہیں تو فتح صرف ایک کی ہوتی ہے، دوسرے کو جھکنا پڑتا ہے۔ جو میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے، کسی پناہ گاہ میں چھپ کر بیٹھ جائے اُسے بزدل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ میں نے اپنے وجود پر کبھی بزدلی کی چھاپ نہیں لگنے دی۔ بدری نرائن جیسا کمینہ خصلت پنڈت بھی میری وحشتوں سے ڈر کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کئی بار اُس نے خود کو کالی کے مندر میں محفوظ کرنا چاہا، انکا نے مجھے مندر میں جانے سے روکا، برے نتائج سے آگاہ کیا، میں نے اُس کی نہیں سنی، دندنا تا ہوا مندر میں داخل ہو گیا، پتھر کے بت اور اُن سے منسوب روایتی ہولناک اور پراسرار باتیں میرا رستہ نہیں روک سکیں۔ میں ان فرسودہ باتوں کو فکشن، پراسرار اور خوفناک کہانیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ بدری نرائن سے آخری معرکے کے وقت اگر میری کلدیپ میری مدد کو نہ آجاتی تو میں بدری نرائن کے بعد امر لال کو بھی ڈنکے کی چوٹ پر ضرور للکارتا۔ موت سے ڈر کر بھاگنے والے دانشمند نہیں کہلاتے، خود کو فریب دینے سے موت ٹل نہیں جاتی۔ جو لمحہ، جو وقت، جو جگہ لوح محفوظ پر رقم کی جا چکی ہے اُسے دنیا کی ساری قوتیں مل کر بھی نہیں ٹال سکتیں۔ پھر موت سے کیا ڈرتا.....؟

میں ایک مسلمان گھرانے کا چشم و چراغ ہوں۔ مجھے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے

کان سن چکے ہیں۔ لیکن میں اپنے اوپر کسی کے حکم کا اطلاق ضروری نہیں سمجھتا۔ کل کیا ہونے والا ہے تم بھی یقین سے نہیں کہہ سکتیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن ہمیں محتاط رہ کر ہی کوئی قدم.....“

”بس کرو انکارانی..... بس کرو۔“ میں نے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں۔ ”اُس وقت تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، میری اُنگلی پکڑ کر چلنے پر مجبور نہ کرو۔“

انکا کی آنکھیں چھلک اُٹھیں۔ مجھے یقین آ گیا کہ اُس نے میرے ماضی کو کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی، زندگی میں پہلی بار میں نے اُس کی آنکھوں کو برستے دیکھا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں ان آنسوؤں کو پی جاتا، انکا کے احسانات بہر حال بے شمار تھے، میں اُنہیں یکسر فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اُس وقت میری ذہنی رو بہک چکی تھی، میں اپنے رویے میں تبدیلی نہ کر سکا، انکا روتی بسورتی مجھے حسرت بھری نظروں سے دیکھتی میرے سر سے اُتر گئی۔ میں پھر خیالات کے سمندر میں غوطے لگانے لگا۔

انکا ایک ہفتے بعد میرے سر پر آئی تھی، مجھے اُس کا انتظار تھا، مجھے اُس کی ضرورت تھی۔ لیکن ہمارے درمیان پھر دُوری ہو گئی، وہ قصور وار نہیں تھی، میں نے اُس کی بات کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی تھی، ایک ہی جگہ پڑے پڑے انسان اُکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ مجھ پر اکیس روز کی پابندی کا ذہنی دباؤ نہ ہوتا تو سروجنی اور سادھنا کی رفاقت میں اکیس مہینے بھی گزارے جاسکتے تھے۔ وہاں مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی، سروجنی پجاریوں کی طرح مجھے دیوتا سمجھ کر خدمت کر رہی تھی۔ میں اُسے کوئی بھی حکم دیتا وہ انکار کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ انکا کا خیال تھا کہ اُس نے سادھنا کو میرے پاس آنے سے اس لئے روک دیا ہے کہ کہیں میرے اندر کی آگ اُس کی دو شیرگی کو نہ جھلسا دے۔ میرا خیال اس کے برعکس تھا۔ میں سات روز سے سروجنی کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہا تھا، میری خاطر اُس نے بھی خود کو اپارٹمنٹ کی چہار دیواریوں میں قید کر رکھا تھا، پہلے وہ ڈال ڈال پات پات اُڑتی پھرتی ہوگی، بیچرے میں بند ہو کر پرندہ بھی پھڑ پھڑانے لگتا ہے، سروجنی بھی تڑپ رہی ہوگی۔ بے خوار کو ایک روز بیٹے کو نہ ملے تو اُس کے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگتے ہیں، سروجنی تو بلا نوش تھی۔ اُس کی اپنی ذات بھی کسی بھری بوتل سے کم نہیں تھی، اُس کا پورا وجود نشہ تھا، وہ سیل بند بھی

سید کے حوالے سے مجھے شاردایا دآئی، وہ ایک پنڈت کی لڑکی تھی، میں نے اُسے اغواء کر کے بدری نرائن کو اُس کی کمینگی کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی۔ بعد میں وہ مجھ سے اس درجہ متاثر ہوئی کہ اُس نے اپنے گھر جانے سے انکار کر دیا، میں شارداد اور شبن خان کو ناگپور سے لے کر گلبرگہ کی طرف جا رہا تھا جب سید ایک اسٹیشن پر ڈبے میں آ گیا۔ میں اُس سے کئی بار تبرک لالھی مانگ چکا تھا، ہر بار اُس مرد قنڈر نے مجھے دھتکار دیا۔ لیکن اُس روز شارداء کے عوض اُس نے وہ لالھی مجھے دے دی۔ پریتم لال نے کہا تھا کہ اگر وہ اپنی زندگی کی تمام ریاضتوں اور اپنی کمائی ہوئی ساری قوتوں کے بدلے وہ لالھی حاصل کر سکتا تو بھی سودا مہنگا نہ ہوتا۔

میں سید مجذوب کے خیال میں گم لالھی کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا جب مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں خوابگاہ میں تنہا نہیں ہوں، کوئی اور بھی ہے۔ مجھے سروجنی کا شبہ ہوا۔ وہ اکثر راتوں میں اٹھ کر میری خیریت دریافت کرنے آ جاتی تھی۔ میری خوابگاہ میں دو دروازے تھے، ایک باہر لاؤنج میں کھلتا تھا، دوسرا سروجنی کے ڈریسنگ روم میں کھلتا تھا۔ لاؤنج کا دروازہ سروجنی خود اپنے ہاتھ سے بند کر کے دوسرے دروازے سے جاتی تھی۔ یہ اُس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ میں نے نظریں گھا کر اطراف کا جائزہ لیا لیکن وہاں کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ خوابگاہ میں نائٹ بلب کی مدھم روشنی موجود تھی، میرا خیال انکارانی کی طرف گیا۔ شاید وہ کہیں آس پاس موجود ہو، میرے سر پر آنے سے ہچکچا رہی ہو۔ میرے سر سے اترتے وقت اُس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ میرا دل پیسنے لگا۔

”انکارانی.....“ میں نے سرگوشی کی۔ ”جو کچھ ہوا اُسے فراموش کر دو، جہاں محبت شدت اختیار کر جائے وہاں چھوٹی موٹی غلط فہمیاں جنم لیتی رہتی ہیں۔ یہ زنجشیں ایک دوسرے کی چاہت کا ثبوت ہوتی ہیں۔ تم اگر کہیں قریب ہو تو میرے سر پر آ جاؤ۔ میں تم سے کھل کر کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں، مجھے زیادہ دیر کے لئے تنہا مت چھوڑو، تنہائی کا احساس انسان کو ڈسنے لگتا ہے، وہ بھٹک جاتا ہے، میری بات غور سے سن لو، میں یہاں خود کو نظر بند محسوس کر رہا ہوں، اب نکل چلو یہاں سے، جو ہوتا ہے اسے میں یا تم کوئی ٹال نہیں سکتا۔ تم نے کہا تھا کہ گرو پرتاپ کبھی اُس کے کئے کی سزا بھگتی ہوگی، وہ بھی ضرور واقف ہوگا کہ دُرگا اُسے میری مدد کرنے کے جرم کی پاداش میں معاف نہیں کرے گی، پھر بھی وہ میری آگ میں کود

شرم بھی محسوس ہوتی ہے، میں نے کبھی مسجد میں جا کر خدا کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی کوشش نہیں کی۔ زندگی اُس رب کریم کا گراف قدر عظیم ہے، میں نے کبھی مالک دو جہاں کا شکر بھی ادا نہیں کیا۔ میں اسے اپنی بدبختی کہوں گا، خود غرضی کا نام دُوں گا، جو بھٹک جائے، گمراہ ہو جائے، سیاہ و سپید کے درمیان امتیاز نہ کر سکے وہ انسان کہلانے کا بھی مستحق نہیں، مسلمان کہلانا تو بڑی بات ہے۔ میں اس نازک فلسفے پر قلم اٹھانے سے گریز کروں گا، میں کیا ہوں؟ مجھے کیا ہونا چاہئے تھا؟ میں کیا بن گیا؟ میں اس ضمن میں حالات اور تقدیر کے لکھے کی بہانہ بازی کر کے، کوئی حذر رنگ تلاش کر کے، کوئی دقیق فلسفہ تراش کر پہلو تپی کی کوشش نہیں کروں گا..... ”من آنم کہ من دانم“ پر بات ختم ہوئی۔ منطق بگھارنے سے کوئی بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ میں گناہگار ہوں، بھٹکا ہوا ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں لیکن ایک بات یہ بھی سچ ہے کہ میں خدا کی ذات سے کبھی منکر نہیں ہوا۔ میں اُس کے اوّل و آخر ہونے پر یقین رکھتا ہوں۔ مجھے بھی یقین ہے کہ موت برحق ہے، اس کا ایک وقت معین ہے..... موت سے پردہ پوشی کون کر سکے گا.....؟

گرو پرتاپ نے مجھے ہاتھ تھام کر رومی شکر اور اُس کے آدمیوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا، انکا کا مشورہ تھا کہ مجھے اکیس روز تک سروجنی کے اپارٹمنٹ سے باہر قدم نہیں نکالنا چاہئے۔ دُرگا کی آواز کا عتاب میری قوتوں کو مفلوج کر چکا تھا، میں نے متعدد بار رانکا ز اور مراقبہ کی مشق کرنے کی کوشش کی، ہر بار مجھے ناکامی کا سامنا ہوا..... دُرگا دیوی کی وجہ سے پریتم لال کی آتما بھی میری مدد سے قاصر تھی۔ انکا بھی براہ راست میری مدد سے گریز کرنے کی مجبوری کا اظہار کر چکی تھی۔ میرے پاس صرف سید مجذوب کی لالھی رہ گئی تھی جسے میں نے سینے سے لگا رکھا تھا، میں اس لالھی کے کرشوں سے بھی ناواقف تھا۔

سید کی لالھی کا خیال آیا تو میں نے لپک کر اُسے اپنی گرفت میں لے لیا، الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا.....

سید مجذوب سے میری پہلی ملاقات گلبرگہ میں رکن الدین کی حویلی میں ہوئی تھی۔ اس کا سلسلہ حضرت خواجہ گیسو دراز جیسے جلیل القدر بزرگ سے ملتا تھا۔ حضرت گیسو دراز کا مزار ہونے کے سبب گلبرگہ کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ لوگ دُور دراز سے جوق در جوق اُن کے مزار پر حاضری دینے آتے تھے جہاں فیض عام کا سلسلہ جاری تھا۔

پچانے میں دھوکہ نہیں کھایا تھا.....!

اُس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، کپڑے پھٹے ہوئے اور گرد آلود تھے۔ سر کے بال خود رو جھاڑیوں کی طرح بکھرے بکھرے تھے، انہیں برسوں سے کنگھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے تلووں میں مٹی کی تہیں جمی نظر آ رہی تھیں، ایڑیوں کی دراڑیں بھی بہت واضح طور پر دکائی دے رہی تھیں۔ جسم کا لباس بھی خستہ تھا جس میں لگے مختلف رنگوں کے پوند اپنا رنگ پھیکا کر چکے تھے۔ لیکن اُس چہرے پر ایک جلال موجود تھا۔ اُس کی نگاہیں اُبلے، تادرو نایاب ہیروں کی مانند چمک رہی تھیں۔ بظاہر اپنی اُجڑی کیفیت میں بھی وہ بادشاہ لگ رہا تھا، ایک عجیب سی بڑو قارے نیازی سے سرشار نظر آ رہا تھا۔

سید مجذوب کو سامنے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنوں میں اُبال آنے لگے، میری پلکوں نے جھپکنا بند کر دیا، بڑی مدتوں کے بعد اُس کی دید کی لذتوں سے فیض یاب ہوا تھا، اندیشہ تھا کہ کہیں میں آنکھیں بند کروں، وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔

”کتنے میں خریدایہ عالیشان کا بک؟“ سید نے دیدے نچا کر خوابگاہ پر ایک اچھتی نظر ڈالی۔ ”بڑے ٹھانڈے نظر آ رہے ہیں۔“

”پیر و مہشد.....“ میں نے ہاتھ جوڑ لئے۔ ”میری رہبری کرو، میں اُلجھ گیا ہوں۔“

”سر پر کنگھی کیا کر، غٹروں کی آواز سے پیٹ نہیں بھرتا۔“

”تم میرے محسن ہو سید.....“ میں نے بسورتے ہوئے کہا۔ ”میں دُرگا کی قوتوں کے شکنجے میں جکڑ گیا تھا، تم نے ہاتھ تھام کر اُس دلدل سے نہ نکالا ہوتا تو میں.....“

”نکاح پڑھوا رہا ہے؟“ سید دیدے نچاتے ہوئے بولا۔ ”ایجاب و قبول کے چکر میں پڑا تو گھن چکر بن جائے گا، نظر لگ جائے گی۔“

”آج مجھے مایوس مت کرنا..... مجھے راستہ نہیں مل رہا، تم میرا ہاتھ تھام لو.....“

”آنکھ مجولی کھیلنا بند کر دے، اونڈھا ہو جا۔“

”تم نے پھر اشارے کنایوں میں باتیں شروع کر دیں۔“ میں نے ٹنگڑا کر کہا۔ ”میرا دم گھٹ رہا ہے سید..... میری انگلی پکڑ کر کسی راستے پر لگا دو۔“

”آج تیری بلبل نہیں دکھائی دی.....“ سید نے معنی خیز انداز میں گردن کو جنبش دی۔

”ہو گئی بھر.....“

پڑا۔ اُس نے دُرگا کا پجاری ہونے کے باوجود اس کی پرواہ نہیں کی، پریتم لال کی دوستی کی خاطر خطروں کے سمندر میں چھلانگ مار دی۔ میں کیوں چوروں کی طرح چھپا بیٹھا رہوں.....؟ میری بات سن رہی ہو؟ سمجھ رہی ہو میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں.....؟“

دوسری سمت سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں تلملا کر اُنکھ کھڑا ہوا۔

”میں پہلے ہی مضطرب ہوں، مجھے اور پریشان مت کرو۔“ میں نے اس بار قدرے اونچی آواز میں کہا۔ ”میری وحشتوں کا چھپ چھپ کر تماشا مت دیکھو۔ میرے اعصاب چنچنے لگے ہیں، سن رہی ہو انکارانی، میں اب زیادہ دنوں برداشت نہیں کر سکتا۔ پریتم لال نے تمہیں ہر قیمت پر میری حفاظت کرنے کی ہدایت کی ہے، تم اس کی پابند ہو۔ لیکن میرے اوپر ایسی کوئی بندش نہیں ہے، تمہیں پریتم لال کی پراسرار شکلیوں کا واسطہ، اپنے زہریلے پنجوں کو میرے سر میں چھبھونے کی کوشش مت کرنا، اگر تم بھی دُرگا کے عتاب سے خوفزدہ ہو تو بے شک مجھ سے دور رہو۔ لیکن میری ایک بات کان کھول کر سن لو، اگر تم نے میرا راستہ روکنے کی غلطی کی تو پھر ہمارے درمیان برسوں کی رفاقت ختم ہو جائے گی۔ مجھے زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ میں کئی بار موت کے منہ میں چھلانگ لگانے کی سوچ چکا ہوں۔ کبھی کلدیپ نے اپنی قسم دے کر میرے پیروں میں زنجیر پہنا دی، کبھی تم نے اپنے پنجوں کی کر بناک چھین سے مجھے گھپ اندھیروں میں دھکیل دیا، کبھی پریتم لال نے درمیان میں آ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ لیکن آتش فشاں کے اُبلتے لاوے کو زیادہ عرصہ نہیں روکا جاسکتا، اس پر بند نہیں باندھے جاسکتے۔ میری دیوانگی حد کو پہنچ رہی ہے، تم میرے قدموں میں سادھنا کی دو شیزگی کی بیڑیاں ڈالنے کے خواب دیکھ رہی ہو۔ سروجنی میرے راستے کا پتھر نہیں بن سکتی۔ اگر تم کو آتا ہے تو میرے سر پر واپس آ جاؤ ورنہ آج رشتے کی تمام بندشیں ہمیشہ کے لئے ختم کر دو.....“

”کس کو آوازیں دے رہا ہے؟ کیوں ریگستانی اونٹ کی طرح پانی کے لئے بلبل رہا ہے.....؟ بھونکنا بند کر دے بد بخت.....“

”کمرے میں ایک مانوس آواز گونجی۔ میں پاگل ہو گیا۔ میں نے جنونی انداز میں پلٹ کر دیکھا، وہ لاؤنج میں کھٹنے والے دروازے سے ٹیک لگائے بڑی بے نیازی سے پاؤں پھیلانے بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ وہ ہم نہیں ہو سکتا تھا..... میری نظروں نے سید مجذوب کو



”وہ بھی اب بات بات پر مجھ سے رُوٹھنے لگی ہے.....“ میں نے شکوہ کیا۔

سید نے میرا جواب سن کر قہقہہ لگایا۔ اُس کے قہقہے میں طنز تھا، نفرت تھی، حقارت تھی۔ وہ دیر تک پیٹ پیٹ کے قہقہے لگاتا رہا۔ پھر یلکھت خاموش ہو کر اس طرح ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے کوئی آہٹ سن رہا ہو۔ پھر ہونٹوں پر اُننگی رکھ کر بڑی مدھم آواز میں بولا۔

”دشش..... دشش..... کوئل سو رہی ہے، جاگ گئی تو لٹو گھومنے لگے گا۔ اسی کے قدموں میں پڑا رہ، باقی سب بھول جا.....“

”تمہیں خدا کا واسطہ سید، آج مجھے مایوس مت کرنا.....“ میں نے انکاری سے کہا۔

”لقب لگا..... ڈبکی مار دے..... ناک دبی رکھنا.....“ وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ”کوئل جگنو پکڑ لے، اُس سے آنکھیں لڑایا کر.....“

”میں اس قید سے رہائی کا خواہشمند ہوں۔“ میں نے کھل کر بات کرنی چاہی۔

”زور کی کو دھکی لگ جانے دے..... گھانٹیں کھل جائیں گی۔“ اُس نے بڑی رازدارانہ سے جواب دیا، پھر داڑھی کھجلانے لگا۔

”میں تمہاری باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں، مجھ سے کھل کر بات کر دو پیر و مرشد۔“ میں نے عاجزی کا اظہار کیا۔

”لوٹن کبوتر کی طرح قلابازی کھانی شروع کر دے..... لاشی چلاتا سیکھ لے۔“

”سید.....“ میں نے تیزی سے کہا۔ ”پر یتیم لال کہتا تھا کہ تمہاری لاشی میں طاقت کے ہزاروں خزانے پوشیدہ ہیں۔ میرے لئے اور کچھ نہیں کر سکتے تو مجھے اس لاشی کے تمام راز سے ہی آگاہ کر دو۔“ میں نے منت کی۔

”پھر سہ کھینا شروع کر دیا.....؟“ اُس کی آنکھیں پٹپٹانے لگیں۔ ”جواری، شرابی کبابی.....“

”میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا چراغ گل کر دوں گا۔“ میں نے الجھ کر کہا۔

”دُھواں بن کر اڑ جائے گا.....“ سید نے مجھے چبھتی نظروں سے گھورا۔

”پھر کیا کروں.....؟“ میں جزبہ ہونے لگا۔

”اُلٹا کھڑا ہو جا..... ٹھیکے لگانا بند کر دے۔“

”سید، تمہیں حضرت گیسو دراز کی قسم۔“ میں نے تنک آ کر کہا۔ ”میری رہنمائی کر دو۔“

جواب میں سید کی آنکھوں میں شعلے رقص کرنے لگے، حضرت گیسو دراز کا نام سن کر اُس نے مجھے تیز نظروں سے گھورا، پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیل گیا۔ وہ مجھے مایوس کر گیا..... لیکن نہیں۔ اُس نے اپنے ڈھکے چھپے جملوں میں میری رہنمائی کرنے کی کوشش ضرور کی ہوگی، میری بہتری منظور نہ ہوتی تو وہ آنے کی زحمت کیوں گوارا کرتا؟ وہ خدا کا برگزیدہ بندہ تھا، شاید اُسے کھل کر کہنے کا اختیار نہیں تھا۔ میں ہی نا سمجھ تھا جو اُس کے رمز و اشاروں کی تہہ تک غوطہ لگانے سے قاصر تھا، اُس کی باتوں کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

میں بڑی دیر تک سید کی باتوں پر غور کرتا رہا، میری وحشتیں جنون کی سرحدوں کو چھونے لگیں۔ میں نے سرو جہنی کے اپارٹمنٹ سے جانے کی ٹھان لی۔ سرو جہنی والے دروازے پر دستک دینا بیکار تھا۔ وہ میرے راستے کی دیوار بن جاتی۔ میں کچھ سوچ کر آگے بڑھا، لاؤنج والے دروازے کی کنڈی کھول کر باہر آ گیا۔ سید کی لاشی میرے ساتھ تھی۔ میں باہر جانے والے راستے کی سمت قدم اٹھانے لگا..... مجھے معلوم تھا کہ باہر کی کھلی فضا میرے لئے کس قدر زہر آلود تھی، پولیس کے شکاری کتے گلی کوچوں میں میری بوسو گتھتے پھر رہے تھے۔ وہ کہیں نہ کہیں، کسی ٹکلی میں، کسی کوچے میں، کسی بازار میں مجھے ضرور دبوج لیتے، مجھے پھر اذیتوں سے گزرنا پڑتا۔ اُن کے پاس بظاہر میرے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وہ مجھے آزاد فضا میں سانس لینے کی اجازت کبھی نہ دیتے۔ انکا نہ بھی کہا تھا کہ میں باہر قدم نکالنے سے گریز کروں۔ اُس نے بتایا تھا کہ روی شکر نے وقتی طور پر اپنی کچھ نجی کمزوریوں کے سبب مرلی کی بات مان لی تھی، لیکن وہ بھی کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ میں مرلی کے گھر سے باہر کہیں پکڑا جاتا تو روی شکر کہہ سکتا تھا کہ اس نے صرف مرلی کے اپارٹمنٹ کی حدود تک چشم پوشی کی ضمانت دی تھی۔ میں بھی حالات کی نزاکت کو سمجھ رہا تھا۔ گرو پرتاپ کوئی چھوٹا موٹا پنڈت نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ دُرگا کی آواز کو نظر انداز کرنے کی جسارت کبھی نہ کرتا، انکا نے مجھے یقین دلایا تھا کہ گرو پرتاپ کو بھی اس کی نافرمانی کی سزا ضرور ملے گی۔

پولیس کمشنر اور بڑے پنڈتوں نے دُرگا کے پجاریوں کو نہ سمجھا ہوتا تو شاید ابھی تک وہ بمبئی کی شاہراہوں پر دھرتا جمائے بیٹھے ہوتے۔ کالی داس اور پنڈت اوم پرکاش کی اوپر



پہنچنے کی خاطر اُسے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے تھے؟ رانی کس ماحول کی پروردہ تھی؟ راجہ کے دل میں اُترنے کی خاطر کن حالات اور واقعات نے اُس کی قسمت کی یاوری کی تھی؟ دونوں کی شادی کے سلسلے میں کیا کیا پیچیدگیاں اور دشواریاں پیش آئی تھیں؟ پھر راجہ کا من موہ لینے کے بعد رانی نے سارے راج پاٹ اور سنگھاسن پر کس طرح قبضہ جمایا تھا.....؟ وہ نور جہاں کس طرح بن گئی.....؟ اکبر نے راجپوتوں کی بغاوت فرو کرنے کی خاطر جو دھابائی سے شادی کر لی لیکن جہانگیر کی محبت پر پہرے بٹھادیے گئے، انارکلی کو دیوار میں کیوں چنوا دیا گیا تھا؟ کوئی کنوئی راز تو ہوگا؟ وہ راز کھل جاتا تو ایک اور کہانی وجود میں آ جاتی، یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوتا، بات سے بات نکلتی رہتی، فسانوں میں جوڑ و پیوند لگتے چلے جاتے۔ لیکن جب قدرت کا اشارہ ہو جاتا تو تمام ادیبوں اور مصنفوں کے قلم رک جاتے، سارے کلی پھندوں کا ذخیرہ ختم ہو جاتا..... ترکی تمام ہو جاتی.....!!

میرے سلسلے میں بھی مقدر کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ میں اس اشارے کو کس طرح ٹال سکتا تھا.....؟

میں سینہ تانے قدم بدھاتا اپارٹمنٹ کے خارجی دروازے پر پہنچا تو مضبوط اور مقفل دروازے نے مزاحمت کی کوشش کی۔ میں نے سید کی لاشی کو دروازے پر ٹکا کر آہستہ سے دباؤ ڈالا تو دروازہ اپنی جگہ سے ہل گیا، قفل ایک کھٹکے کی آواز سے کھل گیا۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر قدم نکالنے کی کوشش کی۔

”ہینڈ زاپ.....“ کسی نے پشت سے لکارا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا، مرلی ڈرینگ گاؤن میں ملبوس ریوالور تانے کھڑا تھا۔ شاید دروازے کی چرچراہٹ اور قفل کے کھٹکے کی آواز نے اُسے بیدار کر دیا تھا۔ مجھے پہچان کر اُس نے ریوالور نیچا کر لیا، تیزی سے میرے قریب آ کر حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

”مہاراج..... تم اس سے کہاں جا رہے ہو.....؟“

”مرلی.....“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”میں نے تم سے پہلے بھی درخواست کی تھی کہ مجھے جیل پہنچا دو۔ تم نہیں سمجھ سکو گے، لیکن میں جانتا ہوں اب تمہارا اپارٹمنٹ بھی میرے لئے محفوظ نہیں رہا، گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائے، میں ایسا نہیں چاہتا۔“

”مجھے بتاؤ مہاراج، تم کو کس بات کا خطرہ ہے.....؟“

تلیے موت کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا جسے آسانی سے نظر انداز کر دیا جاتا۔ اخباروں نے ہم ضرور بڑے بڑے ادارے تحریر کئے ہوں گے، پولیس اور قانون کی ناکامی کی دھجیاں بکھیرا ہوں گی، ابھی تک میری گرفتاری کے مطالبے پر زور دیا جا رہا ہوگا۔ حکومت کی جانب سے وضاحتی بیانات بھی شائع ہو رہے ہوں گے، انکا کی بات غلط نہیں ہو سکتی تھی۔ روی شکر! موقع کی تلاش میں تھا تو اُس نے اپنے اعتماد کے آدمیوں کو چوپاٹی کے ایک ایک چپہ نگرانی پر مامور کر رکھا ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ میں عمارت سے باہر قدم نکالتے ہی دھریا جاتا میری گرفتاری کے بعد سرجنی بھی سوائے پھڑ پھڑانے کے اور کیا کر سکتی تھی۔ بات کسی ایک آدمی کی ہوتی تو شاید اُس کے گداز بدن کے نشیب و فراز میری سفارش کے کام آ جاتے۔ لیکن وہ جمیل احمد خان کے سلسلے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ہندوستان کے تمام چنڈت پجاریوں کو جمیل احمد خان کی تلاش تھی، وہ ایک عرصے سے میری گھات لگائے بیٹھا تھا۔ چنڈت نول کشور ہردوار میں بیٹھا اپنے چیلوں کے ذہنوں میں میرے خلاف زہر بھرتا تھا۔ بدری نرائن اور امر لال کی موت کا فسانہ ابھی تک اُن کے خیالوں میں گونج رہا ہوگا۔ چندرا نے قسم کھائی تھی کہ جب تک وہ مجھ سے اپنے باپ کا انتقام نہیں لے گا کسی صنف نازک کے بدن کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ بدری نرائن کے واقف کاروں نے بھی اُس کی چٹاک راکھ ایک لٹیا میں محفوظ کر رکھی تھی۔ انہوں نے بھی کالی کے مندروں میں بیٹھ کر دیوتاؤں کو وچن دیا تھا کہ میرا جنازہ قبر میں اتارنے کے بعد ہی بدری نرائن کی راکھ آخری رسومات کی ادائیگی کے فرض سے سبکدوش ہوں گے۔

سرجنی، انکارانی کے زیر اثر تھی۔ اُسی کی فراہم کردہ معلومات کی وجہ سے میں نے مرا کو بے دام غلام بنالیا تھا۔ ورنہ بات کب کی بگڑ چکی ہوتی۔

میں بچہ نہیں تھا کہ وقت کی نزاکت اور حالات کی سنگینی کو نہ سمجھ پاتا۔ لیکن مقدر کے لکے کو مٹانا بھی میرے اختیار میں نہیں تھا، میں تمام مصلحتوں سے واقف تھا لیکن کسی اندر و حشت نے مجھے بیٹھے بٹھائے و رغلا دیا تھا..... یہ وحشتیں، جنون کی یہ باتیں نہ ہوتیں تو لہو چوڑی کہانیاں اور افسانوی سلسلے کبھی جنم نہ لیتے، بات ایک لائن میں ختم ہو جاتی..... ”ایک تھاراجہ، ایک تھی رانی، دونوں مر گئے ختم کہانی“..... آگے تمام شد لکھ دیا جاتا۔ کیا ضرور تھی یہ بتانے کی کہ راجہ کون تھا؟ کہاں پلا بڑھا تھا؟ کیسے پروان چڑھا تھا؟ راج گدی تک

”وقت مت ضائع کرو، میری بات مان لو۔ اسی میں سب کی بھلائی ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن سروجنی.....“

”میں اُسے بعد میں سمجھا لوں گا..... جلدی کرو، میرے پاس سے کم ہے۔“

”ایک منٹ ٹھہرو مہاراج، میں لباس بدل لوں۔“ مرلی نے درخواست کی۔ لیکن اُسے منع کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ لباس بعد میں تبدیل کرے گا، پہلے سروجنی کو بیدار کے میرے جانے کی اطلاع دے گا۔ سروجنی کے علاوہ انکا کو بھی میرے جانے کی بھنک جاتی تو بات بگڑ جاتی۔ وہ میرے سر پر آ کر اپنے بچوں کے نشتر لگاتی، میں پھر سے بے ہوش ہوجاتا۔

”لباس کی فکر مت کرو۔“ میں نے کہا۔ ”تم اسی لباس میں باہر کا راؤنڈ لینے نکلے۔ اتفاق سے تم نے مجھے مشتبہ حالت میں دیکھ کر پیچھا کیا۔ میں نے فرار ہونے کی کوشش کی، کامیاب نہ ہو سکا۔ سمجھ رہے ہو میری بات؟ یہ کہانی زیادہ موثر ثابت ہوگی..... جلدی کرو مرلی ہچکچا رہا تھا۔ پھر اُس کی نظریں دروازے کی ہلی ہوئی چولوں پر پڑیں تو اُس آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”تم سامنے نہ آ جاتے تو میں پورا دروازہ اکھاڑ کر ایک طرف رکھ دیتا۔“ میں جھلا بولا۔ ”میری بات مان لو ورنہ وقت گزرنے کے بعد ایک بھاگے ہوئے مجرم کو اپارٹمنٹ میں پناہ دینے کے جرم میں تمہاری وردی بھی اتر جائے گی۔“

مرلی نے بالآخر میری بات مان لی۔ میں نے اُسے خوابگاہ میں جانے کا موقع نہیں دیا۔ وہ بھی دروازے کا انجام دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا، اسی لباس میں میرے ساتھ نیچے آ گیاراج سے گاڑی نکالی، مجھے لے کر تھانے کی سمت روانہ ہو گیا۔ لیکن اُس کے چہرہ ابھی تک الجھن اور پریشانی کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ اُسے مجھ سے زیادہ سروجنی کا لاحق تھا۔

”ایک بات کا دھیان رکھنا۔“ میں نے اُسے یاد دلایا۔ ”میری لاشی مجھ سے جائے، تم کوئی بھی بہانہ کر سکتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ کوئی ماتحت تمہارا حکم ماننے سے انہیں نہیں کرے گا۔“

”حالات بدل چکے ہیں مہاراج.....“ مرلی نے کسمسا کر جواب دیا۔ ”ماتحت سا

ہوتے ہیں تو دم ہلاتے رہتے ہیں، اکیلے میں افسروں کی ماں بہن ایک کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے.....“

”انہیں کسی طرح سمجھا دینا۔“ میں نے دوبارہ زور دے کر کہا۔ ”لاٹھی مجھ سے لے لی گئی تو میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے سکون سے نہیں رہ سکوں گا۔“

”اس لاٹھی میں ایسی کیا بات ہے؟“ اُس نے مجھے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”واپسی میں ایک بار پھر اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے کو غور سے دیکھنا۔“ میں نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔ ”تمہیں خود ہی اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔“

رات سنان اور ویران تھی، سڑکوں پر برائے نام گاڑیاں نظر آرہی تھیں، پولیس کی ایک سائرن کار دُور سے شور مچاتی ہماری جانب لپکی لیکن قریب آ کر انہوں نے مرلی کی گاڑی شناخت کی تو خاموشی سے آگے نکل گئی۔

”دیکھ رہے ہو مرلی؟“ میں سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”ایک ہفتہ گزر گیا، لیکن ابھی میری تلاش جاری ہے۔“

”ہو سکتا ہے تمہارا اندازہ درست ہو۔ لیکن رات کے وقت جرائم پیشہ افراد کی وجہ سے پولیس زیادہ چوکس رہتی ہے، آج کل دہشت گردی کی وارداتوں میں بھی اضافہ ہونے لگا ہے۔“

”روی شکر سے بگاڑ مت کرنا۔ لیکن اُسے اپنے من کے کسی بھید سے بھی آگاہ مت کرنا۔“ میں نے اُس کی بات نظر انداز کر کے کہا تو وہ چونکا۔

”میں سمجھا نہیں مہاراج.....؟“

”وہ اوپر سے جتنا شانت نظر آتا ہے، اندر سے اتنا ہی کھوٹا بھی ہے۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”میں دیکھ چکا ہوں کہ اُس کے سادہ لباس والے روز بروز اپنا گھیرا تنگ کر رہے تھے، کسی نہ کسی بہانے اُس کے آدمی تمہارے گھر میں آ جاتے۔ میں تمہارے اپارٹمنٹ میں گرفتار ہوتا تو تم بھی لپیٹ میں آ جاتے۔ میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔“

تھانہ قریب آنے لگا تو مرلی نے میری ہدایت پر میرے دونوں ہاتھ پشت پر کر کے باندھ دیئے۔ ایسا کرتے ہوئے اُس کی حالت قابل دید تھی۔ میں اُس کے دل کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔

”میری کوئی چٹا مت کرنا بالک.....“ میں نے گمبیر آواز میں کہا۔ ”میں دو ہفتے سبھانے کی خاطر ایک طرف لے گیا تھا۔ میں پولیس کے درمیان گھرا خاموش کھڑا رہا۔ زیادہ پولیس کا مہمان نہیں رہوں گا، ابھی ستارے گردش میں ہیں، لیکن سے گزرتے مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مرلی اور بلیر دونوں بات کرتے ہوئے میرے قریب آ بھی نہیں لگتی۔“

مرلی اثبات میں گردن ہلاتا رہا، تھانے کے دروازے پر کھڑے سپاہی نے جھپٹ پھانک کھول دیا۔ مرلی ڈرینگ گاؤں میں نیچے اتر تو کئی سپاہی موقع کی نزاکت بھانپ اندر کی طرف بھاگے، تھانے کا انچارج انسپکٹر بلیر وردی ٹھیک کرتا ہوا باہر آ گیا۔ اُسے سوتے سے بیدار کیا گیا تھا، نیند کا خمار ابھی تک اُس کی نظروں سے جھانک رہا تھا۔ مرلی کے قریب آ کر اُس نے بڑا زوردار سیلوٹ مارا، پھر حیرت سے بولا۔

”سر..... آپ اس سے..... اس لباس میں.....؟“

میں نے جواب میں ہونٹ چبانا شروع کر دیئے۔ مرلی زیادہ دیر نہیں زکا، اُس کے میں ابھی تک گاڑی میں بیٹھا تھا۔ سید مجذوب کی لاشی میری گود میں پڑی تھی۔ مرلی۔ جانے کے بعد پولیس کے ارکان بلیر کے اشارے پر مجھے گھینٹے ہوئے اندر لے گئے۔ مجھے بلیر سے کچھ کہا تو وہ اُچھل پڑا۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا، پل بھر میں مسلح سپاہی ہونٹ چھیل دھکیل کر قفل لگا دیا گیا۔ دورانقل بردار پوزیشن لے کر کھڑے ہوئے گاڑی کو گمبیرے میں لے لیا۔ مرلی، بلیر کو دکھانے کی خاطر سینہ تان کر آگے بڑھا، گاڑ گئے۔ بلیر، سید کی لاشی ہاتھ میں لئے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، پھر بڑی حقارت سے بولا۔

”کا دروازہ کھول کر اُس نے مجھے نیچے اترنے کا حکم دیا۔ اُس کی کیفیت بتا رہی تھی کہ وقت وہ بڑے مشکل مراحل طے کر رہا تھا۔ میں آہستہ سے نیچے اتر اور دانستہ طور پر لڑکھڑا کرتے گرتے بچا۔ سید کی لاشی گود سے پھسل کر زمین پر جاگری۔

”خبردار.....“ بلیر نے اپنا سروس ریوالتور مجھ پر تان لیا۔ ”اگر چالاکی دکھانے کی حما کی تو پورا شریر چھلنی کر ڈوں گا۔“

”جب میں نے اسے لاکار اتویہ بھاگا تھا، لیکن پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے لنگڑا رہا تھا۔“ اسی لئے مجھے زیادہ دُشواری نہیں ہوئی۔“ مرلی نے میرے لڑکھڑانے کا مقصد سمجھ کر کہا۔

”یو ڈونٹ وری سر.....“ بلیر درمیان میں بول پڑا۔ ”میں اس کو اسی لاشی کا ایسا جلا ڈوں گا کہ سارا کھایا پیا اُگل دے گا۔“

جواب میں مرلی نے مسلح سپاہیوں کو میری طرف سے ہوشیار رہنے کا اشارہ کیا، پھر بلیر کو ساتھ لے کر تھوڑے فاصلے پر چلا گیا۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ بلیر ایک سخت گیر طبیعت کا خبیث پولیس آفیسر ہے۔ مرلی شاید اُسے میرے سلسلے میں

”تم..... میں نے برداشت کا مظاہرہ کیا۔“ تم مجھ سے کیا اُگلوانا چاہتے ہو.....؟“

”پنڈت کالی داس کیسے مرا تھا.....؟“

”مجھے نہیں معلوم.....“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”پنڈت اوم پرکاش کا نام سنا ہے کبھی.....؟“

”نہیں.....“ میں بولا۔ ”میں مسلمان ہوں، پنڈت پجاریوں سے میرا کیا لین دین؟“

”ایک ہفتے سے کہاں چھپا بیٹھا تھا.....؟“ بلبیر نے پھنکارتے ہوئے دریافت کیا۔

”سببی کی ساری پولیس مل کر بھی تجھے نہیں تلاش کر سکی اور ڈپٹی مرلی نے تجھے چوہے اُ

طرح پکڑ لیا..... اصل چکر کیا ہے؟ سیدھی طرح اُگل دے ورنہ تیری کھاٹ کھڑی کر دوا

گا۔ صبح تک تیرا حلیہ اتنا بگڑ چکا ہو گا کہ مرلی بھی نہ پہچان سکے گا۔“

”مجھے ایک سادہ کاغذ اور قلم لا دو.....“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”م

دستخط کے ساتھ ساتھ انگوٹھا بھی لگا دوں گا، تم جو چاہے لکھ لینا.....“

بلبیر اس طرح بھڑک اٹھا جیسے پٹرول کے کنوئیں میں کسی نے جلتی ہوئی تیلی اچھا

دی ہو۔

”بھڑوے..... حرامی..... سور کی اولاد.....“ وہ حلق کے بل چلایا۔ ”انسپکٹر بلبیر کا نفا

اڑانے کی کوشش کر رہا ہے؟“

”آپ اپنی زبان کیوں خراب کرتے ہو صاحب؟“ ایک بڑے کٹے سنتری نے بلبیر

کہا۔ ”مجھے ایک موقع دو، میں ابھی اس مُسلے کو ٹھونک بجا کر لکڑی کی طرح سیدھا کر دوں

اس کی زبان فر فر چلنے لگے گی..... یہ کیکر کے جج آسانی سے زبان نہیں کھولتے.....“

بلبیر نے کوئی جواب نہیں دیا، غضبناک نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے غرایا۔

”میں تجھے دو منٹ کی مہلت دیتا ہوں..... سچ بتا دے کہ تیری اور ڈپٹی مرلی کی

ساتھ گانٹھ ہے؟“

”تم بار بار کس ڈپٹی کی بات کر رہے ہو.....؟“ میں نے انجان بننے کی کوشش ک

”میں مرلی کا نام تمہاری زبان سے پہلی بار سن رہا ہوں۔“

بلبیر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک پڑا۔

”نرا بن..... پر شتم..... جو کھیا..... ششیکھر، تم چاروں مل کر اس حرامی کی دھنائی شروع

دو۔“ اُس نے اپنے ارد گرد موجو دسپا ہیوں میں سے چار کا انتخاب کیا۔ ”اتنا مارو سالے

مٹی نکل پڑے کجھر کے اولاد کی.....“

بلبیر، سید کی لالچی ہاتھ میں لئے کھڑا غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اُس کے حکم کی

پیروی میں لاک اپ کا قفل کھول دیا گیا۔ چار سپاہی اندر گھس کر مجھ پر ٹوٹ پڑے، انہوں

نے مجھے زمین پر گرانے میں دیر نہیں لگائی، میں نے مزاحمت کی کوشش نہیں کی، البتہ سر

بچانے کی خاطر دونوں ہاتھ چلانے لگا۔ وہ میرے جسم پر جوتوں سے ٹھو کریں مار رہے تھے،

سب تجربہ کار تھے، انسان کی ایک ایک رگ، ایک ایک جوڑے سے واقفیت رکھتے تھے۔ میں

زمین پر پڑا بلبلاتا رہا۔ پچھائیں کھاتا رہا، بلبیر دُور کھڑا مجھے مغلظات اور فحش گالیوں سے

نوازا تا رہا۔ میری حالت غیر ہونے لگی۔ ایک سپاہی کی ٹھوک میرے بائیں ہاتھ کی کہنی پر لگی تو

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پرستم لال کی پراسرار شکتی سے جڑا ہوا مصنوعی ہاتھ پھر ٹوٹ گیا،

میری چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ چاروں سپاہی مشینی انداز میں مجھے لاتوں اور

گھونٹوں سے نوازا رہے تھے..... میں ماہی بے آب کی مانند تڑپ رہا تھا۔

”ششیکھر.....“ بلبیر نے چیخ کر اُس بڑے کٹے سپاہی کو مخاطب کیا جس نے میری کہنی پر

شدید ضرب لگائی تھی۔ ”بہت آوازیں نکال رہا ہے یہ مُسلا..... اس حرامی کے منہ پر پیشاب

کر دے، پھر بھی آواز نکالے تو گلا دبا دینا..... مر جائے تو اس کی لاش اٹھا کر ڈپٹی کے

اپارٹمنٹ کے باہر چھوڑ آنا۔ اُس ماں کے خصم نے بھی میرا حق مار کر ترقی حاصل کی تھی۔“

بلبیر نے غصے کے عالم میں مرلی کے ساتھ ساتھ سروجنی کی آوارگی کے قصے بھی بڑے

فحش انداز میں سنانے شروع کر دیئے۔ سپاہی اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے جب فون

کی گھنٹی بجی۔ بلبیر نے پلٹ کر میز پر رکھے فون سیٹ کی جانب دیکھا، پھر ہاتھ اٹھا کر اشارہ

کیا تو ایک سپاہی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر اتنی شدت سے دبایا کہ آواز کے ساتھ ساتھ

میرا دم بھی گھٹنے لگا۔ بلبیر نے آگے بڑھ کر ریسور اٹھا لیا، اُس نے بڑی دہنگ آواز میں

”ہیلو“ کہا تھا۔ لیکن دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز سنتے ہی ہکھلانے لگا۔

”جی..... یس سر..... میں انسپکٹر بلبیر بول رہا ہوں..... جی سر..... جی سر..... آپ کی

انفارمیشن ٹھیک ہے سر..... جی سر..... میں سن رہا ہوں..... جی سر..... اوکے سر، میں حکم کی

تعمیل میں دیر نہیں لگاؤں گا..... مم، میں سمجھ رہا ہوں سر..... کسی کو کان و کان خبر نہیں ہوگی

..... رائٹ..... رائٹ سر.....“

ریسپور رکھ کر وہ تیز تیز قدم اٹھا تالاک اپ کے قریب آیا۔ شیکھر بدستور میرے منہ پر پورا زور دیئے چڑھا بیٹھا تھا۔

”شیکھر.....“ اُس نے سرد لہجے میں حکم دیا۔ ”اس حرامی کو زیور پہنا کر میری پرائیویٹ کار میں لے جا کر بٹھا دے۔ سالے کا تھوڑا سا میک اپ بھی ٹھیک ٹھاک کر دے۔ اس کی بہن کے سسرال سے بلاوا آیا ہے.....“

وقتی طور پر مجھے بے رحم جلادوں سے نجات مل گئی، مجھے ہتھکڑی پہنا کر لاک اپ سے نکالا گیا۔ چار سنگین بردار مسلح سپاہی میرے ارد گرد پوری طرح چوکس نظر آرہے تھے۔ مجھے تھانے کے عقبی حصے میں کھڑی ایک کار میں پچھلی سیٹ پر ڈال دیا گیا۔ شیکھر نے اگلی سیٹ پر بیٹھ کر مجھ پر ریوالور تان لیا۔ وہ مجھے کہیں اور لے جا رہے تھے۔ کہاں.....؟ مجھے علم نہیں تھا۔ دو منٹ بعد بلیر نے آکر اسٹیرنگ سنبھال لیا.....!

شیکھر شاید بلیر کے اعتماد کا آدمی تھا، اس کے سوا کسی اور کو ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ممکن ہے مسلح سپاہی کسی اور گاڑی میں بیٹھے ساتھ ساتھ چل رہے ہوں، مجھے اس کا بھی علم نہیں تھا۔ میرے ذہن میں بلیر کی غلیظ گالیاں گونج رہی تھیں۔ مجھے انکارانی بڑی شدت سے یاد آرہی تھی۔ وہ میرے سر پر ہوتی تو صورت حال مختلف ہوتی۔ وہ بھی دُرگا کی آواز کی وجہ سے اکیس روز تک براہ راست میری مدد نہیں کر سکتی تھی، لیکن دوسروں کو لگنی کا ناچ ضرور نچا سکتی تھی۔ میں نے اُسے سروجنی کے گھر سے رخصت ہونے کی اطلاع بھی نہیں دی، وہ اس وقت سروجنی کے بالوں کی تیج پر لیٹی خراٹے لے رہی ہوگی اور میں جلد بازی میں اٹھائے ہوئے قدم کی سزا بھگت رہا تھا۔ دُرگا کے عتاب سے رہائی میں ابھی دو ہفتے باقی تھے۔ میں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ بلیر کا حساب چمکا کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لوں گا۔

گاڑی کا سفر بیس منٹ تک جاری رہا۔ راستے میں بلیر اور شیکھر کے درمیان مختصر سے دو ایک جملوں کا تبادلہ ہوا۔ بلیر نے اُس سے کہا تھا کہ وہ اُس کے اعتماد کو کبھی دھوکہ دینے کی غلطی نہ کرے، جواب میں شیکھر نے اُسے یقین دلایا کہ وہ مرتے دم تک اُس کا وفادار رہے گا، گردن کٹوا دے گا لیکن زبان نہیں کھولے گا۔

بیس منٹ بعد گاڑی روک دی گئی، شیکھر نے پچھلا دروازہ کھول کر مجھے باہر نکالا، وہ

ایک پرانے طرز کی دو منزلہ عمارت تھی، میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ جان سکا۔ شیکھر نے ایک کمری نظروں پر پٹی باندھ دی۔ میرے بائیں ہاتھ کی کہنی میں ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ شیکھر نے اُسی بازو کو تھام کر مجھے دھکا دے کر آگے بڑھایا۔ میں نے کئی جگہ ٹھوکریں کھائیں، گرتے گرتے بچا۔ اس کیفیت میں بھی میں لنگڑا لنگڑا کر چلتا رہا۔ میں انہیں باور کراتا چاہتا تھا کہ مرلی نے لائھی کی ضرورت کو میرے لنگڑے پن سے غلط منسوب نہیں کیا تھا۔

کئی موڑ درمیان میں آئے، مجھے سڑھیاں بھی ملے کرنی پڑیں۔ میری سیدھی کہنی کئی جگہ چکنی دیوار اور لکڑی کے دروازوں سے بھی ٹکرائی۔ پھر ایک جگہ مجھے روک دیا گیا، ہاتھوں کو پشت پر کر کے مجھے ہتھکڑیاں پہنائی گئی تھیں اس لئے مجھے زیادہ الجھن ہو رہی تھی۔

”تم اب باہر جا کر گاڑی میں میرا انتظار کرو۔“ بلیر کی مدھم آواز ابھری۔ ”ایک بار پھر تنبیہ کر رہا ہوں کہ اپنی زبان بند ہی رکھنا۔“

قدموں کی آواز ابھر کر دُور ہوتی چلی گئی۔ شیکھر نے شاید اشارے میں جواب دیا تھا، مجھے اُس کی آواز نہیں سنائی دی۔

”جمیل احمد خان.....“ ایک لمحہ بعد بلیر نے میرا بازو تھام کر سرد لہجے میں کہا۔ ”تمہاری زندگی کے آخری لمحے قریب آرہے ہیں۔ تم چاہو تو اپنی زبان سے سچ اُگل کر بچ بھی سکتے ہو.....“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، بلیر نے بھی دوبارہ کوئی بات نہیں کی، میرا ہاتھ تھامے خاموش کھڑا رہا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چاروں طرف روشنیاں پھیل گئی ہوں۔ میرا اندازہ غلط نہیں ثابت ہوا، بلیر نے دوسرے ہاتھ سے میری آنکھوں کی پٹی ایک جھٹکے سے ہٹا دی تھی۔

میں ایک مختصر سے کمرے میں کھڑا تھا جہاں ایک کرسی کے علاوہ فرنیچر نام کی کوئی دوسری شے نظر نہیں آرہی تھی۔ پہلی نظر میں مجھے وہ کمرہ کوئی ناز چر سیل ہی محسوس ہوا جسے خطرناک مجرموں کی زبان کھلوانے کی خاطر کام میں لایا جاتا ہوگا۔ میں ابھی ماحول کا جائزہ لے رہا تھا کہ سامنے کا بند دروازہ کھلا اور میں حیرت بھری نظروں سے اُس شخص کو دیکھنے لگا جو شب خوابی کے لباس کے اوپر ایک قیمتی گاؤن پہنے میرے سامنے کھڑا تھا..... وہ ڈی آئی جی روپی



شکر کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

بلیر نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا، اینٹنشن پوزیشن میں آکر زوردار سیلوٹ کیا، پھر اشارہ پا کر اسی برق رفتاری سے اباؤٹ ٹرن ہوا اور لفٹ رائٹ کرتا کمرے سے باہر چلا گیا۔ کمرے میں روی شکر اور میں رہ گئے، کچھ دیر تک اُس کی عقابانی نظریں میرے چہرے پر منڈلاتی رہیں، پھر اُس نے بڑے سلجھے ہوئے لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”تمہاری گرفتاری کس طرح عمل میں آئی.....؟“

”مجرم اور قانون کی آنکھ چمکی کا سلسلہ ازل سے قائم ہے، ابد تک یوں ہی چلتا رہے گا۔“ میں نے سنہل کر جواب دیا۔ ”کبھی مجرم قانون کی نظروں میں ڈھول جھونک کر نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، کبھی قانون حاوی ہو کر مجرم کی گردن دبوچ لیتا ہے۔ آج قانون کی خوش قسمتی اور میری بد نصیبی کا دن تھا۔ میں فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا، تمہارے ایک آفیسر نے ریوالور تان کر گرفتار کر لیا۔“

”تم شاید مرلی کی بات کر رہے ہو.....؟“ ڈی آئی جی نے نفسیاتی انداز میں میری زبان کھلوانی چاہی، میں اُس کی ریاکاری تازہ کیا۔ انکارانی بتا چکی تھی کہ روی شکر نے مصفا آکھیں بند کر لی تھیں، وہ کسی موقع کی تلاش میں تھا۔

”میں اس..... نام سے واقف نہیں ہوں۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

”مجھے اپنا دشمن مت سمجھو۔“ اُس نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ ”دشمن ہوتا تو ملاقات کے لئے تم کو اپنے دفتر بھی طلب کر سکتا تھا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، روی شکر کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتا رہا۔ ”انسپکٹر بلیر نے تمہارے ساتھ غالباً کوئی اچھا برتاؤ نہیں کیا۔“ اُس نے ہونٹ چبانے ہوئے کہا۔ ”جرم ثابت ہوئے بغیر کسی مشتبہ یا مشکوک آدمی پر تشدد کرنا پولیس کے ضابطہ اختیار میں نہیں آتا۔“

”مسٹر روی شکر.....“ میں نے زہر خند سے پوچھا۔ ”تم کو میری گرفتاری کی اطلاع کب مل گئی؟“

”میں ڈی آئی جی ہوں.....“ اُس نے پیئٹر بدل کر جواب دیا۔ ”ہمارے اپنے بکو کچھ ذرائع ہوتے ہیں۔“

”مجھے اس وقت یہاں کس مقصد سے بلایا گیا ہے.....؟“

”تم جانتے ہو کہ پنڈت کالی داس اور پنڈت اوم پرکاش کے قتل نے پنڈت پجاریوں کو آپے سے باہر کر دیا ہے۔ اگر پولیس کشنر اور.....“

”میں کسی پنڈت اور پجاری کو نہیں جانتا۔“ میں نے اُس کا جملہ کاٹ کر سنجیدگی سے کہا۔ ”بوسکتا ہے تم درست کہہ رہے ہو۔ لیکن پولیس کو بہر حال تمہاری ذات پر شبہ ہے۔“

روی شکر کے لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ ابھری، دبی زبان میں بولا۔ ”ابھی تم اعتراف کر چکے ہو کہ تمہیں فرار ہوتے ہوئے کسی نے گرفتار کیا تھا.....“

”اب اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں بے گناہ ہوں، پولیس بلا وجہ مجھے پریشان کر رہی ہے، تو کیا تم یقین کر لو گے؟“ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”تم مجھے پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ اور مہذب شخص معلوم ہوتے ہو۔ پھر تم نے جرم کا راستہ کیوں اختیار کیا.....؟“ اُس کے تیور میں نمایاں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی۔

”میں کھل کر ایک بات کہوں..... سنو گے؟“

”کہو.....“

”تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو.....“ میں نے نفرت کا اظہار کیا۔ روی شکر کی پیشانی ٹھکن آلود ہو گئی۔

”کسی کی باتوں نے شاید تمہیں بڑی خوش فہمیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔“ اُس کے لہجے میں ترشی اُتر آئی۔ ”میرے پاس تمہارا پرانا ریکارڈ بھی موجود ہے، نہ ہوتا تب بھی میرا ایک

اشارہ تمہارے لئے بہت کافی ہے..... سمجھ رہے ہو میری بات؟“

”کیا قبول کرانا چاہتے ہو تم.....؟“ اُس نے خشک آواز میں دریافت کیا۔

”تم پہلی فلائٹ سے لندن واپس چلے جاؤ۔“ وہ مٹھی سمجھ کر بولا۔ ”یہ سہری موقع تمہیں دوبارہ نہیں ملے گا، شرط یہ ہے کہ تم اس ملک میں کبھی واپس نہیں آؤ گے۔“

”اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں تو.....؟“

”وقت ہاتھ سے نکل گیا تو زندگی بھر پچھتاؤ گے جیل احمد خان۔“ اُس نے جھلا کر کہا۔ ”زندگی چاہتے ہو تو میری بات مان لو۔“

”پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں میرے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی ہے.....؟“

وہ رات میرے لئے بڑی اذیت ناک تھی۔ روی شنکر کے حکم کے بعد انسپکٹر بلیئر کو گویا میری موت کا پروانہ حاصل ہو گیا تھا۔ مجھے بہن کے کسی دور دراز علاقے میں لے جا کر ایک زمین دوز تہ خانے میں ڈال دیا گیا جہاں ایذا رسانی کے تمام جدید سامان موجود تھے۔ جس کمرے میں مجھے رکھا گیا، وہاں صرف شیکھر میری نگرانی پر موجود تھا۔ کمانڈ بلیئر کے ہاتھ میں تھی۔ اس عقوبت خانے کے باہر یقیناً سخت پہرہ رہا ہوگا.....!!

میرے پیروں میں زنجیریں ڈال دی گئیں۔ ایک ہاتھ میں جھکڑی پہنائی گئی۔ اس کا دوسرا حصہ دیوار میں لگے مضبوط کنڈے میں ڈال دیا گیا۔ میں پختہ فرش پر پڑا تھا، اپنی جگہ سے بمشکل ایک دو فٹ تک حرکت کر سکتا تھا۔ کمرے کی چھت سے مدھم پادور کا ایک بلب لٹک رہا تھا۔ درود دیوار پر جا بجا خون کے چھینٹے سیاہی اختیار کر کے زبان حال سے اس ظلم و ستم کی کہانی سناتے نظر آرہے تھے جو مجھ سے پہلے دوسروں کے ساتھ روا رکھا گیا تھا۔ ماحول گھٹا گھٹا اور وحشت ناک تھا۔ نہ جانے کتنی بد نصیب رُوحیں اب بھی وہاں اپنے ادھرے ہوئے جسم کی تلاش میں بھٹک رہی ہوں گی۔ میں ابھی گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک کر بناک چیخ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ایک گرج دار آواز ابھری۔

”دس منٹ اور باقی رہ گئے ہیں مادر بہ خطا۔ اب بھی زبان کھول دے۔ ورنہ ہم تجھے بھی بغیر ٹکٹ کے لمبے سفر پر روانہ کر دیں گے۔ اس کے بعد تیری جوان لگائی کو اٹھا لائیں گے۔ کچھ دن اُس کے ساتھ موج مستی کریں گے۔ پھر.....“

”مم..... میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“ کوئی دردناک آواز میں رحم کی درخواست کرنے لگا۔ ”میں زردوش ہوں۔ بھگوان کے لئے.....“

”کھال ادھیڑ و حرامی کی۔“ کوئی تحکمانہ انداز میں چیخا۔ ”اچی گندی زبان سے بھگوان کا نام لے رہا ہے۔“

کر بناک چیخوں کی آوازیں اور تیز ہو گئیں..... بلیئر سینہ تانے کھڑا میرے چہرے کے

اس بار روی شنکر نے جواب نہیں دیا۔ اُس کی نگاہوں میں چنگاریاں چمکنے لگیں، مجھ حقارت سے گھورتے ہوئے اُس نے جھلا کر اپنا سیدھا ہاتھ فضا میں بلند کیا، دوسرے ہاتھ انسپکٹر بلیئر لفٹ رائٹ کرتا سامنے آ گیا۔

”سر.....“ اُس نے قدم جوڑ کر روی شنکر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا حکم ہے؟“

”اے انڈر گراؤنڈ کر دو.....“ روی شنکر کے لمبے میں سفاکی تھی۔ ”کوشش کرو کہ یہ تیرے روز کے اندر میری بات مان لے، انکار کی صورت میں تمہیں میری طرف سے مکمل اختیار، گا..... ایک بات اور..... کسی سے خوفزدہ یا مرعوب ہونے کی کوشش مت کرنا، میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

روی شنکر جس دروازے سے آیا تھا، اُسی سے واپس چلا گیا۔ میری آنکھوں پر پھر پڑا باندھ دی گئی.....!!



تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اشارہ کیا تو شیکھر نے کمرے کے واحد دروازے کو بند کر دیا۔ چیخوں کی آوازیں آتا بھی بند ہو گئیں۔

”سنا تو نے؟ برابر کے ڈرائنگ روم میں ہمارے کارندے اپنے مہمان کا کیسا سواگت کر رہے ہیں؟“ بلیر کے لہجے میں زہریلی زہر تھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”بڑے صاحب نے صرف تین روز کی مہلت دی ہے تجھے۔“ اُس نے حقارت سے کہا۔ ”کیا ارادے ہیں؟ سیدھی طرح جائے گالندن یا ماش کرانے کا ارادہ ہے؟“

”میں لندن نہیں جاؤں گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ ”تم اپنے ارمان پورے کر لو۔۔۔۔۔۔ لیکن میری ایک بات کان کھول کر سن لو بلیر، تم اپنے حق میں کانٹے بھرے ہو۔ تم نے صرف میرا نام سنا ہے، میرے بارے میں تفصیل سے آگاہ ہوتے تو اس وقت میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے۔“

”ابھی تک مرلی کے کھونٹے پراکڑ رہا ہے۔۔۔۔۔۔؟“ بلیر نے فحش کلامی شروع کر دی۔ ”سردجی اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اُس کا سارا جوس نکل چکا ہے۔ اب صرف پھوک باقی رہ گیا ہے سالی میں۔ مرلی کب تک اُس کتیا کے بل بوتے پر چلے گا۔۔۔۔۔۔ اور تو۔۔۔۔۔۔“ اُس نے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ ”تو مجھے تڑی لگا رہا ہے، بلیر کو۔۔۔۔۔۔ اپنے اصلی باپ کو؟“

”بلیر۔۔۔۔۔۔“ میں پوری قوت سے چیخا۔ ”تم اپنی اوقات سے بڑھ رہے ہو۔ میرے ماں باپ کی شان میں گستاخی کرنے سے باز آ جاؤ۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ صرف رات رات کی بات ہے۔ صبح ہونے کے بعد تم۔۔۔۔۔۔“

”مالک پر بھونک رہا ہے۔۔۔۔۔۔ کتے۔۔۔۔۔۔“ بلیر نے اچانک بھرپور ٹھوکر میرے منہ پر ماری، میرے دانت بل گئے۔ ہونٹ پھٹ گیا۔ خون کے قطرے میرے لباس کو رنگین کرنے لگے۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔

شیکھر کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ برابر والے کمرے سے تشدد کی آوازیں پھر سنائی دینے لگیں۔ بلیر نے دوسری ٹھوکر ماری۔ میں نے بچنے کی کوشش کی لیکن بلبلا کر رہ گیا۔

”صبح کیا ہوگا۔۔۔۔۔۔؟ بول۔۔۔۔۔۔“ بلیر نے تیسری ٹھوکر میرے سینے پر مارنے کی کوشش کی۔ میں جھک گیا، اُس کے جوتے کی نو میرے سیدھے بازو سے ٹکرائی، درد کی لہر پورے

جسم میں دوڑ گئی۔ وہ بدستور گر جتا رہا۔ ”کیا ہوگا صبح؟۔۔۔۔۔۔ اب چپ کیوں ہو گیا۔۔۔۔۔۔“

”تم۔۔۔۔۔۔“ میرے اندر جنون نے سر اُبھارتا شروع کر دیا۔ یہی جنون مجھے مرلی اور سردجی کے اپارٹمنٹ سے باہر کھینچ لایا تھا۔ میں شاید پاگل ہو گیا تھا جو میں نے کسی کا مشورہ قبول نہیں کیا، ایک محفوظ پناہ گاہ سے باہر آ گیا اور انجام کار کسی زیر زمین عقوبت خانے میں زنجیر دل میں بندھا بلیر کی ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ لیکن میرے خون کا رنگ، اس کی سرخی اور گرمی ابھی باقی تھی۔ میں نے بلیر کو گھورتے ہوئے سرد لہجے میں مخاطب کیا۔ ”تم میرے جسم پر نہیں، اپنی چٹاکی بھڑکتی آگ کو ٹھوکریں مار رہے ہو۔ تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔ رات رات تم اپنے دل کی بھڑاس نکال لو، صبح میری باری ہوگی۔“

”پاگل بننے کی اداکاری کر رہا ہے۔“ اُس نے غضبناک ہو کر اپنی بیلٹ کھول لی اور بے تحاشہ میری چڑی اڈھیڑنے لگا۔ میں نے نچلا ہونٹ پوری شدت سے دانتوں تلے بھینچ لیا۔ وہ متواتر میرے جسم پر ضربیں لگاتا رہا، میرے اندر کا آتش فشاں کھولتا رہا۔ میں نے حلق سے کوئی آواز نہیں نکالی، جسم کو گھڑی بنا کر لوٹنے لگا۔

شیکھر واپس آیا تو سید کی لاشی اُس کے ہاتھ میں دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میری کوئی مراد پوری ہو گئی۔ میں ساری تکلیف بھول کر اُس متبرک لاشی کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

”تم ایک طرف ہو جاؤ صاحب۔۔۔۔۔۔“ شیکھر نے آستین چڑھالی۔ ”میں دیکھتا ہوں کہ یہ سالا کتنے پانی میں ہے۔“

”جب تک یہ۔۔۔۔۔۔ تھوک کر نہ چاٹے، زمین پر ناگ رگڑ کر ڈی آئی جی صاحب کی بات ماننے کا اقرار نہ کرے اس پر لاشی برساتے رہنا۔ تھک جانا تو اوپر سے کسی اور کو بلا لینا۔ میں کچھ دیر آرام کر کے واپس آتا ہوں۔“

بلیر حکم دے کر غصے میں تلملاتا چلا گیا۔ شیکھر نے دروازہ بند کر لیا۔ اُس کے تیور بلیر سے زیادہ خطرناک نظر آ رہے تھے۔

”کیا فیصلہ کیا نواب صاحب؟“ شیکھر نے لاشی فضا میں بلند کرتے ہوئے زہر خند سے دریافت کیا۔ ”ہماری درخواست منظور کرو گے یا تمہارا یہ سیوک تمہاری بجیہ اڈھیڑنی شروع کر دے۔“

لائے۔ میں نے تم سے بھی کئی بار درخواست کی کہ میرا ہاتھ تھام لو۔ تم اشاروں اشاروں میں مجھے نہ جانے کیا کیا سمجھاتے رہے۔ میں نے تمہارے قریب آنے کی کوشش کی، تم بار بار نزدیک آ کر دُور چلے گئے۔ تمہاری کوئی مصلحت رہی ہوگی۔ اب بھی دیر نہیں ہوئی۔ میں مرنے کو تیار ہوں۔ تم خدا کے نیک بندے ہو۔ ہو سکتے تو میری مشکل آسان کر دو۔“

میں سید کو اپنی زوداد سنا تا رہا، شیکھر مجھ پر لاشی برساتا رہا۔ کچھ دیر بعد اُس نے اچانک ہاتھ روک لئے۔ شاید اُس پر یلکھت حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ دُور کھڑا مجھے آنکھیں پھاڑے گھور رہا تھا۔ اُس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، لیکن نہ میرا سر پہننا، نہ میں نے احتجاج کیا، نہ میرے چیخنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ سب کچھ اُس کے لئے یقیناً حیرت انگیز اور ناقابل یقین رہا ہوگا۔

”تم..... تم کیا بلا ہو.....؟“ اُس نے ہانپتے ہوئے سوال کیا۔ اُس کے لہجے میں پہلے جیسی گھن گرج نہیں تھی۔

”رک کیوں گئے.....؟“ میں نے اُسے حقارت سے گھورا۔ ”مجھ پر لاشی برساتے رہو۔ بلیر تم کو یہی حکم دے کر گیا ہے۔ تم نے بھی میرے جسم کی ایک ایک بجیہ ادھیڑنے کی بات کی تھی۔ ہاتھ کیوں کھینچ لئے؟ اندازہ لگانے کی کوشش کرو کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ تم نے یہی دعویٰ کیا تھا، اور بھی کچھ نغوا بتائیں کی تھیں۔ میرے ہاتھ پیر جکڑے ہوئے ہیں، میں بے بس ہوں، تمہارے رحم بد کر م پر ہوں۔ تم نے تو بڑوں بڑوں کے کس بل نکالے ہوں گے۔ میرے سلسلے میں اتنی جلدی ہمت ہار گئے.....؟“

”نہیں.....“ شیکھر نے کچھ توقف سے کہا۔ ”تم وہ نہیں جو نظر آتے ہو۔“

”پھر..... کون اہوں میں؟“ مجھے اُس کی بات پر ہنسی آ گئی۔ کچھ دیر بیشتر وہ بڑی ڈینگیں مار رہا تھا، اب سہا سہا کھڑا تھا۔

”مجھے بجالو مہاراج.....“ شیکھر ہاتھ باندھ کر گڑ گڑانے لگا۔ ”نپکڑ بلیر بوا ظالم افسر ہے۔ وہ پہلی سمجھے گا کہ میں نے جان بوجھ کر تمہارے ساتھ رعایت کی ہے۔ لیکن تم جانتے ہو کہ میں نیک حرام نہیں ہوں۔“

”ریو الو رکال کر مجھے گولی مارنے کی حسرت اور پوری کر لو..... بلیر کے عتاب سے بھی محفوظ رہا۔“ میں نے مشورہ دیا۔

میں نے شیکھر کی بات کا جواب نہیں دیا، حسرت بھری نظروں سے سید کی لاشی کو دیکھا۔ دل ہی دل میں کہا۔ ”یہ بھی میرے لئے اعزاز ہو گا سید کہ تم اپنی لاشی سے مجھے رُوئی طرح دھکی لگا دو۔ میں اُف نہیں کروں گا۔“

”دیدے پھاڑے کیا گھور رہا ہے لید کے ہٹکے؟“ شیکھر اپنی اصلیت پر اُتر آیا۔ ”سیدھی طرح جواب دے۔ نہیں تو یہی لاشی نیچے سے چڑھا کر اوپر سے نکال دوں گا۔“

”تم میرے اوپر ہاتھ اٹھا کر اچھا نہیں کرو گے۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں..... بہتر ہے کہ مجھ سے دُور رہو.....“

شیکھر یلکھت آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ شاید لٹھ بازی کے فن نئے واقف تھا۔ اُس پینتر ابدل کر پہلا وار میرے کو لہے پر کیا۔ میری ہڈیاں کڑکڑانے لگیں۔ میں نے دوبارہ ہونٹ بھیجنے لئے۔ اُس نے ہوا میں لہرا کر میرے سر کا نشانہ لیا، میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے یقین تھا کہ میرا سر پھٹ جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مجھے ہلکا سا احساس ہوا کہ چھ کوئی ہلکی پھلکی شے میرے سر کو چھو کر گزر گئی ہو۔ اسی لمحے خوشبو کا ایک جھونکا میری ناک۔

”مگر اب..... میں نے آنکھیں کھول دیں۔“

شیکھر کسی ماہر لٹھ بازی طرح اُچھل اُچھل کر، پینترے بدل بدل کر مجھ پر لاشی کے کر رہا تھا۔ ہر بار مجھے ایسا لگتا جیسے پھولوں سے لدی کوئی نرم شاخ میرے جسم سے اُٹھ گیا۔ کر رہی ہو۔ میں ہونٹ بھیجنے پڑا رہا، میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ سید مجذوبہ کہیں آس پاس موجود تھا، یا پھر اُس نے کہیں دُور رہ کر بھی میری آواز سن لی تھی۔ مجھ لاشی کی صرف ایک کاری ضرب لگی تھی، پھر قدرت کا معجزہ میرا محافظ بن گیا۔

”نہیں سید..... نہیں۔“ میں نے دل کی گہرائیوں سے سید کو آواز دی۔ ”تم نے رُوئی دھکی لگانے کی بات کی تھی۔ صرف ایک ضرب کافی نہیں ہے۔ تم میرا پورا جسم ادھیڑنے بات کرو۔ میں اُف نہیں کروں گا۔ میرے دل میں زندہ رہنے کی کوئی آرزو بھی نہیں ہے۔ میرے دل کی کیفیت، میرے حالات سے واقف ہو۔ تم سے زیادہ کون سمجھ سکے گا، میں۔“

نندا کے کہنے پر اہنسا کا راستہ اختیار کیا۔ کترا کر گزرنے کو زندگی کا شعار بنانے کی کوشش۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ بدری نرائن اور اُس کے سر پھرے چیلے مجھے بار بار گھیرتے رہے، اُنہا نے میرے اوپر سکون کا ایک ایک لمحہ تنگ کر دیا۔ مجھے زبردستی دوبارہ میدان میں تھب

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ اُس نے کسمسا کر کہا۔ ”بڑے صاحب نے تمہیں تین دن بری نظروں سے۔“

”مہلت دی ہے۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ میں نے شیکھر سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ”بلیر آئے تو اُس سے“

دینا کہ میں نے لندن جانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا ہے۔“

”تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تم سچ کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ شیکھر کے چہرے پر زندگی کے آثار دوب

نمایاں ہونے لگے۔

”سچ اور جھوٹ کے چکر میں مت پڑو۔“ میں نے رُوکھے لہجے میں جواب دیا۔ ”زندہ“

پچانے کی فکر کرو۔“

اُس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا، پھر اپنا ارادہ ترک کر دیا، دُور بیٹھ کر مجھے دیکھتا

۔۔۔۔۔ دو گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی تو شیکھر بڑی پھرتی سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اُ

نے لپک کر دروازہ کھولا، آنے والا انسپکٹر بلیر کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اُس نے سادہ لہا

پہن رکھا تھا، کچھ دیر خاموش کھڑا مجھے نفرت بھری نظروں سے گھورتا رہا، پھر شیکھر سے بولا

”کیا رہا۔۔۔۔۔؟“

”شیکھر نے جیون میں کبھی ہار مانتی نہیں سیکھی صاحب۔“ اُس نے میری طرف مٹا

نظروں سے دیکھتے ہوئے بلیر کو بڑے دبنگ لہجے میں جواب دیا۔ ”لاٹھی سے صرف اگر

کمر اور کو لہے سہلائے تھے کہ چپس بول گیا۔ لندن تو کیا اب یہ آپ کے حکم سے رُک

بھی چھلانگ لگانے سے انکار نہیں کرے گا۔“

”کیوں مہاشے۔۔۔۔۔“ بلیر نے فاتحانہ نظروں سے مجھے گھورا۔ ”ذکرِ گئی ناساری ہیکڑا

پہلے تو مجھے صبح ہونے کی تڑی دے رہا تھا۔ بڑے اُونچے سُروں میں بول رہا تھا۔۔۔۔۔

جلدی تانی مر گئی۔“

میں نے خاموشی اختیار رکھی۔ مجھے صبح ہونے کے بعد انکارانی کی واپسی کا انتظار تھا۔

”چپ کیوں ہے؟ کیا سروجنی کی یاد ستا رہی ہے؟“ اُس نے حقارت سے اُ

”لندن جائے گا تو اس ویشیا کو بھول جائے گا۔ وہاں تیری بہت ساری بہنیں تھیں اسوا

کرنے کو۔۔۔۔۔“

”بلیر۔۔۔۔۔“ میں اس بار ضبط نہ کر سکا، چیخ اُٹھا۔ ”اپنی گندی زبان بند کر لے۔۔۔۔۔ دُور“

”عقائد نہیں رہا؟“

”ارے۔۔۔۔۔“ بلیر نے بڑے سفاک لہجے میں اپنے غصے کا اظہار کیا۔ ”شیکھر، سن رہا

ہے تو۔۔۔۔۔ یہ حرام کا جنا پھر بولنے لگا۔ اس کے بعد انسپکٹر دیوانہ ہو گیا۔ اُس نے پھر میرے

دپ گھونسوں اور جوتوں کی ٹھکروں کی بارش شروع کر دی۔ میرے سینے پر چڑھ کر وحشیوں کی

روح اُچھٹنے لگا۔ میں نے حلق سے کوئی آواز نہیں نکالی لیکن میرا جوتہ جوتہ چیخ رہا تھا۔ بلیر کی

بان سے میرے بزرگوں کی شان میں بڑے نازیبا جملے ادا ہو رہے تھے۔ میں خون کے

ٹھونٹ پی کر برداشت کرتا رہا۔ پھر اچانک جوتے کی ایک شدید ضرب میری کپٹی پر ایسی لگی

کہ میری نگاہوں کے سامنے کئی سورج طلوع ہو کر غروب ہوتے چلے گئے۔ میرا ذہن گھپ

ندھیروں میں ڈوب گیا۔۔۔۔۔!

صبح میری آنکھ کھلی تو سارا جسم پھوڑے کی مانند ڈکھ رہا تھا۔ میں نے ذرا کر دھ لینی

پاہی تو کراہ اٹھا۔ اسی لمحے ایک مانوس آواز میرے کانوں میں گونجی۔۔۔۔۔

”جیل، تہاری یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی۔ تم اگر ہر قیمت پر سروجنی کے

پارٹنر سے ٹکنا چاہتے تھے تو کم از کم مجھ کو تو آگاہ کر دیا ہوتا۔“

میری انکارانی میرے سر پر موجود تھی۔ اُس کا چہرہ غصے کی شدت سے تھمرا رہا تھا۔

آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ مجھے جس کا انتظار تھا، وہ آگئی تھی۔ اُس کے لہجے میں

ماسف تھا۔ میں نے نظریں گھا کر دیکھا، کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ بلیر اور شیکھر

شاید مجھے مردہ سمجھ کر چلے گئے تھے۔

”تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو۔۔۔۔۔؟“ میں نے عالم تصور میں اُسے مخاطب کیا۔

”یہ وقت شکوہ شکایت کا نہیں ہے۔“ اُس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ ”بلیر

نے تمہارے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے، اس کی سزا اُسے ضرور ملے گی۔“ مگر تم بھی تو میرا کہا

نہیں مانتے۔ من مانی کرنے لگتے ہو۔“

”جو ہو چکا اسے بھول جاؤ۔“ میں نے بحث ختم کرنے کی خاطر کہا۔ ”قسمت میں جو لکھا

ہے اسے نالا نہیں جاسکتا۔“

”تم اتنی جلدی مایوسی کی بات کیوں شروع کر دیتے ہو؟ کیا اب تمہیں اپنی انکار پر بھی

عقائد نہیں رہا؟“



”زخموں کو مت کریدو انکارانی.....“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”تم میری مجبوریوں سے واقف ہو۔ اس سے زیادہ بد نصیبی اور کیا ہوگی کہ میں اتنے دنوں سے بمبئی میں ہوں اور اب تک اپنی ترمین کی صورت بھی نہیں دیکھ سکا۔ چہرہ گرد آلود ہو، دل میں طوفان اٹھ رہے ہوں، زخم رِس رہا ہو تو محفلیں سجانا اچھا نہیں لگتا۔ اور..... کل وہ بھی آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ رُوئی کو ایک بار دھنکی لگ جانے دے، سب گرہیں کھل جائیں گی۔ اُس نے نقب لگانے کی بات بھی کی تھی۔ میں اُسی کے اشارے پر وہاں سے چلا آیا۔ میں سید کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں انکا کو بیہوشی سے قبل تک کی تفصیل سناتے ہوئے کہا۔ ”ان فیصد ہے کہ میں تین روز کے اندر اندر لندن واپس چلا جاؤں۔ انکار کی صورت میں روڈ شکر ہندوستان میں میرا وجود گوارا نہیں کرے گا۔ اُس نے انسپکٹر بلیئر کو حکم دے رکھا ہے کہ مجھے مار کر میری لاش کو خاموشی سے ٹھکانے لگا دیا جائے۔“

”تم اپنے ذہن پر کوئی بوجھ مت ڈالو۔“ انکا نے میرے بالوں پر ٹپکتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اب آگئی ہوں۔ سب کچھ میرے اوپر چھوڑ دو۔“

میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا، بلیئر اور شیکھر کے علاوہ دوسرا لباس والے اور بھی نظر آئے۔ دونوں چہرے بشرے سے بے حد خطرناک نظر آ رہے تھے۔ انسپکٹر بلیئر کے ہاتھوں میں ہنتر موجود تھا، میری آنکھیں کھلی دیکھ کر بڑی نفرت سے بولا۔ ”حرامی..... تو ابھی تک مرا نہیں؟“

”اے اب شاما کو دو صاحب.....“ شیکھر دبی زبان میں بولا۔ ”میں اسے سمجھاتا ہوں۔ یہ لندن جانے پر تیار ہو جائے گا۔“

”نہیں.....“ بلیئر دھاڑنے لگا۔ ”اب یہ نہیں، اس کی اترتی لندن جائے گی۔“

”تم خاموش کیوں ہو جیل.....؟“ انکا تلملانے لگی۔ ”ایٹ کا جواب پتھر سے دو۔ تم سے کہہ چکی ہوں کہ اسے سزا ضرور ملے گی۔ اس کے پر لوک سدھارنے سے پیشتر اب دل کی حسرت پوری کر لو.....“

”انسپکٹر.....“ انکا کے اُکسانے پر میں نے بلیئر کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”بہت ہو چکا اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ ورنہ تمہارا انجام خطرناک ہو گا۔“

بلیئر کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے ہنتر کھول کر ہوا میں لہرایا، انکا میرے سر

اتر جی۔ اس کے بعد جو ہوا وہ خود بلیئر کے لئے بھی تعجب خیز تھا۔ نئے آنے والے سادہ لباس والوں میں سے ایک نے ریوالور نکال کر بلیئر پر تان لیا، سفاک لہجے میں بولا۔

”اس کا فیصلہ بعد میں کرنا انسپکٹر، پہلے میری ایک بات سن لو۔“

”تم.....“ بلیئر نے پلٹ کر اُسے غور سے دیکھا۔ ”کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہاری زندگی کے دن بھی اب پورے ہو چکے ہیں.....“

شیکھر اور دوسرے سادہ لباس والے کی نظریں بھی ریوالور والے کی جانب اٹھ گئیں۔ میں جانتا تھا، انکا ایک وقت میں صرف ایک ذہن کو کنٹرول کر سکتی تھی۔ وہ اس وقت ریوالور والے کے سر پر تھی جس کی نگاہوں میں شعلے لپک رہے تھے۔

”تمہارے پاس اب زیادہ سوچنے اور سمجھنے کا سہ باقی نہیں رہا انسپکٹر۔“ اُس نے سر راتے لہجے میں کہا۔ ”تم نے شاید مجھے ابھی تک نیچا نا نہیں۔ میرا نام اجیت نہیں جتندر ہے۔ بات آٹھ سال پرانی ہے۔ تمہیں شاید یاد بھی نہ رہی ہو، میں بتاتا ہوں۔ تم میری تلاش میں میرے گاؤں گئے تھے، تمہارے پاس میری گرفتاری کا وارنٹ تھا، تمہارے کالے قانون کا مجرم میں تھا۔ میری جوان بہن رادھیکا نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا لیکن تم اُسے زبردستی اٹھالائے۔ دو سال تک تم اور تمہارے ساتھی اُس مجبور کی عزت سے کھیلتے رہے۔ پھر ایک رات وہ تمہاری ہی تحویل میں قتل کر دی گئی۔ تمہارا شک اپنے ساتھی ونود پر تھا، لیکن ایسا نہیں تھا۔“ ریوالور والے نے مٹھیاں بھینچ کر بڑے کرب سے کہا۔ ”اُس غریب کو میری گولی کا نشانہ بننا پڑا۔ میں اُسے نہ مارتا تو تم لوگ اُسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتے رہتے۔ اس کے بعد میں تمہارا اعتماد جیتنے کی خاطر بھیس بدل کر اجیت کے رُوپ میں تمہارے قریب ہوتا گیا۔ مجھے کسی مناسب موقع کی تلاش تھی۔ میں رادھیکا کا انتقام تمہاری بہن سے لینا چاہتا تھا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری کوئی بہن نہیں۔ تم نے شادی بھی نہیں کی ورنہ کچھ آنسو تمہاری دھرم اتنی کے شریر سے پونچھ لیتا..... آج مجھے وہ موقع مل گیا جس کی تلاش تھی۔ تم سمجھ گئے میں کیا کہہ رہا ہوں.....؟“

”بلیئر موت سے نہیں ڈرتا کینے.....“ انسپکٹر آپے سے باہر ہونے لگا۔ ”تو مجھے مارنے کے بعد خود بھی زندہ نہیں رہے گا۔ میرے آدمی تیرے جسم کو ہزاروں ٹکڑوں میں تقسیم کر دیں گے۔ جیون بیارا ہے تو ریوالور پھینک کر میرے پیر پکڑ لے۔ میں تجھے آخری موقع دے رہا

میں بات کو طول نہیں دوں گا۔ تفصیل لکھنے بیٹھ گیا تو زندگی کی ساری نقدی خرچ ہو جائے گی، کہانی ادھوری رہ جائے گی۔ بہر حال انکا نے جو کہا وہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ عقوبت خانے کے محافظ مشورہ کرنے کی خاطر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ بلیر کو زخمی حالت میں ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ پھر مجھے اسی حوالہ میں ڈال دیا گیا جہاں پہلے بند کیا گیا تھا۔ انسپٹر بلیر کی جگہ نیا انکپٹر آ گیا۔ میری گرفتاری کے کیس کو باقاعدگی کی شکل دینے کی خاطر عدالت میں پیش کر کے دس روز کا ریمانڈ حاصل کیا گیا تو بات ڈھکی چھپی نہ رہ سکی۔ میرے دشمنوں کو بھٹک مل گئی۔ سینکڑوں پنڈت پجاریوں نے اُس حوالہ کو گھیر لیا جہاں مجھے سرکاری مہمان بنایا گیا تھا۔ ان کا ایک ہی مطالبہ تھا، مجھے ان کے حوالے کر دیا جائے۔ قانون میں ایسی کوئی شق موجود نہیں تھی کہ کسی مجرم کو عوام کے سیلاب میں دھکیل دیا جائے۔ رومی شکر کے اختیار میں ہوتا تو وہ اس بات پر عمل کرنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ لیکن مرلی اُس کے راستے کی دیوار بن کر درمیان میں حائل ہو گیا۔ بڑے بڑے سرکاری افسران اور راج منتری سر جوڑ کے بیٹھے، مندروں سے جوان پجاریں بھی چوٹیوں کی طرح نکل نکل کر دھرتا دینے والوں کے ساتھ شامل ہونے لگیں تو تماش بینوں کا جھوم بھی بڑھنے لگا۔ حکومت کو مجبوراً فوج طلب کرنی پڑی۔ پنڈت پجاریوں پر لاشمی چارج ہوا، آنسو گیس کے گولے داغے گئے، تب کہیں جا کر حالات کچھ قابو میں آئے۔ تھانے کے علاقے میں باقاعدہ کریو لوگا دیا گیا، کسی کو بھی بغیر تحریری حکم تانے کے تھانے میں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔

انکارانی کی مصروفیات بھی بڑھ گئیں۔ وہ دن بھر میری خاطر جوڑ توڑ میں لگی رہتی۔ رات کو تھکی ماندی واپس آتی تو مجھے دن بھر کی رُوداد سنانے بیٹھ جاتی۔ میں تھانے میں بڑے سکون سے تھا۔ نئے انکپٹر یا اُس کے عملے کے افراد نے میرے ساتھ کوئی بدسلوکی کرنے کی غلطی نہیں دہرائی۔ ابھی تک وہ عقوبت خانے میں ہونے والے تین قتل کی اصل وجہ بھی دریافت نہیں کر سکے تھے۔ جو بیان انسپٹر بلیر نے دیا، اس میں کئی جھول تھے۔ انسپٹر نے جتندر کی کہانی توڑ مروڑ کر صرف یہ کہا کہ اُس کا ذہن بس اچانک ہی پلٹ گیا۔ اُس نے زبان سے کوئی جملہ ادا کئے بغیر ہی ریوالور نکال کر فائرنگ شروع کر دی، بعد میں خود کو بھی گولی مار لی۔ ممکن ہے رومی شکر کے سامنے اکیلے میں اُس نے حقیقت اُگل دی ہو۔ لیکن ریکارڈ پر جو بیان موجود تھا وہ ناکافی سمجھا گیا۔ رومی شکر بڑے مضبوط اعصاب کا مالک

ہوں۔“

جواب میں ریوالور نے ایک شعلہ اُگلا اور بلیر کی الٹی رائے سے خون بھل بھل بننے لگا۔ شیکھر نے دروازے کی طرف بھاگنے کی حماقت کی، وہ بھی مارا گیا۔ دوسرا سادہ لباس کا خاموش کھڑا رہا۔ انسپٹر پاؤں پکڑ کر لڑکھڑاتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا۔

”گھبراؤ مت انسپٹر، میں تمہیں آسان موت نہیں ماروں گا۔“ جتندر نے زہر خندہ کہا۔ پھر دوسرا فائر کیا، بلیر کی سیدھی ٹانگ کے گھٹنے کی ہڈی چنچ کر کرچیوں میں تقسیم گئی۔ وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی مانند زمین پر پچھاڑیں کھانے لگا۔ اُس کی چیخ آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔

”اب یہاں سے نکل چلو، ورنہ تمہارے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔“ دوسرے ہا لباس والے نے جتندر سے کہا۔

”گھبراؤ مت، ہم ساتھ ساتھ ہی چلیں گے۔ پہلے تم، بعد میں، میں۔“ جتندر نے اپنے اختتام کے ساتھ ہی تیسرا فائر کیا، اُس کا ساتھی بھی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ مر۔ کے بعد بھی اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی نظر آرہی تھیں۔ چوتھی گولی نے خود جتندر کی زندگی کے چراغ کو گل کر دیا..... کمرے میں تین لاشیں پڑی تھیں۔ انسپٹر ڈویتی ہا آواز میں اپنے آدمیوں کو مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ بازی بلی بھر میں پلٹ گئی۔ انکا دوبا میرے سر پر آ گئی۔

”تم نے میری خاطر تین آدمیوں کو لڑھکا دیا.....“ میں نے انکارانی کو پیار بھری نظر سے دیکھا۔

”کھیل تو اب شروع ہو گا جمیل صاحب۔“ اُس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ”تمہیں اندازہ جائے گا کہ پریتم لال مہاراج کے سر پر رہ کر میرا سہے برباد نہیں ہوا، اُس مہمان منشی۔ تمہارے کارن مجھے بھی کچھ شکلیاں دان کی تھیں۔ یہ بھی کہا تھا کہ جب تک گھناٹو پ انداز نہ پھیل جائے میں ان شکلیوں کا استعمال نہ کروں۔ بلیر، رومی شکر کا خاص آدمی ہے بلیر کے زخمی ہونے اور تین آدمیوں کے قتل کی خبر سن کر پاگل ہو جائے گا۔ بات پہلے طوفان اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ پنڈت پجاریوں کے دلوں میں سلگنے والی چنگاریاں بھڑکیں گی۔ ہر طرف آگ لگ جائے گی۔“

جانے کی غلطی نہ کرتے تو.....“

”تم روی شکر کے منصوبوں کی بات کر رہی تھیں۔“ میں نے اُس کا جملہ کاٹا۔  
 ”ہاں.....“ وہ میرے تیور بھانپ کر بولی۔ ”روی شکر تم کو کسی قیمت پر بھی موت کے گھاٹ اتارنے کا خواہشمند ہے۔ اُس نے خاص طور پر اجودھیا کے ایک نامی گرامی پنڈت کو بھی تمہاری خاطر بمبئی آنے کی دعوت دی ہے، ایک منصوبہ یہ بھی اُس کے ذہن میں ہے کہ عدالت جاتے ہوئے تمہاری گاڑی کو بم کے دھماکے سے اڑا دیا جائے۔ اس کا الزام اُن انتہا پسند پنڈت پجاریوں کے سر بڑی آسانی سے تھوپا جاسکتا ہے جو بار بار تمہاری سرعام بھانسی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ تمہیں خوراک میں زہر بھی دیا جاسکتا ہے۔ اس کی ذمہ داری بھی کسی اور کے سر ڈالی جاسکتی ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ انکا نے بات جاری رکھی۔  
 ”مرلی کا کٹنا بھی نکالنے کی بات ہو رہی ہے۔ مرلی نے سروجنی کی وجہ سے ترقی حاصل کرنے میں جن افسران کا حق مارا تھا، روی شکر اُن کے ساتھ بھی گٹھ جوڑ کر رہا ہے۔ ایک اہم خبر اور ہے..... چندرا اپنا چاپ ختم کر کے منڈل سے باہر آ گیا۔ پنڈت نول کشور نے اُسے ہردوار بلایا ہے، وہیں بیٹھ کر صلاح مشورے ہوں گے۔“

چندرا کا نام سن کر میرے اندر پھر اٹھل پھٹل شروع ہو گئی۔ زخم ہرے ہونے لگے۔ کھرٹڈ اکھڑنے لگے۔ مجھے موت سے خوف نہیں تھا۔ پہلے بھی متعدد بار میں نے دنیا سے منہ موڑنے کی کوشش کی تھی، کبھی کلدیپ کی باتوں نے راستہ روک لیا، کبھی انکا نے اپنے بچوں کے نشتر چھو کر میرے ذہن کو ماؤف کر دیا، کبھی پریم لال آڑے آ گیا۔ موت برحق ہے، کوئی اسے ٹال نہیں سکتا۔ لیکن چندرا اور پنڈت نول کشور کو کیفر کردار تک پہنچائے بغیر مجھے موت گوارا نہیں تھی۔ انہوں نے بجھتی ہوئی چنگاریوں کو ہوادے کر بھڑکانے کی غلطی کی تھی۔ میں انہیں اسی بھڑکتی ہوئی آگ میں زندہ جلانے کا خواہشمند تھا۔ ایسی اذیت ناک موت مارنا چاہتا تھا کہ پھر کوئی دوسرا پنڈت یا پجاری جمیل احمد خان کا نام بھی زبان تک لانے کی حماقت کبھی نہ کرتا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو پاؤں میں پڑی زنجیریں مجھے بے بسی کا احساس دلانے لگیں۔ وہ مجھ سے خوفزدہ تھے۔ وہ کم ظرف لوگ تھے جنہوں نے مجھے حوالات کی آہنی سلاخوں کے اندر ڈالنے کے باوجود زنجیروں میں جکڑ رہا تھا۔ مرد ہوتے تو لکار کر سامنا کرتے، کجخروں کی طرح پشت سے چھرا گھوپنے کا منصوبہ کبھی نہ بناتے۔

ثابت ہوا۔ اُس نے عقوبت خانے کا ذکر کہیں بھی درمیان میں نہیں آنے دیا بلکہ دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے مرلی کو انکوائری آفیسر بنا دیا۔ اس طرح وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرف وہ مرلی کو باور کرانا چاہتا تھا کہ ساری شرارت انپکٹر بلیئر کی تھی۔ دوسری طرف وہ مرلی ہی کے ہاتھوں مجھے مروانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اتنی گہری چال چلی تھی اُس نے کہ خود مرلی بھی گھبرا گیا ادھر سے ادھر پھر رہا تھا۔ اُس نے اپنے ذرائع سے برکوش بھی کی کہ انکوائری کا کام کسی اور کو سونپ دیا جائے لیکن روی شکر نے اپنی سفارت میں جس انداز میں مرلی کی ذہانت اور کارکردگی کا اظہار کیا تھا وہ مرلی کے آڑے آ گئی۔ چار روز افراتفری اور ہنگاموں میں گزر گئے۔ پانچویں رات انکارانی واپس آئی تو اُن کے چہرے پر بڑی گہری سنجیدگی مسلط تھی۔

”خیریت.....؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو۔“

”آج میرے پاس تمہارے لئے کچھ اچھی خبریں نہیں ہیں۔“ اُس نے خلاء میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔

”جو بھی ہے کہہ ڈالو.....“ میں زہر خند سے بولا۔ ”وقت نے مجھے ڈھیٹ بنا دیا ہے۔ میں ہمت نہیں ہاروں گا۔“

”روی شکر بڑی گھٹیا حرکتوں کے بارے میں غور کر رہا ہے۔ اُس نے کئی منصوبے بنانے شروع کر دیئے ہیں۔“

”اُس کی جگہ تم ہوتیں تو کیا کرتیں؟“ میں نے انکا کو جواب کرنے کی کوشش کی۔ ”کیا مجھے باعزت طور پر رہا کر کے خود کو پنڈت پجاریوں کے حوالے کر دیتیں؟ ڈرگا جرنوں میں اپنی بھینٹ پیش کرنے پر آمادہ ہو جاتیں؟“

انکا پیچ و تاب کھانے لگی۔ میرا جواب اُسے پسند نہیں آیا تھا۔

”پھر رُوٹھ گئیں.....؟“

”تم دل جلانے والی بات ہی کیوں کرتے ہو.....؟“

”کیوں؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا اب مجھے تمہیں چھیڑنے کا اختیار نہیں رہا؟“

”سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔“ وہ لیکھت سنجیدہ ہو گئی۔ ”کچھ دن اور رہ۔“

پیں، اس کے بعد تمہاری چھٹی ہوئی قوتیں تمہیں دوبارہ مل جائیں گی۔ تم ڈرگا کے مندر

”جیل.....“ انکا میرے تاثرات بھانپ کر کسمانے لگی۔ ”میں آئندہ اپنی زبان پر رکھوں گی۔ پھر مجھ سے کوئی شکوہ یا گلہ نہ کرنا۔“

”تم صرف ایک قوت ہو، علامت ہو، کردار ہو..... تم پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہو اپنے کسی آقا کے اشارے پر اس کے دشمن کو تہس نہس کر سکتی ہو، خود کسی کا خون نہیں اسکتیں۔ تمہیں جانوروں یا چرند پرند میں بھی شمار نہیں کیا جاسکتا۔ تمہارے اعضاء انسان سے ضرور ملتے جلتے ہیں لیکن تم انسانی احساسات اور جذبات کی قدر و قیمت سے ناواقف ہو..... واقف ہوتیں تو مجھے اُسی دن مرجانے دیا ہوتا جب میں اپنی کلد پیپ کی لاش ہاتھوں میں اٹھائے میسور کی کسی بلند پہاڑی سے چھلانگ لگانے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ وہ مون کلد پیپ سے میرے عشق کی معراج ہوتی۔ لیکن تم نے میرا ذہن معطل کر دیا۔ میں اپنی حسرتیں پوری نہ کر سکا۔ کلد پیپ کی رُوح آج بھی میرے انتظار میں بھٹک رہی ہے۔ پر لال نے تمہیں نئی شکلیاں دان کر دیں، تمہارا قد پہلے سے زیادہ بلند ہو گیا۔ لیکن میں بڑے خسارے میں رہا۔ اب تم زبان بند رکھنے کی بات کر رہی ہو، مجھے منظور ہے۔ میں تارکیا مڑ رہے کر بھی نامساعد حالات کا.....“

”بس کرو جیل..... خاموش ہو جاؤ۔“ انکارانی تڑپ اُٹھی۔ ”اپنی انکارانی کو غلط نہ سمجھو۔ میں نے تم سے روی شکر کی خباثتوں کی بات کی تھی، تمہیں حالات سے باخبر کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں نے ہارتسلیم کر لی ہے، تم نے میرے بارے میں؟ کچھ کہا میں اس پر بحث نہیں کروں گی لیکن ایک بات کا یقین کر لو..... اگر میں مجسم عورت، رُوپ اختیار کر سکتی تو تم صرف میرے ہوتے..... کوئی دوسری عورت تمہاری سست نظر بھی اٹھا سکتی۔ ہاں میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھ سے احساسات اور جذبات کی باتیں مت کرو۔ مجھے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی خاطر انسانی خون کی ضرورت ہوتی ہے۔ خون پینے والا ان نازک باتوں کو نہیں سمجھ سکتے جو تم مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں صرف اتنا جاؤ ہوں کہ تمہارے سر سے دُور رہ کر میں مضطرب رہتی ہوں۔ مجھے کہیں سکون و آرام نہیں ملتا۔ تمہارے بغیر میں بڑی بے چین رہتی ہوں۔ تم جانتے ہو کہ آج بھی ہندوستان کے کوئے کونے میں بڑے بڑے گیانی دھیانی پنڈت اور پجاری میرے حصول کے لئے زندگی دا پر لگانے کو فخر سمجھتے ہیں۔ لیکن میں نے خود تمہارے سر کا انتخاب کیا تھا۔ تم مجھے اچھے لگتے

کیوں؟ میں اس جذبے کو کوئی خوبصورت نام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ میں پریم لال مہاراج کی شکر گزار ہوں، اُس مہمان پنڈت نے مجھے وشواس دلایا ہے کہ جب تک اس کی آتما مجھ سے منہ نہ موڑ لے، کوئی دوسرا مجھے حاصل نہیں کر سکے گا۔“ انکا جذباتی انداز میں بولتی رہی..... ”تم مجھے آج بھی کمزور مت سمجھو..... میں دُرگا کی پابند نہیں ہوں، روی شکر جیسے ہزاروں۔ کینے مل کر بھی لاکھوں منصوبے بنائیں لیکن میری زندگی میں وہ اپنے سپنے کبھی پورے نہیں کر سکتے۔ میں جانتی ہوں کل کیا ہونے والا ہے۔ کچھ بندشوں کے سبب زبان کھولنے سے قاصر ہوں، مگر اتنا جان لو..... میری زندگی میں وہ تمہارا ایک بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔“

”جی انہوں نے مجھے زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔“ میری زبان سے روانی میں نکل گیا۔ انکا کا چہرہ تہمتا لگا۔

”تم ان مصلحتوں کو نہیں سمجھ سکتے جو میں سمجھ رہی ہوں۔ میں نے ان زنجیروں کو توڑ دیا تو وہ بھڑوں کی طرح تم سے لپٹ جائیں گے، تمہیں بھنھوڑ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ میں ایک وقت میں کس کس کو قابو کروں گی؟ کچھ دن اور صبر کر لو، اس کے بعد گن گن کر دل کے ارمان پورے کر لینا۔“

میں خاموش رہا۔ مرلی نے تھانے میں قدم رکھا تو سپاہی بھی محتاط ہو گئے۔ مرلی نے کسی سے بات نہیں کی۔ سیلوٹ کے جواب میں سر کو جنبش دیتا سیدھا میری طرف چلا آیا۔ اُس کے اشارے پر لاک اپ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ بلیر کی جگہ جس انسپکٹر کو سوئی گئی تھی وہ بھی دُور کھڑا مجھے کینہ تو زنجیروں سے گھورتا رہا۔ حوالات کا دروازہ کھلتے ہی دو مسلح سپاہیوں نے رائفلوں کا رخ میری طرف کر کے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے اپنی بڑائی کا احساس گد گدانے لگا۔ وہ میرے پایہ زنجیر ہونے کے باوجود مجھ سے خائف تھے۔ انکا مرلی کو دیکھ کر کچھ دیر سستانے کی خاطر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

”مہاراج.....“ مرلی نے قریب آ کر بڑی مدھم آواز میں کہا۔ ”حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے میں موجود تمام افراد کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میں انہیں یہی تاثر دیتا رہا جیسے مجھے پولیس کی کارروائی کا کوئی خوف لاحق نہیں

ہے۔“

”تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں انسپکٹر بلیمیر پر بھروسہ نہ کروں۔“ مرلی نے بدستور دبان زبان میں کہا۔ وہ ڈی آئی جی سے مل گیا ہے۔ لاشی والی بات بھی بتادی۔“

لاشی کا ذکر نکلا تو میں کلبلا نے لگا۔ عقوبت خانے سے نکلنے کے بعد مجھے علم نہیں تھا کہ سید کی لاشی کس کی تحویل میں ہے۔ مرلی نے میری بے چینی کو بھانپ لیا۔

”تم جتنا مت کرو، میں کوشش کروں گا کہ تمہاری لاشی تمہیں واپس مل جائے۔ وہ ان تھانے میں رکھی ہے۔“

میں نے سختی سے ہونٹ بھیجنے لئے۔ دل ہی دل میں سید مجذوب کو یاد کرنے لگا۔

”میں تمہارا بیان لینے کی خاطر آیا ہوں۔“ اس بار مرلی نے بلند آواز میں کہا۔

”تم بھی پوچھو.....“ میں نے سرد رویہ اختیار کیا۔ ”کیا جانا چاہتے ہو.....؟“

”انسپکٹر بلیمیر پر کس نے گولیاں چلائی تھیں؟ باقی تین قتل کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”تم سب مل کر مجھے پھانسا چاہتے ہو؟“ میں نے نفرت کا اظہار کیا۔ ”کاغذات ملے

لکھ دو کہ میں نے پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ایک ریوالور جھپٹ لیا تھا۔ تین کچے

مارے گئے، ایک سو زندہ بچ گیا..... زبردستی میرا انگوٹھا بھی لگوا لو۔ اس کے سوا اور کچا

چاہتے ہو؟“

مرلی میری بیجانی باتوں سے کسمسانے لگا۔ نیا انسپکٹر تیزی سے قدم مارتا حوالات کے

اندر آ گیا۔ میرے جملوں کے شعلوں کی تپش اُس کے چہرے پر کپکپا رہی تھی۔

”سر.....“ اُس نے مرلی کو مخاطب کیا۔ ”لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ مجھے

دس منٹ کا موقع دیں۔ اس کی زبان ابھی فر فر چلنے لگے گی۔“

”نہیں.....“ مرلی نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”حالات کے پیش نظر ہم فی الحال تمہارا

ڈگری کا فارمولا نہیں آزما سکتے۔“

”لیکن یہ جو بکواس کر رہا ہے۔“ انسپکٹر نے دبی زبان میں احتجاج کیا۔ اُس کی خونخوار

نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”تو بھی اوقات سے بڑھنے لگا۔“ میں نے انسپکٹر کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”میری لاش

واپس کر دے۔ ورنہ وردی اُتارنے کو تیار ہو جا۔“

”سٹ اپ.....“ انسپکٹر اپنا غصہ ضبط نہ کر سکا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اندر کے سارے افراد ہماری طرف متوجہ ہو جائیں۔ مرلی کے تیور بدلنے لگے۔ وہ انسپکٹر کو کچھ سخت

الفاظ کہنے کے لئے پلٹا، میں نے اُسے موقع نہیں دیا۔

”اُج..... چھا۔“ میں نے انسپکٹر کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”تو نے بھی بلیمیر کی طرح بھونکنا شروع کر دیا۔ تماشا دیکھنا چاہتا ہے تو پھر دھیان سے سن۔“

میں نے گرجدار آواز میں حکم دیا۔ ”ہمیں کھڑے کھڑے اپنی وردی اُتار کر پھینک دے۔

لنگوٹی میں بھاگتا ہوا جا، میری لاشی اُٹھالا۔ انکار کرے گا تو جلا کر خاک کر دوں گا.....“

انکارانی میرے سر سے ریگ گئی۔ سب ہی کی آنکھیں پٹ پٹانے لگیں۔ مرلی بھی

ششدر رہ گیا۔ انسپکٹر نے میرے حکم کی تعمیل میں کسی سعادت مند شاگرد کی طرح اپنی وردی

اُتارنی شروع کر دی۔ جسم پر لنگوٹی اور بنیان رہ گئی تو وہ دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ لوہے کی

الماری کھول کر اُس نے سید کی لاشی نکالی، پھر تیزی سے بھاگتا ہوا میرے سامنے آ گیا۔

لاشی میرے قدموں میں رکھنے کے بعد ہاتھ باندھ کر بڑی انکساری سے بولا۔

”کوئی اور حکم دو مہاراج، میں اب تمہاری کسی آگیا کا پالن کرنے میں دیر نہیں کروں

گا۔ مجھے شاکر دو، میری پاپی نظریں تمہیں پہچاننے میں دھوکہ کھا گئی تھیں۔“

مرلی نے پہلی بار اپنی نظروں سے میرا شعبہ دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھی حیرت سے

بھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کمرے میں باقی عملے کے افراد بھی بُت بن کر رہ گئے۔ میں نے جان

بوجھ کر یہ حرکت کی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ روی شکر کے جاسوس اُسے بھی اپنے چشم دید اور

حیرت انگیز تجربے سے گزرنے کی رُوداد سنا دیں۔ مجھے مرلی کی مجبوریوں کو بھی تحفظ دینا

مقصود تھا۔ تفتیشی افسر بن جانے کے بعد وہ غریب بلاوجہ مخمصے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ میں نے

اُسے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مخاطب کیا۔

”جا بालک..... واپس چلا جا، اوپر والوں کو بتا دے کہ میرے ساتھ کھیل تماشے نہ

کریں۔ میرا ہاتھ اٹھ گیا تو کسی کو بھاگے راستہ نہیں ملے گا۔ سب کی پتلونیں گندی ہو جائیں

گی.....“

”ٹھیک ہے مہاراج..... میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ بڑے افسروں کو ضرور بتاؤں گا۔“

مرلی نے ڈرتے ڈرتے کہا، پھر فائل ہاتھ میں دبائے قدم اُٹھاتا واپس چلا گیا۔



”مہاراج، زنجیروں کے کارن تمہارے ہاتھ پیر میں تکلیف ہو رہی ہوگی۔ میں انہیں کھولے دیتا ہوں۔“ مرلی کے جانے کے بعد انسپکٹر نے انکساری سے کہا۔ پھر وہ آگے بڑھا، میں نے ہاتھ اٹھا کر دھتکار دیا۔

”میتا مرلی نظر آئی تو اب ٹھنڈی کر رہا ہے۔“ میں نے حقارت سے کہا۔ ”وردی پڑ لے، جگے کوتالا لگا کر چوکیدار کی کرسی سنبھال لے۔“

وہ وردی پہن کر لاک اپ کوتالا لگا کر چلا گیا۔ میں نے سید کی لاشی اٹھا کر سینے سے لپی۔ انکا دوبارہ میرے سر پر آگئی۔ اُس کے چہرے سے بشتاٹ ٹپک رہی تھی، مسکرا کر بولی۔

”اسی طرح دُور اندیشی سے کام لینے کی عادت ڈالو..... یہاں بھی رومی شکر کے ایک اعتماد کے آدمی ضرور ہوں گے۔ انسپکٹر کی کہانی سن کر اُسے بھی سوچنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ہی اُس کی طرف سے تمہارا بلاوا آجائے، وہ سودے بازی کی کوشش کرنا چاہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس پنڈت کی قوت بھی آزما کر دیکھ لے جو اوجودھیا سے ایک دو روز میں ہمیں پہنچا دالا ہے۔“

”تم نے اشوک کی بیوہ کے لئے کیا کیا.....؟“ میں نے اُس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔

میں نے اُس کے لئے رہائش اور پیسوں کا بندوبست کر دیا ہے۔ اب اُسے کسی آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا پڑے گا۔“

”تزمین اور سید غوث کی کیا خبر ہے.....؟“ میں نے سر دواہ بھر کر سوال کیا۔

”دونوں خوش ہیں..... کہو تو اُن کو تمہاری خبر کروں؟“

”نہیں انکارانی.....“ میں تڑپ کر بولا۔ ”ذرا حالات سازگار ہو لینے دو، میں خود وہاں جا کر اپنی تزمین کو گلے لگاؤں گا۔“

”تم آرام کرو جیل، میں ذرا رومی شکر اور ایک دودوسرے افسروں کے دل کا بھید کر واپس آتی ہوں۔“

انکاسر سے اتر گئی۔ میں کچھ دیر سید کی لاشی سینے سے لگائے بیٹھا رہا، پھر اسی کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ کمرے میں انسپکٹر کے علاوہ عملے کے دوسرے تمام افراد بھی سہمے سہمے نظر آ رہے

تھے۔ انکا کے ایک ہی کمرے نے اُن کے کس بل نکال دیئے..... سب ہی کو جیسے سانپ سوجھ گیا تھا.....!!

دوسرے دن مرلی نہیں آیا۔ تھانے کا عملہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی محتاط رہا۔ بلیر کی جگہ تعینات ہونے والے انسپکٹر کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ انکا مجھے مزے لے لے کر رہتی رہی کہ نئے انسپکٹر کی وردی اُتروانے والے قصے نے رومی شکر کو بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مرلی نے خاص طور پر ڈی آئی جی سے مل کر ان حالات کا چشم دید قصہ سنایا تھا۔

”ہر طرف کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ رومی شکر نے خاص طور پر اوجودھیا والے پنڈت کو آج شام تک ہمیں پہنچنے کی درخواست کی ہے۔“ انکا نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”جیل، میری درخواست ہے کہ تم اُس پنڈت کے سامنے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا۔ وہ کئی شاستروں کا ماہر اور ہندو دھرم کا مانا ہوا عالم ہے۔ پہلے اُس نے پنڈت نول کشور کے شیطانی ٹولے میں شمولیت سے انکار کر دیا تھا لیکن دُرگا کی آواز کے بعد شاید وہ بھی تمہارے خلاف محاذ آرا ہو جائے۔ گرد پرتاپ بھی اس پنڈت کی عزت کرتا ہے۔ ہمیں سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔“

”پریشان مت ہو انکارانی۔“ میں نے پہلو بدل کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

پھر سید مجذوب کی لاشی دیکھ کر بولا۔ ”جب تک یہ میرے پاس ہے دشمن میرے خلاف کوئی بڑی کامیابی نہیں حاصل کر سکیں گے۔ مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا تو شاید میں مرلی کے اپارٹمنٹ سے باہر نہ آتا۔ اب میں نے خود کو آگ اور خون کے حوالے کر دیا ہے۔ میں

بدترین حالات میں بھی حوصلہ نہیں ہاروں گا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ سید مجذوب میرے اضطراب سے بے خبر نہیں ہوگا۔ وہ بھی دیکھ رہا ہوگا کہ ہندوستان کی وسیع و عریض زمین پر

میرے لئے سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا نہیں رہ گیا۔ ہر طرف آگ کے لاؤ بھڑک رہے ہیں، دشمنوں کے بس میں ہوتا تو میں کب کا جل کر راکھ ہو چکا ہوتا۔ وہ مجھے اذیت ناک سزا

دینے کے خواہشمند ہیں۔ بڑے نادان لوگ ہیں، یہ بھی نہیں جانتے کہ انسان کے لئے سب سے بڑی سزا موت ہے۔ جو موت کو ہر دم گلے لگانے کو تیار ہو وہ پنڈت پجاریوں

سے کیا ڈرے گا؟ سید کی نظر عنایت کے علاوہ تم بھی تو میرے ساتھ ہو۔“

”مجھے تمہارے ارادے کچھ زیادہ اچھے نظر نہیں آتے۔“ انکا نے بے چینی کا اظہار کیا۔

بلایا ہے۔ وہ بڑا مہمان پنڈت ہے۔ کالی کا بڑا چہیتا بھی ہے لیکن.....“ گرو پر تاپ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی غیر مرئی قوت نے اُس کی زبان پکڑ لی ہو۔

”تم خاموش کیوں ہو گئے گرو.....؟ پنڈت پر بھو دیال کے بارے میں کیا بتانا چاہتے تھے.....؟“

”میرے پاس سے کم ہے بالک، کیول اتنا سمجھ لے کہ دنیا دکھاوے کے لئے زمین پر مٹھ مارنے والے کچھ پراپت نہیں کر پاتے۔ من اُجلا ہو، جیون دان کرنے والے پر وشواش ہو تو شریر پر نظر آنے والی گند سے بڑے بڑے بلوان بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں گرو؟ تم کس کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”اُس مہارشی کی جس کی شکتی اپرم پار ہے۔“ گرو نے جھومتے ہوئے کہا۔ پھر کسمسا کر بولا۔ ”میں اب چلوں گا۔ تجھے آخری بار دیکھنے کو من چاہا تو چلا آیا۔ ورنہ میں دُور رہ کر بھی تجھ سے غافل نہیں تھا۔“

”گرو.....“ میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔ ”کیا میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں؟“

”اپنا دھیان رکھنا.....“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اُس سندری کی بات غور سے سنا کر جو تیرے سر پر ڈیرا ڈال چکی ہے۔ بڑی نٹ کھٹ، بڑی چیٹل ہے.....“

”ایک بات پوچھوں گرو؟“ میرے دل میں امریتا کا خیال ابھرا۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ گرو اور اُس کا کیا رشتہ تھا؟ ”وہ کون تھی؟ لندن سے واپسی پر اچانک اپنی سیٹ چھوڑ کر میرے پاس کیوں آ گئی؟ کیا چاہتی تھی؟“

”امریتا کے بارے میں جانا چاہتا ہے؟“ گرو نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اُس نے تجھ سے غلط نہیں کہا تھا کہ آزمائی ہوئی چیزوں کو بار بار نہیں آزمایا جاتا۔“

”لیکن..... میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا.....“ میں نے پورے یقین سے جواب دیا۔

”میں تیری نہیں..... امریتا کی بات کر رہا ہوں.....“ گرو کا لہجہ معنی خیز تھا۔ میں نے اُس کی مبہم بات کی وضاحت طلب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اُس کے جانے کے بعد انکا دوبارہ میرے سر پر آ گئی۔

”یہ گرو تم سے کیا کہنے آیا تھا.....؟“ انکا نے پوچھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ میرے اور گرو کے درمیان ہونے والی بات نہیں سن سکی۔ شاید گرو نے میرے اور انکا کے درمیان بھی

”ابھی تم سمجھداری کی بات کر رہے ہو، وہ سامنے ہوتے ہیں تو ایک دم بھڑک اُٹھتے ہو میری بھی نہیں سنتے.....“

انکا سے میری چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔ اُس روز کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ مگر رات کا کھانا کھانے کے بعد جلدی سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ تھانے کا عملہ مجھ سے

دُور دُور ہی رہا۔ اب اُنہوں نے میرے اُوپر رافل تاننے یا تحارت کی نظروں سے گھورنے کی حماقتیں ترک کر دی تھیں۔ بھیگی بلی بنے ادھر ادھر بیٹھے رہتے۔ وہ میری وحشت اور طاقت کا تماشا دیکھنے کے بعد خائف ہو گئے تھے۔ کیسی عجیب اور مضحکہ خیز بات تھی۔ قانون کے مسلح محافظ ایک قیدی سے نظریں چرا رہے تھے جو حوالات میں زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا۔

رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے ہاتھ پکڑا سوتے سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہو۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو گرو پر تاپ میرے براہِ پختہ فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ میں نے سر پر نظر ڈالی، انکا موجود نہیں تھی۔

”وہ راجیکاری چلی گئی۔“ گرو نے لہراتے ہوئے کہا۔ ”میرے بڑے بھالگیہ جو آج انکا سندری کے درشن ہو گئے۔ بڑی آشتی اُسے دیکھنے کی۔“

میں نے گھوم کر دیکھا، ٹائٹ ڈیوٹی کا عملہ جاگ رہا تھا۔ حوالات کے بیرونی دروازہ پر وزنی تالا بھی موجود تھا..... گرو کو اندر آنے کی اجازت کس نے دی.....؟

”کوئی چتا مت کر.....“ گرو بے پروائی سے بولا۔ ”میں نے اُن کی نگاہوں کے سامنے پردے ڈال دیئے ہیں۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکیں گے۔ میں ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔ دو گھڑی بیٹھ کر چلا جاؤں گا۔ میرا کہا سنا معاف کر دینا۔“

”کیا مطلب.....“ میں چونکا۔ ”تم کہا سنا معاف کرنے کی بات کیوں کر رہے ہو؟“

”تیری سندری نے تجھے بتایا تو تھا کہ میں بھی دُرگا کے سراپ سے نہیں بچ سکوں گا۔ وہ زہر خند سے بولا۔ ”میرا سے پورا ہو چکا بالک، دیوی کا بلاوا آ گیا ہے۔ مجھے جانا ہوگا۔

پرنتو تو بیا کل نہ ہو..... آخر میں وجے تیری ہی ہوگی۔“

”درمیان میں کیا ہوگا.....؟“ میں نے اُسے کریدنے کی کوشش کی۔

”وہ تجھے گھیرنے کے کارن اُجھل کود سے باز نہیں آئیں گے۔“ گرو بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ روی شکر نے پنڈت پر بھو دیال کو تجھے قابو کرنے کے

وقت طور پر کوئی دیوار حائل کر دی تھی۔

”وہ..... مجھ سے آخری بار ملنے آیا تھا۔“ میں نے لمبی سانس لے کر افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ”کہہ رہا تھا کہ دیوی کا بلاوا آگیا ہے۔“

انکا مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے گھورنے لگی۔ میں نے جمائی لے کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں.....!

رات سکون سے بیت گئی۔ صبح انکا پھر حالات کی سن گن لینے چلی گئی۔ میں ناشتہ کرنے کے بعد فارغ ہوا تو مرلی آگیا۔ اُس کے چہرے پر نظر آنے والے تاثرات اُس کے اندر پریشانی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ میرے قریب آیا تو میں نے مسکرا کر کہا۔

”میرے بیان کے بغیر تمہاری انگواڑی مکمل نہیں ہوگی۔ تم جو چاہو لکھ لو، میں دستخط کروں گا۔ تمہارے اور سرورجنی کے کچھ احسانات ہیں مجھ پر۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم دونوں کو کوئی پریشانی لاحق ہو۔“

”میں اس وقت بیان نہیں، آپ کو لینے آیا ہوں.....“ اُس کے لہجے میں کوئی الجھن کھٹک رہی تھی۔

”کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو.....؟“ میں نے سنجیدگی اختیار کر لی۔ ”روی شکر نے آپ کو ہیڈ آفس بلوایا ہے۔“ مرلی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے دبی زہار میں کہا۔ ”اجودھیا سے ایک بڑے پنڈت کو بھی بلایا گیا ہے۔ روی شکر کو میں نے انسپکٹر وردی اُترنے والی بات بتا دی۔ اُس کے مخبروں نے پہلے ہی سے تفصیل سنا رکھی تھی۔ میر خیال ہے کہ وہ آپ سے پھر سودے بازی کرنا چاہے گا۔“

”پنڈت پر بھودیا کو کیوں بلایا گیا ہے.....؟“ میں نے زہر خند سے دریافت کیا۔ مرلی کسمسانے لگا۔

”آپ کو اُس کا نام کیسے معلوم ہوا.....؟“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔ ”مجھے اور بھی بہت کچھ معلوم ہے۔“ میں نے گول مول انداز اختیار کیا۔ ”روی شکر اُردو اپنے پیروں پر کلبھاڑی مارنے کا فیصلہ کر چکا ہے تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں.....“

میں مرلی کے ساتھ جانے کو تیار ہوا تو انکا سر پر واپس آگئی۔ اُس کے چہرے پر بھی گہری سنجیدگی مسلط تھی۔ میں نے فوری طور پر اُسے کریدنا مناسب نہیں سمجھا، مرلی کے ساتھ

حوالات سے باہر قدم نکالا تو چار سنتری رائفل تانے فرائض کی خانہ پُری کی خاطر آگے بڑھے۔ مرلی نے انہیں اشارے سے روک دیا۔ ڈیوٹی آفیسر بھی دُور دُور ہی رہا۔ مجھے مرلی کے بے حد اصرار پر سید کی لانچی تھانے میں ہی چھوڑنی پڑی۔

تھانے کے باہر ایک بکتر بند گاڑی موجود تھی، اس کے پیچھے مسلح سپاہیوں کی ٹولی ایک زک نما بڑی دین میں موجود تھی۔ مرلی مجھے لے کر بکتر بند گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ پولیس کمانڈر بھی موجود تھے۔ مرلی نے ان دونوں کو نیچے اُترنے کا حکم دیا تو ایک ٹانے کے لئے وہ ہچکچائے، لیکن مرلی کے حکم سے انکار نہیں کر سکے۔

گاڑی حرکت میں آئی تو مرلی نے انگریزی زبان میں بات شروع کر دی۔ اُس نے اپنی آواز کو اتنا بلند نہیں ہونے دیا کہ ڈرائیور کے کانوں تک پہنچ جائے۔

”مہاراج..... مجھے زہر کے گھونٹ پی کر روی شکر کے حکم کی پیروی کرنی پڑ رہی ہے۔ سرورجنی بھی آپ کے لئے پریشان ہے۔ صبح کہہ رہی تھی کہ میں استعفیٰ لکھ کر ڈی آئی جی کے منہ پر مار دوں۔ لیکن موجود حالات میں.....“

”میں تمہاری مجبوری سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ ”سکون سے تماشہ دیکھتے رہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ انکا پشت پر ہاتھ باندھے میرے سر پر ٹہل رہی تھی۔ بار بار نظریں اٹھا کر کچھ دیکھنے لگتی، پھر دوبارہ چہل قدمی شروع کر دیتی۔ میں مرلی سے گفتگو میں مصروف تھا۔ انکا سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ تھانے سے روانگی کے پندرہ منٹ بعد انکا نے مجھے پہلی بار مخاطب کیا۔

”جیل، مرلی سے کہو کہ ڈرائیور کو راستہ بدلنے کی ہدایت کرے۔ اگلے چورستے سے گاڑی سیدھے کی بجائے اُلٹے ہاتھ موڑ لی جائے۔ سیدھے ہاتھ پر خطرہ ہے۔ میں پولیس دین کے ڈرائیور کے سر پر جارہی ہوں۔ روی شکر بھی کیا یاد کرے گا کہ اُس کا پالا کس سے پڑا ہے۔“

انکا اپنا جملہ مکمل کر کے میرے سر سے اُتر گئی۔ میں نے فوری طور پر مرلی کی بات کاٹ کر اُسے گاڑی اُلٹے ہاتھ مڑوانے کا مشورہ دیا تو وہ چونکا۔

”مہاراج.....“ اُس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن میں نے اُس کی بات بھر کاٹ دی۔

”سے کم ہے مرلی..... ڈرائیور کو حکم دو کہ چور سے سے گاڑی بائیں ہاتھ موڑ لے۔“ میر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”سیدھے ہاتھ والے راستے پر موت کنڈلی مارے بیٹھی ہے۔ روڈ! شکر میرے علاوہ تمہاری بھی جان کا دشمن ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی آنکھیں کھلی رکھنے مشورہ دیا تھا۔“

مرلی نے ڈرائیور کو گاڑی کا راستہ بدلنے کی ہدایت کی تو وہ اپنی نشست پر کسمانے لگا لیکن مرلی کے حکم کی خلاف ورزی کی ہمت نہ کر سکا۔ بکتر بند گاڑی نے طے شدہ راستہ بدلنا وائریس سسٹم جاگ اٹھا۔ کسی کی کھر کھراتی ہوئی آواز ابھری..... ”نمبرون، تم نے گاڑی لیفٹ بینڈ پر کیوں موڑ دی؟ سیدھے ہاتھ کی طرف واپس جاؤ۔“

”ڈپٹی صاحب نے لیفٹ بینڈ چلنے کا حکم دیا ہے.....“ ڈرائیور نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”میں نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا۔“

”جسٹ مت کرو.....“ تحکمانہ لہجے میں کہا گیا۔ ”جوروٹ بڑے صاحب نے طے کر دیا ہے اسے بدلنا نہیں جاسکتا۔ گاڑی واپس موڑو۔“

”تم اسی راستے پر چلتے رہو۔“ مرلی نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ پھر اپنا واک ٹاکی آن کرنا ہوئے بولا۔ ”میں ڈی ایس پی ریمش کھنا بول رہا ہوں۔ مجھے انفارمیشن ملی ہے کہ سیدھے ہاتھ پر جانا خطرناک ہے۔ اس لئے میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے..... اور۔“

”سر.....“ دوسری جانب سے احتراماً کہا گیا۔ پھر بولنے والے نے مرلی کو اطلاع دے کہ پولیس وین طے شدہ راستے پر ہی نکل گئی ہے۔

”اُس سے فوراً رابطہ قائم کر کے میرے پیچھے پیچھے آنے کا حکم دو۔“ مرلی نے جھلکار کہا۔ ”کیا وین کا ڈرائیور اندھا تھا جو اُسے بکتر بند گاڑی نظر نہیں آئی؟ اُسے کنٹیکٹ کر کے مجھے انفارم کرو..... اور اینڈ آل۔“

مرلی کے چہرے پر تشویش کے تاثرات پھیل کر گہرے ہونے لگے۔ بدلتی ہوئی چھوٹی

خاموش بیٹھا دل ہی دل میں مسکراتا رہا..... سات آٹھ منٹ گزر گئے، دوسری جانب سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ مرلی نے دوبارہ واک ٹاکی آن کرنے کی کوشش کی لیکن اسی لمحے کہیں دور سے اتنے خوفناک دھماکے کی آواز ابھری کہ بکتر بند گاڑی بھی لہرا کر رہ گئی۔ باہر یقیناً انفارمیری پھیل گئی ہوگی۔ قرب و جوار کی عمارتیں بھی ہل کر رہ گئی ہوں گی۔ شیشے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے ہوں گے۔ کئی بے گناہ افراد بھی زندگی سے ہاتھ دھو چکے ہوں گے۔ پولیس وین کے تو پر نچے اڑ گئے ہوں گے، قرب و جوار کی اور بہت ساری گاڑیاں بھی ضرور پلیٹ میں آئی ہوں گی۔ روڈی شکر تک خبر پہنچے گی تو وہ بھی بلبلائے لگے گا۔ اجودھیا سے خاص طور پر بلائے جانے والا پنڈت پر بھو دیال بھی سوچ و چار میں پڑ جائے گا۔

”سر.....“ بکتر بند گاڑی کے ڈرائیور نے سہمی سہمی آواز میں مرلی سے کہا۔ ”بھگوان کی دیا ہے ہم بال بال بچ گئے۔ آپ کی انفارمیشن نے مجھ غریب کی جان بھی بچالی.....“

مرلی کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ وائریس سسٹم پھر جاگ اٹھا۔ ایک کھر کھراتی ہوئی آواز ابھری۔ ”نمبرون..... تم تیزی سے ہیڈ آفس پہنچنے کی کوشش کرو۔ ڈی آئی جی کا حکم ہے..... ڈپٹی صاحب تو خیریت سے ہیں.....؟“

”ہاں.....“ ڈرائیور نے مُردہ آواز میں پوچھا۔ ”ہماری وین کا کیا بنا.....؟“

”صاحب سے کہو کہ بڑے صاحب سے واک ٹاکی پر بات کریں.....“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ پھر رابطہ ختم کر دیا گیا۔ مرلی نے واک ٹاکی پر روڈی شکر سے رابطہ قائم کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ انکا میرے سر پر واپس آ گئی۔ اُس کا چہرہ خوشی سے متمل رہا تھا۔

”میں نے پنڈت پر بھو دیال کا شگون خراب کر دیا۔“ وہ سر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”حادثے کی خبر سن کر وہ بھی ضرور تلملائے گا، غصے میں اپنا گنجا سر کھلارہا ہوگا۔ روڈی شکر کی پتلون بھی ڈھیلی پڑ گئی ہوگی.....“

”سڑک پر ہر طرف خون ہی خون ہوگا۔“ میں نے انکا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے چھپر خانی کی۔ ”تم اتنی جلدی کیسے واپس لوٹ آئیں؟“

”مجھے سمجھ سکتے کہ اچھے لوگوں کا خون پینے کی عادت نہیں ہے۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

”تم ذرا اطمینان کا سانس لو تو ہم دونوں مل جل کر جشن منائیں گے۔“

میں نے روڈی شکر اور مرلی کے درمیان ہونے والی گفتگو پر توجہ نہیں دی، انکا سے چھپر

چھاڑ کرتا رہا۔ وہ بھی میرا دل بہلاتی رہی۔ کچھ دیر بعد مرلی نے واکی ٹاکی بند کر کے بڑی انکساری سے مخاطب کیا۔

”مہاراج، تم نے آج میرے اوپر جو بار کیا ہے وہ میں سارا جیون نہیں بھولوں گا۔“  
”تم بھول رہے ہو مرلی، اس گاڑی میں تم تنہا نہیں ہو، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔“ میں سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نے اگر بروقت خطرے کی بونہ سو گئی ہوتی تو تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی پر لوک سدھار جاتا۔“

”ایک بات پوچھوں مہاراج.....؟“  
”پوچھو.....“  
”یہ دھاکے والی سازش کس نے کی تھی؟“

”ہم دونوں کے متر (دوست) رومی شکر مہاراج کی۔“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا، پھر خلاء میں گھورتے ہوئے بولا۔ ”اب اُس کا برا وقت بھی قریب آ رہا ہے۔“

میں مرلی پر اپنی پراسرار قوتوں کی دھاک بجاتا رہا، وہ مسمی صورت بنائے بیٹھا سعادتمندی سے میری باتیں سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد بکتر بند گاڑی پولیس ہیڈ آفس پہنچا۔ اُس کی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں دروازہ کھلنے پر گاڑی سے نیچے اترتا تو پولیس کے مسلح سپاہیوں نے لپک کر مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ مرلی میرے ساتھ ساتھ تھا۔ میں ابھی تک زنجیروں کی قید سے آزاد نہیں کیا گیا تھا پھر بھی دشمن مجھے کوئی موقع نہیں دینا چاہتے تھے پولیس ہیڈ آفس کے احاطے میں کئی افسران بھی موجود تھے۔ سبھی کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ پولیس دین کی تباہی اور دھماکے کے سبب رواں دواں زندگی میں جو غفلت پڑ آ گیا تھا اس نے سب کو بوکھلا دیا تھا۔

مجھے مرلی کے ساتھ ہی اُس کمرہ خاص میں قدم رکھنا پڑا جہاں رومی شکر کے علاوہ قدا کا ایک ہٹا کٹا پنڈت بھی موجود تھا۔ اُس کے تیور مجھے دیکھتے ہی خطرناک ہو گئے۔ اُس کی نگاہوں میں بلا کا اعتماد موجود تھا۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے دانوں کی مالا لٹے کوئی جب رہا تھا، کمرے میں میرے داخل ہوتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ رومی نے بھی اُس کی پیروی کی۔ میں نے محسوس کیا کہ انکا پنڈت کو دیکھ کر میرے بالوں دبک گئی تھی۔

میں پاپہ زنجیر ہونے کے باوجود سینہ تان کر آگے بڑھتا رہا۔ پھر مرلی نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا تو میں پاؤں جما کر کھڑا ہو گیا۔ رومی شکر کی نگاہوں میں میرے لئے نفرت کا احساس جھلک رہا تھا۔ ایک لمحے تک وہ مجھے تیز نظروں سے گھورتا رہا، پھر اُس نے میرے بجائے مرلی کو مخاطب کیا۔

”تمہیں شکرے کی اطلاع کب ہوئی تھی؟“ ڈی آئی جی نے سرسراتے لہجے میں دریافت کیا۔

”اسے میں نے بتایا تھا۔“ مرلی کو شیشا تادیکھ کر میں نے رومی شکر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”میری نظروں نے تمہاری بکتر بند گاڑی میں ہونے کے باوجود دیکھ لیا تھا کہ سیدھے ہاتھ پر خطرے کے بادل منڈلا رہے ہیں۔“  
”تمہاری انکوائری رپورٹ کہاں تک پہنچی؟“ رومی شکر نے میری بات نظر انداز کر کے پھر مرلی کی طرف دیکھا۔

”میں نے کوئی بیان دینے سے انکار کر دیا ہے۔“ میں نے دوبارہ مداخلت کی۔ ”انسپکٹر بلیر اُس وقت زندہ تھا جب عقوبت خانے میں تین لاشیں ڈھیر ہوئی تھیں۔ اُس سے یہ پوچھو کہ وہ کیسے بچ گیا.....؟“ میرے لہجے میں تلخی تھی۔ میں رومی شکر اور پنڈت پر بھو دیال دونوں کو باور کرانا چاہتا تھا کہ میں ان سے خائف نہیں ہوں۔ پنڈت کی انگلیاں مالا کے دانوں پر تیز تیز چلنے لگیں۔ وہ گرگٹ کی طرح رہ رہ کر رنگ بدل رہا تھا۔

”انسپکٹر بلیر ابھی تک پرانے بیان پر اڑا ہوا ہے۔“ مرلی نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ کوئی اہم بات چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں دوسرے ذرائع سے معلومات حاصل کر رہا ہوں۔ ایک ہفتے بعد اپنی رپورٹ پیش کر دوں گا۔“

”اوکے.....“ رومی شکر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تم باہر بیٹھو، ہمیں جمیل احمد خان سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

مرلی نے ایڑیاں جوڑ کر سیلوٹ کیا، پلٹ کر میری طرف دیکھا پھر قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ ”جمیل.....“ مجھے انکا کی سرگوشی سنائی دی۔ ”صبر سے کام لینا۔“ درگا کی بددعا کا وقت پورا ہونے میں کچھ ہی دن رہ گئے ہیں۔ میں نے پنڈت پر بھو دیال کو پہلی بار دیکھا ہے، یہ بدی زائن کے مقابلے میں زیادہ پہنچا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس سے اُلجھنے کی غلطی نہ کرنا۔“



”لک چھپ کر کیوں بیٹھی ہے سندری؟“ پنڈت نے پہلی بار زبان کھولی۔ اُس کے لہجے میں تلوار کی کاٹ تھی۔ سانپ کا زہر گھلا ہوا تھا۔ وہ انکا سے مخاطب تھا۔ ”سامنے آ جا، میں بھی آج تیرے درشن کر لوں۔“

”تم..... کس سے باتیں کر رہے ہو مہاراج؟“ روی شکر نے حیرت کا اظہار کیا۔

”پنڈت پجاریوں کے گیان دھیان کی باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“ پربھ دیال نے سیدھا ہاتھ اٹھا کر روی شکر کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میرے سر پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔ ”میں تیری سندرتا، تیری مہمان شکتی اور تیرے کھیل تماشوں کے بارے میں بہت کچھ سن چکا ہوں۔ آ..... سامنے آ جا، مجھے بھی اپنی چھب دکھا دے۔ میری اچھا پوری کر دے، پھر بھلے چلی جانا۔“

”یہ مکر و فریب کی باتیں کر رہا ہے۔“ انکا کی مدھم آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ”اُس نے مجھے دیکھ لیا تو پھر اس پر میرا کوئی داؤ اثر نہیں کرے گا۔ میں جا رہی ہوں۔ تم احتیاط سے کام لینا۔“

انکا میرے سر سے ریگ کر اتر گئی۔ پنڈت بل کھانے لگا۔ میں نے پہل نہیں کی، خاموش کھڑا روی شکر اور پنڈت کو باری باری دیکھتا رہا۔ کمرے میں کچھ دیر گہرا سکوت طاری رہا، پھر روی شکر مجھ سے مخاطب ہوا۔

”میں ایک بار پھر تم کو بھارت کی سرحدوں سے نکل جانے کی پیش کش کر رہا ہوں.....“ اُس کا لہجہ بڑا سرد اور کھردرا تھا۔

”میں اپنے فیصلوں میں ترمیم کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“ میں نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

”نیچے واپس آ جا مورکھ.....“ پنڈت پر بھو دیال نے مجھے تیز نظروں سے گھورا۔ اُس کو آنکھوں میں مقناطیسی کشش تھی۔ مجھے اپنا وجود لرزتا محسوس ہوا۔ میں نے جلدی سے اپنی توبہ دوسری طرف کر لی۔ ایک لمحے کی دیر ہو جاتی تو پنڈت کی پراسرار قوتیں مجھے اپنے جال میں پھانسنے میں کامیاب ہو جاتیں۔ مجھے سید کی لائھی کا خیال آیا، وہ میرے پاس ہوتی تو شاہ پر بھو دیال بھی اُسے دیکھ کر مجھے زیر کرنے سے پہلے دس بار غور کرنا ضروری سمجھتا۔ مجھے نظریں بچاتا دیکھ کر پنڈت نے ”جے کالی“ کا نعرہ بلند کیا، پھر الفاظ چباتے ہوئے بولا۔

”سنا ہے تو نے تھانے میں کسی انسپکٹر کی وردی اُترادی تھی، ہمیں بھی کوئی چٹکار دکھا دے۔ زمین پر ٹھوکر مار کر شعلے بھڑکا، میرے شریر کے کپڑے بھی اُتروانے کے لئے کوئی داؤ بیچ کر..... نظریں ملا کر بات کر.....“

پنڈت مجھے بھڑکانے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ انکارانی کہیں آس پاس ہی موجود ایک ایک بات سن رہی ہوگی۔ اُس نے کہا تھا کہ پر بھو دیال، بدری نرائن سے زیادہ قوتوں کا مالک ہے۔ میں بدری نرائن کو کتوں کی موت مار چکا تھا۔ کلدیپ نے امر لال کے جسم کے کئی ٹکڑے کر دیئے تھے۔ تب اور بات تھی، کلدیپ میرے ساتھ تھی۔ اس وقت میں تنہا کھڑا تھا۔ دُرگا نے اکیس دنوں کے لئے میری قوتیں سلب کر لی تھیں۔ انکا کا مشورہ تھا کہ میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دوں۔ پنڈت مجھے اشتعال دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”چپ کیوں ہے.....؟“ پر بھو دیال نے تحارت سے کہا۔ ”اُونچے سُروں میں بات کر، نو جوان چھو کر یوں کی طرح نظریں کیوں چرا رہا ہے.....؟“

”پنڈت.....“ میں چپ نہ رہ سکا۔ ”میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے، کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم درمیان میں نہ آؤ تو بہتر ہوگا۔“

”کیوں؟“ وہ کمینگی پر اُتر آیا۔ ”مجھے دیکھ کر ٹٹی خشک ہو گئی؟ ڈیڑھ باشت کی چھمیا سر سے اُتر گئی تو نامرد بن گیا۔ اُس کی موجودگی میں دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے..... پہاڑ کے نیچے آیا تو بلبلانے لگا؟“

”زبان کو لگام دو پر بھو دیال.....“ میں نے تمللا کر جواب دیا۔ ”تم بھی دُرگا کے دیئے ہوئے سراپ کی وجہ سے اُونچی آواز میں بول رہے ہو۔ میرے ہاتھ پیر بندھے ہیں اور تم اپنی مردانگی کی ڈینگیں مار رہے ہو۔ میری وحشتوں اور جنون کے قصے تم نے بھی ضرور سنے ہوں گے۔ نہیں سنے تو گرو پرتاپ سے جا کر پوچھ لو.....“

”بھول جا اُس مورکھ کو جس نے تیرے کارن اپنا جیون بھینٹ کر دیا۔“ پنڈت جھلا کر بولا۔ ”وہ مہمان شکتی کا مالک تھا لیکن بھول سے دُرگا سے پنچلڑانے کی غلطی کر بیٹھا۔ تو نے نہیں دیکھا، میں جانتا ہوں کہ اُس کا انت کتنا بھیا نک ہوا۔ اُسے دُرگا کے چرنوں میں پکار یوں نے بوئیاں نوچ نوچ کر ختم کر دیا۔ اُس کی آتما اور شریر کا بندھن ٹوٹ گیا۔ آخری سانس تک اُس مہا پرش نے جیون کی بھکشا بھی نہیں مانگی۔ بڑا مورکھ تھا، تجھ جیسے پانی کے

لئے جان دے دی.....“

”پنڈت.....“ میں نے استہزائیہ انداز اختیار کیا۔ ”تم نہیں جانتے کہ گرو نے میری خاطر قربانی کیوں دی..... جان لیتے تو اچھا ہوتا تو ابھی سے چل کر یہاں تک آنے کی غلطی کبھی نہ کرتے۔“

میرا جواب سن کر رومی شکر کسمسا نے لگا۔ پر بھو دیال کی آنکھوں میں بھی شعلے بھڑکے لگے۔ اُس نے اپنے سینے کا ایک بال توڑ کر بڑی قوت سے میری جانب اُچھالا۔ میں توازن برقرار نہ رکھ سکا، تیوراً کر زمین پر گر پڑا۔ زنجیریں جھیں تو اذیت سے کراہ کر رہ گیا۔ رومی شکر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

”رومی کی بات مان لے پاپی.....“ پنڈت نے نفرت سے کہا۔ ”اس دلش سے دفع ہو جا..... سن رہا ہے میری بات، اسی میں تیری مکتی ہے۔“

”میرے فیصلے میں چمک پیدا کرنے میں تمہیں کبھی کامیابی نہیں ہوگی پر بھو دیال.....“ میں نے ٹھوس آواز میں جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم نے تھوڑی بہت قوتیں حاصل کر رکھی ہیں مگر شاید تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ تم سے پہلے تمہارے جیسے بہت سارے پنڈت پجاری میرا راستہ کھوٹا کرنے کی حماقت کر چکے ہیں۔ اُنہوں نے بھی جذبات اور دھرم کے نام پر اندھے ہو کر اپنی اوقات سے تجاوز کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن انجام کیا ہوا؟ ایک ایک کر کے سب پر لوک سدھار گئے۔ تمہاری دُرگابھی صرف پندرہ بیس روز کے لئے میرے اوپر حاوی ہو سکی، اُس کے اختیار میں ہوتا تو گرو پرتاپ سے پہلے مجھے نرک میں جھونکنے کی.....“

”چپ ہو جا مورکھ، پاپی..... اپنی زبان کو تالا لگا لے۔“ پنڈت آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس نے دوسرا وار کیا۔ اُلٹا پاؤں اٹھا کر زمین پر مارا، میرے چاروں طرف آگ بھڑکنے لگی۔ شعلے مجھے جلا کر خاک کر دینے کی خاطر میری سمت بڑھ رہے تھے جب کسی نے میرا بازو تھام لیا۔ میں نے بولکھار کر نگاہوں کا زاویہ بدلا۔ میں سمجھا کہ پنڈت کے جنتر منتر کے پیر میرا ہاتھ تمام کر آگ میں جھونکنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن میری نظر سید مجذوب پر پڑی تو میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔

”مجھے یقین تھا پیر و مرشد.....“ میں نے تڑپ کر کہا۔ ”میرے صبر کی انتہا تمہیں میری

جانب ضرور متوجہ کر لے گی۔ تمہارے اشارے پر رومی کو دھنکی بھی لگ چکی، میں نے اُس وقت بھی اُف نہیں کی، اب کہو تو اپنے وجود کو شعلوں میں جھونک دوں۔“

”دہلتی جھاڑ کر کھڑا ہو جا..... آسمان کی طرف منہ اٹھا کر ریتنا شروع کر دے۔“ سید نے اپنے جسم کا تھوڑا سا میل اتار کر میرے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے کہا، پھر یلکھت نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

بھڑکتے ہوئے شعلے تیزی سے بلند ہو کر میری طرف لپک رہے تھے۔ پنڈت پر بھو دیال کے ہونٹ بدستور متحرک تھے۔ وہ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کی خاطر کسی خطرناک جان لیوا منتر کا چاپ کر رہا تھا۔ رومی شکر بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ میں نے سید مجذوب کے میل کو زبان کے ذریعے حلق کے نیچے اتار لیا۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں کا رقص پلک جھپکتے میں ختم ہو گیا۔ پنڈت اور رومی شکر کی آنکھیں پٹ پٹانے لگیں۔ مجھے اپنے اندر پرانی توانائی کروٹ لیتی محسوس ہوئی۔ میں نے ہاتھوں کو جھککا دیا، ہتھکڑیاں کانچ کی چوڑیوں کی طرح ٹوٹ کر ایک طرف جا پڑیں۔ میرا دل خوشی سے اُچھل پڑا۔ دُرگابھی عتاب سید کے جسم کے میل سے ختم ہو گیا تھا..... میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پیروں کی زنجیروں کو کچے دھاگوں کی طرح توڑ کر ایک طرف اُچھال دیا۔ مسکراتا ہوا کھڑا ہوا تو رومی شکر دم بخود رہ گیا۔ پنڈت نے غصے میں پھر کر اپنا اُلٹا ہاتھ فضا میں بلند کیا، میں نے دم سادھ لیا۔ مجھے سید کی ذات پر اعتماد تھا۔ پر بھو دیال پینتر ابدل بدل کر حملے کرتا رہا، اپنے ترکش کے سارے تیر ایک ایک کر کے آزماتا رہا۔ اُسے ناکامی ہوئی تو بل کھانے لگا۔

”میں نے تم سے کہا تھا پنڈت کہ اپنی وڈیا سے میرے بارے میں جان لیتے تو میرے مقابلے پر آنے کی غلطی کبھی نہ کرتے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم نے اپنے دل کے سارے ارمان نکال لئے۔ اب میری باری ہے۔ کہو تو تمہیں بھی آنکھ کے ایک اشارے سے گرو پرتاپ کے پاس بھیج دوں، لیکن نہیں.....“ میں زہر خند سے بولا۔ ”میں تمہیں ماروں گا نہیں۔ تم زندہ رہو گے تاکہ اپنی زبان سے چندرا اور نول کشور کو بتا سکوں کہ انہوں نے میرے خلاف پنڈت پجاریوں کے دلوں میں زہر گھول کر ٹھیک نہیں کیا۔“

پنڈت پر بھو دیال اپنی جگہ اہونٹ کا شتا رہا، نگاہوں نگاہوں میں مجھے تولتا رہا۔ میں نے رومی شکر کی سمت دیکھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

”تمہیں یاد ہے روی شکر؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔۔۔۔۔“  
”م۔۔۔۔۔ میں قانون کی خانہ پڑی کرنے پر مجبور ہوں۔“ اُس نے بڑی مُردہ آواز میں

جواب دیا۔

”ضرور کرو خانہ پڑی۔“ میں نے حقارت سے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”میں تمہیں منع نہیں کرتا۔ لیکن اپنے کا زندگیوں کو اب اپنی ہی زبان میں سمجھا دینا کہ مجھ سے چھیڑ خانی نہ کریں۔ ایک بات اور دھیان سے سن لو، ڈی ایس پی رمیش کھنا (مرلی) یا سروجنی نے اپنی خوشی سے مجھے اپنے گھر میں پناہ نہیں دی تھی۔ وہ بھی میری طاقت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور گئے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس وقت تم بے بس نظر آ رہے ہو۔ اُن دونوں کے خلاف کوئی گھٹیا قدم اٹھانے کا ارادہ بھول کر بھی مت کرنا۔۔۔۔۔ سنا تم نے؟ میں کیا کہہ رہا ہوں۔“  
روی شکر کچھ جواب دینا چاہتا تھا، لیکن اُسے موقع نہیں ملا۔ پنڈت پر بھو دیال کو اپنا شکست منظور نہیں تھی۔ اُس نے آخری حربے کے طور پر اپنے گلے میں پڑی ہوئی مالا اتار زور سے میری طرف پھینکی۔ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ مالا کے دانے دیوار سے ٹکرا کر اڑے اُدھر بکھر گئے۔ پنڈت نے میرے سمجھانے کے باوجود کمینگی کا ثبوت دیا تھا۔ میں اپنے پر قابو نہ پاسکا۔ میں نے مندا کا سکھایا ہوا عمل شروع کر دیا۔

”مجھے شام کر دو جمیل احمد خاں۔۔۔۔۔“ پنڈت گڑگڑانے لگا۔ ”میں تمہاری شکتی کا انداز نہیں کر سکتا تھا۔ بھول ہو گئی مجھ سے۔“

میں نے جواب میں اُسے تیز نظروں سے گھورا۔ پھر یہ میری تیز نگاہوں کا اثر تھا، ہر مدتوں کی شب و روز ریاضتوں کا کرشمہ تھا، میرے ارتکاز اور مراقبوں کی مسلسل مشقوں کا نتیجہ تھا کہ پنڈت پر بھو دیال کے قدم اُکھڑ گئے۔ وہ چکرا کر نیچے گرا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا جسم جھلس کر کوئلے کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ روی شکر نے پنڈت کا بھیا تک اُچھ دیکھا تو تھر تھر کانپنے لگا۔

انکارانی میرے سر پر واپس آ کر خوشی میں دیوانہ وار رقص کرنے لگی۔۔۔۔۔!!



بازی پلٹ گئی۔ سید مجذوب جیت گیا۔ دُرگا کی شکتی کا سراپا پل بھر میں دم توڑ گیا۔ روی شکر نے میری طاقت کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ وہ کمینگی سے انکاری پر اُتر آیا۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو محتاط رہنے کا اشارہ کر دیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ انکا بھی حیران رہ گئی۔ مجھے دوبارہ تھانے کے لاک اپ میں پہنچا دیا گیا۔ اس بار اُنہوں نے مجھے زنجیروں میں جکڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ سید مجذوب کی لاٹھی میرے پاس ہی رہی۔ انکا بار بار ایک ہی رٹ لگا رہی تھی۔

”جمیل، میں نے زمانے کی کئی کروٹوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ بڑے بڑے سورماؤں سے پالا پڑا ہے، پراسرار قوتوں کے بارے میں اتنا تم نہیں جانتے جتنا میں جانتی ہوں۔ دنیا میں آج بھی ایسی آبادیاں موجود ہیں جہاں تک تمہارے سائنس دان اور کھوجیوں کی رسائی نہیں ہو سکی۔ وہاں دیوتاؤں نے اپنے ماننے والوں کے لئے ایک منڈل کھینچ دیا ہے جس کے اندر اُن کے پجاریوں کے سوا کوئی دوسرا داخل نہیں ہو سکتا۔ زمین سے آسمان تک اس حصار کے اندر جو شے بھی داخل ہوتی ہے وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ تمہاری مہذب دنیا کے لوگ اس بات کو نہیں مانتے لیکن آئے دن ان مخصوص علاقوں سے گزرنے والے طیاروں کی تباہی کی کوئی وجہ بھی دریافت نہیں کر سکے۔ کئی سر پھرے سیاحوں نے ان غیر مہذب علاقوں کو کھوجنے میں جان گنوا دی۔ جو کامیاب نہیں ہو سکے اُنہوں نے اپنی معلومات کا ذخیرہ کتابوں میں جمع کر کے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن انہیں مہمائی، پراسرار اور ہولناک کہانیوں کا نام دے کر الماریوں میں سجایا گیا۔ تم چاہو تو میں تمہیں وہاں کے بارے میں بہت کارآمد باتیں بتا سکتی ہوں۔ مثلاً یہ کہ ان آبادیوں میں لکڑی اور گھاس پھوس سے بنائے گئے دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی ہے، انہیں پوجا جاتا تھا، ان کی رسمیں بھی عجیب و غریب اور بڑی ہولناک ہوتی ہیں۔ تم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

مرلی پہلے ہی میرا غلام بن چکا تھا، پنڈت پر بھودیا ل کا انجام دیکھ کر اور بھی مرید بن گیا۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ پنڈت کی لاش کو خاموشی سے ایک چرمی تھیلے میں بند کر کے بڑی رازداری سے ٹھکانے لگا دیا گیا۔ یہ کام رومی شکر کے خاص آدمیوں نے سرانجام دیا تھا۔ مرلی صرف پنڈت کی کونڈہ بنی لاش ہی دیکھ سکا۔ رومی شکر نے اُسے سخت الفاظ میں زبان بند کھنے کی تاکید کی تھی۔ مرلی کو یہ ہدایت نہ کی جاتی تب بھی وہ زبان نہیں کھول سکتا تھا۔ پنڈت نول کشور یا دوسرے پنڈت پجاریوں کو پر بھودیا ل کے سلسلے میں بھٹک مل جاتی تو وہ پھر بے قابو ہو جاتے۔ مرلی کو بھی جان بچانی مشکل ہو جاتی۔

میں اُس روز بھی سید کی لاشی کو سینے سے لگائے بیٹھا نول کشور کے بارے میں سوچ رہا تھا جب مرلی آ گیا۔ وہ کچھ بوکھلایا بوکھلایا نظر آ رہا تھا۔ میں نے وجہ دریافت کی تو مدھم آواز میں بولا۔

”کل رات انسپکٹر بلیر بھی مر گیا۔ اُس کے جسم میں زہر پھیل گیا تھا۔ رومی شکر نے بھی اُس کی آخری رسومات میں بطور خاص حصہ لیا تھا۔ اُس نے بلیر کے گھر والوں کو دہلی زبان میں سمجھا دیا ہے کہ وہ صبر سے کام لیں، بات پھیلنے نہ پائے۔“

”اچھا ہوا.....“ میں نے ایک لمبی سانس لے کر سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”اپنا جج بن کر زندہ رہنے سے تو بلیر کا مر جانا ہی بہتر تھا۔“

”مہاراج، کل تم کو دوبارہ عدالت کے روبرو پیش کیا جائے گا۔“ مرلی کسمسانے لگا۔

”رہمانڈ کی مدت پوری ہو چکی ہے۔“

”مرلی.....“ میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ ”کیا بات ہے؟ تم کچھ نزوس دکھائی دے رہے ہو.....؟“

”کل کے لئے بڑے سخت انتظامات کئے جا رہے ہیں۔“ اُس نے متفکر انداز میں جواب دیا۔ ”کچھ پنڈت پجاری باہر سے بھی آئے ہیں، دُرگا کے مندر میں سر جوڑے مشورے کر رہے ہیں۔ ڈی آئی جی کی فیندیں حرام ہو گئی ہیں۔ اُسے اندیشہ ہے کہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور ہوگا۔ میری انکوائری رپورٹ سے بھی وہ خوش نہیں ہے۔“

”تم نے ایسا کیا لکھ دیا جو رومی شکر کو پسند نہیں آیا؟“ میں نے بے پرواہی سے سوال کیا۔

”میں نے جو لکھا وہ غلط نہیں ہے۔ پنڈت کالی داس اور اوم پرکاش کی موت میں مجھے

گھاس پھوس کے دیوتاؤں سے شگون لیا جاتا ہے۔ چھوٹے بڑے سب ان پر آنکھ بند کر کے اعتماد کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندو دھرم میں بھی دیوی دیوتاؤں کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ان کی طاقت کے کرشموں سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ ان کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ انکا بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ ”دُرگا کی شکتی بھی اپرم پار ہے۔ میں نے بھی تم سے یہی سنا تھا کہ ایکس روز کے لئے تمہاری قوتیں تمہارے کسی کام نہیں آسکیں گی۔ تم گرو پر تاپ مل چکے ہو۔ وہ بھی پریتم لال مہاراج کے ٹکڑے کا پجاری تھا۔ تم گواہ ہو کہ اُس نے تمہارا ہاتھ تھام کر تمہیں رومی شکر اور اُس کے بہت سارے آدمیوں کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا تو سرچ لائٹس کی تیز روشنیاں بھی بیکار ہو گئی تھیں۔ لیکن دُرگا کے سامنے وہ بھی گھٹنے ٹیک مجبور ہو گیا۔ جھینٹ کی رسم کی ادائیگی کے وقت ننگ دھڑنگ پجاریں مدھ کے پیالے پی وحشانہ رقص کر رہی تھیں۔ پنڈت پجاریوں کا ہجوم دُرگا کی شان میں بھجن الاپ رہا تھا۔ کی شکتی چھین لی گئی، اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دُرگا کے چرنوں میں ڈال دیا گیا۔ میں بھی تم سے یہی کہا تھا، گرو کو اُس کے کئے کی سزا ضرور ملے گی۔“ انکا ایک لمحے کو سانس بے کی خاطر زُکی پھر ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ”جمیل..... مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تمہارے ساتھ ایک انہونی بات کس طرح ہو گئی؟ دُرگا کے عتاب کی مدت ابھی پوری ہوئی تھی لیکن تم نے سب کو حیران کر دیا..... مجھے بتاؤ، یہ کیسے ہو گیا.....؟“

”وہ بروقت آ گیا تھا انکارانی۔“ میں نے سید کی لاشی چوم کر جواب دیا۔ ”ایک لمبے دیر ہو جاتی تو پنڈت پر بھودیا ل کی بھڑکائی ہوئی آگ مجھے جلا کر خاک کر دیتی۔ اُس نے کر اپنے جسم کا میل میرے منہ میں ڈال دیا۔ دُرگا کی طاقت کے جال کچے دھاگول طرح ٹوٹ گئے۔“

”تم قسمت کے دھنی ہو جو وہ بار بار تمہیں درشن دیتا رہتا ہے۔“

انکا میرے ساتھ باتوں میں مصروف رہتی، میرا وقت سکون سے گزر جاتا۔ میں محض کر رہا تھا کہ اس نے اب چندرا اور پنڈت نول کشور کی باتیں کرنا چھوڑ دی تھیں۔ میں ان نام سن کر بھڑک اٹھتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے دشمنوں کی طرف سے غافل نہیں گی۔ جب وہ سر پر نہیں ہوتی تھی تو میں بھی چندرا اور نول کشور کے انجام کے بارے میں منصوبے بناتا رہتا تھا۔

کے قدم بھی میری کلدیپ کے مقابلے میں اکھڑ گئے تھے۔ وہ جان بچانے کی خاطر مندر میں چھپنے کے لئے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا تھا۔ کلدیپ نے ہاتھ کے اشارے سے اُس کا سرتن سے جدا کر دیا۔ اُس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ بعد میں وہ بھی کالی کو دیئے ہوئے وچن کے پالن کی خاطر بھیٹ چڑھ گئی۔ میں ہندوستان چھوڑ کر لندن چلا گیا۔ مجھے تمہارے دیس سے نفرت ہو گئی۔ تمہاری مٹی نے میری بہت ساری خوشیاں چھین لیں، ایک ایک کر کے مجھ سے میرے جینے کے تمام سہارے پھڑتے چلے گئے۔ میں لعنت بھیج کر یہاں سے چلا گیا۔ میں اپنی مرضی سے کبھی واپس نہ آتا، لیکن ہندوستان کے پنڈت پجاریوں کو میرے خلاف بھڑکا دیا گیا۔ پنڈت نول کشور جو بزدلوں کی طرح ہردوار میں کالی کے مندر میں چھپا بیٹھا ہے اُس نے دلوں میں زہر گھولنے کا کام شروع کر دیا۔ سورمر چکا تھا لیکن اُس کی اولاد زندہ تھی..... میں چندرا کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”وہ اٹھارہ سال کا حرامی کالہ بھی پر نکال رہا ہے۔ مجھے پریتم لال کی آتما نے واپس ہندوستان آنے پر مجبور کیا۔ میں یہاں گل جھڑے اُڑانے کے ارادے سے نہیں آیا، نول کشور کو سمجھانے آیا ہوں کہ اس نے مجھے چھیڑ کر اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ میں چندرا کو بھی ایسا سبق سکھاؤں گا کہ اُس کی سات پشیتیں بھی کبھی جمیل احمد خاں کا نام زبان پر لانے کی غلطی نہیں کریں گی.....“

مرلی حیرت سے میری باتیں سنتا رہا، میرے جنون میں کمی نہیں آئی۔ میں نے سینہ ٹھونک کر کہا۔

”تم قانون کے نگہبان ہو۔ چاہو تو تم بھی نول کشور اور چندرا کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ پورے ہندوستان کے پنڈت پجاریوں کو آگاہ کر دو کہ میں سر سے کفن باندھ کر آیا ہوں، میری کلدیپ کی رُوح ابھی تک بے چین ہے۔ اُسے تب سکون ملے گا جب میں اپنے باقی دشمنوں کو جہنم رسید کر دوں گا، پنڈت نول کشور اور چندرا کو موت کے گھاٹ اُتاروں گا۔ تمہارا ڈی آئی جی صرف کالی داس اور اوم پرکاش کی موت سے بولکھلا گیا۔ وہ مجھ سے شرطیں باندھ رہا ہے۔ کہتا ہے میں ہندوستان چھوڑ کر واپس لندن چلا جاؤں۔ لیکن اب اُس کی زبان کو بھی میں نے تالا لگا دیا ہے۔ پر بھو دیال کو اُس نے اچودھیا سے بلایا تھا، بڑا مان تھا

تمہارا کوئی عمل دخل نظر نہیں آیا۔“ مرلی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”میں نے رپورٹ پر بھی یہی لکھا ہے۔ روی شکر کی توقعات اس کے برعکس تھیں۔ اُس نے فی الحال تو کچھ نہیں کہا۔ لیکن میرے خلاف اوپر والوں کے کان ضرور بھرے گا۔“

”تم ابھی باہر سے آنے والے کچھ پنڈت پجاریوں کا ذکر کر رہے تھے۔“ میں نے اُس کی کہی ہوئی بات نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”کیا تم اُن کے نام سے بھی واقف ہو.....؟“

”تم کس کے بارے میں جاننا چاہتے ہو مہاراج؟“ وہ میری بات کا مقصد بھانپ گیا۔ ”میں ہردوار کے پنڈت نول کشور کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ میرے لہجے میں نفرت اُتر آئی۔ ”وہ کالی کے بڑے مندر کا بڑا پردہت ہے۔ تم نے بھی یہاں ضرور سنا ہوگا۔“

”وہ خود نہیں آیا.....“ مرلی نے تھوڑے توقف سے جواب دیا۔ ”اُس کے کچھ کارند ضرور آئے ہیں۔“

”چندرا کا نام سنا ہے کبھی.....؟“ میں نے پہلو بدل کر حقارت سے پوچھا۔

”تم..... تم شاید سورگ باشی امر لال مہاراج.....“

”میرے سامنے اُسے سورگ باشی اور مہاراج کہنے کی غلطی دوبارہ کبھی مت کرنا۔“ آپے سے باہر ہو گیا۔ ”وہ بد بخت میرے سکون کا دشمن ہے۔ وہ درمیان میں نہ آتا تو با یہاں تک نہ بڑھتی۔ اُس نے انسانیت کے نہیں کالی کے نام پر میرے دشمن بدری نرائن پشت پناہی کی تھی۔ ہندوستان کے سارے پنڈت پجاری مل کر بھی میرا راستہ نہیں روکتے تھے۔ پہلے بدری بھی دیوتاؤں کے کھونٹے پر بڑی اُچھل کود کرتا تھا، میں نے طاقت حاصل کی تو وہ حرام زادہ آنکھ جھولی کھیلنے لگا، چھپ چھپ کر وار کرنے لگا۔ میں اُسے لگا وہ دُم دبا کر بھاگ نکلتا۔ پھر امر لال نے اُس کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُسی سوری وجہ میری کلدیپ کو میسوری پہاڑیوں سے نیچے آنا پڑا۔ وہ غریب پریتم لال کے استھان پر گیان دھیان میں مصروف تھی، امر لال نے اُس کی زندگی میں بھی ہلچل مچا دی، زہر دیا۔“ میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ”تم نہیں جانتے، بڑی لمبی کہانی ہے۔ بڑی دل داستان ہے۔ تم تفصیل سنو گے تو تمہارا کلیجہ بھی پھٹ جائے گا۔ صرف اتنا جان لو کہ امر



اُسے پنڈت کی طاقت پر..... نتیجہ کیا نکلا؟ تم بھی اپنی نظروں سے اس کا بھیا نک انجام چکے ہو۔ میں نے تمہارے گھر پر گرو پر تپ کے کہنے پر بے سرا کیا تھا۔ دُرگا کی مہان شکتی اُس کی بھی بھیٹ لے لی۔ وہ بڑا عظیم پنڈت تھا، مہان شکتیوں کا مالک تھا۔ وہ دنگا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے بھی جنگ و جدل کا شوق نہیں ہے۔ لیکن وہ بار بار مجھے ٹانگ پکڑ کر لیتے ہیں، سکون سے نہیں رہنے دیتے۔ میری موت کے خواب دیکھتے ہیں۔ اب لڑ پٹا رہا تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

آنکھیں ابھی ضرور کھل گئی ہوں گی۔ انہوں نے دیکھ لیا ہو گا کہ دُرگا کا سراپ بھی ہشتوں کے آگے بند نہیں باندھ سکا۔ گرو پر تپ نے کہا تھا کہ دُرگا کی بلند ہونے والی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھنے کی گستاخی کے تصور سے بھی کانپ کر رہ جائے گا۔ تم بھی ایک نے میری ساری قوتیں سلب کر دی ہیں۔ اکیس دن اور اکیس راتیں میرے اوپر بڑا دار آفسر ہو مرلی، حالات تم سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ تمہیں سمجھ لینا چاہئے تھا کہ میں ہوں گی۔ گرو نے مشورہ دیا تھا کہ میں اکیس روز تک اپنے پتکھ سپینے ایک جگہ خاموش رہوں۔ میں نے سروجنی کی وجہ سے تمہارے گھر کا انتخاب کر لیا۔ میں اکیس روز تک کیا..... آگ لگا دی میرے سینے میں۔“

بازو سپینے بیٹھا رہتا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ روی شکر اور اُس کے گرگے تمہارے گرد ڈال رہے ہیں۔ میں اپنی جان بچانے کی خاطر تمہیں اور سروجنی کو مصیبت میں نہیں ڈال

تھا..... تم گواہ ہو، میں تمہارے گھر سے چوروں کی طرح نکل بھاگنا چاہتا تھا لیکن تم آنکھ کھل گئی۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا، تمہیں مجبور کر کے تمہارے ذریعے اپنی گرد پیش کر دی۔ میں جیل میں بھی خاموش رہا مگر روی شکر کے پالتو کتے اور زیادہ بھونکنے وہ میری خاموشی کو بزدلی سمجھ رہے تھے۔ مجھے مجبوراً جواب دینا پڑا..... انسپکٹر بلیر۔

زمین عقوبت خانے میں میرے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تم واقف نہیں ہو۔ مگر جب پانی اونچا ہو گیا تو مجھے اپنی پلکوں کو جنبش دینی پڑی، تین آدمی مارے گئے۔ گولیاں میں نے چلائی تھیں..... اُن کے دماغ پلٹ دیئے تھے۔ بلیر کا انجام بھی خطرناک ہوا۔“

وحشت پر قابو نہ پاسکا۔ مرلی نے امر لال کو سو رگ باشی اور مہاراج کہہ کر میرے تن میں آگ لگا دی تھی۔ میں دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔“ روی شکر نے کمینگی کی چالیں شروع کر دیں۔ میں گاڑی کا رخ تبدیل نہ کراتا تو میرے ساتھ ساتھ تمہارے چہیتے بھی بکھر جاتے۔ دشمن جشن مناتے، میری لاش پر رونے والا کوئی نہ ہوتا۔ ڈی نے پھر حماقت کا ثبوت دیا، پنڈت پر بھو دیال کو قربانی کا بکرا بنا دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ عتاب کی مدت پوری ہونے سے پہلے میں ہاتھ پیچ نہیں چلا سکوں گا۔ وہ بھول گیا

میں نے کوئی تلخ جواب دینا چاہتا تھا کہ انکارانی میرے سر پر آ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں

چنگاریاں سنگ رہی تھیں۔ بڑی متفکر نظر آرہی تھی۔

”کوئی نئی اطلاع؟“ میں نے اُسے عالم تصور میں مخاطب کیا۔

”جیل.....“ انکا ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ ”مرلی سے کہو کہ جتنی جلدی ممکن ہو گھر

پہنچنے کی کوشش کرے۔ ہر دو ار سے آنے والے ایک پجاری نے اس کے گھر کو آگ لگا دی

ہے۔ اس میں پنڈت نول کشور کی شرارت ہے۔ اُسے بھنک مل گئی ہے کہ مرلی تمہارا ساتھ

دے رہا ہے۔“

سروجنی اور ساوھنا کا کیا بنا؟“ میں نے بڑی عجلت سے پوچھا۔ ”کیا وہ بھی.....“

”پریشان مت ہو۔“ انکا نے کہا۔ ”مجھے اس پجاری کے من کا بھید ذرا دیر میں معلوم

ہوا۔ لیکن میں نے سروجنی اور سادھنا کو بچا لیا۔ وہ دونوں پجاری کے ہاتھ نہیں لگیں اور اُس کا ارادہ یہی تھا کہ انہیں بھی زندہ جلا دے۔ میں نے انہیں حفاظت سے مرلی پڑوس میں رہنے والے ڈاکٹر کے گھر پہنچا دیا ہے۔ فائر بریگیڈ والے آگ بجھانے کوششوں میں مصروف ہیں۔

”پجاری اس وقت کہاں ہے؟“ میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”کیا تم نے اُسے بھڑا ہوئی آگ کا ایندھن نہیں بنایا؟“

”نہیں..... میں نے اُسے زندہ چھوڑ دیا ہے۔ کل عدالت میں وہ بھی موجود ہوگا۔“

”اللہ تعالیٰ خیر تھا۔“ اُس کا فیصلہ تم بھری عدالت میں کر دینا۔“

”کیا سوچ رہے ہو مہاراج.....؟“ مرلی نے میری خاموشی اور چہرے کے بدلے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ سروجنی بھی نہیں دیوتاؤں سامان پوجتی ہے۔ اُس نے وقتی طور پر چپ سادھ لی ہے لیکن اندر ہی اندر سلگ رہی ہے۔ ذرا سے کچھ اور بیت جائے، پھر دیکھنا۔ رومی شکر میرے آگے پیچھے ہاتھ باندھے گھومتا پھرے تو نام بدل دینا.....“

”کب تک ساتھ دے سکو گے.....؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”جب تک شریر اور آتما کا سبندہ قائم ہے، میں قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گا۔“ مرلی۔

”ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔“

”سوچ لو..... میرا ساتھ دینا تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔ بڑے خسارے میں رہو گے۔“

”تم کوئی حکم دے کر آزمالو، میں ہر امتحان میں پورا اُتروں گا۔“

میں نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مرلی کے نقصان پر غور کرنے لگا۔ میری

سے وہ بھی آگ کی لپیٹ میں آگیا۔

”تم دیر کیوں کر رہے ہو جمیل؟“ انکانے بے چینی کا مظاہرہ کیا۔

میں نے انکا کو جواب دینے کی بجائے آنکھیں کھول کر مرلی کو دیکھا، مدھم مدھم ٹھوس

میں بولا۔

”شانت رہ کر میری بات سنو مرلی، میرے پاس تمہارے لئے کوئی اچھی خبر نہیں..... وہی ہوا جس کا خطرہ تھا، میرے دشمن اوجھے جھکنڈوں پر اُتر آئے ہیں۔ وہ نہیں چا

کہ تم میرا ساتھ دو۔“

”میں سمجھا نہیں.....“ مرلی کسمسانے لگا۔

”انہوں نے تمہارے اپارٹمنٹ کو آگ لگا دی ہے۔“ میں نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”فائر بریگیڈ والے بھڑکتے شعلوں کو بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہت کچھ

بل چکا، جو باقی بچے گا وہ بھی کسی کام کا نہیں رہے گا۔“

”سروجنی کا کیا بنا مہاراج.....؟“ مرلی نے ساز و سامان کی بجائے اپنی لکشمی کے

بارے میں بے چینی سے دریافت کیا۔

”وہ اور سادھنا دونوں خیریت سے ہیں۔ تمہارے پڑوسی ڈاکٹر کے گھر میں محفوظ ہیں۔“

”میرے لئے کیا حکم ہے.....؟“ مرلی نے بڑے حوصلے سے سوال کیا۔

”جلد بازی سے کام نہ لینا، ورنہ دشمنوں کو ہنسنے کا موقع مل جائے گا۔“ میں نے اُسے تسلی دی۔ ”گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا سارا نقصان پورا کرنے کی ذمہ داری میری ہے۔“

”ایک بات اور بتا دو مہاراج.....“ مرلی نے بڑی عقیدت سے کہا۔ ”جب تم نے آنکھیں بند کر کے اتنی دُور سے میرے اپارٹمنٹ کو جلتے دیکھ لیا تو تمہیں یہ بھی ضرور معلوم ہو گا کہ اس کا ذمہ دار کون ہے.....؟“

”میں نے تمہیں شانت رہنے کو کہا تھا۔ ایک دن اور صبر کر لو، وہ دشت بھی سامنے آ جائے گا جس نے تمہارے نشین کو آگ لگانے کی بھول کی ہے۔“

مرلی نے اصرار نہیں کیا۔ جھک کر پر نام کیا، پھر تیزی سے واپس چلا گیا۔ دروازے کو پھرتالا لگا دیا گیا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ تھانے کے سارے عملے کو انسپکٹر کی وردی اُترنے کی کہانی معلوم ہو چکی تھی۔ پھر بھی وہ احق بار بار لاک اپ کا تالا کھولنے اور بند کرنے کی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔

”جمیل.....“ مرلی کے جانے کے بعد انکانے مجھے مخاطب کیا۔ ”اب تم نے کیا سوچا ہے؟ کل عدالت عدم ثبوت کی روشنی میں تمہیں آزاد کرنے کا فیصلہ سنا دے گی۔ یہ صرف عدالت کا فیصلہ ہوگا۔ دُرگا کے مندر میں کچھ اور فیصلہ کیا گیا ہے..... وہ تمہیں گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ ہر دوار سے پنڈت پجاریوں کی جو ٹولی آئی ہے وہ بڑے اُونچے سپنے

دیکھ رہی ہے۔“

”بحرا یا نندنی جیسی کوئی پجارن نہیں بھیجی نول کشور نے؟“ میں نے بے پرواہی مظاہرہ کیا۔ ”میرا دل بھی بہل جاتا، تمہاری من پسند غذا بھی میسر آ جاتی۔“

”یہ تم کہہ رہے ہو جمل..... تم؟“ انکا نے بڑی خوشگوار حیرت کا اظہار کیا۔ ”مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔“

میں نے جواب میں مسکرا کر انکارانی کے چہرے پر پھوٹنے والی شفقت دیکھی۔ وہ اتراتی بل کھاتی میرے کندھے پر آ گئی، بڑی لگاؤ سے بولی۔

”اسی طرح خوش رہا کرو..... اچھے لگتے ہو.....“

”جو پنڈت پجاری مجھ پر جال ڈالنے آئے ہیں، اُن کی تعداد کیا ہے.....؟“ میں نے قدرے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟“ انکا اٹھلا کر بولی۔ ”پریتیم لال مہاراج نے اپنی کہ سے تمہاری داسی کو جو شکستیاں دان کی ہیں وہ کس دن کام آئیں گی؟ تم صرف تماشہ دیکھ رہنا۔ تمہارے دشمنوں کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔“

”اب بمبئی سے نکلنے کی بات کرو۔“ میں نے سنجیدگی اختیار کی۔ ”یہ میری منزل نہیں ہے، تم بھی جانتی ہو۔“

”ترنم اور سید غوث سے ملے بغیر چلے جاؤ گے.....؟“

”ہندوستان میں میرے اور بھی بہت سارے واقف کار ہیں۔ مجھے حیدر آباد بھی جانتا ہے۔ رکن الدین کی حویلی میں بھی کچھ جانے پہچانے چہرے میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔“

گلبرگ پہنچ کر حضرت گیسو دراز کے مزار پر بھی حاضری دینی ہے۔ سید مجذوب سے مل کر اُن کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے۔ کس کس کا ذکر کروں.....؟“ میرے لہجے میں اُدا اسی اُتر آئی۔

”میسور کی پہاڑیاں یاد ہیں تمہیں؟ وہیں پریتیم لال کی کنیا میں کلدیپ نے اپنی جوانی دن اور اُنٹگوں کی راتیں قربان کر دی تھیں۔ اب تو وہ جھوپڑی بھی اُجڑ چکی ہوگی۔ خاک اور دُھول اُڑ رہی ہوگی ہر سمت۔ میں وہاں بھی جانا چاہتا ہوں۔ شاید کلدیپ کی بے چارہ

رُوح وہاں ابھی تک میرا انتظار کر رہی ہو۔ وہی میری آخری منزل، میرا آخری ٹھکانا ہوگا۔ پریتیم لال کی آتما نے لندن کے ہسپتال میں مجھ سے جو کچھ کہا تھا اس کا ایک ایک لفظ میرا

دل و دماغ میں محفوظ ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ میں جل کے اُوپر ہی اُوپر تیرتا رہا ہوں گا۔ جل کی تہہ میں غوطہ نہیں لگا سکوں گا۔ مجھے کٹھن منزلیں سر کرنی ہوں گی۔ میں پتھر کی اتنی ٹھوس مورتی یا کوئی ایسی آہنی چٹان نہیں بن سکوں گا جس پر زمانے کے سرد و گرم کا زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ اُس نے جو کچھ کہا تھا ممکن ہے ٹھیک ہی کہا ہو۔ مجھے اپنے بارے میں زیادہ خوش فہمی بھی نہیں ہے۔ لیکن میں اب تنگ آ چکا ہوں، جو کام جتنی جلدی پورا ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے..... میں اپنی ترنم سے ضرور ملوں گا۔ اُس کے رُوپ میں مجھے اپنی نرگس بھی نظر آ جاتی ہے۔ کلدیپ کا پیار بھی چھلکتا نظر آتا ہے۔ مجھے سید غوث کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے جس نے

ترنم کا بوجھ میرے کندھوں سے اُتار دیا تھا۔ مگر ان تمام کاموں سے پہلے مجھے پنڈت نول کشور کے تناور درخت کو جڑ سے اُکھاڑنا ہے۔ وہ بچ گیا تو ہندوستان کے سر پھرے پنڈت پجاری اُس کے وجود سے میرے خلاف زہر کشید کرتے رہیں گے۔ امر لال جیسے

زہریلے سانپ کے اُس سپنولے چندرا کو بھی ٹھکانے لگانا ہے جس نے پیدا ہوتے ہی بغیر سوچے سمجھے مجھ سے دشمنی مول لے لی۔“

”چندرا کو بھڑکانے کی ذمہ داری بھی نول کشور پر عائد ہوتی ہے۔“ انکا نے حقارت سے کہا۔ ”وہی سب کی ڈور تھامے انہیں اپنے اشارے پر کھڑے پتلیوں کی طرح نچا رہا ہے۔“

”سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں انکارانی۔“ میں سرد لہجے میں بولا۔ ”کوئی کم، کوئی زیادہ.....“

”تم فکر مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ انکا نے بڑے پیار سے میرے گال پر نرم نرم انگلیاں پھیرتے ہوئے تسلی دی۔ ”تم بس خوش رہا کرو۔ ہنستے بولتے رہا کرو۔ سنجیدہ ہو کر جذباتی باتیں شروع کر دیتے ہو تو ذرا اچھے نہیں لگتے۔“

”سادھنا کی بات کروں.....؟“ میں نے یوں ہی اُس کی خوشنودی کی خاطر پوچھ لیا۔ ”ہائے جمل، تم نے کس قیامت کا نام لے لیا۔ پیاس بھڑک اُٹھی میری۔“ انکا ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ میں سمجھ رہا تھا، وہ میری توجہ ہٹانے کی خاطر موضوع بدلنے کی خواہشمند تھی۔ میں اُس کی اداکاری پر مسکرا دیا..... وہ اور شوخیاں کرنے لگی.....!!

”دوسرے دن مجھے عدالت میں پیش کیا گیا۔ مرلی حسب وعدہ میرے ساتھ تھا۔ اپنی جگہ وہ حالات کے پیش نظر کسی دوسرے افسر کو بھی تعینات کر سکتا تھا۔ اُس کے گھر کو نذر آتش کر

دیا گیا تھا، اُس کا عذر قابل قبول ہوتا۔ لیکن اُس نے بڑے حوصلے اور ہمت کا ثبوت دیا۔ ٹھیک وقت پر مجھے لینے آ گیا۔ میں نے اُس کو بغور دیکھا۔ اُس کے چہرے پر گھر جل جانے کا کوئی ملال نہیں تھا۔

”مرلی.....“ میں نے دبی زبان میں پوچھا۔ ”سروجنی اور سادھنا کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟“

”وہ دونوں محفوظ ہیں۔ بڑی کرپا کر دی بھگوان نے۔“ مرلی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”سروجنی بتا رہی تھی کہ اگر ایک لمحے کی دیر ہو جاتی تو اس کا آگ کے شعلوں سے بچ نکلنا مشکل ہو جاتا۔“

”سامان کا کیا بنا.....؟“ میں نے آہستہ سے دریافت کیا۔ ”سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔“ مرلی بے پرواہی سے بولا۔ ”سروجنی کو بھی کوئی پروا نہیں ہے، مجھے بھی ملال نہیں ہوا۔ سامان کا کیا ہے، بازار سے دوسرا آ جائے گا۔ سروجنی کو بھگوان نہ کرے کچھ ہو جاتا تو.....“ مرلی کے چہرے کے رنگ بدلنے لگے۔

”دھیرج سے کام لو.....“ میں نے اُسے سمجھایا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ”ایک بات اور بتاؤں آپ کو.....“ اُس نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آتشزدگی کی رپورٹ بھی نہیں لکھوائی۔“

”کیوں.....؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے بارے میں طے کر لیا جائے تو پھر تھانہ پچھری کی دوسری مول نہیں لینی چاہئے۔“ مرلی کے لہجے میں اشتقاق کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ ”سروجنی نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔“

”سن رہے ہو جمیل اس ڈی ایس پی کی باتیں؟“ انکا چپ نہ رہ سکی۔ ”کس دیدہ دلیرا سے نقصان برداشت کرنے کی باتیں کر رہا ہے۔ جتنی مالیت کا سامان کو مکملہ بنا ہے اس سے دو گنی رقم تو یہ ہر مہینے بطور رشوت ہڑپ کر جاتا ہے۔ تعلقات بڑھانے کی خاطر آئے دل دعو توں پر جو خرچ ہوتا ہے وہ الگ ہے۔ اس کے علاوہ سروجنی خود بھی کسی نکال سال سے کم نہیں ہے۔ اُس کے چاہنے والے.....“

”چپ ہو جاؤ انکارانی۔“ میں نے اُسے ٹوک دیا۔ ”جہاں گنگا کھلے عام بہہ رہی ہے۔“

وہاں کوئی بھی ہاتھ دھو سکتا ہے۔“

”مجھے گنگا سے زیادہ جمنے کے بچ جانے کی خوشی ہے۔“ انکا نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”بہن! سے روانگی سے قبل تم بھی اپنی تھکن اور بدن کی کشائیں اتار لینا۔ میں بھی تازہ دم ہوں گی۔“

”تم نے اتنی خوبصورت باتیں کہاں سے سیکھ لیں؟“ میں اُس کے برجستہ جملے کی داد دے بغیر نہ رہ سکا۔

”تمہاری صحبت کا نتیجہ ہے.....“ انکا نے جھک کر سلام کیا۔ ”صحبت کا مطلب سمجھتی ہو؟“ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ میرا مفہوم سمجھ کر شرمائی۔

عدالت کے راستے میں میرے اور مرلی کے درمیان اُس کے اپارٹمنٹ میں لگنے والی آگ کی بات ہوتی رہی۔ مرلی مجھے تفصیل بتاتا رہا، انکا اُس کے جملوں پر منہ بناتی رہی۔ گاڑی عدالت کے احاطے میں جا کر رُک کر پولیس کے جودستے وہاں تعینات تھے یکدم جو کس نظر آنے لگے۔ میں نے گاڑی سے باہر آ کر اطراف کا جائزہ لیا، دُور دُور تک کوئی ہنڈت یا پجاری نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے تعجب ہوا۔ انکا نے کہا تھا کہ دُرگا کے مندر میں ہر دوار سے آنے والوں نے میرے سلسلے میں عدالت کے برعکس فیصلے کئے تھے۔ میں نے سر پر نظر ڈالی۔ انکا بھی موجود نہیں تھی۔ شاید وہ حالات کی سن گن لینے کی خاطر چلی گئی تھی۔

پولیس کے کمانڈوز نے گاڑی سے باہر نکلتے ہی مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ مرلی نے اشارہ کیا، میں عدالت کی سمت قدم بڑھانے لگا۔ آج مجھے صرف ہتھکڑی لگائی گئی، بیڑیاں ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ وہ میری وحشت اور جنون کا تماشہ دیکھ چکے تھے اس لئے نرمی پر اتر آئے تھے۔

میں نے عدالت میں قدم رکھا تو سرکاری اہلکاروں کی نظریں میری جانب اٹھ گئیں۔ میں نے طمانیت محسوس کی۔ اپنا سینہ اور کشادہ کر لیا۔ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ اُن کی بھاری نظریں کے مقابلے میں میری تنہا ذات زیادہ اہم تھی۔ مرلی نے مجھے ایک طرف بٹھا دیا۔ سنگین بردار، چوکیداروں کی طرح میری حفاظت پر تعینات ہو گئے۔ چہ دیر بعد میرا نام بلند آواز میں پکارا گیا۔ میں اٹھ کر عدالت کے کٹہرے میں جا کھڑا ہوا۔ عدالت کی مشینری

”اس پر پنڈت اوم پرکاش کو قتل کرنے کا شبہ کیا جا رہا تھا۔“ روی شکر نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ اُس کی آواز میں گرمجوشی نام کو بھی نہیں تھی۔

”لیکن استغاثہ جرم ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔“ جج نے روی شکر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں فیصلہ لکھ چکا ہوں۔ لیکن اس کو سنانے سے پیشتر میں مجرم کے سلسلے میں آپ کی ذاتی رائے جاننا چاہتا ہوں۔ کیا مجرم کے کردار کے بارے میں آپ کے ذہن میں کوئی ایسی بات ہے جسے آپ عدالت کے ریکارڈ پر لانا پسند کریں گے؟“

”جی نہیں.....“

”مسٹر روی شکر.....“ جج نے اس بار ٹھوس آواز میں پہلو بدل کر سوال کیا۔ ”کیا آپ نے اچھو دھیا کے جانے مانے پنڈت پر بھودیال کا نام کبھی سنا ہے.....؟“

”جی..... ہاں۔“ روی شکر کسمسے لگا۔ مرلی کے علاوہ میں بھی چونکا۔

”مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پنڈت مہاراج دو روز پہلے بمبئی میں موجود تھے۔“ جج نے حکمانہ انداز اختیار کیا۔ ”میں انہیں تلاش کرنے اور ایک ہفتے کے اندر اندر عدالت کے روبرو پیش کرنے کی ذمہ داری آپ کو سونپتا ہوں۔ کارن یہ ہے کہ مجھے ابھی کچھ دیر پہلے فون پر ایک ایسی اطلاع ملی ہے جس کے بعد پر بھودیال کا کھون لگانا ضروری ہو گیا ہے۔“

”میں پوری پوری کوشش کروں گا یور آنر.....“ روی شکر نے سنبھل کر کہا۔ لیکن میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے چہرے پر ماتمی تاثرات بڑی سرعت سے طاری ہو رہے تھے۔ کچھ اور وردی والوں نے بھی شپٹانا شروع کر دیا۔

”کیا آپ کو کبھی پنڈت مہاراج کے درشن ہوئے ہیں.....؟“

”جی..... جی نہیں۔“ روی شکر نے تھوک نلگتے ہوئے جواب دیا۔

روی شکر کو کٹہرے سے جانے کی اجازت مل گئی۔ میں نے دوبارہ ہلکی سی پھونک ماری، اس بار وہ لڑکھڑا کر مرلی سے ٹکرا گیا۔ لوگوں کے لبوں پر دوبارہ تبسم جاگ اُٹھا۔ مرلی نے سہارے کر اُسے ایک خالی کرسی تک پہنچا دیا۔

عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا۔ انکارانی نے غلط پیش گوئی نہیں کی تھی۔ عدم ثبوت اور پھس پھس گواہوں کی بے ربط گواہیوں میں کوئی وزن نہ ہونے کے سبب مجھے باعزت طور

حرکت میں آگئی۔ استغاثے کے وکیل اور اُس وکیل میں دلچسپ مکالمے بازی شروع ہوئی جو میری طرف سے مرلی نے کھڑا کیا تھا۔ میں نے ان کی بحث اور تکرار پر کوئی توجہ نہ دی۔ عدالت میں کچھ کچھ بھرے ہوئے افراد کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی، میری نظریں ایک دراز قد شخص پر پہنچ کر رُک گئیں جو داخلی دروازے کے قریب کھڑا کسمسے تھا۔ اُس نے سیدھا سادھا لباس پہن رکھا تھا لیکن چہرے پر نظر آنے والی گھنی اور الجھن اُلجھی داڑھی نے اُس کی پول کھول دی۔ وہ کوئی عام انسان ہوتا تو لباس کی طرح داڑھی نفاست کا بھی ضرور خیال رکھتا۔ میں دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ مجھے اپنی قیافہ شناسی اعتماد تھا۔ انکارانی نے بھی بڑے یقین سے کہا تھا کہ جس سادھو نے مرلی کے اپارٹمنٹ ماچس کی تیلی دکھائی تھی وہ عدالت میں موجود ہوگا۔ انکا نے مجھے بھری عدالت میں اُس قدر کا فیصلہ سنانے کی اجازت بھی دی تھی۔

وکیلوں کے درمیان گرم گرم بحث کا سلسلہ ختم ہوا تو فاضل جج نے بطور خاص روی شکر کو کٹہرے میں طلب کیا۔ میں اُسے پہلے نہیں دیکھ سکا تھا، اُس کا نام سن کر چونکا۔ وہ تیسرا قطار سے نمودار ہوا تو مجھے شرارت سوچھ گئی۔ میں نے ایک آزمودہ عمل کا مظاہرہ کیا، دراز شکر نشستوں کے درمیان سے آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھ کر پھونک ماری تو وہ ایک خوبصورت مرہٹی جوان عورت سے کھتم گتھا ہو گیا۔ عورت کے شوہر نے تازہ کہ وہ حرکت اتفاقیہ نہیں تھی۔ بات عدالت سے باہر کی ہوتی تو وہ یقیناً ڈی آئی جی سے اُڑ پڑتا۔ پھر بھی اُس نے بڑی حقارت سے روی شکر کو شانوں سے پکڑ کر آگے کی جانب دھکیل دیا۔ قرب وجوار میں بیٹھے ہوئے من چلے لوگوں نے جملے کسے۔ لیکن جج نے آرڈر آرڈر آواز بلند کی تو سب محتاط ہو گئے۔ روی شکر جھینپا جھینپا سا نظر آ رہا تھا، بڑی مشکل۔ کٹہرے تک پہنچا۔

”کیا آپ کو جمیل احمد خاں کے بارے میں کچھ کہنا ہے.....؟“ جج نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”جی نہیں.....“ روی شکر کا جواب بڑا مختصر تھا۔ میں سمجھ گیا کہ جج نے اُسے انکارا اُکسانے پر کٹہرے میں طلب کیا ہوگا۔

”کیا آپ کو معلوم ہے کہ مجرم کو کیوں گرفتار کیا گیا تھا.....؟“



پر رہا کر دیا گیا۔ مرلی کے چہرے پر فتح کی علامتیں جاگ اٹھیں۔ اُس نے آگے بڑھ کر میری تھکڑی کھول دی۔ انکا میرے سر پر آ کر خوشی سے تھرکنے لگی۔  
”جس نے تمہارے گھونسلے کو تیلی دکھائی تھی وہ بھی اس وقت عدالت میں موجود ہے میں نے مرلی سے سرگوشی کی۔

”کہاں.....؟“ مرلی کی نگاہوں میں چنگاریاں سلگنے لگیں۔

”تم اجازت دو تو میں اس کا کریا کرم کر دوں؟“ میں نے دبی زبان میں پوچھا۔  
”آپ مالک ہیں مہاراج، لیکن.....“

میں نے مرلی کو کوئی جواب نہیں دیا۔ جج دوسرے کیس کی فائل اٹھا چکا تھا۔ میں ایک نظر مشتبه سادھو پر ڈالی، میری رہائی کا فیصلہ سن کر اُس کی پیشانی پر متعدد سلوٹیں ابھریں۔ میں نے نظر گھما کر جج کو دیکھا، پھر بڑے ادب سے اُسے مخاطب کیا۔

”یور آرز..... ابھی آپ نے پنڈت پر بھو دیال کے بارے میں ڈی آئی جی صاحب کو دیا تھا کہ کھوج لگا کر اُسے عدالت کے روبرو پیش کیا جائے۔“  
”تم کیا کہنا چاہتے ہو.....؟“ جج نے مجھے غور سے دیکھا۔ اُس کی نگاہوں میں کئی سوال گڈمڈ ہوتے نظر آئے۔

”عدالت میں اس وقت ایک ایسا سادھو موجود ہے جو پر بھو دیال کے بارے میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔“ میں نے بہت کچھ پر خاص طور سے زور دیا۔  
”تمہیں اس کا علم کس طرح ہوا.....؟“

”عدالت میں داخل ہوتے وقت وہ ایک پل کو میرے قریب آیا تھا۔ اُس درخواست کی تھی کہ میں اس کا پیغام آپ تک پہنچا دوں۔“ میں نے بڑی صفائی سے جھوٹا بولا۔ انکا میرا اشارہ سمجھ کر سر سے ریگ گئی۔ میں نے مسمی صورت بنا کر اپنی بات جاڑا رکھی۔ ”اس کے سوا میں اور کچھ نہیں جانتا یور آرز۔“

مرلی حیرت سے میرا منہ تنکے لگا۔ روی شکر کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ میں نے جس شخص پر سادھو ہونے کا شبہ کیا تھا وہ کسی روبرو کی طرح قدم اٹھاتا عدالت کے سامنے آ گیا۔

”تم کچھ کہنا چاہتے ہو پنڈت پر بھو دیال کے سلسلے میں؟“ جج نے اُسے سر سے پاؤں

میں گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

”ہاں سرکار۔“ پجاری ہاتھ باندھ کر بولا۔ ”اگر آپ مجھے پنڈت مہاراج کے سلسلے میں بولنے کا موقع دیں تو میں آپ کا انکار کبھی نہیں بھولوں گا۔“

”جو کچھ کہنا ہے کبھی میں آ کر کہوں.....“ جج نے سپاٹ لہجے میں حکم دیا۔ پجاری جوانکا رانی کے تیر بچوں کی چھین کے بعد اُس کے اشاروں پر عمل کرنے پر مجبور تھا، قدم بڑھاتا کبھرے میں داخل ہو گیا۔

”سرکار، میرا نام منوہر ہے۔ کئی درشنوں سے سورگ باشی پر بھو دیال مہاراج کی سیوا کر رہا تھا۔“ سادھو نے بسورتے ہوئے کہا۔

”سورگ باشی (جنت نصیب) کے حوالے پر جج اپنی کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ روی شکر کے چہرے کا رنگ بھی فق ہو گیا۔

”یہ..... یہ سب کیا ہے مہاراج.....؟“ مرلی نے مجھ سے سرگوشی کی۔ ”اُسے پر بھو دیال کے بارے میں.....“

”تمنا شدہ دیکھتے رہو۔“ میں نے دبی زبان میں کہا۔ ”تالیاں بجانے کی کوشش مت کرو ورنہ بلاوجہ لپیٹے میں آ جاؤ گے۔ روی شکر کو صرف مجھ پر شبہ کرنے دو۔ وہ میزے سامنے قدم نہیں جما سکتا۔ تم نے غلطی کی تو اس کے گرگے تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔“  
”تم جانتے ہو کہ اس وقت عدالت کے روبرو کیا بیان دے رہے ہو؟“ جج نے پجاری منوہر کو غور سے دیکھا۔

جواب میں منوہر انکارانی کے اشارے پر رویکارڈ کی طرح بجنے لگا۔ اُس نے میرا نام درمیان سے نکال کر پنڈت پر بھو دیال کی موت کی بھیا تک کہانی سنادی۔ روبرو عدالت کو بتایا کہ روی شکر نے پنڈت کو اجودھیا سے کسی کام سے بلایا تھا۔ وہ پنڈت سے کوئی ناجائز کام لیتا چاہتا تھا۔ پر بھو دیال نے انکار کیا تو اسے بھڑکتی آگ میں جھونک کر کوئلہ بنا دیا گیا۔ اس کے جسم کو خاموشی سے گڑھا کھود کر دبا دیا گیا۔ منوہر نے ان لوگوں کے نام بھی بتائے جنہوں نے پنڈت کی لاش کو ٹھکانے لگایا تھا۔ جگہ کی نشاندہی بھی کر دی۔ عدالت میں موجود افراد مکیوں کی طرح جھنجھٹانے لگے۔ سب ہی کی نظریں بار بار روی شکر اور منوہر کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ میں خاموش کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔

”تمہیں اس قدر تفصیل سے تمام باتوں کا علم کس طرح ہوا.....؟“ جج نے پجاری منہ کو تیز نظروں سے گھورا۔

”کل رات مہاراج نے سپنے میں درشن دیا تھا۔“ منوہر بڑی عقیدت سے جھومر بولا۔ ”سب کچھ مہاراج ہی نے بتایا ہے۔ یہ حکم بھی دیا تھا کہ سرکار کے سامنے پیش ہر سارا کچا چٹھا بیان کر دوں، پھر جو سرکار کو منظور ہو.....“

عدالت نے مختلف زاویوں سے منوہر کو ٹٹولنے اور کریدنے کی کوشش کی، وہ ایک بیان پر ڈٹا رہا تو عدالت کے حکم پر اُسے اور رومی شکر دونوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ مہر مرلی کا ہاتھ تھام کر باہر آ گیا۔

”میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے مہاراج۔“ مرلی نے باہر آ کر کہا۔ ”یہ اچنبھا کیسے گیا؟ اگر منوہر ہی نے رومی شکر کے اشارے پر میرے گھر کو پھونکا تھا تو پھر اُس کے خلاف کیوں ہو گیا؟ پنڈت پر بھو دیال کی جلی ہوئی لاش کو کہاں دبایا گیا؟..... یہ بات تو میرے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم۔ مجھے سمجھاؤ مہاراج..... یہ کیا کہانی ہے؟“

”یہ چنگا کر تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔“ میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”تم نے اہ سردجنی نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی۔ تم گواہ ہو کہ میں نے خاموشی سے نکل جانا چاہا، نے میرا راستہ روک لیا۔ رومی شکر اور اُس کے نادان چیلے ہم دونوں کے خلاف ہو گئے۔ میرا کچھ نہ لگاؤ سکے تو تمہارا گھر جلا دیا۔ پر بھو دیال نے بھی مجھے پہچاننے میں غلطی کی۔ وہ مجھے اپنی سختی کے بل پر ٹھکانے لگانے کی خاطر حملے کرتا رہا، میں خاموش کھڑا اُسے سمجھاتا رہا۔ اُس نے میری بات نہیں مانی۔ میرا ہاتھ اٹھ گیا۔ وہ جل کر کوئلہ بن گیا.....“ میں زہر خند سے بولا۔ ”میری خاطر آج عدالت سبائی گئی۔ رومی شکر اور پجاری منوہر دونوں موجود تھے۔

میں نے تم سے کل کہا تھا کہ ایک دن اور انتظار کر لو، جس نے آگ لگائی ہے وہ بھی سامنے آ جائے گا۔ سو وہ آ گیا۔ میں نے ایک تیر سے تمہارے دونوں دشمنوں کا بندوبست کر دیا۔ لیکن کھیل ابھی ختم نہیں ہوا۔“ میں نے انکا کی بات یاد کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”عدالت نے میری رہائی کا فیصلہ سنا دیا ہے لیکن پنڈت پجاریوں کی ایک ٹولی ہر دوار سے بھی بھیجی گئی ہے۔ پنڈت نول کشور نے اُن کے دلوں میں زہر بو کر میرے مقابلے پر آمادہ کیا ہے۔ وہ کہیں آس پاس ہی مجھے موت کے گھاٹ اُتارنے کی خاطر گھات لگائے بیٹھے

ہوں گے۔ موقع پاتے ہی ٹوٹ پڑیں گے۔ تم چاہو تو خاموشی سے اپنی جان بچا کر نکل جاؤ۔ میں اُن سے نمٹ لوں گا۔“

”نہیں مہاراج..... نہیں۔“ مرلی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”میں کار نہیں ہوں جو ڈر کر بھاگ جاؤں۔ تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔“

میں اُطراف کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے کوئی پنڈت یا پجاری نظر نہیں آیا لیکن انکا نے جو کہا تھا وہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ لازوال قوتوں کی مالک تھی۔ ”میرے دشمن ضرور کہیں قریب چھپے ہوں گے۔“ میں نے سوچا۔ انہوں نے عدالت کے باہر چھیڑ چھاڑ مناسب نہیں سمجھی ہو گی۔ وہ دُور سے چل کر آئے تھے، ہر دوار سے رواں گی سے قبل پنڈت نول کشور نے انہیں میرے بارے میں تفصیل سے بتایا ہوگا۔ محتاط رہ کر بھرپور وار کرنے کی تلقین کی ہوگی۔ ممکن ہے عدالت میں بھی اُن کے ایک دو مخبر موجود رہے ہوں۔ جج کا فیصلہ سن لینے اور اپنے ایک ساتھی کا انجام دیکھ لینے کے بعد وہ اور زیادہ محتاط ہو گئے ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ اس وقت بھی باہمی مشورے میں مصروف ہوں۔ انہوں نے اپنے پروگرام میں فوری طور پر کوئی تبدیلی کر لی ہو..... اور بھی کئی امکانات ہو سکتے تھے۔

”کس دُچار میں گم ہو مہاراج.....؟“ مرلی نے کہا۔ ”میری ایک گاڑی مع ڈرائیور باہر موجود ہے۔ اس سے پیشتر کہ ہمیں کوئی نئی رُکاوٹ درپیش ہو، یہاں سے نکل چلو۔ عدالت کے آس پاس کوئی ہنگامہ مناسب نہیں ہوگا۔“

مرلی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں کھلی جگہ میں کھڑا تھا، کسی عمارت کے فلیٹ سے چھپ کر چلائی جانے والی کوئی گولی بڑی آسانی سے میرے وجود کو چاٹ سکتی تھی۔ میں نے فوری طور پر ارتکاز اور مراقبے کی ایک مشق کی، اپنے گرد حصار باندھا، پھر مرلی کے ساتھ قدم بڑھاتا عدالت کے احاطے سے باہر آ گیا جہاں ایک جھلملاتی کار پہلے سے موجود تھی۔ ڈرائیور نے دُور سے مرلی کو دیکھ لیا تھا۔ اُس نے باہر نکل کر ہمارا استقبال کیا۔ میں اور مرلی کچھل نشست پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے اسٹیئرنگ سنبھالا۔

”کہاں چلنا ہے سر.....؟“ اُس نے انجن اشارت کرتے ہوئے مرلی سے دریافت کیا۔ ”چوپائی.....“ مرلی کا جواب مختصر تھا۔ گاڑی حرکت میں آ گئی۔ میں آنے والے حالات کے بارے میں غور کرنے لگا۔ انکا واپس نہیں آئی تھی۔ شاید ابھی تک وہ سادھو منوہر

کے سر پر سوار ہوگی۔ ممکن ہے جج نے اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا ہو۔ ڈی آئی جی کو حراست لینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اُس نے یقیناً احتجاج کیا ہوگا۔ وہاں اُس کے گروہ موجود تھے، وہ بھی شور کر سکتے تھے۔ وکیلوں نے بھی احتجاج کیا ہوگا۔ حالات کے پیش نظر بھی ممکن تھا کہ فاضل جج نے حراست کے احکامات کو ہاؤس اریسٹ میں تبدیل کر دیا۔ روی شکر کوئی معمولی آدمی نہیں تھا، اپنے میدان کا منجھا ہوا کھلاڑی ہوگا۔ نہ ہوتا تو فیصلے کرنے کی بجائے حد میں رہ کر بھی اپنے فرائض انجام دے سکتا تھا، مجھے مروانے کا کبھی نہ اُٹھاتا..... معا میرے ذہن میں ایک خیال بڑی سرعت سے ابھرا..... ہو سکتا روی شکر کے کسی جاں نثار نے پجاری منوہر ہی کو ٹھکانے لگا دیا ہو۔

”یہ تم نے لمبا راستہ کیوں اختیار کیا.....؟“ مرلی نے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ میری بٹ گئی۔

”دوسری روڈ بلاک ہے سر۔“ ڈرائیور نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کچھ دیر پیشتر ایک حادثہ گیا تھا۔ پولیس نے ٹریفک کا رخ متبادل راستوں کی جانب موڑنا شروع کر دیا ہے۔“ میرے ذہن میں ایک کھٹکا سا ہوا۔ وہ مرلی کا ڈرائیور تھا تو قابل اعتماد بھی رہا ہوگا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے اُس نے جان بوجھ کر حادثے کا بہانہ تراشا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے نندا کے بتائے ہوئے ایک عمل کو پڑھنا شروع کیا۔ میری نگاہوں آگے سے اندھیرے چھٹنے لگے۔ اصل صورت حال میرے اوپر اشاروں کنایوں منکشف ہو گئی۔ میں نے نظریں کھول کر ڈرائیور کو دیکھا، وہ بڑے اطمینان سے گاڑی چلانے میں مصروف تھا۔

”تمہارا شبہ نام.....؟“ میں نے اُسے مخاطب کیا۔

”سیوک کو لچت رام کہتے ہیں۔“

میں کوئی دوسرا سوال کرنا چاہتا تھا کہ انکارانی میرے سر پر آگئی۔ اُس کی مانوس میرے کانوں میں گونجی۔

”یہ جس راستے پر چل رہا ہے، اسی پر چلنے دو.....“

”لیکن میں نے.....“

”تم نے جو کچھ محسوس کیا وہ بھی غلط نہیں ہے۔“ انکا نے نچلا ہونٹ چباتے ہوئے

بات کاٹ کر کہا۔ ”لچت رام کی جیب میں اس وقت وہ لمبی رقم بھی موجود ہے جو اسے بطور پیشگی ادا کی گئی ہے۔ کام ہو جانے کے بعد اتنی ہی رقم اور دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔“

”گویا یہ ہمیں موت کے منہ میں لے جا رہا ہے.....؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”ہمیں نہیں..... صرف اپنے آپ کو۔“ انکا زہر خند سے بولی۔ ”یہ میٹکے ہوئے لونٹوں کی عین بھی بڑی عجیب شے ہوتی ہے۔ انسان کو پلک جھپکتے میں غدار پر آمادہ کر دیتی ہے..... سیدھے راستے سے بھٹکا دیتی ہے، اندھا کر دیتی ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سنہیل کر بیٹھ گیا۔ مرلی ابھی تک سا دھونو ہر کے سلسلے میں ابھرا تھا۔ کئی بار اُس نے مجھ سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ روی شکر اور منوہر کا انجام کیا ہوگا؟ میں اُسے بار بار ٹالتا رہا۔

”مہاراج.....“ کچھ توقف کے بعد اُس کے پیٹ میں پھر مروڑ شروع ہو گئی۔ ”کیا پنڈت پر بھودیال کی لاش برآمد ہو جائے گی؟“

”تم کیوں پریشان ہو رہے ہو.....؟“

”میری بات کا مطلب کچھ اور تھا.....“ اُس نے پہلو بدل کر وضاحت کی۔ ”روی شکر نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں، وہ بڑا گھاگ آدمی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اُس کے ہاتھ کہاں کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جرائم پیشہ افراد سے بھی اُس کے گہرے مراسم ہیں۔ اُس کے آدمی بجلی کی رفتار سے زیادہ پھرتیلے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عدالت کے کارندوں کی رسائی سے پہلے ہی وہ لاش کو کسی دُور دراز کے علاقے میں لے جا کر ٹھکانے لگا دیں۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے جمیل.....“ انکا نے مجھے بتایا۔ ”روی شکر نے حراست کے احکامات سنتے ہی عدالت میں موجود اپنے ایک خاص آدمی کو کچھ ایسا ہی اشارہ کیا تھا کہ وہ لاش کو کہیں اور منتقل کر دے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس شخص کے ذہن کو بالکل ہی معطل کر دیا ہے۔ وہ اس وقت خودکشی کے ارادے سے کسی ریلوے کراسنگ کی طرف جا رہا ہوگا۔“

”لچت رام اس وقت ہمیں کہاں لے جا رہا ہے.....؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”میںاں سے دو میل کے فاصلے پر کالی کا ایک پرانا مندر ہے۔ مندر کے ساتھ ہی کھیل کا میدان ہے جو اس وقت عام طور سے سنسان رہتا ہے۔ مندر کے قریب ہی ہر دوار سے آنے والی پنڈت پجاریوں کی ٹولی موجود ہے۔ کسی زمانے میں لچت رام بھی ہر دوار میں رہا،

اُس کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا تھا۔ انکا میرے سر پر کھڑی کولہوں پر ہاتھ رکھے مسکراتی رہی۔  
 پجاریوں نے گاڑی گھیر لی۔ مرلی چیخ و تاب کھانے لگا۔ میں نے اسے خاموش رہنے کی  
 تاکید کی، خود دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ میرے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا، میں ارتکا ز اور  
 مراتبے کا عمل کر چکا تھا، ایک اشارہ کرتا وہ سب اوندھے منہ زمین پر ڈھیر ہو جاتے۔ لیکن  
 میں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ انکارانی کو پریتم لال نے کیا کیا  
 ہتھکنیاں دان کی تھیں؟ مجھے سامنے دیکھ کر ایک بھاری ڈیل ڈول کا پجاری سینہ تانے آگے  
 بڑھا۔ اُس کی نگاہوں میں شعلے بھڑک رہے تھے، مجھے حقارت سے گھورتا ہوا بولا۔

”تو تم ہو جمیل احمد خاں؟ پنڈت مہاراج کی زبانی سنا تھا کہ تم نے بڑی دھوم مچا رکھی  
 ہے۔ تمہاری وجہ سے ہمارے کئی دھرماتما پر لوک سدھار گئے۔ پر تو میری نظریں تو کچھ اور  
 دیکھ رہی ہیں.....“  
 ”تم شاید نول کشور کی بات کر رہے ہو.....؟“ میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ انکا  
 بدستور میرے سر پر کھڑی رہی۔

”زبان کو قابو میں رکھ پاپی، تیرے گندے منہ سے مہاراج کا پوتر نام دوبارہ نکلا تو جلا  
 کر خاک کر دوں گا۔“ اُس کے تیور خطرناک ہو گئے۔ اُس کے باقی ساتھی بھی بل کھانے  
 لگے۔ مجھے اُس کی جوانی پر رحم آنے لگا۔ دو چار جنتر منتر سیکھ کر وہ بڑا گھمنڈی بن گیا تھا،  
 جمیل احمد خاں کے سامنے سینہ تانے کھڑا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی  
 حماقت کر رہا تھا۔ شاید نول کشور نے اپنے آدمیوں سے میرا مکمل تعارف نہیں کرایا تھا۔ وہ  
 اگر میرے ماضی کی داستان کے ایک حصے سے بھی واقف ہو جاتے تو شاید کبھی میرے  
 سامنے آنے کی غلطی نہ کرتے۔ میرے سینے میں نول کشور کے خلاف طوفان کروٹیں لینے  
 لگا۔ وہ بد بخت کالی کے مندر میں چھپا بیٹھا تھا، میرے مقابلے میں نوجوان اور ناسمجھ  
 پجاریوں کو آگے بڑھا رہا تھا۔ شاید مجھے قتل و غارت گری میں الجھا کر کوئی نئی چال چلنے کے  
 خواب دیکھ رہا تھا۔

”میری بات دھیان سے سنو بالک.....“ میں نے اُس گمرو جوان کو سمجھانے کی کوشش  
 کی۔ ”میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ میں خون خرابے سے بچنا چاہتا ہوں۔ تم لوگ بار بار  
 مجھے کیوں اکساتے ہو؟ تم سے جو کہا گیا ہے وہ جھوٹ ہے، جو کہانیاں سنائی گئی ہیں ان میں

کرتا تھا اسی لئے آسانی سے پک گیا۔“  
 ”اُن کی تعداد کیا ہوگی.....؟“

”تم یہ سوال پہلے بھی کر چکے ہو۔“ انکا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اس بار تم کچھ بڑ  
 بولو گے، صرف تماشہ دیکھو گے۔“  
 ”پریتم لال نے کیا گھول کر پلا دیا ہے.....؟“ میں نے اُسے معنی خیز نظروں سے گھیرا  
 ”کچھ دیر اور صبر کر لو، اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا۔“

گاڑی کچھ دیر بعد انکا کے بتائے ہوئے پلے گراؤنڈ میں داخل ہوئی تو مرلی بھی چونکا  
 اُس کے چونکنے کی وجہ بھی پنڈت پجاریوں کی وہ چنڈال چوکڑی تھی جو کالی کے پرانے  
 مندر کے قریب موجود تھی۔ اُن کی تعداد پندرہ بیس سے زیادہ نہیں تھی لیکن اُن کے چہرہ  
 سے عیاں تھا کہ وہ مارنے یا مر جانے کا فیصلہ کر کے آئے تھے۔ گاڑی دیکھتے ہی وہ ایک ساتھ  
 اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کی آنکھوں سے خون اُبلنے لگا۔ لچت رام نے گاڑی روک دی۔  
 ”گاڑی کیوں روک دی تم نے.....؟“ مرلی چیخا۔ وہ موقع کی نزاکت محسوس کر  
 بولکھلا گیا تھا۔

”گاڑی اس نے نہیں، نوٹوں کی اس گڈی۔ ز روکی ہے جو اس کی جیب میں پڑا  
 ہے۔ یہ حرام خور بھی پک گیا.....“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ لچت رام نے جیب  
 ریوالور نکال کر میرے اور مرلی پر تان لیا۔  
 ”یو باسٹرڈ.....“ مرلی تلملانا لگا۔

لچت رام گالی سن کر بھٹا گیا۔ اُس نے فائر کرنے میں عجلت کا مظاہرہ کیا۔ مجھے اڑ  
 اندازہ نہیں تھا کہ وہ کوئی حماقت کا ثبوت دے گا۔ لیکن انکارانی کی دُور رس نظریں اُس  
 دل کا بھید تاڑ چکی تھیں۔ فائر کی یکے بعد دیگرے چار آوازیں سنائی دیں لیکن ریوالور سے  
 ہوئی گولیاں پچھلی نشست تک فاصلہ بھی نہ طے کر سکیں، درمیان میں ہی بے اثر ہو کر ہار  
 قدموں پر گر گئیں۔ خود لچت رام بھی دم بخود رہ گیا۔ انکا میرے سر پر بیٹھی مسکراتی تھی۔  
 مرلی کی حالت فائر کی آواز سن کر غیر ہو گئی تھی۔ لیکن اُس نے لچت رام کو پانچویں  
 چلانے کا موقع نہیں دیا، برق رفتاری سے اُٹھ کر سیدھے ہاتھ کا پھندا اُس کے گلے  
 ڈال کر اتنی تیزی سے دو تین شدید جھٹکے دیئے کہ لچت رام اگلی سیٹوں پر ہی ڈھیر ہو گیا۔

کوئی حقیقت نہیں ہے۔ تم نے سن لیا ہوگا کہ سرکاری عدالت نے مجھے کالی داس اور اس پرکاش کے قتل کے سلسلے میں بری کر دیا ہے، تم مجھے کس بات کی سزا دینے کی خاطر گھیر رہے ہو؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے.....؟ پولیس بھی بار بار مجھے شبہ کے طور پر پکڑ لیتی ہے، بڑا دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جاتا ہے۔ عدالت کے فیصلے کے علاوہ یہ بات بھی تمہارے غم میں آگئی ہوگی کہ پنڈت پر بھودیال کی بھینک موت میں رومی شکر کا ہاتھ شامل ہے۔ پجاری منو ہر میرا نہیں، تمہارے ہی جتنے کا آدمی ہے۔ اُس نے عدالت کے زور و جویاں دیا ہے وہ سچ ہی ہوگا۔ رومی شکر کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔ تفتیش ہوگی تو نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا..... تم لوگ بلاوجہ میری ایک جان کے پیچھے کیوں پڑے ہو؟

”تم ہمیں کیا سمجھانا چاہتے ہو بگلا بھگت؟“ اُس نے مجھے حقارت بھری نظروں سے دیکھا۔ ”کیا مہاراج نول کشور نے جو کہا ہے وہ سب جھوٹ ہے؟“

”ہو سکتا ہے مجبوروں نے اُسے بھی غلط بات بتائی ہو۔“ میں نے اپنا غصہ ضبط کرنے ہوئے کہا۔ ”تم نو جوان ہو، سمجھدار معلوم ہوتے ہو۔ تم نے جو دیکھا، جو سنا وہ بھی دیکھا، کر پنڈت نول کشور کو بتا دو۔“

”ضرور بتا دیں گے۔“ اُس نے تکیے انداز میں جواب دیا، پھر سینہ پھلا کر بولا۔ ”ایک شرط ہے..... تمہیں بھی ہمارے ساتھ ہی ہر دوار چلنا ہوگا۔“

”مجھے وہاں لے جا کر کیا کرو گے.....؟“

”وہاں تمہاری آؤ بھگت دھوم دھام سے کریں گے۔ تم سے یہ بھی معلوم کریں گے کہ بدری نرائن مہاراج کو کس دشت نے مارا تھا؟ یہ بھی جاننے کی کوشش کریں گے، مہاراج ام لال کو جس سندری نے مندر کی سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے کیا تھا، اس کا اصل کارن کیا تھا؟ اُس سندرنار اور مہاراج کے درمیان کیا سبب بندھ تھا؟“

”چپ ہو جاؤ.....“ میں کلدیپ کی شان میں اُس کی گستاخی برداشت نہ کر سکا تو بڑا۔ ”اپنی گندی زبان پر تالے لگا لو۔ میں سمجھ گیا تمہارے ذہنوں، تمہارے دلوں میں جو بوجھ بویا گیا ہے اس سے سینا پھل کا درخت نہیں اُگ سکتا، ببول کے کانٹے ہی پیدا ہوں گے۔ میری بات مان لو، میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ مجھے مت چھیڑو، تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟ مجھ سے اُلجھنے کی حماقت نہ کرو، اسی میں تمہاری مکتی ہے۔“

”اور کوئی بھاشن دینا چاہتے ہو تو وہ بھی دے ڈالو۔ اس کے بعد ہماری باری ہوگی۔“ اُس نے بدستور میری حیثیت کو نظر انداز کرتے ہوئے طفلانہ انداز میں بات کی۔ ”یہ بھی جان لو کہ جب ہم بولنا شروع کریں گے تو تمہیں بھاگے راستہ نہیں ملے گا..... کیا سمجھے؟“

میں غصے کے باوجود مسکرا دیا۔ پنڈت نول کشور نے اُن کے خمیر میں جو ہر گھول دیا تھا وہاں کے وجود سے علیحدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مرلی میری ہدایت کے مطابق ابھی تک کار کے اندر ہی بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ ایک دو بار اُس نے بغلی ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا، میں نے اشارے سے روک دیا۔ انکا بدستور میرے سر پر کولہے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ میرے ہونٹوں پر زہر میں بھی مسکراہٹ اُبھرتے دیکھ کر بولی۔

”اب کیا خیال ہے جمیل صاحب؟ کچھ اور سننا چاہتے ہو ان لوگوں سے یا میں اپنا کام شروع کروں.....؟“

”چپ کیوں ہو گئے خاں صاحب؟“ گبرو جوان کی موت اُس کے سر پر منڈلانے لگی۔ وہ بد بخت میرا مذاق اڑانے کی غلطی کر رہا تھا۔ اُس کا لہجہ بڑا تحقیر آمیز تھا۔ ”ابھی تو تمہاری زبان فر فر چل رہی تھی۔ بڑے لال پیلے ہو رہے تھے۔ اب مسکرا کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو.....؟“

میرے جسم سے چیونٹیاں لپٹ گئیں۔ میں انہیں موت کے جہنم میں نہیں دھکیلنا چاہتا تھا، پندرہ بیس پجاری اور مردہ پائے جاتے تو بات ڈھکی چھپی نہ رہ سکتی، پورے ہندوستان میں تہلکہ مچ جاتا۔ میرے دشمن پھر دو اور دو چار کرنے بیٹھ جاتے۔ اُن کے ذہنوں میں یہ خیال ضرور سر اُبھارتا کہ میری رہائی کے فوراً بعد ہی پجاری کس طرح جہنم رسید ہو گئے؟ وہ پجاریوں کے قتل سے پھر میرا رشتہ جوڑ لیتے۔ پھر مجھے آہنی زیور پہنا دیئے جاتے۔ میری طاقت مجھے مل چکی تھی، دُرگا کا عتاب سید کے جسم کی میل سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ میں چپ نہ رہتا۔ میری دشتوں میں پھر اُبال آ جاتا۔ میں جنون کی حالت سے دو چار ہو کر پھر دیوانگی کی حرکتیں شروع کر دیتا۔ بات بڑھ جاتی۔ انکارانی کی نصیحتیں دھری کی دھری رہ جاتیں۔ پر تہم لال کا کہا سچ ہو جاتا کہ میں جل کے اُپر ہی اُپر تہر تار ہوں گا۔ میں ابھی نو جوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے لکھڑا کوئی جواب دینے کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ انکا پھر بول پڑی۔

”اب تم خاموش ہی رہنا جمیل۔“ اُس کے تیور یکنخت خطرناک ہو گئے۔ ”یہ لاتوں کے



بھوت ہیں، باتوں سے نہیں مانیں گے۔ پر یتیم لال مہاراج نے بھی شکلیاں دان کر وقت یہی کہا تھا کہ جب چاروں سمت گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جائے، کچھ اور نہ بھٹائی دے پھر میں اس کے بتائے ہوئے نسخے استعمال کر سکتی ہوں۔“

”سوچ لو انکارانی.....“ میں نے کہا۔ ”خون خرابے پھر میری راہ میں رکاوٹیں کھڑی دیں گے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا..... تم فکر مت کرو، خاموشی سے تماشہ دیکھتے رہو۔“

”کیا کالی کے پوتر کندھوں پر نظر آنے والا کوئی ناگ دیوتا تمہیں سونگھ گیا؟“ نو جو کے حوصلے میری خاموشی سے بڑھنے لگے۔ اُس کے ساتھی بھی شیر ہونے لگے۔ وہ اپنے انجام سے بے خبر تھے۔ نو جوان اپنے گھمنڈ میں بکواس کرتا رہا۔ ”کچھ بولو تمہیں خاں، چڑیوں کی طرح چہکوں۔ بلبل کی طرح پھد کو۔ مینڈک کی طرح چھلائیں مارو۔“ آخری اچھا ہوتا وہ بھی کہہ ڈالو، من میں کوئی حسرت باقی نہ رہ جائے۔“

انکارانی انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ نو جوان کی لسنرائیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اچانک کی پلکوں نے تیز تیز جھپکنے شروع کر دیا۔ پھر جو کچھ ہوا اس نے مرلی کے علاوہ مجھے ششدر کر دیا۔ نو جوان کھڑے کھڑے چکرا کر گرا، پھر قلابازیاں کھاتا ہوا کالی کے پرلے مندر تک چلا گیا۔ ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے کئی پراسرار قوتیں مل کر اُسے ٹھو کریں مار رہی ہوں۔ اُس کی حالت دیکھ کر باقی پجاری بھی آنکھیں پٹ پٹانے لگے۔ مرلی کار کا دروازہ کھول باہر نکل آیا۔ انکا کی نظریں بدستور اُسی نو جوان پجاری پر مرکوز تھیں جو مندر کے پاس چارے پھانٹ رہا تھا۔ وہ اُسے ایک لمحے غضبناک نظروں سے گھورتی رہی، پھر اُس نے گلابی ہونٹوں کو دائرے کی شکل دے کر زور سے پھونک ماری تو نو جوان پجاری کا جسم طرح شدید جھٹکے کھانے لگا جیسے بجلی کے ننگے تاروں میں الجھ گیا ہو۔ اذیتوں کی انتہا دوچار ہونے کے باوجود اُس کے حلق سے کوئی چیخ نہیں نکل رہی تھی۔ چند لمحوں میں وہ جان ہو گیا تو انکا نے دونوں ہاتھ آسمان کی سمت بلند کر دیے، سیاہ آندھی کا بگولا بھنر صورت میں آسمان سے برق رفتاری سے نیچے آیا، پل بھر میں نو جوان کو پلٹ کر غائب کیا۔ نو جوان پجاریوں کی ٹولی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اپنے گرو کا انجانہ کر اُن کے پاؤں اکھڑ گئے۔

”مہاراج.....“ مرلی نے میرا بازو تھام لیا، خوفزدہ آواز میں پوچھا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“

”یہ ممکن ہو گیا؟“

”اپنی زبان بند ہی رکھنا۔“ میں نے گمبیر لہجے میں کہا۔ ”کسی اور نے سنا تو تمہیں پاگل ہی سمجھے گا۔“

”جو آگیا (حکم) مہاراج.....“

”جہیل.....“ انکا نے بھاگتے ہوئے پجاریوں کے بارے میں سوال کیا۔ ”کہو تو ان کو بھی سیاہ آندھی کی چکی میں پیس کر رکھ دو؟ ان کے گندے وجود بھی ذرات بن کر فضا میں بکھر جائیں گے۔“

”نہیں..... انہیں جانے دو۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”نول کشور شاید ان کی زبان سمجھ لے۔“

”خیال ہے تمہارا.....“ اُس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”وہ ٹیکر کا جج شرافت کی زبان نہیں سمجھے گا۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے تمہیں الجھانے کی خاطر کر رہا ہے۔ تم دیکھنا، میں اُسے کیسی سزاؤں گی۔ ایک بار منڈل سے باہر آ لینے دو۔“

”مہاراج.....“ مرلی نے ڈرائیور کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ”مجھے اس کے سلسلے میں پولیس کو اطلاع دینی ہوگی۔“

میں نے مرلی کو جواب دینے کی بجائے انکا کی طرف دیکھا، وہ میرا اشارہ سمجھ گئی۔ میں نے مرلی کو باتوں میں لگا لیا، انکارانی کی پراسرار قوت نے لچت رام کی لاش بھی غائب کر دی۔ میں نے میدان صاف دیکھ کر مرلی کو مخاطب کیا۔

”کیا ڈرائیور کے سلسلے میں پولیس میں رپورٹ درج کرانی ضروری ہے؟“

”اس کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔“ وہ سنبل کر بولا۔ ”میں دشمنوں کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتا۔“

”لجبت رام کہاں کا رہنے والا تھا.....؟“

”جو نیپور سے تعلق ہے اُس کا۔ اُس کے گھر والوں کو بھی اطلاع دینی ہوگی۔“

”پریشان مت ہو۔“ میں نے بے پرواہی سے کہا۔ ”لجبت رام خود ہی اپنے گھر چلا گیا ہے۔ تم چاہو تو اُس کے اچانک غائب ہوجانے کی اطلاع کر دینا۔ خانہ بدی ہو جائے گی۔“

مرلی نے میرا جواب سن کر اسٹیرنگ سیٹ کی سمت دیکھا تو آنکھیں پٹ پٹانے لگیں۔ اُس نے کوئی سوال نہیں کیا، سمجھدار تھا اس لئے جان گیا کہ اس کا ڈرائیور بھی ماورائی قوتوں کا شکار ہو گیا۔

”ذہن پر زور مت دو مرلی، جو دیکھا ہے اسے بھلا دو۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔  
 ”جب تک میرا ہاتھ تمہاری پشت پر ہے، کسی بات کی فکر مت کرو۔“

”مہاراج.....“ اُس نے بڑی عقیدت سے میرے سامنے ہاتھ جوڑ لئے، رندھی بول  
 آواز میں بولا۔ ”مجھے بھول مت جانا۔ سیوک کو اپنی پرارتھنا میں ضرور یاد رکھنا۔ تمہاری بول  
 کر پابوگی۔“

میں جواب میں مسکرا دیا۔ مرلی نے اسٹیرنگ سنبھال لیا، گاڑی پھر چل پڑی۔  
 میرے سر پر بائیں کروٹ لیٹ گئی۔ اُس نے اپنا سر کہنی پر ٹکا رکھا تھا۔ اُس کے ہونٹ مسک  
 رہے تھے، نشی آنکھوں سے ٹمکنی باندھے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”کیا بات ہے انکارانی.....؟“ میں نے اُس کی مخمور نگاہوں کے شوخ رنگوں میں ڈوب  
 کر سرسرائی آواز میں پوچھا۔ ”اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہو؟“

”سوچ رہی ہوں کہ تم کچھ کچھ کنجوس ہوتے جا رہے ہو۔“ اُس کا انداز دلبرانہ تھا۔  
 ”میں سمجھا نہیں.....“ میں نے معنی خیز انداز اختیار کیا۔

”پریتیم لال مہاراج نے مجھے جو شکلیاں دان کی ہیں تم نے اس کی کوئی تعریف نہ  
 کی۔“ اُس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

”تم اس کا موقع کہاں دے رہی ہو.....؟“ میں نے اُس کے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے  
 بڑی اپنائیت کا اظہار کیا۔ ”تمہاری کافر ادائیں دیکھو یا پریتیم لال کی قوتوں کی تعریف  
 کروں.....؟“

میری بات سن کر وہ بڑے محبوبانہ انداز میں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ کانوں میں  
 انگلیاں گھما کر قاتلانہ انداز میں بولی۔

”ایک بار پھر کہنا جمیل، میں پوری توجہ سے تمہاری بات نہیں سن سکی۔ کیا کہہ رہے  
 تم.....؟“

”مہاراج، ایک درخواست کروں، مانو گے.....؟“ مرلی نے مجھے مخاطب کیا تو انکا

جل کر کہا۔

”اس وقت یہ کباب میں ہڈی بن کر ہمارے درمیان کہاں سے آگیا..... نہ ہر لگ رہا ہے۔“  
 ”کیا کہنا چاہتے ہو.....؟“ میں نے انکا کے چہرے پر نظریں جمائے جمائے مرلی سے

پوچھا۔

”جب تک ہمیں رہنا، مجھے اور سروجنی کو سیوا کرنے کے حق سے محروم نہ کرنا۔“ وہ  
 لجاجت سے بولا۔ ”ہمارے دو ارچھوڑ کر کہیں اور جانے کی بات نہ کرنا.....“

”ہمیں اب میرا قیام بڑا مختصر ہو گا۔“ میں سنجیدہ ہو گیا۔ ”ہو سکتا ہے ایک رات سستا  
 کرکل ہی کسی اور طرف نکل جاؤں۔“

”مجھے اپنے ساتھ نہیں لے چلو گے.....؟“ اُس نے عاجزی کا اظہار کیا۔ ”تمہارا ہاتھ  
 بٹاتا رہوں گا۔“

”میری وحشتوں میں کہاں اُلجھتے پھرو گے مرلی، مجھے بہت سارے ادھورے کام  
 پورے کرنے ہیں۔ کسی سے کیا ہوا وعدہ نبھانا ہے، کسی کی بے چین رُوح کو قرار پہنچانے کی

خاطر ٹھن مرحلوں سے گزرتا ہے۔ میری کوئی منزل نہیں، کوئی ٹھکانا نہیں۔“ میں نے سرد آہ  
 بھر کر جواب دیا۔ ”تم دیکھ چکے ہو میرے دشمن سائے کی طرح میری زندگی کے ساتھ ساتھ

لگے ہوئے ہیں۔ تمہارے دیس کے پنڈت پجاری میری جان کے لاگو ہیں۔ وہ برسوں  
 سے اپنے دانت تیز کر رہے ہیں۔ اُن کا بس نہیں چلتا ورنہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح میرے

جسم سے لپٹ جائیں، مجھے بھنھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔ دو گز زمین کا ٹکڑا بھی نصیب نہ  
 ہونے دیں۔ میں جتنا دُور بھاگنا چاہتا ہوں وہ اتنا ہی میری ٹانگوں سے لپٹ کر اپنے

درمیان کھینچ لاتے ہیں۔ مجھے اپنے بچاؤ کی خاطر پھر ہاتھ پاؤں چلاتا پڑتا ہے۔ میری  
 زندگی کی داستان بڑی طویل، بڑی دردناک ہے۔ کبھی موت سے فرصت ملی تو اطمینان سے

سناؤں گا۔“

مرلی خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ گاڑی مختلف شاہراہوں سے گزرتی رہی۔ چوپائی  
 کی وہ عالیشان عمارت قریب آگئی جس میں مرلی کا اپارٹمنٹ تھا۔ گاڑی پارکنگ لائٹ میں

جا کر رُکی، مرلی نے تیزی سے نیچے اتر کر میرے لئے دروازہ کھولا۔

”جمیل.....“ انکا نے مجھے مخاطب کیا۔ ”یاد ہے تمہیں؟..... نم نے مرلی سے کوئی وعدہ

کیا تھا۔“

”کیسا وعدہ.....؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے مرلی کے اپارٹمنٹ میں آتشزدگی سے ہونے والے تمام نقصانات کو پورا کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔“

”ابھی مجھے پرانے حساب کتاب چکنا کر لینے دو، مرلی سے کیا ہوا وعدہ بھی پورا کر دوں گا۔“

”ایک نظر اس جملے ہوئے اپارٹمنٹ کو بھی دیکھ لو جسے پجاری منوہرنے کھنڈر بنا دیا ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مرلی مجھے ساتھ لئے لفٹ کی سمت قدم اٹھانے لگا۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ اُس نے ڈاکٹر کے اپارٹمنٹ میں محض ایک رات گزاری تھی سرجنی کے اصرار پر صبح ہوتے ہی ڈیکوریٹڈ (DECORATED) اپارٹمنٹ کرائے پر حاصل کر لیا تھا۔

”اپارٹمنٹ جل جانے سے تو تمہیں لاکھوں کا نقصان ہوا ہوگا۔“ میں نے مرلی کو کرید۔

”اس کی چننا مت کرو مہاراج.....“ مرلی نے میری بات کا مفہوم بھانپ لیا۔ ”تمہاری کرباسے بھگوان کا دیا بہت سارا دھن موجود ہے۔“

”میں تمہارے جملے ہوئے اپارٹمنٹ کو دیکھنا چاہوں گا۔“ میں نے دبی زبان میں کہا۔

”خوابوں کی اس جنت کو ظالموں نے کس طرح پھونک ڈالا۔“

”جھیل..... میں ابھی آتی ہوں۔“ انکا نے کہا پھر میرے سر سے اتر گئی۔ شاید اُس نے

آس پاس منڈلاتے ہوئے کسی خطرے کو دیکھ لیا تھا۔

”میں نے ٹھیکیدار سے بات کر لی ہے۔“ مرلی نے لا پرواہی سے بتایا۔ ”بس ایک مہینے کی بات ہے، سب کچھ ویسا ہی ہو جائے گا جیسا پہلے تھا۔“

میرے اصرار پر مرلی مجھے اس منزل پر لے گیا جہاں اُس کا اپنا اپارٹمنٹ تھا۔ وہ بڑے

اطمینان سے قدم اٹھا رہا تھا۔ لیکن اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ کر چونک اٹھا۔ مجھے بھی اتر دروازے کو دیکھ کر دکھ ہوا جس کا رنگ برباد ہو چکا تھا۔ آگ کی تیش اور دھوئیں کی کلونس

نے اس کی ساری شان و شوکت اجاڑ دی تھی۔ محل میں ٹاٹ کا پیوند لگ رہا تھا۔

”یہ..... یہ آج صبح تک نہیں تھا۔“ مرلی نے مجھے آگاہ کیا۔ ”شاید ٹھیکیدار نے کام شروع کر دیا ہے۔ پرانا دروازہ اس لئے لگا دیا ہوگا کہ کسی چوکیدار کی ضرورت نہ پڑے۔“

مرلی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنا چاہا، میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ مجھے وضاحت

طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ میرے ذہن میں انکارانی کا تصور کلبلانے لگا۔ میرا اُس کا

ساتھ چوتھائی صدی سے زیادہ پر محیط تھا۔ میں اُس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ وہ لفٹ

میں میرے سر سے اتر گئی تھی، اُس نے مجھے مرلی کا نقصان پورا کرنے کا وعدہ یاد دلایا تھا۔

اس کا مشورہ تھا کہ میں جملے ہوئے فلیٹ کو بھی ایک نظر دیکھ لوں، اور مرلی پرانے دروازے

کو لگا دیکھ کر کہہ رہا تھا کہ شاید ٹھیکیدار نے کام شروع کر دیا ہے۔ مجھے دروازے کی دوسری

طرف بھی انکا اور پریتم لال کی پراسرار اور ناقابل یقین قوتوں کا ہاتھ محسوس ہوا۔ میں نے

ارنکا ز اور مراقبے کے مختصر عمل سے گزر کر آنکھیں بند کر لیں۔ راستے کی زکاوٹیں ایک ایک

کر کے سر کنے لگیں۔ میں اپارٹمنٹ کے باہر کھڑے ہونے کے باوجود دروازے سے گزر کر

اندر پہنچ گیا۔ وہاں سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ ہر شے اپنی اصلی حالت

میں موجود تھی۔ مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ پریتم لال نامکن کو مکمل بنا دینے کی قوتوں کا مالک

تھا۔ میری خاطر اُس نے انکا کو کچھ طاقتیں سونپ دی تھیں۔ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا، وہ

خواب نہیں تھا۔ انکارانی نے مجھے بھی تاریکی میں رکھ کر حیرت زدہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے مسکرا کر آنکھیں کھول دیں۔

”تم رُک کیوں گئے مہاراج.....؟“ مرلی نے پوچھا۔ ”آنکھیں بند کئے کیا سوچ

رہے تھے؟“

”اب کسی ٹھیکیدار کی ضرورت نہیں رہی۔“ میں نے ٹھوس آواز میں کہا۔ ”صرف باہر کا یہ

دروازہ بدلوا دینا..... ایک دو مہینے بعد..... جلدی نہ کرنا۔ ورنہ تمہارے جانے والے تمہیں

بھگوان کا اوتار سمجھ کر تمہاری پوجا شروع کر دیں گے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ مرلی پلکیں چھپکانے لگا۔ ”میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔“

”سروجنی اور سادھنا کو بھی سمجھا دینا کہ اپنی زبان بند رکھیں.....“

”کس سلسلے میں؟“ مرلی کی حیرت عروج پر پہنچ گئی۔ ”مجھے بھی بتا دو مہاراج، تمہاری

نظروں نے کیا دیکھ لیا ہے؟“

انکا میرے سر پر واپس آ گئی۔ بڑی سنجیدہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

”انکارانی.....“ میں نے اُسے عالم تصور میں مخاطب کیا۔ ”آج تم سے کچھ کہنے کو دل

چاہتا ہے۔ میری بات سے انکار تو نہیں کرو گی؟“  
”تم حکم دو جمیل.....“ اُس نے بڑی سعادت مندی کا اظہار کیا۔

”بڑے عرصے بعد مجھے تمہاری ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“ میں ایک سرد آہ بھر  
جذباتی لہجے میں بولا۔ ”تم جس قدر وقامت کی ہو، جہاں ہو، جیسی بھی ہو، کی بنیادوں پر ایک  
رات کے لئے میری آغوش کی زینت بننے کے لئے اپنی آمادگی کا اظہار کر دو۔“  
”بے شرمی کی باتیں مت کرو۔“ اُس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شوخی سے  
کہا۔ ”میں سمجھ رہی ہوں کہ تم نیلام کے اشتہاروں والی زبان کیوں استعمال کر رہے ہو۔“  
”تم نے شاید اندر کی حالت دیکھ لی ہے، تبھی چمک رہے ہو۔“  
”تم کہاں کھو گئے مہاراج؟“ مرلی کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ”میری بات! جواب بھی نہیں دیا۔“

”تمہیں یاد ہوگا، میں نے اپارٹمنٹ میں لگنے والی آگ کی خبر سناتے وقت کہا تھا کہ  
تمہارا نقصان پورا کرنے کی ذمہ داری میری ہو گی۔“

”کیوں شرمندہ کر رہے ہو؟“ مرلی نے میری بات سے خوش ہو کر انکساری سے کہا۔  
”میں اب اتنا گنا گزرا بھی نہیں ہوں کہ تیس چالیس لاکھ کا دھچکا نہ برداشت کر سکوں۔ بابا! آنی جانی شے ہے، تمہاری دعا ہو گی تو کروڑوں کمالوں گا۔“

میں نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولنے سے پیشتر سروجنی کو بھی بلوایا۔ سادھنا بھی اُس کے  
ساتھ ساتھ تھی۔ انکا کی نظریں سادھنا کے گدرائے ہوئے جسم پر مچلنے لگیں۔ مرلی نے  
میرے کہنے پر دروازہ کھولا تو ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے اندر پہنچ کر دروازہ بند کر دیا۔ مرلی کے  
علاوہ سادھنا بھی پھٹی پھٹی نظروں سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ سروجنی کی کیفیت سب  
سے مختلف تھی۔ اُسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اپارٹمنٹ کا سارا ساز و سامان، بکھر  
سیٹ اپ بالکل ویسا ہی تھا جیسے ہوا کرتا تھا۔ سروجنی پھر کی طرح ایک ایک کمرے میں  
چکراتی پھر رہی تھی۔ ہر شے کو ہاتھ لگا کر دیکھ رہی تھی، بار بار حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔ اُن  
کی نگاہوں میں جگنو چمک رہے تھے۔ خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

”دیکھ رہے ہو جمیل..... دولت کی چمک دمک انسان کی نگاہوں کو کس طرح خیرہ کر دیتی  
ہے۔“ انکا نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سروجنی پورے اپارٹمنٹ کا جائزہ لے کر آئی تو اُسے  
احساس ہوا کہ میں بھی وہاں موجود ہوں۔ وہ بے اختیار دوڑ کر میرے قدموں میں گر گئی۔  
میں نے اُس کو بازو تھام کر اٹھایا۔ وہ ہاتھ باندھ کر بولی۔

”مہاراج، میں نے پہلے بھانپ لیا تھا کہ تمہاری شہتی اپرم پار ہے۔ ہم تمہارا شکریہ کس  
زبان میں ادا کریں؟ تم نے جو احسان کیا ہے وہ ہم سارا جیون نہیں بھلا سکیں گے۔“

سروجنی کی دیکھا دیکھی مرلی نے بھی میرے پیروں کو چھو کر اپنا فرض پورا کر دیا۔ سادھنا  
الگ تھک کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اُس کی تنہائی کا احساس ہوا تو میں نے ہاتھ کے  
اشارے سے قریب بلا کر اُسے گلے لگا لیا۔ اُس کی کنول جیسی نظروں میں آنسوؤں کے شبنمی  
قطرے جھلکانے لگے۔ سروجنی کی آنکھیں سلگ اٹھیں۔ اُس کا بس چلتا تو شاید سادھنا کو  
اسی وقت گولی مار دیتی۔ میں اُس کی نظروں میں رقابت کے جذبوں کو کروٹیں بدلتا دیکھ رہا  
تھا۔ میں نے سادھنا کو اپنی بانہوں کے حلقے سے آزاد کیا تو سروجنی نے سکون کا سانس لیا۔  
”میں آج رات اسی اپارٹمنٹ میں گزاروں گا۔“ میں نے سروجنی سے کہا۔ ”کل صبح  
کہیں اور چلا جاؤں گا۔“

”تم کہیں نہیں جاؤ گے مہاراج.....“ سروجنی نے قریب آ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”اب  
آئے ہو تو کچھ دن ہمیں سیوا کرنے کا موقع دو۔“  
”ابھی مجھے دُور جانا ہے۔ پھر کبھی آیا تو کچھ دن ضرور آرام کروں گا۔“ میں نے سپاٹ  
لہجے میں جواب دیا۔

سروجنی اور سادھنا نے مل کر میرے کھانے کا اہتمام کیا۔ میں اسی کمرے میں آ گیا  
جہاں پہلے مقیم تھا۔ مرلی میرے ساتھ ساتھ تھا، دوپہر کا کھانا اور شام کی چائے ہم نے ساتھ  
ہی بیٹھ کر پی۔ سادھنا سامنے نہیں آئی۔ شاید سروجنی نے پھر اُس پر پابندی لگا دی تھی۔ میں  
چائے پی کر دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ مرلی کسی ضروری کام سے چلا گیا تھا۔ سروجنی  
ضرورت سے کچھ زیادہ ہی میری آؤ بھگت میں لگی تھی۔ انکا میرے سر پر لیٹی سروجنی کو گھور  
رہی تھی۔

”کیا بات ہے انکارانی؟“ میں نے پوچھا۔ ”آج تم سروجنی کو اتنی توجہ سے کیوں دیکھ  
رہی ہو؟“

”آج اس کے ارادے تمہارے حق میں نیک نظر نہیں آرہے۔“ اُس نے بڑی ہنسی سے جواب دیا۔ ”تم نے اس کا اتنا بڑا نقصان پورا کر دیا۔ یہ اس کی ادائیگی کے طور پر تمہاری آغوش میں بکھیرنا چاہتی ہے..... بڑی چالاک عورت ہے۔ سادھنا کو تمہارے ہاتھوں میں دیکھ کر اس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے تھے۔ اُس غریب پر دوبارہ تم سے رہنے کی پابندی عائد کر دی گئی ہے۔“

انکا کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ سروجنی مجھ پر زیادہ ہی مہربان ہو رہی تھی۔ رات گئے واپس آیا تو اُسے مجبوراً اُٹھ کر جانا پڑا۔ میری سرد مہری نے اُسے مایوس کر دیا تھا ورنہ مرلی کی پرواہ نہیں تھی۔ مرلی اور سروجنی کے جانے کے بعد ہم اپارٹمنٹ میں تنہا رہ گئے۔ مرلی نے کہا تھا کہ وہ صبح دوبارہ اپنے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جائے گا۔

میں خوابگاہ میں تنہا رہ گیا تو میں نے آئندہ کے بارے میں سوچا۔ میرے ذہن پر ہر دور کلبلا رہا تھا۔ پنڈت نول کشور کی سرکوبی ضروری ہو گئی تھی۔ وہ بار بار مجھے الجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت موقع غنیمت تھا، انکا کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق چند روز کالی کے مندر میں نول کشور کے ساتھ تھا۔ میں دونوں سے ایک ساتھ نمٹ لیتا تو چھٹی جاتی۔ میرے ذہن میں ماضی کی الٹا داستان سر اُبھارنے لگی۔ وقت کی گردشوں نے مجھے کہیں تک کر آرام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ جین لنڈا کے ساتھ لندن کی آزاد فضا میں دن سکون سے ضرور گزرے تھے، وہ میری منزل نہ بن سکی۔ پریم لال کی آتما نے سائے کر میرے زخموں پر جمی ہوئی کھرٹک کو دوبارہ کھرچ دیا۔ میرے زخم پھر تازہ ہو گئے۔ امر لال کے کسی لڑکے کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ پریم لال نے مجھے چند روز بارے میں بتایا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ بدری نرائن اور امر لال کا انتقام لینے کی خاطر میرے دشمن پھر سر جوڑ کر مشورہ کر رہے ہیں۔ امر لال کا نام سن کر میرا سکون برباد ہو گیا۔ وہ میرا کلدیپ کا قاتل تھا۔ میں لندن چھوڑ کر واپس ہندوستان آ گیا۔ پنڈت پجاریوں نے میرے اطراف گھیرا ڈالنا شروع کر دیا۔ درخت کو ایک بار جڑ سے اکھاڑ دیا جائے تو اس کے دوبارہ اُگنے کا اندیشہ نہیں رہتا۔ میں بھی انہی خطوط پر غور کر رہا تھا۔ انکارانی میرے پرچہ لپٹی کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔ میں تادیر اپنی وحشتوں سے سرماتا رہا، پھر وہ احساس معدوم ہونے لگا۔ غنودگی میرے جنون کو تھپکیاں دینے لگی۔

رات کا پچھلا پہر تھا جب مجھے احساس ہوا کہ میں کمرے میں تنہا نہیں ہوں۔ میں نے پلوں کے درمیان جھری کر کے دیکھا تو مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ وہ سادھنا تھی جس کے کندن جیسے دھکتے جسم پر باریک نائٹ گاؤن قیامت ڈھا رہا تھا۔ وہ خود بھی کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ اُس کے لباس سے دھینگا مشتکی کرتے ہوئے جسمانی نشیب و فراز دیکھ کر میرے جسم سے بچھو لپٹ گئے۔ جذبات کو ڈنک مارنے لگے۔ وہ میرے بستر پر بیٹھی بڑی نشیلی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے شبہ ہوا، سروجنی نے اُسے میرے قریب آنے سے روک دیا تھا۔ انکا نے بتایا تھا کہ سادھنا کی جوانی کو کسی راج منتری کے قدموں میں بھیٹ چڑھانے کی خاطر سنبھال کر رکھا گیا ہے۔ سروجنی کو خطرہ تھا کہ سادھنا کے جسم کی پیش میرے وجود کو پگھلا دے گی۔ اُس نے خود اپنے آپ کو میری خدمت میں پیش کر دیا تھا، سادھنا کو سینٹ کر علیحدہ رکھا تھا۔ پھر سادھنا کا اتنی رات گئے، اتنے ہیجان انگیز لباس میں میرے بستر پر موجود ہونا، بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ وہ شاید میرے پریشان ذہن کی پیداوار تھی۔ سادھنا نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے دوسری کروٹ لینے کی کوشش کی تو میرے بازو پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ اس ہاتھ کے لمس نے میرے خون کی گردش تیز کر دی۔ میرے دل و دماغ میں کن کھجورے ریٹکنے لگے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں..... وہ میرا وہم نہیں تھی، سادھنا ہی تھی۔ میں اُسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ میرے وجود میں گرم آندھی کے جھٹکے چلنے لگے۔ سادھنا کی موجودگی میرے پتے ہوئے لقمے و دق صحرائیں کسی نخلستان سے کم نہیں تھی۔ میری آنکھیں جلنے لگیں، حلق میں کانٹے چھبنے لگے۔

”مہاراج.....“ سادھنا کی مترنم آواز میرے کانوں میں رس گھول گئی۔ ”داسی کو شاکر دو۔ میں نے تمہاری نیند میں خلل ڈال دیا۔“

”سروجنی کہاں ہے.....؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

”تمہیں میرا آنا برا لگا تو میں واپس چلی جاتی ہوں۔“ اُس نے اُنھنے کی کوشش کی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کی کلائی تھام لی۔

”تم نے میری بات کا غلط مطلب سمجھا۔“ میں نے اُسے دوبارہ اپنے بستر پر بٹھالیا۔

”دراصل میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ.....“

”میں سمجھتی ہوں مہاراج۔“ اُس نے بڑی معصومیت سے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”میڈم



ہو گیا تھا۔ میں چاہتا تو انکا کی درخواست رد بھی کر سکتا تھا۔  
 ”جیل.....“ وہ مجھے ہچکچاتا دیکھ کر عاجزی کرنے لگی۔ ”تم واقف ہو کہ انسانی خون  
 میری غذا ہے۔ میں تمہیں حکم نہیں دے رہی، تم سے درخواست کر رہی ہوں۔ میری  
 درخواست رد نہ کرنا..... آج مجھے بھی جشن منالینے دو.....“

میں نے سادھنا کے سراپا پر ایک آخری نظر ڈالی۔ اُس گل بدن پر مجھے ترس آرہا تھا۔  
 لیکن میں نے انکا کی درخواست رد نہیں کی، سادھنا کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گیا،  
 اُس کی صراحی دار گردن پر میرے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہوئی تو وہ کسمسا نے لگی۔  
 ”مہاراج..... یتیم کیا.....“

میں نے اُسے جملہ مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا، ہاتھوں کے شکنجے کو تنگ کیا تو سادھنا کا  
 کندن جسم پھڑپھڑانے لگا۔ وہ زیادہ دیر مدافعت نہ کر سکی، اُس کی آنکھیں اُبل کر حلقوں  
 سے باہر آگئیں۔ اُس کا جسم ساکت ہو گیا۔ میں نے اُٹھ کر اُس کے سر پر بھرپور ٹھوک ماری،  
 خون کا فوارہ جاری ہوا تو انکا میرے سر سے اتر گئی۔ میں نظریں پھیر کر واپس اپنی خواب گاہ  
 میں آگیا.....!!

صبح میری آنکھ دیکھ سے کھلی۔ انکا میرے سر پر ٹانگیں پھارے گہری نیند سے دو چار تھی۔  
 اُس کا چہرہ کسی تازہ گلاب کی مانند کھلا کھلا نظر آرہا تھا۔ میں اُٹھ کر دوسرے کمرے میں آیا۔  
 سادھنا کا جسم غائب تھا۔ قالین پر خون کا ایک دھبہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں دوبارہ اپنے  
 بستر پر آکر لیٹ گیا.....!

ناشتے کی میز پر سروجنی کی بے چینی میری نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ ایک سونے کی  
 جڑیا اُس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی، اُس کی فکر بے جا نہیں تھی۔

”کیا بات ہے سروجنی.....؟“ میں نے اُسے ٹٹولنے کی خاطر پوچھ لیا۔ ”تو مجھے کچھ  
 پریشان دکھائی دیتی ہے.....“

”کوئی خاص بات نہیں ہے مہاراج۔“ اُس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ ”سر  
 میں ہلکا ہلکا درد سا ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اپنا دھیان رکھا کر۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”مری کو ابھی تیری ضرورت ہے۔“  
 ناشتے کے بعد مری تیار ہو کر دفتر جانے لگا تو میں بھی سید کی لائٹھی سنبھال کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

کو میرے یہاں آنے کی بھٹک بھی مل گئی تو وہ مجھے شکاری کتوں کے آگے ڈال دے گی۔  
 ”پھر..... تم یہاں کیوں آگئیں.....؟“ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر  
 لہجے میں سوال کیا۔

”تمہاری سیوا کرنے۔“ اُس نے بے اختیار اپنا سر میرے کشادہ سینے پر رکھ دیا۔ ”تم  
 سا پیار مجھے بچارن کی جھولی میں بھی ڈال دو۔“

میرے جذبات میں طغیانی آگئی۔ ایک اونچی لہر آئی، ہم دونوں کو بہا کر لے گئی  
 میرے اعصاب کا تناؤ دُور ہو گیا۔ سادھنا میری آغوش میں بکھری پڑی تھی، اُس کا  
 عریاں جسم اور بے ترتیب لباس مجھے کسی اور دنیا کی سیر کر رہا تھا جب انکا کی مانوس  
 میرے کانوں میں گونجی۔  
 ”سادھنا تمہیں کیسی لگی؟“

میں نے چونک کر سر پر نظر ڈالی، انکا کی شوخ نگاہوں سے مستی چھلک رہی تھی۔ برا  
 بات میری سمجھ میں آگئی۔ سادھنا میرے پاس اپنی مرضی سے نہیں آئی تھی، انکارانی  
 پراسرار قوتوں نے اُسے بنا سنوار کر میری ہوس کا نشانہ بنا دیا تھا..... اب اُس کی پائ  
 نظریں سادھنا کے جسم پر مچل رہی تھیں۔

”تمہارا دل بھر گیا ہو تو میں بھی اپنی غذا حاصل کر لوں۔“ انکا نے جماہی لیتے ہوئے  
 پھر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

”اگر سروجنی کو علم ہو گیا تو.....؟“ میں نے ایک ممکنہ خطرے کا اظہار کیا۔  
 ”تم فکر مت کرو جیل۔“ اُس نے بے پرواہی سے کہا۔ ”میری خاطر سادھ  
 دوسرے کمرے میں پہنچا دو۔ گلا گھونٹ کر اس کا سر پھاڑ دو، میں اس کے جسم میں  
 ہوئے خون سے اپنے وجود کو سیراب کرنے کے بعد اسے بھی چھوڑ کر دوں گی۔“ انکا  
 بڑے یقین سے کہا۔ ”سروجنی اور مری کے فرشتے بھی اس کا سراغ نہیں لگا سکیں  
 سادھنا سے پہلے بھی کچھ لڑکیاں سروجنی کے قبضے سے نکل کر راہ فرار اختیار کر چکی ہیں  
 دونوں تمہارے اوپر شبہ نہیں کریں گے۔“

میرے اور انکا کے درمیان خون کی فراہمی کے سارے معاہدے ختم ہو چکے تھے۔  
 اُس کے کسی حکم کا پابند بھی نہیں تھا، پراسرار قوتوں کے حصول کے بعد ہم دونوں کا پلا

”تم کہاں جا رہے ہو مہاراج.....؟“ سروجنی نے بے چینی سے دریافت کیا۔  
 ”اب یہاں سے دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کچھ حساب کرنے ہیں۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔“

سروجنی نے مجھے روکنے کی کوشش کی۔ مرلی نے بھی اصرار کیا۔ لیکن میں نے آنے کا وعدہ کر کے جان چھڑائی۔ سروجنی کے سر پر ہاتھ پھیر کر مرلی کے ساتھ نیچے آئے۔ ”کہاں جانے کا ارادہ ہے مہاراج؟“ مرلی نے کار میں بیٹھنے کے بعد سوال کیا۔  
 ”ریلوے اسٹیشن تک چھوڑ دو۔ کسی بھی گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔“ میں نے سرد آواز میں جواب دیا۔ ”ابھی تو بہت سفر کرنا ہے۔ میری کوئی ایک منزل نہیں ہے، جہاں رات وہیں پڑاؤ ڈال دوں گا۔“

راستے میں مرلی بڑی عقیدت سے گفتگو کرتا رہا۔ میں ہوں ہاں کر کے جواب دیتا۔ اٹکا، سادھنا کے خون کے نشے میں ابھی تک بے سدھ پڑی ہلکے ہلکے خراٹے نشر کر رہی تھی۔ میں آنے والے کل کے بارے میں سوچنے لگا.....!!



مرلی مجھے ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ میرے پاس سید کی لالٹھی کے علاوہ کوئی دوسرا سامان نہیں تھا۔ مجھے سامان کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جہاں جس چیز کی ضرورت ہوتی وہ اٹکا فراہم کر دیتی تھی۔ جن قارئین نے میری داستان المناک کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی واقف ہوں گے کہ میرے لئے دولت کا حصول کس قدر آسان تھا۔ دولت میرے ہاتھ کے میل سے بھی کم حقیقت تھی۔ اسی دولت کی خاطر میں بھی انکارانی کے عشق میں مبتلا ہوتا چلا گیا تھا۔ دولت انسان کی بینائی روشن کرنے کے لئے سب سے موثر ذریعہ ہے۔ اس کی جھلک دیکھ کر انسان کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔ دل کی دھڑکنوں کو بڑی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ حسین خواہوں اور خواہشات کی تکمیل کے لئے بھی انسان کو دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دولت ہی کے بل بوتے پر ایک کمزور حریف بھی اپنے سے ڈگنے قد و قامت کے دشمن پر جھپٹ پڑتا ہے۔ دولت ایک ضرورت ہے، نشہ ہے، طاقت ہے۔ یہی دولت انسان کو بیٹا سے ناپیتا بھی کر دیتی ہے۔ دولت کی خاطر وہ دوسروں کے قتل پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ چوری کرتا ہے، ڈاکے مارتا ہے، اسی سے ضمیر کے سودے بھی بر ملا کئے جاتے ہیں۔ اس کا ایندھن نفس کو درغلالتا ہے۔ یہی فساد کی جڑ ہے، یہی جسم فروشی کے کام آتی ہے، اسی کی خاطر انسان اپنی ڈگر سے ہٹک جاتا ہے، منزل سے دور ہو جاتا ہے، سراب کے پیچھے وحشی گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگنے لگتا ہے۔ اسی کو امیری اور غریبی کا میزان سمجھا جاتا ہے۔ یہی ہاتھ کا کنگن ہے، یہی پیروں کی میزی بھی بن جاتی ہے۔ میری آنکھیں بھی دولت کی ریل پیل دیکھ کر خیرہ ہو گئی تھیں۔ آپ واقف ہیں، میں بڑا قناعت پسند تھا، والدین سے دور ایک کمرے کے فلیٹ میں زندگی کے دن بڑے سکون سے گزار رہا تھا۔ صبح اٹھنا، اپنے ہاتھ سے ناشتہ بنانا، دن بھر خون پسینہ بہا کر روزی کمانا، رات کا کھانا کھانے کی ادنیٰ درجے کے ہوٹل میں کھا کر ایک جھلکے پلنگ پر سکون کی نیند سو جانا، دوسرے دن

پھر کولہو کے نیل کی طرح روزمرہ کے معمولات میں بخت جانا۔ زندگی بڑے سکون سے گزرتی تھی جب انکا نے میرے سر کو اپنے آشیانے کے لئے منتخب کیا تھا۔ ہر شخص کی طرح میری بھی شروع شروع میں گھبرایا، انکا مجھے اپنے بچوں کی تیز چھین سے اپنا معمول بتا لیتی۔ میرے اشاروں پر عمل کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ میری زندگی میں طوفان کی شدتیں کبھی نہ پہنچیں۔ اگر انکا نے میرے سر پر بیرا نہ کیا ہوتا۔

میں اختصار سے کام لوں گا۔ قارئین جانتے ہیں کہ میں حالات کے ساتھ سمجھوتا کرنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر انکا نے میرے لئے دولت کے خزانوں کے منہ کھول دیے۔ میں بہکتا ہوا گیا..... آج میں کلدیپ کی بے چین رُوح کو سکون پہنچانے کی خاطر زندگی داؤ پر لگانے پر آمادہ تھا۔ وہ میری رُوح تھی، میری زندگی تھی، میرے جینے کا آخری سہارا تھی جسے امرالہ کی مداخلت نے مجھ سے چھین لیا..... کلدیپ سے میری ملاقات بھی دولت کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ وہ بذاتِ خود پونا کے ایک معروف دولت مند تاجر کی بیٹی تھی۔ قدرت نے اُسے جس کی دولت سے نواز کر اُس کی قدرو قیمت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ وہ بڑی مہذب تھی، تعلیم کے زیور سے پوری طرح آراستہ تھی۔ اُس کی گفتگو میں شائستگی کا رنگ جھلکتا تھا۔ اُس کی نگاہیں جدھر اٹھتی تھیں، ایک رشتہ قائم کر لیتی تھیں۔ میری اُس کی پہلی ملاقات پونا کے ریلوے کلب میں ہوئی۔ دولت کے بل بوتے پر وہ سن پسند گھوڑوں پر بے دریغ داؤ لگاتی رہی۔ قیمت نے یاوری نہیں کی، وہ ہارتی چلی گئی۔ اُس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ لیکن اُسے اپنی ہار بھی منظور نہیں تھی۔ پھر میں نے انکا کی پراسرار قوتوں کے ذریعے اُسے جیتنے کی طرف گامزن کر دیا۔ فتح کا احساس اور میرے قرب کی تپش اُسے پگھلاتی رہی۔ وہ ایک اثراماذن لڑکی تھی، حسن کی دیوی تھی، دولت میں کھیلتی تھی۔ بڑے بڑے دولت مند اُس کی ایک نگاہ غلط اتار کے منتظر رہتے۔ اُسے رجھانے اور اپنانے کے سنہرے خواب دیکھتے لیکن قرعہ فال میرے نام نکلا۔ انکا کی صورت میں میرے پاس ”جادو کی چھڑی“ موجود تھی۔ میرا اُس کا ربط بڑھتا گیا۔ وہ میری پجاری بن گئی۔ میری خاطر اُس نے

پجاریوں کا لباس پہن لیا، دنیا کی رنگینیوں سے منہ موڑ کر صرف مجھے سر بلند رکھنے اور سر پہ دیکھنے کی خاطر پریم لال کی کنیا میں مرگ چھالا پر بیٹھی شب و روز دیوی اور دیوتاؤں کی خوشنودی کی خاطر جا پ کرتی رہی..... سارا کھیل دولت کی بنیاد پر شروع ہوا تھا۔ اس

سلسلہ ختم نہیں ہوا، جاری تھا.....

میں بھی کے پُر رونق اسٹیشن پر ٹرین کے فرسٹ کلاس کپارٹمنٹ میں تنہا بیٹھا تھا اپنی تسبیح روز و شب کے دانے شمار کر رہا تھا جب گاڑی کی تیسری سیٹی کی آواز ابھری، اسی کے ساتھ گاڑی چل پڑی۔ میرے خیالات کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ میں نے سر پر نظر ڈالی، انکارانی بیدار ہونے کے لئے توجہ ممکن انگڑائیاں لے رہی تھی۔ سادھنا کے گداز جسم کا سارا خون اپنے وجود میں منتقل کر لینے کے بعد اُس کے حسن میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ اُس کے گالوں کی سرخی کندن کی طرح دکھ رہی تھی۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے تراشیدہ ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ دو چار بار اپنے جسم کو بھرپور انداز میں دائیں بائیں حرکت دینے کے بعد اُس نے آنکھیں کھول دیں، پھر ہڑبڑا کر اٹھی، بڑی سنجیدگی سے مجھے مخاطب کیا۔ ”ہم اس وقت کہاں ہیں جمیل.....؟“ اُس نے نظریں گھما کر ماحول کا جائزہ لیا۔

”ریل کے فرسٹ کلاس میں.....“ میں نے شوخی سے کہا۔ ”اس وقت کپارٹمنٹ میں میرے اور تمہارے سوا کوئی اور نہیں ہے۔“

”تم نے کہاں جانے کا ارادہ کیا ہے؟“ وہ میری بات کا جواب دینے کی بجائے میری نگاہوں میں جھانکنے لگی۔ اُسے پھر میری فکر لاحق ہو گئی۔

”فی الحال دہلی جانے کا ارادہ ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر حاضری دینے کے بعد اگلی منزل ہر دوار ہوگی.....“

”پہلے تو تم نے حیدر آباد جانے کا خیال ظاہر کیا تھا۔“ ہر دوار کا نام سن کر اُس کے چہرے پر اضطرابی کیفیتیں نمودار ہونے لگیں۔ کیا اب رکن الدین کی حویلی جانے کا ارادہ ترک کر دیا؟ گلاب کہہ چلتے تو ایک پتھہ دو کاج ہو جاتا۔ سید مجذوب سے ملاقات بھی ہو جاتی، بزرگ کی چوکھٹ پر حاضری بھی دے لیتے۔“

”سفر بہت لمبا ہو جاتا۔ دو مختلف سمتوں کا راستہ طے کرنے میں خاصا وقت ضائع ہو جاتا۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”زندگی رہی تو اپنوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“

”سید کو کیوں فراموش کر رہے ہو؟ اُس نے تمہیں دُرگا کے عتاب سے نجات دلا کر وہ کارنامہ انجام دیا ہے جو میری قوت سے بھی باہر تھا۔“

”اُس کی لاشی میرے پاس ہے۔“ میں نے لاشی کو عقیدت سے چوم لیا۔ ”مجھے یقین ہے، سید مجذوب مجھے کبھی فراموش نہیں کرے گا۔ میں جہاں بھی رہوں، اُس کا سایہ میرے ساتھ ساتھ ہوگا۔“

انکا نے جواب نہیں دیا، کسمسانے لگی۔ میں اُس کی نگاہوں میں الجھن کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

”چپ کیوں ہو گئیں؟“ میں نے اُسے چھیڑا۔ ”کیا سادھنا کا خون مارٹینا کے کار“

ٹیل خون سے زیادہ لذت آمیز نہیں ثابت ہوا.....؟“

”تمہیں اس وقت مارٹینا کیوں یاد آگئی.....؟“

”اور کسے یاد کروں.....؟“ مجھے کلدیپ یاد آگئی۔ نرگس کا تصور ذہن میں کلبلانے لگا۔

مالارانی کا خیال کروٹیں لینے لگا۔ میں نے آہ بھر کر کہا۔ ”میری زندگی میں اب یادوں کے“

سوا اور کیا رہ گیا ہے.....؟“

”میری ایک بات مانو گے.....؟“ اُس نے بڑے لاڈ سے کہا۔

”میں جانتا ہوں تم کیا مشورہ دو گی۔“ میں اُس کا اشارہ سمجھ گیا۔ ”تم مجھے ہر دور جاننے“

سے روکنا چاہتی ہو۔ لیکن کب تک؟“ میرے جنون نے پھر سر اُبھارنا شروع کیا۔ ”پنڈت“

نول کشور منڈل سے باہر آنے میں جلد بازی نہیں کرے گا۔ مجھے دُور بٹھا کر دوسرے“

معاملات میں الجھاتا رہے گا۔ تم نے ہی بتایا تھا۔ میں انتظار بھی کر لوں۔ لیکن زندگی کا“

ضمانت کون دے گا؟ بلاوے کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ کسی وقت بھی جسم اور رُوح کا رشتہ اُڑ“

کے حکم سے ختم ہو سکتا ہے۔ میں حسرتیں دل میں لئے دنیا سے رخصت ہو گیا تو میری زہر“

کو کبھی سکون نہیں ملے گا۔ ایک طرف میری لاوارث لاش کو کوئی خیراتی ادارہ قبر میں اُتار“

کی تیاری کر رہا ہوگا، دوسری طرف نول کشور بھنگ چڑھا کر کسی کم عمر بچارن کی برہنہ کر“

ہاتھ ڈالے دھوم دھڑکا کرنے میں مگن ہوگا، جو رام..... چھو رام اور بے بزرگ بلی“

نعرے لگائے گا۔ چندرا کی کسی سندرنار کے شریکر کو ہاتھ لگانے کی قسم بھی ٹوٹ جائے گی“

بھی کسی معصوم کو زبردستی گاہن کرنے میں بٹ جائے گا۔ میں نے پریم لال مہاراج“

جو وعدے کئے تھے، وہ ادھورے رہ جائیں گے۔ کلدیپ کی رُوح ہمیشہ شاکی رہے گی“

میں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”نہیں انکارانی..... نہیں۔ میں ان دونوں چٹکوں میں“

مہین سوہن کی ناجائز اولادوں کو خوشیاں منانے کا موقع نہیں دُوں گا۔ جب تک جنم رسید“

نہ کر لوں گا، چین سے نہیں بیٹھوں گا..... پنڈت پجاریوں کو تالیاں بجانے کا موقع مل گیا تو“

وہ پھر اوقات سے تجاوز کرنے لگیں گے۔“

”میں تمہارے دل کی کیفیت سمجھ رہی ہوں۔ لیکن.....“

”بہت وقت گزر گیا، بڑے درگزر سے کام لیتا رہا۔ اب لیکن ویکن کی کوئی گنجائش باقی“

نہیں رہی۔“

”ٹھیک ہے جمیل.....“ انکا نے تھوڑے توقف سے کہا۔ ”اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو“

پھر میں تمہیں روکوں گی نہیں۔ مگر ایک وعدہ کرو، تم جذبات میں بے قابو ہو کر کوئی قدم نہیں“

اٹھاؤ گے۔“

”تم اس قسم کے شورے پہلے بھی دیتی رہی ہو۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”انسان جان بوجھ کر نادانی نہیں کرتا۔ اپنی خوشی سے کوئی بھڑکتی آگ میں چھلا گئے۔ لگانے“

کی حماقت نہیں کرتا۔ وقت، حالات، گھٹن، محرمیاں اور اندر ہی اندر پکنے والا آتش گیر مادہ“

جب لاوے کی شکل میں اُبلتا ہے تو ساری مصلحتیں، تمام دُور اندیشیاں اور سود و زیاں کا“

حساب کتاب دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ جنون کی شدت انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ وہ“

آدم خور بن جاتا ہے۔ اپنے حریف کو پھاڑ کھانے کی خواہش کے علاوہ اُسے اور کچھ نہیں“

بجھائی دیتا..... کملانا نام کی وہ ٹھوس جسم والی مرہٹی لڑکی یاد ہے تمہیں؟ لالہ موتی رام کی ناجائز“

اولاد جسے لاڈ پیار نے بربادی کی روش پر ڈال دیا تھا۔ تمہارے ایک اشارے پر وہ پکے“

ہوئے آم کی طرح میرے قدموں میں آگری تھی۔ تم نے سب کچھ ایک سوچے سمجھے“

منصوبے کے تحت کیا تھا۔ اُس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے گاڑھے خون نے تمہیں بھی“

جنون کی حالت میں مبتلا کر دیا تھا۔ یاد ہے تمہیں؟ تم نے کس قدر وحشیانہ انداز میں حلق سے“

خونناک غراہٹ کی آوازیں نکال کر مجھے اُسے مار ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ کتنے جنونی انداز میں“

میرے سر پر اپنے باریک پنچے چھوئے تھے۔ براہمت ماننا انکارانی، اگر اس وقت میں انکار“

کر دیتا تو شاید تم مجھے بھی زندہ چھا ڈالنے سے گریز نہ کرتیں..... کہو، کیا میں جھوٹ کہہ رہا“

ہوں؟ کمل کی بات یاد نہ آرہی ہو تو سادھنا کو یاد کرو..... کل رات ہی کی بات ہے جب اپنی“

خواہش کی تکمیل کی خاطر تم نے اُس تر و تازہ کلی کو کس بیدردی سے جوانی کی لہلہاتی شاخ“

سے نوچ کر مسل ڈالا.....“

انکا کوئی جواب نہ دے سکی، خاموش بیٹھی مجھے تنکلی باندھے گھورتی رہی۔

”اس انداز میں کیوں گھور رہی ہو جان من؟“ میں اُس کے لا جواب ہو جانے پر ترنگ میں آ گیا۔ ”اشتعال اور بارود میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ جب تک کوئی جلتی ہوئی تیلی نہ دکھائے دونوں میں دھماکے نہیں ہوتے۔“ میں نے اُسے تنکھی نظروں سے دیکھا۔ ”اور کچھ یاد دلاؤں؟ کوئی اور مثال دُوں؟ مثلاً جب دہلی کا نام آتا ہے تو مجھے اپنی نرگس یاد آ جاتی ہے۔ وہ میرے پیار کی خاطر، مجھے پریشانیوں سے چھٹکارا دلانے کی خاطر ایک بزرگ کے مزار کی طرف جارہی تھی جب تم نے.....“

”بس کرو جمیل..... چپ ہو جاؤ۔“ انکا، نرگس کا نام سن کر کسمسانے لگی۔ ”نرگس کے سلسلے میں کئی بار میں تم سے معذرت کر چکی ہوں۔“

”میں مانتا ہوں۔ لیکن پنڈت نول کشور نے ابھی تک کوئی معذرت نہیں کی۔ مفاہمت کا کوئی پہلو اختیار نہیں کیا۔ بار بار بارود کو دُور بیٹھا آگ دکھا رہا ہے۔ ایک بار کھل کر دھماکے ہو لینے دو، اب چھوٹی موٹی دھماکیں، دھوئیں سے کام نہیں چلے گا۔“

”تم شاید ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ انکا نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”میں کوشش کروں گی کہ تمہارے دشمنوں کو منڈل سے باہر نکلنے پر مجبور کر دوں۔ پھر تم اپنی حسرتیں بھی پوری کر لینا۔“

”اب ہوئی تاباں.....“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”پہلی بار تم نے میرے دل کی بات؛ صادقاً کیا ہے۔ دل چاہتا ہے تمہارا منہ چوم لوں۔“

”ہمیشہ جھوٹے وعدوں پر بڑھاتے رہتے ہو، کبھی عمل کر کے دکھاؤ تو جانوں۔“ اُس نے سیدھا پاؤں سر پر ملستے ہوئے ایک خاص ادا سے کہا۔ مجھے لکھنؤ کے کوٹھوں کی طرح داہ طوائفیں یاد آ گئیں۔

ہمارے درمیان خوشگوار ماحول میں باتیں شروع ہو گئیں۔ انکا مجھے لبھاتی رہی۔ میں چھیڑ خانی کی باتیں کرتا رہا۔ کئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔ ایک اسٹیشن پر ٹکٹ چیکر کپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر یوں چونکا جیسے پہلے سے جانتا ہو۔ میں نے اپنے ذہن پر زور دینے کی زحمت نہیں کی۔ البتہ یہ فکر ایک لمحے کو ضرور لاحق ہوئی کہ میں بے ٹکٹ سفر کر رہا تھا۔

”اے مسٹر، تم اس ڈبے میں کیسے آ گئے.....؟“ ٹکٹ چیکر نے میرے قریب آ کر

خوشگوار انداز میں سوال کیا۔

”کیوں.....؟“ میں نے بے پرواہی کا مظاہرہ کیا۔ ”کیا یہ فرسٹ کلاس نہیں ہے؟“

”صورت شکل سے تو پڑھ لکھے معلوم ہوتے ہو۔ لیکن یہ لاشی.....“

”بھونکنے والے کتوں کو بھگانے کے لئے استعمال کرتا ہوں۔“ میں نے اُس کا جملہ مکمل کیا تو وہ بیچ و تاب کھا کر بولا۔

”تمہیں اگلے اسٹیشن پر یہ ڈبہ خالی کرنا ہوگا۔ یہ کسی کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔ کیا تمہیں باہر ریزروڈ (RESERVED) کی سختی نظر نہیں آئی.....؟“

”اتنا پڑھا لکھا ہوتا تو فرسٹ کلاس میں کیوں سفر کرتا.....؟“ میں نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔

”ٹکٹ ہے تمہارے پاس.....؟“ اُس نے برا سامنے ہٹا کر پوچھا۔

”کیا خیال ہے جمیل.....؟“ انکا نے ٹکٹ چیکر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اس کو اٹھا کر باہر نہ پھینک دوں؟“

میں نے جواب دینے کی بجائے ٹکٹ چیکر کو غصے سے دیکھتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میرا نفسیاتی حربہ کام آ گیا، انکا کی موجودگی میں مجھے زیادہ فکر بھی نہیں تھی۔

”ٹھیک ہے مسٹر.....“ اُس نے میرے غصے سے مرعوب ہو کر جواب دیا۔ ”ٹکٹ ہوگا آپ کے پاس۔ لیکن یہ ڈبہ آپ کو بہر حال اگلے اسٹیشن پر خالی کرنا ہوگا۔“ وہ اپنا آخری فیصلہ سن کر سستانے کی خاطر دُور جا کر بیٹھ گیا۔

”انکارانی.....“ میں نے بھی فیصلہ کن لہجے میں انکا کو مخاطب کیا۔ ”میں یہ ڈبہ خالی نہیں کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہوگا.....“

اگلا اسٹیشن آنے سے پہلے گاڑی کی رفتار مدہم ہونی شروع ہوئی تو انکا میرے سر سے رنگ کر اتر گئی۔ ٹکٹ چیکر کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہونا شروع ہو گئے۔ گاڑی رُکی تو اُس نے بوی تہذیب سے کہا۔

”ڈبہ گوالیار سے دہلی تک کے لئے مخصوص ہے۔ آپ ایک اسٹیشن پہلے اتر جائیے گا۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ خاموشی سے نیچے اتر گیا۔ انکا کچھ دیر بعد دوبارہ



واپس آگئی۔

”تمہیں یاد ہے جمیل؟ میں نے سادھنا کے سلسلے میں ہندوستان کے ایک منتری کے سلسلے میں بات کی تھی۔“ انکا نے مجھے اپنی معلومات سے آگاہ کیا۔ ”اُس کی اکلوتی لڑکھو گوالیار سے ہم سفر ہوگی۔ اُس کے ساتھ حفاظتی عملہ بھی ہوگا۔ اُن کے لئے برابر ڈبے میں نشستیں محفوظ کرائی گئی ہیں۔“

”کچھ بھی ہو، میں اپنی نشست خالی نہیں کروں گا۔“ میں نے کسی ضدی بچے کی طرز کہا۔ انکا مسکرانے لگی۔

”کیا تم ہمیشہ اسی انداز میں بات نہیں کر سکتے؟“

”حالات لگام کھینچ کر مجھے طیش دلاتے ہیں۔ بات میرے بس میں نہیں رہتی۔“ میں نے وضاحت پیش کی۔

”تمہیں اب اپنے آپ پر قابو رکھنا ہوگا جمیل۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”پنڈت نول کٹر جب تک منڈل سے باہر نہیں آجاتا میں اس کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتی۔ اُس مرد نے یونہی اتنی لمبی چوڑی بساط نہیں بچھائی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ ابھی وہ صرف اپنے پیادے آگے بڑھا رہا ہے، اہم مہرے اُس نے سنبھال کر رکھے ہوں گے۔“

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“ میں نے سپاٹ آواز میں پوچھا۔

”میری بات کا غلط مطلب مت نکالو۔“ اُس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میر مقصد یہ تھا کہ ہم جو قدم بھی اٹھائیں سوچ سمجھ کر اٹھائیں۔ دشمنوں کو بھاگنے کا موقع نہ سکے۔ وہ بکھر کر ادھر ادھر ہو گئے تو کہانی پھر طول پکڑ لے گی۔ تم میری مجبوری سے واقف ہو۔ میں کالی کے مندر یا کسی پجاری کے منڈل میں نہیں داخل ہو سکتی۔“

”فکر مت کرو۔ مجھے مندروں میں گھسنے اور حالات سے نمٹنے کا تجربہ ہے۔“

حقارت سے بولا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ نول کشور، پنڈت بدری نرائن یا امرلال سے ناپا تو توں کا مالک ہوگا۔“

انکا کچھ سوچنے لگی۔

”تم نے چندرا کے بارے میں کوئی کھوج لگایا؟“ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”وہ اتنی کم عمری میں موت کی تمنا کیوں کر رہا ہے؟“

”اُسے بھی کم مت سمجھنا۔“ انکا نے نفرت کا اظہار کیا۔ ”سانپ کا بچہ بھی سنبولا کہلاتا ہے۔ چندرا میں بھی سانپوں جیسی خاصیت ضرور ہوگی۔ وہ امرلال کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اُس کی رگوں میں باپ کا خون موجود ہے، اسی خون کی گرمی نے اُس کے انتقامی جذبات کو ہوا دی ہوگی۔ وندھیا چل کی برفانی گچھاؤں میں منڈل کھینچ کر سال دو سال گزارنا عام آدمیوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ بڑے بڑے پنڈت چپس بول دیتے ہیں۔ چندرا وہاں جم کر بیٹھا ہوگا تو اُس نے کچھ نہ کچھ حاصل بھی کیا ہوگا لیکن..... تم یہ بار بار چندرا کے دھیان میں کیوں گم ہو جاتے ہو؟“

”مجھے اُس کی جوانی پر کبھی کبھی ترس آنے لگتا ہے۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”غرض کرو میں طبعی موت کا شکار ہو جاؤں تو کیا وہ حرام کا ختم کسی حسینہ کے محلی جسم کو ہاتھ لگائے بغیر مجرذ زندگی گزار دے گا؟ پجاریں صرف اُس کا خواب دیکھتی رہیں گی، خود وہ بھی ماہی بے آب کی طرح اپنی خواہشات کی کانٹوں بھری سیج پر تڑپتا رہے گا۔“

”عجیب شخص ہو تم۔“ انکا مسکرا دی۔ ”کبھی چندرا کا نام سن کر تمہارے اندر کا وحشی گھوڑا ہنہانے لگتا ہے، تم طیش میں آکر بے قابو ہو جاتے ہو، دیوانگی کی تمام سرحدیں عبور کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہو۔ اس وقت چندرا کی کسن جوانی تمہارے آڑے آرہی ہے۔“

انکا کا اعتراض بجا تھا۔ میں نے جسے قدموں تلے روندنے کا عزم کر کے جین کی مرمیں بانہوں اور مہکتی زلفوں سے منہ موڑا تھا، لندن کی پرسکون زندگی کو الوداع کہا تھا، اُس کے بارے میں میرے دل کے کسی گوشے میں بھی ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں ابھرتا چاہئے تھا۔ وہ میرا دشمن تھا۔ میرے خون کا پیاسا تھا، میری کلدیپ کے قاتل کا بیٹا تھا۔ مجھے اُس سے شدید نفرت کا اظہار کرنا چاہئے تھا۔ میں نے موضوع بدل دیا۔ انکا نے بھی سکون کا سانس لیا۔ وہ بھی میری وحشتوں، میرے جنون سے گھبرا جاتی تھی۔ میری ہمدرد تھی۔ مجھے پرسکون دیکھنا چاہتی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ گوالیار کا اسٹیشن قریب آنے لگا تو انکا کے تیور یکجہت تبدیل ہونے لگے۔ اُس کی نگاہوں میں اُبھرنے اور خوشی کے طے جلے تاثرات ابھرنے لگے۔

”کیا بات ہے انکارانی.....؟“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”تمہاری نظریں کہاں بھٹکتی پھر رہی ہیں؟“

کو خوبصورتی سے ٹال کر دروازہ اندر سے بولٹ کر لیا۔ امریتا اور میری نظریں چارہوں میں تو اس کی بنگاہوں میں خوشی کی کرن بس ایک لمحے کو نظر آئی، پھر اُس نے بے زنجی سے نظریں پھیر لیں۔ آگے بڑھ کر تھکے تھکے انداز میں ہر تھکے آخری سرے پر جا کر بیٹھ گئی۔ دونوں مسلح افراد دروازے پر جے کھڑے رہے، اُن کی نظریں بار بار میری جانب اُٹھ رہی تھیں۔ شاید انہیں نارنگ کی بیٹی کے لئے ”مخصوص“ کپارٹمنٹ میں میری موجودگی پر تعجب ہو رہا تھا۔ میں امریتا کو کنکھیوں سے دیکھنے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ اُس نے مجھے شناخت کرنے میں اجتناب کیوں برتا؟ فضائی سفر کے دوران تو وہ کسی خوش گلو پرندے کی طرح چمک چمک کر باتیں کر رہی تھی، بڑی بے تکلفی سے ڈھکے چھپے لفظوں میں اس بات کا دعویٰ بھی کیا تھا کہ وہ نہ صرف مجھ سے واقف ہے بلکہ آزا بھی چکی ہے..... میں نے اپنے ذہن کو ایک بار پھر کھانا شروع کیا، کئی امکانات پر غور کیا، کئی پہلوؤں سے ماضی پر نظر ڈالی لیکن امریتا سے مشابہت کوئی چہرہ دُور دُور تک نظر نہیں آیا۔ میرے کانوں میں اُس کا کہا ہوا ایک جملہ صدائے بازگشت بن کر گونجا..... ”آزمائی ہوئی چیزوں کو دوبارہ پرکھنے کی کیا ضرورت ہے.....؟“ گرو پرتاپ نے بھی امریتا کے بارے میں میرے استفسار پر امریتا کے اسی جملے کی تصدیق کی تھی۔

میرا ذہن الجھنے لگا۔ گاڑی نے آخری سیٹی کے بعد ریٹکنا شروع کیا تو انکا میرے سر پر آ گئی۔ اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی مسلط تھی۔ کسی خیال میں مستغرق نظر آ رہی تھی۔ میں نے امریتا کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا، فضائی سفر کے دوران گرو نے امریتا اور انکا کے درمیان کوئی پردہ حائل کر دیا تھا جو وہ امریتا کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ گرو نے کسی خاص مصلحت کی بناء پر ہی ایسا کیا ہوگا۔ میں بھی انکارانی کو یہ موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ میرے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر کوئی شکوہ کرے۔

گاڑی نے رفتار پکڑی تو ایک مسلح شخص امریتا کے ساتھ والی نشست پر جم کر بیٹھ گیا، دوسرا میرے قریب آ کر بڑے خشک لہجے میں بولا۔

”تم کس طرح اندر گھس آئے؟ یہ ڈبہ تو صرف ایک ہی فیملی کے لئے بک ہوا تھا۔“ انکا میرے جواب دینے سے پیشتر ہی سر سے اُتر گئی۔ ہٹے کئے شخص کے تیور اچانک بدل گئے۔ بڑی نرمی سے بولا۔

”گوالیار کا اسٹیشن قریب آ رہا ہے۔“ انکا نے کسماتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں سے کہا تھا کہ راج منتری کی بیٹی چارمچا فطوں کے ساتھ سفر کرے گی۔ لیکن وہ محافظ دُور تک کہیں نظر نہیں آ رہے۔ لڑکی جو حسن و جمال میں اپنی مثال آپ ہے مجھے کچھ گھر گھبرائی سی نظر آ رہی ہے۔ اُس کے ساتھ جو دو آدمی ہیں وہ بھی مجھے اچھے لوگ نہیں دکھ دیتے۔ کہیں نہ کہیں کوئی گریڈ ضرور پیدا ہوئی ہے۔ نارنگ سنہا بڑی اونچی شے ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ پردھان منتری کو بھی گھاس نہیں ڈالتا۔ اُس کے ہاتھ بہت لمبے پر بہت دُور اندیش، بڑا معاملہ فہم آدمی ہے۔ اپنے سائے سے بھی محتاط رہنے کا عادی ہے۔ میں نے جو معلومات کی ہیں، وہ غلط نہیں ہو سکتیں۔ راج منتری نارنگ اپنی بیٹی کو دنیا پر سب سے زیادہ چاہتا ہے۔ محافظوں کا انتخاب کرتے وقت بھی اس نے بہت سوچ سمجھا۔ کوئی آخری فیصلہ کیا ہوگا۔ تمہاری اطلاع کے لئے ایک بات اور بتا دوں، نارنگ سنہا شمار اصول پرست اور ایماندار لوگوں میں کیا جاتا ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ اُس نے انڈر ورلڈ (UNDER WORLD) کے کئی گاڈ فادرز (GODFATHERS) سے گٹھ جوڑ کر ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو حکومتی کاموں میں اُس کی جڑیں اتنی مضبوط نہ ہوتیں۔“

میں خاموشی سے انکا کی باتیں سنتا رہا۔ وہ نارنگ کے بارے میں مجھے بڑی تفصیل۔ ایک ایک بات بتا رہی تھی۔ اُس کی لڑکی کے حسن و جمال کے سلسلے میں بھی اُس نے ان تعریفیں کی تھیں کہ میرا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔

گاڑی کی رفتار مدہم ہو۔ تہ ہوئے تھمنے لگی تو انکا میرے سر سے اُتر گئی۔ میں دروازے کی مخالف سمت والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ گاڑی رکی تو کپارٹمنٹ کا دروازہ کمریلوے کے عملے کے کئی بڑے عہدیدار باہر موجود تھے لیکن میں پھٹی پھٹی نظروں سے اُن تازک انداز حسینہ کو دیکھ رہا تھا جو اندر داخل ہو رہی تھی۔ میری آنکھیں پٹ پٹانے لگیں۔ لاکھوں میں بھی ہوتی تو میں اُسے دور سے پہچان لیتا۔ وہ امریتا کے سوا کوئی اور نہیں تھی۔ میرے کانوں میں اُس کی گفتگو کے وہ خوبصورت جملے رس گھولنے لگے جو اندن سے اپنے وقت جہاز میں ہمارے درمیان ہوئی تھی۔

امریتا نے ڈبے میں قدم رکھا تو اُس کے جسم کی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ دو ہٹے کئے مسلح افراد بھی اندر آ گئے۔ انہوں نے گیٹ ہی سے استقبال کرنے والے

”شما کرنا مہاراج، میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا۔ دھرم کرم کے معاملے میں ہم پنڈت پجاری سے اُلجھنے کی غلطی نہیں کرتے۔“

وہ انکا کے زیر اثر تھا۔ میں نے برا سامنہ بنا کر اُسے ہاتھ کے اشارے سے دھتکار دیا۔ وہ ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت کرنے کے انداز میں تھوڑا سا جھکا، پھر اپنے ساتھی کے پاس جا سرگوشی کرنے لگا۔ میں نے پھر اچنتی ہوئی نظر امریتا کے چہرے پر ڈالی، اُس کی اجنبیت انداز مجھے ڈس رہا تھا۔ اگر وہ نارنگ جیسے قد آور منتری کی چیتھی تھی تو پھر اُسے اپنے محافظ سے اس قدر خوفزدہ بھی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ فضائی سفر کے دوران وہ بڑی الزاما ڈرن، بے باک نظر آئی تھی۔ اب اجنبیوں کی طرح گم صم بیٹھی شاید میرے صبر کا امتحان لے رہی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کسی مصلحت کے پیش نظر اُس نے محافظوں کی موجودگی میں مجھ سے بے تکلف ہونا پسند نہ کیا ہو۔

کچھ دیر بعد انکا دوبارہ میرے سر پر آگئی۔

”میں نے غلط نہیں کہا تھا ٹیبل.....“ اُس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”نارنگ کی جسم اور چیتھی بیٹی جس کا نام امریتا ہے اس وقت بڑی بے بسی کا شکار ہے۔ قسمت نے تمہیں اب سنہری موقع دیا ہے۔ تم امریتا کی مدد کر کے نارنگ کا دل جیت سکتے ہو۔ تمہارے ہاتھ مضبوط ہو جائیں گے۔“

”میں سمجھا نہیں.....“ میں نے وضاحت چاہی۔

”امریتا کے چار محافظ جو اس کی حفاظت پر مامور تھے، اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹے ہیں۔ یہ دو بٹے کئے آدمی جو تمہیں اس وقت نظر آرہے ہیں انہوں نے امریتا کو اغواء کرنے کا بیڑا بنالیا ہے۔ ان کا تعلق نارنگ کے مخالف گروہ سے ہے، امریتا کے عوض وہ نانہ سے بڑی سے بڑی رقم طلب کر سکتے ہیں، اپنی کوئی بات بھی منوا سکتے ہیں۔“

”یہ کیسے ممکن ہے.....؟“ میں نے بے چینی سے کہا۔ ”کیا دہلی کے ریلوے اسٹیشن نارنگ سنبھا کے حفاظتی دستے کے دوسرے افراد امریتا کے استقبال کو موجود نہیں ہوں گے؟“

”استقبال تو تب ہوگا جب وہ دہلی پہنچ سکے گی۔“ انکا کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”کیا مطلب.....؟“ میں چونکا۔

”امریتا کو دہلی پہنچنے سے پیشتر ہی راستے میں اتار لیا جائے گا۔ نارنگ کو خبر ہونے

اس کو ایسی جگہ پہنچا دیا جائے گا جہاں پرندہ بھی پر نہ مار سکے..... اغواء کرنے والوں کی جڑیں بھی زیر زمین کام کرنے والوں تک پھیل ہوئی ہیں۔“

انکا سے تفصیل سن کر مجھے امریتا کے گم صم ہونے کی وجہ سمجھ آگئی۔ میں نے اُسے بغور دیکھا، آزاد فضاؤں میں چپکے والی بلبل اس وقت شکاریوں کے جال میں پھنسی بے بس نظر آ رہی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہو جمیل.....؟“ انکا نے کہا۔ ”کیا امریتا کے حسن اور جسم کے گداز نے تمہیں متاثر نہیں کیا؟ ایک نظر بھر کر دیکھو، اس کی ٹس ٹس سے جوانی پھوٹی پڑ رہی ہے۔ آم کے آم اور گھلیوں کے دام والا سودا ہے۔ یہ بھی تمہاری آغوش میں مچلنے سے گریز نہیں کرے گی۔ نارنگ بھی تمہارا بے دام غلام بن جائے گا۔ بڑے بڑے پولیس آفیسر اس کا نام سن کر ہی تھر تھرانے لگتے ہیں۔“

”میں راستے میں اُلجھ گیا تو میرا سفر پھر لمبا ہو جائے گا۔“ میں نے دیدہ و دانستہ امریتا سے لائق کا اظہار کیا۔

”سمجھنے کی کوشش کرو یہ موقع بار بار ہاتھ نہیں آتے۔“

میں کچھ توقف کے بعد اپنی سیٹ سے اٹھا۔ سید مجذوب کی لائٹھی میری گرفت میں تھی، انکا سنبھل کر بیٹھ گئی۔ میں نے ننذا کی قوتوں والے عمل سے خود کو محفوظ کر لیا۔ امریتا مجھے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر پہلو بد لے لگی۔ شاید وہ مجھے خطرے کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ اُسے یہ اندیشہ بھی لاحق ہوگا کہ بات بڑھ جانے کی صورت میں اغواء کرنے والے اُسے گولی بھی مار سکتے ہیں۔

میرے پاس قوتوں کی کمی نہیں تھی۔ پریتم لال نے کہا تھا کہ میں کسی جائز کام کے لئے اس کا نام لے کر جس خواہش کا خیال دل میں لاؤں گا وہ ضرور پوری ہوگی انکا کو بھی پریتم لال نے اپنی کچھ حیرت انگیز قوتیں سونپ دی تھیں۔ سید کی متبرک لائٹھی میرے پاس تھی۔ مجھے کوئی خوف نہیں تھا۔ میرے قدم جوں جوں آگے بڑھتے گئے، امریتا کی بے چینی بھی بڑھتی گئی۔ دونوں بٹے کئے افراد بھی محتاط ہو گئے۔ جس نے مجھ سے بات کی تھی، وہ بیٹھا رہا۔ اُس کا دوسرا ساتھی بگلی ہولسٹر سے پستول نکال کر اٹھ کھڑا ہوا، خطرناک انداز میں غرا کر بولا۔

درمیان میں کر لی۔ راجو کے پستول سے یکے بعد دیگرے چھ شعلے لپکے..... چھ پھول میرے قدموں میں پڑے نظر آنے لگے۔ دوسرا شخص بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ میں نے اُسے سنہلنے کا موقع نہیں دیا، سید کی لاشی اُس پر اُچھال دی۔ وہ بلبلاتا ہوا اونڈھے منہ گرا۔ پھر امریتا کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ راجو پستول پھینک کر اپنے ساتھی پر چڑھ بیٹھا۔ جیب سے ریشم کی مضبوط ڈور نکال کر اُس نے زمین پر گرے ہوئے بد معاش کے دونوں ہاتھ پشت پر کر کے سختی سے باندھ دیئے، پھر اُس کے پاؤں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا..... وہ راجو کی شان میں مغلظات گالیاں بکنے لگا۔

میں نے لاشی زمین سے اٹھا کر اُس کے سر پر مار دی۔ اُس کے حلق سے خرخراہٹ کی آوازیں بلند ہوئیں، پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔  
 ”میرے لئے کیا حکم ہے مہاراج؟“ راجو ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔  
 ”پٹھ..... پانی..... پہاڑ کے نیچے آیا تو گزر گرانے لگا۔ پہلے بڑا اُچھل کود رہا تھا۔“ میں نے دل میں پریم لال کا نام لے کر اُسے حکم دیا۔ ”اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لے..... سنا تو نے، میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

راجو نے کسی سعادت مند بچے کی طرح اپنی آنکھوں کا فلکجہ بنا کر گلے میں ڈال لیا۔ اُس کے دونوں انگوٹھے پوری قوت سے ٹیٹوے پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگیں۔ حلق سے گھٹی گھٹی ہوئی خوفناک آوازیں بلند ہوئیں۔ پھر اُس کی زندگی کا چراغ اُسی کے ہاتھوں بجھ گیا۔ وہ بھی ڈھیر ہو گیا۔ امریتا دوڑ کر بے اختیار میرے سینے سے لپٹ گئی۔ اُس کے جسم کی تپش، اُس کے سینے کی دھڑکنیں میرے اندر کے شیطان کو اکسانے لگیں۔ میں اُسے ہاتھوں کے حصار میں لئے اپنی نشست کی طرف واپس آ گیا۔ وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ عجیب صورت تھی، موت کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ خوفزدہ ہو کر تھر تھرا رہی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ پہلے وہ گم صم بنی بیٹھی تھی۔

”جیل.....“ انکا کی آواز میری قوت سماعت سے ٹکرائی۔ ”میں گارڈ کے سر پر جاری ہوں۔ ہو سکتا ہے امریتا کے اغواء کی سازش میں اُس کا بھی ہاتھ شامل ہو۔ لیکن اب یہ گاڑی دہلی پہنچنے سے پیشتر راستے میں کہیں نہیں رُکے گی۔ تم پریشان مت ہونا۔ مجھے گارڈ کے علاوہ

”جہاں بیٹھے تھے وہیں واپس جا کر سکون سے بیٹھ جاؤ مہاراج، ہم اپنے معاملات کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ دھرم کرم سے ہمارا دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہم صرف گولیوں کی زبان میں بات کرنے کے عادی ہیں۔ تم اپنا کام کرو، ہمیں اپنا کام کر دو۔ اسی میں دونوں کی بھلائی ہے۔“

”سندری..... تمہارا نام امریتا ہے نا.....؟“ میں نے پستول والے کو نظر انداز کر براہ راست امریتا کو مخاطب کیا۔

”آں..... ہاں.....“ اُس نے شپٹاتے ہوئے جواب دیا۔ اس بار بھی اُس کی نظر میں اجنبیت تھی۔

”تمہارے ساتھ یہ کون لوگ ہیں.....؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔

”تم..... تم اپنا کام کرو۔“ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”یہ..... یہ میرے محافظ ہیں۔“  
 ”سن لیا تم نے گرد دیو.....“ پستول والے نے مجھے تیز نظروں سے گھورا۔ ”اب پھرتے نظر آؤ۔“

”میں نے تمہیں ڈبے میں بیٹھنے کی اجازت دی تھی، تم نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع دیئے۔“ دوسرے کے لہجے میں تلخی شامل ہو گئی۔ ”جاؤ بابا جاؤ، ہمارے متھے لگنے کی اُمت مت کرو.....“

”سندری.....“ میں نے پھر امریتا کو مخاطب کیا۔ ”میں تیری دُبدھا کا کارن بن ہوں۔ پرنتو کوئی چٹنا نہ کر۔ میں جو تیری سہانتا کو آ گیا ہوں۔ ان اٹھائی گز بد معاشوں کا خوف دل سے نکال دے۔ شانت ہو جا، جو یہ دشت چاہتے ہیں وہ اب نہیں ہوگا۔ تو میری شرن (پناہ) میں آگئی ہے۔“

پستول والے کا دوسرا ساتھی بھی اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کا پستول بھی نکل آیا۔ انکا رفقاری سے رنگتی میرے سر سے اتر گئی۔ امریتا کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی۔ بدستور سینہ تانے اپنی جگہ کھڑا رہا۔

”راجو.....“ دوسرے شخص نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔ ”اسے ٹھکانے لگا کر لاٹھ سے باہر پھینک دے۔“

جسے راجو کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا اُس نے پستول فضا میں بلند کیا۔ میں نے سید

انجن ڈرائیور کو بھی قابو کرنا ہوگا۔ تم چاہو تو بے قابو ہو جاؤ۔ امریتا اس وقت تمہاری خواہش سے انکار نہیں کرے گی۔“

انکا چلی گئی۔ میں امریتا کو نارمل حالت میں لانے کی خاطر تسلیاں دیتا رہا۔ میرا خیال ہوش و حواس بحال ہونے کے بعد مجھے پہچان لے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دہشت کیفیتوں سے نجات پانے کے بعد وہ ہونٹ چباتی مجھ سے دُور ہو گئی، مدھم لہجے میں بولی۔ ”تم نے میرے اوپر جو احسان کیا ہے وہ میں سارا جیون یاد رکھوں گی۔ تم نے بروقت میری مدد نہ کی ہوتی تو نہ جانے میرا کیا انجام ہوتا۔“ آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اُسے جھرجھری آگئی۔ سب سے لہجے میں کہنے لگی۔ ”ان دونوں نے میرے باڈی گارڈز بڑی سفاکی سے قتل کیا تھا۔ مجھے دشواری نہیں تھا کہ میں ان کی قید سے آزاد ہو سکوں۔ انہوں نے مجھے بڑے خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی۔“

”شاید اسی لئے تم نے مجھ سے گریز اختیار کر رکھا تھا؟“ میں نے اُسے کریدنے کی کوشش کی۔

”کیا مطلب.....؟“ اُس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ ”کیا تم مجھے پہلے جانتے ہو؟“

”ہاں.....“ میں نے اُسے یاد دلانے کی خاطر کہا۔ ”ہم لندن سے ہندوستان آئے وقت جہاز میں ایک ساتھ تھے۔ زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔“

وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ اُس کی نگاہوں میں عجیب سی الجھن پیدا ہوئی۔ ”مجھے نہیں آ رہا۔“ اُس نے سیاہ آواز میں جواب دیا۔

میرے ذہن میں اٹھل پھل شروع ہو گئی۔ فضائی سفر کے دوران اُس کا خوردہ میرے پاس آنا، بے تکلفی سے باتیں کرنا، اپنائیت اور پرانی واقفیت کا اظہار کرنا، مجھے گفتگو کا انداز، حسین چہرے پر کھیلنے والی شوخی و شرارت، ایک ساتھ کھانا کھانا، اُس ہونٹوں کے گداز پر ابھرنے والی مقناطیسی مسکراہٹ۔ مجھے اُس کا ایک ایک انداز یاد تھا۔ لیکن اُس نے سرے سے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔

”تم فرسٹ کلاس میں سفر کر رہی تھیں۔ کچھ دیر کے لئے اٹھ کر اکانوی میں بیٹھیں۔“ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”امرتا..... یہ نام بھی تم نے

مجھے بتایا تھا۔“ ممکن ہے آپ کی نظروں کو دھوکا ہو رہا ہو، جس لڑکی کا ذکر آپ کر رہے ہیں وہ میری ہم شکل رہی ہو۔ اُس کا نام بھی امریتا ہو سکتا ہے۔“ اُس کے لہجے میں بھولپن تھا، وہ اداکاری نہیں کر رہی تھی۔ لیکن جو کچھ میں کہہ رہا تھا وہ بھی غلط نہیں تھا۔ ”تم نے مجھ سے مختصر گفتگو کے درمیان گروپرتاپ کا نام بھی لیا تھا، وہ تمہارے ساتھ تھا۔ کچھ یاد آیا.....؟“

”گروپرتاپ.....“ اُس کی سہمی سہمی نظروں میں ارتعاش کی کیفیت نمودار ہوئی۔ سنجیدگی سے بولی۔ ”ہاں..... میں گروپرتاپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ پتاجی اُن کی بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ میں جب بھی بیرون ملک جاتی ہوں، گرو جی میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ لندن سے واپسی پر بھی وہ میرے ساتھ تھے۔ لیکن آپ.....“ اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر اپنی یادداشت کریدنے لگی۔

”میرا نام جمیل احمد خان ہے.....“ میں نے اُسے اپنا نام بتایا۔

”یہ نام بھی میں آپ کے منہ سے پہلی بار سن رہی ہوں۔“

میرا دل چاہا کہ اُس کی باتوں پر قہقہہ لگانا شروع کر دوں۔ میرے سینے میں اُس کی تصویر آویزاں تھی۔ ایک ایک نقش میری نگاہوں میں کندہ تھا۔ اُس کی آواز، اُس کے دل بھانے کا انداز، اُس کی شوخ مسکراہٹیں، لگاؤ کی باتیں، سب کچھ ویسا ہی تھا، میں بھی وہی تھا۔ لیکن وہ بدل گئی تھی۔ عام زندگیوں میں بھی فلمی کہانیوں جیسے حیرت انگیز اتفاقات ہو سکتے ہیں۔ ایک شکل کی دولہا کیوں بھی ہو سکتی ہیں، ان کے نام بھی ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ میں اُس کی بات تسلیم کر لیتا لیکن گروپرتاپ کے حوالے کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی اُس کی اجنبیت کی باتیں میرے لئے کسی معنے سے کم نہیں تھیں۔ شاید وہ مجھ سے مذاق کر رہی تھی۔ لیکن ہے کوئی اور مصلحت رہی ہو۔ ہو سکتا تھا اُسے اپنے ملک میں وہ آزادی حاصل نہ ہو جو بیرون ملک رہی ہو؟ نارنگ سنہا کی طرف سے اُس پر کچھ پابندیاں عائد ہوں؟ وہ بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ اُس کے حلقے میں بھی سب اُنچے طبقے کے افراد ہوں گے۔ اُس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، گھومنا پھرنا سب کچھ ایک طے شدہ پروگرام اور ٹائم ٹیبل کے تحت عمل میں آتا ہوگا۔ لیکن میں اُس کا محسن تھا، میں نے اُس کی جان بچائی تھی۔ دہلی کے ریلوے اسٹیشن



پر وہ میرے متعلق اپنے باپ سے اور کیا تعارف کرا سکتی تھی؟..... پھر وہ مجھے پہچانے کیوں گریز کر رہی تھی.....؟“

”جو لوگ تمہیں اغواء کر رہے تھے وہ کون تھے؟“ میں نے موضوع بدل دیا۔ ”اُن مقصد کیا تھا.....؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ اُس نے شانے اچکا کر جواب دیا، پھر رسی میں بندھے ٹکڑے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہ مر گیا.....؟“

”نہیں.....“ میں نے زہر خند سے جواب دیا۔ ”اگر یہ بھی مر گیا تو پھر میری زندگی ضمانت کون دے گا؟“

”آپ گرو پرتاپ کو کیسے جانتے ہیں؟“ اُس نے پھر بڑی بدل دی۔

”وہ گرو تھا، میں چیلہ۔“ میں نے اختصار سے کام لیا۔ ”تم اس سے زیادہ جان کر کرو گی؟“

”آپ..... آپ بھی مجھے مہان شکتیوں کے مالک نظر آتے ہیں۔“ اُس کی حسیں آنکھوں میں پھر خوف کی تلچٹ نظر آنے لگی۔ ”ایک لفنگے نے آپ پر فائر کیا، میں نے مار کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو مارنے کے بعد وہ مجھے بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔ لیکن جب میں نے دوسرے کی چیخ کی آواز سن کر آنکھیں کھولیں تو جرن زدہ رہ گئی۔ آپ کے چرنوں میں پھول پڑے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے غائب گئے۔ پھر آپ نے اپنی لاشیں دوسرے پر اچھال دی، وہ پستول رکھنے کے باوجود آپ کا ہاتھ نہیں بگاڑ سکے۔ جو کچھ میری نظروں نے دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ ایک پل کو میرے ذہن میں خیال ابھرا کہ میں شاید جاگتے میں پسنا دیکھ رہی ہوں۔ ایک نے دوسرے ساتھی کے ہاتھ رسی سے باندھ دیئے، اس کے بعد آپ کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا..... آپ کے کہنے پر اُس نے جیو ہٹا کر لی۔“ اُس نے پہلی بار مجھے عقیدت مندی کی نظروں سے دیکھا۔ ”مجھے وشواس ہے کہ آپ بھی گرو پرتاپ سے کم شکتی کے مالک نہیں ہیں۔ گرو جی ایسے ایسے چتکار دکھاتے ہیں کہ سب اچنبھے میں پڑ جاتے ہیں۔ ڈیڈ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ وہ پنڈت پجاریوں کی سیوا کرنا اپنا دھرم سمجھتے ہیں.....“

”تمہیں مجھ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی؟“ میری آنکھیں پھر سلگنے لگیں۔

”کیوں نہیں.....“ وہ تیزی سے بولی۔ ”آپ دیوتا سان ہیں۔ میں آپ کے چرنوں کی راتی ہوں۔“

”داسی دیوتاؤں سے اتنی دُور..... الگ تھلگ نہیں بیٹھتی۔“ میں نے اُسے اُکسانے کی دُش کی۔ ”اندرو کی سہا کی رنگین کہانیاں نہیں سنیں تم نے.....؟“

اُس کے ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور تبسم ابھر آیا۔ میرے دل کی کلی چٹختنے لگی۔ وہ شرما کر دلی۔ ”مجھے اندر کے اکھاڑے کی کہانیاں عجیب لگتی ہیں۔“

”کیوں.....؟“ میں نے مضرب کے تاروں کو جھپٹا۔ ”یقین نہیں آتا.....؟“

”ایک بات میرے من میں کھٹک رہی ہے۔“ وہ پھر کسی بام پھلی کی طرح ہاتھ سے بھیلے لگی۔ ”مجھے دیکھ کر بنجیدگی سے بولی۔ ”پوچھ لوں..... آپ برا تو نہیں منائیں گے؟“

”پہلے کسی منٹش نے تمہاری من موہ لینے والی باتوں کا برا منایا ہے؟“ میں نے پہلو بدلا۔ وہ مسکرا دی۔

”آپ کا شبہ نام جمیل احمد خان ہے۔ لیکن.....“ اُس نے جان بوجھ کر جملہ پورا نہیں کیا۔ میں اُس کی بات کا مفہوم بھانپ کر بولا۔

”شکنتی اور طاقات کسی دھرم، کسی ذات پات کی پوچھی نہیں ہوتی۔ جو من مار لیتا ہے، گیان دھیان میں لگ جاتا ہے، وجہ کیول اُسی کی ہوتی ہے۔ اپنے اپنے وشواس، اپنے اپنے کلن کی بات ہے۔ ناموں میں کیا دھرا ہے۔“ میں نے بات جاری رکھی۔ ”میں تمہیں شکنتلا کے نام سے پکاروں، کیا تم مجھے راجدشیت سمجھ کر میری بانہوں میں سما جاؤ گی؟“

”آپ.....“ وہ شرما کر بولی۔ ”آپ شاید کالی داس کے لکھے ٹانگ کی بات کر رہے ہیں؟“

”یہ جیون بھی کسی ٹانگ سے کم تو نہیں۔“ میں نے اُسے یاد دلایا۔ ”کچھ دیر پہلے جو ہور ہا تھا وہ بھی ایک ٹانگ تھا۔ میں تمہارے بھاگیہ سے یہاں نہ ہوتا تو اس ٹانگ کا انت بھیا نک ہی ہوتا۔ وہ تمہیں ہر بات پر مجبور کر سکتے تھے۔ تم اُن کے قبضے میں تھیں۔ وہ دو تھے، مسلح تھے۔ تم اپنے باؤی گارڈس کا انجام دیکھ چکی تھیں۔ تم انکار کی ہمت نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ تمہیں کسی نام سے پکارتے تم اُن کے اشاروں پر ناچنے کو آمادہ ہو جاتیں۔ جیون سے سندر کر دیتی تھیں، اُسے بچانے کے کارن منٹش اپنا سب کچھ بلیدان کر دیتا ہے۔ پاپ

اور پن کی باتیں تو من کا بہلاوا ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا.....؟“

وہ اپنی جگہ کسمسے لگی۔ میری باتوں نے اُس کے وجود میں پچھل مچا دی تھی۔ تجربے کا تھا، وہ اتاڑی۔ میں نے اُسے اشارے سے قریب آنے کو کہا۔ اُس نے غور داسی کہا تھا، دیوتا کی بات ماننا اُس کا دھرم تھا۔ وہ شرماتی لجاتی میرے قریب آ کر قدموں میں بیٹھنے لگی۔ میں نے بازو تھام کر اُسے پہلو میں بٹھالیا۔ اُس کا قرب قیامت تھا۔ نہ چاہتا تو جنون کا مظاہرہ کر کے اُسے اپنی بانہوں کی گرمی سے پگھلا دیتا۔ وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ میں نے اُس کی زندگی بچائی تھی۔ وہ قرض چکانے میں زیادہ پر پیش نہ کرتی۔ لیکن میں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا، اُس کی زلفوں سے کھیلتا رہا، اُسے لبھانے کی باتیں کرتا رہا۔ ہمارے درمیان سے تکلف کی دیواریں سرکنے لگیں۔ اُس کا اثر بحال ہوا تو وہ بھی پرت پرت کھلنے لگی۔ مجھے اپنے اور نارنگ سنہا کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کرتی رہی۔ میں نے فضائی سفر کے دوران ملاقات کا ذکر دوبارہ چھیڑا۔ اُسے پھر بڑے یقین سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں الجھنے لگا۔ لیکن اُس کی باتوں نے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہونے دیا۔

انکارانی نے غلط نہیں کہا تھا۔ ٹرین کسی اسٹیشن پر نہیں رکی۔ دہلی کا اسٹیشن قریب آنے والا تو وہ میرے سر پر واپس آ گئی۔ بڑی چاق و چوبند دکھائی دے رہی تھی۔

”سفر کیسا گزرا جمیل.....؟“ اُس نے امریتا کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ابھی منزل دُور ہے.....“ میں نے سنبھل کر کہا۔

”اچھا کیا جو تم نے جلد بازی سے کام نہیں لیا۔“ وہ یلخت سنجیدہ ہو گئی۔ ”باہر حالات بڑے نازک ہو گئے ہیں۔ ہر طرف ہنگامہ ہو رہا ہے، گاڑی کا درمیانی اسٹیشنوں نہ رُکنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ مسافروں میں بھی افراتفری پھیل گئی ہے، ریلوے کے اگلے سرکھار ہے ہیں۔ اُن کے لئے اوپر والوں کے سوالات کا کوئی جواب دینا مشکل ہے۔ خیالی گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ انجن کا بریک فیل ہو گیا جس کا انجام تباہی ہوگا، کچھ سرکاری افسر اسے گاڑی کے انغواء کا نام دے رہے ہیں۔ شخص پریشان ہے۔ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی، چاروں طرف تہلکہ مچا ہوا ہے۔ ٹیلیفون کھڑکھڑائے جا رہے ہیں، اخبار نویسوں کے ہاتھ ایک دلچسپ سرخی آ گئی ہے۔“

سے زیادہ نارنگ سنہا پریشان ہے۔ وہ اس وقت دہلی کے اسٹیشن پر کسی زخمی شیر کی طرح ٹھہلتا پھر رہا ہے۔ فوج کا ایک دستہ بھی بلالیا گیا ہے، گاڑی کو روکنے کی خاطر مختلف انتظامات کئے گئے ہیں..... گاڑی رُکے گی تو سب کی توجہ تمہارے اپارٹمنٹ کی طرف ہوگی۔ نارنگ کی وجہ سے کسی کو مسافروں کی نہیں، صرف امریتا کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ تم ہیر و بن جاؤ گے۔ جس گروہ نے امریتا کو انغواء کرانے کا کام سرانجام دیا تھا اُن کے درمیان بھی کھلبلی مچی ہے۔ نارنگ کو امریتا کے محافظوں کے قتل کی اطلاع مل چکی ہے۔ اُس نے کسی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ دل ہی دل میں منصوبے بنا رہا ہے۔ بڑا گھاگ آدمی ہے۔ تمہیں ایک بات اور بتا دوں، نارنگ کے بنگلے میں اس وقت کئی جفاوری پنڈت جمع ہیں، وہ بھی اپنے اپنے جنتر مंत्र آزار رہے ہیں۔ ان پنڈتوں میں نول کشور کا ایک نائب بھی ہے۔ نارنگ اُس پر بڑا اعتماد کرتا ہے۔ اُسے نوری طور پر ہر دوار سے ایک مخصوص طیارہ بھیج کر دہلی بلالیا گیا ہے۔ تم ذرا دُور اندیشی سے کام لینا۔ نارنگ کا اعتماد جیتنے کے ساتھ ساتھ تم پنڈت نول کشور کے نائب کو جنتر رسید کر کے اُسے بھی اپنی طاقت کا احساس دلا سکتے ہو.....“

میں انکارانی کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ امریتا میرے قریب ہی بیٹھی تھی۔ جس شخص کے ہاتھ پیر جکڑے ہوئے تھے، وہ ہوش میں آ چکا تھا۔ اُس نے منہ سے کوئی آواز نہیں نکالی، حیرت سے آنکھیں پھاڑے چھت کو گھور رہا تھا۔ پنڈت نول کشور کا نام سن کر میرے اندر دہلی چنگاریاں پھر بھڑکنے لگیں۔ میں نے طے کر لیا کہ اُس کے نائب کو بڑی اذیتاں موت سے دوچار کروں گا۔ ہر دوار پہنچنے سے پہلے یہ میرے لئے ایک نیک شگون ہوتا۔ دشمن کی صفوں میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی.....!

کچھ دیر بعد گاڑی دہلی کے پلیٹ فارم پر رکی۔ میرے کپارٹمنٹ کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ یکے بعد دیگرے چار کمانڈوز رائفل تھامے حیرت انگیز پھرتی سے دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ انہوں نے مجھ پر رائفل تان کر ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا۔ میں اطمینان سے بیٹھا رہا۔ امریتا اٹھ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ تنی ہوئی رائفلوں کا رخ زمین کی طرف ہو گیا۔ کمانڈوز نے امریتا کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کچھ نہ کچھ ضرور بھانپ لیا تھا۔ کھلے دروازے سے باہر پلیٹ فارم پر دُور دُور تک صرف دردیوں میں ملبوس مسلح افراد نظر آ رہے تھے۔ ایک کمانڈو نے لپک کر اُن دونوں بد معاشوں کے سر پر پوزیشن سنبھال لی جس

میں سے ایک پرلوک سدھار چکا تھا۔ دوسرے نے صورت حال کی نزاکت محسوس کر کے اپنے ہونٹ دانتوں تلے بھینچ لئے تھے۔ دو کمانڈرز کی نظریں مجھ پر اور امریتا پر مرکوز تھیں۔ چوتھے کمانڈر نے دروازے پر پہنچ کر سیدھے ہاتھ کا اٹکھٹا فضا میں بلند کر کے جھوٹا کنٹرول میں ہونے کا مخصوص اشارہ دیا تو سب سے پہلے نارنگ سنہا اندر داخل ہوا۔ اُس نے دھڑا اور کرتے پہن رکھا تھا، آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک موجود تھی۔ پہلی ہی نظر میں وہ مجھے نہ آور شخصیت کا مالک محسوس ہوا۔ امریتا دوڑ کر باپ کے سینے سے لگ گئی۔ نارنگ کے چہرے کا تناؤ بتدریج کم ہونے لگا۔ وہ رکا نہیں، امریتا کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گیا۔ دونوں کمانڈرز نے پھر رائفل تان لی۔ انکا تیزی سے میرے سر سے اتر گئی۔

جو کچھ ہوا، آنا فانا ہوا۔ نارنگ کے جانے کے بعد اور کئی باوردی افسران ڈبے میں آ گئے۔ وہ صورت حال سمجھنے کی کوششوں میں مصروف تھے جب ایک فوجی افسر تیزی سے بھاگتا ہوا ڈبے میں آیا، مجھ سے کہنے لگا۔ ”مہاراج، آپ کو متری جی نے یاد کیا ہے۔“ گاڑی میں بیٹھے آپ کی راہ تک رہے ہیں۔“

میں خاموشی سے سید کی لاشی تھامے اٹھا۔ سب کی نگاہیں میری اصلیت جاننے کی خاطر بے چین ہو گئیں۔ میں اُن کے درمیان سے گزرتا ہوا باہر آیا۔ فوجی افسر میری رہنمائی کرتا ہوا پلیٹ فارم کے باہر کھڑی فلیگ کار (FLAG CAR) تک لے گیا۔ باوردی ڈرائیور نے اگلی نشست کا دروازہ کھولا، میں خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پچھلی نشست پر امریتا اپنے باپ کے سینے سے لگی بیٹھی کچھ سرگوشیاں کر رہی تھی۔ نارنگ کا چہرہ گرگٹ کی طرح رنگ تبدیل کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے اندر آ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی چل پڑی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا.....!

نارنگ کی سرکاری کوٹھی پر اُس کے اہلکاروں نے میرا خاطر خواہ استقبال کیا، مجھے کوٹھی کے خاص مہمان خانے میں جگہ ملی جبکہ پنڈت پجاریوں کو انکیسی میں ٹھہرایا گیا تھا۔ شام کی چائے مجھے میرے کمرے میں پہنچائی گئی، لیکن رات کے کھانے پر میرا بلاوا آ گیا۔ میں نے سید کی لاشی کو اس وقت بھی ساتھ رکھا۔ ڈرنیبل پر نارنگ اور امریتا کے علاوہ ایک اہمیزہ کی پر وقار عورت بھی موجود تھی۔ امریتا اور اُس کے چہرے کے نقوش میں بڑی مماثلت تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مسز نارنگ ہوگی۔

ملازموں نے کھانا پیش کیا۔ نارنگ خلاف توقع بہت خاموش تھا۔ اُس کے چہرے کے ہڈیاں اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ اُسے امریتا کے صبح سلامت گھر آ جانے کی خوشی ضرور تھی، لیکن وہ اپنے دشمنوں کے بارے میں اس وقت بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اُسے تفصیل سے دیکھا۔ وہ قابل رشک صحت کا مالک تھا۔ اُس کی نظروں میں سمندر جیسی گہرائی تھی جس کے اندر ہزاروں طوفان مچل رہے تھے..... وہ زیادہ باتونی بھی نہیں تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر گفتگو کرنے کا عادی تھا۔ جبکہ اُس کی بیوی اوشا کماری ہر شخص سے بہت جلدی گھل مل جانے کی عادی تھی۔ اس وقت بھی وہ مجھ سے کرید کرید کر امریتا کے انواء کی تفصیل معلوم کر رہی تھی۔

امریتا بتا رہی تھی کہ وہ دونوں بدمعاش مسلح تھے، ہٹے کئے تھے لیکن تم نے انہیں اس طرح قابو کر لیا جیسے کوئی سپیرا اپنے سے زیادہ طاقتور اور زہریلے سانپوں کو قابو کر لیتا ہے..... مجھے بتاؤ، یہ سب کچھ کس طرح ممکن ہوا.....؟“

”سپیروں کی طرح میرے پاس بھی یہ بین موجود ہے۔“ میں نے سید کی لاشی کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس کے علاوہ بلوانوں کی سنگت میں بھی بیٹھا اٹھا ہوں۔ اُن سے بھی کچھ جنتر منتر سیکھے ہیں.....“ میں نے آخری جملے کی ادائیگی میں انکساری سے کام لیا۔

”ممی، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مہاراج گرو پر تپ سے بھی واقف ہیں۔“ امریتا نے بیچ میں لقمہ دیا۔ ”اگر یہ نہ ہوتے تو شاید وہ دونوں.....“

”بے بی.....“ نارنگ نے امریتا کو ٹوکا۔ اُس کا لب و لہجہ بڑا خشک اور کھردرا تھا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ جو ہو چکا اسے بھول جاؤ.....“

”جو بدمعاش زندہ ہاتھ آیا ہے، اُس نے کچھ اُگلایا ابھی تک زبان پر تالے ڈال رکھے ہیں؟“ اوشا کماری نے شوہر سے پوچھا۔

”ایجنسیاں اپنا کام کر رہی ہیں۔“ نارنگ نے اُلجھ کر جواب دیا۔ ”تم اپنی مصروفیات گھر کے کام کاج تک ہی محدود رکھا کرو۔“

انکا میرے سر پر تھی۔ وہ بار بار آتی جاتی رہی تھی۔ اُس کی زبانی مجھے بہت ساری معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ جو غنڈہ زندہ ہاتھ آیا تھا مجھے اُس کے انچا کا بھی علم ہو گیا۔ اُس نے کچھ ہی دیر پہلے وہ مختصر سا زہریلا کپسول کھا کر خودکشی کر لی تھی جو اُس کی مصنوعی

ڈاڑھ کے اندر پوشیدہ تھا۔ اور بھی بے شمار باتیں میرے علم میں آچکی تھیں۔

”تم جس غنڈے کا ذکر کر رہی ہو وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“ میں نے اوشا کمار کی کو مخاطب کیا۔ میں یہ بھی جانتا چاہتا تھا کہ نارنگ کو اس حادثے کی اطلاع مل چکی تھی یا وہ ابھی تک لاعلم ہی تھا۔

”کیا کہا آپ نے.....؟“ نارنگ نے ہاتھ میں دبے ہوئے نوالے کو واپس پلیٹ میں ڈال کر میری طرف چونک کر دیکھا۔ ”کون مر گیا.....؟“

”وہی.....“ میں نے ٹھوس آواز میں جواب دیا۔ ”ایجنسیاں جس کی اکھاڑ پچھاڑ میں اپنا سہہ برباد کر رہی تھیں۔“

”آپ..... آپ میرے ساتھ آئیں مہاراج.....“ نارنگ کھانے سے ہاتھ کھینچ کر اٹھ گیا۔ مجھے بھی اُس کی پیروی کرنی پڑی۔ وہ مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ کچھ دیر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتا رہا، پھر خشک آواز میں بے حد سنجیدگی سے بولا۔ ”میری اطلاع کے مطابق آپ نے ایک بل کے لئے بھی اپنے کمرے سے باہر قدم نہیں نکالا، پھر وہ بات آپ کو کس طرح معلوم ہوگئی جو ابھی تک مجھے بھی.....“

نارنگ اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا۔ کمرے میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے لپک کر ریسپور اٹھا لیا۔ پھر دوسری جانب سے اُسے جو اطلاع ملی اسے سن کر وہ دیوانہ ہو گیا۔ اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا، آنکھوں سے درندگی جھانکنے لگی۔

”تفتیشی افسران کو جوتے مار کر ملازمت سے برطرف کر دو، سب نکتے ہیں۔ حرام کی روٹیاں توڑتے ہیں۔“ وہ بڑی گرجدار آواز میں اپنا حکم سنارہا تھا۔ سب کو ایک ہی جگہ ہاؤس اریسٹ کر دو، وہاں کسی پرندے کو بھی پر مارنے کی اجازت نہیں ملنی چاہئے۔ جب تک بے بی کے سلسلے میں فائل رپورٹ میرے سامنے نہ آجائے تمام خبریں ٹاپ سیکٹ ہوں گی۔ کسی کو ہوا بھی نہ ملے۔“

فون پر گفتگو کرنے کے بعد ایک لمحے وہ اپنی جگہ کھڑا بیچ و تاب کھاتا رہا، پھر میرے قریب آ کر بولا۔

”مہاراج..... تم امریتا کے اغواء کے سلسلے میں اور کیا کچھ بتا سکتے ہو.....؟“

”اب تک جو پنڈت پجاری یہاں سر جوڑے بیٹھے جنم کنڈی بنا رہے ہیں، بڑے

اُونچے سُروں میں بول رہے تھے، اُن کا کیا کہنا ہے؟“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تو نارنگ بل کھانے لگا۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ”اپنی اپنی پیاریوں میں ہاتھ ڈال کر کچھ نہ کچھ تو کھوجا ہوگا۔ اور وہ جسے خاص طور سے ہر دور سے اُڑن کھولا بھیج کر بلایا گیا ہے، وہ کیا چنکار دکھا رہا ہے؟ کیول تن پر چندن تھوپ لینے، ماتھے پر آڑی ترچھی ریکھائیں کھینچ لینے سے بات نہیں بنتی بالک.....“ میں نے نارنگ کو اپنی برتری کا احساس دلانے کی خاطر ٹھوس آواز میں کہا۔ ”جو گرجتے ہیں وہ برسنے کی شکتی نہیں رکھتے۔ مداری کی طرح کھیل تماشا دکھانے والے دھرتی کے بھیتر نہیں جھانک سکتے ہیں۔ جو دم نہ سادھ سکے وہ ساگر کی تہوں میں جا کر وہ سیپ نہیں پاسکتا جس کے اندر انمول موتی ہوتا ہے.....“

نارنگ کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ انکا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے سامنے اُونچی آواز میں بولنے والوں کو برداشت نہیں کرتا۔ اُس کی تیز نظریں میرے اُوپر کسی بھوکے گدھ کی طرح منڈلا رہی تھیں۔ وہ میری وحشتوں، میرے جنون کی کیفیتوں سے ناواقف تھا۔ میں نے لوہے کو تپا کر ایک کاری ضرب اور لگائی۔

”مجھے لال پہلی نظروں سے مت گھور و بالک، تمہاری جھولی میں کیول ایک ہی کھرا سونا تھا، اُسے دُرگا کا عتاب نکل گیا۔ میں گرو پرتاپ کی بات کر رہا ہوں..... وہ زندہ ہوتا تو آنکھ موند کر امریتا کو اغواء کرنے والوں کی ساری کتھاسنا دیتا۔“ میں دبنگ آواز میں بولتا رہا۔ ”تم نہیں جانتے، میں بتاتا ہوں۔ گرو پرتاپ نے مجھے بچانے کی خاطر اپنا جیون بھیٹ چڑھا دیا، بمبئی کی پولیس نے کالی داس اور پنڈت اوم پرکاش کے قتل کا الزام لگا دیا تھا مجھ پر۔ میری چڑی پر کوڑے برسائے گئے۔ میں نے سانس روک لی۔ تھک ہار کر انہوں نے میرا معاملہ عدالت پر چھوڑ دیا۔“ میں نے حقارت کا اظہار کیا۔ ”تم نے بمبئی کے ڈی آئی جی روی شکر کا نام ضرور سنا ہوگا۔ اُس نے ایک گیانی دھیانی پنڈت پر بھودیال سے مجھے ٹھکانے لگانے کا سودا کیا، جانتے ہو پھر کیا ہوا؟ پر بھودیال جل کر کوئلہ ہو گیا۔ بات بادی گئی۔ لیکن اب روی شکر کے ستارے بھی بھونچال کی پلیٹ میں آگئے ہیں، تم نے اخباروں میں ضرور پڑھا ہوگا۔“

نارنگ کی آنکھیں شعلے اُگل رہی تھیں۔ مجھ سے پیشتر شاید کسی نے اُس کے سامنے سینہ تان کر اتنی اُونچی آواز میں بات نہیں کی ہوگی۔ شاید امریتا نے اُسے میرے بارے میں جو

”میری زبان پر بھروسا کرے گا یا اپنی استری (بیوی) کی زبان سے سننا پسند کرے؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ کسمسانے لگا۔

”اوشا کو میں گھر کے سوا کسی اور معاملے میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتا۔“ اُس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”میں تیری نہیں..... اپنی بات کر رہا ہوں۔“

”کیا مطلب.....؟“ نارنگ چونکا۔

مجھے جواب دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اوشا کماری دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ وہ انکا کی پراسرار قوتوں کے زیر اثر تھی۔ نارنگ نے اُسے دیکھ کر برا سامنہ بنایا۔ وہ اوشا کو واپس جانے کے لئے یقیناً سخت زبان استعمال کرنے کے بارے میں غور کر رہا تھا لیکن اُسے موقع نہیں ملا۔

”میری بات سنو نارنگ، میں تمہیں بتاتی ہوں کہ امریتا کس سازش کا شکار ہوتے ہوئے بچ گئی۔ وہ دشمنوں کے ہاتھ لگ جاتی تو تم بھی اُن کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتے۔ اُن کا کہنا نہ مانتے تو وہ امریتا کے پھول جیسے شریکِ گرد و نڈالتے..... تم جو سپنے دیکھ رہے تھے وہ بھی ادھر رہے رہ جاتے۔ بہت کچھ نشت ہو جاتا.....“

اوشا کماری کسی ریکارڈ کی طرح بھتی رہی۔ اُس نے امریتا کے اغواء کی وہ تمام تفصیل بتا دی جو انکارانی کی دریافت تھی۔ میں سینہ تانے کھڑا سید کی لاشی کو آہستہ آہستہ زمین پر مارتا رہا۔ نارنگ ٹپٹانے لگا۔ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، حیرت سے آنکھیں پھاڑے کھڑا ٹکٹکی باندھے اوشا کو دیکھتا رہا جو کسی معمول کی طرح سپاٹ لہجے میں بول رہی تھی۔ کہانی پوری ہوئی تو وہ جس انداز میں اندر آئی تھی اسی طرح اُلٹے قدموں واپس چلی گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ کمرے میں صرف میں اور نارنگ باقی رہ گئے۔ میں معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

”مہاراج، میں تم سے ایک فنی کروں گا۔“ نارنگ، انکارانی کے کہنے کے مطابق میرے سامنے ہاتھ باندھ کر بولا۔ ”جو ڈھکی چھپی باتیں تم نے اوشا کی زبانی کہلوا دیں، اس کی بھنک کسی اور کو نہیں ہونی چاہئے.....“

”حکم دے رہا ہے.....؟“ میں نے نظریں ترجھی کیں۔

کچھ بتایا تھا اسی کی وجہ سے وہ مجھے برداشت کر رہا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اُسے ملازم ڈنڈا ڈوٹی کر کے اب تک کوشی سے باہر پھینک چکے ہوتے۔

”مجھے دُور جانا ہے بالک.....“ میں نے اُسے خاموش دیکھ کر بے پرواہی سے کہہ دیا۔ ”مجھے اپنے چکروں میں مت الجھاؤ، مجھے جانے دو۔ ہر دو دروازے آنے والے پنڈت شیوا روک لو۔ باقی سب کی چھٹی کر دو۔“ میں نے شیوا کے سلسلے میں سرسری انداز میں کہا۔ ”وہ دس پندرہ دن اٹھک بیٹھک لگائے تو شاید تمہاری کوئی سہائتا کر سکے۔ سمجھ رہے ہو، میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”زندہ باد جمیل..... زندہ باد۔“ انکارانی نے بڑے ستائشی انداز میں میری تعریف کی۔ ”اسی طرح ڈٹے رہو۔ میں اوشا کماری کے سر پر جا رہی ہوں۔ تم دیکھنا ابھی یہ نارنگ تمہارے آگے ہاتھ باندھے کھڑا ہو گا۔“

انکا میرے سر سے اُتر گئی۔ میں اوشا کماری کے حوالے پر اُس کی بات کا مفہوم سمجھ گیا۔ میری نظریں نارنگ کے چہرے پر جمی رہیں۔ وہ بھی کسی چٹان کی طرح اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔ ”اتنے دھیان سے کیا دیکھ رہے ہو؟ میں یہاں خود سے نہیں آیا۔“ میں نے اس بار قدرے مدہم آواز میں کہا۔ ”یہ اتفاق ہی تھا جو میں بھول سے غلط اپارٹمنٹ میں بیٹھ گیا۔ میری بھول امریتا کے کام آ گئی۔ وہ سندھ، بھولی بھالی معصوم لڑکی ہے۔ کسی نازک پھول جیسی۔ اب اُس کی رکشا پر زیادہ دھیان دینا۔ سانپ کی دُم پیر تلے آ جائے تو وہ پلٹ کر ڈسنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ سمجھ رہے ہو میرا مطلب؟ دشمنی کا کھاتا ایک بار کھل جائے تو آسانی سے بند نہیں ہوتا۔ تمہارے دشمن بھی چین سے نہیں بیٹھیں گے۔“

”تم کیا جانتے ہو اُن کے بارے میں جنہوں نے امریتا پر ہاتھ ڈالنے کی غلطی کی تھی؟“ نارنگ نے زبان کھولی۔ اُس کے لہجے میں گھمنڈ اور غرور کی آمیزش تھی۔

”دھیرج سے کام لے بالک.....“ میں نے ہاتھ اٹھا کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”زیادہ چتر چالاک بننے کی بھول کرتے ہیں وہ زیادہ گھائے میں رہتے ہیں۔ سسے کا انتظار کرو۔ سب کچھ تیرے سامنے آ جائے گا۔“

”مہاراج.....“ نارنگ پھر بل کھانے لگا۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ کھل کر کہو، کیا جانتے ہو میرے دشمنوں کے بارے میں؟“



”نہیں مہاراج..... نہیں۔“ وہ گڑگڑانے لگا۔ ”میں تمہیں حکم نہیں دے رہا۔ تمہاری شرم پر م پار ہے۔ تم اوپر سے کچھ نظر آتے ہو لیکن تمہارے اندر کا روپ دیوتاؤں سا ہے۔ آج سے مجھے اپنا سیوک ہی سمجھو۔ مجھ سے کوئی بھول ہو تو شکر کر دینا۔ میں تمہیں پناہ نہیں سکا تھا۔“

”میرے سلسلے میں اپنی زبان بھی بند ہی رکھنا۔“ میں نے سرد آواز میں کہا۔ ”میں جیہ کے بکھیروں میں الجھنا پسند نہیں کرتا۔ جن دھرماتماؤں کو بلایا ہے ان سے بھی کچھ نہ کہنا۔“ میں ان سب کی چھٹی کئے دیتا ہوں۔ تم کوئی چننا مت کرو۔“

”پنڈت شیوا کو روک لے۔“ میں نے سرسراتے انداز میں کہا۔ ”مجھے اُس سے کچھ حساب کرنا ہے۔“

”جو آگیا (حکم) مہاراج.....“

نارنگ کا سارا کلف اتر گیا۔ وہ میرا بے دام غلام بن گیا۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ نارنگ نے مجھ سے کھانا کھانے کا اصرار کیا۔ میں نے اُس کی درخواست رد کر دی۔ دن میں کئی بار اوشا کماری اور امریتا میری خیریت دریافت کرنے آتی رہیں۔ میں نے آخری بار امریتا کو پھر ہوائی سفر کے بارے میں ٹٹولا۔ اُس کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ سفر کے دوران مجھ سے نہیں ملی تھی۔ اب جبکہ میرے اور اُس کے درمیان حجاب اٹھ چکا اُس کا دروغ گوئی سے کام لینا میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں نے بھی طے کر لیا کہ اس موضوع پر دوبارہ کوئی گفتگو نہیں کروں گا۔ امریتا کے مقابلے میں اوشا کماری مجھ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس کی باتوں کا انداز، بار بار کھل کر قہقہے لگانا، آنکھوں میں آنسو چھلکا کر ذمہ معنی باتیں کرنا۔ انکارانی نے مجھے بتایا کہ نارنگ کے مخصوص ڈرائیور کے علاوہ وہ بھی کئی جوان ملازم اوشا کماری کے جال میں پھنس کر پھڑپھڑا چکے ہیں۔ انکار کی جرأت میں تھی؟ جو زبان کھولتا اُسے مروا دیا جاتا تھا۔ قصور اوشا کماری کا بھی نہیں تھا۔ نارنگ مصروف آدمی تھا۔ شادی کے بعد امریتا کی پیدائش تک اُس کی دلچسپی قائم رہی، پھر بندہ کم ہوتی گئی۔ اُس کی دل بستگی کے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ اوشا کماری نے کچھ عرصہ نارنگ کی واپسی کا انتظار کیا، پھر اُس نے بھی وقت گزارنے کی خاطر راستے تلاش کر لئے۔ نارنگ نے اُسے محض گھر تک محدود رکھا۔ اس لئے وہ ملازموں پر ہاتھ صاف کرتی رہی۔

کچھ پنڈت پجاری بھی اُس کے آشرم میں گھڑی دو گھڑی سستا کر اپنی پیاس بجھا لیتے تھے۔ ہارنگ سخت غیر طبیعت کا مالک تھا، اُسے اوشا کماری کی رنگ رلیوں کی خبر نہیں تھی ورنہ اپنے حریفوں کی طرح اُسے بھی کب کا ٹھکانے لگوا چکا ہوتا۔

انکاران گن لیتی رہی۔ کوئی خبر ہوتی تو میرے کانوں تک پہنچا دیتی۔ شام کو میں سو کر اٹھا اور اُس نے مجھے بتایا کہ نارنگ نے پنڈت شیوا کے علاوہ دیگر تمام پنڈت پجاریوں کی چھٹی کر دی ہے۔ انیکسی میں اب شیوا کے سوا کوئی اور نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر حاضری ضروری سمجھی۔ انکار مزار کے باہر رُک گئی۔ میں نے درگاہ میں قدم رکھا تو میری حالت غیر ہونے لگی۔ جسم کے رونٹے کھڑے ہو گئے۔ بدن تھر تھرانے لگا، کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ ایک جلیل القدر بزرگ کی درگاہ تھی، میرا بال بال گناہوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں شاید اب اس قابل بھی نہیں رہ گیا تھا کہ کسی بزرگ کے آستانے پر دو گھڑی سستا سکوں۔ میرے لئے قدم جما کر کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔

میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگ گئی۔ صرف میں تنہا نہیں تھا، اور بھی بے شمار پرانے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، اپنے گناہوں سے توبہ کر رہے تھے، خدا کی بارگاہ میں گڑگڑا کر دُعائیں مانگ رہے تھے۔ مزار مبارک کے قریب ہاتھ باندھے، سر جھکائے، نظریں نیچی کئے کھڑے منت مان رہے تھے۔ اپنی کیفیت بیان کر رہے تھے، وسیلے کی بھیک مانگ رہے تھے۔ لوگوں کی کثیر تعداد ایک طرف قطار اندر قطار بیٹھی تلاوت کلام پاک میں مشغول تھی۔ مجھ گنہگار کو کچھ دیر ٹھہرنے کی اجازت مل گئی، یہی بہت تھا۔ میں مزار کی طرف منہ کئے اُلٹے قدموں باہر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ کسی سے ٹکرا گیا۔ میں نے معذرت طلب کرنے کی خاطر پلٹ کر دیکھا تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ سید مجذوب تھا..... خدا کا محبوب بندہ۔ وہ آنکھیں موندے، دُعا کے لئے دونوں ہاتھ بلند کئے فقیروں جیسے انداز میں جھکا کھڑا تھا۔ اُس کی پلکوں سے آنسوؤں کے قطرے ڈھلک ڈھلک کر گر رہے تھے۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھا، کسی اور دنیا کی سیر کر رہا تھا۔ میں اُس کے قریب ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی لائمی اس وقت میرے پاس تھی۔ میں نے پلکیں جھپکایا بند کر دیں، سید بہ نظر آ گیا۔ جمائے رہا۔ اندیشہ تھا کہ میں پلکیں جھپکائوں تو وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ جسے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ وقت گزرتا رہا، وہ لوگائے کھڑا دل کی مرادیں پار ہاتھ میں

اپنی باری کا منظر تھا۔ کچھ دیر بعد سید نے آنکھیں کھولیں تو میں اُس کے سامنے کھڑا ہوں۔  
مجھے دیکھ کر وہ چونکا، پھر مسکرا کر دبی زبان میں بولا۔

”یہاں بھی سودے بازی کرنے آ گیا..... جواری..... نوسر باز.....“  
 ”میری منزل قریب آ چکی ہے پیرو مرشد.....“ میں نے استدعا کی۔ ”میرے حق! دُعا کر دو۔“  
 ”سڑکوں کی صفائی شروع کر دے۔“

”وقت کم رہ گیا ہے.....“ میں نے عاجزی کی۔ ”تم میری انگلی تھام لو.....“

”آدھا تیر..... آدھا تیر.....“ سید کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا۔ ”ٹھٹھول کرتا ہے.....“

”میری حالت پر رحم کرو سید..... تم نے کبھی کھل کر میری بات نہیں سنی۔“ میں نے

کیا۔

”کسی کو ٹھے پر چڑھ جا..... بلندی مل جائے گی۔“ سید جیسے لہجے میں بولا۔  
 ”میں تنہا ہوں، وہ بے شمار ہیں۔ میں مر گیا تو میرا خون تمہاری گردن پر ہوگا.....“  
 ”پھر سڑھ کیلئے لگا؟ زبان کو تالا لگا لے۔“  
 ”اندھیرا بڑھنے لگا ہے۔ کسی وقت دم بھی گھٹ جائے گا۔ تم راستہ دکھا دو۔“ مل۔  
 منت کی۔

”کسی درخت سے اُلٹا لٹک جا..... بین بجانی چھوڑ دے۔“

”میری داستان ختم ہونے کا وقت قریب ہے سید، میں ہاتھ جوڑتا ہوں، جو کہنا ہے کر کہہ دو۔ تمہارے اشارے میری سمجھ میں نہیں آتے.....“ میں نے اُسے رحم طلب نظر سے دیکھا۔

”آندھی آرہی ہے.....“ اُس نے پلکیں جھپکانی شروع کر دیں۔ ”اکڑوں؟“  
 کلڑوں کوں کی آوازیں نکالا کر۔“  
 ”تم مجھے مرغا بنا دو، مجھے یہ بھی منظور ہے۔“  
 ”اوپر دیکھ..... اوپر.....“

میری نظریں ایک لمحہ کو اوپر اٹھیں، سید پھر مجھے جُبل دے کر نکل گیا۔ میں دروازہ نیل و مرام باہر آ گیا۔ انکا دوبارہ سر پر آ گئی۔ وہ کچھ وحشت زدہ سی لگ رہی تھی۔

لئے چندالوں کی پوری ٹولی جمع ہوگی۔ سب اپنی اپنی بانک رہے ہوں گے۔ ہر دوایہ

بھیجے والا خود دہلی میں موجود ہوگا۔ اسی نے شیوا کو باخبر کیا ہوگا۔ کالی کے مندر میں بیٹھے شیطانوں کے کانوں میں بھی اسی نے زہر پھونکا ہوگا۔ نول کشور کے لئے اب مہرے قیمتی تھے۔ اُس نے فوری طور پر شیوا کو واپسی کا حکم نامہ جاری کیا ہوگا۔ نارنگ مخصوص طیارہ بھیج کر شیوا کو طلب کیا تھا۔ شیوا کوئی پیادہ نہیں رہا ہوگا۔ میرے خلیفہ بساط بچھائی جا رہی تھی، اس پر شیوا کی حیثیت کسی فیل، رُخ یا گھوڑے جیسی ضروری چندرا کی موجودگی میں اُسے بہر حال وزیر نہیں سمجھا سکتا تھا۔

شیوا مارا جاتا تو نول کشور کی بازی کچھ ضرور کمزور ہو جاتی۔ میں بہت سارے انداز پر غور کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں انکارانی کا زبان نہ کھولنے کی مجبوری والا جملہ بھی تھا۔ میں نے اس کی وضاحت نہیں طلب کی، میں اُس کی مجبوریوں سے واقف تھا۔ بارہتا چکی تھی کہ پراسرار قوتوں کے درمیان بھی کچھ سمجھوتے ہوتے ہیں، کچھ حد بند ہوتی ہیں جس کی خلاف ورزی کچھ دیوی دیوتاؤں کی نظروں میں پسندیدہ نہیں سمجھی۔ شاید انکا نے کسی ایسی ہی مجبوری کے تحت وہ جملہ ادا کیا ہو۔ میرے لئے یہی کافی تھا کہ

نہ بوقت شیوا کی واپسی کی اطلاع مجھ تک پہنچا دی۔ وہ ہاتھ سے نکل جاتا تو مجھے ملال ہوتا۔ میرے پاس بھی بہت ساری قوتیں موجود تھیں۔ سب سے اہم سید ہند لاشی تھی جسے دیکھ کر پریتم لال جیسے مہان پنڈت کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

نہ حفظ ماتقدم کے طور پر ننڈا کے ایک عمل کا ورد کر کے خود کو جنتر منتر سے محفوظ کر لیا۔ میں سینہ تانے انیکسی میں داخل ہوا۔ شیوا کی خدمت کے لئے کئی ملازم موجود تھے۔ دیکھ کر وہ جھک جھک کر ڈنڈوت کرنے لگے۔ مجھے انیکسی کی بجائے کوشی کے مہان میں جگہ ملی تھی، ملازموں نے اسی سے میرے رتبے کا اندازہ قائم کر لیا ہوگا۔ بڑے کے ملازم ان پڑھ ہونے کے باوجود مالکوں کی نظریں پڑھ کر حسب مراتب کا خیال کے عادی ہوتے ہیں۔ ایک ملازم نے میرے دریافت کرنے پر شیوا کے کمرے کی

کردی۔ میں دندنا تا ہوا اندر داخل ہوا۔ شیوا ایک کمن ملازمہ کو گود میں بٹھائے کی باتیں کر رہا تھا۔ مجھے سامنے دیکھ کر چونکا۔ ملازمہ بے ترتیب لباس درست کرنے سے باہر نکل گئی۔ شیوا ایک جھکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے کچھ پڑھ کر اپنے آپ

لئے چندالوں کی پوری ٹولی جمع ہوگی۔ سب اپنی اپنی بانک رہے ہوں گے۔ ہر دوایہ بھیجے والا خود دہلی میں موجود ہوگا۔ اسی نے شیوا کو باخبر کیا ہوگا۔ کالی کے مندر میں بیٹھے شیطانوں کے کانوں میں بھی اسی نے زہر پھونکا ہوگا۔ نول کشور کے لئے اب مہرے قیمتی تھے۔ اُس نے فوری طور پر شیوا کو واپسی کا حکم نامہ جاری کیا ہوگا۔ نارنگ مخصوص طیارہ بھیج کر شیوا کو طلب کیا تھا۔ شیوا کوئی پیادہ نہیں رہا ہوگا۔ میرے خلیفہ بساط بچھائی جا رہی تھی، اس پر شیوا کی حیثیت کسی فیل، رُخ یا گھوڑے جیسی ضروری چندرا کی موجودگی میں اُسے بہر حال وزیر نہیں سمجھا سکتا تھا۔

شیوا مارا جاتا تو نول کشور کی بازی کچھ ضرور کمزور ہو جاتی۔ میں بہت سارے انداز پر غور کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں انکارانی کا زبان نہ کھولنے کی مجبوری والا جملہ بھی تھا۔ میں نے اس کی وضاحت نہیں طلب کی، میں اُس کی مجبوریوں سے واقف تھا۔ بارہتا چکی تھی کہ پراسرار قوتوں کے درمیان بھی کچھ سمجھوتے ہوتے ہیں، کچھ حد بند ہوتی ہیں جس کی خلاف ورزی کچھ دیوی دیوتاؤں کی نظروں میں پسندیدہ نہیں سمجھی۔ شاید انکا نے کسی ایسی ہی مجبوری کے تحت وہ جملہ ادا کیا ہو۔ میرے لئے یہی کافی تھا کہ

نہ بوقت شیوا کی واپسی کی اطلاع مجھ تک پہنچا دی۔ وہ ہاتھ سے نکل جاتا تو مجھے ملال ہوتا۔ میرے پاس بھی بہت ساری قوتیں موجود تھیں۔ سب سے اہم سید ہند لاشی تھی جسے دیکھ کر پریتم لال جیسے مہان پنڈت کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

اُس کی آنکھوں سے ایک شعلہ لپکا..... مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے سارے تن بدن میں آگ لگا دی ہو..... میں نے ارتکاز اور مراقتے کا عمل شروع کیا، شیوانے دوسرا وار کیا، اُٹا پاؤں اٹھا کر زمین پر مارا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ سید کی لاشی ہاتھ میں نہ ہوتی تو اندھے منہ زمین پر گرا ہوتا۔ شیوانے مجھے پکراتا دیکھ کر اپنے گلے سے ایک مالا اُتار کر زمین پر دے ماری۔ دانے بکھر گئے۔ اُن کی جگہ لاتعداد ناگئیں نمودار ہو کر میری طرف بڑھنے لگیں..... میں نے سید کی لاشی گھمانی شروع کر دی۔ ناگئیں اپنی اپنی جگہ تھم گئیں۔ اُن کا دحیرت انگیز طور پر بڑھنے لگا۔ میں نے ارتکاز کا عمل مکمل کر کے ناگوں کو تیز نظروں سے گھورا، اُن کے جسموں کو آگ لگ گئی۔ وہ خاک بن کر غائب ہو گئیں۔ میں نے اپنے گرد حصار کھینچی اور جم کر کھڑا ہو گیا۔ شیوا کی آنکھیں حیرت سے پٹ پٹانے لگیں۔ اُس کی نظروں نے غالباً میری قوتوں کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ اُس نے جھلا کر پے در پے وار کرنا شروع کر دیئے۔ میں کسی آہنی ستون کی طرح جما کھڑا رہا۔ اُس کے ترکش کے سارے تیر ختم ہو گئے تو وہ ہاپنے لگا.....! میں بخل سے کام نہیں لوں گا۔ شیوانے مجھ سے مرو بن کر مقابلہ کیا تھا۔ نامردوں کی طرح پشت دکھا کر بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اُس نے جوار کے تھے وہ بھی بھر پور تھے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو بولھلایا ہوتا۔ میرے پاس سید کی لاشی بھی تھی، ننڈا کی قوت بھی تھی، کلہ پ اور پریم لال کی آتمائیں بھی نا دیدہ طور پر ضرور ہم رکاب ہوں گی۔

”ٹک کیوں گئے شیوا.....؟“ میں نے ہانپتا دیکھ کر اُس کا مذاق اُڑایا۔ ”اتنی جلدی چیں بول دی؟ کچھ اور کھیل تاشہ دکھانا چاہتے ہو تو وہ ارمان بھی پورا کر لو۔ اس کے بعد میری باری ہوگی، تمہیں اپنا دفاع کرنا ہوگا.....“

”تم نے جو پوتر لاشی تھام رکھی ہے، اسے ایک طرف پھینک دو۔ میں آخری سانس تک تم سے ہار نہیں مانوں گا۔“ شیوانے دیکھ کر نچلا ہونٹ چبانا شروع کر دیا۔

”ایک شرط میری بھی ہوگی.....“

”وہ کیا؟“ اُس کی آنکھوں میں اُمید کی کرنیں چمکنے لگیں۔

”تم اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ کر میرے قدموں میں رکھ دو، میں لاشی ایک طرف بٹالوں گا۔“ میں نے زہر خند سے اُس کی احقانہ شرط کا مذاق اُڑایا۔

اپنے بھوش کی چتا کرنی چاہئے۔ سارے دن ایک سامان نہیں ہوتے۔“

”سنا ہے امر لال کا پتر چندرا، وندھیا چل کی پہاڑیوں سے واپس آ گیا ہے؟“ میں سرسراتے لہجے میں دریافت کیا۔

”ہاں۔ وہ بھی نول کشور مہاراج کی شرٹن میں ہے.....“ شیوا کا انداز کھردراتھا۔

”دونوں بلوان کب تک منڈل میں چھپے بیٹھے رہیں گے؟ کب تک کالی کے چروں، ڈنڈوت کریں گے؟“ میں نے حقارت سے پوچھا۔ ”تم بھی تو ایک ہی تھیلی کے پتے ہو۔ تمہیں تو اوش جان کاری ہوگی۔“

شیوا کے تیور بدلنے لگے۔ اُس کا چہرہ غصے سے تپنا لگا۔ خون کی گردش اُس کی نس سے نمایاں تھی۔ وہ بے حد طیش میں آچکا تھا۔ لیکن ابھی اُس نے حملہ کرنے میں نہیں کی۔ مٹھیاں بھیچنے کھڑا مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے اُسے کسی کے حکم کا انتظار کوئی طاقت اُس کے آڑے آرہی تھی۔ شاید وہ ذہنی طور پر پنڈت نول کشور سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اُسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھتا رہا۔ انکا میرے پر کسماتے ہوئے بولی۔

”تم کس بات کے منتظر ہو جمیل؟ دیر مت کرو، شیوا کو مار ڈالو۔ دشمن کو سنبھلنے کا موقع دنا شہمنڈی نہیں ہے۔“

”تم چپ چاپ تماشہ دیکھتی رہو انکارانی.....“ میں نے کہا۔ ”یہ پوری طرح ہیر قبضے میں ہے۔ میں اسے بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا، تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ اس کی لاش تحفہ نول کشور اور چندرا کے لئے جمیل احمد خاں کی طرف سے ایک تحفہ خاص ہوگا.....“ میں نے شیوا کو مخاطب کیا۔ ”منہ میں گھنٹکیاں ڈالے کیا سوچ رہے ہو؟ تمہیں تو میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگا۔ تمہارے گرد اور چندرا کے آنجہانی پتا امر لال نے تم سے بڑی تفصیل سے میرے بارے میں ایک ایک بات سے باخبر کیا ہوگا..... پھر وقت برباد کر رہے ہو؟ اپنی شہتی کا کوئی چٹکار دکھاؤ، جو جنتر منتر سیکھ رکھے ہیں وہ کس دن کا گے؟ پر لوک سدھار گئے تو ساری آتمائیں من ہی من میں رہ جائیں گی۔“

میرا اندازہ غلط نکلا، شیوا کو کسی ہدایت کا انتظار نہیں تھا۔ وہ اپنی قوتوں کو سمیٹ کر دل ہی دل میں کوئی جاپ شروع کر چکا تھا۔ پھر اُس کا سیدھا ہاتھ یکنخت فضا میں

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، میری بات کا مقصد سمجھ کر خاموش رہا۔ اُس کے پر بدستور خطرناک نظر آرہے تھے۔

”زنخوں جیسی باتیں کیوں کرتے ہو شیوا؟“ میں حقارت سے بولا۔ ”جہاں دوشل پیر لڑتے ہوں، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، وہاں بچوں جیسی شرطیں نہیں ہانپ جاتیں۔ محبت اور جنگ میں تو ہر حربہ استعمال ہوتا ہے، تم ایک لاشی سے خوفزدہ ہو گئے۔ تمہارے گرو نے یہی سکھایا تھا.....؟“

”وہ جے تمہاری ہوئی۔ میں ہار گیا۔“ شیوا نے تیز آواز میں کہا۔ ”فضول باتیں مت کر، میں اب بھی سینہ تانے مردوں کی طرح قدم جمائے کھڑا ہوں۔ مجھے مار دو۔ میں تم سے جیون کی بھکھا نہیں مانگوں گا۔“

”تمہاری مراد انگی مجھے پسند آئی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”تم مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرو، میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا۔“

”جیل.....“ انکا نے احتجاج کیا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ دشمن کو معاف کر دینا عقلمندانہ نہیں ہوگی۔“

”میں نے زندگی میں اور بھی بہت ساری حماقتیں کی ہیں۔“ میں نے انکا سے کہا۔ ”ایک غلطی اور کر لینے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟“

”کیا وچن لینا چاہتے ہو؟“ شیوا نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

”پنڈت نول کشور اور چندرا تک میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ اب یہ اچھل کود بند کر دیا۔ میں نے بے حد خطرناک لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”دوسرے بے قصہ پنڈت پجاریوں کو ایندھن بنانے سے میرے اندر کی جوالا اور بھڑکتی رہے گی۔ اُن سے کہہ دو کہ وہیں تو مندر اور منزل سے باہر آ کر کھلے میدان میں ایک بار مقابلہ کر لیں۔ سمجھ رہے؟“

میری بات.....؟“

”اگر گرو نے تمہاری بات سوینا کر کرنے سے منہ موڑ لیا تو.....؟“

”تو بھی میں ماسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ میں نے جھلا کر کہا۔ ”بدری نرائن نے کالی کے مندر میں پناہ لے کر زندگی بچانی چاہی تھی، آج وہ اس دھرتی پر نہیں ہے۔ املا بھی سینہ ٹھونک کر ہمارے بیچ کود پڑا تھا، اُسے بھی کالی کا مہان سیوک ہونے کا بڑا گھمبیر

بچہ کیا نکلا؟ میری کل دیپ نے اُس کے شریر کے بھی ٹکڑے کر کے نرک میں جھونک دیا۔

”میں تمہارا سندیس گروتک پہنچا دوں گا۔ ماننا نہ ماننا اُن کے اختیار کی بات ہے۔“

شیوا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے..... اب میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ..... میں تمہیں تمہارا بیون دان کرتا ہوں۔“ میں نے فیصلہ سنا دیا۔

شیوا خاموشی سے جانے لگا تو انکا جھلا کر بولی۔

”مجھے اجازت دو جمیل، میں اسے زندہ نہیں جانے دوں گی۔ تم غلطی کر رہے ہو.....“

”تم کوئی غلطی نہ کرنا.....“ میں نے انکا کو نیڑھی نظروں سے دیکھا۔ وہ تلملا کر رہ گئی۔

میں قدم اٹھاتا نیکی سے باہر آ گیا.....!!





انکا مجھ سے رُٹھ گئی تھی۔ وہ مجھ سے شاک تھی۔ میں نے شیوا کو واپس جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ میرا دشمن تھا۔ دشمن کے ساتھ محبت اور رحم کا برتاؤ کرنا عقلمندی کے منافی تھا۔ وہ مجھے یہی باور کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شیوا کے خاموشی سے واپس جانے کی اطلاع بھی مجھے انکا ہی نے دی تھی۔ وہ نول کشور کا کوئی خاص آدمی تھا۔ نارنگ نے امریتا کو اغواء کرنے والوں کا کھوج لگانے کی خاطر اُسے ہر دروازے سے طلب کیا تھا۔ قسمت مجھے درمیان میں لے آئی۔ میں راستے میں نہ آتا تو شیوا، نارنگ کی کوشش میں سب سے زیادہ اہم آدمی سمجھا جاتا۔ اُس کی پذیرائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جاتا۔ چھوٹے بڑے سب اُس کی آؤ بھگت میں لگے ہوتے۔ میرے آجانے سے اُس کی اہمیت ختم ہو گئی۔ انکا نے اوشا دیوی کو اپنا معمول بنا لیا۔ اُس کی زبانی امریتا کے اغواء کی کہانی سنوا دی۔ نارنگ ششدر رہ گیا۔ وہ اسے میرا کمال سمجھ رہا تھا۔ میں اور انکا الگ الگ نہیں تھے۔ بہر حال نارنگ میرا گرویدہ ہو گیا۔ میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ پنڈت شیوا کی اہمیت کوڑی کی رہ گئی۔ میں چاہتا تو دوسرے پنڈت پجاریوں کی طرح اُسے بھی نارنگ کی سرکاری کوشش سے باہر نکلا دیتا لیکن میں نے اُسے روک لیا۔ میں نے طے کیا تھا کہ شیوا کی لاش کے ٹکڑے نول کشور کو روانہ کروں گا، اُس سے بھیا نک انتقام لوں گا۔ میری وحشت میرے جنون میں کچھ کمی واقع ہو جاتی۔ نول کشور سوچ میں پڑ جاتا۔ اُس کے لئے صرف ”راستے باقی رہ جاتے، میرے راستے سے ہٹ جاتا۔ گتائی کی زندگی بسر کرنے کی خاطر کہیں پہاڑوں یا جنگلات میں روپوش ہو جاتا یا پھر کالی کے مندر سے باہر نکل آتا۔ میرے لئے دونوں ہی صورتیں ہر اعتبار سے فائدہ مند ہوتیں۔

میں نے انکا کے اطلاع دیتے ہی نارنگ کی کوشش تک پلٹ کر آنے میں کسی غفلت کا ثبوت نہیں دیا۔ میرے دل میں رحم کا کوئی جذبہ نہیں ابھرا۔ میں راستے بھر اُسے بھیا نک

موت سے دوچار کرنے کی بابت غور کرتا رہا۔ انکا اُسے نارنگ کی کوشش میں ایک کسن ملازمہ کی زلفوں میں الجھا کر آئی تھی۔ شیوا کے جنتز منتر کے پیر بھی دھوکہ کھا گئے۔ وہ بھی اُسے یہ نہ بتا سکے کہ موت ہر لمحہ اس سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ میں اُڑتا ہوا شیوا کے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے پہل نہیں کی، مجھے اپنی قوت پر ناز تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شیوا میرے مقابلے پر زیادہ دیر نہیں ٹک سکے گا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ وہ اپنے سارے جنتز منتر آزمانے کے بعد بھی اپنی جگہ ڈٹا کھڑا رہا۔ اُس نے اپنی شکست تسلیم کرنے میں بہانہ سازی سے کام نہیں لیا۔ اُس کا خیال تھا کہ میرے اور اس کے درمیان سید کی لاشی ایک واضح فرق تھی۔ وہ غلط فہمی کا شکار تھا۔ اُس کی نظریں ننذا کے راز کو نہیں پاسکتی تھیں۔ میری قوت کے بارے میں اُس کی آنکھیں گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ پہنچ جاتیں تو شاید وہ مقابلے کی حماقت بھی نہ کرتا، پہلے ہی اپنی ہار تسلیم کر لیتا۔ شکست کا اعتراف بھی بہادری کی دلیل ہے۔ وہ میرے رحم و کرم پر تھا، اُس نے کہا بھی تھا کہ میں اس کی زندگی کی کہانی ختم کر دوں، میں نے بھی یہی ٹھان رکھی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے دل نے مشورہ دیا کہ میں اُسے معاف کر دوں۔ اس دشمن کو بخش دوں جس کے دل میں میرے خلاف نفرتوں کا طوفان موجزن تھا۔ جو پنڈت نول کشور کے جتھے سے تعلق رکھتا تھا۔ جسے نارنگ نے بھی دوسرے پنڈت پجاریوں پر فوقیت دی تھی۔ وہ یقیناً میرے دشمنوں کی جماعت میں کسی بڑے رُتبے پر فائز رہا ہوگا۔

بہت کچھ ممکن تھا۔ بہت سی باتیں قرین قیاس تھیں۔ ایک بات واضح تھی، وہ میرا دشمن تھا۔ دشمنوں کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس حرامزادے نے مجھے تاریکی میں رکھ کر مجھ پر اچانک تازہ توڑ حملے شروع کر دیئے تھے۔ اس کی خصلت میں کہیں نہ کہیں کسی گندے خون کا دھل ضرور رہا ہوگا۔ مرد ہوتا تو میری طرح لکار کر حملے کا آغاز کرتا۔ میں ذرا کمزور پڑ جاتا تو وہ میری لاش پر کھڑا فاتحانہ انداز میں تعقیب بلند کرنے سے بھی دریغ نہ کرتا، میری ساری خود اعتمادی، سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ جنگ میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ جو موقع سے فائدہ اٹھا لے، جیت اُسی کی ہوتی ہے۔ سید کی لاشی نے سہارا نہ دیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ میرے قدم لڑکھڑا جاتے، مجھے سنبھلنے میں دیر لگتی، شیوا اس دوران شیر بنارہتا۔ بعد میں میرے جوابی حملوں سے اپنی شکست کا اعتراف کرتا۔

میں نے زندگی میں سارے قدم سوچ سمجھ کر نہیں اٹھائے۔ کئی بار کلدھپ کو بھی شکایت ہوئی کہ میں جذبات کی رو میں بہک جاتا ہوں۔ انکارانی بھی یہی شکوہ کرتی تھی کہ جنوں میں بہک کر میں بغیر سوچے سمجھے قدم آگے بڑھا دیتا ہوں، مصلحتوں کو نظر انداز کر دیتا ہوں، جوش میں آکر ہوش کھو بیٹھتا ہوں۔ پریتم لال بھی پیش گوئی کر چکا تھا کہ میں جل کے اندر غوطہ نہیں لگا سکوں گا، خود میں گواہ ہوں کہ میری جلد بازی نے کئی حسین مواقع ضائع کر دیئے۔ میں انسان ہوں، فرشتہ نہیں ہوں۔ میں نے غلطیاں نہ کی ہوتیں، کوتاہیوں کی حماقت نہ کی ہوتی تو میری زندگی کی المناک داستان کا اندازہ بیان کچھ اور ہی ہوتا۔ شاید کلدھپ بھی کالی داس کو دیئے ہوئے وجہ کی بھینٹ چڑھنے سے بچ جاتی۔ مجھے در بدر کی خاک نہ چھانی پڑتی۔ لیکن مقدر کے لکھے کو مٹانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری زندگی بڑی گناہ آلود رہی ہے، سید مجھ پر مہربان تھا، وہ اشاروں کنایوں میں مجھے راست قدم اٹھانے کی نصیحتیں کرتا تھا۔ میں کم فہم تھا، اس کی گہرائی تک پہنچنا میرے اختیارات کی بات نہیں تھی۔

شیوا جیسے دشمن کو معاف کرنا بھی شاید میری حماقت ہی تھی۔ وہ میرے اختیار میں تھا۔ اُس کا ترش خالی ہو چکا تھا، اُس نے اپنی شکست بھی تسلیم کر لی تھی۔ لیکن میں نے اُسے اپنا ایک پیغام پنڈت نول کشور اور چندرا تک پہنچانے کا وعدہ لے کر معاف کر دیا۔ انکا نے غرا کر شیوا کی طرف جھپٹنے کی کوشش کی، میں نے اُسے بھی سختی سے روک دیا۔ وہ ناراض ہو گئی۔ منہ پھلائے میرے سر پر بیٹھی رہی۔ میں اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

رات کے کھانے پر نارنگ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ میں نے اُس کی خوشی کی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ امریتا اغواء ہونے سے بچ گئی تھی، نارنگ نے اوشا کماری کی زبانی پوری کہانی سن لی تھی، شیوا بھی چلا گیا تھا۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ ایک رات اور اس چھت کے نیچے گزار کر نارنگ سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کر لوں گا۔

کھانے کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ امریتا مجھ سے بے تکلفی سے گفتگو کرتی رہی۔ اوشا کی شکاری نظریں میرے اوپر جال ڈالنے میں مصروف تھیں، میں کترا کترا کر اپنا بچاؤ کرتا رہا۔ انکارانی میرے سر پر چٹ لیٹی آسمان کی طرف گھورتی رہی۔ وہ بدستور مجھ سے اکھڑی اکھڑی نظر آ رہی تھی۔ نارنگ کے چہرے پر سرسریں رقص کر رہی تھیں۔

بڑا دُور اندیش اور گھاگ آدمی تھا، میں سمجھ رہا تھا کہ سب کی موجودگی میں وہ زبان نہیں کھولے گا۔ وہ اپنے سائے سے بھی محتاط رہنے کے اصول کا پابند تھا۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی ثابت ہوا، کھانے سے فارغ ہو کر وہ مجھے اپنی ساؤنڈ پروف لائبریری میں لے گیا جہاں پوری دنیا سے رابطہ قائم کرنے کے لئے مختلف لائسلی نظام موجود تھے۔ انکا مجھے بتا چکی تھی کہ لائبریری نارنگ کے لئے کوشی کی سب سے محفوظ ترین جگہ تھی، وہاں کسی پرندے کو بھی پر مارنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی لائبریری کے فرش سے ایک چور راستہ کوشی کے عقب میں بھی نکلتا تھا، اس کا علم بھی نارنگ کے سوا کسی اور کو نہیں تھا۔ اس لئے کہ چور راستے میں نارنگ کا ذہن اور غیر ملکی ماہرین فن کا ہاتھ شامل تھا۔ مقامی لوگوں کو اس کی بھنگ بھی نہیں تھی۔

لائبریری میں قدم رکھتے ہی میں نے خود کو نندا کی قوتوں سے لیس کر لیا۔ مجھے نارنگ کے دل میں جھانکنے کا موقع مل گیا۔ میں یہ کام انکارانی سے بھی لے سکتا تھا۔ وہ نارنگ کے سر پر چلی جاتی پھر اُس کی خوشی کا پورا احوال منٹوں میں مجھ تک پہنچا دیتی، نارنگ ہکا بکارہ جاتا۔ لیکن وہ اس وقت رُوٹھی ہوئی تھی، میں نے اُسے چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

میں نارنگ کے ساتھ لائبریری میں داخل ہوا تو خود کا دروازہ بند ہو گیا۔ نارنگ نے مجھے بڑی انکساری سے ایک آرام کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا تو وہ میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

”مہاراج.....“ اُس نے کہا۔ ”آج میں بہت خوش ہوں۔ میری خوشیوں کا اصل کارن تم ہو۔ تم نہ ہوتے تو مجھے کنارے تک پہنچنے کے لئے بڑے ہاتھ پیر مارنے پڑتے۔ تم نے ایک پل میں میری ساری چننا دُور کر دی۔ تم پہلے مل جاتے تو میں آج کہیں اور ہی ہوتا۔ یہ راج منتری کا استھان تو کانٹوں کی بیج ہے۔“ اُس نے مجھے بڑی عقیدت مند نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”میری نگاہوں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ پورے بھارت میں تم سے بڑا کوئی آدمی نہیں ہو سکتا۔ ایک گرد پر تاپ تھا لیکن وہ بھی اس بلندی تک نہیں پہنچ سکا جہاں تم نظر آ رہے ہو۔“

”کیا پالیا نارنگ.....؟“ میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ”بڑا خوش نظر آ رہا ہے؟“

”جن سور کے بچوں نے امریتا کو اغواء کر کے مجھے اپنے اشاروں پر ناپنے کے سنے دیکھے تھے، اب وہ نارنگ کی مٹھی میں ہیں۔ وہ اپنی باری پوری کر چکے، اب میں انہیں اپنا

کھیل دکھاؤں گا۔ وہ جیت جاتے تو میں تباہ ہو جاتا، ساری جنتا کے سامنے میرے شریک کپڑے اتر جاتے۔ اب میں انہیں ننگا کروں گا۔ ایک کے بدلے دس مارے جائیں گے۔ ساری دنیا تماشہ دیکھے گی۔“

”ایک بات کہوں بالک....“ میں نے پچھتے ہوئے پنڈت جیسا انداز اختیار کیا۔ ”دھیان سے سنے گا.....؟“

”تم آگیا دو مہاراج، سیوک تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کرے گا۔“

”کچھ دنوں کے لئے سرکار سے چھٹی لے کر باہر چلا جا۔ جب اندھیرے چھٹ جائیں تو واپس لوٹ آنا۔ اسی میں تیری بھلائی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں مہاراج.....؟“ اُس نے مجھے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”سُرنگ میں اترنا بڑے جان جوکھم کی بات ہے۔“ میں سنجیدگی سے بولا۔ ”کہیں چھت کرنے سے راستہ بند ہو جائے تو دم گھٹنے لگتا ہے۔“

”تم..... تم کیا کہنا چاہ رہے ہو.....؟“ نارنگ کی نگاہوں میں کئی رنگ بھلہلہانے لگے۔

”میں زیر زمین (UNDER WORLD) دنیا کی بات کر رہا ہوں نارنگ سنہا۔“ میں نے کھل کر کہا۔ ”جو لوگ تمہارے جال میں پھنس چکے ہیں، ان کی جڑیں بھی بڑی دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ تمہارے تجربہ کار لوگوں نے ہوشیاری سے کام لیا ہے، بڑی مچھلیوں کو ابھی تک یہ ہوائیں لگی کہ ان کے آدمیوں پر کس نے جال ڈالا ہے۔ وہ تہہ سے نکل کر کھلے ساگر میں کھوج لگانے کا کام شروع کر چکے ہیں۔ ایک ایک لہر کو کھنگالا جا رہا ہے۔ سن رہا ہے بالک میں کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں؟“

نارنگ دم بخود رہ گیا۔ بُت کی طرح ساکت و جامد کھڑا کچھ دیر مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے گھورتا رہا، پھر کسمسا کر بولا۔ ”تم اور کیا جانتے ہو مہاراج.....؟“

”وہ سب کچھ جو تو نہیں جانتا۔“ میں نے گہمیر لہجے میں جواب دیا۔ ”ابھی ساگر چڑھا ہوا نہیں ہے۔ سے تیرے ہاتھ میں ہے۔ تیرا دوسرے کنارے اتر جا۔ سمندری طوفان آ گیا تو بڑی تباہی ہوگی۔ کھارے پانی کی گوشت خور مچھلیوں کو ٹیٹھے پانی میں رکھنے کا دھیان دل سے نکال دے، انہیں ختم کر دے، خود باہر چلا جا۔ بانس رہا تو بانسری بھی ضرور بجے گی۔ میرا کہنا مان لے۔“

نارنگ نے فوراً ہی میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ دُور اندیش ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک ذہنیت کا مالک بھی تھا، اپنے پیچھے کوئی ثبوت چھوڑنا اُس کی سرشت کے خلاف تھا۔ اُس کے ذہن میں کسی کے خلاف ابھرنے والا معمولی خدشہ بھی مشکوک آدمی کی ہلاکت کا بہانہ بن جاتا تھا۔ اُس کی خاصیت ناگن جیسی تھی جو اپنے بچوں کو کھا جانے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ میں اُس کی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔

”کس وجہ میں گم ہے بالک.....؟“ میں نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

”تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہارا کہنا مان لوں گا۔“ اُس نے ڈھلے یقین حالت میں شرط رکھی۔

”شرط باندھ رہا ہے.....؟“ میں نے اُسے تیز نظروں سے گھورا۔

”نہیں..... میں بنی کر رہا ہوں.....“ اُس نے کینچل بدلنے کی کوشش کی۔

”جو چنتا تجھے بیا کل کر رہی ہے اسے من سے نکال دے، اگلے چندرما سے پہلے باہر چلا جا، موج میلا کر کے تین مہینے نکال دے، پھر واپس آ جانا۔“ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں کسی اور راستے کا مسافر ہوں، تیرے ساتھ نہیں جا سکتا۔ دھرم کرم اور دنیا داری میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تیری سمندر پٹری کا معاملہ نہ ہوتا تو میں ناگن نہ پھنساتا۔ سارے منش ایک جیسے نہیں ہوتے مورکھ، میں زبان بند رکھتا تو تیرے من میں بھی اٹھل پھٹل نہ ہوتی۔ تیرے ساتھ اور بھی کچھ لوگ بھونچال کی لپیٹ میں آ جاتے۔ نیکی کا بدلا بدی سے نہیں دیا کرتے..... سنا تو نے؟“

نارنگ میری دو ٹوک بات سن کر شپٹانے لگا۔ انکا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی خونخوار نظریں نارنگ کے چہرے پر جمی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں چنگاریاں چمکنے لگیں۔

”میں کل صبح چلا جاؤں گا۔“ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں نے تیری بدھی میں جو بات بٹھانے کی کوشش کی ہے اس میں تیرا ہی بھلا ہے، ماننا نہ ماننا تیرے اختیار میں ہے.....“

”مہاراج.....“ اُس نے سنبھل کر کہا۔ ”آج تک کسی نے نارنگ کی بات ٹالنے کی غلطی نہیں کی۔ میں تم سے بنی کر رہا ہوں، تم میرے ساتھ رہو گے تو میرا من شانت رہے گا.....“

”چھل کپٹ کی باتیں کر رہا ہے؟“ مجھے غصہ آ گیا۔ انکا کچھ کہے بغیر میرے سر سے اتر

گئی۔ دوسرے ہی لمحہ لائبریری کا خود کار دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تو نارنگ حیرت سے اُچھل پڑا۔ میں سمجھ گیا کہ انکارانی کی طرف سے نارنگ کے لئے وہ پہلی وارنگ تھی۔

”اور کچھ دیکھنا پسند کرے گا؟“ میں تیزی سے بولا۔ ”ہٹ جا میرے راستے سے، اور پچھتائے گا۔ میرا ہاتھ اٹھ گیا تو تجھے بھاگے راستہ نہیں ملے گا۔ وہ چور راستہ بھی تیرے لئے قبر بن سکتا ہے جس کے اوپر تو سینہ تانے کھڑا ہے۔ بول..... کیا فیصلہ ہے تیرا؟“

پھر نارنگ کا چہرہ خوف سے زرد ہو گیا۔ وہ زمین سے ایک فٹ بلند ہو چکا تھا۔ قمر کا نپٹے ہوئے اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”مجھے شاکر دو مہاراج..... تمہارا جب من چاہے چلے جانا، میں تمہیں روکوں گا نہیں۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے انکا کونٹے کی خاطر نارنگ سے سرد آواز میں کہا۔ ”دھرنی پرواپس آ جا، قدم جما لے، پھر کوئی کیننگی مت دکھانا۔ ورنہ سارا کھایا پیا باہر آ جائے گا.....“

میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا لائبریری سے باہر آ گیا۔ خود کار دروازہ جسے انکا کی پراسرار قوت نے کھولا تھا، دوبارہ بند ہو گیا۔ میں سیدھا اپنی خوابگاہ میں آ گیا۔ چند لمحوں بعد انکا بھی واپس آ گئی۔ وہ پھر چیت لیٹ کر چھت کو ٹنگتی باندھے گھورنے لگی، میں اُس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ وہ مستقبل میں پیش آنے والے حالات کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

پریتم لال نے اُسے جو قوتیں بخشی تھیں انہوں نے انکارانی کو بڑا قد آور بنا دیا تھا۔ میرا ذہن الجھ رہا تھا۔ رہ رہ کر شیوا کا خیال کلبلائے لگتا۔ میں نے یونہی ایک رسالہ اٹھا کر اُس کی ورن

گردانی شروع کر دی۔ میری نظریں رسالے پر جمی تھیں لیکن میرا ذہن بدستور شیوا کے سلسلے میں الجھتا رہا۔ میں پنڈت نول کشور اور چندرا کے بارے میں غور کرنے لگا..... شیوا کی زبانی

میرا پیغام سن کر اُن کا ردِ عمل کیا ہوگا.....؟ کیا نول کشور اپنی حرامزدگی سے باز آ جائے گا.....؟ چندرا کے ذہن میں امر لال کے انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی وہ سرد پڑ جائے گی.....؟ شیوا پر کیا گزرے گی.....؟ وہ اپنے اور میرے مقابلے کی داستان بیان کرے گا.....؟

کیا اس کی بات تسلیم کر لی جائے گی.....؟ ”نہیں.....“ میرے ذہن نے جواب دیا۔ ”پنڈت نول کشور نے میری موت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ وہ ایک عرصے سے پنڈت پجاری لال

اپنے جھنڈے تلے اکٹھا کر رہا تھا، اُن کے دل و دماغ میں میرے خلاف زہر بھر رہا تھا۔ اُسے کالی کا آشیروداد حاصل تھا..... کالی جسے طاقت کی سب سے بڑی دیوی سمجھا جاتا تھا

جس کو دیئے ہوئے وجن کی خاطر میری کلدیپ نے اپنی ہنستی مسکراتی زندگی کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ اُس کی حمایت نے نول کشور کے غبارے میں بھی ہوا بھری ہوگی۔ ایک شیوا کے بیان پر وہ نقطہ تا تحقیق اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائے گا۔ چندرا بھی اپنی جوانی کے زعم میں اونچے اونچے خواب دیکھ رہا ہوگا۔ وہ مارنے یا مر جانے کا فیصلہ کر چکے ہوں گے۔ پریتم لال کی آتما نے جو کہا تھا وہ غلط نہیں ہوگا.....“

میں تادیر اپنے آپ سے الجھتا رہا، پھر انکا کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ”میں کچھ دیر کے لئے جا رہی ہوں۔“ اُس نے رُوٹھے ہوئے انداز میں کہا۔ ”پریتم لال مہاراج کی آتما نے مجھے یاد کیا ہے۔ اپنا دھیان رکھنا.....! میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔“

”تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔ جب چاہو، جہاں چاہو جا سکتی ہو.....“ میں نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

”غلطی تمہاری تھی۔ اور تم ہی جلی کاٹی باتیں بھی کر رہے ہو۔“ اُس نے شکوہ کیا۔ ”اپنے جملوں کو بھی تو لے کر کوشش کرو انکارانی.....“ میں نے اُسے یاد دلایا۔ ”میں نے بھی تم سے شیوا کو نہ روکنے کی وجہ دریافت کی تھی۔ تم نے اپنی کسی مجبوری کی آڑ لے کر بات ٹال دی، اصل وجہ نہیں بتائی۔ میں نے بھی اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اپنی اپنی نصیحتیں ہوتی ہیں۔“

انکا نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن کوئی مجبوری لاحق ہوگی جو اُس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ مجھے دیکھتی ہوئی خاموشی سے چلی گئی۔ میں پھر اپنے جنون میں مبتلا ہو گیا، اپنی دشتوں سے الجھ رہا تھا جب کسی کے قدموں کی آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے نظر گھا

کر دیکھا، امریتا شب خوابی کا لباس پہنے میرے کمرے میں داخل ہو کر کمرے کا دروازہ بند کر رہی تھی..... میرے ذہن سے سارے پریشان کن خیالات چھٹ گئے۔ میری نظریں امریتا کے جسم پر چمکنے لگیں۔

ذہن پریشان ہو، اعصاب پر کسلندی طاری ہو، دماغ الجھنوں کا شکار ہو اور خیالات میں بے نیازی کروٹیں بدل رہی ہو تو کسی حسینہ کا وجود ان تمام علامتوں کو ڈور کر دیتا ہے۔ امریتا کو دیکھ کر میری بھی یہی حالت ہوئی۔ وہ دروازہ بند کر کے میری سمت بڑھی تو میں اُس کی

پذیرائی کی خاطر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ گلبدن اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ درمیاں ہار کم کر رہی تھی۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ فضائی سفر کے دوران بھی وہ مجھ سے بے تکلف باتیں کر رہی تھی۔ میں نے جب اُسے اغواء کنندگان سے نجات دلائی تھی اس وقت اظہار تشکر کے طور پر بے اختیار میرے سینے کی گہرائیوں میں سا گئی تھی۔ لیکن وہ ایک ہونے دماغ کی لڑکی تھی، جنس مخالف کے لئے اپنے اندر بے پناہ مقناطیسی کشش بھی رکھتی تھی۔ میرے خیال کے مطابق وہ آوارہ بھی نہیں تھی۔ پھر اتنی رات گئے وہ باریک گاہ سے اپنے جسم کے پیمان انگیز خطوط کی نمائش کرتی میری خواب گاہ میں کیوں آئی؟ منہ صرف ملاقات ہوتا تو دروازے کو اندر سے بولٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ معاذ ذہن میں ایک خیال بڑی سرعت سے ابھرا۔ ”کہیں نارنگ نے اسے میری کمزوری کو سمجھ لیا تھا؟ امریتا کے حسن و جمال کا جادو میرے قدموں میں بیڑیاں ڈالنے کی استعمال کیا جا رہا ہو؟“ میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ میں نے طے کر لیا کہ نارنگ کو اس مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔

امریتا بادِ بہار کے معطر جھونکوں کی طرح میرے قریب آ کر رک گئی۔ اُس کی آنکھوں میں نیل کنول تیر رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں مجھے اپنے سحر میں الجھا رہی تھیں۔ کے گداز بدن کی پیش مجھے جھلسانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے پیش قدمی نہیں کی خواہشات کو بے لگام نہیں ہونے دیا۔ وہ میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہی دانشوروں اور ماہر نفسیات کا خیال ہے کہ مردوں کی نگاہوں کا مفہوم عورت پہلی نظر بھانپ لیتی ہے۔ شاید امریتا نے بھی میرے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر میرے بند ہونے کے ارادوں کو تاڑ لیا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک دل آویز تبسم پھیل کر چلا گیا۔ میرے اور قریب آ کر بڑی اپنائیت سے بولی۔

”بیٹھنے کو نہیں کہو گے مہاراج.....؟“

میں نے پلکوں کی جنبش سے کام لیا۔ وہ اجازت حاصل کر کے میرے برابر بیٹھ گیا۔ اُس کے جسم کی خوشبو میرے دل و دماغ میں بسنے لگی۔ میں نے خود کو سنبھالا۔ میں سمجھتا تھا کہ نارنگ نے اس خوبصورت ناگن کو مجھے ڈسنے کی خاطر بھیجا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتی کہ میرے پاس قاتل سے قاتل زہر کا تریاق موجود تھا۔

”سکن و چاروں میں گم ہو.....؟“ اُس نے تھوڑے توقف سے سوال کیا۔ اس بار بہاراج کا لقب استعمال نہیں کیا گیا۔

”ایک مشکل درپیش آگئی ہے۔“ میں نے اُسے آزمانے کی کوشش کی۔ ”تمہارے پتا کا کہنا ہے کہ میں کہیں نہ جاؤں، سارا جیون اسی کے ساتھ رہوں۔“

”تو پھر ان کا کہنا مان لو نا..... کیا ضرورت ہے کہیں جانے کی؟“ وہ بڑی اپنائیت، بڑی گلاٹ سے بولی۔ ”میں تمہاری سیوا کروں گی، تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“

”کہا ہوسا تمہارا.....؟“ میں نے پھر اُسے کریدا۔ ”فضائی سفر کی طرح کہیں تم پھر مجھے بھول گئیں تو.....؟“

”پیارے بھول ہو گئی تھی..... شاکر دو۔“ امریتا کا لب و لہجہ تبدیل ہونے لگا۔ اُس کے انداز میں وارفتگی تھی۔

”پہلے تم نے انکار کیوں کیا تھا.....؟“ میں نے شکوہ کیا۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، نگاہوں کے ذریعے میرے دل میں سامنے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اُسے برسوں سے جانتا ہوں، جنم جنم سے میرا اُس کا ساتھ رہا ہو۔

میرے عزم کا مضبوط قلعہ مسما رہا۔

”تمہیں وہ جملہ یاد ہے؟“ میں نے مدھم آواز میں کہا۔ ”جو آزمائے جاپکے ہوں انہیں بار بار نہیں آزمایا جاتا۔“

”ہاں.....“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولی۔ ”میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا.....“

”کیا مطلب.....؟“ میں چونکا۔ امریتا کے لہجے کا یقین میری یادداشت میں پلچل کانے لگا۔ اُس کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ پہلے اُس نے بڑی سادگی سے مجھے بچانے سے انکار کر دیا تھا، بار بار بڑے وثوق سے میری بات کی نفی کرتی رہی۔ اور اب اُسے اعتماد سے اقرار کر رہی تھی۔

”امریتا.....“ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”میں تمہیں کیا سمجھوں.....؟“

”کلینا..... کجرا پجارن..... امریتا، جو چاہے سمجھ لو جمیل.....“ اُس کی آواز یکنخت بدل گئی۔ ”ناموں میں کیا رکھا ہے؟ سچا سمبندھ تو من کا من سے ہوتا ہے.....“

میری آنکھوں نے برسا شروع کر دیا۔ ماضی کے حسین لمحات مجھے ڈسنے لگے، ڈنک



مارنے لگے۔ میرے وجود کی عمارت لرزنے لگی۔ میرے اندر طوفان کی شدتیں بڑھنے لگیں۔ میں دیوانہ ہو گیا۔ پھٹی پھٹی بے چین نظروں سے امریتا کو دیکھنے لگا۔ نگاہیں ایک بار پھر دھوکا کھا گئیں، میں اُسے پہچان نہ سکا۔ فضائی سفر کے دوران اُس نے واضح اشارہ کیا تھا۔ وہ جملہ میرے کانوں میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہا تھا، میں بے پروا سا لگتا ہے۔

تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ ندامت کا احساس میرے کرب میں اضافہ کرنے لگا۔ میں نے پھر جھپکائی بند کر دیں۔ امریتا کو دیکھتا رہا۔ اب شے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ پکار پکار کر احوالہ بہت تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے صرف امریتا کا جسم تھا، اُس کا ہاتھ بالو.....

”یہ..... یہ تم کہہ رہی ہو.....؟“ میں نے اُسے حیرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جسم کے اندر میری کلدیپ کی روح موجود تھی۔

”تم پھر جیت گئیں۔ میں ایک بار پھر بار گیا۔“ میں نے بڑے خلوص سے اعتراف کیا۔ ”ان دشمنوں کو بھول جاؤں جنہوں نے تمہارے سر پر وہ نظر نہیں آ رہی۔“ اُس نے انکا کے بارے میں دریافت کیا۔ پری زندگی میں ہر سو کانٹے ہی کانٹے بکھیر دیے ہیں۔ کہیں ایک جگہ تک کر نہیں بیٹھنے سمجھ گیا، وہ میری توجہ مبذول کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے میرے درد کا اندازہ لگا لیا۔ میں نے تم گواہ ہو، تمہیں کھونے کے بعد مجھے جینے کی آرزو نہیں تھی۔ میں نے انکارانی سے حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

”جمیل.....“ کلدیپ کی آواز دوبارہ میرے کانوں میں گونجی۔ ”تم نے اپنی انکا ہندستان کو خیر باد کہنے کے رادے سے اُس کے ساتھ انگلینڈ چلا گیا۔ تمہاری یاد نے وہاں کی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ میں نے پھر خودکشی کا ارادہ کیا، پر تیم لال درمیان میں آ گیا۔“

”اُس نے جاتے وقت کہا تھا کہ پر تیم لال مہاراج نے اُسے یاد کیا ہے۔“ میں نے اُسے یاد کیا ہے۔ ”میں نے کہا کہ جو کام تم نے ادھورے چھوڑے ہیں وہ مجھے پورے کرنے ہوں گے۔ میں نے مہاراج کا کہا مان لیا۔ مجھے پر تیم لال ہی کی زبانی علم ہوا کہ تمہیں میری زندگی سے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔“ وہ بھی مجھ سے بار بار روٹھنے لگی ہے۔

”تم اُس کی بات جو نہیں مانتے۔“ اُس نے مسکرا کر کہا۔ ”اُس کا دھیان رکھا۔ اُمید کرنے والے اُس مادر بہ خطا امر لال کی ایک اولاد چندرا کے رُوپ میں بھی زندہ میں جانتی ہوں وہ کتنا بدل چکی ہے۔ اُس کے ننھے سے من میں تمہارے لئے پیاری ہے۔ وہ سپنلا وندھیا چل کی پہاڑیوں میں بیٹھا طاقت حاصل کرنے کے لئے جا پ کر رہا۔ نولول کشور پنڈت پجاریوں کو میرے خلاف بھڑکا رہا تھا۔ میں مہاراج کا اشارہ سمجھ گیا۔“

”انکارانی کو شکوہ ہے کہ میں نے شیوا کو زندہ کیوں چھوڑ دیا۔“

”اب وہ شکایت نہیں کرے گی۔“ کلدیپ نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”مہاراج..... کیا تاج ہوٹل میں تم ہی نے کجرا پجارن کے رُوپ میں پنڈت کالی داس کی موجودگی سے مجھے باخبر کیا تھا۔ تم باخبر نہ کرتیں تو میں تاریکی میں مارا جاتا..... اچھا ہوتا..... کہانی ختم ہوتی۔“ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”شاید مرنے کے بعد میں تمہیں پالیتا، تمہارے

”میری آتما پر بہت سی پابندیاں ہیں جمیل۔“ اُس نے سرد آہ بھری۔ ”میں بھی اب آجاتا۔ لیکن تم نے بروقت مجھے بچا لیا۔ اس کے بعد میں نے نول کشور کے دست بارے میں تم سے کھل کر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کیوں اتنا ہتا سکتی ہوں کہ کبھی کبھی منش کی.....“

”جیل.....“ کلدیپ نے منت کی۔ ”میرا کہا مان لو۔ میری آتما کو کسی امتحان میں ڈالو۔ میں دُرگا دیوی یا سید مجذوب کے بارے میں زبان نہیں کھول سکتی، صرف اتنا کہ وہ اب میری آتما بھی کبھی دوبارہ تمہارے پاس کسی بھی روپ میں نہیں آسکے گی۔ کل ہونے والا ہے؟ میں بھی جانتی ہوں۔ لیکن میں تمہیں کٹھنایوں سے بچانا چاہتی ہوں۔ کیا تم میری آخری بنتی سویکار نہیں کرو گے؟ نراش کر دو گے اپنی کلدیپ کو.....؟“

میں ہونٹ چبانے لگا۔ میرا جنون اپنے شباب پر تھا۔ کلدیپ کہہ رہی تھی کہ یہ میری اور کسی کی آخری ملاقات ہے۔ وہ چلی گئی تو پھر میری نظریں اُسے کسی روپ میں نہیں دیکھ سکیں گی۔ میں غصے میں گرفتار تھا جب ایک خیال میرے ذہن میں ابھرا۔

”کلدیپ..... کیا تم جانتی ہو کہ پریم لال نے انکارانی کو کیوں یاد کیا ہے.....؟“ میں نے کلدیپ کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

”مہاراج نے بلایا ہے تو اس کا بھی کوئی کارن ہوگا.....“ اُس کے جواب میں صداقت میں غمی ہوئی۔ وہ زبان کھولنے سے گریز کر رہی تھی۔

”تم مجھے ٹال رہی ہو..... اپنے جیل کو.....؟“ میں نے شکوہ کیا۔

”تم نے بھی تو اپنی کلدیپ کی آخری اچھا (خواہش) قبول کرنے سے انکار کر دیا۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی تڑپ کر اٹھا۔

”کلدیپ.....“ میں نے اُس کا ہاتھ پوری قوت سے تھام لیا۔ ”مجھ سے رُڈھ کر مت ہٹو۔ میں سکون سے نہیں رہ سکوں گا۔“

”میں نے تم سے ملنے کی خاطر جو آخری مہلت مانگی تھی اس کا سے پورا ہو رہا ہے جیل، اس کے تو میری بات پر دھیان کر لینا.....“

وہ جانے کے ارادے سے بڑھی تو میں نے اُسے ہاتھوں کے حصار میں دبوچ لیا۔

”یہ پاپ ہے جیل.....“ اُس نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”تم جس شریہ کو چھو رہے ہو وہ میرا نہیں، امریتا کا ہے۔“

میں نے اُسے ہاتھوں کے شلنجے سے آزاد کر دیا۔ اُس نے حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا، پھر تیز حیرت قدم اٹھاتی دروازہ کھول کر واپس چلی گئی۔ میرے خواب پھر چکنا چور ہو گئے۔ میرے وجود میں مایوسیوں کی کرچیاں چبھنے لگیں۔ میں سر تھام کر بستر پر بیٹھ گیا۔

نہیں ملا..... تزئین یاد ہے نا تمہیں؟ تم بھی اُس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ تمہارے پیار کا خاطر میں نے دل میں ٹھان لیا تھا کہ میں پہلے تمہارے ان دشمنوں کا صفایا کر لوں جو ہمارے نرائن اور امر لال کے ادھر سے پنپوں میں رنگ بھرنے کی خاطر سر جوڑ رہے تھے۔ سر پہ جہنم رسید کر لوں، پھر اطمینان سے تزئین سے ملوں گا..... اور..... اب تم کہہ رہی ہو کہ میرے سارے جھیلے چھوڑ کر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لوں، اپنے بدترین دشمنوں کو بیچوں کی طرح تھمکے لگانے اور تالیاں بجانے کا موقع فراہم کر دوں۔“ میں دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔

مجھے کلدیپ کی موت کا خیال آیا تو میرے صبر کے آتش فشاں نے بھی منہ کھول دیا۔ ”مجھے تم سے بھی شکایت ہے کلدیپ، تم نے بھی مجھے دھوکے میں رکھا۔ میری خاطر کالی بھینٹ دینے کا وعدہ کر بیٹھیں۔ میں بے خبر رہا۔ تم امر لال کو نرک میں جھونک کر سرخروہ لگائیں۔ میں در بدر ہو گیا۔ مجھے خبر ہوتی تو میں تمہارے اور امر لال کے درمیان آجاتا۔ میں کام آجاتا تو شاید تمہیں اس کرب، اس اذیت کا احساس ہوتا جس سے میں دوچار ہوں..... اب تم مشورہ دے رہی ہو کہ میں خاموش ہو جاؤں، چھپ کر کسی کو نہ کھدے۔ میری زندگی گزار دوں.....“ میں تملتا اٹھا۔ ”نہیں کلدیپ..... نہیں۔ اب میں دشمنوں کے سر پہ پہنچ چکا ہوں۔ میری واپسی اب ممکن نہیں ہو سکتی۔ میں نے شیوا کے ذریعے دشمنوں کو پھینک بیج دیا ہے۔ میں انہیں اندھیرے میں رکھ کر شب خون نہیں مارنا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں لکار کر مقابلے پر آنے کی دعوت بھیجی ہے۔ شیوا کو زندہ چھوڑ دینے میں میری اور کسی کی مصلحت نہیں تھی۔ انکارانی ناراض ہوتی ہے تو وہ بھی مجھ سے کنارہ کر لے۔ زندگی کی تفرق کس کو ہے؟ میں تو سر سے کفن باندھ گھوم رہا ہوں۔ موت کل آئے یا آج..... کیا فرق جائے گا.....؟“

”تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو جیل۔“ کلدیپ نے پیار سے میری گردن میں ہاتھ ڈال دیں۔ ”میں تمہیں کھل کر نہیں بتا سکتی۔ لیکن کسی کے درمیان میں آجانے سے حالات بدل گئے ہیں.....“

”تم شاید دُرگا دیوی کی بات کر رہی ہو.....؟“ میں زہر خند سے بولا۔ ”میں اکیس کے عتاب میں مبتلا کیا گیا تھا۔ گرو پر تاپ نے یہی بتایا تھا۔ لیکن سید مجذوب کے جسم کی تپ نے دُرگا کی زنجیروں کی تمام کڑیاں ناکارہ کر دیں، سب ٹاپتے رہ گئے۔“

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا، دیوانوں کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی حرکتیں بلا سبب نہیں تھیں۔ میں نے پھر اُسے آواز دی۔

”سید..... اپنے پیروں کی تھوڑی سی دھول میرے سر پر ڈال دو۔“

”جل جائے گا.....“ اُس نے مجھے غضبناک نظروں سے گھورا۔

”تمہارے ہاتھوں جلاتو میری عاقبت سنو جائے گی....“ میں نے انکساری کا اظہار کیا۔

”ہو! میں اُڑنے لگا..... نوسر باز..... مداری۔“

”مجھے تمہاری بددعا میں بھی منظور ہیں..... آج کوئی فیصلہ کر دو.....“

”چھلائیں جاری رکھ۔“ وہ ہاتھ نچا کر مدھم آواز میں بولا۔ ”ٹک ٹک..... ٹک ٹک

پکان جمدے۔“

میں نے کچھ کہنا چاہا، وہ پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے خود کو بستر پر ڈھیر کر دیا۔

سید کے اشارے میری سمجھ سے بالاتر تھے۔ میں ان کی تہہ تک پہنچنے کی خاطر ذہنی جناسٹک

میں مصروف تھا جب انکا میرے سر پر آگئی۔ بڑی اُداس اُداس نظر آ رہی تھی۔

”کیا ہو گیا انکا رانی.....؟“ میں نے اُسے چھیڑا۔ ”کیا پریتم لال نے بھی تم پر کچھ

پابندیاں عائد کر دیں جو اجڑی اجڑی لگ رہی ہو.....؟“

”پابندی.....“ انکا نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”تم کن پابندیوں کی بات کر رہے ہو.....؟“

میں محتاط ہو گیا۔ میں نے کلدیپ کی آتما کے آنے کی بات ظاہر کرنی مناسب نہیں

لگتی۔ انکا پر اسرار قوتوں کی مالک تھی، اُس کی نظریں دلوں کا بھید بھی جان لیتی تھیں۔

پابندیوں کا ذکر میری زبان سے سن کر اُس کا چونکنا خالی از عدت نہیں ہو سکتا تھا۔

”کس لئے یاد کیا تھا پریتم لال نے.....؟“ میں نے کلدیپ کا خیال دل و دماغ سے

نکال کر سوال کیا۔

”مہاراج نے کہا ہے کہ میں تم سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لوں۔“ وہ میرے سر پر

کسمانے لگی۔

”کس بات کی معافی.....؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”مجھے شاکر دو جمیل۔“ اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”مہاراج نے کہا ہے کہ تم نے

ٹیوا کو زندہ چھوڑ کر کوئی غلطی نہیں کی، وہ تمہارے ساتھ دھوکا نہیں کرے گا.....“

کلدیپ کی باتیں میرے جسم کے سناٹے میں گونجتی رہیں۔ میرے دل و دماغ میں کچھ

جاری تھی۔ میں کسی آخری نتیجے پر پہنچنے کی کوششوں میں مبتلا تھا جب کسی کے کھنکھارنے کی

آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے آواز کی سمت نظریں اٹھائیں..... میری پلکوں نے جھپ

بند کر دیا۔

سید مجذوب میرے سامنے دیوار سے ٹیک لگائے پاؤں پھیلانے بیٹھا تھا۔ اُس کی

داڑھی حسب معمول جھکاڑ کی مانند بڑھی ہوئی تھی۔ لباس تار تار نظر آ رہا تھا۔ لیکن چہرے پر

وہی جلال موجود تھا جسے میں نے پہلی بار رکن الدین کی حویلی میں دیکھا تھا۔ وہ قلندرانہ

انداز میں مجھے گھور رہا تھا۔ ہونٹوں سے ٹپکنے والی رال اُس کے لباس میں جذب ہو رہی تھی۔

وہ کامل بزرگ تھا، مجذوب تھا، اُسے کسی ظاہری رکھ رکھاؤ، نمود و نمائش کی ضرورت نہیں تھی۔

خدا نے اُسے پنے فیض و کرم سے نواز رکھا تھا..... کچھ دیر تک وہ سنجیدگی سے مجھے گھورتا رہا۔

پھر مسکرا کر بولا۔

”قلا بازیاں کھا رہا ہے..... نوٹشکی کے مسخرے.....“

”میری مشکل حل کر دو پیر و مرشد.....“ میں نے بڑی عاجزی سے درخواست کی۔ ”مجھے

کچھ بھائی نہیں دے رہا۔“

”میرے کی سلائی پھیر لے..... چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔“

”میں جس موڑ پر کھڑا ہوں وہاں مجھے تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔“

”جہاں سیر..... وہاں سوا سیر.....“ وہ دیدے نچا کر بولا۔ ”کان کا کھونٹ نکالنے

عادت ڈال لے.....“

”تم نے اب بھی میری مدد نہ کی تو میں ڈوب جاؤں گا سید۔“ میں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”میرا انجام بڑا بھیا نک ہوگا۔“

”ڈر گیا..... لنگوٹی چھوڑ کر بھاگنے کی سوچ رہا ہے.....؟“

”اور کیا کروں.....؟“ میں نے عاجزی کا اظہار کیا۔

”آنکھوں پر پٹی باندھ لے..... کنوئیں میں چھلانگ مار دے۔“

”تم نے پھر اشاروں میں بات شروع کر دی؟“ میں جھلا گیا۔ ”مجھے روشنی کی ایک

دکھا دو..... تمہیں اپنی بزرگی کا واسطہ۔“

کرنے کی وجہ سے پریم لال نے مجھے خودکشی کرنے سے باز رکھا تھا۔ اور اب جب میں اپنی منزل کے آخری سنگ میل کے قریب پہنچ گیا تو وہ یہ کہنے آئی تھی کہ میں تمام جھگڑوں سے منہ پھیر کر کہیں گوشہ نشینی اختیار کر لوں، دشمنوں کو پیٹھ دکھا کر واپس لوٹ جاؤں.....!!

”کیوں؟..... آخر کیوں؟“ میں نے سوچا۔ ”وہ کون تھا جس کے درمیان میں آجانے سے بساط کا رخ پلٹ گیا تھا؟ کلدیپ نے کھل کر اُس کا نام لینے سے کیوں گریز کیا تھا؟ وہ ایسی کون سی قوت تھی جس سے کلدیپ کی آتما بھی خائف تھی؟“..... دُرگا.....! وہ یقیناً دُرگا ہی ہوگی جس نے اوم پرکاش کی موت پر سررُش کرنے کی خاطر مجھے اکیس روز کے عتاب سے دوچار کیا تھا۔ گرو پرتاپ نے کہا تھا کہ میں اکیس روز تک اپنے پتلے سینے کہیں خاموش بیٹھا رہوں۔ سید کو میری کمپرسی پر رحم آگیا۔ دُرگا کو سید کی مداخلت ناگوار گزری، اُسی نے دھرم کرم کے درمیان دیوار کھڑی کی ہوگی۔ کلدیپ زندہ ہوتی تو اور بات تھی۔ مجھے یقین ہے، وہ کئی زندگیاں مجھ پر قربان کر سکتی تھی۔ لیکن اُس کی آتما دیوی دیوتاؤں کے قبضے میں تھی، وہ مجبور ہو گئی ہوگی.....!

انکا نے بھی واپسی کے بعد کوئی اچھی خبر نہیں سنائی تھی۔ لندن کے ہسپتال میں پریم لال کی آتما نے مجھے خودکشی کے ارادے سے روک دیا تھا، کلدیپ کے ادھورے مشن کی تکمیل کی ہدایت کی تھی۔ میری ہی خاطر اُس نے انکارانی کو اضافی قوتوں سے مالا مال کیا تھا۔ اُس نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ اس کا سایہ میرے ساتھ ساتھ رہے گا..... اب وہ بھی پیچھے ہٹ گیا۔ انکارانی نے میرے استفسار پر یہی بتایا تھا کہ مہاراج کی آتما کو بھی آسمانوں پر طلب کر لیا گیا ہے۔ وہ بھی میری مدد کو نہیں آئے گا.....

”دُرگا..... دُرگا..... دُرگا.....“ میرے ذہن میں ایک ہی نام کی بازگشت ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہا اٹھ کر پوری کوٹھی کی تمام بٹیاں روشن کر دوں، ایک ایک کو سوتے سے جگاؤں، بے اختیار قہقہے لگانا شروع کر دوں۔ لوگ میری دیوانگی کا سبب پوچھیں تو میں کہوں۔ ”تمہاری دُرگا نے میرے اوپر پہرے بٹھانے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ وہ ایک ایک کر کے میرے ساتھیوں، میرے جانثاروں کو مجھ سے دُور کر رہی ہے۔ مجھے تنہا کر کے میری بے بسی کا تماشا دیکھنا چاہتی ہے۔ سید سے نہیں جیت سکی تو اس کا انتقام مجھ سے لے رہی ہے..... کچھ سنا تم نے، میں کیا کہہ رہا ہوں؟ دُرگا پانی کے پربند باندھنے کی کوشش کر

”اور کچھ.....؟“ میں نے بے نیازی سے دریافت کیا۔

”ہاں.....“ وہ کچھ توقف سے بولی۔ ”مہاراج نے ایک بات اور کہی تھی۔ اُس کی بہن کو دھرتی سے آکاش پر بلا لیا گیا ہے۔ اب وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اب کوئی میرے جنونی فیصلوں میں اڑنا نہ لگائے۔ جو کہ ہونا ہے ایک بار ہو جائے۔“ میں نے دلبرداشتہ ہو کر کہا۔ ”انکارانی، تم چاہو تو تم بھی ساتھ چھوڑ دو۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔“

”ایسی بات مت کرو جھیل.....“ اُس نے تڑپ کر جواب دیا۔ ”میں تم سے دُور رہ کر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔“

”پھر ایک بات کا وعدہ کرو۔ آج کے بعد تم مجھ سے رُوٹھنے کا کوئی انداز نہیں اختیار کر گی..... سنا تم نے؟ ہمارے درمیان صرف اچھے دوستوں کا رشتہ برقرار رہے گا..... ہم کی کسی بات کے لئے پابند نہیں کریں گے۔ ہمیں فیصلہ کرنے کا اختیار ہوگا۔“

انکا نے کوئی جواب نہیں دیا، اثبات میں سر کو جنبش دے کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر میرے بالوں میں دُبک گئی۔ اُس کے خاموش احتجاج کا وہ انداز بھی دیدنی تھا۔ میں نے اٹھ کر روشنی بجھائی، پھر بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے لگا۔ کلدیپ اور سید مجذوب کی باتیں میرے دماغ میں گونجنے لگیں.....!

کلدیپ، امریتا کے رُوپ میں سامنے آ کر مجھے پھر حیران کر گئی تھی۔ اُس نے جانے جاتے مجھے باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ آخری بار دیوی دیوتاؤں سے اجازت لے کر مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ ہو سکے تو میں اُس کے مشورے پر غور کروں۔ اُس کا مشورہ میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ جنون اور وحشتوں کے سفر میں وہ ہمیشہ میرے شانہ بشانہ میرے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ بدری نرائن جیسے موذی اور سخت جان دشمن سے طویل جنگ لڑنے کے دوران اُس نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا۔ وہ میسور کی پہاڑیوں میں کلدیپ کے رُوپ میں بیٹھی جا پ بھی کرتی رہی، کلپنا کے رُوپ میں میری مدد بھی کرتی رہی۔ پنڈت کالی داس کو تاج محل ہوٹل میں میری وجہ سے بٹھایا گیا تھا۔ پجارج کجرا کو اُس کا من بہلانے کی خاطر بھیجا گیا تھا۔ کلدیپ اگر کجرا کے جسم پر قبضہ کر کے مجھے کالی داس کی موجودگی سے باخبر نہ کرتی تو میں اندھیرے میں کام آجاتا۔ اُسی کے ادھورے کام پورے

رہی ہے۔ پھرے ہوئے سمندر کی سرکش موجوں کے آگے سرکنڈوں کی باڑھ لگانے کی خواہشمند ہے۔ شاید اُسے نہیں معلوم کہ میں کئی بار کالی کے مندر بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر داخل ہو چکا ہوں۔ کالی کے کئی سیوک میرا راستہ کھوٹا کرنے کی حماقت میں جان گنوا بیٹھے۔ کئی پجار نہیں میری وحشت کے درمیان آ کر روندی گئیں۔ کیا دُرگا کو اس کا علم نہیں ہوگا؟ اگر وہ واقف ہے تو پھر تم سب مل کر پتھر کی اس مورتی کو سمجھاؤ..... تم نے ہی اسے تشکیل دیا ہے، اس پر رنگ روغن چڑھا کر اس کے نقوش اُجاگر کئے ہیں۔ تم اسے مندر میں بلند مقام پر سجا کر اس کے سامنے دُندوت کرتے ہو۔ اس کی پوجا کرتے ہو۔ میں تمہارے رسم و رواج، تمہارے دھرم کرم کے معاملات میں ٹانگ نہیں پھنسا رہا۔ لوگ درختوں کی پوجا کرتے ہیں، بھڑکتی ہوئی آگ کے سامنے سجدے کرتے ہیں، جانوروں کو دیوتا مانتے ہیں۔ اپنے اپنے اعتقاد، اپنے اپنے یقین کی بات ہے۔ کون اچھا ہے؟ کون برا؟ اس کا فیصلہ بھی میرے اختیار کی بات نہیں۔ میں تم سے صرف اتنی درخواست کر رہا ہوں کہ تم اپنی زبان میں دُرگا کو سمجھاؤ کہ جمیل احمد خاں کسی انسان کا نہیں، ایک وحشی، ایک دیوانے کا نام ہے۔ وہ ہوش مندی کی باتیں نہیں کرتا، جوش میں آ کر ہوش کھو بیٹھا ہے، مصلحتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے، من مانی کرتا ہے۔ اپنی اسی دیوانگی کے سبب وہ کئی بار مرا، کئی بار زندہ ہوا۔ اس کی وحشتوں کی لپیٹ میں آ کر اس کے اپنے بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ سہارے ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔ اب وہ تنہا ہے، ایک تنہا آدمی کو دُرگا اور کیا تنہا کرے گی؟ جنگلی درندوں کو طوطا مینا پالنے والے تیلیوں کے پنجرے میں نہیں بند کیا جاتا..... جو خود موت کا خواہاں ہو اُسے کوئی موت سے کیا ڈرائے گا.....؟ اسے سمجھاؤ، اس سے کہو کہ ایک گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں آنے کی حماقت نہ کرے، دیوار گری تو وہ بھی پاش پاش ہو جائے گی۔ آندھیوں کی زد پر چراغ روشن کرنا شاعروں کی نازک خیالی ہے..... میں شاعر نہیں ہوں، بت پرستی بھی میرا شیوہ نہیں۔ میں پہلے ہی وحشتوں کا مارا ہوں، وہ مجھے چھیڑے گی تو میرے جنون میں کمی نہیں ہوگی، میری درندگی اور بڑھ جائے گی..... ابھی میں ہوش میں ہوں، تم میری بات غور سے سنو۔ دُرگا کو بھی جا کر سمجھانے کی کوشش کرو، کل میں ہوش کھو بیٹھا تو کچھ یاد نہیں رہے گا۔ ایک بات سمجھ لو، میں تنہا نہیں گردوں گا، میرے ساتھ بڑے بڑے پنڈت، بڑے بڑے بت بھی ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ پھر مجھ سے کوئی شکوہ، کوئی شکایت نہ کرنا.....

تھی، بے بس ہو گئی ہوگی.....!!

میں بستر پر لیٹا کروٹیں لیتا رہا۔ کلدیپ اور پریتم لال کی باتیں میرے دل و دماغ میں باہل چار رہی تھیں۔ مجھے پریتم لال سے زیادہ کلدیپ کی یاد ستر رہی تھی۔ وہ میری زندگی تھی، میری رُوح تھی۔ جب تک زندہ رہی اُس کی ہر سانس مجھ سے وابستہ رہی۔ اُس کی موت بھی میری خاطر ہوئی۔ زندگی کی آخری سانسیں اُس نے میری آغوش میں گزاری تھیں۔ ان دنوں اُسے مجھ سے ایک لمحہ کی جدائی بھی منظور نہیں تھی، میری ہانپوں میں سمٹی ہوئی حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہتی۔ پریتم لال کی کنیا اُس کے لئے سب سے پورا استھان تھا۔ میں پہلے کبھی اُس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا تو وہ اپنا جسم سمیٹ لیتی، زور زور رہنے کے بہانے تراشنے شروع کر دیتی۔ مگر آخری دنوں میں وہ خود پروانے کی طرح مجھ پر نثار ہونے لگی، بار بار میرے ہونٹوں کو چومنے لگتی، لگاؤ کی باتیں شروع کر دیتی۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ میسور کی پہاڑیوں سے نیچے آنے کے بعد اُسے اپنی زندگی کا ہم سفر بنالوں گا۔ میری زندگی کا خلاء پُر ہو جائے گا۔ میں اس سے آنے والے کل کی باتیں شروع کر دیتا، اُس سے سہاگ رات کی باتیں کرتا تو اُس کی آنکھوں میں مسرتوں کے سینکڑوں دیے ٹنٹمانے لگتے۔ اُس کی خوبصورت آنکھیں ننکا ہو جاتیں۔ میں انہیں خوشی کے آنسو سمجھتا، میں اُس کے انجام سے بے خبر تھا۔ اُسے علم تھا کہ کالی کو دیئے ہوئے وچن کو نبھانے کی گھڑی نزدیک آرہی ہے..... پھر جب اُس نے حقیقت کا انکشاف کیا تو میں پاگل ہو گیا۔ وہ مجھے آخری سانس تک سمجھاتی رہی، دلا سے دیتی رہی..... مجھے یاد ہے کلدیپ نے آخری سانس اُکھڑنے سے پیشتر بڑی مشکل سے اُٹھ کر میری پیشانی کا بوسہ لیا تھا، پھر کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح میری آغوش میں گر گئی۔ وہ ہمیشہ کے لئے زندگی سے منہ موڑ گئی۔ میں اُسے روک نہ سکا۔ انکارانی نے مجھے بے ہوشی سے دوچار نہ کیا ہوتا تو میں کلدیپ کے حسین جسم کو ہاتھوں میں لئے کسی بلند چٹان سے چھلانگ لگا دیتا، کہانی وہیں ختم ہو جاتی۔ لیکن موت پر بھی انسان کا بس نہیں چلتا۔ میں کلدیپ کے بغیر بھی زندہ رہا، اُس کا جسم میری نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گیا..... اُس کی رُوح کبھی کبھی دیوی دیوتاؤں سے کچھ مہلت طلب کر کے مجھے بہلانے کے لئے آ جاتی..... اب اُس کی رُوح پر بھی پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ وہ دُرگا جیسی مہبان دیوی کے آگے زبان نہیں کھول سکتی تھی، بے بس ہو گئی ہوگی.....!!



میں کرب کے عالم میں گرفتار تھا جب انکارانی کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ شاید وہ بھی جاگ رہی تھی، اُسے بھی میری بے چینی کا علم ہو گیا تھا۔

”جیل..... دل چھوٹا مت کرو۔ میں جو تمہارے پاس ہوں۔“ وہ مجھے سمجھا رہی تھی۔ ”جو چلے گئے وہ واپس نہیں آسکتے۔ جو باقی ہیں ان کے بارے میں بھی کبھی محبت سے سوچ لیا کرو.....“

”تم تزمین کی بات کر رہی ہو.....؟“ مجھے وہ گڑیا یاد آگئی جسے میں نے اشرفی بیگم سے زبردستی چھین لیا تھا۔ وہ مجھے بابا کہنے لگی تھی، میری کلدیپ بھی اُسے ماں کی طرح پیار کرتی تھی۔ ہم دونوں نے سید غوث کا انتخاب کر کے اُس کی شادی کر دی تھی۔ ایک مدت سے میں نے اپنی گڑیا کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ میرے اندر کا غبار تزمین کا نام سن کر چھٹنے لگا، خیالات کے بہاؤ کا رخ بھی تبدیل ہو گیا۔

”اور بھی کچھ دلوں میں تمہاری بے پناہ محبت موجود ہے۔“ وہ بڑی اُداسی سے بولی۔ ”تم نے کبھی دل میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“

”کبھی فرصت ملی تو اطمینان سے دیکھوں گا.....“ میں نے انکارانی کا دل رکھنے کو کہا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے مرجھائے ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اُمید کی کرنیں اُس کی آنکھوں میں جھلکانے لگیں۔ پہلے وہ احساسات اور جذبات کی صداقت سے ناواقف تھی، میرے ساتھ رہتے رہتے وہ بھی سرد گرم کا فرق سمجھنے لگی تھی۔

”کس کس کو دیکھنے کا وقت نکالو گے.....؟“ اُس نے شوخی سے کہا۔ ”اس چھت کے نیچے بھی ایک باسی کڑھی میں اُبال آرہا ہے۔ میں اوشا کماری کی بات کر رہی ہوں۔ نارنگ ابھی تک جاگ رہا ہے، اپنے اُلجھے ہوئے بکھیرڈوں کا حل تلاش کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ اور وہ اُس کے ساتھ لیٹی تمہاری یاد میں ٹھنڈی ٹھنڈی آپیں بھر رہی ہے.....“

”تمہیں برا نہیں لگ رہا.....؟“ میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔ اب صرف وہی رہ گئی تھی۔

وہ بھی رُوٹھ کر رخصت ہو جاتی تو زندگی میں بڑا سناٹا طاری ہو جاتا۔ کبھی صرف سائیں سائیں کی خیالی آوازیں بھی انسان کو ڈنک مارنے لگتی ہیں، اضطراب میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

”ایسا مت سوچو جیل.....“ انکارانی میرے خیالات پڑھ کر کسمسا نے لگی۔ پیار سے

بولی۔ ”میں خود سے تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ تم دھکا دو تو اور بات ہے.....“

”میں تمہاری مجبوریاں سمجھتا ہوں انکارانی، مجھے اپنی کوتاہیوں کا بھی احساس ہے۔ لیکن ابھی سبھی انسان خود اپنے آپ سے بھی بے بس ہو جاتا ہے۔ جذبات سر اُبھارتے ہیں تو سمجھائی نہیں دیتا۔“ میں نے سچے دل سے کہا۔ ”میری باتوں کا برا نہ مانا کرو..... تم تو ہری زندگی کے ہر پہلو، تمام نشیب و فراز سے واقف ہو۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا.....؟“

”اب تم نے کیا فیصلہ کیا ہے.....؟“ اُس نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

”میں نے طے کر لیا ہے..... میری اگلی منزل ہر دوار ہوگی۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں جیل،! جو ہوگا، دیکھا جائے گا.....“ انکارانی کے لہجے میں اس کا خلوص بھی شامل تھا۔ میرے ذہن سے تنہائی کا احساس چھٹنے لگا.....!!



کاسباب نہیں ہوگا۔ میں اُسے اپنے ارادے سے آگاہ کر چکا ہوں۔“

انکا نے کوئی جواب نہیں دیا، اُس کی نظریں نارنگ کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ میں سب سے رخصت ہو کر کوشی کے باہر آ گیا۔ نارنگ میرے ساتھ ساتھ تھا۔ پورنیکو میں ایک کار تیار کھڑی تھی، باوردی ڈرائیور بھی موجود تھا۔

”مہاراج..... کیا تم میرے لئے کچھ دن اور نہیں رک سکتے؟“ نارنگ نے دبی زبان میں کہا۔ ”تم نے بڑی مچھلیوں کے بارے میں جو کچھ کہا وہ غلط نہیں ہے۔ وہ گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے اُن کی نظریں مجھ تک پہنچ جائیں۔“

”اسی کارن میں نے کہا تھا کہ کچھ دنوں کے لئے ملک سے دُور چلا جا.....“ میں سپاٹ لچے میں بولا۔

”اور وہ سور کے بچے جو میری قید میں ہیں؟“ وہ ہونٹ چبانے لگا۔

”انہیں ختم کرادے۔“

”اتنی جلدی میں انہیں موت کی نیند نہیں سلاؤں گا۔“ نارنگ کسی زہریلے ناگ کی طرح بل کھانے لگا۔ ”اُن حرامزادوں نے امریتا پر ہاتھ ڈالنے کی غلطی کی تھی۔ نارنگ کی عزت سے کھیلنے کی حماقت کی تھی۔ میں انہیں سسکا سسکا کر بڑی اذیتاں موت ماروں گا۔“

”تیری مرضی.....“ میں نے لا پرواہی سے شانے اچکائے۔

”رُک جاتے تو اچھا تھا.....“ اُس نے بڑی عاجزی کا اظہار کیا۔

”مجھے بھی کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔ موقع ملا تو پھر آؤں گا۔“ میں نے قدم آگے بڑھادیے۔ اُس نے دوبارہ مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر اسٹیشن کے لئے روانہ ہو گیا۔ انکا میرے سر پر آلتی پالتی مارے بیٹھی کسی سوچ میں مستغرق تھی۔ میں نے اُسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ ابھی تک نارنگ کے خیال سے چھٹکارا نہیں حاصل کر سکی تھی۔ میرے دماغ میں بھی نارنگ ہی کلبلا رہا تھا۔ میں نے زیر زمین کام کرنے والے دشمنوں کے بارے میں زبان کھول کر کسی دُور اندیشی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ مجھے اپنی زبان بند رکھنی چاہئے تھی۔ جرائم کی غلاظتوں میں لتھڑے ہوئے مگر مجھے آدم خورشوروں کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ وہ ناگ پڑ لیں تو شیر بھی

لدل سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

صبح ناشتے کی میز پر سب ہی اُداس تھے۔ شاید نارنگ نے انہیں میری روانگی کی اطلاع دے دی تھی۔ خود نارنگ بھی کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ میری نظریں وہ رہ کر امریتا کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ اُس کا جسم بے حد تروتازہ و شاداب نظر آ رہا تھا۔ اسی جسم میں گزشتہ رات میری کلدیپ مجھ سے آخری بار ملنے آئی تھی۔ اس جسم کے نشیب و فراز میں مجھے کلدیپ کا عکس نظر آ رہا تھا۔ اوشا کماری کے چہرے پر اُداسی کے علاوہ اپنی شکستہ احساس بھی چل رہا تھا۔ وہ نارنگ سنہا جیسے قد اور شخص کی بیوی تھی۔ نارنگ پر نہ کسی لگے دوسروں پر اُس کا حکم ضرور چلتا تھا۔ اُس کے ایک اشارے پر کوئی بھی اُس کے قدموں میں جھک سکتا تھا۔ نہ جھکتا تو کسی ناکردہ گناہ کے الزام میں مار دیا جاتا۔ میرے سلسلے میں اُسے مایوسی ہوئی تھی۔ وہ اپنے شکار کو بے بس کر کے مارنے کی عادی تھی۔ اُس نے میرے اُپر بھی جال ڈالنے کی کوشش کی۔ اُس کا خیال تھا کہ میں بھی دو چار روز میں اس کی حیثیت سے استفادہ حاصل کرنے کی لالچ میں آ کر اس کی خواہشات کی دہلیز پر سر جھکا دوں گا۔ میں اُن جلدی جانے کے لئے پابہ رکاب ہو جاؤں گا، یہ بات اُس کے وہم و گمان میں نہیں تھی۔ ورنہ ممکن ہے وہ مجھے تسخیر کرنے کا عمل تیز کر دیتی۔ انکارانی میرے سر پر بیٹھی سب کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی تھی۔

”جیل.....“ میں ناشتے سے فارغ ہو کر اُٹھنے لگا تو اُس نے میرے کان میں سرگٹ کی۔ ”مجھے نارنگ کے ارادے نیک نظر نہیں آ رہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ میں چونکا۔

”وہ تمہیں ہر دوار جانے سے روکنے کے منصوبے ہے۔“ انکا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اُسے ابھی دہلی میں تمہاری ضرورت ہے۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔“ میں نے ٹھوس آواز میں جواب دیا۔ ”نارنگ مجھے روکنے نہ

وقتی طور پر نارنگ نے میری بڑائی تسلیم کر لی تھی۔ میں نے اُسے اوشا کمار کی زبان امریتا کے اغواء کی تفصیل سنوا کر اپنا غلام بنالیا تھا۔ میں دہلی میں اُس کی کوٹھی میں رہتا تو میرے پاؤں دھو دھو کر پینے سے بھی کبھی دریغ نہ کرتا۔ لیکن وہ میری دُوری برداشت نہیں کر سکتا تھا، بڑے پیمانے پر جرائم کرنے والے پیشہ ور افراد اپنے کسی راز کو کبھی دوسروں کے ہاتھ نہیں لگنے دیتے۔ ایک ذرا سے شبہ پر وہ اپنے سگے بھائی کو بھی زندہ درگور کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ میں نارنگ کا رشتہ دار نہیں تھا، میں نے اُسے آنے والے حالات سے بھی باخبر کر دیا تھا، یہ وارننگ بھی دی تھی کہ اگر اُس نے میرا کہنا نہ مانا تو اس کے ستارے گردش میں آجائیں گے۔ اگر وہ صرف جرائم پیشہ ہوتا، کسی مافیا کا سربراہ بھی ہوتا تو میری بات پر عمل کرنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ کرتا۔ لیکن وہ ایک ہی وقت میں دو کشتیوں پر پیر جمائے کھڑا تھا۔ راج منتری کی حیثیت میں اُس نے جو ساکھ بنالی تھی وہ اُس کے جرائم کی پردہ پوشی کرتی تھی۔ حکومت کا ایک اہم ستون ہونے کے ناتے اُسے بڑے وسیع اختیارات حاصل تھے۔ اُس کے مخالفین بھی اُس کی سرد و گرم سننے اور برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ وہ اس عہدے کو چھوڑنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا، شیر کی کھال اُس کے جسم سے عارضی طور پر علیحدہ ہو جاتی تو نہ صرف اُس کے سیاسی دشمن اُس کی جان کے لاگو ہو جاتے بلکہ انڈر ورلڈ کے مخالفین بھی پہلی فرصت میں اُسے بھنبھوڑ ڈالنے کی خاطر دانت تیز کرنے لگتے۔ نارنگ کسی ایک کشتی سے بھی پاؤں ہٹانے کو تیار نہیں تھا۔ اسی لئے مجھے روکنے کی بار بار کوشش کر رہا تھا۔ وہ میری پراسرار ماورائی قوتوں کے ذریعے اپنے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ میں اُس کے خواب چکن چور کر کے داہن جارہا تھا۔ اُس کا تملانا قدرتی امر تھا۔

اسٹیشن کے راستے میں میرے اور انکارانی کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم رہے۔ گاڑی اسٹیشن پر جا کر رکی۔ میں نیچے اُتر اتوریلوے کے عملے کے ایک اعلیٰ آفیسر نے میرا استقبال کیا۔ شاید نارنگ نے فون کے ذریعے اُسے پتہ کیا تھا۔ ہر دو دروازے والی گاڑی دوسرے پلیٹ فارم پر تیار کھڑی تھی۔ مجھے ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں بٹھا دیا گیا جس میں دو مسافر پہلے سے موجود تھے۔

”کچھ جل پانی کرو گے مہاراج.....؟“ جس آفیسر کو میری دیکھ بھال کی ہدایت کی گئی تھی

نے بڑی انکساری سے پوچھا۔

”مڑی چلنے میں کتنی دیر باقی ہے.....؟“ میں نے اُس کی بات نظر انداز کر دی۔ انکا

تھوچ کر میرے سر سے اُتر گئی۔

”ہیں منٹ.....“

”تمہارا شہ نام.....؟“

”سیوک کوراجہ رام کہتے ہیں.....“ اُس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ”منتری جی کی بڑی کرپا

ہاںہوں نے آپ کی سیوا کے لئے میرا چناؤ کیا۔ وہ بتا رہے تھے کہ آپ مہان شکتی کے

ایک ہیں۔ منی کو ہاتھ لگا دیں تو وہ بھی سونا بن جائے۔ کچھ اپنے اس سیوک کو بھی دان کر دو

مہاراج.....“

میں نے سرسری نظر سے اُس کے دل میں جھانک کر دیکھا تو مجھے ہنسی آگئی۔ وہ ایک

باش مہنت آدمی تھا۔ جس عہدے پر فائز تھا وہاں تک پہنچنے کی خاطر بھی اُس نے خوشامد

اور خوبصورت لڑکیوں کی سفارش استعمال کی تھی۔ ایسا نہ کرتا تو ہیڈ کلرک کے عہدے سے

اُسے کبھی نہ بڑھ پاتا۔

”تمہارا ایک اشارہ ہو جائے گا، میرے بھاگیہ کے دو ارکھل جائیں گے۔“ اُس نے

”مہاراج.....؟“ میں نے سنجیدگی سے اُسے گھورا۔

”تم حکم دو مہاراج.....“

”صرف رام رام کرنا شروع کر دے۔ راجہ کا پھندا اپنے نام سے نکال کر پھینک دے۔“

”میں..... میں سمجھا نہیں مہاراج.....“ وہ گڑبڑا نے لگا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات

تھے کہ وہ میری بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہے، جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کر رہا

ہے۔

”گھر کی صاف ستھری سبزی، تازہ بھاجی پر گزارا کرنے کی عادت ڈال لے۔ بازار

پٹ پٹے بھو جن پر منہ مارتا رہا تو پیٹ گڑبڑ ہو جائے گا۔“ میں نے نفرت کا اظہار کیا۔

”جھٹی کر۔ کوئی دفتر میں بیٹھی تیری راہ تک رہی ہے۔“

میں نے اُس کی پول کھول دی تو وہ شٹلے لگا۔ خاموشی سے اُٹھ کر چلا گیا۔ میں نے

نہنی سناٹی بیٹھی تھی۔ دونوں مرد مسافروں کی نظریں بار بار خاتون کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ چہرہ چھپائے پلیٹ فارم کی دوسری جانب متوجہ تھی۔ میں نے سر پر نظر ڈالی، انکا وجود نہیں تھی۔

میری نے وقت مقررہ پر ریگننا شروع کر دیا۔ میں پھر چندرا اور نول کشور کے خیال ہم ہو گیا۔ نول کشور کو علم ہو گا کہ میں کئی بار جان پھیلی پر رکھ کر کالی کے مندروں میں داخل ہوا تھا۔ اُس نے میرا راستہ روکنے کی خاطر بہت سوچ سمجھ کر ہی کوئی موثر قدم اٹھایا ہو گا۔ ہاؤس میں داخل ہوا۔ میں نے مندروں میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ ایک نظر چندرا کو دیکھنا چاہتا تھا جو عہد شباب میں میری کی باتیں سوچ رہا تھا۔ میں اُسے الزام نہیں ٹھہراتا۔ اُس کی جگہ میں ہوتا تو شاید باپ کے انتقام کی آگ مجھے بھی جھلسا دیتا۔ میں بھی عقل و دانش سے کام لینے کی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ رگوں میں دوڑتا ہوا گاڑی جو ان خون مجھے بھی سیاہ و سفید کے فرق سے بے نیاز کر دیتا۔ جو لوگ تیرنے کا تجربہ رکھتے وہ بھی اپنے پیاروں کو بچانے کی خاطر آنکھ بند کر کے سمندر میں چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ حماقت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب موت کے احساس سے دم گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ چندرا کو بھی غالباً علم نہیں تھا کہ وہ گھبرائی ہو کر پہاڑ سے ٹکرانے کا فیصلہ کر بیٹھا۔ نول کشور نے اُسے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا ہو گا، اُسے بتایا ہو گا کہ وہ اُس امر لالہ واحد سیوک ہے جسے دوسرے تمام پنڈت پجاریوں کے مقابلے میں کالی کا آشیر باد سے زیادہ حاصل تھا۔ گمراہی کے راستوں پر ڈالنے کی خاطر اُس کے معصوم کانوں میں کے قطرے پٹکائے ہوں گے۔ زہریلی باتیں کی ہوں گی، اُسے اُکسانے کے لئے تجربوں کی دودھاری تلوار استعمال کی ہوگی۔ اُس سے کہا ہو گا کہ جمیل احمد خان کو جان مارنے کے بعد وہ امر ہو جائے گا۔ امر لال کی آتما کو بھی قرار آ جائے گا۔

چندرا کے علاوہ میں پنڈت نول کشور کے درشن بھی کرنا چاہتا تھا جو منڈل میں بجا رہا تھا۔ نا عاقبت اندیش پنڈت پجاریوں کو دھرم کے نام پر موت کے اندھے کوئی دھکیل رہا تھا۔ لیکن میری آرزو پوری نہ ہو سکی۔ میرے ذہن کی پرواز مندر کے صدر پر ہی کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا کر ختم ہو گئی۔ میں نے ننذا کے ایک اور عمل کو آزمایا۔ حصار کو نہ توڑ سکا جو پنڈت نول کشور نے قائم کر رکھا تھا۔ میں نے تلملا کر آنکھیں کھولیں۔ کپارٹمنٹ میں ایک برقع پوش خاتون کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک علیحدہ برقعہ

گاڑی تیسرے یا شاید چوتھے اسٹیشن پر رُکی تو ڈبے کا دروازہ کھلا۔ ایک انسپٹر چار ہین والوں کے ساتھ دندنا تا ہوا اندر گھس آیا۔ انہوں نے مجھ پر ریوالور اور رائفلیں تانیں۔ میں موقع کی نزاکت نہ محسوس کر سکا۔

”تمہارا نام جمیل احمد خاں ہے.....؟“ انسپٹر نے ٹوک کر سوال کیا۔

”ہاں.....“ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”ہمارے پاس تمہاری گرفتاری کا وارنٹ ہے۔“ وہ گرج کر بولا۔ ”تمہیں ہمارے

نہنی سناٹی بیٹھی تھی۔ دونوں مرد مسافروں کی نظریں بار بار خاتون کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ چہرہ چھپائے پلیٹ فارم کی دوسری جانب متوجہ تھی۔ میں نے سر پر نظر ڈالی، انکا وجود نہیں تھی۔

”میرا جرم کیا ہے.....؟“ میں نے انسپٹر سے سوال کیا۔

سردار دیا۔

نقاب پوش خاتون ایک ادھیڑ عمر کی عورت ثابت ہوئی جس کے چہرے پر چچک کے پٹار داغ نظر آ رہے تھے۔

”آئی ایم سوری میڈم، لیکن.....“ انسپٹر اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ جو کچھ ہوا وہ شاید اُس کی

دفع کے برعکس تھا۔ عورت بل کھاتی اپنی نشست پر واپس چلی گئی۔ انسپٹر ایک لمحے خاموش

رہا پھر جھلا کر بولا۔ ”کچھ بھی ہو، تمہیں ایس بی کے آفس تک بہر حال میرے ساتھ چلنا ہو

گا۔“ میں اُس کی بات ٹال گیا تھا، مگر اب صورت حال واضح ہو گئی تھی۔ نارنگ نے مجھے دہلی سے خاصی

نکل جانے کے بعد روکنے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ عملی صورت میں میرے سامنے تھا۔ میں

ایک لمحے کو آنکھیں بند کر لیں۔ انسپٹر کو ایک جھکنا دینا ضروری تھا۔

”تم نے سنا نہیں..... میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں.....؟“ اُسے شاید میرے آنکھ بند

لینے کی ادائیگی نہیں آتی تھی۔

”کیا تم مجھے میرا وارنٹ گرفتاری دکھا سکتے ہو.....؟“ میں نے آنکھ کھول کر سلجھنے

انداز میں کہا۔

انسپٹر نے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ دو مسافروں کی موجودگی میں وہ قدرے

نظر آ رہا تھا۔ میری بات سن کر اُس نے بڑے اعتماد سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں اُس کی

خود اعتمادی پر مسکرا دیا۔ اُس نے یکے بعد دیگرے تمام جیبیں کھنگال ڈالیں لیکن دو چار نوٹوں

کے سوا کچھ اور برآمد نہیں ہوا۔ اُس کی حیرت قابل دید تھی۔

”تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے.....“ میں نے بڑے سکون سے کہا۔ ”میں لڑکیاں

کرنے کا کام نہیں کرتا.....“

”یہ..... یہ لڑکی کون ہے؟“ اُس نے جھلا کر برقع پوش خاتون کی سمت اشارہ کیا۔

”تم یہ سوال براہ راست خاتون سے بھی کر سکتے ہو۔“ میرے لہجے میں زہ کھائی آ گئی۔

انسپٹر، خاتون کی سمت بڑھنا چاہتا تھا، وہ خود اٹھ کر قریب آ گئی۔

”میں تمہیں کوئی اغواء شدہ لڑکی نظر آتی ہوں.....؟“ خاتون نے برقع کا نقاب

سے ہٹایا تو دونوں مسافر بھی کسمسا نے لگے۔ انسپٹر کے منہ کا مزہ بھی کر کر اہو گیا۔ میں

”تمہارے اوپر دہلی کے ایک شریف خاندان کی لڑکی کو زبردستی اغواء کرنے کا

ہے۔“ انسپٹر نے برقع پوش خاتون کی طرف ایک اچھتی ہوئی نظر ڈال کر کہا۔ ”میرا

ہے کہ وہ لڑکی بھی تمہارے ساتھ ہی ہے.....“

میرے ذہن میں انکا کے جملے گونجنے لگے۔ دہلی سے روانگی کے وقت اُس نے تارنگ

کی کوشی پر اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے ہر دوڑ جانے سے روکنے

کوشش کرے گا۔ انکارانی کو تارنگ کے ارادے نیک نہیں نظر آ رہے تھے۔ میں اُس کی

بات ٹال گیا تھا، مگر اب صورت حال واضح ہو گئی تھی۔ تارنگ نے مجھے دہلی سے خاصی

نکل جانے کے بعد روکنے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ عملی صورت میں میرے سامنے تھا۔ میں

ایک لمحے کو آنکھیں بند کر لیں۔ انسپٹر کو ایک جھکنا دینا ضروری تھا۔

”تم نے سنا نہیں..... میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں.....؟“ اُسے شاید میرے آنکھ بند

لینے کی ادائیگی نہیں آتی تھی۔

”کیا تم مجھے میرا وارنٹ گرفتاری دکھا سکتے ہو.....؟“ میں نے آنکھ کھول کر سلجھنے

انداز میں کہا۔

انسپٹر نے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ دو مسافروں کی موجودگی میں وہ قدرے

نظر آ رہا تھا۔ میری بات سن کر اُس نے بڑے اعتماد سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں اُس کی

خود اعتمادی پر مسکرا دیا۔ اُس نے یکے بعد دیگرے تمام جیبیں کھنگال ڈالیں لیکن دو چار نوٹوں

کے سوا کچھ اور برآمد نہیں ہوا۔ اُس کی حیرت قابل دید تھی۔

”تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے.....“ میں نے بڑے سکون سے کہا۔ ”میں لڑکیاں

کرنے کا کام نہیں کرتا.....“

”یہ..... یہ لڑکی کون ہے؟“ اُس نے جھلا کر برقع پوش خاتون کی سمت اشارہ کیا۔

”تم یہ سوال براہ راست خاتون سے بھی کر سکتے ہو۔“ میرے لہجے میں زہ کھائی آ گئی۔

انسپٹر، خاتون کی سمت بڑھنا چاہتا تھا، وہ خود اٹھ کر قریب آ گئی۔

”میں تمہیں کوئی اغواء شدہ لڑکی نظر آتی ہوں.....؟“ خاتون نے برقع کا نقاب



خاتون کے سر پر واپس چلی گئی جو اگلے اسٹیشن پر بڑی خاموشی سے اتر گئی تھی۔ انکا دوبارہ میرے سر پر آگئی۔

سفر جوں جوں کنتارہا، میرے خدشات کم ہوتے گئے۔ میرا خیال تھا جب نارنگ کے آدمیوں نے اُسے میرے بارے میں اپنی ناکامی کی داستان سنائی ہوگی تو وہ پاگل ہو گیا ہو گا۔ اُس کا شمار ان شریف لوگوں میں نہیں کیا جاسکتا تھا جو اپنی شکست مردانگی سے قبول کر لیتے ہیں۔ اپنے منصوبے کی ناکامی کی اطلاع سن کر وہ نئے طریقے بھی اختیار کر سکتا تھا۔ اُس کی پیشانی پر ابھرنے والی سلوٹیں بھی حکومت وقت کے لئے بڑے معنی رکھتی تھیں۔ اُس کی ٹوٹی بڑی مضبوط تھی۔ کوئی اُس کے خلاف آواز بلند کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ امریتا کے سلسلے میں، میں نے اُس کی مدد کی تھی۔ اس میں نارنگ کی مرضی اس کی خواہش کا دخل نہیں تھا۔ حالات خود مجھے اُس کے راستے میں لے گئے تھے۔ میں اس ڈبے میں سفر نہ کر رہا ہوتا جس میں امریتا کو اغواء کیا جا رہا تھا تو شاید نارنگ کا نام بھی میرے ذہن کے کسی گوشے میں نہ آنے پاتا۔ حالات کی ستم ظریفی مجھے درمیان میں کھٹائی تھی۔ دہلی کے پولیس کے محکمے کے تمام بڑے افسران کو اس بات کا علم بھی ہو گیا تھا کہ میں نے نارنگ کی کوٹھی میں قیام کیا تھا۔ نارنگ میرے اوپر کوئی بھی الزام لگا دیتا، صرف اس بات کا سرسری طور پر ذکر کر دیتا کہ امریتا کے اغواء میں اصل مجرموں کے ساتھ میری نا بھگت کے امکانات کو خارج نہیں قرار دیا جاسکتا، رائی کا پہاڑ بن جاتا۔ دہلی پولیس کا ٹلڈ مجھ پر مڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑتا۔ مجھے بھاگے راستہ نہ ملتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اپنی ناکامی کی خبر سن کر نارنگ نے یہ بھی ضرور سوچا ہو گا کہ شہد کی مکھیوں کے چھتے میں پتھر مارنا خود اُس کے لئے بھی مصیبت پیدا کر سکتا ہے۔ وہ میری قوت کا اندازہ لگا چکا تھا، امریتا کے سلسلے میں وہ پہلے ہی انڈر ورلڈ کے جرائم پیشہ افراد سے اُلجھا ہوا تھا، مزہ اُلجھاوے پیدا کرنا اُس کے حق میں مناسب نہ ہوتا۔ یہی سوچ کر اُس نے خاموشی اختیار کر لی ہوگی، صبر کر لیا ہوگا۔ انکا نے بھی میری تشویش محسوس کر کے یہی کہا تھا۔

”تم وسوسوں کو دل و دماغ سے نکال دو جمیل، نارنگ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہوگا۔ وہ دوبارہ تمہارے راستے میں دیوار کھڑی کرنے کی غلطی نہیں کرے گا۔“

”ہاں۔ لیکن ہر دو ارکان نام درمیان میں آجانے سے تم یہ کیوں سمجھ رہے ہو کہ وہ تمہارے بیٹوں سے مل گیا ہے؟“ انکارانی نے مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس بہم کو ذہن سے نکال دو۔ نارنگ، پنڈت پجاریوں کو اپنی ضرورتوں کے تحت مشین کے پرزوں کی طرح ضرور استعمال کرنے کا عادی ہے۔ لیکن دھرم کرم سے اُس کا دُور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ تمہیں اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا اُس وقت تک جب تک زیر زمین کام کرنے والوں سے اُسے مکمل طور پر چھٹکارا نہ مل جاتا.....“

انکا کی باتوں میں وزن تھا لیکن جب تک میں ہر دو ارکان نہیں پہنچ گیا، میری بے چینی برقرار رہی۔ اپنی منزل پر قدم رکھنے کے بعد ہی مجھے ذہنی سکون ملا۔ پنڈت نول کشور اب تک کالی کے مندر میں چھپا بیٹھا دُور دُور سے چنگاریاں چھوڑ رہا تھا، شعلے بھڑکا رہا تھا، سر بھرے پنڈت پجاریوں کو ایندھن کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ اب اُسے براہ راست مقابلے پر آنا پڑے گا۔ جنگ دوسرے کے علاقے میں لڑی جائے تو دھماکوں کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔ اپنی زمین پر ایک پٹانے کی آواز بھی دُور دُور تک سنائی دیتی ہے۔ میں بڑی دیر تک پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا کے رُخ کا اندازہ لگا تا رہا۔ انکا بھی پوری طرح محتاط نظر آنے لگی۔ اُس کی چلتیاں بڑی مستعدی سے اپنے حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔ اُس کے لئے فاصلوں کی کوئی قید نہیں تھی۔ اُس کی دُور بین نظریں سمندر کی تہوں تک بھی پہنچ سکتی تھیں۔ وہ بھی قرب و جوار میں نظریں دوڑا کر حالات کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

ہر دو ارکان دریا ئے گنگا کے ساحل پر واقع صوبہ یو پی کا ایک مشہور شہر ہے۔ ہندو اسے اپنے لئے بڑا مقدس سمجھتے ہیں۔ وہاں کی سرزمین پر ماتھا ٹیکنا بھی ان کے لئے کسی سعادت سے کم نہیں۔ اس شہر میں ہر بارہ سال بعد شیواجی کی یادیں کبھ کا میلہ منعقد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان سمٹ کر اس شہر میں سما جاتا ہے۔ ہندوستان سے باہر رہنے والے پنڈت پجاری بھی اس میلے میں دنیا کے دُور دراز علاقوں سے چل کر آتے ہیں۔ پنڈت پجاری اور پجاریاں سب ایک ساتھ گنگا میں اِشان کر تے ہیں۔ بڑا دھوم دھڑکا ہوتا ہے۔ دن رات اندر کی گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں۔ سکھ کی آوازیں دلوں کو گر ماتی ہیں۔ ہر دو ارکان کو دروازہ کُہا جاتا ہے۔ ہندوستان کے نقشے میں اسے ”ہری دوار“ کے نام سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہ ایک آبادی ایک لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔ دو یا تین لاکھ بھی ہوتی تو میری ذات پر اس کا

کیا اثر پڑتا؟ مجھے تو صرف دو افراد سے غرض تھی، پنڈت نول کشور جس نے میری ہڈ سکون زندگی کی سطح پر کنکر اچھال کر اضطراب کی لہریں پیدا کر دی تھیں۔ پریتم لال نے بھی مجھے صرف دو ہی نام بتائے تھے۔ دوسرا نام میری کلدیپ کے قاتل امر لال کے اکلوتے بیٹے چندرا کا تھا۔ دونوں کالی کے اس عظیم الشان مندر میں چھپے بیٹھے تھے جس پر مہاجنوں اور سینڈھ ساہوکاروں نے بے دریغ سرمایہ خرچ کیا تھا۔ وہ قلعہ بند تھے، خود کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔ لیکن میں اب اُن کا سکون برباد کرنے کی خاطر اُن کے سروں پر پہنچ گیا تھا۔ اب وہ زیادہ دنوں چین کی بنسری نہیں بجاسکتے تھے۔

میرے ذہن میں چندرا اور پنڈت نول کشور کا تصور چل رہا تھا۔ میں تصور میں نول کشور کو اپنے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی رقت سے گڑگڑا رہا تھا۔ اُس کا لہو لہان چہرہ دیکھ کر مجھے اُس پر ترس نہیں آیا۔ وہ بڑا موزی درندہ تھا۔ درندوں کو آزاد نہیں رکھا جاتا، لوہے کی مضبوط زنجیروں میں جکڑ کر قابو کیا جاتا ہے۔ انہیں آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ پھر درندگی کا مظاہرہ شروع کر دیتے ہیں۔ بہتر ہے انہیں موت کی نیند سلا دیا جائے۔

میری بے رحم نظریں نول کشور کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ موت کو سر پر منڈلاتا دیکھ کر اُس کی گھٹکی بندھ گئی تھی۔ وہ مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ حرام زادہ مگر مجھ کے آنسو بہا کر مجھے رام کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اگر اُسے علم ہو جاتا کہ اُس کے آنسو کے قطرے میرے سینے میں دھکتی آگ پر پڑوں گا کام سرانجام دے رہے ہیں تو شاید اس کے آنسو ٹھم جاتے۔ وہ میرے پیروں پر سر رکھ دیتا۔

نول کشور کے برابر امر لال کا وہ نوجوان بیٹا بھی دم بخود کھڑا مجھے ٹھٹکی باندھے دیکھ رہا تھا جس نے دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کی خاطر وندھیا چل کی برفانی گچھاؤں میں جاپ منتر کئے تھے۔ مجھے اُس کی جوانی پر ترس بھی آ رہا تھا۔ اس ولد الحرام نے بھی مجھے نیچا دکھانے کی خاطر اپنے سارے جنت منتر آزما ڈالے تھے۔ میرے قدم ذرا رپٹ جاتے، میں لڑکھڑاکر زمین پر گر پڑا ہوتا تو وہ اور نول کشور دونوں جنگلی سوروں کی طرح میرے اوپر چڑھ دوڑتے۔ میری زندگی کا چراغ گل کرنے کی خاطر کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کرتے۔ میرے مرجانے کے بعد بھی شاید وہ میرے مُردہ جسم کو بھنبھوڑتے رہتے، روندتے رہتے۔ پھر ٹکے پھونکے جاتے، کالی کو میری موت کا مژدہ سنانے کی خاطر حسین پجاریں منک منک کر

بے نچا نچا کر گھنٹیاں بجانی شروع کر دیتیں۔ مدھ اور بھگ کے پیالے گردش میں آتے، پنڈت پجاری مدھوش ہو کر میری موت کا جشن منانے کی خاطر حسین پجاریں اوڑھ مسموم دیوداسیوں کو مالی غنیمت سمجھ کر اپنی اپنی آغوش میں گھسیٹ لیتے۔ وہ کو لہے منکا کر گھنٹیاں بجاتا بھول جاتیں، ہٹے کئے پجاریوں کے بازوؤں میں بے بس ہو کر پھڑ پھڑاتا شروع کر دیتیں۔ کالی کا بت خاموش کھڑا تماشا دیکھتا رہتا۔

میں اپنے خوابوں میں گم تھا جب کسی کی آواز نے میرے حسین خیالوں کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ میں نے نظریں گھما کر دیکھا، وہ ایک سیدھا سادھا نوجوان نظر آ رہا تھا۔ ٹھوس اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک۔

”کہاں گم ہو مہاراج.....؟“ وہ میری طرف متحس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ”ہری دوار میں شاید پہلی بار آنا ہوا ہے۔ کہاں جانے کا دوا چار ہے.....؟“

”تم کون ہو.....؟“ میں نے سنجیدگی اختیار کر لی۔ انکارانی کی نظریں بھی نوجوان پر مرکوز ہو گئیں۔

”اپنا سیوک ہی سمجھ لو۔“ اُس نے بدستور انکساری سے کام لیا۔ پھر میرے سیدھے مادھے لباس کو دیکھ کر دبی زبان میں پوچھا۔ ”تمہارا شہ نام.....؟“

”جھیل، اس پر اپنا نام ظاہر نہ کرنا.....“ انکا نے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔ ”یہ ایک برائے نما ہوئل کا نمائندہ ہے۔ تمہیں مسافر سمجھ کر اپنے ٹھکانے پر لے جانا چاہتا ہے۔“

”نام نہ ظاہر کرنے میں کیا مصلحت ہے.....؟“ میں نے جان بوجھ کر سوال کیا۔

”تمہارا بھیجا ہوا پیغام شیوا کے ذریعے پنڈت نول کشور تک پہنچ چکا ہوگا۔“ انکا نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اُس کے آدمی ہر دوار کے تمام راستوں میں پھیل چکے ہوں گے۔ تمہاری خوشبو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ میں تمہیں محتاط رہنے کا مشورہ دوں گی۔“

”میں سمجھ رہا ہوں جان من.....“ میں نے لہرا کر جواب دیا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ دشمنوں کو میرے آنے کی اطلاع مل جائے۔ ایسا نہ چاہتا تو شیوا کو زندہ چھوڑ کر تمہاری ناراضگی کبھی نہ مول لیتا۔ وہ میرا بہت سکون برباد کر چکے۔ اب میری باری ہے، انہیں میرے آنے کی خبر ملے گی تو اُن کے اندر بھی ہلچل مچے گی۔ اٹھل پھل شروع ہو جائے گی۔“

مجھ رہی ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

ہیں۔ میں کالی کے مندر کی تلاش میں تھا جو میرے بدترین دشمنوں کی پناہ گاہ تھی۔ مگر وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ راستے میں جگہ جگہ پنڈت پجاری چلتے پھرتے نظر آئے۔ دو چار چھوٹے موٹے مندر بھی دکھائی دیئے۔ میں نے راستے میں منیجر سے بات نہیں کی، اپنے خیالوں میں متفرق رہا۔

گاڑی آئند بھون کے خوبصورت پارکنگ لاث میں جا کر رُکی۔ ہوٹل کی چار منزلہ عمارت کا حسن اور رکھ رکھاؤ قابل دید تھا۔ مجھے تعجب تھا کہ منیجر نے مجھے ہوٹل کے صدر دروازے پر اُتارنے کی بجائے پارکنگ لاث کا رخ کیوں اختیار کیا؟ میں نے فوری طور پر کوئی باز پرس مناسب نہیں سمجھی۔ انجن بند کر کے اُس نے تیزی سے نیچے اتر کر میرے لئے دروازہ کھولا۔ میں باہر آیا تو کہنے لگا۔

”ایک راستہ پارکنگ لاث سے بھی آئند بھون کے اندر جاتا ہے، اسے کیول ہمارے خاص گاؤں استعمال کر سکتے ہیں۔ عام مسافروں کو یہ راستہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم اپنے مہربانوں کی سیوا کا خاص دھیان رکھتے ہیں۔ تم تو دھرماتما ہو مہاراج، تمہارے چمنوں کی برکت سے آئند بھون کا کاروبار بھی چمک اُٹھے گا۔“

منیجر باتونی آدمی تھا۔ میں خاموشی سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ عقبی راستے کو اس طرز پر بنایا گیا تھا کہ کسی سرنگ سے گزرنے کا احساس ہوتا تھا۔ باہر بنزہ ہی بنزہ تھا، اندرونی راستوں پر بھی پیتل کے جھللاتے مخصوص گملوں میں خوشنما پودے موجود تھے۔ روشنی کا اہتمام بھی اس طرح کیا گیا تھا کہ وہ چھت کے گوشوں سے پھوٹی نظر آتی تھی۔ مجھے پہلی منزل کے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں آرام اور آسائش کا ساز و سامان بھی دہلی کے اشوک سے کم نہیں تھا۔ مجھے کسی لکھا پڑھی کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ راہداری میں مجھے ہوٹل کے عملے کے افراد بھی نظر آئے۔ اُن میں حسین و جمیل لڑکیاں بھی شامل تھیں جن کے ماتھوں پر سرخ رنگ کی بندیاں موجود تھیں۔ ان بندیوں کے اندر آئند بھون کا نام سنہری حروف سے لکھا گیا تھا جو دور سے جگمگاتا نظر آتا تھا۔ یہ گویا اُن کی شناخت تھی۔

”کچھ دیر سستا لو مہاراج۔“ منیجر نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ”دور سے آئے ہو، تھک گئے ہو گے۔ کوئی ضرورت ہو تو گھنٹی بجا کر کسی بھی سیوک کو بلا لینا۔ میں بھی آتا رہوں گا۔“ اُس نے بستر کے ساتھ ہی ایک طرف لگے ہوئے سوچ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بڑی

انکارانی کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا پیش کردہ جواز معقول تھا۔ وہ میری طرف سے توجہ کر پھر نو جوان کو گھورنے لگی۔

”تم نے کوئی جواب نہیں دیا مہاراج۔“ نو جوان اصل مقصد کی طرف آ گیا۔ ”اُمّی ہری دوار میں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے تو سیوک کے ساتھ چلو۔ ہمارے مسافر خانے میں تمہیں گھر جیسا آرام ملے گا۔ کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”یہاں کا سب سے بڑا ہوٹل کون سا ہے۔؟“ میں نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔ ”آئند بھون۔“ نو جوان نے برا سامنہ بنایا۔ ”آج کل رش نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے تمہیں خالی کمرہ مل جائے۔ لیکن۔۔۔۔۔ وہ خاموش ہو کر میرے حلیے کا جائزہ لینے لگا۔

”چپ کیوں ہو گئے بالک۔۔۔۔۔ میں نے اُس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر پوچھا۔“ ”آئند بھون میں مسافروں کی جیب کی بجائے اُن کے تن کے کپڑوں کا زیادہ دھیان رکھا جاتا ہے۔؟“

”تم خود سمجھداری کی بات کر رہے ہو تو پھر میں کیا بتاؤں؟“ اُس نے زہرا گئے کی چال چلی۔ ”وہاں سیدھے سادھے یا تریوں کی کھال اُدھینڑی جاتی ہے۔ بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار ہی ادھر کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ میں نے تمہیں کھل کر بتا دیا، آگے تمہاری مرضی۔“

”تم یہیں ٹھہرو جمیل۔۔۔۔۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ انکارانی مجھے رُکنے کا اشارہ کر کے سر سے اُتر گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کہاں گئی ہوگی۔ میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ میں نو جوان سے باتوں میں مصروف تھا کہ ایک بانکا بھیللا جوان میرے سامنے آ کر رُکا۔ سرائے نما ہوٹل کا جوان اُسے دیکھ کر خاموشی سے سرک گیا۔ میں نے آنے والے پر نظر ڈالی۔

”میرے ساتھ آؤ مہاراج۔۔۔۔۔“ اُس نے بڑے مہذب لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ”باہر گاڑی بھی موجود ہے۔“

”تم۔۔۔۔۔؟“

”آئند بھون کا منیجر ہوں۔“ اُس نے مسکرا کر اپنا تعارف کرایا۔ ”مجھے دیر سے خبر ملی ورنہ تمہیں اتنی دیر بھی انتظار نہ کرنا پڑتا۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ انکارانی کے زیر اثر تھا۔ میں باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ آئند بھون سے کچھ فاصلے پر تھا، لیکن اسے دیکھ کر دہلی کا اشوک یاد آ گیا۔ میری نگاہیں تمام راستے بھٹکتی

انکساری سے کہا۔ ”آئند بھون کے سیوکوں کو تمہاری سیوا کر کے جو آئند ملے گا، وہی تمہارا انعام ہوگا۔“

”تمہارا نام.....؟“ میں نے بستر پر کمر سیدی کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”سیوک کو بھنڈاری کہتے ہیں.....“ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”کالی کا بڑا مندر یہاں سے کتنی دور ہے.....؟“

”کیسی باتیں کرتے ہو مہاراج.....؟“ وہ میرے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ ”تمہارے لئے دُور کیا اور نزدیک کیا۔ تم پلکوں کو ایک اشارہ کر دینا، آئند بھون کی گاڑیاں کس دن کاہ آئیں گی؟ سب کچھ اپنا ہی سمجھو۔“

”ایک بات اور دھیان سے سن لے بالک.....“ میں نے ذرا تیز لہجہ اختیار کیا۔ ”ہمارے سلسلے میں اپنی زبان بند ہی رکھنا۔ کسی سے کچھ نہ کہنا۔ ہم سنیاسی لوگ ہیں، دوسروں سے الگ تھلگ رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ نمائش تم جیسے بالکوں کو شوبھا دیتی ہے۔ کالی کے مندر میں ہمارا ایک کام نہ انک جاتا تو ہم ادھر کبھی نہ آتے۔ کام پورا ہوتے ہی ہم کہیں اور سدھار جائیں گے۔ پنڈت پجاریوں کو ہمارے بارے میں بھنک مل گئی تو آئند بھون میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں ہوگی۔ ہم کس کس کی درشن پیاس بجھائیں گے؟ سن رہا ہے میری بات.....؟“

”تم چننا مت کرو مہاراج، مجھے بھی اپنا بھگت ہی سمجھو.....“

”بھگت ہی رہنا..... بگلا بھگت بننے کی کوشش نہ کرنا۔“ میں نے اُسے تنبیہی نظروں سے گھورا۔

”تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی مہاراج.....“ وہ سہم کر بولا۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ اُس کے قدموں کی آواز ابھر کر دُور ہوتی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد انکا کی آواز میرے کانوں میں گونجی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

”تم نے تو بھنڈاری کی جان ہی نکال دی۔ بگلا بھگت والی بات سن کر اُس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔“

”بھنڈاری کو جہنم میں جھونکنا انکارانی.....“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”تم جانتی ہو کہ میں ہر دوار میں تفریح کی غرض سے نہیں آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے دشمن میری گھٹ

ہائے بیٹھے ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے اُوپر کوئی جال پھینکیں، میں پیش قدمی کر کے خون سے ہولی کھیلنا زیادہ پسند کروں گا۔ منزل پر پہنچ کر سستا نا میرے اصول کے خلاف ہے۔ اب فیصلے جتنی جلدی ہو جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔ مجھے زندگی کی آرزو کبھی نہیں ہوئی۔ موت کی پرواہ بھی نہیں ہوگی۔“

”ایسی باتیں مت کرو جمیل.....“ وہ کسمسا کر بولی۔ ”میں ہوں تا تمہارے ساتھ.....“

”اب کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ میں نے نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ ”تم نے برسوں پہلے میری زندگی میں جو بیج بو یا تھا اب اس کی فصل کاٹنے کا وقت سر پر آ پہنچا ہے۔“

”جمیل.....“ انکا نے احتجاج کرنا چاہا، میں نے اُسے موقع نہیں دیا۔

”میں تم سے کوئی شکوہ، کوئی گلہ، کوئی شکایت نہیں کر رہا۔“ میں نے واضح الفاظ میں بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اب ان باتوں کا وقت بھی نہیں ہے۔ بیج منجھدار میں پھنس جانے کے بعد صرف حسرت بھری نظروں سے ساحل کی طرف دیکھنے سے کام نہیں چلتا۔ مجھے کنارے کی تلاش بھی نہیں ہے۔ لیکن ڈوبنے سے پیشتر میں ان کو بھی غرق کر دینے کا آرزو مند ہوں جو بار بار مجھے الجھا دیتے ہیں۔ کس کی جیت ہوگی؟ کون گھٹنے ٹیک دے گا؟ یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔“

”تم کچھ دیر آرام کر لو..... میں حالات کی سن گن لگا کر آتی ہوں۔“ انکا نے اپنا نیت کا اٹھا رکھا۔

”جانے سے پہلے ایک بات اور سن لو، میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔“ میں نے کہا۔ ”پریم لال کو دیوتاؤں نے آسمانوں پر بلا لیا ہے، یہ خبر تم نے ہی سنائی تھی۔ کلدیپ کا ساتھ بھی ختم ہو گیا۔ ایک ہمدرد گرو پر تاپ کی شکل میں سامنے آیا تھا، اُسے دُرگا کا عتاب چٹ گیا۔ میرا تمہارا ساتھ بڑا پرانا ہے انکارانی۔“ میں نے توقف سے بات جاری رکھی۔ ”ہم ایک دوسرے کی مجبوریوں کو سمجھتے ہیں۔ ہمیں ایک دوسروں کی قوتوں کا بھی اندازہ ہے۔ ہو سکتا ہے میرا خیال غلط ہو، مگر فی الحال میں یہی سمجھ سکا ہوں کہ دُرگا میرے راستے کی سب سے بڑا رکاوٹ بن گئی ہے۔ وہ مجھے تنہا کرنا چاہتی ہے، اپنے بھگتوں کے مقابلے میں اُسے میری فتح منظور نہیں ہوگی..... ہونی بھی نہیں چاہئے۔ اس کا اختیار تم پر چلتا تو شاید

پرتم لال کے بعد وہ تمہیں بھی نوچ کر میرے وجود سے علیحدہ کر دیتی۔ لیکن ایسا نہیں سکا۔ مگر میں محسوس کر رہا ہوں کہ شاید.....

”اس سے آگے اور کچھ نہ کہنا جیل.....“ انکا تڑپ کر بولی۔ ”میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔ کل کیا ہونے والا ہے؟ حالات کیا صورت اختیار کریں گے؟ میں جانتی ہوں۔ لیکن زبان نہیں کھول سکتی..... میں نے تم سے پہلے بھی یہی کہا تھا کہ کچھ مجبوریاں لاحق ہیں۔ ایک بات اور بھی کہی تھی، اپنے ذہن کو کرید کر دیکھو، یاد کرو..... میں نے کہا تھا کہ میں خبر سے تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی..... ہاں، تم دھتکار دو تو اور بات ہے۔“

انکا کے لہجے میں خلوص تھا، اعتماد تھا۔ وہ ڈیڑھ بالشت کی فتنہ ڈرگا کے مقابلے پر میرا ساتھ نبھانے کا یقین دلا رہی تھی۔ میرے اختیار میں ہوتا تو اُس کو اپنی ہاتھوں میں سمیٹ لیتا۔ اُس کے ہونٹ چوم لیتا، دل کے کسی محفوظ گوشے میں ہمیشہ کے لئے چھپا لیتا۔ اُس کی بلائیں لیتا..... میری آنکھوں کے گوشے نمناک ہونے لگے۔ میں نے الفاظ کو اظہارِ تشکر کے ذریعہ بتانے کی ٹھانی۔ اُس نے موقع نہیں دیا، پھدک کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے دوبارہ آنکھیں موند لیں.....!

شام کو بھنڈاری نہ جگاتا تو میں سوتا ہی رہتا۔ میں نے سر پر نظر ڈالی، انکاراتی وہاں موجود نہیں تھی۔ اُسے گئے بہت وقت گزر چکا تھا۔ ہر دو اربا بڑا شہر نہیں تھا کہ انکاراتی کی واپسی میں اتنی دیر ہوتی۔ اُس کے لئے فاصلوں کی کوئی قید بھی نہیں تھی۔ وہ بجلی کی رفتار سے تیز کام کرنے والی حیرت انگیز قوتوں کی مالک تھی۔ کالی کے مندر میں میری ذہنی پرواز بھی منزل کے ناویدہ آہنی جال سے ٹکرا کر واپس آگئی تھی۔ ممکن ہے انکا کبھی اندر داخل ہونے میں دشواری پیش آرہی ہو۔ مندر میں داخل ہوئے بغیر وہ نول کشور اور چندرا کے بارے میں نہیں جان سکتی تھی۔ ابھی تک اسی تنگ و دو میں لگی ہوگی، ممکن ہے وہ درمیان میں کئی وقت آئی ہو، مجھے محو خواب دیکھ کر واپس چلی گئی ہو، اُس نے مجھے جگانا مناسب نہ سمجھا ہو۔ مندر میں داخل ہونے کے لئے اُس کے پاس اور بھی کئی طریقے تھے۔ وہ کسی پنڈت پجاری کے سر پر پنجے گاڑ کر بیٹھ جاتی، سارے منزل دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ وہ دینی طور پر کسی پجارن کا ذہن پلٹ کر اُسے اندر کے حال احوال بتانے پر مجبور کر سکتی تھی۔

”تم اُٹھ کر اشان کر لو مہاراج، تھکے ہو گے، میں تمہارے لئے جل پانی کا بندوبست

رہا ہوں۔“ بھنڈاری اپنی بات مکمل کر کے واپس چلا گیا۔ میں نے اُٹھ کر غسل خانے کا رخ کیا۔ نیم گرم پانی سے غسل کرنے سے ذہن قدرے ہلکا ہو گیا۔ میں تیار ہو کر باہر نکلا تو بندھون کی ایک ہوسٹ اپنے لبوں پر مسکرائیں بکھیرے میری منتظر تھی۔ ٹرائی میں پھل، دودھ اور دوسرے لوازمات رکھے نظر آرہے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس خوبصورت اور جوان حسینہ سے دل بہلانے کی باتیں ضرور کرتا۔ لیکن میں نے اُسے صرف ایک نظر بھر کر دیکھا، پھر اشارے سے باہر بھیج دیا۔ اُس کو میرا خشک رویہ پسند نہیں آیا، تیزی سے پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ بھنڈاری نے اُسے میرے کمرے میں بھیجنے سے پیشتر محتاط رہنے کی ہدایت ضرور کی ہوگی۔

پیٹ کو ایندھن نہ ملے تو دل و دماغ پر بے کیفی مسلط رہتی ہے۔ میت میں شرکت کرنے والوں کے لئے بھی کھانے کا انتظام ہوتا ہے۔ عجیب رسم و رواج ہیں اس دنیا کے۔ ایک باپ اپنے جوان بیٹے کے غم میں مٹھا لٹھکتا ہوتا ہے، اُس کے بڑھاپے کا سہارا چھن جاتا ہے، کڑوا جاتی ہے، عزیز و اقارب، دوست احباب میت کے نہلانے ڈھلانے اور دفنانے تک اُس کی نمکساری میں لگے رہتے ہیں۔ اُس مٹھا لٹھکتا شخص کو خود اپنا ہوش نہیں ہوتا، کل کی فرتار ہی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی لازم ہے کہ نمکساری کے لئے آنے والوں کی خاطر مدارات کرے، کھانے پینے کا اہتمام کرے۔ نہ کرے تو لوگ باتیں بنانی شروع کر دیتے ہیں۔ ساری رواداری بھول کر تنقید کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ میرے تو ایک دو نہیں، کئی اپنے ایک ایک کر کے پھٹڑ چکے تھے۔ میں کسی اور کا نہیں، خود اپنا پیٹ بھر رہا تھا۔ انسان کا جی نہ چاہے تب بھی اُسے کچھ نہ کچھ زہر مار کرنا پڑتا ہے۔ خوراک انسان کے جسم کے لئے ایک ضرورت ہے، اس کے بغیر کام نہیں بنتا۔ مشین کو تیل نہ ملے تو وہ بھی چلتے چلتے جام ہو جاتی ہے۔ خوراک بڑی ظالم شے ہے۔ پیٹ کے لئے خوراک ضروری ہے اور خوراک حاصل کرنے کی خاطر پیسے درکار ہوتے ہیں۔ انسان کے پاس خوراک خریدنے کے لئے پیسے نہ ہوں تو وہ چوری کرنے، ڈاکہ مارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کچھ نہ بن پڑے تو خود کشی کر لیتا ہے۔ جانوروں میں بھی خوراک ہی کا مسئلہ درنگی تک طول پکڑ لیتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو ہلکھاتے ہیں، انسان اور جانوروں میں صرف خوراک ہی ایک قدر مشترک ہے جو دونوں اہم اور درنگی پر اُکساتی ہے۔ یہی خوراک انہیں آپس میں بھی ایک دوسرے کا دشمن بنا



بڑا جو کچھ روز پہلے ہی بنارس سے آیا ہے۔ اُس کا ذہن کچا تھا اس لئے آسانی سے میرا معمول بن گیا۔ مندر سے واپسی میں اُسے دیر لگی۔ میں سمجھی شاید میرے بچوں کا اثر اُسے پوری طرح قابو نہیں کر سکا۔ تم جانتے ہو کہ میں کسی کا ذہن بھی معطل کر کے اُسے اپنے اشاروں پر نچا سکتی ہوں۔ لیکن میری موجودگی اُس کے سر پر ہونا شرط ہے۔ پریم لال مہاراج نے میری اس قوت میں بھی کچھ اضافہ کیا تھا۔ اب میرے بچوں کا اثر کسی کے لئے فخر وقت تک قائم رہ سکتا ہے۔ پجاری کی واپسی میں دیر ہوئی تو میں بھی فکر مند ہو گئی۔ لیکن وہ واپس آ گیا۔“

”کیا بتایا اُس پجاری نے.....؟“ میں نے بے چینی کا اظہار کیا۔

”تمہارا ایک شکار ہاتھ سے نکل گیا۔“ انکا دبی زبان میں بولی۔

”یہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....؟“ میری وحشتوں میں اضافہ ہو گیا۔ ”کون نکل گیا؟“

”چندرا.....“

”کیا.....؟“ میں حیرت سے اُچھل پڑا۔ ”وہ سنپولا کیسے نکل گیا؟ مجھے بتاؤ انکارانی، اس وقت وہ کہاں ہے؟ یہ دنیا میرے پیروں کے چکر سے زیادہ وسیع نہیں ہے۔ وہ حرامزادہ دنیا کے جس کونے میں بھی ہو گا، میں اُسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ میں اُسے ختم کئے بغیر نہیں مروں گا۔ سنا تم نے؟ میں جب تک اُسے جہنم رسید نہ کر لوں، سکون کا ایک لمحہ بھی میرے اوپر حرام ہو گا..... تم مجھے صرف اُس کا پتہ بتا دو، میں اُسے پاتال سے بھی چٹا پکڑ کر باہر گھسیٹ لوں گا۔ وہ میری دسترس سے دُور نہیں جاسکتا..... ناممکن ہے۔“ میرے جنون میں اضافہ ہونے لگا۔

”خود کو سنبھالو جمیل.....“ انکا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہر دو ارتکب آگئے ہو تو پنڈت نول کٹور کا قصہ پاک کر لو۔ ایک رہ جائے گا، وہ بھی مل جائے گا۔ کہاں تک بھاگے گا؟ کب تک جان بچائے گا.....؟“

”کیا تمہیں علم نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے.....؟“

”معلوم ہوتا تو تم سے کیوں چھپاتی.....؟“ انکا کسمسانے لگی۔ مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ

ٹوٹ پڑے۔

”تم..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو انکارانی.....؟“ میں نے اُسے بڑے غور سے دیکھا۔ ”تم

دیتی ہے۔ سلسلہ یوں ہی جڑ پکڑتا ہے۔ پھر بات بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پیٹ بھر نے پہلے انسان کو صرف جسم کی غذا کی ضرورت سنانی ہے۔ پیٹ بھر جائے تو ہری ہری سوچیں گے۔ ہے۔ دانہ گندم کی خواہش انسان کو در بدر بھی کر دیتی ہے۔ ہماری انسانیت کی طویل تاریخ کی ابتداء بھی دانہ گندم ہی سے ہوئی تھی، پھر فسانے میں جوڑ لگتے گئے۔

میں بھی پیٹ میں ایندھن بھر رہا تھا۔ میرے ذہن میں انکارانی کی غیر موجودگی، احساس کروٹیں بدل رہا تھا۔ میں جس منزل پر پہنچ چکا تھا وہاں قدم قدم پر خطرات موجزن تھے۔ ایک ذرا سی لغزش سارا کھیل چو پٹ کرنے کا سبب بن سکتی تھی۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ ہوسٹس کچھ دیر بعد دوبارہ دروازے پر دستک دے کر اندر آئی۔ کمرہ اُس کے صحن کی چمک دمک سے روشن ہو گیا۔ اُس کے جسم کی خوشبو نے پورے ماحول کو معطر کر دیا۔ میں نے پھر اُسے نظر انداز کر دیا۔ وہ خاموشی سے ٹرائی گھسیٹی، لہراتی، بل کھاتی واپس لوٹ گئی۔ مگر نے اُسے کمرے میں ٹھہلنا شروع کر دیا۔ انکا کے بارے میں میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی..... وہ میرے سر پر واپس آگئی تو میں نے عالم تصور میں اُسے دیکھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات غمازی کر رہے تھے کہ اُس کے پاس میرے لئے اچھی بری کئی خبریں سنانے اور موجود تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں متضاد کیفیتیں نظر آرہی تھیں۔

”جو کچھ جمع کر کے لائی ہو میرے سامنے ڈھیر کر دو۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”چیزیں میرے کام کی ہوں گی، میں ایک طرف کر لوں گا۔ باقی کو نظر انداز کر دوں گا۔ اختصار سے کام نہ لینا۔ میں تفصیل سننا پسند کروں گا۔“

”جمیل.....“ انکا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کالی کے مندر کے چاروں طرف بڑا مضبوط منڈل کھینچا گیا ہے۔“

”کیا تم نے اندر جانے کی کوشش کی تھی.....؟“ مجھے اُس کی مجبوری کا خیال آ گیا۔ ”نہیں..... تمہیں معلوم ہے، میں کالی کے مندر میں نہیں جاسکتی۔ لیکن میری نظر نے جس حصار کو دیکھ لیا ہے اس میں صرف کسی پنڈت یا پجاری کی قوت کو دخل نہیں ہوتا۔ کسی دیوی کی شکست بھی ضرور شامل ہے۔“

”ڈرگا.....“ میرے ذہن میں ایک ہی نام ابھرا۔

”مندر کے اندر کے حالات معلوم کرنے کی خاطر مجھے ایک نئے پجاری کا انتخاب

چاہیں دیکھ کر بھی بھڑک اٹھتا ہے۔ اُسے ابھی تک یقین نہیں آیا کہ تم نے شیوا کو محض پیغام پہنچانے کی خاطر زندہ چھوڑ دیا ہوگا۔ وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ نیانے زندگی بچانے کی خاطر تم سے کوئی سمجھوتا کر لیا ہے۔“

میرا دل چاہا کہ دیوانہ وار قہقہے لگانا شروع کر دوں۔ نول کشور کو میرے تصور نے یقیناً ہی کر دیا تھا۔ اگر وہ پاگل نہ ہوتا تو شیوا پر شبہ نہ کرتا۔ اُسے اپنے خاص خاص آدمیوں کی پہچان ہوتی۔ اُس کے لئے ہیرے اور کانچ کے ٹکڑے کا فرق جاننا ضروری تھا۔ وہ اپنے رسم و رواج کے مطابق شیوا کا کوئی امتحان بھی لے سکتا تھا، شیوا اس امتحان میں بھی ضرور پورا نرانا۔ میری نظروں نے اُسے شناخت کر لیا تھا، وہ کھرا سونا تھا۔ اُس میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ اُس نے میرے مقابلے میں مردوں کی طرح سینہ تان کر اپنی شکست تسلیم کی تھی۔

ابن پھیلا کی زندگی کی بھیک نہیں مانگی تھی۔ اُس نے ٹھوس لہجے میں کہا تھا۔۔۔۔۔۔ ”میں اب ہی سینہ تانے مردوں کی طرح قدم جمائے کھڑا ہوں۔ مجھے مار دو۔ میں تم سے جیون کی ضمانت نہیں مانگوں گا۔“ انسان جب اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگے تو اُس کی خود اعتمادی بڑھ نہیں رہتی۔ اپنے بازوؤں کا اعتماد ختم ہو جائے تو وہ بزدل بن جاتا ہے۔ کسی پناہ گاہ نہ چھپ کر بڑی بڑی باتوں کا اعلان کرنا، ڈینگیں مارنا اور بات ہے۔۔۔۔۔۔ طاقت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب دوحریف میدان میں اترتے ہیں۔

میں بدری نرائن کا انجام بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ بڑا ذہین، بڑا دُور اندیش، بڑا شاطر اور بڑی کمپنی خصلتوں کا مالک تھا۔ جب تک میں کمزور رہا وہ بار بار میرے تعاقب میں لپکتا رہا۔ مجھے آنکھیں دکھاتا رہا۔ انکارانی کو چاپ کے ذریعے حاصل کرنے کے بعد تر بنی جیسا کہ شمشیر بن گیا تھا۔ اُس کا انجام بھی میری خواہش کے عین مطابق ہوا۔ بدری نرائن نے رفاقت، ہواؤں کا رخ اور طاقت کا توازن پر کھنے کا عادی تھا۔ میں نے جب قوتیں بدل کر لیں، جب نندا اور کپالا کی تعلیم نے مجھے زندگی اور موت، انسانیت اور درندگی کے فرق سے آگاہ کیا، جب انکارانی بھی میری قوتوں سے آنکھ ملانے سے کترانے لگی تب بدری نرائن جیسے پنڈت نے بھی عورتوں کی طرح میرے ساتھ آنکھ بچولی شروع کر دی۔ امر مانجی اُس کی حمایت میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا۔۔۔۔۔۔؟ جیت اعتماد اور یقین کی بات۔ میری کلدیپ تو اس وقت میسور کی پہاڑیوں سے نیچے آئی تھی جب امر لال نے

جولاز وال قوتوں کی مالک ہو، جس کے سامنے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، جو دلوں کی گہرائیوں میں جھانک کر انسانی خیالات بھی پڑھنے کی ناقابل یقین صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ۔۔۔۔۔۔ وہ میرے ایک دشمن کا پتہ نہیں لگا سکتی۔۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔۔ کیا میں تمہاری بات پر اعتماد کروں؟ دل نہیں مانتا۔“

”ہاں جلیل۔۔۔۔۔۔ میں غلط نہیں کہہ رہی۔“ اُس نے ہاتھ ملتے ہوئے یقین دلایا۔ ”یہ پہلا اتفاق ہے جب میری نگاہوں کے سامنے رُکاوٹیں کھڑی کی جا رہی ہیں۔ لندن سے واپس کے سفر کے دوران بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ تم درمیان میں نہ آگئے ہوتے تو میں اشوک کی اچانک دیوانگی کا بھید ضرور پالیتی۔ وہ قوت میری نظروں سے دُور نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن اس بار۔۔۔۔۔۔ اس بار۔۔۔۔۔۔“

”اس بار کیا ہو گیا۔۔۔۔۔۔؟“ میں نے تمللا کر پوچھا۔ ”اس بار کون سی مجبوری آڑے آ رہی ہے۔۔۔۔۔۔؟“

”میں اس کا بھی کھوج لگا لوں گی۔“ انکا نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”ممکن ہے تمہارا اندیشہ درست ہو، دُرگا کی مہان شکتی میرے راستے میں آگئی ہو۔۔۔۔۔۔ اگر ایسا ہوا ہے تو یہ قوتوں کے توازن کو برقرار رکھنے کے معاملے کی خلاف ورزی ہے۔ مجھے کچھ سمجھنے کا موقع دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ چند راکا سراغ لگتے ہی تمہیں آگاہ کر دوں گی۔“

”اگر سراغ نہ ملا تو۔۔۔۔۔۔؟“ میں نے اُسے ضاحت طلب نظروں سے گھورا۔

”پھر دُرگا کی طرح مجھے بھی آسمان پر کئے گئے وعدوں کی خلاف ورزی کرنی پڑے گی۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”اپنی انکارانی پر بھروسہ رکھو، میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔“

”پجاری نے تمہیں کالی کے مندر کے اندر کا اور کیا حال بتایا ہے۔۔۔۔۔۔؟“ میں نے اپنی وحشتوں پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

”شیوا نے تمہارا پیغام پنڈت نول کشور تک پہنچا دیا ہے۔“ اُس نے زہر خند سے جواب دیا۔ شیوا کو اس جرم کی سزا بھی مل چکی ہے۔ اُسے مندر کے تہہ خانوں میں ایک کال کھڑی میں قید کر دیا گیا ہے۔“

”کیا جرم سرزد ہوا تھا شیوا سے۔۔۔۔۔۔؟“

”زندہ رہنے کا جرم۔۔۔۔۔۔“ انکا نے پہلو بدل کر کہا۔ ”نول کشور تمہارے سلسلے میں اپنی

کمینگی کا ثبوت پیش کیا تھا۔ وہ درمیان میں نہ آتا تو سید کی لائھی ہی بدری نرائن کے لئے بہت ہوتی۔

”کیا سوچ رہے ہو جیل.....؟“ انکا نے پوچھا۔

”تمہارے مشورے پر غور کر رہا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ہر دو ایک آیا ہوں تو پنڈت نول کشور کی اترھی کو بھی شمشان گھاٹ تک پہنچاؤں، اس کے بعد چندرا کی باری ہوگی۔“

”ہر دو میں تمہارے آنے کی اطلاع پا کر کالی کے مندر میں بڑے بڑے گیانی دھیانی پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ سب کا خیال ہے کہ مندر کو ایک مُسلے کے گندے خون سے ناپاک نہ کیا جائے، باہر نکل کر گھیرا جائے۔ لیکن وہ پنڈت نول کشور کا کہا بھی نہیں ٹال سکتے۔“

”وہ کیا کہہ رہا ہے.....؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”وہ ابھی تک کالی کے نام پر دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے۔“ انکا نے غلامی چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ہر وقت پوری طرح ہوشیار رہنا ہوگا۔ نول کشور کی چندال چوکنڑی میں بچے ذات کا ایک چمار بھی شامل ہے۔ میں نے جس پجاری کو معمول بنایا تھا اُس نے بتایا ہے کہ وہ چمار سفلی کا ماہر ہے۔ اُس نے پنڈت پجاریوں کے بچے بیٹھ کر دعویٰ کیا ہے کہ وہ تمہیں دُور رہ کر بھی اپنے گندے عمل سے ہلاک کر سکتا ہے۔“

میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ انکارانی کی بات سن کر میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ذہن میں آتش فشاں کروٹیں بدلنے لگا، مجھے اپنی کہانی یاد آرہی تھی۔ میرا پورا ماضی میری نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگا۔ مجھے وہ بھیا تک اور خوفناک منزلیں یاد آئیں جن سے گزر کر میں اس مقام تک پہنچا تھا۔ ان ہولناک کہانیوں کو یاد کر کے مجھے جھرجھری آ گئی۔ میرے نام لیوا، میرے قارئین گواہ ہیں کہ میں نے کبھی حالات کے سامنے کھٹے نہیں ٹیکے، کسی سورما سے خوفزدہ ہو کر زندگی کی بھیک نہیں مانگی۔ میں پارسائی کے دعوے نہیں کر سکتا، میری زندگی کا ورق ورق گناہ آلود ہے۔ کیوں ہوا؟..... کیسے ہوا؟..... میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا۔ ہر شخص اپنے جذبات، اپنے احساسات کا خود گواہ ہوتا ہے۔ میں بنی دیانت داری سے اس بات کی گواہی دے سکتا ہوں کہ میں صرف نام کے اعتبار سے مسلمان ہوں، مذہب سے میرا دُور کا بھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ مگر..... ایک بات یہ بھی درست ہے کہ

میں نے خدا کے دُجو سے کبھی انکار نہیں کیا۔ کسی اور کو اُس کے برابر نہیں سمجھا۔ یہ خیال بھی بڑے دل و دماغ کے کسی نہ کسی گوشے میں ہمیشہ محفوظ رہا کہ مرنے کے بعد مجھے اُسی کے سامنے پیش ہونا پڑے گا جس نے مجھے زندگی کی نعمتوں سے مالا مال کیا تھا۔ میرا نامہ اعمال بڑے ہاتھ میں ہوگا۔ میں اس ”لم یزل“ کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہوں گا۔ وہاں میری نازنیاں کسی کام نہیں آئیں گی۔ انکارانی بھی میرا ساتھ چھوڑ دے گی۔ وہ فیصلہ سنا دے گا۔ بندے کی ترکی تمام ہو جائے گی۔ زبان ہلانے، دُوم مارنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اُس دن شیطان مردود اپنی کامیابی کا جشن منائے گا، انسان بے بسی سے کھڑا تماشا دیکھتا رہے گا..... وقت گزر چکا ہوگا، بچھتاوے کسی کام نہیں آئیں گے.....!

مجھے بھی شیطانوں نے بھٹکادیا تھا۔ میں نے اُن کا قصہ ختم کرنے کی ٹھان لی تھی۔ ”کہاں کا ارادہ ہے جیل.....؟“ انکا نے مجھے اُٹھتا دیکھ کر پوچھا۔ اُس کی نظریں بڑے چہرے کے تاثرات پر مرکوز تھیں۔

”کالی۔ کے مندر کی کشش مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے....“ میں نے زہر خند سے جواب دیا۔ ”آند بھون میں سستانے اور رنگ رلیاں منانے کے اور بھی مواقع آئیں گے۔“

”میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔ لیکن تم مندر میں داخل نہیں ہو سکو گے۔“

”میں یہاں بیٹھ کر بھی کیا کروں گا.....؟“ میں کمرے سے نکل کر باہر آ گیا۔ سید کی ٹٹی میرے ساتھ تھی۔ انکا نے میرے سر پر ٹھلنا شروع کر دیا۔ اُس کے چہرے پر تشویش کے تاثرات ابھرنے لگے۔ میں عقبی راستے سے گزر کر باہر آیا تو بھنڈاری بھاگتا ہوا سامنے آیا۔ کسی نے اُسے میرے باہر نکلنے کی اطلاع کر دی تھی۔

”کہاں جانا ہے مہاراج؟“ اُس نے ہاتھ باندھ کر پوچھا۔

”کسی سواری کا بندوبست کر دے.....“ میں نے سرد لہجے میں حکم دیا۔ ”کالی کے درشن بھارہا ہوں۔ ڈرائیور سے کہنا کہ جہاں میں کہوں وہیں اُتار کر واپس آجائے۔ میں بحث نہیں پسند کرتا۔“

”تم جو کہو گے وہی کرے گا۔ لیکن واپسی میں.....“

”پھر تو نے لیکن ویکن شروع کر دی.....“ میری پیشانی پر سلوٹیں ابھریں تو بھنڈاری نے زبان کو بریک لگ گیا۔ اُس کے حکم پر گاڑی آگئی۔ میں خاموشی سے بیٹھ گیا، گاڑی

میں بزرگوں سے اتنا ضرور سنا ہے وہ جس کے نام پر اڑائی جاتی ہیں اُسے پانی میں بہا بھی نہیں چھوڑتیں۔ اگر کسی وجہ سے یہ خطرناک عمل ناکام ہو جائے تو پھر اسے کرنے کا ہانڈی کا شکار ہو جاتا ہے۔

میں نے سید کی لاشی پر اپنی گرفت مضبوط کر رکھی تھی۔ ہانڈی مجھ سے بیس فٹ کے پلے پر رک گئی تو انکا نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے۔ پھر اُس کی زبان سے قابل فہم زبان میں کچھ جملے ادا ہونے لگے۔ میں نے پہلی بار انکارانی کو ایک انوکھی زبان بولتے سنا تھا۔ اُس کی آنکھیں کوری ہانڈی پر جمی ہوئی تھیں، چہرے سے غیض و غضب کا اظہار ہو رہا تھا۔ جس انداز میں وہ بول رہی تھی اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا وہ کسی نادیدہ نکت کو بے نقط سنارہی ہو۔ ہانڈی فضا میں معلق گردش کرتی رہی۔ انکارانی کی زبان سے غلط لپکتے رہے۔ وہ خاموش ہوئی تو کسی نے ناک میں منمنانا شروع کر دیا۔

”تو درمیان میں کہاں سے آگئی؟ میرا تیرا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ تو درمیان سے ہٹ جا، میں نے جس دشت کے پلید نام پر ہانڈی چھوڑی ہے اُس کا کریا کرم ہو کر رہے گا۔ کالی اور رگ کا بھی یہی اچھا ہے۔ میری بات مان لے۔۔۔۔۔ درمیان میں آئے گی تو، تو بھی نشٹ ہو جائے گی۔“

انکارانی کی نگاہوں سے نفرت کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اُس نے پھر اپنی زبان بولنی شروع کر دی۔ لب و لہجے سے اُس کے غصے کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ نہیں گرائے، ہانڈی بھی ایک ہی محور پر چمکراتی رہی۔

”ایسا کبھی نہیں ہو سکتا مورکھ۔۔۔۔۔ اپنی ہٹ سے باز آ جا، میرا کہا مان لے۔ سے بیت رہا ہے۔ میں تجھے ایک آخری موقع اور دے رہا ہوں، اس کے بعد میں ڈوری چھوڑ دوں گا۔ اُنکو تو جان۔“

جواب میں پھر انکارانی کے منہ سے شعلوں کی دھواں دھار آتش بازی چھوٹنے لگی۔ ہری جانب سے آخری وارننگ دی گئی، انکا دونوں ہاتھ بلند کئے جمی کھڑی رہی۔ اُس کی ہاتھوں کی جنبش ختم ہو گئی، وہ ٹھنکی باندھے ہانڈی کو چمکراتا دیکھتی رہی۔ موت اور زندگی کا صبر نہا کھیل بڑا اعصاب شکن تھا۔

اچانک ہانڈی کو ایک جھٹکا لگا، وہ برق رفتاری سے نیچے آئی۔ انکارانی شاید اسی بات کی

چل پڑی۔

”جمیل۔۔۔۔۔“ انکا نے دہی زبان میں کہا۔ ”اپنے گرد حصار کھینچ لو، دائرے سے باہر نکلنے کی غلطی نہ کرنا۔ میرا خیال ہے وہ تمہیں مندر تک پہنچنے سے پہلے کہیں راستے میں گھیرنے کی کوشش ضرور کریں گے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انکا کا اندازہ بھی غلط ثابت نہیں ہوا۔ ڈرائیور بڑی مستعدی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ لیکن ایک میدان سے گزرتے وقت اُس نے اچانک فلٹ بریک لگا کر گاڑی روک دی۔ پھر دروازہ کھول کر ہڈیانی انداز میں چیختا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ انکا کی نظروں میں شعلے بھڑکنے لگے۔

”وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔۔۔۔۔“ اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”چمار نے تمہارے اوپر غلطی کی ہانڈی چھوڑی ہے۔ تم دیکھنا میں اُس کا کیا حشر کرتی ہوں۔“

میں لپک کر گاڑی سے باہر آیا۔ فضا میں ایک کوری ہانڈی تیرتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی۔۔۔۔۔ ہانڈی کو بند کرنے کے لئے سرخ رنگ کا کورا کپڑا استعمال کیا گیا تھا۔ میدان کے آس پاس جو دس بارہ مقامی لوگ موجود تھے وہ بھی ہانڈی کو دیکھ کر ”رام دہائی۔۔۔۔۔“ اور ”رام نام ستیہ ہے“ کا نعرہ لگاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ میدان کی دوسری طرف کالی کالنگ بوس مندر سر اٹھائے کھڑا تھا۔

”چمار ذات نے ہماری ایک اور مشکل آسان کر دی۔“ انکا نے بڑے یقین سے کہا۔

”تم دیکھنا اب میں کس طرح پنڈت نول کشور کے منزل کا سواستیاناں کرتی ہوں۔۔۔۔۔“ میری نظریں کوری ہانڈی پر جمی ہوئی تھیں جو فضا میں تیزی سے گردش کرتی ہوئی نیچے آ رہی تھی۔ مجھے بھگوان پر شاد یاد آ گیا، اُس نے بھی مجھے اُس وقت ایسی ہی کوری ہانڈی دی تھی جب ترینی ایک منزل میں بیٹھا انکارانی کو اپنے قبضے میں کرنے کی خاطر جا پکڑا تھا۔ میں نے ہانڈی ترینی کی طرف اچھال دی تھی لیکن اُس کا انجام میری توقع کے برعکس ہوا۔ ترینی بچ گیا۔ بھگوان پر شاد خود اپنے جال میں پھنس کر مارا گیا۔ اُس کی موت بڑی اذیت ناک ثابت ہوئی تھی۔

میں خوفزدہ نہیں ہوا۔ میری نگاہیں اُس ہانڈی کو دیکھ رہی تھیں جو تیر کی طرح میری طرف آ رہی تھی۔ مجھے سفلی کے سلسلے میں کچھ نہیں معلوم، لیکن ان ناپاک طلسمی ہانڈیوں کے

منتظر تھی۔ اُس نے زور سے پھونک باری، فضا میں گھن گرج کی آوازیں گونجنے لگیں۔ کچھ دیر یہ سلسلہ جاری رہا، پھر ہانڈی نے دوبارہ فضا میں بلند ہونا شروع کیا۔ انکارانی کے گلابی ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

کسی کے چیخنے کی آوازیں کر میری توجہ کالی کے مندر کی جانب مبذول ہوئی۔ ایک لمبا ترنگا کالا بھجنگ پجاری نما شخص دھوتی باندھے بھاگتا ہوا مندر کے دروازے سے باہر نکلا۔ اُس کا اوپری جسم تنگا تھا، چہرے سے وحشت نچک رہی تھی۔

”جیل.....“ انکارانی نے تیزی سے میرے کاندھے پر آکر کان میں سرگوشی کی۔ ”پنڈت نول کشور نے جو منڈل کھینچا تھا اس کے ٹوٹنے کا وقت آ گیا ہے۔ مندر کے اوپر بجلیاں چمکیں، شعلے لپکیں تو سمجھ لینا کہ تمہارا راستہ صاف ہو گیا۔ تم بلا دھڑک اندر چلے جانا۔ اپنے ہوش برقرار رکھنا۔ میں باہر رہ کر بھی تم سے دور نہیں رہوں گی۔“

مندر سے برآمد ہونے والا شخص پاگلوں کی طرح حلق پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا، لیکن کوری ہانڈی بجلی بن کر اُس کے وجود سے ٹکرائی۔ پجاری جو یقیناً ہمارا مطلوبہ سفلی کرنے والا چمار تھا، بلبلارز مین چائے لگا۔ اُس کے جسم سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ وہ زندگی بچانے کی خاطر دوبارہ اُٹھ کر گرتا پڑتا مندر کی طرف بھاگا۔ اُس کے جسم کے شعلے منڈل سے ٹکرائے تو بجلیاں کوندنے لگیں..... بادل کے گرجنے کی خوفناک آوازیں ابھرنے لگیں..... مندر کے چاروں طرف چنگاریاں اُڑتی نظر آرہی تھیں۔ انکا خوشی سے چلائی۔

”جلدی کرو جیل، نول کشور کا منڈل ٹوٹ کر بکھر چکا ہے..... اپنا خیال رکھنا۔“ میں نے سید کی لانا بھی پر گرفت مضبوط کی اور برق رفتاری سے مندر کے بڑے بھانک کی سمت دوڑنے لگا جہاں پنڈت پجاریوں کا ہجوم ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا.....!!



مندر کے اطراف جو منڈل پنڈت نول کشور نے قائم کیا تھا، انکارانی نے اس کا تباہ کر دیا۔ ایک غلطی بھی انسان کے حق میں بڑی تبدیلیاں رونما کر دیتی ہے۔ سفلی باننے والے چمار کی باتوں نے وقتی طور پر میرے دشمنوں کو ضرور خوش کیا ہوگا، وہ میری موت کا جشن منانے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے، پجاریوں نے بناؤ سنگھار شروع کر دیا ہو گا۔ آنے والے لمحات اُن کے دلوں کو گرما رہے ہوں گے۔ لیکن میری انکارانی نے بازی ہٹ دی۔

نول کشور اور اُس کے ساتھیوں کے دل اس وقت دھڑکنے شروع ہو چکے ہوں گے جب خوفناک ہانڈی کو فضا میں چھوڑا گیا ہوگا، سب کی نظریں اُسی ہانڈی پر جمی ہوں گی، اُن کے چہرے تہمتار ہے ہوں گے۔ وہ ایک کے مقابلے میں سینکڑوں تھے لیکن منڈل میں چھپے بیٹھے تھے۔ سامنے آنے کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔ نول کشور بھی لمبی چوڑی ڈینگیں مار رہا ہوگا۔ دوسرے ہاں میں ہاں ملانے میں پیش پیش ہوں گے۔ ایک چمار کے آجانے سے اُن کے حوصلے اور بلند ہوئے ہوں گے۔ چھوت چھات اور اُونچ نیچ کا فرق بھول کر انہوں نے بھٹی کو بھی اپنا نجات دہندہ سمجھ لیا۔ عام حالات میں پنڈت پجاری کسی مسلمان کے چھوئے برتن میں پانی بھی پینا گوارا نہیں کرتے۔ کوئی غیر اُن کو ہاتھ لگا دے تو ان کا دھرم بھرشت ہو جاتا ہے۔ خود اپنے رسوائی گھر میں بھی وہ ننگے پاؤں داخل ہوتے ہیں۔ ہر تہوار پر چھوٹے بڑے کا دھیان رکھا جاتا ہے۔ دھرم کے معاملے میں ان کے عقیدے، ان کے نظریات بڑے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن ایک میری ذات نے ان کو اس قدر ہراساں اور خوفزدہ کر دیا تھا کہ انہوں نے کالی کے پوتر مندر میں ایک نیچ ذات چمار کا داخلہ منظور کر لیا تھا۔ نول کشور مندر کا بڑا پروہت ہونے کے باوجود اُس کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ آیا، دوسرے پنڈت پجاری بھی اُس کے ہمنوا بن گئے۔ کسی کا دھرم بھرشت نہیں ہوا۔ ساری اُونچ نیچ ختم ہو گئی۔



میرے خوف نے سب کو ایک صف میں کھڑا کر دیا۔

وہ صرف میری موت کے خواہشمند تھے۔ جب چہار ذات نے سفلی کے جنتز منتر پڑھ کر ہانڈی فضا میں چھوڑی ہوئی تو سب ہی کی نظریں اُس پر جم گئی ہوں گی۔ وہ مندر میں کہیں نہ کہیں میری ہولناک موت کا بھیانک انجام دیکھنے کی خاطر دیکے بیٹھے ہوں گے، وقت کے ساتھ ساتھ ان کے دل کی دھڑکنیں بھی بتدریج تیز ہو گئی ہوں گی۔ لیکن پھر نتیجہ کیا نکلا؟ جیو دھاری ہانڈی کی واپسی کا سفر دیکھ کر سب کے منہ لٹک گئے ہوں گے، آنکھیں پٹپٹانے لگی ہوں گی، بکلیوں پر سانپ لوٹ گئے ہوں گے۔ سب کی سوالیہ نظریں سفلی کرنے والے پر اٹھی ہوں گی، اُس کی دھوٹی ڈھیلی ہوتی دیکھ کر سب کے دلوں میں چھوت چھات اور اُدھنچ نہج کا خیال پھر اُبھرا ہوگا۔ پنڈت نول کشور نے محسوس کر لیا ہوگا کہ ہانڈی کا پلٹنا نیک شگون نہیں ہے، اُس کی تیوری پر بل آگئے ہوں گے۔ اُس نے گرج کر بڑے تحکمانہ انداز میں کہا ہوگا۔

”اس نہج ذات کے چہار کے منہ پر کالک تھوپ دو، اس کی چٹیا کاٹ ڈالو۔ جوتے مار کر باہر نکال دو۔“

انکارانی اسی بات کی منتظر تھی۔ چہار باہر نکلا، اُس کا پلید عمل اُسی پر لوٹ گیا۔ وہ جان بچانے کی خاطر دوبارہ مندر میں جانے لگا تو منڈل سے ٹکرا گیا، انکارانی پلک جھپکتے میں اپنا کام کر گزری۔

ہر طرف چنگاریاں اُڑ رہی تھیں، پنڈت پجاریوں نے خوف کے مارے اُونچی آواز میں اشلوک پڑھنا شروع کر دیا، کالی کو خوش کرنے کی خاطر دیو داسیاں بھجن گانے لگیں، سب کے چہرے ست گئے، سب کو اپنی اپنی پڑی تھی، کسی نے میری طرف دھیان نہیں دیا۔ میں اُن کی بھیڑ میں شامل ہو کر آہستہ آہستہ جگہ جگہ بنا تا اندر داخل ہو گیا۔ سید کی لالھی کو میں نے اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ چھوٹے بڑے مندروں کو کس انداز میں تعمیر کیا جاتا ہے؟ اس کا تھوڑا بہت تجربہ میں پہلے بھی کر چکا تھا۔ میرے جسم پر سادہ لباس تھا، پنڈت پجاری بدحواس نہ ہوتے تو پہلی ہی نظر میں ضرور چوکتے۔ میں نے غلٹ سے کام لیا، مندر کے وسیع و عریض چوڑے کے اطراف مہندی کی باڑھ لگی تھی۔ میں اُس کی آڑ لیتا ہوا برق رفتاری سے عقبی حصے کی طرف نکل گیا جہاں یاتریوں کے ٹھہرنے کے لئے کمرے تعمیر تھے۔ ہر طرف ہابا کار

مچی تھی۔ سب کے چہرے فق تھے، مجھے موقع مل گیا۔ میں قدم بڑھاتا ایک کمرے میں داخل ہو گیا، سامنے پلنگ پر ایک بوڑھا پڑا تھا۔

”کیا ہوا بلرام؟“ بوڑھے نے مجھے اپنا ساتھی سمجھ کر پوچھا۔ ”باہر کیسا شور ہو رہا ہے؟“

”بڑے پروہت جی کی موسی کا انتقال ہو گیا۔ سب سینہ کو بی کر رہے ہیں۔“ میں نے نفرت سے کہا، پھر لپک کر اُس کی گردن دیوچ لی۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں انسان اٹھ کر پانی بھی نہیں پی سکتا۔ مجھے زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی، دو چار جھکوں میں ہی اُس کی آنکھیں اُبل کر باہر آ گئیں۔ میں نے پلٹ کر دروازے کو اندر سے کنڈی لگا لی، ایک طرف ٹین کے صندوقے میں کئی لباس موجود تھے۔ میں نے زرد رنگ کی ایک دھوٹی نکال کر باندھ لی۔ کھوٹی پر لٹکی ہوئی دو چار مالا میں بھی گلے میں ڈال لیں۔ مرنے والے کے ہاتھ کا کڑا اتار کر سیدھے ہاتھ میں پہن لیا، ماتھے پر چندن تھوپ تھاپ کر دروازے کے قریب آ گیا۔ سید کی لالھی بدستور میرے ساتھ تھی۔ میں اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ حلیہ تبدیل کر لینے کے بعد وہ مجھے آسانی سے شناخت نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ دیر دروازے سے لگا کھڑا میں باہر کی سن گن لیتا رہا، پھر کنڈی کھول کر باہر آ گیا۔ میں نے صدر دروازے کی طرف جانے کی غلطی نہیں کی، عقبی حصے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ پنڈت پجاریوں کی نولیاں جگہ جگہ موجود تھیں وہ سب اسی ہنگامے کی بات کر رہے تھے جو انکارانی نے بپا کیا تھا۔ دو چار بوڑھے پنڈتوں کے ہاتھ میں مجھے لالھیاں اور ڈنڈے بھی نظر آئے۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں نے بھی سید کی لالھی اس طرح تھام لی جیسے اسے سہارے کے طور پر استعمال کرنے کا عادی ہوں۔

مندر میں موجود کئی لوگوں نے مجھے سرسری طور پر دیکھا لیکن کوئی نوٹس نہیں لیا۔ میں پوری طرح محتاط تھا، کالی کے اس مندر میں جگہ جگہ لگی تختیوں نے میرے لئے بڑی آسانی پیدا کر دی تھی۔ وہ یاتریوں کی رہنمائی کے لئے آویزاں کی گئی تھیں، اس وقت میرے کام آ رہی تھیں۔

آدھے گھنٹے تک میں ادھر ادھر کوئی مناسب جگہ تلاش کرتا رہا، پھر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ہنگامے کی شدت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ پنڈت پجاری صدر دروازے سے ہٹ کر اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف واپس لوٹ رہے تھے۔ پنڈت نول کشور کی طرف

میں کے لئے مہاراج کا لفظ استعمال کیا۔  
”ہاں مہاراج.....“

میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ شاید قسمت مہربان تھی جو میرا اُس کا ٹکراؤ ہو گیا۔  
میں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا، سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ ”کیا پروہت مہاراج  
تمہاری ماما کا علاج نہیں کرتے؟“

”اُن کے پاس اتنا سے کہاں ہے؟“ اُس کے جواب میں احساس محرومی بھی شامل تھا۔  
”میں کیا کر سکوں گا؟“ میں نے کہا۔ ”میں بھی آج صبح ہی دیوی درشن کے کارن بہت  
دور سے چل کر آیا ہوں۔“

”اور کچھ نہیں تو بیمار کے شریر پر ہاتھ رکھ کر بھگوان سے پرارتنا ہی کر دینا۔“ اُس کی نیل  
نول جیسی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ ”میرے من کو چین آ جائے گا۔“

میرے پاس وقت کم تھا، میں نے اُس کی بات مان لی، اُس کے ساتھ ہولیا۔ مجھے زیادہ  
دور نہیں چلنا پڑا۔ دو چار موڑ کاٹ کر وہ حصہ آ گیا جہاں دس بارہ ہٹ نما چھوٹے چھوٹے  
کوائر بڑی خوبصورتی سے تعمیر کئے گئے تھے۔ شاید وہ نول کشور کے مخصوص ملازموں کے  
لئے وقف تھے۔ ادھر سناٹا ہی تھا۔ وہ مجھے ایک کوائر میں لے گئی جو چھوٹے چھوٹے دو  
کمروں پر مشتمل تھا۔ چھوٹا سامن بھی تھا۔ پجارن نے مجھے اپنا نام جھرناتایا تھا۔ ایک  
کمرے میں اُس کی بیمار ماں فرش پر پڑی تھی۔ اُس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ بخار کی شدت اور  
نفاہت نے غڈ حال کر رکھا تھا۔ میں نے چٹائی پر بیٹھ کر اُس کی کلائی پر ہاتھ رکھا۔ جھرنانے  
غلط نہیں کہا تھا، عورت کا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ وہ شدید بخار میں مبتلا تھی۔

”جیل.....“ میرے کانوں میں انکا کی مانوس آواز ابھری۔ ”تم قسمت کے دہنی ہو جو  
تمہیں سر چھپانے کا ٹھکانا مل گیا۔ جھرنانے مکان پر کسی کو تمہاری موجودگی کا گمان بھی نہیں  
ہو سکتا۔ اس کی ماں جب بارہ سال کی تھی تب سے نول کشور کی سیوا کر رہی ہے۔ جھرنانے بھی  
نول کشور کی شرافت کا کڑوا پھل ہے، تم اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کرو، یہ تمہارے لئے  
بڑی کار آمد ثابت ہوگی۔“

مجھے انکارانی کی آواز سن کر تعجب ہوا۔ وہ کسی طور بھی کالی یا ڈرگا کے مندروں میں داخل  
نہیں ہو سکتی تھی، کسی مندر میں اُس کی آواز بھی پہلی بار میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ شاید

سے بار بار چاروں طرف بلندی پر لگے لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے اعلان کیا جا رہا تھا کہ  
صدر دروازہ کچھ دیر کے لئے بند کیا جا رہا ہے۔ سب سے درخواست کی جا رہی تھی کہ  
اپنے اپنے ٹھکانوں پر بیٹھ جائیں۔ میں اس اعلان کا مطلب سمجھ گیا۔ دھماچوٹڑی کے دن  
سب ہی کا ذہن معطل ہو گیا تھا، اب دشمنوں کی نظریں مجھے تلاش کر رہی ہوں گی۔ انہیں یہ  
گمان بھی ضرور ہوا ہو گا کہ میں موقع پا کر ان کے درمیان نہ پہنچ گیا ہوں۔ اپنی تسلی کی خاطر  
وہ ایک ایک کوٹنے کھد رے میں میری تلاش کریں گے۔ میں ہاتھ آ گیا تو میری تھک بونی  
کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ میرے لئے چھپنے کی خاطر کسی مناسب جگہ کی فوری  
ضرورت تھی۔ میں دوبارہ یا تریوں کی رہائش والے حصے کی طرف لوٹ رہا تھا جب ایک  
خوبصورت پجارن میرے سامنے آ گئی۔ وہ کسن تھی، حسین تھی۔ لیکن اُس کے چہرے سے  
پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ جس انداز میں اُس نے سامنے آ کر اچانک میرا راستہ روکا تھا  
اس سے یہی گمان ہوا کہ وہ میرے اوپر کسی اور کا دھوکہ کھا رہی تھی۔ میرے چہرے کے  
خدو خال اُس کے کسی واقف کار سے ملتے ہوں گے۔

”مہاراج.....“ اُس نے ہاتھ باندھ کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بڑی کرپا ہوگی  
تمہاری، ایک نظر میری ماں کو دیکھ لو۔“  
”کیا ہوا اُسے.....؟“ میں نے آواز بنا کر پوچھا۔  
”کل رات سے اُس کے منہ میں ایک دانہ بھی نہیں گیا۔ شری بھی تپ رہا ہے۔ گرد و  
ہوتے تو وہ دیکھ لیتے.....“ وہ بڑی سوگوار نظر آرہی تھی۔  
”گرودیو.....؟“

”وہ کچھ دنوں پہلے دیوی درشن کو آئے تھے، دو دن ہوئے واپس چلے گئے۔“ اُس نے  
مختصر بتایا۔ ”اُن کے ہاتھ میں جادو تھا مہاراج..... ماں ایک دم بھلی چنگی ہو گئی تھی، جیسے کبھی  
روگ نہ رہا ہو۔“

”تم یہاں کیا کرتی ہو.....؟“ میں نے دبی زبان میں اُسے ٹولا۔  
”جب ماں ٹھیک ہوتی ہے تو وہ بڑے پروہت کی سیوا کرتی ہے۔ آج کل یہ کام مجھے  
کرنا پڑ رہا ہے۔“

”تمہارا مطلب پنڈت نول کشور مہاراج سے ہے؟“ میں نے دل پر جبر کر کے اچانک

ہے ہیں وہ سارے بھید بھاؤ سمجھنے لگتے ہیں..... تو ابھی نادان ہے، سیانی ہو جائے گی تو وقت انکا نے کہا بھی تھا کہ وہ باہر رہ کر بھی مجھ سے دُور نہیں رہے گی۔ اُس نے غلط نہیں کیا تھا۔ میں اُس کی آواز واضح طور پر سن رہا تھا۔

”کیا تم سب کچھ دیکھ رہی ہو.....؟“ میں نے عالم تصور میں انکا کو مخاطب کیا۔

”ہاں۔ تم جہاں جہاں جاؤ گے، تمہارے آس پاس کا کچھ حصہ مجھے نظر آتا رہے گا۔ میری تہیں صرف مشورے دے سکیں گی، میری قوت مندر کے اندر تمہاری کوئی مدد نہیں کرے گی.....“ انکا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ عورت جو تمہارے سامنے پڑی ہے اس کا نام جڑ ہے۔ کبھی اس کی بھرپور جوانی کو دیکھ کر بڑے بڑے گیانیوں کی رال ٹپکنے لگتی تھی، اب بھی اس کے ماضی کا حسن اس کے چہرے کے خطوط سے جھلک رہا ہے۔ میں زیادہ دیر تم سے مخاطب نہیں رہ سکتی، آتی جاتی رہوں گی..... میری بات غور سے سنو، اپنے سینے کا ایک بال توڑ کر جمنائے منہ میں ڈال دو۔ ماں بیٹی دونوں تمہاری بے دام غلام بن جائیں گی۔ لیکن جلد بازی سے کام نہ لینا۔ ورنہ.....“

انکا سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا۔ لیکن اُس کے جملے کا مفہوم سمجھ چکا تھا۔ میری نظریں جڑ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”کس وجہ سے تم گم ہو مہاراج.....؟“ جھرنائے چہرے پر میری خاموشی سے تشویش کے رنگ ابھرنے لگے۔

”تمہارے پتا کا دیہانت کب ہوا تھا.....؟“ میں نے برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔ میرے پاس وقت کی کمی نہیں تھی۔

”مم..... مجھے نہیں معلوم مہاراج۔“ وہ ہونٹ چباتے ہوئے مدھم آواز میں بولی۔ ”ماں بتاتی ہے کہ جب میں نے جنم لیا تھا تب وہ حیوت تھی، پھر میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی بھگوان نے انہیں اپنے پاس بلا لیا.....“

”کیا جمنے پہلے بھی بیمار ہوتی رہی ہے.....؟“ میں نے بات کا رخ بدل دیا۔

وہ میرے منہ سے ماں کا نام سن کر چونکی۔ میں بھی اُسے حیران کر دینا چاہتا تھا۔ اُنہ نے کچھ کہنا چاہا، میں نے اُسے موقع نہیں دیا، بڑے ٹھوس لہجے میں بولا۔

”تجھے کس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے لگی؟ جو جیون سے منہ پھرا کر آکاش سے رشتہ جڑا

ہے ہیں وہ سارے بھید بھاؤ سمجھنے لگتے ہیں..... تو ابھی نادان ہے، سیانی ہو جائے گی تو وقت انکا نے کہا بھی تھا کہ وہ باہر رہ کر بھی مجھ سے دُور نہیں رہے گی۔ اُس نے غلط نہیں کیا تھا۔ میں اُس کی آواز واضح طور پر سن رہا تھا۔

”کیا تم سب کچھ دیکھ رہی ہو.....؟“ میں نے عالم تصور میں انکا کو مخاطب کیا۔

”ہاں۔ تم جہاں جہاں جاؤ گے، تمہارے آس پاس کا کچھ حصہ مجھے نظر آتا رہے گا۔ میری تہیں صرف مشورے دے سکیں گی، میری قوت مندر کے اندر تمہاری کوئی مدد نہیں کرے گی.....“ انکا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ عورت جو تمہارے سامنے پڑی ہے اس کا نام جڑ ہے۔ کبھی اس کی بھرپور جوانی کو دیکھ کر بڑے بڑے گیانیوں کی رال ٹپکنے لگتی تھی، اب بھی اس کے ماضی کا حسن اس کے چہرے کے خطوط سے جھلک رہا ہے۔ میں زیادہ دیر تم سے مخاطب نہیں رہ سکتی، آتی جاتی رہوں گی..... میری بات غور سے سنو، اپنے سینے کا ایک بال توڑ کر جمنائے منہ میں ڈال دو۔ ماں بیٹی دونوں تمہاری بے دام غلام بن جائیں گی۔ لیکن جلد بازی سے کام نہ لینا۔ ورنہ.....“

انکا سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا۔ لیکن اُس کے جملے کا مفہوم سمجھ چکا تھا۔ میری نظریں جڑ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”کس وجہ سے تم گم ہو مہاراج.....؟“ جھرنائے چہرے پر میری خاموشی سے تشویش کے رنگ ابھرنے لگے۔

”تمہارے پتا کا دیہانت کب ہوا تھا.....؟“ میں نے برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔ میرے پاس وقت کی کمی نہیں تھی۔

”مم..... مجھے نہیں معلوم مہاراج۔“ وہ ہونٹ چباتے ہوئے مدھم آواز میں بولی۔ ”ماں بتاتی ہے کہ جب میں نے جنم لیا تھا تب وہ حیوت تھی، پھر میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی بھگوان نے انہیں اپنے پاس بلا لیا.....“

”کیا جمنے پہلے بھی بیمار ہوتی رہی ہے.....؟“ میں نے بات کا رخ بدل دیا۔

وہ میرے منہ سے ماں کا نام سن کر چونکی۔ میں بھی اُسے حیران کر دینا چاہتا تھا۔ اُنہ نے کچھ کہنا چاہا، میں نے اُسے موقع نہیں دیا، بڑے ٹھوس لہجے میں بولا۔

”تجھے کس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے لگی؟ جو جیون سے منہ پھرا کر آکاش سے رشتہ جڑا

کر تیرا اصلی روگ نہیں جان سکا..... میں نے بڑے سوچ و چار کے بعد تجھے وہ دارودیا ہے جو من کو شانت کر سکے۔ جو گزر گئی، گزر گئی۔ جو باقی رہ گئی اسے بھی منس کر بٹا دے۔ من سے پچھتاووں کو تن کا روگ کیوں بتا لیتی ہے؟“

”تم..... تم کون ہو مہاراج؟“ جمنانے مجھے حیرت سے دیکھا۔ ”تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نہیں سمجھ سکی۔“

”مُڑی..... تو دو بل کے لئے باہر چلی جا.....“ میں نے سرسراتے لہجے میں کہا، جھرنہ سہم کر باہر چلی گئی۔ میں نے جمنانے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اب پوچھ، کیا جاننا چاہتی ہے، وہ جو بیت گیا؟ یا وہ جو کل پیش آنے والا ہے.....؟“

”میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھ سکی.....“ اُس نے بدستور حیرت کا اظہار کیا۔ ”اُن پہلی بار تمہیں دیکھا ہے۔ کوئی بھول ہو گئی ہو تو شام کر دینا۔“

”بھول تو تجھ سے بہت پہلے ہو چکی، اب اسے نبھانے کی چٹا کر۔“ میں نے سرد آواز میں جواب دیا۔ ”جھرننا کو خبر ہو گئی تو اُس کے دل پر کیا بیتے گی مورکھ، بچی کے بھوش کے بارے میں سوچا کر۔ اُس کی رکھشا کرنے کی خاطر آنکھیں تھیلی رکھ۔ جو تیرے ساتھ ہو گا وہ جھرننا کے ساتھ نہیں ہونا چاہئے۔ تو سمجھتا تھی، جھیل گئی۔ وہ نا سمجھ ہے، اُس کے ساتھ کچھ ہوا تو وہ جیو ہٹا کر لے گی۔“ میں نے اُسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”میں خود سے نہیں آیا، تیری مُڑی میرا ہاتھ تھام کر لے آئی۔ میری نظروں نے تیرے من کا روگ جان لیا۔ میں ابھی دو چار روز ہوں، پھر چلا جاؤں گا۔ میری بات کان کھول کر سن، ہر چپکنے والی چیز سننا نہیں ہوتی۔ بھگوان یا دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں کچھ نہیں کرتیں۔ وہ کوئی دوش کرنے کے قابل ہی نہیں ہوتیں۔ منش را کسس بن جاتا ہے..... اپنے من میں جھانک، اپنے جیون کی پتک کے پتے پلٹ کر دیکھ، ایک پتے پر تجھے اُس چنڈال کی صورت نظر آ جائے گی جو کالہ کے پوتر استھان پر دھرتا جمائے بیٹھا پجاریوں کے اُجلیقن سے کھلونوں کی طرح کھیل رہا ہے..... دیو داسیوں سے من بہلا رہا ہے..... سمجھ گئی میری بات یا کھل کر تیرے جیون کی ساری کھانا ڈالوں.....؟“

جمنانے میرے پیر پکڑ لئے۔ جھرننا پہلے ہی میری شعبدہ بازی سے متاثر ہو چکی تھی۔ مجھے کالی کے مندر میں سر چھپانے کا ٹھکانا مل گیا۔ دونوں ماں بیٹیوں نے یقین دلایا تھا کہ

برے بارے میں زبان نہیں کھولیں گی۔ میں نے سکون کا سانس لیا..... پنڈت نول کشور نے بیوکوں نے پورا مندر کھنگال ڈالا۔ جمنانے کے گھر کی تلاشی نہیں لی گئی، میں محفوظ رہا۔ نول کشور، جمنانے کی جوانی سے کھیل چکا تھا، اب جھرننا کی کنسی میں نقب لگانے کی سوچ رہا تھا۔ اُس کے دماغ کے کسی گوشے میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ اس کا سب سے بڑا دشمن اس کے سب سے بااعتماد لوگوں کے گھر میں چھپا بیٹھا ہوگا۔

جھرننا الہڑتھی، کسن تھی، نادان تھی۔ ماں کو باتیں کرتا دیکھ کر اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹیں واپس لوٹ آئیں۔ وہ ہرنیوں کی مانند کلیں بھرنے لگی۔ کبھی بھاگ کر باہر جاتی، کبھی دوڑ کر اندر آتی۔ جو ہنگامے ہو رہے تھے اُن کا آنکھوں دیکھا حال بتانے لگتی۔ پنڈت نول کشور پر کیا قیامت گزر گئی، جھرننا کو اس کا مطلق اندازہ نہیں تھا۔ جمنانے کے چہرے پر البتہ تشویش کے گھنے بادل منڈلانے لگے تھے۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے جمنانے کو کریدنے کی خاطر انجان بن کر پوچھا۔ ”یہ جھرننا کیا خبریں سنارہی ہے؟ باہر کیا ہو رہا ہے.....؟“

”بھگوان ہی جانے۔“ وہ نقاہت سے بولی۔ ”بہت دنوں سے ہردوار کے آکاش پر کالے کالے بادل منڈلا رہے ہیں۔ پنڈت پجاری بڑے پردہت کے ساتھ بیٹھے کسر پھر کرتے رہتے ہیں، کسی کو ادھر جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے..... تم آرام کرو۔ میں اب چلتا ہوں۔“ میں نے جان بوجھ کر اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”ابھی رہنے کا ٹھکانا بھی دیکھنا ہے۔ پنڈت نول کشور سے ملاقات بھی کرنی ہے.....“

”تم کہاں سے آئے ہو مہاراج.....؟“ جمنانے دبی زبان میں پوچھا۔

”بنارس سے.....“ میں نے اُس کے چہرے پر اُبھرنے والے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے بے پردہی سے جواب دیا۔ ”دو تین دن ٹھہروں گا، پھر واپس چلا جاؤں گا۔“

”بڑے پردہت سے تمہاری ملاقات پہلے سے ہے یا پہلی بار ملو گے؟“

”تم کیوں پوچھ رہی ہو.....؟“ میں نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جب میں غنودگی کی حالت میں تھی تو تم جھرننا سے باتیں کر رہے تھے۔ تم نے کہا تھا کہ اگر کسی کے سامنے اس کی زبان تمہارے بارے میں کھل گئی تو بھونچال آ جائے گا۔“ وہ مجھے گھورنے لگی۔ ”تم نے کہا تھا کہ بڑے پردہت کو بھی تمہارے بارے میں معلوم نہ

ہے من کی دُبدھا سمجھ رہا ہوں۔ تو بھی اسی نیک منش کے لئے بیاہل ہو رہی ہے۔۔۔۔۔“  
 ”مہاراج۔۔۔۔۔“ اُس نے بڑی عقیدت سے میرے قدموں کو ہاتھ لگا کر چومتے ہوئے  
 زبان میں کہا۔ ”جب تم دلوں کا بھید جاننے کی شقت رکھتے ہو تو پھر بڑے پردہت سے  
 کی بھول کیوں کر رہے ہو۔۔۔۔۔؟“  
 ”سر چھپانے، رات گزارنے کے لئے کوئی ٹھکانا تو ڈھونڈنا پڑے گا۔“ میں نے لوہا  
 ہدیکھ کر ملکی سی ضرب لگائی، مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔

”ایک بتی کروں مہاراج۔۔۔۔۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر مجھم التجا بن گئی۔ ”غریب پجارن کا یہ  
 ہاتھ جیسے مہان دیوتا سان منش کو شوبھا تو نہیں دیتا۔ لیکن تم یہیں بسیرا کر لو تو زیادہ  
 دسب ہوگا۔ ہمارے بھاگیہ بھی کھل جائیں گے۔“

”تم۔۔۔۔۔“ میں نے جمن کی بات سن کر آنکھیں بند کر لیں، اُسے متاثر کرنے کے لئے  
 میں کچھ دیر آنکھیں موندے رہا۔ اُس نے جو جملہ کہا تھا اس کے پس پردہ مجھے شیوا کا چہرہ نظر

آئے لگا۔ انکارانی نے بتایا تھا کہ نول کشور نے اس کی بات نہیں سنی تھی، تہہ خانے کی کال  
 کوٹھڑی میں قید کر دیا تھا۔ میں جمن کو اعتماد میں لے کر شیوا کا پتہ معلوم کر سکتا تھا۔ بات

اگر شیوا کی نہ بھی ہوتی تو جمن اس کا نام سن کر ضرور چونکتی۔ وہ اگر نول کشور کی خاص پجارن  
 تھی تو پنڈت شیوا کے بارے میں بھی ضرور جانتی ہوگی۔ میں نے اُسے مرعوب کرنے کی

خاطر صرف ”تم“ کہہ کر بات ادھوری چھوڑ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ یقیناً پوری طرنا  
 میری طرف متوجہ ہوگی۔ میں نے کچھ توقف کے بعد دوبارہ آنکھیں کھولیں تو میرا تیار

درست ثابت ہوا۔ جمن مجھے ممکنگی باندھے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے پہلو بدل کر  
 بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”میں سمجھ رہا ہوں تم کس کی بات کر رہی ہو۔ میں بھی اُسی کو کھوجنے آیا ہوں۔ نول کشور  
 نہیں جانتا، مجھے معلوم ہے کہ وہ زردوش ہے۔“ میں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے

خاطر گنیمیر آواز میں سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”وہ زردوش نہ ہوتا تو کالی اپنے سیوکوں سے  
 ناراض بھی نہ ہوتی، اس سے جو شور وغل ہو رہا ہے، وہ بھی اسی کا نتیجہ ہے۔“

”تم کس کی بات کر رہے ہو مہاراج؟“ جمن نے کسمسا کر پوچھا۔  
 ”وہی۔۔۔۔۔ جو پہلے بڑے پردہت کا خاص آدمی تھا۔“ میں نے شیوا کا نام لینے سے

کرتے ہوئے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”اب بغیر کسی پاپ کے سزا بھوگ رہا ہے۔“

ہو۔۔۔۔۔ اور اب تم خود چل کر اُس کے پاس جا رہے ہو۔“  
 میں ایک لمحے کو ٹپٹا گیا، پھر مسکرا کر بولا۔ ”تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی۔۔۔۔۔“  
 ”پھر جیسا تم چاہو۔۔۔۔۔ لیکن میری مانو تو اس سے بڑے پردہت سے نہ ملو تو اچھا ہوگا۔“  
 ”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”میں کوئی کارن تو نہیں بتا سکتی، پر نتوانتا جانتی ہوں کہ کالی اپنے سیوکوں سے ناراض  
 گئی ہے۔“ اُس نے مدھم لہجے میں کہا۔ ”کوئی چتنا ضرور ہے جس نے بڑے پردہت سے  
 بیاہل کر رکھا ہے۔ وہ اپنے لوگوں پر بھی شک کرنے لگا ہے۔ تم نئے آئے ہو، وہ تمہارا  
 اوپر بھی شبہ کرے گا۔“

”تم۔۔۔۔۔“ میں نے جمن کی بات سن کر آنکھیں بند کر لیں، اُسے متاثر کرنے کے لئے  
 میں کچھ دیر آنکھیں موندے رہا۔ اُس نے جو جملہ کہا تھا اس کے پس پردہ مجھے شیوا کا چہرہ نظر

آئے لگا۔ انکارانی نے بتایا تھا کہ نول کشور نے اس کی بات نہیں سنی تھی، تہہ خانے کی کال  
 کوٹھڑی میں قید کر دیا تھا۔ میں جمن کو اعتماد میں لے کر شیوا کا پتہ معلوم کر سکتا تھا۔ بات

اگر شیوا کی نہ بھی ہوتی تو جمن اس کا نام سن کر ضرور چونکتی۔ وہ اگر نول کشور کی خاص پجارن  
 تھی تو پنڈت شیوا کے بارے میں بھی ضرور جانتی ہوگی۔ میں نے اُسے مرعوب کرنے کی

خاطر صرف ”تم“ کہہ کر بات ادھوری چھوڑ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ یقیناً پوری طرنا  
 میری طرف متوجہ ہوگی۔ میں نے کچھ توقف کے بعد دوبارہ آنکھیں کھولیں تو میرا تیار

درست ثابت ہوا۔ جمن مجھے ممکنگی باندھے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے پہلو بدل کر  
 بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”میں سمجھ رہا ہوں تم کس کی بات کر رہی ہو۔ میں بھی اُسی کو کھوجنے آیا ہوں۔ نول کشور  
 نہیں جانتا، مجھے معلوم ہے کہ وہ زردوش ہے۔“ میں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے

خاطر گنیمیر آواز میں سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”وہ زردوش نہ ہوتا تو کالی اپنے سیوکوں سے  
 ناراض بھی نہ ہوتی، اس سے جو شور وغل ہو رہا ہے، وہ بھی اسی کا نتیجہ ہے۔“

”تم کس کی بات کر رہے ہو مہاراج؟“ جمن نے کسمسا کر پوچھا۔  
 ”وہی۔۔۔۔۔ جو پہلے بڑے پردہت کا خاص آدمی تھا۔“ میں نے شیوا کا نام لینے سے

کرتے ہوئے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”اب بغیر کسی پاپ کے سزا بھوگ رہا ہے۔“



دیکھ رہا تھا۔ ایک دوبار اُس نے جمنہ کو بھی اپنے ارادے سے آگاہ کیا تھا۔ جمنہ ایک ماں بھر تھی۔ وہ نول کشور کی بات سن کر کاتب اُٹھی تھی۔ اُس کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ جانتی تھی مندر کے اندر کھلنے والی ہر کپڑی پر پہلا حق بڑے پروہت کا ہوتا ہے، اس کے بعد دوسرے بھی اس کی مہک سے حیثیت بھر استفادہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مندروں میں یہی کچھ ہوتا ہے، چھوٹے بڑے سب ایک رنگ میں رنگے ہوتے ہیں اس لئے ایک دوسرے پر انگلیاں بھی نہیں اٹھائی جاتیں۔ کالی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھانے کے لئے بھی پجاریوں کے خون کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بڑی ہولناک رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ پجاریوں اور دیو دیویوں کی تعداد کا حساب کتاب بھی ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ تمام باتیں خود جمنہ نے رورور کرتی تھیں۔ میرے اُوپر اُس کا اعتماد بڑھتا جا رہا تھا۔ اس وقت بھی میں جمنہ کے ساتھ بیٹھا حالات کی سن گن لینے کی کوشش کر رہا تھا جب اچانک پانچ چھ بٹے کئے پجاری ہاتھوں میں لٹھ لئے دندتے ہوئے اندر گھس آئے۔ سید کی لالھی میرے قریب ہی رکھی تھی۔ میں نے برق رفتاری سے اُسے اٹھا کر گھمایا، لالھی نے لگی وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اُس کے حلق سے بڑی کرہناک چیخ کی آواز بلند ہوئی تھی۔ میں نے اُچھل کر پوزیشن تبدیل کی۔ جمنہ بھاگ کر ایک طرف ہو گئی۔ ایک پجاری نے اُسے بالوں سے پکڑ کر جھکا دیا، وہ چکر کر منہ کے بل گری۔ میں نے چینتر ابدل کر دوسرا وار کیا، ایک شخص اور ڈھیر ہو گیا۔ باقی پیچھے کھسکے لگے۔ میں نے لالھی لہرا کر انہیں للکارا۔

”پیچھے کیوں ہٹ رہے ہو حرام زادو..... مردہو، باہر نکل کر کھلے میدان میں مقابلہ کرو۔ اپنے باقی ساتھیوں کو بھی بلاؤ۔ آج یہ فیصلہ بھی ہو جائے کہ کون بڑا ہے، کون چھوٹا.....“

”تم پوری طرح ہمارے نرغے میں پھنس چکے ہو۔“ اُن میں سے ایک غریبا۔ ”سید کی طرح لکڑی پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ اسی میں تمہاری مکتی ہے۔“

”پنڈت نول کشور کے اشاروں پر ناچ رہے ہو کیونہو.....“ میں گرج کر بولا۔ ”تم اتنا منڈل کا انجام بھی دیکھ چکے ہو جو تمہارے پروہت نے بڑے مان سے کھینچا تھا، کیا حاصل ہوا.....؟ آنکھیں کھولو، حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ خود عیش کر رہا ہے، تمہیں ایک ایک کر کے میرے انتقام کی آگ میں جھونک رہا ہے۔ پنڈت کالی داس کا انجام کیا ہوا..... اوم پرکاش بھی کام آ گیا۔ میں اب بھی تمہارے سامنے سینہ تانے کھڑا ہوں۔ اُس بھڑکے

”مار ڈالو سارے منسلے کو..... قیمہ بنا دو.....“ کئی ملی جلی آوازیں میرے کانوں میں گئیں۔ پھر ہر احساس تاریکی میں گم ہو کر رہ گیا.....!!

میں کب تک بے ہوش رہا، کتنے عرصے بے خبری کی کیفیت سے دوچار رہا، انہوں نے بڑے اُوپر کیا کیا ستم ڈھائے، کیا کیا ظلم کئے، مجھے کچھ یاد نہیں۔ جب دوبارہ ہوش آیا تو مجھ کو جڑ جڑ تا سوری طرح ڈکھ رہا تھا۔ اذیتاں تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو یوں لگا جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں..... لیکن

ہو، بہت کچھ ممکن تھا۔

میرے ذہن میں گرم ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ میں نے کئی بار اپنی قوتوں کو آزمانا پایا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ شاید کالی کی مہمان شگفتی نے مجھے پوری طرح بے بس کر دیا تھا، بری تمام قوتیں سلب کر لی گئی تھیں۔ میرے دل نے کہا۔

”جیل احمد خاں، اب اپنی شکست تسلیم کر لو۔ بہت کھیل کود چکے، ہر کہانی کا کوئی نہ کوئی انجام ضرور ہوتا ہے۔ تمہاری زندگی کی کہانی تو بڑی رنگین تھی۔ تم ہمیشہ سرکش گھوڑے کی مانند پہناتے رہے، تم نے جو چاہا وہ ہوا۔ جو مانگا وہ ملا۔ انکارانی کے سر پر آنے سے پیشتر تم کچھ بھی نہ تھے، وہ مہربان ہوئی تو قارون کا خزانہ تمہارے ہاتھ آ گیا، تم اپنی اوقات بھول گئے، ہواؤں میں پرواز کرنے لگے، دُور دُور کی سوچنے لگے۔ دولت، عزت، شہرت تمہیں سب کچھ ملا۔ جن مہ جبینوں کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے وہ بھی تمہاری آغوش میں پھلنے پر مجبور ہو گئیں۔ نرگس کے بارے میں سوچو، مالا رانی پر غور کرو، کلدیپ کے حسن کا اندازہ لگاؤ۔ کیا تم ان کے قابل تھے؟..... نہیں، سب انکارانی کی مہربانی تھی، اُس کی پراسرار قوت تمہارے کام آتی رہی۔ تم رنگ رلیاں مناتے رہے۔ لندن میں بھی تم نے کھیل تماشے دکھائے، لیکن ہندوستان کے گوشے گوشے میں تمہارے نام کی گونج کسی نہ کسی طور سنائی دیتی رہی۔ لیکن کب تک..... کبھی نہ کبھی تو تمہارے عروج کو زوال ہونا ہی تھا۔ ہر ذی روح کو موت کا ناقص چکھنا پڑتا ہے۔ کل تک تم دوسروں کی موت پر تہقہہ لگاتے تھے، فخر سے سینہ تان کر ملتے تھے، آج اپنی باری آئی تو بغلیں جھانکنے لگے..... ایسی بھی کیا کم ہمتی؟ مرد بنو..... مرد۔ گردن اٹھا کر موت کا استقبال کرو۔ دوسروں کو بھی ہسنے کا موقع دو.....“

”کیا سوچ رہے ہو جیل احمد خاں.....؟“ پنڈت نول کشور نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”سرد لہجے میں مخاطب کیا۔“ تم تو ساگر کی لہروں کی طرح بڑا اچھل کود کرنے کے عادی تھے۔ بڑا شور شرابا مچا رکھا تھا تم نے۔ جنگی سور کی طرح کھیت کھلیاں کو روندتے پھر رہے تھے کسی کومنہ میں لگام ڈالنے کی اجازت نہیں دیتے تھے..... آج دم سادھے کھڑے ٹکڑ ٹکڑ کیا گھور رہے ہو؟ کیا سانپ سونگھ گیا؟ من ہی من میں ہمیں کشت دینے کے بارے میں کیا کامنڈر سپنے دیکھ رہے ہو؟ کچھ ہمیں بھی سناؤ.....“

”کالی کے سامنے آتے ہی مینا مر گئی سالے کی۔“ ایک منہ زور پنڈت نے دل کی

وہ خواب نہیں، حقیقت تھی۔ میں کالی کے قد آور بت کے سامنے بیس فٹ کے فاصلے پر ایک ستون سے بندھا کھڑا تھا۔ میرا جسم رسیوں سے نہ جکڑا ہوتا تو شاید میری ٹانگیں میرے وجود کا بوجھ برداشت نہ کر سکتیں۔ میرے دائیں بائیں پنڈت پجاری قطار بنائے کھڑے مجھے نفرت اور حقارت بھری نظروں سے گھور رہے تھے۔ کالی کے بت کے سیدھے ہاتھ پر ایک ہٹا کٹا راز قد شخص ایک اونچی کرسی پر بیٹھا مجھے بڑی کینہ توڑ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں پنڈت نول کشور کا نام گردش کرنے لگا۔ اُس کی خوفناک نظروں سے شعلے نکل رہے تھے۔ میری نظریں اُس کے چہرے پر جم گئیں۔ دشمن کو سامنے دیکھ کر میرے خون نے جوش مارا۔ میں نے ننذا کے بتائے ہوئے عمل کو پڑھنے کی کوشش کی، میری زبان نے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے عالم تصور میں انکارانی کو آواز دی۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ مندر سے باہر رہ کر بھی مجھ سے دُور نہیں رہے گی، میں جہاں جاؤں گا اس کے آس پاس کا کچھ حصہ اُسے نظر آتا رہے گا۔ جبرنا سے ملاقات کے بعد میں نے واضح طور پر اُس کی آواز بھی نہ سنی تھی..... اُس نے کہا تھا کہ جبرنا میرے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوگی۔ لیکن اس وقت کوئی میری بد نصیبی میں شریک ہونے کے لئے سامنے نہیں آیا۔ مجھے تنہا ہونے کا احساس ڈنک مارنے لگا۔

میں اپنے بے بسی پر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ کلدیپ نے کہا تھا کہ سید کی لاشی کی آخری موٹی پر میرے کام آئے گی..... وہ بھی میرے ہاتھ سے کہیں نکل گئی تھی۔ انکارانی بھی کہیں دُور کھڑی تماشہ دیکھ رہی ہوگی۔ دُور گانے کلدیپ اور پریم لال کو میرے راتے سے علیحدہ کر دیا تھا۔ کالی کی شگفتی نے شاید انکارانی کی قوت پر واز بھی چھین لی ہوگی..... کس جبرنا کیا کر سکتی تھی؟ وہ تو خود عتاب کا نشانہ بن رہی ہوگی۔ مجھے جمن کے گھر سے برآمد کرنے کے بعد انہوں نے جمن کو ضرور مار ڈالا ہوگا۔ اُس کا جرم بے حد سنگین تھا، اُس غریب نے ہالی کے مندر کے بڑے پروہت پنڈت نول کشور مہاراج کے مقابلے میں جیل احمد خاں کی مدد کی تھی۔ اُسے سنگین جرم کی سزا بھی بڑی سنگین ملی ہوگی۔ جبرنا شاید محفوظ ہو..... اُس ناکسن جوانی دیکھ کر میرے دشمنوں کو شاید اُس پر رحم آ گیا ہو۔ گودے دار بنی دیکھ کر تو خاشا زدہ کتا بھی دم ہلانے لگتا ہے۔ جبرنا تو جوانی کی سرحدوں پر دستک دے رہی تھی۔ ہوسر ہے نول کشور نے اُسے خود سزا دینے کی خاطر اپنے کسی کمرہ خاص میں بند کر

بھڑاس نکالی۔ ”کل تک بڑے اونچے سروں میں لمبی چوڑی باتیں کرتا تھا۔“

میں رسیوں کے شکنجے میں جکڑا کھڑا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی زبان میں زہرا گل رہے تھے۔ میری قوت گویائی میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ میرے لئے وہ لمحے بڑے اعصاب شکن تھے، مجھے بے عزتی کی موت منظور نہیں تھی۔ میں نے بار بار بھڑ بھڑانے کی کوشش کی، ہر بار بندشیں میرے گوشت میں ہی پیوست ہوتیں تو میں اذیت سے بلبلا اٹھتا۔ وہ حق بجانب تھے۔ میں نے بھی اُن کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی تھی۔ جو بھی سامنے آیا اُسے اپنے قدموں تلے روندنا چلا گیا، لیکن ایک فرق ضرور تھا، میں نے کسی کے ہاتھ پیروں کو جکڑ کر اُس کو اپنی مردانگی کا ثبوت نہیں دیا۔ مجھے ایک ایک کہانی یاد آرہی تھی، میرے اندر طوفان کروٹیں بدلتا رہا، شعلے بھڑکتے رہے لیکن شاید دُرگا اور کالی کی قوتوں نے مل کر مجھے بے بس کر دیا تھا۔ کتوں کے غول میں عید منائی جا رہی تھی۔ پنڈت نول کشور دُور بیٹھا سر پھرے پجاریوں کو بھڑکا رہا تھا، وہ سب آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ بڑی مغفلات گالیاں بک رہے تھے۔ میری طرف منہ اٹھا اٹھا کھٹکھٹ رہے تھے۔ اُن کے بس میں ہوتا تو مجھ پر ہلا بول دیتے، میرے جسم کی تھکے بوٹی کر ڈالتے۔ لیکن نول کشور نے انہیں قریب آنے سے روک رکھا تھا، وہ مجھے آسان موت نہیں مارنا چاہتا تھا، سسکا سسکا کر، اذیتیں دے دے کر مارنا چاہتا تھا۔ اُس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔

”بڑی آنکھیں لال پیلی کر رہے ہو مہاراج.....“ نول کشور نے میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کی کوشش کی۔ ”کیا ہم سے تمہارے سوا گت میں کوئی بھول ہو گئی؟ تم تو بڑے بڑے دعوے کر رہے تھے، بڑے بڑے جال بُن رہے تھے، اب چپ کیوں ہو؟..... کوئی منتر پڑھ کر پھونک مارو، ہمیں جلا کر بھسم کر دو، دیوی دیوتاؤں کی شان میں برے شہد اپنی گندی زبان سے نکالو، تم یہی کیا کرتے تھے نا، اور..... وہ کہاں گئی؟ تمہاری بیر بہنی، ڈیڑھ باشت کی چھمیا۔ سنا ہے وہ بھی تمہارا ساتھ چھوڑ گئی۔ ایک بار اُسے پھر آواز دو، شاید اُس پودنی حرافہ کو تمہارے اوپر دیا آجائے، تمہارا اُس کا تو برسوں کا گٹھ جوڑ تھا، اُسی کے کارن تم کیچڑ کے مگرچھ کی طرح شکار کھیلا کرتے تھے۔ پنڈت بدری نرائن یاد ہے تمہیں؟ تمہاری وہ رکھیل کلدیپ پہاڑ سے اتر کر نیچے نہ آجاتی تو مہاراج امرال تمہارا وہ انجام نہ کتا کہ دنیا دیکھتی۔ بدری نرائن بھی تمہیں تڑپا تڑپا کر کتوں کی موت مارتا۔ تمہاری ار

بصورت رکھیل کے دن بھی پورے ہو چکے تھے۔ آخری سے میں وہ کالی کے چرنوں میں رچی۔ کالی نے دیا کھا کر اُس کی بھیٹ سویکار کر لی..... یاد ہے تمہیں.....؟“

کلدیپ کا نام لے کر اُس نے بھڑکتی چنگاری پٹروں کے کنویں میں ڈال دی تھی۔ میری ہتھوں میں خون اُتر آیا، پٹلیاں حلقوں سے اُبل پڑنے کے لئے بے چین ہو گئیں۔ میری رگوں میں خون کی جگہ کن کھجورے دوڑنے لگے۔ میں نے پھر پوری قوت صرف کر دی لیکن زپ کر رہ گیا۔

”سندر نارایوں کو چال میں پھنسانا تجھے خوب آتا ہے۔“ نول کشور نے میری وحشت، میرے جنون کی بے بسی کا تماشا دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جہنا بھی تیری باتوں میں آگئی۔ اُسے بھی اپنے کئے کی سزا بھوگنی پڑے گی۔ ہم نے اس ویشیا کو کالی کے پوتر چرنوں میں بھیٹ پڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے.....“

میرا دل چاہا کہ حلق پھاڑ پھاڑ کر نول کشور کی ذہنی فلاحی پر تہقہ لگانا شروع کر دوں۔ وہ جہنا کو ویشیا بھی کہہ رہا تھا اور اُسے کالی کے پوتر چرنوں میں قربان کرنے کی باتیں بھی کر رہا تھا۔ کل تک جس کی چھاتیوں کے درمیان منہ رگڑ کر رانی جانی کہتا تھا، آج اُسے ویشیا کہہ رہا تھا۔

”مہاراج.....“ ایک پستہ قد پجاری نے قطار سے نکل کر پنڈت نول کشور کو مخاطب کیا۔ ”گرود پود، تم آگیا دو تو میں اس لٹچے کو اپنے دو چار کرتب بھی دکھا دوں.....؟“

نول کشور نے اجازت دے دی ٹھکنے پجاری نے سر جھکا کر ڈنڈوت کیا، پھر پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں نے رنگ بدلنا شروع کیا۔ اُس کے ہونٹ ہلنے لگے۔ وہ کسی منتر کا جاپ کر رہا تھا، سب کی نظریں ہم دونوں پر جمی تھیں۔ پستہ قد پجاری نے منتر پڑھ کر زوردار پھونک ماری، میرے چاروں طرف آگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اُس کی پیش میرے جسم کو جھلسانے لگی۔ اُس نے اُلٹا ہاتھ اٹھا دیا، شعلے غائب ہو گئے۔ میں نے ٹھکان کا سانس لیا۔ لیکن میرا سکون زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ پجاری نے اُچھل کر سیدھا پاؤں زمین پر مارا، میرے کانوں میں کسی خوفناک درندے کی غراہٹ کی آواز اُبھری..... میں نے پلٹ کر بائیں جانب دیکھا، وہ خرگوش اور بندر سے ملتا جلتا کوئی عجیب الخلت جانور تھا جو نیچے کیڑے پیٹ زمین سے چپکائے مجھے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اُس کی

بھین کھول کر دیکھو، تم بھلے چنگے کھڑے ہو۔ اتنی جلدی کیسے مر سکتے ہو؟ ابھی تو تم کو بہت  
تجہ اور دیکھنا ہے.....“

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میری آنکھیں پٹ پٹانے لگیں۔ میری نگاہیں حیرت سے  
بہنی کی پھٹی رہ گئیں..... میں دم بخود رہ گیا۔ پریشان نظروں سے اپنا جسم ٹولنے لگا، میرے  
بدن کے کسی حصے پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ لہو کا ایک قطرہ بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔  
میرے زخموں کی جلن چھوڑ کر ہو گئی تھی۔ پستہ قد پجاری میرے اور نول کشور کے بیچ کھڑا  
سکر رہا تھا۔ پھر وہ درمیان سے ہٹ گیا۔ میں اس حقیقت سے انکار نہیں کروں گا کہ ایسا  
نعبہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کچھ دیر بعد نول کشور کے حکم پر جتنا کو گھسیٹ کر سامنے لایا گیا۔ اُس کے منہ سے خون  
جاری تھا، آنکھوں سے موت کا بھیا نک احساس جھانک رہا تھا۔ اُس کے جسم پر لباس نام کی  
کوئی شے موجود نہیں تھی۔ وہ کالی کی قد آور مورتی کے سامنے مادرِ زاد برہنہ کھڑی خوف سے  
فرقہ کرنا رہی تھی۔ کچھ پنڈت پجاریوں کی زبان اس وقت بھی ہونٹوں پر لپٹا رہی تھی۔  
”ہٹے کٹے پجاریوں نے جتنا کو ہاتھ تھام کر جکڑ رکھا تھا، اُس غریب نے میری طرف  
صرت بھری نظروں سے دیکھا غوغا..... آں غاں کی آوازیں نکالنی شروع کیں تو میں  
ساری جان سے لرز اٹھا..... ظالموں نے اُس کی زبان کاٹ کر بولنے سے محروم کر دیا تھا۔  
بڑھی وہ مجھے اپنی بے گناہی کا یقین دلا رہی تھی۔ مجھے پہلے بھی یقین تھا کہ اُس نے یا جھڑنا  
نے میرے خلاف تجزیہ نہیں کی ہوگی۔ میں اس بدنصیب کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ وہ  
بہنی پھٹی نظروں سے وہاں موجود پنڈت پجاریوں کو رحم طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ان  
میں کئی اُس کے جسم سے کھیل چکے ہوں گے، بہتوں نے اُس کے تلوے چاٹ کر بوڑھی  
لوگوں کے نیم گرم خون کو جھوٹی تسلی دی ہوگی، کچھ کل تک اُس کے طلب گار بھی رہے ہوں  
گے، آج سب سے آنکھیں پھیر رکھی تھیں۔

پنڈت نول کشور کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کالی کی مورتی کے سامنے کئی بار جھک جھک  
کر ڈنڈوت کرتا رہا، پھر اُس نے بلند آواز میں کچھ اشلوک پڑھنے کے بعد بولنا شروع کیا۔  
”ماتا..... تو تمہان ہے۔ تیری شہتی اپرم پار ہے، ہم تیرے پجاری، تیرے بالک سلمان  
ہیں۔ ہم سے کوئی بھول چوک ہوئی ہو تو ہمیں شاکر دینا۔ ہم منش ہیں، اُن کھاتے ہیں،

آنکھیں، اسی سرچ لائٹ کی تیز روشنی کی طرح چمک رہی تھیں۔ مجھے جھرجھری آگئی۔ میں  
نے اپنی زندگی میں اس قسم کا کوئی جانور پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک بار اُس نے منہ کھولا تو  
میں کپکپا کر رہ گیا..... اُس کے لمبے لمبے نوکیلے دانت بے حد خوفناک دکھائی دے رہے  
تھے۔ اُس کی زبان پر جنگلی نیبو کے درخت کی طرح بڑے بڑے کانٹے آگے ہوئے تھے۔  
”جے بجرنگ بلی..... جے بھوانی.....“ پجاری نے کھڑے کھڑے ہوا میں قلابازی کھا  
کر نعرہ بلند کیا۔ عجیب الخلق جانور فضا میں اُچھل کر میری سمت آیا۔ اُس کے نشتر جیسے پنجے  
ایک ہی چھپٹے میں میرے جسم میں کئی شکاف پیدا کر گئے..... میرے بدن سے لہو کی دھاریں  
اُبلنے لگیں..... پنڈت پجاریوں نے ”جے ماتا، جے کالی“ کے فلک شکاف نعرے لگانے  
شروع کر دیے۔ زمین پر نکلتے ہی اُس منحوس درندے نے بلی کی طرح دوبارہ چھلانگ  
ماری۔ اپنے پنجے میرے بدن میں گاڑ کر میرے جسم سے لپٹ گیا..... اُس کے نوکیلے دانت  
میری چھاتی کی بوٹیاں اڈھڑنے لگے..... اُس نے اپنی گندی زبان کے زہریلے کانٹے  
میرے جسم میں چھوئے تو میں کر بناک حالت سے دوچار ہو گیا۔ میرے زخموں پر جیسے کسی  
نے پسلی ہوئی سرخ مرچ چھڑک دی ہو..... میری پلکوں کے نیچے اندھیرے کوند نے لگے۔  
نوجوان پجاری نے اُلٹا پاؤں زمین پر مارا تو جانور اُچھل کر فرش پر گرا، پھر میری حیرت کی  
کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ پراسرار طور پر اپنی جسامت کم کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چپوٹنے کی  
شکل اختیار کر کے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ میرا جسم لہولہاں ہو رہا تھا..... میرے زخموں میں اُس  
جانور کی زبان کے کانٹوں نے جیسے آگ بھردی تھی۔ میں بے کسی کے عالم میں کسمارہا  
تھا۔ میرے دشمن قہقہے لگا رہے تھے۔ میرا ذہن ڈوبنے لگا۔ شاید موت کے سرد ہاتھ میری  
مشکل آسان کرنے کی خاطر میری رُوح قبض کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے..... میں نے  
آنکھیں بند کر لیں۔

”نہیں جمیل احمد خاں..... نہیں۔“ پنڈت نول کشور کی کرخت آواز میرے کانوں میں  
گوونچی۔ ”ہم تمہیں اتنی آسان موت نہیں مرنے دیں گے۔ اپنے ایک ایک آدمی کا حساب  
گن گن کر لیں گے۔ تم ہماری اجازت کے بغیر مر بھی نہیں سکو گے۔ تم نے جو کچھ دیکھا، جو  
محسوس کیا وہ تو کیوں ایک ناک تھا۔ ہم تمہیں اپنے بالکلوں کی شہتی کا کھیل دکھا رہے تھے۔



سے اعضا جسم سے کاٹ کاٹ کر علیحدہ کرنے لگے..... میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

پچارنوں کے بھجن گانے کی آواز میں پچاریوں کا شور و غل بھی شامل ہو گیا۔ غالباً وہ بھینٹ کی بھیا تک اور ہولناک رسم کی ادائیگی کے بعد خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ اُن کا شور بے ختم ہوا تو میں نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اُبکائیاں آنے لگیں..... میں اُس منظر کی تاب نہ لا سکا۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی تو پچاریوں نے تیز دھار چیزوں سے مجھے ٹھونگے مارنا شروع کر دیئے۔ میں آنکھ کھلی رکھنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ جتنا کسے ہاتھ پاؤں اور چھاتیاں جسم سے علیحدہ کرنے کے بعد اُس کے خون سے چلو بھر بھر کر کالی کے جسم کو غسل دینے کی رسم پوری کر رہے تھے۔ میں نے ہونٹ سختی سے بھیج لئے۔ رسم ختم ہوئی تو جتنا کے جسم کے ٹکڑوں کو ٹھوکر میں مار مار کر چبوترے سے ہٹا دیا گیا۔ پنڈت نول کشور کی نظریں پھر میری جانب اٹھیں۔ ان میں فاتحانہ چمک تھی۔

”ہم نے جتنا کے بھینٹ کی رسم بہت سادگی سے ادا کی ہی..... تم نراش مت ہونا۔“ اُس نے سرد آواز میں کہا۔ ”تمہارے ساتھ ہم پورا پورا نیا نے کریں گے، تم مہان شکتیوں کے مالک ہو تو پھر تمہارے ساتھ جو سلوک ہوگا، دھوم دھام سے ہی ہوگا۔ ہم تمہیں موقع دیں گے، تم اُس ڈریڈ بالشت کی چھمپا کو بھی بلا لینا، وہ بھی تماشا دیکھ لے گی۔ اپنے دھرم کے دو چار بڑوں کو بھی بلا لینا، وہ اپنے دھرم کے انوسار تمہارا گریا کرم بھی کر دیں گے۔“

”مہاراج.....“ ایک اڈھڑ عمر پجاری نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”میں تو کہتا ہوں کہ آج ہی اس مُسلے کا جھکا کر ڈالو۔“

”ہاں مہاراج.....“ دوسرے نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ”شیوا کی نیت کے کھوٹ کا امتحان بھی ہو جائے گا۔ اگر اُس نے اپنے ہاتھوں سے اس مُسلے کا سر کاٹ کر دیوی کے یونوں میں رکھ دیا تو اسے شاکر دینا۔ میرا من کہتا ہے کہ وہ زردوش ہی ہوگا۔“

کئی اور آوازیں بھی شیوا کے حق میں بلند ہوئیں۔ پنڈت نول کشور سب کی سنتا رہا۔ سب اپنی اپنی کہہ چکے تو اُس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”دھیرج سے کام لو..... ہم شیوا کا امتحان بھی اوش لیں گے۔ سے کا انتظار کرو۔ میں چندرا کو سند لیس بھیجتا ہوں کہ پیچھی ہمارے جال میں پھنسن گیا ہے۔ اُس کا بھی کچھ حساب کتاب نکلتا ہے، اُس کے من میں بھی سورگ باشی امر لال مہاراج کی چتا کی آگنی ابھی تک

دھرتی کے چکر میں الجھ کر ہماری بدھی کام نہیں کرتی تو کبھی کبھی پاپ کر بیٹھتے ہیں۔ اس پاپ کا پراسیت بھی اپنا دھرم سمجھتے ہیں..... ماما تو دیوی ہے، تو ہمارے من کے بھید بھاؤ جانچ رہے۔ ہم سب تیری شرن میں ہیں، تیرا ابکار نہ ہوتا تو ہم بھی دوسرے پاپیوں کی طرح درجہ بڑھ کر ٹھوکریں کھا رہے ہوتے۔ ہم تیرے بتائے ہوئے راستوں پر پگ دھرنے کے عادی ہیں۔ تیری سیوا کرنا ہمارا دھرم ہے، تیرے چرنوں میں بھینٹ اور بلیدان پیش کرنا بھی ہمارا دھرم ہے۔ تجھے راضی کرنا، تجھے خوش رکھنا بھی ہمارا دھرم ہے۔ آج تیرا یہ سیوک پھر تیرے پوتے چرنوں میں ایک ایسی پاپی پچارن کی بھینٹ چڑھا رہا ہے جس نے تجھ سے پریم کرنے والوں کے ساتھ دھوکا کیا۔ ہم بنتی کرتے ہیں ماما، کہ ہماری اس بھینٹ کو اپنے چرنوں میں سویکار کر لے۔“

نول کشور نے اپنی چب زبانی ختم کی تو کالی کے پچاریوں نے جے جے کار کے نعرے بلند کئے۔ پچارنوں کی ایک ٹولی نے اندر آ کر بھجن گانا شروع کر دیا۔ جھرتا مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ نہ جانے اُس کمن کے ساتھ ان ظالموں نے کیا برتاؤ کیا ہوگا۔ میرے ذہن میں جھرتا کی معصومیت کلبلا رہی تھی۔ نظریں جتنا پر تھیں جسے بھگ یا پھر کوئی اور نشی چیز زبردستی پلائی جا رہی تھی۔ کچھ دیر میں وہ نشے سے چکرانے لگی تو اُسے گھسیٹ کر کالی کے قدموں کے سامنے چبوترے پر چت لٹا دیا گیا۔ دو پجاری اور لپک کر سامنے آ گئے۔ چاروں نے مل کر اُس کے ایک ایک ہاتھ اور ایک ایک پاؤں کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ موت کا بھیا تک تصور نشے پر غالب آتا تو جتنا کا جسم کمان کی طرح اکڑنے لگتا، چاروں پجاری پھر طاقت کے استعمال سے اُسے سیدھا کر دیتے۔ میں اس ہولناک رسم کو آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا۔ پنڈت نول کشور قریب کھڑا ہاتھ کے اشاروں سے اپنے آدمیوں کو ہدایتیں دیتا رہا۔ ایک پجاری نے آگے بڑھ کر جتنا کے سر کے بال کاٹ ڈالے۔ پھر دو پجاری بڑے بڑے چھرے لہراتے میدان میں کود پڑے۔ پچارنوں کے بھجن گانے کی آواز بندرتی بلند ہونے لگی۔ چھرے لہراتے ہوئے پجاری اُپھلتے کودتے جتنا کے قریب جاتے اور اُس کے جسم پر وار کر کے پھر رقص شروع کر دیتے۔ جتنا کے حلق سے غوغا، غاں غاں کی کرناک چیخیں بلند ہوتی رہیں..... اُس کا بدن لہو لہان ہو رہا تھا۔ اُس کے جسم نے جھٹکے کھانا شروع کیا تو دونوں پجاری ایک دوسرے سے پشت ملا کر اُس کے خون آلود جسم پر بیٹھ گئے، اُس



نئی زبانیں گدی سے کھینچ کر پیروں تلے روند ڈالتا۔ مرجاتا لیکن کلدیپ کی شان میں  
تسلی برداشت نہ کرتا۔

پنڈت نول کشور میری دھجیاں بکھیرتا رہا، مجھ پر طنز کرتا رہا، گھناؤنے الفاظ استعمال کرتا  
ہا۔ میں خاموش کھڑا سب کچھ سننے پر مجبور تھا۔ بازی یکلفت اتنی تیزی سے چلی تھی کہ میں  
بھی حیران رہ گیا۔ میں نے انکارانی کا مشورہ قبول کیا ہوتا، اپنے گرد حصار کھینچ لیا ہوتا، اس  
کے اندر پاؤں جمائے کھڑا رہتا تو شاید بساط کا رخ نہ پلٹتا، صورت مختلف ہوتی۔

میں خاموش کھڑا اپنے خیالات میں مستغرق تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ ابھی تک سید مجذوب  
کو بھی میرے بارے میں خبر نہیں ہوئی۔ خبر ہوتی تو وہ ضرور آتا۔ نہ آتا تو دُور بیٹھے بیٹھے ہی  
اشارہ کر دیتا، میری مشکل حل ہو جاتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دوسروں کی طرح سید نے بھی  
ٹاپس پھیر لی ہوں، میری طرف سے مایوس ہو گیا ہو۔ وہ خدا کا برگزیدہ بندہ تھا، اُس کی  
رسائی بہت اُپر تک تھی۔ قدرت نے اُسے دونوں ہاتھوں سے نواز رکھا تھا، وہ دلوں کے  
مجید بھی جانتا ہوگا۔ شاید اُسے بھی میرے انجام کی خبر ہو گئی ہو، اُس نے سمجھ لیا ہو کہ توبہ کے  
دروازے میرے اوپر بند ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد کسی کی مداخلت کام نہیں آتی، سب بے  
بس ہو جاتے ہیں۔ سید بھی بے بس ہو گیا ہوگا۔ اُس نے بارہا اشاروں کنایوں میں میری  
اصلاح کی کوشش کی تھی، میری بد نصیبی کہ اُس کی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اُسے کھل  
کر کہنے کا اختیار نہیں تھا، میں اس کی تہہ تک ڈبکی لگانے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا، بات  
گڑتی چلی گئی، اب پچھتاؤں سے کچھ حاصل نہیں تھا، بربادی شاید میرا مقدر بن چکی تھی۔  
میں کیا شکوہ کرتا؟ کس منہ سے گلہ کرتا؟ انسان جو ہوتا ہے وہی اُسے کا ثنا بھی پڑتا ہے.....  
میں نے تو کچھ بھی نہیں بویا تھا، ہواؤں کے دوش پر تصورات کے محل تعمیر کرتا رہا، خود بھی بھٹکتا  
ہا۔ دوسروں کو بھی بھٹکتا رہا۔ کبھی اپنے گریبان کی سمت توجہ ہی نہیں کی..... پھر کس سے  
شکایت کرتا.....؟

پنڈت نول کشور دل کی بھڑاس نکال چکا تو اُس نے مجھے کسی تہہ خانے کی کال کوٹھڑی  
میں ڈلوادیا۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ میں راستوں کا اندازہ بھی نہیں لگا سکا۔  
ہار گئے ہوئے جسم کے پٹے کٹے پجاریوں نے مجھے دھکے مار مار کر کال کوٹھڑی تک پہنچایا۔  
نئے سیلی ہوئی بد بودار زمین پر اوندھا لٹا کر میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے۔ پیروں

سنگ رہی ہوگی۔ وہ آجائے گا تو مل بیٹھ کر آرام سے فیصلہ کریں گے۔ اتنی جلدی بھی  
ہے؟ ابھی تو جمیل احمد خاں پہاڑ تلے آئے ہیں، یہ بڑی مہمان شکلیوں کے مالک رہ چکے  
ہیں، ان کے سر پر کبھی انکارانی براجمان ہوا کرتی تھی، ہمارے بڑے بڑے گیانی دھرم  
بھی اُس نٹ کھٹ بلا کو قابو کرنے کے کارن جان گنوا چکے ہیں۔ وہ بھی بڑی حرافہ ہے، جس  
کے سر پر ہوتی ہے کیول اُسی کی بات سنتی ہے، دوسروں سے سارے پرانے رشتے ناتے  
تمام بندھن توڑ لیتی ہے۔ منش کے خون کا بھوجن کرتی ہے، سندرناریوں کی رگوں میں  
دوڑتا ہوا جوان خون اُسے زیادہ بھاتا ہے۔ بڑے بڑے پنڈت پجاری اُس کے درشن کو  
ترستے ہیں، کئی اُس کی آشا میں آج بھی منڈلوں میں دھونی رمائے بیٹھے سندرسندر بنے  
دیکھ رہے ہوں گے، جاپ کرتے ہوں گے۔ وہ بڑی مشکل سے کسی کے جال میں پھنسی  
ہے۔ لیکن یہ مسلا بڑا بھاگیہ شالی (خوش قسمت) ہے۔“ نول کشور نے میری جانب اشارہ  
کیا۔ ”قسمت کا بڑا دھنی ہے جو بیٹھے بٹھائے وہ چنچل گجریا اس کے سر پر بیٹھ گئی۔ یہ اپنی  
اوقات ہی بھول گیا، سب سے پنچہ لڑانے لگا۔ بڑے عیش کر لئے اس نے، بڑی رنگ  
رلیاں منا چکا، بہت دھوم دھڑکا کر لیا، اب پھنسا ہے ہمارے جال میں..... چندرا کو اپنے  
دو، پھر ہم اُس سور کی اولاد کا کریم بھی دھوم دھام سے ہی کریں گے۔“

میں صرف سن سکتا تھا، کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ وہ میری کلدیپ کی شان میں  
گستاخانہ جملے بولتے رہے، میں آگ پر لوٹا رہا۔ وہ انکارانی کو بھی برا بھلا کہتے رہے، میں  
سننا رہا۔ انہوں نے میری قسمت کا فیصلہ کرنے میں جلد بازی نہیں کی، انہیں اُس سنوے  
چندرا کا انتظار تھا جس کے باپ کو میری کلدیپ نے بڑی عبرتناک سزا دی تھی۔ اُس نے  
پہل نہیں کی تھی۔ آخری وقت تک امر لال سے یہی درخواست کرتی رہی کہ وہ میرے اور  
بدری نرائن کے درمیان سے ہٹ جائے، ہمیں آپس میں نمٹ لینے دے۔ اُس نے بھی  
میں نہ بولنے کا وعدہ کیا تھا، امر لال نے کلدیپ کی بات نہیں مانی۔ وہ بے قصور تھی، میری  
خاطر اُس نے پوری جوانی داؤ پر لگا دی۔ میری ہی خاطر اُس نے کالی کو اپنی زندگی کی بھینٹ  
دینے کا وچن دیا تھا، وہ جب تک زندہ رہی پریم لال کی کنیا میں بیٹھی دیوی دیوتاؤں کی پوجہ  
کرتی رہی۔ آج انہی دیوی دیوتاؤں کے ماننے والے اس عظیم عورت کو گالیوں سے نواز  
رہے تھے۔ میرے ہاتھ کھلے ہوتے، میں آزاد ہوتا تو ان کو اتنی جرأت کبھی نہ ہوتی۔ میں ان

ری غنودگی چھٹے لگتی تو میں ہاتھ جھٹک کر پہلو بدل لیتا۔ سنگلاخ اور ناہموار زمین نے میرا بڑبڑا دیا تھا۔ میں بیہوش رہنا چاہتا تھا، اسی کیفیت میں مرجانا چاہتا تھا۔ میں مرجاتا تو بہت نول کشور کے سارے خواب چکنا چور ہو جاتے، سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ چندرا واپس آ کر میری سردلاش کو دیکھتا تو وہ بھی دل تھام کر رہ جاتا۔ اُس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک امر لال کا انتقام نہ لے لے گا، کسی عورت کو ہاتھ نہ لگائے گا۔ اُس کی قسم پوری نہ ہوتی تو وہ پچاروں اور دیو داسیوں کو دیکھ کر صرف ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر سکتا تھا، اُن کے تصور سے کھیل سکتا تھا، اُن کے قریب نہیں جاسکتا تھا۔ اُن کے کنوارے بدن کی مہمندی سونہی خوشبو سے ہمیشہ محروم ہی رہتا۔ دوسرے موج میلا کرتے رہتے، وہ ولد الحرام دُور بیٹھانے کی طرح ہونوں پر زبان پھیرتا رہتا۔ میری موت بھی ایک زاویے سے اُن کی شکست ہوتی۔ شاید اسی لئے وہ مجھے ہوش میں لانا چاہتے تھے۔

ممکن ہے وہ میرا وہم رہا ہو، وہ دشمن کا آدمی نہ ہو کوئی حشرات الارض ہو، کوئی سانپ ہو جو میری خوشبو پا کر میری کلائی پر اپنی گرفت جمانے کی کوشش کر رہا ہو، میرے آس پاس مڈلا رہا ہو، خوشی سے پھن اٹھائے ناچ رہا ہو..... میں اُس کے لئے ”بڑا کھانا“ ثابت ہوتا۔ اُسے ہفتوں خوراک کی تلاش میں بھٹکانا پڑتا۔ مجھے سمو چا نگنے میں اُسے دقت ضرور پیش آتی، میں اُس کے لئے بھی ”لوہے کا چنا“ ثابت ہوتا۔ لیکن وہ پھر بھی اپنی کوششوں سے باز نہ آتا..... سانپ کی بجائے کوئی نیولا بھی ہو سکتا تھا، کوئی گھونس جو پتھروں کے اندر ہی اندر سرنگ کھودنے کا کام اتنی مہارت اور چابکدستی سے کرتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ نول کشور کے گرگوں نے کوئی ایسا موذی جانور پال رکھا ہو جو نڈیوں کو سکون کی نیند نہ سونے دیتا ہو۔ وہ میرا روندنا ہوا احساس بھی ہو سکتا تھا، نیند اور بے چینی کے درمیان کشمکش ہو تو حواسِ خمسہ پوری طرح سے معطل نہیں ہوتے، کوئی ایک جس دوسری جس پر غالب آتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی بلاوجہ بھی یہ خیال گزرتا ہے جیسے کوئی شے جسم پر ٹپک رہی ہو، کوئی بدن کو چھو رہا ہو!

میں بھی ٹوٹی ہوئی غنودگی کے عالم میں امکانات کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔ لیکن ایک بار پھر جب کسی نے مدھم آواز میں میرا نام لے کر آواز دی تو میں کسمسانے لگا۔ ”کون ہے؟“ میں نے جھلا کر پوچھا۔ ”کون ہے جو میرے سکون کو برباد کر رہا ہے؟“

میں زنجیریں ڈال دی گئیں۔ زنجیر کا دوسرا سرا سنگلاخ دیوار میں لگے مضبوط آہنی کنڈے میں ڈال کر زنی تالے لگا دیئے گئے۔ دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ وہ جاتے جاتے کہ گئے تھے کہ میں نے فرار کی کوشش کی تو میرا انجام اور بھی نیک ہوگا۔ میں کوئی جواب نہ دے سکا، بدبو اور تعفن سے میرا دماغ پھنسا جا رہا تھا، اندھیرا اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں بھائی دیتا تھا، میرا ذہن پھرتا رہی میں ڈوبنے لگا.....

گھپ اندھیروں میں وقت کا احساس نہیں ہوتا، نظروں میں کانٹے سے چھپنے لگتے ہیں ذہن اُلجھنے لگتا ہے، گھٹن کا احساس شدت پکڑنے لگتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے وقت کی رفتار گنی ہو، ذہن منجمد ہو گیا ہو۔ کچھ بھائی نہیں دیتا، موت کی خواہش ہوتی ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ زندگی ایک نعمت ہے، انہیں پکڑ کر کسی اندھیری کوٹھڑی میں بند کر دو، روشنی کی کوئی کرن اُن کی آنکھوں تک نہ پہنچ سکے، کوئی بات کرنے والا نہ ہو، یہ خیال بھی لاحق ہو کہ باہر دشمن کی فوج موجود ہے، فرار کا کوئی راستہ نہ ہو، ہاتھ پیروں میں آہنی زنجیریں پڑی ہوں، ہر طرف تعفن پھوٹ رہا ہو، پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ زندگی کو نعمت سمجھتے ہیں یا موت کے لئے گڑگڑا کر دُعائیں مانگتے ہیں۔ میں درویشوں کی بات نہیں کر رہا، اُن برگزیدہ بندوں کی بات بھی نہیں کر رہا جو اللہ کو محبوب ہوتے ہیں۔ پیر و فقیر کی بات بھی اور ہوتی ہے، ان کے دل میں خدا کی یاد ہوتی ہے۔ جہاں خدا کی ذات مضر ہو، وہاں اندھیروں کا گزر بھی نہیں ہوتا، روشنی ہی روشنی ہوتی ہے، نور کی بارش ہوتی ہے، تجلیات کا ظہور ہوتا ہے، تنہائی کا احساس قریب نہیں پھٹکتا، فرشتے آس پاس موجود ہو جاتے ہیں۔ ان کے لئے اندھیرے بھی روشنی سے زیادہ منور ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے جیسوں کی بات کر رہا ہوں جو سوئی چمے سے بھی کراہ اٹھتے ہیں۔

میں بے ہوش نہ ہو گیا ہوتا تو اذیت سے دوچار رہتا، بیہوشی بھی ایک نعمت ہے۔ انسان ہر فکر سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ شب و روز کے ہنگاموں سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا، زمین کی سیلن اور تعفن کے سبب میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں تب تک بیہوش رہا؟ مجھے اس کا مطلق کوئی اندازہ نہیں ہے۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ دوسری بار میری غفلت اس وقت ٹوٹی جب کوئی میرا ہاتھ تھام کر زور زور سے جھنجھوڑ رہا تھا۔ شاید میرے دشمنوں کو میری بیہوشی بھی پسند نہیں آئی تھی۔ وہ مجھے بیدار رکھنا چاہتے تھے۔ میرے ذہن

”اُٹھو مہاراج.....“ ایک نسوانی آواز میری قوتِ سماعت سے ٹکرائی۔ ”دیر مت کرو، ہوگئی تو تمہارے ساتھ میں بھی ماری جاؤں گی۔“

”کون.....؟“ میں نے اُس آواز کی بازگشت کو شناخت کرنے کی کوشش کی۔

”مم..... میں ہوں مہاراج، جھرنہ۔ اُن ظالموں نے میری ماں کو کالی کے چنوں پر بھینٹ چڑھا دیا، وہ مجھے بھی تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں اُن کے ہاتھ لگ گئی تو دشت میرے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کریں گے۔“

خلاف توقع جھرنہ کی آواز سن کر میں ہڑبڑا کر اُٹھا..... پاؤں میں پڑی زنجیریں بھی جاگ اُٹھیں۔

”آہستہ مہاراج..... آہستہ۔“ جھرنہ نے سرگوشی کی۔ ”چار پانچ مسئلہ باہر بھی دے رہے ہیں، انہیں خبر ہوگئی تو دروازہ کھول کر اندر آجائیں گے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، ہاتھ بڑھا کر گھپ اندھیرے میں جھرنہ کے کسن جسم کے نشیب و فراز کو ٹٹولنے لگا۔ اس عمل میں کسی نفسانی خواہش کو دخل نہیں تھا، وہ عمر میں میری تزئین سے بھی چھوٹی تھی، اُس کے بارے میں کوئی برا خیال دل میں نہیں لاسکتا تھا۔ میں اُس کے برہنہ جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے تھے.....؟

محسوس کرنا چاہتا تھا کہ میں زندہ بھی ہوں یا مر چکا ہوں؟

”کیا کرتے ہو مہاراج.....؟“ جھرنہ نے پھر خظروں کا احساس دلایا۔ ”ہمارے ہاں کثوری نہیں اور بھی سینکڑوں پنڈت پجاری اُس کی کسن جوانی پر دانت جمائے بیٹھے سے بہت کم ہے۔“

”تم..... تم نول کشور کے آدمیوں سے بچ کر یہاں تک کیسے پہنچ گئیں؟“ میں نے نول

کر اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”جس راستے سے آئی ہو اُسی راستے واپس چلی جاؤ۔ ہو سکے تو ایک دو روز کسی محفوظ مقام پر چھپی بیٹھی رہو۔ ابھی پنڈت پجاریوں کو تمہاری تلاش ہوگی۔ دو چار روز میں تھک کر بیٹھ جائیں تو کالی کے مندر سے دور چلی جانا۔ ہر دوار بھی تمہارے لئے محفوظ نہیں ہوگا۔ سمجھ رہی ہو میری گڑیا، میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں؟ جلدی سے واپس بھاگ جاؤ.....“

”تم غلط سمجھ رہے ہو مہاراج.....“ اُس نے بدستور مدھم آواز میں کہا۔ ”میں مندر کے اندر نہیں تھی۔ جب وہ تم پر لٹھ برسا رہے تھے اُس وقت میں مندر ہی میں تھی، وہ تمہیں چلے گئے تو میں کوارٹر میں گئی، وہاں میری ماں نیم بیہوش پڑی تھی۔ میں اُس سے

سبھانے کی کوشش کر رہا ہوں؟ جلدی سے واپس بھاگ جاؤ.....“

”تم غلط سمجھ رہے ہو مہاراج.....“ اُس نے بدستور مدھم آواز میں کہا۔ ”میں مندر کے اندر نہیں تھی۔ جب وہ تم پر لٹھ برسا رہے تھے اُس وقت میں مندر ہی میں تھی، وہ تمہیں چلے گئے تو میں کوارٹر میں گئی، وہاں میری ماں نیم بیہوش پڑی تھی۔ میں اُس سے

نے اُس کو لنگا جل پلانے کی کوشش کی، اُس نے گنگا جل بھی نہیں پیا، جب تک ہوش رہا ہر ایک ہی جملہ دہراتی رہی..... بھاگ جا جھرنہ، بھاگ جا..... مندر سے دُور چلی نہیں چھپ کر بیٹھ جا۔ میرے بعد وہ تیرا بھی برا حشر کریں گے۔“

”پھر..... پھر کیا ہوا.....؟“

”میں ماں کے کہنے پر سہم کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں نے بھاگتے بھاگتے وہ لاشی بھی

نالی جسے تم نے سینے سے لگا کر رکھا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر کسی نے مجھے پکڑنے کی

کوشش کی تو اسی لاشی سے اس پاپی کا سر پھوڑ دوں گی۔ لیکن وہ سب تمہارے چکر میں لگے

نے۔ میں کسی نہ کسی طرح چھپتی چھپاتی مندر سے نکل گئی.....“

جھرنہ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ وہ شاید دیوانی ہوگئی تھی۔ اُسے غالباً اپنی

کے ہولناک انجام کی تفصیل معلوم ہوگئی تھی۔ وہ تاب نہ لاسکی، پاگل ہوگئی۔ پاگل نہ

تھی تو یہی بہکی باتیں نہ کر رہی ہوتی..... وہ اگر مندر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی تو

اُس نے دوبارہ اسی مقتل گاہ میں پلٹ کر آنے کی حماقت کیوں کی جہاں اُس کی بے قصور

میں مان ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ مندر سے نکلنے میں کامیاب ہوئی ہوگی۔ صرف پنڈت

نہ، وہ بڑے پروہت کی وجہ سے خاموش تھے لیکن جب ہنگامہ ہو تو ہر طرف لوٹ مار شروع ہوجاتی ہے۔ جس کے ہاتھ جو لگتا ہے وہ اسے مالی غنیمت سمجھ کر لے بھاگتا ہے۔ جھرنہ تو

نر اسونا تھی جس کی چمک دمک نے کالی کے مندر میں ہر طرف اپنے پرستاروں کی فصل

برگھائی تھی، وہ جننا کے کہنے پر ضرور بھاگی ہوگی۔ ہو سکتا ہے اُس نے میری لاشی بھی اٹھالی

لیکن وہ مندر سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوئی ہوگی۔ کسی نہ کسی نے ہمت سے کام لے کر

راستے میں ہی دیوبچ لیا ہوگا، ہنگاموں سے فائدہ اُٹھا کر اسے بھی ضرور لوٹا کھسونا گیا

نہ، منتر خوان بچھا ہو، دعوت عام ہو تو نیدے ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جن

سب بھرے ہوتے ہیں وہ بھی ”مال مفت دل بے رحم“ کے مصداق دو چار لقمہ ضرور ہر

لے لیتے ہیں۔ جھرنہ کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہوگا۔ جہاں لنگر جاری ہو، وہاں کون

نہ کرتا ہے؟ ”غریب کی جو رو سب کی بھابھی“ بننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جھرنہ حملہ

آوروں کی یلغار سے بوکھلا گئی ہوگی، کسی کو بھی درندگی سے ہوس کا نشانہ بنایا جائے تو وہ اپنے ذہنی توازن برقرار نہیں رکھ سکتا۔ جھرتا تو معصوم تھی، کس تھی، بٹنی پر ادھ کھلی کچی کلی کی مانند تھی۔ میری بد نصیبی کی لپیٹ میں آکر وہ بھی ”آدم خور درندوں“ کی وحشت کا شکار ہو گئی۔ لیکن ایک سوال باقی رہ گیا تھا..... جھرتا مجھ تک کس طرح پہنچ گئی.....؟ کیا نول کشور جھرتا کے ذریعے مجھے کوئی پیغام پہنچانا چاہتا تھا؟ مجھے ذہنی طور پر خوفزدہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا؟ یا یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ کس حد تک اپنی کمینگی کا ثبوت دے سکتا ہے.....؟؟

”تم کن و چاروں میں گم ہو مہاراج؟ کیا سوچ رہے ہو؟“ جھرتا نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”سے بڑی تیزی سے بیت رہا ہے۔“

”جھرتا.....“ میں نے بڑے پیار سے اس معصوم کو ٹٹولنے کی خاطر سوال کیا۔ ”تم نے ابھی کہا تھا کہ مندر سے بھاگتے سے تم نے میری لاٹھی اٹھالی تھی۔“

”ہاں..... میں نے سچ کہا تھا، میں جھوٹ نہیں بولتی۔ تمہیں وشواس نہیں آتا تو خود چھوکر دیکھ لو۔“ اُس نے جواب میں لاٹھی میرے ہاتھ میں دی تو میرا دل دھڑکنے لگا۔

شاید میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا، میں مرچکا تھا، مرنے کے بعد میری روح آخری ایام کے سہانے خواب دکھا کر اس بات کا احساس دلارہی تھی کہ..... ”دیکھو جمیل احمد خاں..... یہ مقام عبرت ہے۔ تم نے کیا سوچا تھا؟..... کیا ہو گیا۔ کوئی تدبیر تمہارے کام نہ آئی۔ تم مسلمان ہو کر ایک مندر کے تہ خانے میں بیہوشی کے عالم میں سفر آخرت پر روانہ ہوئے تھے..... تم ’عالم برزخ‘ میں ہو۔ ایک بار پھر سیّد مجذوب کی متبرک لاٹھی کا دیدار کر لو..... اس کے بعد تمہیں ایک سفر اور کرنا ہوگا۔ اس کے بعد.....“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے مہاراج.....“ جھرتا کی آواز نے میرے خیالات کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ وہ سہمی سہمی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”اُس نے کہا تھا کہ اگر دیر ہوئی تو پھر اُس کا بس نہیں چلے گا۔ اُس نے مجھے جادو کے خول میں چھپا کر تمہارے پاس بھیجا ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ میں تم کو بھی اسی خول میں چھپا کر مندر سے باہر نکال لاؤں۔ سے بیت گیا تو گپ اندھیرے کا منڈل ٹوٹ جائے گا۔ دشمن ہمیں دیکھ لیں گے تو میں بھی تمہاری وجہ سے مارا جاؤں گی..... بھگوان کے لئے، اب نکل چلو، میرا من بے چین ہو رہا ہے۔ میں ابھی من نہیں چاہتی۔“

”جھرتا.....“ میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ اندھیرے میں اُس نے کوئی لاٹھی بے ہاتھ میں تھما دی تھی..... وہ پھر بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی۔ میرے دل و دماغ میں فتنہ پھیل شروع ہو گئی۔ میں نے بڑے ضبط سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔ ”تم کس کی بات کر رہی ہو میری گڑیا؟ تمہیں کس نے جادو کے پٹارے میں بند کر کے اس کال کوٹھڑی میں بند کیا تھا؟ اندھیروں کے منڈل ٹوٹ جانے کی بات کس نے کی تھی؟ تم..... تم کس کی بات کر رہی ہو.....؟“

”میں اُسے نہیں جانتی۔“ جھرتا نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ ”وہ پلاسٹک کی بنی گڑیا جیسی لگ رہی تھی۔ بالکل میری طرح باتیں کر رہی تھی۔ میرے سر پر بیٹھی تھی۔ میں نے اُس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا، میں مندر میں واپس نہیں آتا چاہتی تھی لیکن.....“ اُن نے میرے سر میں کوئی چیز چھو دی، میں نے اُس کا کہا مان لیا۔ مندر میں قدم رکھتے ہی میرا دل ڈول رہا تھا، کوئی ٹھکتی تھی جو مجھے آگے آگے چلا رہی تھی۔ میری نظریں پنڈت پاریوں کو دیکھ رہی تھیں، وہ سب بوکھلائے ہوئے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ میری آنکھوں نے بھی مجھے اپنی نگاہوں کے سامنے سے گزرتے دیکھا..... اُس نے ٹھیک ہی کہا تھا مہاراج..... میں سب کو دیکھ رہی تھی، کوئی مجھے نہیں دیکھ پارہا تھا۔ اس سندر گڑیا نے مجھے ناک کا جادو کے پٹارے میں بند کر دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ میں نے دیر کی تو پٹارا ٹوٹ جائے گا..... وہ کون تھی؟..... کیا سمجھ رہا ہے اُس کا تمہارا.....؟“

میں خوشی سے دیوانہ ہونے لگا۔ جھرتا مجھ سے انکارانی کی بات کر رہی تھی۔ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میرا اُس کا کیا تعلق ہے؟ میرے پاس وقت ہوتا تو اُس معصوم کو ضرور بتاتا کہ انکارانی سے میرا تعلق بڑا گہرا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں یلکھت تیز ہو گئیں۔ انکارانی نے کافی کے مندر کا حال احوال لینے کی خاطر بھی، ایک پجاری کو اپنا معمول بنالیا تھا۔ اُس نے پنڈت نول کشور کا منڈل توڑنے میں بھی بڑی دور اندیشی سے کام لیا تھا..... اب اُس نے جھرتا کو میرے پاس بھیجا تھا۔

وہ مجھ سے بے خبر نہیں تھی، مجھے جال میں پھانس لینے کے بعد پنڈت نول کشور نے غالباً کوئی منڈل کھینچ لیا ہوگا۔ ایسا نہ ہوتا تو انکارانی سے میرا رابطہ نہ ٹوٹتا، اُس نے جو کہا تھا، وہ نہیں کہا تھا۔ میری نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد وہ بھی مضطرب ہوئی ہوگی۔ اُس



میں انکارانی کی بے شمار حیرت انگیز قوتوں کا چسکا رد کچھ چکا تھا۔ وہ ناممکن کو ممکن بنا دینے والی تھی۔ جو کچھ اس وقت میرے ساتھ گزر رہی تھی، مجھے اس پر بھی کوئی تعجب نہیں ہوا۔ ساری مخلوقات ایسی ہیں جو عام انسانوں کو نظر نہیں آتیں لیکن ان کے وجود سے انکار کیا جاسکتا۔ بھوت پریت..... چڑیل اور پچھل پیریوں کا تصور خیالی ہو سکتا ہے، کچھ قسم بھی کھاتے ہیں کہ ان کا واسطہ شیطانی بدروحوں سے پڑ چکا ہے۔ وہ بڑی عجیب و غریب اور مختلف شکلوں میں نظر آتی ہیں۔ جنات کے وجود سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ وہ نف اشکال میں سامنے آنے کی قوت رکھتے ہیں۔ قدرت نے انہیں ڈھیل دے رکھی ہے۔ مختلف مذاہب کے لوگوں کے نظریات اور عقائد بھی مختلف ہوتے ہیں۔ وہ بھی کچھ ہی باتوں پر یقین رکھتے ہیں جنہیں انسانی ذہن قبول نہیں کرتا۔ آپ کس کس کو جھٹلاتے ہیں گے، کس کس بات کی نفی کریں گے؟..... میں اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔

کالی کے مندر کی کھلی فضا میں آ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میری توانائی سید کی زامانی لاشی سے بحال ہو چکی تھی، مجھے وہ ظلم یاد آئے جو مجھ پر ستون کے ساتھ رسیوں سے بکڑ کر ڈھائے گئے تھے۔ پنڈت نول کشور کی گندی زبان سے ادا ہونے والے جملے میرے اذان میں گونجنے لگے۔ پنڈت پجاریوں کی خرمستیاں بچھو بن کر میرے جسم سے لپٹ گئیں۔ جتنا کا بھیا نک انجام، اُس کی آخری ہچکی مجھے آواز دینے لگی۔ وہ بد نصیب مجھے پناہ دینے کے جرم میں ماری گئی۔ اُس وقت میں بے بس تھا۔ اب آزاد تھا۔ سید کی لاشی بھی میرے ساتھ تھی۔ میں نے اپنا رخ پنڈت نول کشور کی پناہ گاہ کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ جھرتا نے میرا ارادہ بھانپ لیا۔ ہو سکتا ہے انکارانی نے اُس کے ساتھ ذہنی رابطہ برقرار رکھا ہو، اُسے میرے خطرناک ارادے سے باخبر کر دیا ہو۔

”کسی اور دشام میں جانے کی مت سوچو مہاراج۔“ جھرتا نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ ”سے ہاتھوں میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ ہم باہر نہیں نکل سکے تو دوبارہ دھر لئے جائیں گے۔“ ”جھرتا.....“ میں نے اُسے کریدنے کی کوشش کی۔ ”تم جس پلاسٹک کی ٹکٹ کھٹ، لٹاؤ گی کڑیا کی بات کر رہی تھیں، کیا اس وقت بھی وہ تمہیں نظر آرہی ہے.....؟“ ”کیسی باتیں کرتے ہو.....؟“ اُس نے مجھے گھور کر کہا۔ ”وہ کالی کے مندر میں خود آتا تو مجھے کیوں مجبور کرتی.....؟“

کے ذہن میں بہت سارے خطرات ابھرے ہوں گے۔ وہ میری مدد کی خاطر مختلف پہلوؤں پر غور کر رہی ہوگی۔ اُس کا بس نہیں چل رہا ہوگا، جھرتا کو مندر سے نکلتا دیکھ کر اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں ہوں گی۔ وہ کسی اور پر بھی اعتماد کر سکتی تھی، کسی پنڈت پجاری کو دوبارہ معمول پر لے سکتی تھی۔ لیکن اُس نے جلد بازی کا مظاہرہ مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔ جھرتا اور جمنے سے وہ میری باتیں سن چکی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ جھرتا میرے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوگی۔ وہ آنے والے وقت کے بارے میں بھی صحیح اندازے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اُس نے کئی بار کہا تھا کہ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ کچھ مجبوریاں لاحق تھیں جو وہ زبان نہیں کھول سکتی تھی۔

بہر حال، انکارانی کو یقین رہا ہوگا کہ جھرتا دشمنوں کے ہاتھ نہیں آ سکے گی۔ وہ اُسی کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔ اور آخر کار اُس کی لازوال قوتوں نے جھرتا کو میرے پاس بھیج دیا۔ سب اُس کی پراسرار قوتوں کے سامنے اندھے ہو گئے، پر تيم لال نے انکارانی کو جواضائی قوتیں دان کی تھیں وہ حیرت انگیز تھیں۔

پہلے مجھے شبہ تھا، جھرتا کی بات سن کر یقین آ گیا کہ میرے ہاتھ میں جو لاشی تھی، وہ سید مجذوب ہی کا دیا ہوا تحفہ تھا۔ میں نے اُسے آزمانے کی خاطر زنجیر پر ہلکی سی ضرب لگائی، میرا دل خوشی سے اُچھل پڑا۔ زنجیر ٹوٹ کر علیحدہ ہو گئی۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے، اس لئے لاشی زنجیر تک لے جانے میں مجھے کچھ دشواری ضرور ہوئی۔ لیکن زنجیر کے ساتھ ساتھ میرے ہاتھ بھی بندشوں سے آزاد ہو گئے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میری توانائی بھی آہستہ آہستہ بحال ہو رہی تھی۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”میرا ہاتھ تمام لومہاراج.....“ جھرتا نے کہا۔ پھر خود ہی ہاتھ بڑھا کر میری کلائی تھام لی۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے لاشی اُٹھا کر دروازے سے نکالی، ہلکا سا زور دیا تو وہ ٹوٹ کر گر پڑا۔ باہر روشنی ہو رہی تھی۔ چار ہٹے کئے پجاری لٹھ لئے ایک تخت پر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے، انہیں دروازہ ٹوٹنے کی آواز سنائی نہیں دی۔ وہ صرف اندھے نہیں ہوئے تھے، گوئے بہرے بھی ہو گئے تھے۔ جھرتا میرا ہاتھ تھامے تیز قدم اٹھانے لگی۔ کئی پڑی راستوں سے گزر کر ہم کھلے آسمان کے نیچے پہنچ گئے۔ ہر طرف پنڈت پجاری گھوم پھر رہے تھے۔ پجاریں اور دیو داسیاں بھی مکتی پھر رہی تھیں۔ کسی کی توجہ ہماری جانب مبذول نہیں ہوئی۔



”میں نے کہا نا..... پہلے کچھ دیر سنا لو، پھر آرام سے باتیں بھی ہوتی رہیں گی.....“  
 اس نے کھل کر میری بات کا جواب دینے سے گریز کیا۔  
 میں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا، اسی وقت ایک گاڑی تیزی سے قریب آ کر رکی۔  
 انٹرینگ سیٹ پر آنند بھون کا منیجر بھنداری نظر آ رہا تھا۔ اُس نے نیچے اتر کر میرے لئے  
 پچھلا دروازہ کھولا۔ میں جھرنا کا ہاتھ تھام کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ انکا میرے سر سے اتر  
 کر جھرنا کے سر پر چلی گئی۔  
 میرے ذہن میں انکارانی کے وہ آخری جملے گونجنے لگے جو اُس نے جھرنا کے بارے  
 میں کہے تھے.....!!



میں لا جواب ہو گیا۔ میں نے مندر کی عمارت کی سمت دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔  
 ”پنڈت نول کشور، میں اس وقت تجھے چھوڑے جا رہا ہوں۔ تم نے اور تیرے حرام  
 جنے ساتھیوں نے میرے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے وہ میرے دل پر نقش ہے۔ تو بھی یاد رکھو  
 ..... میں پھر واپس آؤں گا۔ جب تک پائی پائی کا حساب چکتا نہ کر لوں، جہنم سے نہیں  
 بیٹھوں گا۔ چندرا کو سند یہ بھیج کر اُسے بھی بلوالے۔ تم دونوں کی ارتھی ایک ساتھ اٹھ گئی تو  
 تمہارے ساتھیوں کو بھی دوبار مرگھٹ تک جانے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ چندرا سے  
 یہ بھی کہہ دینا کہ اُس کا باپ امرلال مر گیا ہے تو اُس کا غم نہ کرے۔ اُس کا ایک باپ میری  
 شکل میں ابھی زندہ ہے۔ اُس کی چتا کو میں اپنے ہاتھوں جلتی ہوئی لکڑی دکھاؤں گا..... کچھ  
 رہا ہے میری بات کا مطلب.....؟“

میں دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ جھرنا نے تیز تیز قدم اٹھانے کی بجائے دوڑنا شروع کر  
 دیا۔ میں بھی اُس کا ساتھ دینے لگا۔ شاید جادو کے پتارے کے ٹوٹنے کا وقت قریب آ رہا  
 تھا۔ ہم بھاگتے ہوئے کالی کے مندر کے پھانک سے باہر نکلے۔ انکارانی میرے سر پر آ  
 گئی۔ اُس کا چہرہ خوشی سے تھمرا رہا تھا۔ وہ مجھے ہوی والہانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔  
 ”انکارانی.....“ میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”تمہارا بہا احسان میں زندگی بھر.....“  
 ”غیریت کی باتیں مت کرو جمیل.....“ وہ پھٹک کر میرے شانے پر آ گئی۔ میرے  
 گالی پر اپنی نرم نرم انگلیاں پھیر کر بولی۔ ”دوستوں حساب ہمیشہ دل میں ہوتا ہے..... دل  
 کی باتوں کو زبان تک نہیں لایا کرتے۔“

”اب کیا ارادہ ہے.....؟“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔  
 ”جو تم چاہو گے وہی ہوگا۔ لیکن کچھ دیر سنا لو، مجھے بھی کچھ سوچنے کی مہلت دو۔“  
 ”رنا کا کیا بنے گا.....؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”یہ بے سہارا اب کہاں جائے گی جمیل.....؟“ انکا کی مخمور آنکھیں نمناک ہونے  
 لگیں۔ ”جمنہ نے تمہارے ساتھ جو مہربانی کی تھی، ہمیں اُسے بھی نہیں بھولنا چاہئے۔ تم  
 پریشان مت ہو۔ میں اسے فی الحال کسی محفوظ جگہ پہنچا دوں گی۔ تم اپنے جھمیلوں سے فارغ  
 ہو لو تو پھر یہ تمہارے پاس واپس آ جائے گی۔“  
 ”کیا مطلب.....؟“ میں نے چونک کر انکارانی کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

آئی۔

”تم مجھے ٹالنے کی کوشش کر رہی ہو.....؟“ میں نے شکوہ کیا۔

”مذکر کرنے کی عادت بدلنے کی کوشش کرو جمیل.....“ اُس نے مجھے سمجھانے کی کوشش

کی۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ مہان شکلیوں نے بہت سے پردے میری نظروں کے

سامنے سے ہٹا رکھے ہیں۔ میں مستقبل میں جھانک سکتی ہوں لیکن زبان نہیں کھول سکتی۔

اسی لئے میں نے کالی کے مندر میں داخل ہوتے سے تم سے کہا تھا، میں صرف مشورہ دے

سکتی ہوں۔ یاد ہے تمہیں.....؟“

”کیا کہا تم نے.....؟“ میں نے چونک کر اُسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”کیا تم جانتی

نہیں کہ کالی کے مندر میں میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟“

”ہاں.....“ اُس نے دروغ گوئی سے کام نہیں لیا۔ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ ”میں

زبان کھول دیتی تو بھی وہی ہوتا جواب ہوا ہے۔ البتہ میں تم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جاتی۔

پھر شاید کبھی ہمارا ساتھ ممکن نہ ہوتا.....“

”میں سمجھا نہیں.....“ میں نے پہلو بدل کر اُسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”تمہیں یاد ہے جمیل، میں نے تم سے کہا تھا کہ جب تک پریم لال مہاراج کی آتما

میرے حق سے دستبردار نہ ہو جائے، دھرتی کا کوئی دوسرا پنڈت یا پجاری مجھے کسی بھی شکلی یا

جاپ منتر کے زور سے اپنانے کے خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔“ اُس نے کسمسا کر جواب دیا۔

”اب اُسے آکاش پر بلایا گیا ہے..... دھرتی سے اُس کی آتما کے تمام سمبندھ بھی ٹوٹ

چکے ہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“ انکا کے جملے کا مفہوم میرے اضطراب میں اضافہ کرنے لگا۔

”مجھے بتاؤ انکارانی۔ کیا پریم لال کے بعد اب کوئی اور پنڈت یا پجاری تمہیں حاصل کرنے

کے لئے کہیں چوروں کی طرح چھپا بیٹھا جا چکا ہے.....؟“

”ابھی سے پریشان مت ہو.....“ اُس نے بڑی لگاؤ سے جواب دیا۔ ”پہلے پنڈت

نول کشور اور چندرا کا حساب چکتا کر لو، پھر دیکھا جائے گا۔“

انکارانی نے کھل کر میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اُس نے وضاحت مناسب نہیں سمجھی

تھی، لیکن میرے وجود میں پچھوؤں نے ڈنک مارنا شروع کر دیا، رگوں میں سنسنہٹ

وقت کی طنائیں میرے ہاتھ میں آ کر ایک بار پھر بام مچھلیوں کی طرح نکل گئیں۔ وہ

میرے جال میں آ گئے تھے، انکارانی نے کالی کے مندر میں میرا داخلہ ممکن بنا دیا تھا۔ میں

صرف قدم جما کر ڈوری کھینچ لیتا..... ساری مچھلیاں پھنس جاتیں۔ وہ مگر مجھ بھی ہاتھ آ جاتا

جو دلدل میں چھپا بیٹھا دوسروں کی جانوں کا زیاں کر رہا تھا۔ میں اُس کا کریا کرم کر کے

ہاتھ جھاڑ لیتا۔ سپہ سالار مار دیا جائے تو فوری طور پر کمان سنبھالنے سے سب پہلو تہی اختیار

کرتے ہیں۔ کوئی مجھ سے آنکھیں ملانے کی جرأت نہ کرتا۔ ایک چندہ باقی رہ جاتا میرے

بہی کھاتے میں۔ میں اُس کے پیچھے لگ جاتا۔ انکارانی نے کہا تھا کہ وہ کسی ایسی جگہ روپوش

ہو گیا ہے جہاں اُس کی نظریں نہیں پہنچ پازنی تھیں۔ کچھ دوسری قوتیں بھی چندرا کا ساتھ

دے رہی تھیں۔ انکا کی دور بین نظروں کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی تھیں۔ اُس نے

میرے استفسار پر یہی بتایا تھا۔

پنڈت نول کشور کو مارنے کا ایک سنہری موقع بھی ہاتھ آ کر نکل گیا۔ میں آئند بھون کے

کمرے میں بیٹھا حالات پر غور کر رہا تھا جب انکارانی میرے سر پر آ گئی۔ مجھے جھرنے کے

بارے میں اُس کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔

”جھرنے اس وقت کہاں ہے.....؟“ میں نے سنبھل کر گفتگو کا آغاز کیا۔

”میں اُسے ایک اتا تھ آشرم میں چھوڑ آئی ہوں۔ وہاں وہ دوسرے ہم عمر بچوں کے

ساتھ رہے گی تو اُس کا دل بہلتا رہے گا۔“

”تم نے کہا تھا کہ میں جھیلوں سے نمٹ لوں تو وہ پھر میرے پاس آ جائے گی؟“

”جو بھوش میں لکھ دیا جائے اسے سے آنے سے پہلے کوئی نہیں جان سکتا۔“ انکا سنجیدگی

سے بولی۔ ”انسان اگر آنے والے کل کے بارے میں سب کچھ جان لیتا تو پھر جھگڑا کس

بات کا رہ جاتا؟ سارے جنگامے، جھگڑے، فساد ختم ہو جاتے۔ ہر طرف امن و شانتی نظر

شروع ہو گئی۔ مجھے میری قومیں واپس مل چکی تھیں، سید مجذوب کی لاش بھی معجزاتی طور پر میرے پاس واپس آ گئی۔ اگر جمنہ کے بعد جھرتا بھی میرے دشمنوں کے ہاتھ لگ جاتی تو اُس کا انجام بھی بھیا نک ہوتا۔ پھولوں کی مہک ختم ہو جائے، اُس کی پتھڑیوں کا مٹھلی تاثر ختم ہونے لگے، وہ مرجھانے لگیں تو پھر انہیں گلدانوں سے نکال کر کوڑے دان میں پھینک دیا جاتا ہے۔ کالر سے نکال کر جوتوں تلے مسل دیا جاتا ہے۔ میرے دشمن بھی جھرتا کا رس نکالنے میں بڑی عجلت سے کام لیتے۔ پھوک رہ جاتا تو وہ اُسے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے کہیں گٹر میں ڈال دیتے، کسی اندھے کنوئیں میں پھینک دیتے، دریا برد کر دیتے۔ لیکن میری قسمت کی خوش نصیبی سے ایسا نہیں ہو سکا۔ جھرتا بھی بچ گئی، سید کی متبرک لاش بھی دوبارہ میرے ہاتھ آ گئی۔ ننڈا اور کپالا کی قومیں بھی میرے شامل حال تھیں۔ انکارانی نہ ہوتی تو طاقت کے توازن میں کوئی فرق بھی نہ پڑتا۔ مگر بات طاقت کی نہیں، محبت کی تھی، قرب کی تھی۔ ایک تعلق کی تھی جو چوتھائی صدی سے زیادہ پر محیط تھا۔ وہ میرے وجود کا ایک حصہ بن گئی تھی، میں اُس کی خاطر کئی بار جان کی بازی لگا چکا تھا۔ جب رفاقتوں میں ایک ہی جیسے خون کا رنگ جھلکنے لگے تو سود و زیاں کا فرق مٹ جاتا ہے۔ ایک پسندیدہ گلاس بھی ہاتھ سے پھسل کر ٹوٹ جائے تو اس کی یاد ذہن میں مدتوں کروٹیں لیتی رہتی ہے۔ انکارانی تو میری رگ رگ میں سما چکی تھی، میری رُوح میں گھل مل گئی تھی۔ میں اُس کی جدائی کا تصور بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

میں اُس سے بار بار اصرار کرتا رہا کہ وہ مجھے اُس پنڈت یا پجاری کا نام بتا دے۔ وہ بہانے تراشتی رہی۔ میں رُوٹھ گیا تو بڑی حسرت سے بولی۔ ”جہیل..... تم مجھ سے ناراض مت ہوا کرو۔ ہنستے بولتے رہا کرو۔ تم اُداس ہوتے ہو، خفا ہو جاتے ہو تو مجھے اپنی زندگی بھی پھینکی پھینکی محسوس ہونے لگتی ہے۔ تم جذبول اور احساس کی بات کرتے ہو، میں ان خوبصورت لفظوں کے معنی نہیں سمجھتی۔ لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اب میرے تمہارے درمیان کوئی اور آیا تو بات میری برداشت سے بھی باہر ہو جائے گی۔ طاقت کا توازن بگڑ جائے تو کبھی کبھی نجیف دشمن بھی اپنے سے جری حریف پر موت بن کر جھپٹ پڑتا ہے۔ اُسے اپنے انجام کی نہیں، اپنی بقا کی فکر جنون کی حدوں سے گزر جانے پر اُکسا دیتی ہے۔ سمجھ رہے ہونا تمہاری انکارانی تم سے کیا درخواست کر رہی ہے.....“

”انکا.....“ میں اُس کے پیار کی تپش، اُس کے خلوص کی گرمی سے کھٹکنے لگا۔ ”اب صرف تم ہی تو رہ گئی ہو جس کی باتیں میرے کانوں میں رس گھولتی ہیں۔ کبھی کبھی حالات لمحے بارود کی طرح چنگاری دکھا دیتے ہیں، میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہوں۔ تمہیں بھی چنے زہریلے جملوں سے دُکھ پہنچانے لگتا ہوں۔ لیکن جو اپنے ہوں، اُنہی پر مان بھی ہوتا ہے، شکوہ شکایت بھی اُنہی سے کی جاتی ہے۔ غیر آنسو پونچھنے کی کوشش کہاں کرتے ہیں؟ بڑی آگ کو اور ہوا دیتے ہیں۔ تم مجھے معاف کر دیا کرو۔ زُرس، مالا رانی، کلدیپ سب ہی ساتھ چھوڑ گئے۔ قسمت کی بد نصیبی دیکھو، میں لندن سے واپسی کے بعد ابھی تک اپنی زمین سے بھی نہیں مل سکا۔ اب اگر تم بھی.....“

”ماپوسی کی باتیں مت کرو جہیل۔“ اُس نے بڑے پیار سے کہا۔ ”ہمت سے کام لو۔ بے مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔“

”نہ ہوں تب بھی پنڈت نول کشور کو زندہ چھوڑ کر ہر دور سے واپس نہیں جاؤں گا۔ برے ذہن میں پھر میرے دشمن زخموں میں پڑے کیڑوں کی طرح بلبلانے لگے۔“

”تم سے جانے کی بات کون کر رہا ہے.....؟“

”چندرا کا کوئی سراغ ملا.....؟“ میں نے دبی زبان میں سوال کیا۔

”نہیں ملا تو اب مل جائے گا.....“ وہ خلاء میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

”میں سمجھا نہیں..... اب کیا فرق پڑ گیا.....؟“

”اب اندھیروں کے چھٹنے کا وقت قریب آ رہا ہے۔“ اُس نے بدستور خلاء میں گھورتے ہوئے یقین سے کہا۔ ”کچھ دن اور انتظار کر لو، چندرا زیادہ دیر تک میری نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا.....“

”ایک بات پوچھوں..... بتاؤ گی؟“ میں نے اُسے رازداری سے مخاطب کیا۔

”کیا جانا چاہتے ہو.....؟“ وہ میری جانب متوجہ ہو گئی۔

”جو تمہیں مجھ سے چھیننے کی کوشش کر رہا ہے اُس کا چاب کب شروع ہوا؟ کتنے دن باقی

رہ گئے ہیں؟“ میں ٹھوس لہجے میں بولا۔ ”ترینی اور دوسرے پنڈتوں نے تمہیں مجھ سے

بار بار چھیننے کی کوشش کی، وہ کامیاب بھی ہو گئے۔ لیکن اُس وقت کی بات اور تھی۔ اب میں

فانی ہاتھ نہیں ہوں، میرے ترکش میں بھی کئی تیر موجود ہیں، تم واقف ہو، میں تمہیں بچانے

میں گونجی..... میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا، سید ایک کرسی پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔ گنجان داڑھی کے اُلجھے ہوئے بالوں میں خوراک کے ذرات اٹکے ہوئے تھے۔ وہ بار بار ”ہو حق..... ہو حق..... حق اللہ“ کے نعرے گارہا تھا۔ میں اُسے عاجزانہ نظروں سے گھورنے لگا۔

”ایسے مت دیکھا کر..... دیدے پھٹ جائیں گے.....“ اُس نے رازداری سے کہا۔  
”وقت گزرتا جا رہا ہے سید۔“ میں نے التجا کی۔

”رستی تھام کر لٹک جا..... ڈگڈگی بجانا شروع کر دے.....“ وہ اپنے انداز میں بولنے لگا، پھر نظریں چمکا کر کہا۔ ”چلی گئی..... پھر بھاگ گئی۔“

”وہ بھاگی نہیں.....“ میں نے سنجیدگی سے اُسے یقین دلایا۔ ”اُس نے تمہارا احترام کیا ہے۔“

جواب میں سید نے ایک غضبناک قہقہہ لگایا۔ پھر سر کھلانے لگا۔  
”وہ میرے ہاتھ آ کر نکل گیا.....“ میں نے کہا۔ ”میں مرجاؤں گا لیکن اُس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔“

”کس کی بات کر رہا ہے مجبوظ الحواس؟..... بے دُم کے بندر؟“ سید کی آنکھیں پٹپٹانے لگیں۔

”وہی جو مندر میں چھپا بیٹھا ہے..... دوسرا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔“ میں نے آواز میں رقت پیدا کی۔ ”تم رہنمائی کر دو..... میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُن دونوں کو ختم کرنے کے بعد خاموشی اختیار کر لوں گا۔ تم جانتے ہو کہ میں نے ایک بار پہلے بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے زبردستی مجھے ٹانگیں پکڑ کر پھر میدان میں کھینچ لیا۔“

”آبادی چھوڑ کر جنگل کی طرف پھوٹ لے۔ کسی اُونچے درخت پر چڑھ کر بیٹھ جا.....“

سید کے لہجے میں درشتی اُتر گئی۔ ”ڈال ڈال پات پات کھیلنا بند کر دے۔“

”تمہاری بہم باتیں مجھے دیوانہ کر دیں گی۔“ میں اُلجھنے لگا۔ ”جو کچھ کہنا ہے صرف ایک بار کھل کر واضح الفاظ میں کہہ دو۔ تمہاری پیچیدہ باتیں میرے سر سے گزر جاتی ہیں۔“

”سر میں کٹھنھی کیا کر.....“ سید دیدے بچانے لگا۔ ”کدو کا تیل چھوڑ لے۔“

”مم..... میں اپنی جان دے دوں گا۔“ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میرا خون تمہارے نام

کی خاطر آخری دم تک اُن کی ٹانگیں پکڑ پکڑ کر منڈل سے باہر کھینچتا رہوں گا۔ آسانی سے شکست تسلیم نہیں کروں گا، انہیں بھی دانتوں پسینہ آ جائے گا۔ مجھ سے ایک وعدہ کرو، تم مجھے اندھیرے میں نہیں رکھو گی۔“

”جمیل..... جمیل..... ایسی باتیں مت کرو۔“ اُس کے جذبات میں بھی طوفان اُمنڈنے لگا۔ میرے بالوں میں لپٹ کر مچلنے لگی۔ کچھ توقف کے بعد اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی نیل کنول آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ میری نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر بیکے

لہجے میں بولی۔ ”کاش میں مکمل عورت ہوتی تو اس وقت تمہیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتی، دل بھر کر تمہیں پیار کرتی، دل کی دھڑکنوں میں چھپا لیتی، تمہیں اپنا سینہ چیر کر دکھاتی کہ اس

میں صرف تم ہی تم ہو، کوئی اور نہیں ہے۔ ایسی ہی پیار بھری میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہا کرو۔

میں نے شروع شروع میں بس یوں ہی تمہارے سر کا انتخاب کیا تھا۔ تم نے رام دیال کی ماں کی بات نہیں مانی، پندتوں نے اُس سے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ تم اگر چاہتے تو ایک

چھوٹے سے جاپ کے ذریعے بھی مجھے حاصل کر سکتے تھے، تم نے انکار کر دیا۔ مجھے تمہاری بات اچھی لگی۔ چھوٹے موٹے پرندے بھی سردی، گرمی اور برسات سے بچنے کی خاطر کوئی

گھونسل بنا لیتے ہیں، میں نے تمہارے خوبصورت بالوں میں بسیرا کر لیا۔ میں تمہیں آزمانا چاہتی تھی۔ تمہیں اپنے دفتر کا وہ مونا کرپین آفیسر یاد ہے جس نے دیر سے دفتر پہنچنے پر دفتر

میں بلا کر تمہاری بے عزتی کی تھی۔ تم نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی تو کسی بد کے ہوئے

سانڈ کی طرح منہ سے جھاگ اڑانے لگا۔ آدھیر سے آریو کرنا..... نوماپھی..... ہم ٹم کو ابھی ڈس مس کرنا..... اپنا لگا رلو اور گٹ آؤٹ ہو جاؤ..... ہم کچھ نہیں سننا مانگتا..... تم خاموش

ہو کر جانے لگے۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ مجھے اُس وقت انسانی خون کی فوری ضرورت تھی۔

بس..... مجھے اُس کا تمہاری بے عزتی کرنا برا لگا تھا..... میں نے تمہارے ہاتھوں اُس کو موت کے گھاٹ اُتروا دیا۔ پھر بات بوہتی چلی گئی۔ اور آج..... یوں لگ رہا ہے کہ اگر تم

میری زندگی میں نہ آتے تو میرا ڈیزہ بالشت کا وجود بھی ادھورا ہی رہ جاتا۔ شاید میں

انکارانی اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی۔ اُس کے شرما تے لجاتے چہرے پر اچانک ایک سائے کیپکپانے لگا۔ وہ سہم کر تیزی سے میرے سر سے اُتر گئی۔ میں مضطرب ہو گیا۔ میں اُس کے اچانک چلے جانے کے بارے میں غور کرنا چاہتا تھا جب ایک مانوس آواز میرے کانوں

یہ زبردستی، پیش سب خالق حقیقی کے تابع تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو نگاہوں سے اوجھل ہونے کی قوت  
تار نہ ہوتا۔ کوئی نہ کوئی راز تھا..... کوئی پردہ تھا جو میرے اور اُس کے درمیان حائل تھا۔  
میں ایک کل جو میرے ہاتھ نہیں آ رہی تھی، وہی ساری مشکلات کی کلید تھی۔ وہ میرے ہاتھ آ  
تو تیسارے پردے سرک جاتے، راستہ صاف نظر آنے لگتا۔ کوئی روک ٹوک باقی نہ رہتی۔  
سید کی آمد سے پیشتر میرے قلب پر جو اضمحلال طاری تھا، جو بے کیفی مسلط تھی وہ کائی  
نہ طرح چھٹ کر صاف ہو گئی۔ اُس کی باتیں میری سمجھ میں نہ آ سکیں، یہ دیگر بات ہے لیکن  
میں کی آمد کا معجزہ تھا جس سے میرے قلب کی کیفیت حیرت انگیز طور پر تبدیل ہو گئی تھی۔  
ہر از بہن اُس کی باتوں کو سلجھانے میں مصروف تھا۔ صرف ایک اشارہ کچھ کچھ واضح ہو رہا  
تھا۔ سید نے کہا تھا کہ ”بیل کے دہانے پر کھانڈ بُرک دے، چوٹے بولکھا کر باہر نکل آئیں  
میں.....“ میرے دماغ میں پنڈت نول کشور کا تصور رہ رہ کر ابھڑ رہا تھا۔ وہ میری نفرت کا  
باب بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس جملے سے نول کشور کی ذات کا  
بھی کوئی نہ کوئی دخل ضرور ہوگا..... ”کھانڈ بُرک دے“ کا مطلب واضح ہو جاتا تو تمام مشکل  
آسان ہو جاتی۔ سید کا اشارہ یقیناً کسی ایسی شے کی طرف تھا جسے دیکھ کر یا محسوس کر کے  
پنڈت نول کشور کی کھوپڑی پلٹ جاتی۔ وہ بلبلہ کر منڈل اور مندر سے نکل کر باہر آ جاتا۔  
میں اُس کا قصہ تمام کر دیتا۔ پھر خوشی سے ”تالی بجانا اور تھرکانا شروع کر دیتا۔“

[illegible]

لکھا جائے گا۔“  
سید اچھل کر کرسی سے اُٹھ گیا۔ دیوانوں کی طرح مجھے پھٹی پھٹی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔

”ہیل کے دہانے پر کھانڈ بڑک دے..... چپو نے بوکھلا کر باہر نکل آئیں گے..... پھر.....  
پھر تو تالی بجانا..... تھر کن شروع کر دینا“

”تمہیں خدا کا واسطہ سیّد.....“ میں نے ہاتھ جوڑ لئے۔ ”صرف ایک بار میری کائنی  
تھام کر سیدھا راستہ دکھا دو..... میں دوبارہ پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھوں گا..... میری بات کا  
یقین کرو۔“

”گھنگھور گھٹائیں..... کالی بدریا..... رم جھم.....“ سید اپنے آپ سے ہم کلام نظر آ رہا تھا۔ پھر یکنخت وہ ٹھکے لگانے لگا۔ ”آ رہا ہے..... آ رہا ہے..... نشہ چھا رہا ہے.....“

میں تیزی سے لپکا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ سید سے لپٹ جاؤں گا، اُس کے پیر پکڑ لوں گا۔ شاید اُس کو مجھ پر رحم آ جائے۔ مجھے یقین تھا کہ جس دن وہ مجھ پر مہربان ہو گیا، میرے سارے دلدردور ہو جائیں گے۔ ساری مشکلات دُور ہو جائیں گی۔ وہ مجذوب تھا، خدا نے اُس کو اپنی نگاہِ کرم سے نواز دیا تھا۔ اُس کا ایک بار ہاتھ آ جانا شرط تھا، پھر میں اُسے آسانی سے نہ چھوڑتا۔ یا وہ میری درخواست قبول کر لیتا یا میں اُس کے قدموں میں سر ٹکرا ٹکرا کر جان دے دیتا۔

سید میرا ارادہ بھانپ گیا..... قبل اس کے کہ میں قریب جاتا، وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں تڑپا رہ گیا۔ وہ بھراپنی بولی بول کر چلا گیا۔ میں ڈور کا سرا تلاش کرنے میں الجھنے لگا۔ اُس کے اشارے میری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ وہ حکم خداوندی کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کے پردے چاک کرنے کی جسارت اُس میں بھی نہیں تھی۔ وہ بار بار میرے سامنے آ جاتا تھا، پھر پلک جھپکتے میں نظروں سے غائب ہو جاتا تھا۔ اُس کی آمد و رفت بلا سبب نہیں تھی۔ اُسے مجھ سے لگاؤ نہ ہوتا تو وہ یونہی اپنا وقت کبھی برباد نہ کرتا۔ اُس نے محض تفریحاً اپنی لاشی میرے حوالے نہیں کی تھی، وہ مجھے سہارا دینا چاہتا تھا۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا اس میں مشیت ایزدی کو بھی دخل تھا۔ اُس کے شب و روز کی ایک ایک مصروفیت، اُس کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، اُس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ، ایک ایک



کبھی وہ میری توجہ بٹانے کی خاطر، مجھے ذہنی طور پر کمزور کرنے کے لئے ترمین کو اغواء لیتے، کبھی چچا جان کی لڑکی کو اٹھا کر لے جاتے۔ میں دیوانہ ہو جاتا۔ وہ دُور بیٹھے قہقہے لے رہے.....!!

اس وقت بھی مجھے انکارانی کی نظروں سے اُبلتے آنسوؤں میں اپنے کسی عزیز کی لاش نظر آرہی تھی۔ میرا ذہن ترمین کی طرف گیا، میں لرزے لگا۔ ساری جان سے کانپ لگا۔ انگوٹھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا..... وہ دوبار ترمین کو ہدف بنا چکے تھے، میں ان کے بل پر اپنی جیتی جاگتی گڑیا کو واپس لے آیا، وہ منہ دیکھتے رہ گئے۔ اس بار شاید ان نے ترمین کو..... میں اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ میرے وجود کے اندر طوفان لگے۔ میں نے دل ہی دل میں دشمنوں کو لالکارا۔

”خرا مزادو..... کینو..... سور کے بچو..... خبردار، کوئی ایسا قدم مت اٹھانا جو میرے ماضی بظنوں کو دوبارہ تازہ کر دے۔ جو کھر بٹ جی ہے، اس میں برسوں لگے ہیں۔ تم نے اسے مارنے کی کوشش کی تو پھر کچھ باقی نہیں بچے گا۔ شاید میں بھی اپنے جنون، اپنی وحشوں، دیوانگی، اپنے پاگل پن کا شکار ہو جاؤں۔ لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو، جہاں بے سچے ہوں، ارادوں میں کوئی کھوٹ نہ ہو، وہاں قسمت بھی ساتھ دیتی ہے، خدا کی قسم بھی شامل ہو جاتی ہے..... میری آواز غور سے سنو، اب کوئی حماقت نہ کرنا..... جھگڑا تمہارا ہے۔ میرے اور اپنے درمیان کسی اور کوشاں کرنے کی غلطی مت کر بیٹھنا۔ میری بات سنو، میرے کسی اور عزیز دار نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ تم نے مجھے اپنے جال میں پھانس لیا۔ میں تمہارا، تمہاری تعداد ان گنت تھی۔ تمہیں دُرگا، کالی اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کی توری بھی حاصل تھی۔ لیکن تم مجھ سے خوفزدہ بھی تھے۔ تمہیں ڈر نہ لاحق ہوتا تو مجھے ہاتھ میں باندھ کر کبھی نہ رکھتے۔ ایک ایک کر کے مقابلے پر آتے تو میں بتاتا کہ جمیل خاں سے ٹکرا کر تم نے اپنی موت کو لالکا رہے۔ تم بزدل تھے، بزدل ہو۔ مرد ہوتے تو ان کی طرح مقابلہ کرتے۔ میں نے پھر بھی کوئی شکوہ، کوئی شکایت نہیں کی۔ نتیجہ کیا نکلا؟

پنے دیکھتے گئے، میں پھر تمہاری نظروں میں دھول جھونک کر باہر آ گیا۔ ہر دور میں ان کی آبادی زیادہ ہے، کئی چھوٹے چھوٹے مندر اور بھی ہوں گے۔ میں چاہتا تو تمہاری لاشیں میں آگ لگا دیتا، انہیں جلا کر راکھ کر دیتا۔ اُن میں کچھ تمہارے اپنے بھی ضرور

”کھانڈ بُر کئے“ کا وہ پہلا اشارہ تھا جس کا مفہوم تلاش کرتے ہوئے میرے دل کی غیر کیفیت ہوئی تھی۔ وہ کیفیت سکون قلب کی تھی۔ میرے ذہن اور دل کی دھڑکنوں میں ایک ہم آہنگی تھی جو اس بات کی تائید کر رہی تھی کہ سید مجذوب کا وہ اشارہ میرے دشمن پنڈت نول کشور ہی کی جانب تھا..... بات صرف ”کھانڈ“ کے اشارے کے حل کی تلاش میں آ کر ایک گئی۔ میں اسی سلسلے میں دل و دماغ کی انتہائی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوششوں میں مصروف تھا جب انکارانی میرے سر پر واپس آ گئی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

اُس کا چہرہ بڑا سوگوار نظر آ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھیگی بھیگی، سرخ سرخ نظر آرہی تھیں۔ وہ سرخی کسی گہرے زخم کی پیداوار لگ رہی تھی۔ سید کے جانے کے بعد انکا واپسی میں دیر کر دی تھی۔ وہ کہاں گئی تھی؟ اُس نے کیا دیکھ لیا تھا؟ کیا خبر سن لی تھی جس نے اُس کے چہرے کو اس قدر اُداس کر دیا تھا؟ وہ مجھ سے نگاہیں ملاتے ہوئے بھی کتر رہی تھی..... ان آنسوؤں کو بھی چھپانے کی کوشش کر رہی تھی جو اُس کی پلکوں کی اوٹ سے طوفان کی طرح اُبل پڑنے کو ٹھانٹیں مار رہے تھے۔ کیوں؟ آخر کیوں.....؟

وہ یقیناً کوئی اہم بات تھی جس نے انکارانی کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا..... ”کیا بات ہے.....؟ تم اتنی اجڑی اجڑی، اتنی اُداس اور غمگین کیوں نظر آرہی ہو؟ کیا خبر سن لی؟ کون مر گیا.....؟“

”جمیل.....“ اُس کی آواز بھرا کر رہ گئی۔ آنسوؤں کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ سسکیاں بھرے لگی۔

میرے دل میں وسوسے سر اُبھارنے لگے۔ میں انکارانی کی کیفیت اور اپنے دل کی دھڑکنوں میں کوئی ربط تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اتنی سوگوار زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میرے اندر طوفان سر اُبھارنے لگا۔ میرا ماضی میری نگاہوں کے سامنے نمودار ہوا۔ میرے دشمنوں نے میرے ساتھ ہمیشہ کم ظفری کا ثبوت دیا تھا، وہ مجھ سے اپنی ہمت کا بدلہ میرے خونی رشتوں سے لیا کرتے تھے۔ مجھے ایک محاذ پر مصروف کر کے ”دشمن“ کی طرف میری دنیا اُجاڑ دیتے تھے۔ انہوں نے نرگس کو مار دیا تھا، انکا نے مجھے بعد میں دی۔ مالارانی بھی ہاتھ سے نکل گئی، میری طاقت اور انکا کی لازوال قوتیں کسی کام

”کیا ہوا جھرتا کو.....؟“ میں نے تزئین کی جانب سے سکون کا سانس لے کر دریافت کیا۔ انسان بھی بڑا خود غرض ہوتا ہے۔ ایک لمحہ پہلے میں تزئین کے خیال سے پاگل ہو رہا تھا۔ جھرتا کا نام سن کر میری دیوانگی ختم ہونے لگی۔ بات اپنوں کی نہیں، پرایوں کی تھی۔

”انہیں جھرتا کی تلاش تھی جمیل.....“ انکا نے بسورتے ہوئے جواب دیا۔ ”پنڈت نول کشور نے اُسے ہر قیت پر تلاش کرنے کا حکم نامہ جاری کیا تھا۔ مجھے دیر سے خبر ہوئی۔ میں ادھر تمہارے ساتھ باتوں میں لگی تھی، ادھر وہ اپنا کام کر گئے۔“

”جو ہوتا تھا، ہو گیا انکارانی.....“ میں نے اُسے تسلی دی۔ ”پریشان مت ہو۔“ میں نے اُسے بہلانے کی خاطر کہا۔ ”میں تمہارے لئے کوئی دوسری جھرتا لا دوں گا۔ بالکل ویسی ہی، بلکہ اس سے بھی اچھی.....“

”وہ کتنی معصوم تھی جمیل..... کتنی بھولی بھالی صورت تھی اُس کی۔“ وہ سر آدھ بھر کر بولی۔ ”کیا بگاڑا تھا اُس غریب نے کسی کا.....؟“

”مجھے تعجب ہو رہا ہے.....“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”تمہیں اُس سے اتنی جلدی اس قدر محبت ہو گئی؟“

انکارانی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر ہونٹ چباتی رہی، پھر موضوع بدل کر دریافت کیا۔

”وہ مرد قلندر آیا تھا..... اس بار کیا کہہ گیا.....؟“

”اُس کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں.....“ میں نے مختصر تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”ایک اشارہ ابھی تک مجھے پریشان کر رہا ہے۔“

”کیا.....؟“

”اُس نے کہا تھا کہ کھانڈ بُرک دو، چپوٹے بوکھلا کر باہر نکل آئیں گے۔“

”وہ..... وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔“ انکا کی نگاہیں کسی خیال سے چپکنے لگیں۔

”تم کسی نتیجے پر پہنچ گئیں.....؟“ میں نے اُسے وضاحت طلب نظروں سے گھورا۔

”میرا انتظار کرنا جمیل، میں ابھی واپس آتی ہوں۔“

وہ بڑی سرعت سے میرے سر سے اتر گئی۔ میں اُس کے جانے کی وجہ بھی دریافت نہ کر سکا۔ میرے اضطراب میں پھر اضافہ ہونے لگا۔ انکارانی نے سیّد مجذوب کا اشارہ سننے کے

ہوتے۔ میں تمہارے دوسرے مندروں کو ہمسار کر کے انتقام کی آگ سرد کرنے کی کوشش کرتا تو شاید تمہارے اپنے ساتھی ہی تمہیں گردن سے پکڑ کر میرے سامنے لے آتے۔ بہت کچھ ممکن تھا، بہت کچھ ہو سکتا تھا، اب بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن میں نے اپنی طرف سے کسی مٹی کی حرکت کا مظاہرہ نہیں کیا..... تم کو بھی خبر دار کر رہا ہوں کہ ایسی کوئی غلطی نہ کر بیٹھنا کہ پھر مجھے سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ کالی داس، اوم پرکاش کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ اُن پنڈت پجاریوں کی طویل فہرست پر ایک نظر ڈال کر دیکھو جو میرے عتاب، میرے غضب کا شکار ہو چکے ہیں۔ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو، کیا بدری نرائن کے انتقام کی آگ تمہارے دل میں نہیں سلگ رہی؟ چندرا سے پوچھو، جو ابھی تک امر لال کے غم میں تڑپ رہا ہے..... اگر تم نے میری تزئین کو کوئی نقصان پہنچایا تو میں ہندوستان کے سارے پنڈت پجاریوں کو چین چین کر ماروں گا۔ کوئی نہیں بخشا جائے گا..... سب کے ٹینٹوں دبا کر جہنم رسید کر دوں گا۔“

میں وحشتوں میں ڈوب دلی ہی دل میں ہڈیاں بکتا رہا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ انکارانی نے صرف جمیل کہہ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی.....؟ کہتے کہتے رک کیوں گئی.....؟

”انکارانی.....“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ”جوابات بھی ہو، مجھے کھل کر بتاؤ۔“

”جس مت پیدا کرو۔ میں بری بھلی سب کچھ سننے کو تیار ہوں۔ اوکھلی میں سر دینے والے موصولوں سے نہیں ڈرا کرتے۔ جب آگ بھڑکتی ہے تو اپنوں اور پرایوں کی تمیز نہیں کرتی۔ مجھے بتاؤ، کون زخمی ہوا؟ کون جل کر راکھ ہو گیا؟ میری قوت برداشت کا امتحان مت لو۔“

”جو بھی ہے جلدی کہہ ڈالو.....“

”جمیل.....“ اُس نے کچھ توقف سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے جواب دیا۔

”جب کسی سے محبت ہو جائے تو اُس کے پھڑنے پر دل کو ٹھیس بھی ضرور لگتی ہے، آنسوؤں پر اختیار نہیں چلتا، دل پھٹ جاتا ہے۔“

”تم..... تم پھر پھیلاں بجھو رہی ہو۔“ میں نے مضطرب آواز میں سوال کیا۔ ”کون بچ گیا؟ تم کس کا سوگ منا رہی ہو.....؟“

”وہ..... وہ جھرتا.....“ اُس کی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔

بعد اُس کی بات کی تصدیق کی تھی۔ شاید وہ اس اشارے کا مفہوم سمجھ گئی تھی، لیکن مجھے سے کچھ کہے بغیر وہ جلت میں کہاں چلی گئی تھی؟

میں اُس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ اُس کے دل میں جھرتا کی محبت اچانک دیوانگی کی حد تک کس طرح پیدا ہو گئی؟ وہ اس طرح رو رہی تھی جیسے اُس کا اپنا کوئی عزیز مر گیا ہو، جیسے وہ جھرتا کو پہلے سے جانتی ہو، کوئی قریبی رشتہ رہا ہو۔ کوئی ایسا رشتہ جو اُس نے مجھے بتانا مناسب نہ سمجھا ہو..... کوئی اور بات بھی ممکن ہو سکتی تھی۔ جھرتا کسں تھی، خوبصورت تھی، نوجوان تھی، ہر نی کی طرح اُچھلتی کودتی تھی، ممکن ہے انکارانی کو اُس کی وہی ادا بھاگنی ہو..... ایک اور قیاس میرے ذہن میں کلبلانے لگا، جھرتا کے گورے بدن سے خون چھلکتا تھا، اُس کے گدرائے ہوئے گال قدھاری انار کی طرح سرخ سرخ نظر آتے تھے۔ شاید انکارانی کو اُس کا گاڑھا گاڑھا خون پسند آ گیا ہو؟ کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی جو اُس نے جھرتا کو توجہ کے قابل سمجھا تھا، اُسے اپنے ساتھ آئند بھون لے آئی تھی۔ میرے استفسار پر اُسے اتنا تھ آشرم چھوڑ آئی۔ لیکن اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ جب میں سارے جھمیلوں سے فارغ ہو جاؤں گا تو جھرتا دوبارہ میرے پاس واپس آ جائے گی۔

میں اپنے خیالات میں مستغرق تھا کہ بھنڈاری دروازے پر دستک دینے کے بعد اندر داخل ہوا۔ وہ کچھ الجھا الجھا نظر آ رہا تھا۔ میں اُس کے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھنے لگا۔ اُس کی نگاہیں کچھ بدلی بدلی نظر آ رہی تھیں۔

”مہاراج.....“ گفتگو کی ابتدا اُس نے دبی زبان میں کی۔ ”تم کالی کے مندر گئے تھے۔ کر آئے پوجا.....؟“

میں بھنڈاری کی بات سن کر چونکا۔ اُس نے مندر اور پوجا کا ذکر بلاوجہ نہیں چھیڑا ہوگا۔ میں نے سوچا..... وہ مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتا تھا؟..... کیا اُسے مندر میں ہونے والے ہنگامے کی اطلاع مل گئی تھی؟ کسی نے میری اصلیت کی خبری کر دی تھی؟..... میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کوئی نہ کوئی فتنہ پھر سر اٹھانے والا تھا۔ بھنڈاری جو آئند بھون میں میرے قیام کے دوران میرے آگے پیچھے بچھا جا رہا تھا، اب کچھ بدلا بدل نظر آ رہا تھا۔

”جو مندر میں جاتے ہیں وہ صرف پوجا کے ارادے سے نہیں جاتے، اور بھی بہت سارے کارن ہوتے ہیں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”تمہارے وہاں جانے کا کیا کارن تھا.....؟“

”تو کیوں معلوم کر رہا ہے.....؟“ میں جھلا گیا۔ میری پیشانی پر آڑی ترچھی سلوٹیں

بھرنے لگیں۔ ”تیرے پیٹ میں کیوں مروڑ ہو رہا ہے؟“

”کالی کا ایک پجاری ابھی ادھر آیا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ مندر میں کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔“

بھنڈاری میرے تیور دیکھ کر کچھ نرم پڑا۔

”کیا کہہ رہا تھا.....؟“ میں نے بدستور درشت لہجے میں دریافت کیا۔

”وہ کہہ رہا تھا مندر کا بڑا پروہت بڑے غصے میں ہے، کوئی مُسلا وہاں بھیس بدل کر پہنچ گیا تھا۔ پجاریوں کو اُس پر شبہ ہوا تو اُسے پکڑ لیا گیا۔ پنڈت نول کشور مہاراج نے اُس کے ہاتھ پیر باندھ کر تہہ خانے میں ڈلوادیا تھا۔ مہاراج نے مندر کے دوسرے کرتاؤں دھرتاؤں سے ان کی رائے پوچھی تو سب کا ایک ہی خیال تھا، اس مُسلے کو پورن ماشی کی رات دیوی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ پرنتو وہ مُسلا رسی تڑا کر بھاگ نکلا۔ پجاریوں نے ایک ایک کو تاجھان مارا لیکن اُس کا کوئی کھوج نہیں ملا..... کالی کو خوش کرنے کی خاطر بڑے پروہت کو اپنی خاص پجاری کی بھینٹ دینی پڑی۔ مہاراج کے خاص کھوجی ہردوار میں چاروں طرف پھیل گئے ہیں۔ گھر گھر کی تلاشی ہو رہی ہے۔“

میں نے ارتکاز اور مراقبے کا مختصر عمل کر کے آنکھیں موند لیں۔ اندھیرے چھٹنے شروع ہوئے تو میں نے مختلف سمتوں میں نظریں دوڑائیں۔ باہر کاؤنٹر کے قریب ایک ہٹا کٹا پجاری کھڑا تھا۔ اُس کی نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ شاید وہ نول کشور ہی کا کھوجی تھا جو آئند بھون میں ٹھہرے ہوئے مسافروں کے سلسلے میں معلوم کرنے آیا تھا۔ میں نے اُس کی طرف سے توجہ ہٹا کر بھنڈاری کے دل میں جھانکا، وہ بھی اندر سے بے چین نظر آ رہا تھا۔ مجھے اُس کی بے چینی کا اندازہ بھی اُس کی سوچوں کے ذریعے ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر بھنڈاری کو تیز نظروں سے گھورا۔ میری بدلی ہوئی نظریں دیکھ کر وہ کسمسانے لگا۔

”مورکھ..... آنکھ کے اندھے، تو میرے مندر جانے کا کارن پوچھ رہا تھا.....؟“

”نہیں مہاراج..... نہیں۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا جو تم سمجھ رہے ہو۔“ بھنڈاری شپٹا گیا۔

”میرا نام جاننا چاہتا ہے.....؟“ میں نے سید کی لاکھی اٹھائی تو اُس کے چہرے کا رنگ

نہ ہونے لگا۔

”اُس سندری کو بھی نو دو گیارہ کر دے۔“ میں نے اُسے دہلانے کی خاطر سنجیدگی سے کہا۔ ”تیری گھروالی کو بھٹک مل گئی تو تیرے بارہ پنجے میں بھی دیر نہیں لگے گی۔“

بھنڈاری سر پر پاؤں رکھ کر نکل بھاگا۔ میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ مجھے یقین تھا کہ اسی سرزنش ہو جانے کے بعد اب وہ کسی کو میرے کمرے کے آس پاس پھٹکنے کی اجازت بھی نہیں دے گا۔ خود بھی میرے پاس آنے سے گریز کرے گا۔ میں نے اُس کی عیاشی کا ہانڈا جو پھوڑ دیا تھا.....!

وقت زیادہ گزر گیا تو میری اُلجھن انکارانی کے سلسلے میں بڑھنے لگی۔ اُس نے سید کے اشارے کو سمجھ لیا تھا، پھر انتظار کرنے کا کہہ کر چلی گئی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ میں اُس کا انتظار کروں، وہ جلدی واپس آئے گی۔ لیکن دو گھنٹے گزر چکے تھے، وہ واپس نہیں آئی۔ میں اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وحشت بڑھنے لگی تو میں کمرے سے نکل کر باہر آ گیا۔ سید بزدوب کی لاشی میرے ساتھ ساتھ تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک کیڑا کلبلایا..... بھنڈاری نے کہا تھا کہ نول کشور کے کھوجی ہردوار کے کوئے کھدروں میں میری تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں ابھی تک اُن کے ذہنوں میں پچھو بن کر ڈیک مار رہا تھا۔ میں اُن کے اس جال کو توڑ کر نکل بھاگا تھا جسے انہوں نے بڑی مضبوطی سے تیار کیا تھا۔ تہہ خانے کا ٹوٹا ہوا دروازہ انہیں نظر آیا ہوگا تو اُن چار پجاریوں کی بھی شامت آگئی ہوگی جو کالی کے چرنوں کے چڑھاؤں کا مال کھا کھا کر ساڈ بنے پھر رہے تھے، انہیں میری نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ ”میں اُن کی نظروں کے سامنے سے کس طرح نکل گیا؟..... اس خیال نے مندر کے بڑوں کی کھوپڑیوں میں شکوک و شبہات پیدا کئے ہوں گے۔ جتنا کے بعد انہیں بھی شاید کالی کے چرنوں میں بھیٹ چڑھانے کی تیاری ہو رہی ہوگی، وہ سب حلق پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے ہوں گے، اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی خاطر بڑی بڑی قسمیں کھا رہے ہوں گے، تڑپ رہے ہوں گے، بلبار رہے ہوں گے۔ جتنا بھی اسی طرح تڑپتی تھی، مچلی تھی، کچھ کہہ نہیں سکتی تھی، ظالموں نے اُس کی زبان کاٹ دی تھی۔ اُس کی زبان سلامت ہوتی تو اُن دھرماتماؤں کے نام بھی اُس کی زبان پر ضرور آجاتے جنہوں نے اُسے مال غنیمت سمجھ کر پامال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا چھوڑی تھی۔ نول کشور کے مستفید ہو جانے کے بعد اُس کے حاشیہ برداروں نے بھی

”بات تمہاری نہیں ہے مہاراج۔“ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”میں تم سے کیول یہ بھتی کرنے آیا تھا کہ تم بڑے پروہت کی سہائتا کر دو۔ اُس مُسلے کا کھوج لگا دو جس نے کالی کے مندر کی پوترتا کو اپنے پلید چرنوں سے گندا کرنے کی کوشش کی ہے۔“

”وہ بھی یہی بھتی کرنے آیا ہے یا اُس کے من میں کچھ اور کلبل رہا ہے.....؟“ میں نے سرسراتی آواز میں سوال کیا۔

”تم..... تم کس کی بات کر رہے ہو.....؟“

”وہی..... گھٹے ہوئے سروالامسٹنڈا پجاری جو باہر کھڑا تیری راہ دیکھ رہا ہے۔“

”مہاراج..... تم..... تمہاری ٹھکتی اپرم پار.....“ وہ بڑی عقیدت سے میرے پاؤں چھونے کے ارادے سے آگے بڑھا۔ میں نے پیر ایک طرف کر کے اُسے تحارت سے دھکا مارا۔

”دُور ہٹ پلٹ..... مجھے تیرے شریر سے بھی کسی بستوئی (چھپکلی) کی سزا انداز رہی ہے۔“

”تمہیں کیا ہو رہا ہے مہاراج.....؟“ اُس نے وضاحت کرنی چاہی، میں نے گھڑک کر کہا۔

”جب کوئی سندری اپنے اُبلے شریر کا مول بھاؤ کرنا شروع کر دے تو اُس کے تن سے بستوئی ہی کی باس آتی ہے..... میں اُس کی بات کر رہا ہوں جو تیرے کمرے میں چادر میں بدن چھپائے تیری راہ تک رہی ہے..... اور کچھ سنے گا.....؟“

بھنڈاری نے ہی ہی کر کے ہتھی نکالی، جانے کے ارادے سے پلٹا تو میں نے گرج کر کہا۔

”چلا کدھر پاپی..... اُس مسٹنڈے کو بھی بلا لے جو کھوجی بن کر گندی موریوں میں جھانکتا پھر رہا ہے۔ میں اُس حرامی کی دبدبہ بھی دُور کر دوں گا۔“

”مجھے شاکر دو مہاراج۔“ بھنڈاری میرے رعب میں آکر کپکپانے لگا۔ ”وہ جو باہر کھا رہا ہے، میری بات کا وشواس کر لے گا۔ تم آرام کرو۔“

”جاتے جاتے ایک بات اور سن لے.....“ میں نے لوہا گرم دیکھ کر ایک کاری ضرب اور لگائی۔ ”چنڈت نول کشور سے کھلوادے کہ چندرا کو ادھر ہی بلوالے۔ چندرا آ گیا تو وہ مُسلا بھی سامنے آجائے گا..... سنا تو نے، میں کیا کام کی بات بتا رہا ہوں؟“

”میں تمہارا سندلیس بڑے پروہت تک اوش پہنچاؤں گا۔“

جمنہ کی جوانی سے اپنا اپنا لگان وصول کیا ہوگا، جمنہ کی زبان کھل جاتی تو وہ سب نچے ہو جاتے۔ اندر کی بات باہر آ جاتی۔ جبرنا کو بھی خبر مل جاتی کہ مندر کی مقدس گھنٹیوں کی جھنکاروں میں کیا گل کھلائے جاتے ہیں۔ دیوداسیوں کو شادیاں کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، وہ صرف کالی کی خدمت کے لئے وقف کر دی جاتی ہیں، انہیں بڑا قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔ اُن کا یہ بھرم بھی کسی پروہت یا بڑے پنڈت کے ہاتھوں چکنا چور ہو جاتا ہے۔ عقاب کے خوخوار بچوں میں پھنسا ہوا شکار صرف پھڑ پھڑا سکتا ہے، پھر اُس کی توت مدافعت جواب دے جاتی ہے۔ کالی بھی کیا کر سکتی ہے؟ اُس کے شہنام کی آڑ میں جو کھیل تماشا ہوتے ہیں، ان کی گونج دُور دُور تک سنائی دیتی ہے۔ وہ خود نہیں سن سکتی..... جو سننے ہیں وہ بھی دم سادھ کے بیٹھ جاتے ہیں۔

جمنہ کی آواز حلق سے نکل کر چاروں طرف گونجتی تو جبرنا بھی دم سادھنے کے سوا اور کیا کرتی؟ اُس کی کمسنی یکخت سن بلوغت کا راز پالیتی۔ وہ سہی سہی رہنے لگتی۔ پنڈت پجاریوں سے بچ بچ کر چلتی، بار بار راستہ کترانے کی کوشش کرتی۔ لیکن ایک دن وہ بھی کسی نہ کسی موڑ پر دیوبلی جاتی..... پھر وہ وی راستے باقی رہ جاتے۔ یا وہ اسی رنگ میں رنگ جاتی یا کالی کے قد آور بت سے سر ٹکرا کر مر جاتی..... اچھا ہوا جو وہ درندگی کا شکار ہونے سے پہلے مر گئی۔ انکا بلا وجہ اُس کا سوگ منار ہی تھی۔

جمنہ کی تصویریں اُتر و اُتر بڑے فخر کی بات سمجھتے ہیں، اس طرح سینہ تانے نظر آتے ہیں ہے شیران کی بندہ ق کی گولی سے نہیں، ان کے رعب و دبدبے سے دہشت کھا کر جان سے نر گیا ہو..... مردانگی تو تب ہے کہ شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے لکارا جائے، ہراس پر گولی داغی جائے۔ پنڈت نول کشور کا واسطہ ابھی تک کسی شیر سے نہیں پڑا تھا۔ وہ بونہریوں اور مرغابیوں کو نشانہ بنانے کا عادی تھا۔ شیر کو سامنے دیکھ لیتا تو دم بخود رہ جاتا۔ اُس کے دیدے پھٹ جاتے، سانپ سوگھ جاتا، کھڑے کھڑے دھوتی میں چھلھلائے لگتا۔

میں کچھ سوچ کر عقبی راستے سے گزر کر آئند بھون سے باہر آ گیا۔ میں نے اپنے ارد گرد ایک مضبوط حصار قائم کر کے قدم آگے بڑھانے شروع کر دیئے۔ شکاریوں کی تعداد زیادہ ہو تو شیر بھی ملی بن کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ نول کشور مجھے گیدڑ کی طرح کراپنی کچھار سے نکل کر باہر آ جائے۔ میں اُس کے خون کے چھینٹوں سے اپنے انتقام کی آگ بجھا کر ”تالی بجاؤں، تھرکنا شروع کر دوں“..... غالباً سید مجذوب کے مبہم اشارے کا مطلب بھی یہی تھا۔

میں سینہ تانے قدم بڑھاتا رہا۔ میرا رخ کالی کے مندر کی جانب تھا..... ذہن انکارانی کے بارے میں اُلجھ رہا تھا جو ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ آئند بھون، آبادی سے ہٹ کر واقع تھا۔ میں اطراف میں نظر دوڑاتا اپنی منزل کی سمت گامزن تھا۔ میرے ذہن میں شیوا کا تصور بھی ابھر رہا تھا۔ اُس غریب کو بلا وجہ میرے نام پر سزا دی گئی تھی۔ جمنہ سے ملاقات کے دوران میں نے سوچا تھا کہ کالی کے مندر کے تہہ خانوں میں بنی کال کوٹھڑیوں میں اُسے بھی ضرور تلاش کروں گا۔ وہ بہادر تھا، موت سے نہیں ڈرتا تھا، اپنے ساتھیوں سے بھی مخلص تھا۔ غدار ہوتا تو میرا ہاتھ تھام کر اُن کے بارے میں سب کچھ بتا دیتا۔ چندرا کی گمشدگی کا راز بھی اُنکے دیتا، میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا منظور نہ ہوتا تو زندگی بچ جانے کے بعد کسی اور سمت نکل جاتا۔ کالی کے مندر میں واپسی کی حماقت کبھی نہ کرتا..... نول کشور اور اُس کے گروگوں نے باریکیوں میں جانے کی زحمت نہیں کی ہوگی، جلد بازی میں ایک فیصلہ کر بیٹھے۔ میں اُن کی غلطی سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ شیوا کی رہائی میرے ہاتھوں عمل میں آتی تو وہ میرا ہمنوا بن جاتا۔

مجھے شیوا کے حوالے سے آئند لال یاد آ گیا۔ وہ بھی بڑا معاملہ فہم، بڑا اندر اور ”دلیر



بھگت“ تھا۔ اُس وقت جب میں عدالت کے روبرو کھڑا کسی فیصلے کا منتظر تھا، بڑے بڑے پجاریوں نے کٹہرے میں آ کر میرے خلاف گواہیاں دی تھیں، مجھ پر سنگین الزامات کی فہرست بڑی طویل تھی، بدری نرائن کے سوا اُس کے تمام چیلے عدالت میں موجود تھے، وہ بد بخت تربیتی داس بھی اٹھ کھڑا ہوا جسے میں بڑی اذیت ناک سزائیں دے چکا تھا۔ سب بدری نرائن کے اشارے پر مرد بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھ پر مالا گواغوا کرنے اور قتل کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔ نرسنگ کی موت کا بھی ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ میں بل کھا کر رہ گیا۔ انکا بھی تملانا اٹھی تھی، میں ایک اشارہ کرتا وہ سب کو گتلی کا ناچ بچانا شروع کر دیتی، انصاف کی کرسی پر بیٹھا ہوا جج بھی رنگا ہو کر ناچنے لگتا۔ لیکن میں نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی..... جب سارے بیانات ختم ہو گئے تو جج نے میری طرف سخت نظروں سے گھورا۔ میرے دشمنوں نے میرے خلاف زہر اگلنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا۔ جج میرے خلاف فیصلے دینے کے لئے اپنے ذہن کو پوری طرح آمادہ کر چکا تھا۔ خود میری طویل خاموشی بھی عدالت کے لئے ایک ثبوت بن گئی تھی۔ سرکاری وکیل بھی اپنی کامیابی کے سلسلے میں بڑا ہر امید نظر آ رہا تھا جب آندلال نے اُس کی وساطت سے خود کو کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔ پنڈت پجاری اُسے بہت مانتے تھے، خود انکا رانی نے بھی مجھ سے کہا تھا کہ وہ کئی شاستروں کا ماہر اور ہندو دھرم کے بڑے عالموں میں شمار کیا جاتا تھا۔ وہ کٹہرے میں آ کر کھڑا ہوا تو میرے دشمنوں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ آندلال کو میرے تابوت کی آخری کیل سمجھ رہے تھے۔ اُس نے بولنا شروع کیا تو سب خاموش ہو گئے۔ سب کی نظریں اُس پر جمی تھیں، وہ جج سے کہہ رہا تھا..... ”میرا نام آندلال ہے۔ میں دھرم کا سیوک ہوں۔ میں نے دیوی دیوتاؤں کی بڑی کٹھن تپسیا کے بعد وہ مقام حاصل کیا ہے جو بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔ میں نے سارا جیون شاستروں کے پتوں کے بیچ گزارا ہے، ویدوں میں جان کھپائی ہے۔ دیوی دیوتاؤں نے میرا مان بڑھایا ہے، میں ان ہی کی سوغت کھا کر کہتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا، سچ کہوں گا۔ سچ کے سوا اور کچھ نہیں کہوں گا۔“ پھر اُس نے عدالت سے ہاتھ باندھ کر درخواست کی کہ مجھے باعزت طور پر رہا کر دیا جائے۔ مجھے نزدوش اور بے قصور قرار دیا جائے تو عدالت میں کھلبلی مچ گئی۔ پنڈت پجاریوں کے چہرے لٹک گئے۔ وکیل سرکار کی آنکھیں بھی حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جیوری کے ممبران بھی اپنی اپنی نشستوں پر

پلوہ لئے لگے۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ آندلال میری حمایت بھی کر سکتا تھا.....!! آندلال نے بھری عدالت میں اپنی مہبان شکتی کے کرشمے پیش کئے تو پنڈت پجاریوں کی زبانیں اُس کے خلاف بھی زہر اگلنے لگی تھیں۔ شیوا کی طرح آندلال پر بھی شبہ کیا گیا کہ وہ مجھ سے مل گیا ہے۔ ایک پولیس افسر نے اُسے دھکا دے کر باہر نکالنے کی کوشش کی، آندلال کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اُس نے کچھ پڑھ کر پھونکا، انسپکٹر کھڑے کھڑے چکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں ابل کر حلقوں سے باہر آ گئیں۔ اُس کا چہرہ سیاہ ہو گیا، ناک سے خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اُسے نہ روکا ہوتا تو شاید وہ ایک ایک کر کے سب کو ٹھکانے لگا دیتا۔ کھیل اُسی روز ختم ہو جاتا۔ کوئی دوبارہ میرے مقابلے پر آنے کی جرأت نہ کرتا..... آندلال نے میرے اشارے پر اپنا ہاتھ روک لیا۔ پولیس اُسے گرفتار کر کے لے گئی..... وہ غریب آخری وقت تک زبان بند کئے رہا، پھر ایک طویل عرصے بعد انکارانی نے مجھے اطلاع دی کہ امر لال نے مجھے رکن الدین کی حویلی سے باہر نکالنے کی خاطر آندلال کو ٹھکانے لگا دیا..... بڑے کم ظرف لوگ تھے، بڑے کمینہ فصلت تھے، چھپ کر پشت سے چھرا گھوپنے کے عادی تھے۔

آندلال کو میری غفلت نے شکار کر دیا لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ شیوا کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ اس کا جرم میں صرف اتنا تھا کہ اُس نے میرا پیغام نول کشور تک پہنچانے کی غلطی کی تھی..... وہ میرا سفیر تھا، میرا قاصد تھا، میرا ایلچی تھا۔ پھر میں اُسے دشمنوں کی قید میں کس طرح برداشت کر سکتا تھا.....!!

میرے دل و دماغ میں نفرت کی چنگاریاں چٹ رہی تھیں۔ میرے دشمنوں نے میرے ساتھ ہمیشہ کینگی کا ثبوت پیش کیا تھا۔ وہ کبھی سامنے سے نہیں آتے تھے، مجھے چاروں اطراف سے گھیرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دشمن بہر حال دشمن ہوتا ہے، اُس سے کسی رحم کی توقع نہیں کرنی چاہئے۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ کبھی حریف کے حساس اور دفاعی ٹھکانوں پر گولہ باری کی جاتی ہے، کبھی اُس کی توجہ بٹانے کی خاطر شہری علاقوں پر بھی ایک دو بم پکا دیئے جاتے ہیں۔ ایسا دشمن کی توجہ بٹانے کے لئے کیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی تنظیمیں اور ادارے احتجاج کرتے ہیں لیکن سننا کون ہے؟ جس کی لالچی اُس کی بھینس..... ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ طاقت ور اپنے کمزور دشمن پر بلاوجہ بھی اپنی برتری قائم

نہ کے سامنے اُچھل کود کر رہے تھے۔“ میں نے اُس کا مضحکہ اُڑاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا بیج الخلق جانور مجھے پسند آیا تھا۔ تمہاری شکل بھی بالکل اُسی جیسی لگتی ہے۔“

میرا جواب اُسے پسند نہیں آیا۔ اُس کے ہونٹوں نے بد بدانا شروع کیا۔ میں قدم جما کر ہڑا ہو گیا۔ اُس کی رگوں میں جوان خون گردش کر رہا تھا، اُس نے جلد بازی میں یہ بھی نہیں سوچا کہ میں مندر کے تہہ خانے سے کس طرح آزاد ہو گیا؟ دوبارہ میرے قدم مندر کی ہاب کیوں اٹھ رہے تھے؟ تاہم توڑ حملے شروع کر دیئے۔ اُسی جانور نے پھر نمودار ہو کر میری رَف زقہ لگائی لیکن حصار سے نکلایا تو جل کر راکھ ہو گیا۔ ایک ایک کر کے اُس نے تمام رہے آزما ڈالے۔ پھر مجھے ایسی نظروں سے گھورنے لگا جیسے کوئی ڈرافٹ خواب دیکھ رہا ہو۔

”کیا دیکھ رہا ہے رے.....؟“ میں نے اُس کی جوانی پر ترس کھا کر کہا۔ ”کچھ دیر پہلے تو بازار لگا رہا تھا۔ پٹارے میں کچھ اور باقی رہ گیا ہو تو اُسے بھی نکال لے۔ اس کے بعد دُم ہا کر خاموشی سے چلا جا، ابھی تیرے کھیلنے کودنے کے دن ہیں مورکھ، کسی سے بچہ لڑانے سے پہلے ایک نظر اپنے قد پر بھی ڈال لیا کر..... میری نصیحت بھول مت جانا، تیرے بھلے کو کہہ رہا ہوں.....“ میں نے اُسے دھتکارا۔ ”جا..... اب نظریں نیچی کر کے چلا جا۔ زیادہ فضول بازی اچھی نہیں لگتی۔“

”تم نے منڈل کھینچ رکھا ہے۔“ وہ تمللانے لگا۔ ”منڈل سے باہر نکل کر بات کرو۔“

”جب تو پاگل کتے کی طرح اُچھل کود کر رہا تھا، منہ اٹھا اٹھا کر بھونک رہا تھا اُس وقت کیا میں تیری بہن کے ساتھ آنکھ پھولی کھیل رہا تھا؟“ میرا خون جوش مارنے لگا۔ ”کالی نے باندھ نہ رکھا ہوتا تو تجھے اُسی وقت تیری ماں کے پیٹ میں واپس پہنچا دیتا، تو دوبارہ جنم لےتا تو وہ تیرے کانوں میں سکھ پھونکنے سے پیشتر تجھے یہ ضرور سمجھاتی کہ پھر کبھی جمیل احمد نہیں سے آنکھیں ملا کر اونچی آواز میں بات کرنے کی حماقت نہ کرنا۔ سن رہا ہے مورکھ، میں تجھے کیا اُپدیش کر رہا ہوں.....؟“

وہ پھر پاگل ہو گیا۔ جنوں اور دیوانگی کے عالم میں انسان کو موت اور زندگی کا احساس نہیں رہتا، وہ نتائج پر غور نہیں کرتا۔ وہ بھی اسی کیفیت سے دوچار تھا۔ بات طول پکڑنے لگی۔ دوسرے راگبر بھی تماشہ دیکھنے کوڑک گئے۔ مندر سے بہت سارے پنڈت پجاری بھی نکل کر باہر آ گئے۔ میرے گرد بھیڑ جمع ہو گئی۔ میں نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ

رکھنے کی خاطر کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتا رہتا ہے۔ یہ کوئی منطق نہیں ہے، نہ کوئی فلسفہ ہے، نہ جنگی قوانین میں ایسی کوئی شق موجود ہے۔ لیکن دنیا اسی ریت پر چل نکلی ہے۔ پولیس اصل مجرم پر ہاتھ ڈالنے سے قاصر رہتی ہے تو مجرم کے بے گناہ رشتہ داروں کو اٹھالیتی ہے، اُس کے بیوی بچوں کو لاک اپ کر دیا جاتا ہے۔ مجرم چاروٹا چار سائے اُجاتا ہے۔ ایسا کرتا بھی جرم ہے، شرافت کے منافی ہے۔ لیکن جب قانون خود قانون کی خلاف ورزی کرے تو انصاف کس سے طلب کیا جائے.....؟

انکارانی نے واپسی میں دیر کر دی تھی، بھنڈاری کی نیت صاف تھی لیکن اُس نے سامنے اُ کر میرے تجسس کو اُبھار دیا تھا۔ میں آئند بھون کے پُر آسائش کمرے میں بیٹھ کر انتظار نہیں کر سکتا تھا، باہر نکل آیا۔ میرے قدم تیزی سے دشمن کے ٹھکانے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ میں کیل کانٹے سے پوری طرح لیس تھا۔ سید کی متبرک لاٹھی میرا سب سے بڑا ہتھیار تھی۔

میں آبادی کے علاقے میں داخل ہوا تو گھٹے ہوئے سر اور لمبی لمبی چوٹی والے پنڈت پجاریوں کی نظریں میری سمت اُٹھنے لگیں۔ میں سینہ تانے آگے بڑھتا رہا۔ سمندر کی بھری ہوئی لہریں سیلاب کی صورت اختیار کرتی ہیں تو اندھی ہو جاتی ہیں، بہری ہو جاتی ہیں۔ انہیں لوگوں کی آہ و بکا کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔ وہ بے بسائے مکانوں کو مکینوں سمیت خس و خاشاک کی طرح اپنی لیٹ میں بہا لے جاتی ہیں۔ میں بھی پھرے ہوئے طوفان کی طرح کالی کے مندر کی جانب قدم بڑھا رہا تھا جب وہی پستہ قد پجاری میرے سامنے آ گیا جو مندر کے اندر مجھے شعبدے بازی دکھا رہا تھا۔ اُس وقت میرے ہاتھ جبر بندھے تھے، کالی نے میری قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ میں کوئی جوابی کارروائی نہ کر سکا۔ وہ نول کشور کی اجازت لے کر بلاوجہ میدان میں کود پڑا۔

کالی کا مندر مجھ سے صرف سو گز کے فاصلے پر رہ گیا تھا جب ٹھگنے پجاری کی موت اُسے میرے سامنے لے آئی۔ میں نے کترا کر نکل جانا چاہا لیکن وہ گھمنڈی تھا، میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”تم.....“ اُس نے مجھے حقارت سے گھورا۔ ”تم وہی ہونا جسے بڑے پروہت کے حکم سے تہہ خانے میں بند کیا گیا تھا؟“

”میری نظریں بھی اگر دھوکہ نہیں کھا رہیں تو تم بھی وہی مداری ہو جو کالی کے قد آد

نہی نے کوشش بھی نہیں کی۔ دیکھ نو جوان ہونے کے باوجود میدان میں آ گیا تھا۔ نول نے بٹور نے بھی اُس کی بات رد نہیں کی تھی.... کون تھا وہ؟ پنڈت پجاری اُسے زبان بند رکھنے کی تاکید کیوں کر رہے تھے؟... کیا راز تھا؟ کیا کہانی تھی جو مجھ سے چھپائی جا رہی تھی؟... میں نے دیکھ کو تیز نظروں سے گھورا۔ میرے لب و لہجے میں سفاکی آ گئی۔

”اپنی زبان کھول دے مورکھ۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”تو میری آتما کو رازانے کی بات کر رہا تھا۔ پھر تجھے سانپ کیوں سونگھ کیا؟ میری آتما کا پالن کر۔ مجھے بتا کہ تو کون ہے؟ نہیں بتائے گا تو میں تجھے پتھر کا کرڈوں گا، تیری گندی آتما بھی اس پتھر کے اندر موجود ہوگی۔ وہ تجھے احساس دلاتی رہے گی کہ اگر تو نے میرا کہا مان لیا ہوتا تو تیرا ہم پتھر کا نہ بنتا.... ایک بات اور بھی سن لے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں تیرے شریر کے لئے کٹڑے کرڈوں۔“

میں نے غضبناک انداز میں اُلٹا ہاتھ فضا میں بلند کیا، اسی لمحے میرے سر پر انکارانی کی زد کا دھماکا ہوا۔ اُس کی مانوس آواز میرے کانوں میں سرسراتی ہوئی ابھری۔

”جلد بازی مت کرنا جمیل، اگر دیکھ مر گیا تو کھیل بگڑ جائے گا۔“

”تم کہاں چلی گئی تھیں؟“ میں نے ہاتھ روک کر پوچھا۔ ”تم نے کہا تھا کہ سید نے غائز کرنے والی بات ٹھیک ہی کہی تھی۔ تم نے مجھے انتظار کرنے کو کہا تھا، جلدی واپس آنے یقین دلایا تھا۔ لیکن.....“

”میں اُلجھ گئی تھی۔ میں نے تم سے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔“ انکا نے سنجیدگی سے باب دیا۔ ”میں واپس آ جاتی تو یہ ٹھگنا واپس مندر میں چلا جاتا۔ سارا کھیل بگڑ جاتا۔ میں اسے غافل بھی نہیں تھی۔ آئندہ ہون سے تمہیں یہاں تک لانے میں بھی میری ہی کوششوں کا ثل ہے۔ مجھے مجبوراً لمبا راستہ اختیار کرنا پڑا۔“

”تم مجھے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی ہو؟“ میں نے بڑی جلت سے کہا۔ ”میں تم سے غائز کی بات کر رہا ہوں.....“

”وہ کھانڈ ہی ہے جمیل، جسے تم نے ہوا میں معلق کر رکھا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ میں چونکا۔

”یہ دیکھ پنڈت نول کشور کا منہ بولا بیٹا ہے۔ وہ اسے اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہے۔“

اسے میری کمزوری سمجھ کر پے در پے وار کر رہا تھا۔ میں سید کی لاشی تھا سہ کھڑا رہا۔ اُس نے منڈل سے باہر نکلنے والی بات کہہ کر مجھے غصہ دلایا تھا، میں چاہتا تو صرف پلکوں کو اشارہ کرتا، وہ پلک جھپکتے میں زمین پر گر کر لوٹنے لگتا۔ میرا اُس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا، لیکن ہر بات کی ایک حد مقرر ہوتی ہے۔ وہ حد سے تجاوز کرنے لگا تو میں نے سید کی لاشی اٹھا کر زمین پر ماری، وہ اُچھل کر ہوا میں معلق ہو گیا، اُس کے پیر زمین سے ایک فٹ اوپر تھے، وہ ہوا میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اُس کی بوکھلاہٹ دیدنی تھی۔

”اب کیا وچار ہے مورکھ.....؟“ میں نے قدرے درشت آواز میں پوچھا۔ ”کھوٹی پر انکار ہے گا یا نیچے آنے کا کوئی اوپائے کرے گا؟“

”تم.....“ وہ پھر مجھے آنکھیں دکھانے لگا۔ ”تم اپنی بھیانک موت کو دعوت دے رہے ہو جمیل احمد خاں، تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟ جان لو گے تو تمہاری آتما بھی لرز اٹھے گی۔“

”نہیں دیکھ، نہیں.....“ مجمع میں سے ایک پجاری چیخ اُٹھا۔ ”اس پاپی سے اپنا پرچہ مت کرانا۔ زبان کو تالا لگا لے، میں جا کر مہاراج کو خبر کرتا ہوں۔“

میرے کانوں میں سنسناہٹ شروع ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ پستہ قد نو جوان کا نام دیکھ تھا لیکن پجاری نے اُسے اپنا تعارف کرانے سے کیوں منع کیا تھا؟ مہاراج کا اشارہ یقیناً پنڈت نول کشور کی طرف تھا..... پجاری، نول کشور سے کیا کہنے جا رہا تھا؟ میرے ذہن میں دوسو سے جا گئے لگے۔ میں نے پجاری کو مندر کی طرف بے تحاشہ بھاگتے دیکھا۔ میں اُنکی اُٹھا کر اُس کی سمت اشارہ کرتا، وہ جل کر راکھ ہو جاتا۔ لیکن مجھے اُس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں دیکھ کو گھورنے لگا جو پاگلوں کی طرح ہوا میں اس طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا جیسے کوئی ڈوبتا ہوا شخص زندگی بچانے کی خاطر موت کے ساتھ جدوجہد کر رہا ہو.....

”تو چپ کیوں ہو گیا.....؟“ میں نے اُسے لاکارا۔ ”اپنے بارے میں کیا بتانے جا رہا تھا؟ جو کچھ من میں ہے، اُگل دے۔ میں بھی تو سنوں کہ کس راویا یا ہنومان کے کھونٹے پر اُچھل رہا ہے۔ اُس سیتا کا نام بھی بتا دے جس نے تجھے جنم دیا تھا؟“

”اس کی باتوں میں مت آنا دیکھ۔“ میری پشت سے کسی دوسرے پجاری نے ہانک لگائی تو میرا تجسس بڑھنے لگا۔ کالی کے مندر کے اندر بڑے بڑے جغادری پنڈت اور پجاری بھی موجود تھے، لیکن دیکھ کے سوا کسی کو میرے سامنے اُچھل کود کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

ہے۔ اپنے کسی گرو کو یاد کر۔ کب تک الگنی پر گندے لنگوٹ کی طرح جھولتا رہے گا۔“

”کچھ دیر اور چپک لوجیل احمد خاں۔“ وہ جھلا کر بولا۔ ”تمہاری موت سر پر منڈلا رہی ہے۔ تمہارا انجام بڑا بھیا نک ہوگا۔ تم چاروں اور سے گھر چکے ہو۔ اس بار تمہیں بھاگنے کا بیج نہیں ملے گا، میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے.....“

دیک اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا، میں نے اپنی توتیں آنکھوں میں یکجا کر کے پتلیوں کو گردش دیا، وہ زمین پر گر کر قلابازیاں کھانے لگا۔ اُس کے حلق سے کرناک چنچیں ابھرنے لگیں۔

پجاریوں نے آگے بڑھنے کی جسارت کی، میں نے انہیں شعلہ بارنگاہوں سے دیکھا،

ب کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ دوسرا چکر کر زمین پر لوٹنے لگا..... مجمع دو قدم پیچھے

آ گیا۔ سب کی سٹی گم ہو گئی۔

”کسی اور نے ماں کا دودھ پیا ہے تو وہ بھی سامنے آجائے۔“ میں گرجنے لگا۔ ”محرکہ

کلمیدان میں ہوگا تو سب کو آئے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ جو مندر میں چھپا بیٹھا

ہے اُسے بھی باہر نکلنے کو کہو۔ اُسے بتاؤ، کہ فیصلے کا دن آ گیا ہے۔ اُس نے آنے میں دیر کر

لی تو میں دیکھ کوکتے کی موت ماروں گا۔ تم میں کوئی مرد ہو تو پہلے وہ سامنے آجائے۔“

ایک ہٹا کٹا پجاری اُچھل کر سامنے آ گیا۔ اُس کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے۔ اُس

نے کچھ پڑھ کر پھونک ماری، زمین سے کوڑیا لے سانپ اُبلنے لگے۔ میں حصار میں تھا،

ہنپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اس قسم کے کھیل تماشے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میں

نے سیدھا ہاتھ فضا میں بلند کر کے زور سے جھٹکا، سانپ کے مقابلے پر نیولوں کی فوج

بدر ہوئی۔ پجاری نے دوسرا وار کیا، سیاہ ذرات کی آندھی چلنے لگی، سانپ اور نیولے

بب ہو گئے۔ حصار کے چاروں طرف تاریکی پھیلنے لگی۔ میں نے سید کی لائٹ گھما دی،

نکلا ہلک جھپکتے میں چھٹ گئی۔ پجاری نے کئی اور وار کئے، میں توڑ کٹا رہا۔ پھر میرے

پیر کا پیانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے سیدھا پاؤں زمین پر مارا، پجاری جہاں کھڑا تھا وہاں کی

میں شق ہو گئی۔ پجاری نظروں سے غائب ہو گیا، زمین دوبارہ برابر ہو گئی۔ سب کی آنکھیں

لٹکی پھٹی رہ گئیں۔ سارے نامرد بن گئے، کسی نے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کی۔ میں

نہ پٹ کر دیکھ کی طرف دیکھا، اُس کی نگاہوں سے بھی خوف جھانک رہا تھا..... اچانک

بچنے لگا۔

اس کی خاطر وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ انکا نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اُس مرد قلندر کا اشارہ

اسی کی طرف تھا۔ یہ مندر میں گھسا بیٹھا تھا۔ مجھے اسے باہر لانے کی خاطر بھی ایک پجاری کو

اپنے تابع کرنا پڑا۔ پنڈت نول کشور تمہارے لئے پاگل ہو رہا ہے۔ اُس نے اُن چار

پجاریوں کو بھی مروا دیا جو تمہاری نگرانی پر مامور تھے۔ دیکھ بھی تملتا رہا تھا۔ میں نے

پجاری کے ذریعے اُسے تمہاری اطلاع بھجوائی تو بھاگ کر مندر سے باہر آ گیا۔ پنڈت

پجاری اسی لئے دیکھ کو منہ بند رکھنے کی تاکید کر رہے ہیں۔ خود بھی مقابلے پر آنے سے

گریز کر رہے ہیں۔

”پھنس گئی گوٹ حرامزادوں کی۔“ میرا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ ”آگ اپنے گھر میں

لگے تو شعلوں کی تپش کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ کل تک وہ میری دکھتی رگوں پر ہاتھ ڈال کر

قیمتے لگا رہے تھے، آج میری باری ہے..... اب مزہ آئے گا کھیلنے کا۔“

”میں تمہیں پھر دُور اندیشی سے کام لینے کا مشورہ دوں گی۔“

”بس کرو انکارانی..... بس کرو۔“ میں ہاتھ مسلتے ہوئے بولا۔ ”میرے دشمنوں نے

ہیشہ شب خون مار کر مجھے بدحواس کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج میرے ہاتھ پہلی بار ایک

سنہری موقع لگا ہے..... تم جھرتا کو کیوں بھول رہی ہو.....؟ لگے ہاتھوں اُس کا حساب بھی

چٹکا ہو جائے گا۔“

”میں دیکھ کے سر پر واپس جا رہی ہوں۔ تم سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا.....“

انکا جتنی جلدی میں آئی تھی، اتنی ہی غلت میں واپس چلی گئی۔ میں نے نظریں گھما کر مجمع

کی طرف دیکھا، مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ تعداد میں مجھ سے کہیں زیادہ تھے لیکن اُن کے چہروں پر

خوف مسلط تھا۔ خوف کی وجہ پنڈت نول کشور کی کمزوری تھی جو میرے ہاتھ آگئی تھی۔ اُن کی

نگاہوں میں میرے لئے نفرت ہی نفرت بھری تھی لیکن وہ قدم آگے بڑھانے کی غلطی نہیں کر

رہے تھے۔ دیکھ میرے ہاتھوں ”خرچ ہو جاتا“ تو انہیں بھی نول کشور کے سامنے جواب

دینا پڑتا۔ میں نے مجمع سے نظر ہٹا کر دیکھ کی جانب دیکھا، اُس کی حالت بڑی مضحکہ خیز

نظر آ رہی تھی۔

”چپ کیوں ہے بالک.....؟“ میں نے چٹکی بھری۔ ”اپنی جھولی میں ہاتھ ڈال کر دیکھ

شاید کوئی جستر منتر باقی رہ گیا ہو، اُسے بھی آزمالے۔ بدھی ٹول..... کسی بڑے کو آواز

”تم سب کا تر ہو، بزدل ہو، ڈرپوک ہو۔ گردو پوکو بلاؤ، اُس سے جا کر کہو کہ میں بلارا ہوں۔ اُس نے اتنی دیر کردی تو یہ مسلا مجھے بھی نہیں بخشے گا۔“

میں سمجھ گیا کہ انکارانی نے اس کو ہشکارا ہوگا۔ میری طرح اُسے بھی پنڈت نول کشور کا انتظار بے چین کر رہا ہوگا۔

”کس کو آواز دے رہا ہے بالک؟“ میں نے اُس کا مذاق اڑایا۔ ”اب تیری سہائیا کو کوئی نہیں آئے گا۔ تو اب میری ٹھنی میں ہے۔ میں تجھے اپنا سیوک بنا کر اپنے ساتھ لے چلوں گا، اسی میں تیری مکتی ہے۔ تیرے بھوش میں بھی یہی لکھا ہے کہ سارا جیون میرے چرنوں میں پڑا رہے گا۔“

”تم کوئی سپنا دیکھ رہے ہو جیل احمد خاں.....“ انکا نے شاید اُسے پھر آزاد چھوڑ دیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھتا ہوا بولا۔ ”تم چرنوں کی بات کر رہے ہو، میں تمہارے منہ پر تھوکتا بھی گوارا نہیں کروں گا۔“

”پھر بھونکنا شروع کر دیا.....؟“ میں نے اُسے غضبناک نظروں سے گھورا۔ ”سیدی طرح بات نہیں مانے گا.....“

”تم اُننگی ٹیڑھی کر کے بھی دیکھ لو..... اپنے ارادوں میں سھل نہیں ہو سکو گے۔“ میں نے جواب دینے کی بجائے اُننگی ٹیڑھی کر لی، اُس کے جسم پر نظر آنے والا لباس غائب ہو گیا۔ سب ششدر رہ گئے۔ دیکھ جلدی سے گھٹنے جوڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے سنبھلنے کی مہلت نہیں دی، پانچوں اُننگیوں کو باری باری آگے پیچھے ہلانا شروع کر دیا۔ وہ ہڈیانی انداز میں چلانے لگا۔ آگے پیچھے جھکولے کھانے لگا۔ کچھ بچاری تیزی سے مندر کی طرف دوڑے، لیکن پھر رُک گئے۔ انکارانی کی سرگوشی میرے کانوں میں گونجی۔

”مبارک ہو جیل..... چپو نے بوکھلا کر بل سے باہر آ رہے ہیں۔“

میں نے مندر کی سمت دیکھا، پنڈت نول کشور اپنی چندال چوڑی کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا میری طرف آ رہا تھا۔ اُس کے تیور اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، میری آنکھوں میں خون اترنے لگا۔

”تم نول کشور کو زیادہ ڈھیل مت دینا۔“ انکا نے کہا۔ ”جو کچھ کرنا ہو، جلدی کر گزرتا۔“

”تم خاموش بیٹھی تماشہ دیکھتی رہو.....“ میں نے ہونٹ پر زبان پھیرتے ہوئے جواب

”آج بہت عرصے بعد ایک دشمن سامنے آ رہا ہے۔ تم جلدی کی بات کر رہی ہو؟ مجھے یں کا حساب کتاب چکانا ہے، کچھ وقت تو لگے گا۔“

میں انکارانی سے ہمکلام تھا، دیکھ کو موقع مل گیا۔ اُس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش میں نے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا، وہ پھر لباس میں نظر آ رہا تھا۔ میں نے دونوں یوں کا حلقہ بنا کر زور سے اپنے سینے پر مارا، دیکھ لڑکھڑا کر زمین پر گرا پھر اس طرح بری طرف لڑھکنے لگا جیسے اُسے اپنا توازن برقرار رکھنے میں دشواری پیش آرہی ہو۔ اُس نے پھر چلانا شروع کر دیا۔ پنڈت نول کشور کی رفتار میں بھی تیزی آ گئی۔ دیکھ میرے پیادے ٹکرا کر رُکنا تو میں نے اُسے تیز نظروں سے گھورا۔

”بہت اُچھل کود کر چکا حرام کے ختم، اب خاموشی سے اٹھ کر اکڑوں بیٹھ جا، سر گھٹنوں کے درمیان کر لے، آنکھیں موند لے، جو کچھ ہوگا تجھ سے نہیں دیکھا جائے گا..... تیرا گردو با رہا ہے، اب اُس کی باری ہے۔“ میں نے کسی زخمی سانپ کی طرح پھنکار کر بڑے ناک لہجے میں کہا۔ ”چتا مت کر، میں پہلے تیرے گردو کا کریا کرم کروں، پھر تجھے بھی اسی کے پاس بھیج دوں گا..... خبردار جو ہمارے بیچ ٹانگ پھسانے کی کوشش کی.....“

میرے لب و لہجے میں ایسی گھن گرج تھی کہ دیکھ نے تعمیل حکم میں دیر نہیں لگائی۔ میں نے نظریں اٹھا کر سامنے کی طرف دیکھا۔ میرا در پنڈت نول کشور کے درمیان فاصلہ بڑی تیزی سے گھٹ رہا تھا..... اُس کے گرگوں کے تیور بھی خطرناک نظر آ رہے تھے۔ مجھ یہ دیکھ زرخشی ہوئی کہ وہ مارنے یا مر جانے کا فیصلہ کر کے کالی کے مندر سے باہر آ گیا تھا۔ میں نے سید کی لالچی پر گرفت مضبوط کر لی۔ انکارانی میرے سر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

میری نگاہیں پنڈت نول کشور اور اُس کے ساتھیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سارے کے سارے دس فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر رُک گئے۔ میرے ارد گرد دھڑکے ہوئے پنڈت بچاری نے ان کے ساتھ شامل ہونے لگے۔ ان کی پیشانیوں پر نفرتوں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ ان کے تیوروں میں غضب کا سمندر چنگھاڑ رہا تھا، انہوں نے اپنے جسموں پر بھبھوت ملا دیا تھا، عجیب مضحکہ خیز نظر آ رہے تھے۔ سب ہی کی نگاہوں میں شعلوں کا رقص جاری تھا۔ نول کشور کی پیشانی بڑی کشادہ تھی لیکن وہ فراخ دل نہیں تھا، بڑا کینہ پرور تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو بڑی نرائن کی چتا کی چنگاریوں کو کبھی نہ کریدتا۔ وہ مر چکا تھا، میری کلدیپ بھی اس جنگ



”جیل.....“ انکا تمللانے لگی۔ ”یہ حرامزادہ بکواس کر رہا ہے۔ مجھے اجازت دو، میں ابھاڑو کو دو منٹ میں سیدھا کر دوں گی۔“

”نہیں انکارانی، فی الحال اطمینان سے بیٹھی رہو۔ تمہاری ضرورت پیش آئی تو میں تکلف کے کام نہیں لوں گا۔“

انکا نے ہونٹ بھیجنے لئے۔ اُس کی سرخ سرخ نگاہیں نول کشور پر جمی ہوئی تھیں، اُن سے عزت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

”کیا کھسر پھسر کر رہا تھا اُس ڈیڑھ بالشت کی چھمیا سے؟“ وہ حقارت سے ہنسا۔ ”ہوا بر رہی ہوگی تجھے؟..... کیوں؟“

”نہیں.....“ میں نے اُسی کی زبان میں جواب دیا۔ ”مجھے بتا رہی تھی کہ دیکھ کی پائش کا اصل راز کیا ہے۔“

نول کشور دیکھ کا نام نہ کر تمللانے لگا۔ اُس کے تیور بدلنے لگے۔

”زبان کو لگام دے پاپی.....“ وہ غرایا۔ ”میں کالی کے مندر میں بیٹھا تھا تو اس کا کارن کھ اور تھا۔ تو کچھ اور سمجھ بیٹھا۔ تو جانتا ہے کہ ہم نے بدری نرائن مہاراج کی چتا کی راکھ سنبھال کر رکھی ہے۔ تجھے ٹھکانے لگالیں تو پھر اسے بھی کسی اُونچے استھان پر بکھیر دیں گے۔ کسی ایسی جگہ جہاں تجھ جیسے پلید منش کے گندے قدم نہ پہنچ سکیں۔“

”تم اندھے ہو نول کشور.....“ میں گرجنے لگا۔ ”تمہارے ساتھی بھی اندھے ہیں۔ بگل ہیں جو تمہاری چکنی چڑی باتوں میں آگئے۔ انہیں خبر ہوئی کہ بدری نرائن کتنا بڑا پاپی، کتنا مکار، کس قدر غنا باز تھا تو یہ تمہارے جھنڈے تلے سر جوڑ کر کبھی کھڑے نہ ہوتے۔“

”چپ ہو جا ملسے.....“ نول کشور کے اُلٹے ہاتھ پر کھڑا ہوا ایک ہٹا کٹا پجاری خم ٹھونک کر سامنے آ گیا۔ ”اپنی گندی زبان سے اب اگر بدری مہاراج کے لئے ایک شبد بھی اور کہا زیری کھاٹ کھڑی کر دوں گا۔“

”مہارپشوں کے ساتھ مخڑی کر رہا ہے دشت.....“ میں نے پجاری کو غضبناک نظروں سے دیکھا۔ ”بیڑوں کی باتوں میں دخل اندازی کرتا ہے۔ دیوی کے چڑھاوے کھا کھا کر دن پر تھوڑی چربی چڑھ گئی تو آنکھیں دکھارہا ہے۔ مکتی چاہتا ہے تو سر جھکا کر واپس چلا جا۔ نارا ہے رائڈ کے سائڈ، نظریں جھکا لے، واپس مندر میں جا کر کسی پجارن کے ساتھ

میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی، حساب برابر ہو گیا تھا لیکن نول کشور نے تعصب کو ہوا دی تھی، نفرتوں کے بیج بوئے تھے اور اب اُس کی کھڑی فصل لئے میرے سامنے موجود تھا۔ اُس نے دھرم میں سیاست شامل کر دی۔ اب لیڈری چکانے کی خاطر باہر آ گیا تھا۔ دیکھ میرے قبضے میں نہ ہوتا تو شاید اب بھی وہ کسی پجارن کے لینگے میں چھپا بیٹھا ہوتا، دوسروں کو بلا وجہ نفرت کی بھی میں جھونکتا رہتا.....!

اُس کی پیشانی پر مجھے شیطانی قوتوں کا جال نظر آ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُس نے گیان دھیان میں بڑی اٹھک بیٹھک لگائی ہوگی۔ اُس کی نظریں میرے چہرے سے گزر کر دیکھ پر تک گئیں جو بے بسی سے دم سادھے میرے قدموں میں پڑا تھا۔ اُس نے میری طاقت کا اندازہ لگانے کے بعد ہی خاموش رہنا مناسب سمجھا ہوگا، ورنہ پہلے بڑی اچھل کود کر رہا تھا۔

”اتنی دُور کیوں رُک گئے نول کشور.....؟“ میں نے سرد آواز میں اُسے مخاطب کیا۔ ”تجھ پر دیا آ رہی ہے مورکھ.....“ اُس نے مجھے خوفناک نظروں سے گھورا۔ اُس کے ساتھی کسمانے لگے۔

”میں دیا کا مطلب سمجھتا ہوں پنڈت مہاراج۔“ میں زہر خند سے بولا۔ ”نہ سمجھتا تو دیکھ میرے جنون میں نہ پڑا ہوتا، اس سے نرک کی سیر کر رہا ہوتا۔“

”بڑبڑولے..... بہت زبان چل گئی ہے تیری۔“ اُس نے مٹھیاں بھیجنے لیں۔ ”اُس کے بل پر اکڑ رہا ہے جو تیرے سر پر آلتی پالتی مارے بیٹھی ہے۔“

”انکارانی کی بات مت کرو نول کشور، اُسے میں نے خاموش رہنے کو کہا ہے۔ ورنہ تم سب کے لئے وہی کافی ہوتی۔“

جواب میں اُس نے فلک شکاف تہقہہ لگایا، مجھے باور کرانا چاہا کہ وہ انکارانی سے خوفزدہ نہیں ہے۔

”تو اُس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا مورکھ، یہ بڑی ہرجائی ہے۔ کسی ایک کی ہو کر نہیں رہتی۔ ایک دن تجھے میری بات اوش یاد آئے گی۔ پرنتو اس سے تجھے سنبھالنے کا موقع نہیں ملے گا۔ میری مان تو اُس کا پیچھا چھوڑ دے، بھگا دے اُسے۔“ وہ تیز آواز میں بولا۔

”اپنی شکتی پر بھروسہ کر۔ گجریوں، جریوں سے من بہلانا چھوڑ دے۔“

ٹھنھول کر۔ میرا ہاتھ اٹھ گیا تو بھاگے راستہ نہیں ملے گا۔“

پجاری کے ہونٹ ہلنے شروع ہو گئے۔ میں اختصار سے کام لوں گا، میں نے اُسے ڈھیل نہیں دی۔ ایک ہی وار میں جہنم رسید کر دیا۔ اُس کے دوسرے ساتھی نول کشور کی جانب دیکھنے لگے۔

”اُپر ادھی.....“ نول کشور کے تیور بدلنے لگے۔ ”تو شرافت سے میری بات نہیں سمجھ گا۔ تیرے لئے کوئی اوپائے کرنا ہوگا۔“

”اوپائے تو تم کر چکے تھے نول کشور، لیکن نتیجہ کیا نکلا؟“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں تمہاری کالی کی تمام شلتیوں کو نیچا دکھا کر باہر نکل آیا، تم سب ٹاپتے رہ گئے..... اب تم کو بھی باہر آنا پڑا، دیکھ کے لئے۔“

”اے چھوڑ دے.....“ نول کشور نے جھلا کر جواب دیا۔ ”بالکوں پر ہاتھ اٹھانا مہا پرشوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔“

”چھوڑ دوں گا.....“ میں نے جلتی پر تیل چھڑکا۔ ”سنا ہے تو دیکھ کو منہ بولا بیٹا کہتا ہے۔ اصلیت کیا ہے.....؟“

پنڈت نول کشور تپ اٹھا، پیچ و تاب کھانے لگا۔ اُس کے چہرے پر ماورائی قوتوں کا جال پھیلنے لگا۔

”جھیل.....“ انکارانی پہلو بدل کر بولی۔ ”تم وقت برباد کر رہے ہو۔ کھیل جلدی سے نمشا کر یہاں سے نکل چلو۔“

”تم نے جواب نہیں دیا مہاراج۔“ میں نے نول کشور پر طنز کے تیر برسائے شروع کئے۔ ”آج تو اپنی اُس رکھیل کا شبہ نام بتا دو جس نے تمہاری اس پاپ کی نشانی کو جہنم دیا تھا۔ وہ زندہ ہے یا تم نے اپنا پاپ چھپانے کے کارن اُسے بھی جہنم کی طرح زبان کاٹ کر گوئی کر دیا؟“

”مہاراج.....“ ایک سادھو نے مجمع سے نکل کر نول کشور سے کہا۔ ”یہ پاپی مسلا جو من میں آئے بولے چلا جا رہا ہے۔ تم کالی کے مندر کے بڑے پروہت ہو، مہاپرش ہو۔ تمہاری شستی اپرم پار ہے پھر اسے جلا کر بھسم کیوں نہیں کر دیتے؟ اس دھشت کی زبان کاٹ کر پھینک دو۔ پورا ہر دور تمہارے ساتھ ہے..... کس بات کا دُچار کر رہے ہو؟“

نول کشور کی تیوری کے بل اور گہرے پڑ گئے۔ سادھو کی بات سن کر دوسرے پنڈت پجاریوں کی نظریں بھی اُس کی جانب اٹھنے لگیں۔ نول کشور تن کر کھڑا ہو گیا.....

”دیکھ کو ہٹا دے راستے سے۔ پھر میں بتاتا ہوں تجھے کہ کتنے بیسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔“

میں نے ٹھوکر ماری، دیکھ بلبلاتا ہوا دُور جا پڑا۔ میں نے سید کی لائھی کو مضبوطی سے تھام لیا۔ دوسری طرف نول کشور نے پلٹ کر کالی کے مندر کے بڑے گنبد کی طرف دیکھا، کئی بار جھک جھک کر ڈنڈوت کیا۔ پھر اُس نے میری طرف دیکھا، اُس کی نگاہوں میں شیطانی بھڑک رہے تھے۔ غصے کی شدت سے اُس کے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اُس نے اپنے جستر منتر آزمانے شروع کر دیئے۔ میں سینہ تانے کھڑا رہا۔ انکارانی اٹھ کر میرے سر پر ٹپکنے لگی۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی مسلط تھی۔ نول کشور حملے کرتا رہا۔ وہی کھیل تماشے، وہی شعبدے بازی، وہی ناکج جو میں پہلے کئی موقعوں پر دیکھ چکا تھا..... رونما ہوتے رہے۔ کبھی وہ زمین سے چٹکی بھر کر میری طرف اُچھالتا، کبھی سینے کے بال توڑنے لگتا، کبھی فیزو کو بل دینا شروع کر دیتا، کبھی ہاتھ پاؤں کو اٹھا اٹھا کر جھٹکنے لگتا۔

میں دروغ گوئی کو منافقت سے کم نہیں سمجھتا۔ میں اقرار کروں گا کہ پنڈت نول کشور نے کالی کے مندر میں بیٹھ کر وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ میں بدری نرائن کی طاقت سے بھی واقف تھا۔ میں نے دوسرے سینکڑوں پجاریوں کے دم ختم بھی دیکھے تھے، اُن کے چٹکاروں سے بھی واسطہ پڑ چکا تھا، امر لال اور پریتم لال کی بات اور تھی لیکن پنڈت نول کشور مجھے سادھو جگدیو کی ٹکر کا نظر آ رہا تھا۔ انکارانی نے مجھے جگدیو کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ سورگ باشی پریتم لال کے دوستوں میں سے تھا۔ اُس کو ماورائی قوتوں کے حصول کا جنون تھا۔ وہ تمام زندگی جنگلوں اور پہاڑوں کی خاک چھانتا رہا، جہاں بھی کچھ ملتا اٹھا کر اپنی جھولی میں ڈال لیتا۔ ایک بار وہ اپنی عظیم طاقت کے گھمٹ میں غلطی سے پریتم لال سے بھی ٹکرا گیا تھا۔ پھر اُس نے اپنی شکست بھی بڑی مردانگی سے قبول کر لی اور سچے دل سے ہمیشہ کے لئے پریتم لال کا ہاتھ تھام لیا۔ جب تک زندہ رہا، تن من دھن سے پریتم لال کا سیوک بن کر اُس کی خدمت کرتا رہا، اُسی کے گن گاتا رہا۔

پنڈت نول کشور کے اندر مجھے دوسرا سادھو جگدیو نظر آ رہا تھا۔ دیکھ کی وجہ سے وہ پاگل

نہ ہو گیا ہوتا تو شاید میری کہانی کچھ اور ہوتی۔ لیکن وہ جوش میں تھا، ہوش سے کام نہیں لے رہا تھا۔ اُس کا چہرہ بھڑکتی آگ کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔ میرا احصار کئی بار اُس کے حملوں سے ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گیا، کئی بار مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی گتے کے بڑے ڈبے میں بند ہوں، کوئی جری شخصیت کا مالک مجھے ادھر ادھر اُلٹ پلٹ رہا ہے..... اُسے صرف میری اُنہی قوتوں کا اندازہ تھا جو مجھے پریتالال، آندلال اور جلدیو کے ذریعے ملی تھیں۔ کلدیپ کی اتما میرے کام آتی رہتی تھی۔ گفتگو کے دوران اُس نے مجھے سب کچھ بتا کر حیران کر دیا تھا۔ لیکن دوسرے پجاریوں کی طرح وہ بھی ننذا کی بخشی ہوئی قوتوں اور تبت میں گزاری ہوئی میری زندگی کے سنہرے باب سے مطلق بے خبر تھا۔ سید کی لائچی کے بارے میں بھی اُن کے فرشتوں کو بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔ میرے پاس یہی دو حربے تھے جو انہیں زیر کر دیتے تھے۔

پنڈت نول کشور متواتر حملے کرتا رہا۔ پھر اُس نے اچانک ہاتھ بڑھا کر اپنی چٹیا کو مٹھی میں جکڑا تو انکارانی نے تیزی سے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”سنہلنا جمیل..... اب یہ وہ داؤ آزمانے جا رہا ہے جو اس سے پیشتر کسی پنڈت پجاری نے نہیں آزمایا۔ میری مانو تو اسے ڈھیل مت دو، جتنی جلدی ممکن ہو اس کا کھیل ختم کر دو۔“

”تم پریشان مت ہو..... تماشا دیکھتی رہو۔“

”یہی تمہاری غلطی ہے۔“ وہ تمللانے لگی۔ ”تم میری بات نہیں مانتے، اپنی من مانی کرتے ہو۔“

میں نے جواب نہیں دیا، میری نگاہیں نول کشور پر جمی تھیں جو اپنی چٹیا تھامے کھڑا مجھے قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔

”مجھے معلوم ہے نول کشور.....“ میں اُسے بھڑکانے کی خاطر زہر خند سے بولا۔ ”تم اب اپنا آخری داؤ استعمال کرنے کی سوچ رہے ہو، تمہیں یہ وچار بھی بیا کل کر رہا ہو گا کہ اگر تمہارا داؤ کام نہ آیا تو کیا ہو گا..... کیوں؟ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”من میں کچھ اور گند بھرا ہو تو وہ بھی نکال دے۔“ نول کشور زخمی شیر کی طرح دھاڑا۔

”پاپی، دشت، من کی ساری آشنائیں پوری کر لے، اس کے بعد سے تیرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

میں کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ اچانک چار چھ بٹے کئے پجاری شیوا کو گھسیٹتے ہوئے سامنے لے آئے۔ میں نے شیوا کو دیکھا تو میری آنکھیں چمکنے لگیں..... میں نے چیخ کر کہا۔ ”نول کشور، ابھی تک تم جنتر منتر کے کھیل تماشے دکھا رہے ہو، میں نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی اختیار کئے کھڑا ہوں۔ لیکن اس سے پیشتر کہ تم اپنی ترکش کا آخری تیر استعمال کر دیا میں جوابی حملہ شروع کروں..... تمہارے گندے بوجھ سے دھرتی کو چھٹکا رادلا دوں، میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میری بات دھیان سے سن لو“ میری آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ ”تم نے پنڈت شیوا پر جو الزام لگایا ہے اس میں کوئی صداقت، کوئی سچائی نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ میں نے شیوا کی زندگی صرف اس لئے بخش دی تھی کہ میں اُس کے ذریعہ تمہیں اپنا پیغام پہنچانا چاہتا تھا۔ شیوا نے آخری وقت یہی کہا تھا کہ وہ ڈر کر بھاگے گا نہیں، میں اُسے مار دوں..... سن رہے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟ تم شیوا کی طرف سے اپنا من صاف کر لو، میں اُس کی خاطر تمہیں ایک آخری موقع اور دینے کو تیار ہوں۔“

”تم..... تم یہ کیا حماقت کی باتیں کر رہے ہو جمیل.....؟“ انکارانی جھلا کر بولی۔ ”نول کشور کو ختم کر دو..... مار ڈالو، میری بات مان لو۔ کھیل ختم کرنے کی کوشش کرو۔“

”تم اس وقت درمیان میں اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش مت کرو۔“ میں نے انکارانی سے کہا۔ ”ایک بار تمہارے دل میں بھی گرہ لگی تھی کہ میں نے شیوا کو زندہ کیوں چھوڑ دیا.....؟ یاد ہے نا..... آج میں اس گانٹھ کو بھی کھولنا چاہتا ہوں۔“

”بات کو سمجھنے کی کوشش کرو جمیل.....“ اُس نے متوحش نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”نول کشور جو آخری داؤ استعمال کرنے سے ہچکچا رہا ہے وہ تمہاری توقعات سے زیادہ خطرناک ہے۔ اُسے موقع مت دو۔ میرے دل میں تمہاری طرف سے اب کوئی بدگمانی نہیں ہے۔ میں چاہوں بھی تو تمہاری مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں سوچ سکتی۔“

انکارانی کا آخری جملہ میرے لئے توجہ طلب تھا۔ اس سے پیشتر اُس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں اُس کی مجبوری کا سبب جاننا چاہتا تھا، میری توجہ بٹ گئی۔ پنڈت نول کشور کو شاید اسی موقع کی تلاش تھی۔ وہ اپنا وار کر گیا۔ اُس نے منھی میں جکڑی ہوئی چٹیا کو پوری قوت سے جھٹکا دیا، کئی بال ٹوٹ کر اُس کے ہاتھ میں آ گئے۔ اُس نے بالوں پر جلدی جلدی کچھ پڑھ کر میری طرف اُچھال دیا..... فضا میں بجلیاں کڑکنے لگیں۔ ایسی آوازیں گونجنے

لگیں جیسے ہزاروں بدروہیں چیخ رہی ہوں۔

مجھے اپنے جسم پر شدید تپش کا احساس ہوا۔ میں نے جسم پر نظر ڈالی تو ششدر رہ گیا۔ میں نگا کھڑا تھا..... میرے جسم پر سیاہ سیاہ آبلے نظر آرہے تھے..... میں نے جو حصار قائم کیا تھا وہ ٹوٹ چکا تھا۔ پنڈت پجاریوں کے چہرے خوشی سے تپنے لگے۔ سید کی لالچی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے قدموں میں گر گئی تھی۔ میں اُسے اٹھانے کے ارادے سے جھکا، نول کشور کو ایک موقع اور مل گیا۔ اُس نے برق رفتاری سے گلے میں پڑا ہوا جیو اُتار کر میری طرف اُچھالا، میں رسیوں میں جکڑا گیا..... ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل نہیں رہا۔ انکارانی میرے سر سے اُتر گئی۔ میں سید کی لالچی پر اوندھے منہ گرا۔ جب اچانک کوئی افتاد خلاف توقع آپڑے تو ایک لمحے کو انسان ششدر رہ جاتا ہے، اُس کے ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں، کچھ بھائی نہیں دیتا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ سب کچھ میری توقع کے خلاف ہوا تھا۔ بازی ایک دم سے پلٹی تھی۔ انکارانی نے کہا بھی تھا کہ نول کشور وہ آخری حربہ استعمال کرنے کی سوچ رہا تھا جو اس سے پیشتر کسی پنڈت پجاری نے نہیں کیا تھا۔ انسان ہمیشہ غلط فہمی کا شکار ہوتا ہے۔ مجھے بھی کچھ زیادہ ہی خوش فہمی ہو گئی تھی، نول کشور کو موقع مل گیا۔ اُس نے تابو توڑ حملے شروع کر دیے۔ لیکن اُس نے ابھی تک میرے قریب آنے کی ہمت نہیں کی۔ اُس کی دیکھا دکھی اُس کے چیلے بھی دُور ہی دُور کھڑے تھے۔ پھر ایک پنڈت نے جو نول کشور کے سیدھے ہاتھ پر کھڑا تھا چیخ کر شیوا سے کہا۔

”تیرے امتحان کا سہ آگیا شیوا..... آگے بڑھ کر اس مسئلے کا قصہ پاک کر دے، ہم تجھے شام کر دیں گے، تجھے پھر وہی مان ملے گا جو تو نے کھو دیا تھا.....“

پنڈت نے دھوتی کے اندر چھپا ہوا شکاری چاقو نکال کر شیوا کی طرف اُچھالا۔ شیوا چاقو پر گرفت جما کر بجلی کی سرعت کے ساتھ میرے قریب آگیا۔ بوکھلاہٹ میں، میں کوئی جوابی کارروائی کرنا بھی بھول گیا..... شیوا کی آنکھوں میں خون اُبل رہا تھا۔ وہ اُچھل کر زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ لات مار کر اُس نے مجھے چت کیا۔ اُس کا سیدھا ہاتھ فضا میں بلند ہوا، میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ موت کا تصور پلکوں کے نیچے اندھیرا بن کر لہرانے لگا..... میرے ہاتھ کی رسیاں کٹ گئیں۔ میرے ہاتھ آزاد ہو گئے۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ شاید میں پھر کسی خوش فہمی کا شکار ہو رہا تھا جب شیوا میرے جسم سے لپٹ گیا۔ اُس نے دوسروں کو بھی

ہڈ دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ میرا گلہ گھونٹ کر مارنا چاہتا ہے۔ اُس کی آواز سرسراتی ہوئی برے کانوں میں گونجی۔

”تم نے میرا جیون مجھے دان کر دیا تھا۔ میں تمہارے دان کئے ہوئے جیون سے تمہارا ی خون نہیں کر سکتا تھا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام، میں نے اپنا دھرم اپدیش نبھادیا۔ کرو تو یہ پورا کر دیا.....“

میں نے ہاتھ آزاد ہوتے ہی سید کی لالچی پکڑ لی۔ ارتکاز اور مرا تپے کا عمل کرتا ہوا تیزی سے اُٹھا، حصار کھینچنے میں بھی بڑی عجلت سے کام لیا۔ نول کشور اور اُس کے ساتھی حیرت زدہ رہ گئے۔ اُن کی قہر آلود نظریں موقع کی نزاکت بھانپ کر شیوا کی جانب اُٹھے لگیں۔ میں نے سید کی لالچی اُٹھا کر اُس کا رخ پنڈت نول کشور کی سمت کر دیا۔ وہ فضا میں اُچھل کر زمین پر چاروں شانے چت گرا۔ میں نے اس پجاری کی سمت دیکھا جس نے شیوا کو شکاری چاقو دے کر میری طرف بھیجا تھا۔ میں نے اُلٹا ہاتھ اُس کی طرف کر کے انگلیاں جھٹک دیں۔ وہ بھی زمین پر گر کر ترپنے لگا۔ پھر اُس کا جسم اکڑ گیا۔ میں نے اپنے جسم کے آبلوں پر بوبک ماری، ساری سوزش ختم ہو گئی۔ تمام چھالے اور داغ دھبے دُور ہو گئے۔ میں لپک کر نول کشور کے سر پر پہنچ گیا۔ اُس کے ساتھ کھڑے ہوئے پجاری میری وحشت دیکھ کر کانٹائی کی طرح پھٹ گئے۔ بہت ساروں نے دھوتیاں سنبھال کر مندر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

پنڈت نول کشور میرے حملے کا توڑ کر کے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے سید کی لالچی اُس کے سر پر ماری۔ اُس کی کھوپڑی دو حصوں میں منقسم ہو گئی..... بھجھ نکل کر باہر آگیا۔ وہ مایہ بے آب کی طرح ترپ ترپ کر ٹھنڈا ہو گیا..... ہجوم میں بھگدڑ مچ گئی۔ پنڈت پجاری کائی کے مندر کی طرف بے تحاشہ بھاگنے لگے، دوسرے تماش بین بھی تتر بتر ہو گئے۔ دیکھنے والے بھی جان بچانے کی خاطر دوڑ لگا دی۔ میں اُسے بھی پنڈت نول کشور کے ساتھ ہی جہنم کے سفر پر روانہ کرنا چاہتا تھا۔ شیوا نے اس کی سفارش کی تو میں نے اُٹھا ہوا ہاتھ نیچے گرا لیا۔ میدان میں صرف شیوا رہ گیا۔ میں قدم اُٹھاتا اُس کے قریب چلا گیا۔

”شیوا.....“ میں نے اُسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ ”میں تمہارا احسان کبھی نہیں....“

”ابکار کس بات کا.....؟“ وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ”میں نے حساب برابر کر دیا۔“

”میرے ساتھ چلو شیوا.....“ میں نے اُسے دعوت دی۔ ”میں تمہارے اوپر آنکھ بند کر کے بھروسہ کر سکتا ہوں۔ ہم ایک اور ایک مل کر گیارہ بن جائیں گے۔“

”نہیں مہاراج.....“ اُس نے مہاراج کہہ کر میری برتری تسلیم کر لی۔ میری دعوت ٹھکر کر بولا۔ ”میں کالی کا سیوک ہوں..... میں نے کالی کے چرنوں میں جنم لیا تھا، میرا انت ہی دیوی کے چرنوں میں ہی ہوگا..... تم جاؤ۔“

میں شیوا کو سمجھانا چاہتا تھا کہ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی تیز آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ وہ ڈر کر بھاگ گئے تھے۔ اب اُن کی مخبری پر شاید پولیس نے مجھے گھیرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ دو تین لاشوں کی موجودگی میں مجھے قاتل ثابت کرنا اُن کے لئے زیادہ دشوار نہ ہوتا..... شیوا بھی فکر مند نظر آنے لگا۔ میں فرار کا کوئی راستہ تلاش کرنے کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ انکارانی میرے سر پر واپس آ گئی..... میں نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”اب کیا ہوگا انکارانی.....؟ وہ پھر میرا وقت برباد کریں گے۔ چندرا کو غور کرنے کا موقع مل جائے گا۔“

انکارانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے اپنے پنجے اتنی شدت سے میرے سر میں چھوئے کہ میں سنبھل نہ سکا۔ میری نظروں کے نیچے گھپ اندھیروں کے بادل تیرنے لگے.....!!



میرے ذہن پر طاری دُھند آہستہ آہستہ چھٹ رہی تھی۔ ایک ہلکی سی ملکبی چادر جیسی ہار کی اب بھی درمیان میں حائل تھی۔ اس تاریکی کے اُس پار میرا ماضی دفن تھا۔ میری کتاب زندگی کے اوراق جا بجا بکھرے پڑے تھے، ان پر حالات اور گزرتے وقت کی گرد جم چکی تھی۔ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ پڑھنے والے میری داستان کا کیا اثر قبول کریں گے؟ جس کے دل پر گزرتی ہے، تکلیف کی شدت کا اندازہ اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں لگا سکتا۔ تنقید کرنا، بال کی کھال نکالنا بڑا آسان کام ہے۔ اپنی کرنی انسان کو سوئی جیسی لگتی ہے۔ کوئی دوسرا وہی غلطی کرے تو شہتیر بن جاتی ہے۔ میں شکوہ نہیں کر رہا، مجھے شکوہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ روزِ محشر دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو جائے گا۔ سب کے افعال تانے اُن کے اپنے اپنے ہاتھوں میں ہوں گے۔ وہاں تنقید کرنے کی اجازت نہیں ہو گی، جسم کا ایک ایک عضو گواہی دے گا، انکار کرنے کی جسارت کسی مائی کے لال میں نہیں ہو گی، سب دم سادھے کھڑے ہوں گے، اپنی اپنی فکروں سے اتنی مہلت ہی نہیں ملے گی کہ دوسروں کی طرف دیکھ سکیں، دوسروں میں کیڑے نکال سکیں..... یہ گل افشائیاں، یہ چھیڑ چھاڑ، ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا، اپنے عیبوں پر پردہ ڈالنا، دوسروں کی خامیوں کا اُھنڈورا پیٹنا، محفلوں میں بیٹھ کر ڈینگیں مارنا، اپنی امارت کا اظہار کرنا، غیروں پر پھتیاں کرنا، جیلے بازی کرنا، طاقت کے بل پر اُچھلنا کودنا، یہ سب کچھ یہیں، اس دنیا میں رہ جائے گا۔ وہاں دوسروں کی عزت پر شب خون مارنے کی اجازت نہیں ہوگی، کسی کی بہو بیٹیوں کے سر سے دوپٹہ کھینچنے کی مجال نہیں ہوگی، دھن دولت کسی کام نہیں آئے گی۔ قانون کی خرید و فروخت کا کاروبار نہیں چلے گا۔ دنیا دکھاوے کو اشک شوئی کرنا، ڈھونگ اور ناکمل بچانے کے مواقع نہیں ملیں گے۔ ”بغل میں چھری اور لب پر رام رام“ کی ساری کہانیاں بھری کی دھری رہ جائیں گی۔ سارے کچے چٹھے مثل آئینہ روشن ہوں گے، ساری قلعی اُتر



دھج کر انجان بننا اور بات ہے، مجھے کسی اور کی نہیں اپنی قبر میں جانا ہے۔ میری سرگزشت بھی میرے پیش نظر ہے۔ میری کہانی بڑی رنگین ہے لیکن اس کے نتائج رنگین نہیں، سنگین ہوں گے۔ میں نے بھی اپنی پارسیائی کا دعویٰ نہیں کیا، میں نہیں جانتا کہ میری داستان بڑھنے والے اس کا کیا تاثر قبول کریں گے۔ لیکن ایک حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہوگا، میں نے ایک عام آدمی کے مقابلے میں زیادہ نامساعد حالات میں زندگی بسر کی ہے۔ میں نے جان بوجھ کر اس جہنم میں چھلانگ نہیں لگائی تھی، انکارانی میرے سر پر خود سے آئی تھی، اس میں میری مرضی، میری خواہش کو کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ بے پناہ پراسرار قوتوں کی مالک تھی، اُس کے پنجے جب جلد میں چبھتے ہیں تو میرا ذہن ماؤف ہو جاتا ہے، ذہن ماؤف ہو تو انسان صحیح اور غلط میں تمیز نہیں کر سکتا۔ طاقت کا تصور، دوسروں پر برتری کا احساس، دولت، عزت اور شہرت کا نشہ یہ سب باتیں انسان کو بہکا دیتی ہیں، اندھا کر دیتی ہیں۔ میں نے شروع میں ضرور کترانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ”خون کا مزہ“ منہ کو لگ جانے کے بعد میں بھی بہک گیا، اندھا ہو گیا، درندہ بن گیا..... میں نے اپنی داستان کا کوئی حصہ چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ جو واقعات رونما ہوئے، جس تو اتر سے پیش آتے رہے اسی ترتیب سے بے کم و کاست قلم بند کرتا رہا۔ میں نے جو صدمے برداشت کئے، جن اذیتوں سے گزرا، جن حیرت انگیز اور ناقابل یقین واقعات اور مشاہدات سے میرا واسطہ پڑا ہے اسے انسان کا ذہن قبول نہیں کرتا۔ کبھی کبھی خود مجھے بھی ایسا شبہ ہوتا ہے جیسے جو کچھ میں نے دیکھا، جو میرے اوپر گزری وہ سب میرا وہم تھا..... خواب رہا ہوگا.....!

میرے پاس انکارانی کی عجیب و غریب قوت تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے کم اور انکارانی کی آنکھوں سے زیادہ دنیا کے نشیب و فراز دیکھے۔ اُسی کی نظروں سے انسان کو اندر سے کھگانے کی کوشش کی۔ میری یہ داستان جب آخری موڑ پر پہنچے گی تو شاید آپ مجھ سے بہتر کوئی نتیجہ اخذ کر سکیں، میں نے کیا کھویا؟ کیا پایا؟ کیا گنوا دیا؟ کیا حاصل کیا.....؟ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ پنڈت پجاریوں کی دشمنی نے ہندوستان کی سرزمین کے چپے چپے پر میرے دشمن پیدا کر دیئے تھے، مجھے کہیں قدم جمانے، کہیں سر چھپا کر دو گھڑی سستانے کی ہمت نہیں تھی۔ میں کسی ستارے کی طرح روز و شب گردش میں رہتا تھا۔ مچھلی کا ٹانگل لینے کے بعد شکاری کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ بخشی پر آنے سے پیشتر وہ اپنا پورا زور لگاتی ہے،

جائے گی، غازہ، لپ اسٹک اور پاؤڈر..... سارا میک اپ ڈھل جائے گا۔ اصلیت کھل کر سامنے آ جائے گی۔ روز و شب کی تمام تفصیل، ساری روداد سامنے ہوگی۔ انجام کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا، وکیلوں کے دفتر کے چکر نہیں کاٹنے ہوں گے، منصف کے قلم پر ”نا قابل فروخت“ لکھا نظر آ جائے گا۔ ایک منصف ہوگا، اُس کا ایک ہی فیصلہ ہوگا۔ اس پر عملدرآمد میں پلک جھپکنے کی تاخیر بھی نہیں ہوگی۔

وہاں پنڈت امر لال، بدری نرائن، برکاتی شاہ، سید مجذوب، میں اور آپ سب ایک قطار میں، ایک ہی صف میں سر جھکائے باادب کھڑے ہوں گے۔ نہ انکارانی کا زور چلے گا، نہ پریتیم لال اور سادھو جگدیو کے جنتر منتر کام آئیں گے۔ نندا اور کمپال بھی سرنگوں ہوں گے۔ کچھ چہرے مثل آفتاب چمک رہے ہوں گے، کچھ بے گناہ ہونے کے باوجود اُس کے قہر سے لرزیدہ ہوں گے، کانپ رہے ہوں گے۔ وہاں ماضی، حال اور مستقبل کا کھیل ختم ہو جائے گا۔ سارے سودے، سارا کاروبار ہاتھ کے ہاتھ ہوگا، نقد کام ہوگا۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے.....! ”میاں کی جوتی میاں کے سر“ کی مثال کا اصل مطلب واضح ہو جائے گا۔ احتجاج کی گنجائش نہیں ہوگی۔ سارے شور و شرابے، ساری اُچھل کود، نام و نمود کی پھلچھڑیاں صرف زمین پر اپنی چھب دکھا سکتی ہیں، آسمانوں پر اُس کا نظام بڑا صاف و شفاف ہوگا۔ کسی پرندے کو پر مارنے کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔ محض نام کے ساتھ پیر زادہ، عادل زادہ یا امیر زادہ لگا لینے سے کام نہیں چلے گا..... اُلٹے سیدھے بیان داغنے کی مہلت نہیں ہوگی۔ جو بویا ہے وہی کاٹنا پڑے گا۔ پیر پیغمبروں کے متبرک اسمائے گرامی.....

اولیاء، انبیاء..... اور خدا کے برگزیدہ بندوں کے ناموں سے ملتے جلتے ناموں کو جنت کی سند نہیں حاصل ہوتی۔ لوگوں نے دستور بنا لیا ہے کہ بچوں کا نام رکھتے وقت بڑی بڑی کتابوں کو کھنگالا جاتا ہے، جو نام فہرست میں شامل کئے جاتے ہیں، صرف ان کے صوفی حسن کا خیال ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے، اس کی عظمت اور احترام کو بالائے طاق رکھ کر ان ناموں کے جز یا اجزاء کو کلی پھندوں کی طرح نو مولود کے نام کے ساتھ نتھی کر دیا جاتا ہے۔ ان باتوں سے بخشش نہیں ہوتی۔ سب دل کے بہلاوے ہیں، ڈھکوسلے بازی ہے، بس ایک بات سن لو، گرہ سے باندھ لو..... ”سب ٹھانڈ پڑا رہ جائے گا جب لاڈ چلے گا بخارا۔“ میں کوئی لاطینی زبان نہیں بول رہا، فلسفہ نہیں بگھار رہا جو بات سمجھ میں نہ آ سکے۔ جانا

تڑپتی ہے، پھر پھڑپھڑاتی ہے۔ میری کیفیت بھی اسی سے ملتی جلتی تھی۔ میں بے دست و پا ہو جاتا تو میرے دشمن کے کلیجوں میں ٹھنڈک پڑ جاتی۔ میں ذرا آسودہ حال ہوتا تو وہ پھر میرے گرد اپنا گھیرا ڈالنا شروع کر دیتے۔ مجھے اپنے بچاؤ کے لئے پھر ہاتھ پھیر چلانے پڑتے۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجا کرتی..... کون ہاتھ قصور وار ہوتا ہے کون بے قصور؟ یہ جھگڑا ازل سے چل رہا ہے، ابد تک جاری رہے گا..... سیاہ و سفید کا فیصلہ زمین پر نہیں آسمان پر ہوگا۔ اپنے منہ میاں مٹھو بن کر اترانے سے قلبی سکون نہیں ملتا..... ایسا کرنے والے خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں.....!!

میں اُس وقت بھی بڑا بے سکون تھا جب ملگجی باریک چادر کی تاریکی بھی رفتہ رفتہ دُور ہو گئی۔ میرا ذہن پوری طرح کام کرنے لگا۔ میں حیرت سے اس آرام دہ کمرے کو دیکھنے لگا جہاں ایک درمیانے درجے کے آدمی کی ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ مجھے یاد آیا، میں نے ہر دو درمیانے درجے کے بڑے مندر کے سامنے اپنے ایک دشمن پنڈت نول کشور کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ دو تین پنڈت پجاری اور بھی بلاوجہ ہمارے درمیان آکر پس گئے تھے۔ مجھے اُن کی موت کا کوئی غم نہیں تھا۔ نول کشور کی موت میرے لئے باعث مسرت تھی۔ میں اُس کی لاش پر چتا کی آگ تک پہنچنے سے پہلے اپنی کامیابی کا جشن منانا چاہتا تھا۔ سید نے بھی اشارے کنایوں میں تالی بجانے اور ترکنے کا ذکر کیا تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا؟ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ مگر میری یہی خواہش تھی کہ دو چار ٹھمکے ضرور لگا لوں۔ مگر اس کی فرصت نہیں ملی..... نول کشور کی موت کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا، وہ کالی کے بڑے مندر کا پروہت تھا، اُس کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوگی۔ پنڈت پجاری مندر کے تہہ خانوں میں چھپ کر بیٹھ گئے ہوں گے۔ اُن کے دل تا دیر سینوں میں دھڑکتے رہے ہوں گے..... کسی نے پولیس کو فون پر اطلاع دی ہوگی کہ ایک مسلمان نے ایک ہندو پنڈت کو مار ڈالا۔ ہر طرف تہلکہ مچا ہوگا، قانون کے محافظوں کے ذہن بھی تعصب کا شکار ہو گئے ہوں گے۔ اسی تعصب کی آڑ میں بے گناہ مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگانے کا سنہری موقع بھی بلوائیوں کے ہاتھ آ جاتا ہے۔ انتہا پسند اپنی اکثریت کی بنیاد پر کمر کس کر مردانگی دکھانے کی خاطر میدان میں نکل آتے ہیں، دُکانیں لوٹی جاتی ہیں، عصمتیں روندی جاتی ہیں، معصوم اور نوجوان لڑکیوں کو سر بازار رنگا کر دیا جاتا ہے، ان کے ہاتھ پشت پر باندھ

یے جاتے ہیں۔ وہ اجتماعی زیادتی کا برملا مظاہرہ کرتے ہیں، اپنی بہادری پر شیطانی قہقہے بکرتے ہیں۔ بوڑھے اور ضعیف لوگوں کا بھی قتل عام شروع ہو جاتا ہے، شیر خوار بچوں کے حلق میں چھرے گھونپ دیئے جاتے ہیں، حکومت کے ماتھے پر بھی بل آ جاتا ہے۔ پڑھے لکھے سیاستدان بھی بیان داغنے وقت مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں، تعصب کا الزام ابتداً اقلیت پر ہی لگایا جاتا ہے، اکثریت کے خلاف زبان کھولنے والے مافیا کے دہشت گردوں کے ہاتھوں مار دیئے جاتے ہیں۔ جان بوجھ کر کون اپنی موت کو دعوت دیتا ہے.....؟ میرے ذہن میں آندھی چل رہی تھی، مجھے سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ میں نے دیکھ کو مندر

کی جانب جان بجا کر بھاگتے دیکھ کر اپنا ہاتھ اٹھایا تھا، شیوانے اُس کی زندگی کی سفارش نہ کی ہوتی تو وہ بھی کام آگیا ہوتا..... میں نے شیوانے کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دی تھی، اُس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بڑی جوانمردی سے میری پیشکش رد کر دی۔ اُس نے کالی کے زونوں میں آنکھیں کھولی تھیں، اُسی کے چروں میں مرنے کا خواہش مند تھا۔ میں اُسے ہٹل کرنا چاہتا تھا کہ وہ غلطی پر ہے، کالی کا مندر اُس کے لئے منقل گاہ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ سینکڑوں لوگ گواہ بن چکے تھے کہ پنڈت نول کشور کے قتل کی ذمہ داری شیوانے پر بھی عائد ہوتی تھی۔ اُس نے مجھے مار دیا ہوتا تو کہانی وہیں ختم ہو جاتی۔ پنڈت پجاری اُسے کا ندھوں ہٹھا لیتے، جلوس کی شکل میں گلی کوچوں میں چکراتے پھرتے، شیوانے کے نام کی ”جے جے کار“ گونج رہی ہوتی۔ وہ نول کشور کا نائب بھی مقرر کیا جاسکتا تھا۔ لیکن شیوانے ایسا نہیں کیا، وہ مرد تھا، اُس کی رگوں میں زخموں کا خون نہیں، کسی خاندانی باپ کا خون گردش کر رہا تھا۔ میں نے اُس پر جو احسان کیا تھا، شیوانے اس کا حساب برابر کر دیا۔ میرے ہاتھ کی ٹشیں کاٹتے وقت اُس کا دل ضرور دھڑکا ہوگا، اُسے علم رہا ہوگا کہ وہ اپنی موت کے بنانے پر خود اپنے خون سے اٹھٹھا لگا رہا ہے۔ لیکن اُس کے قدم نہیں ڈمگ گئے، وہ موت سے نہیں ڈرا..... بازی میرے حق میں پلٹ گئی، نول کشور کام آگیا، اُس کی موت اذیتناک نہ تھی..... اور شیوانے اسی کالی کے مندر میں واپس جانے کی بات کر رہا تھا جہاں ہر کوئی اُس کے خون کا پیاسا ہو رہا ہوگا..... میں اُسے سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ غلط فیصلہ کر رہا ہے لیکن مجھے نہ کی مہلت نہیں ملی۔ پولیس کی سائرن بجاتی گاڑیاں گردش میں آ گئیں۔ میں جائے اُردات سے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جاتا تو شاید شیوانے کی گواہی بھی میرے کسی کام نہ آتی،

ہزاروں چشم دید گواہ میرے خلاف زہر اگلنے کو آمادہ ہو جاتے۔ اُن کی جگہ میں ہوتا تو شاید میں بھی وہی کرتا۔ لیکن انکارانی نے میرے سر پر واپس آ کر اپنے تیز پنجے میرے سر میں چبھو دیئے۔ میرے سامنے گھپ اندھیرا پھیل گیا۔ میری بجائے پولیس کے ہرکاروں نے شیوا کو حراست میں لے لیا ہوگا، اُس پر ظلم توڑ رہے ہوں گے اور..... میں ایک آرام دہ کمرے کے بستر پر پڑا چھت کو گھور رہا تھا جب ایک مردانہ آواز میرے کانوں میں گونگی۔

”اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“

میں نے پلٹ کر دیکھا، میری آنکھیں نمناک ہونے لگیں..... میں رکن الدین کی حویلی میں تھا۔ ایک مدت کے بعد رکن الدین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود مجھ سے بڑی عزت و احترام سے مخاطب ہوا تھا۔ اُس کی حویلی سے میری زندگی کی بہت ساری خوشگوار یادیں وابستہ تھیں، رکن الدین نے میرا بڑا ساتھ دیا تھا۔ اپنی حویلی کے دروازے میرے اوپر کھول دیئے تھے۔ جہیں پہلی بار میری اور سید مجذوب کی ملاقات بھی ہوئی تھی جس نے میری زندگی میں تلاطم پیدا کر دیا تھا۔ اور بھی بے شمار یادیں تھیں جو میرے ذہن میں کروٹیں بدل رہی تھیں۔

کلدیپ کے مرنے کے بعد مجھے زندگی سے نفرت ہو گئی تھی۔ جین لندن سے نہ آ جاتی تو میں بمبئی کے کسی فنٹ پاتھ پر ہی گھسٹا گھسٹا دم توڑ دیتا۔ جین نے جھولی پھیلا کر مجھ سے اپنے لئے میری زندگی کی بھیک مانگی، میں انکار نہ کر سکا۔ ہندوستان سے رخصت ہونے وقت میں نے ایک ترمین کے سوا سب کی یادیں کو کھرچ کر ذہن سے نکال دیا تھا۔ انکارانی نے ایک ترمین کے ساتھ نہیں لے گیا تھا، اُس وقت میرا خیال تھا کہ دوبارہ کبھی ہندوستان کے جنم میں پلٹ کر نہیں آؤں گا۔ لیکن پریم لال نے کلدیپ کی بے چین رُوح کا ذکر چھیڑ کر مجھے واپسی کے سفر پر آمادہ کر دیا۔ اب قسمت مجھے دوبارہ رکن الدین کی حویلی لے آئی تھی۔

انکارانی نے ایک لمبی جست بھری تھی، ہر دروازے گلیز گزرتے..... دہلی لے جاتی تو میں ایک بار پھر خواجگان کی چوکھٹ پر پیشانی رگڑ رگڑ کر اپنے ماضی کے گناہوں سے توبہ کر لیتا۔ آگ لے جاتی تو تاج محل کا نظارہ ہی کر لیتا، یہ بھی محسوس کرنے کی کوشش کرتا کہ ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر کس کس انداز و زوایوں سے غریبوں کی محبت کا مذاق اڑانے کی کوشش کی ہے۔ اجیر میں کچھ دنوں قیام ممکن ہوتا تو وہاں بھی زیارتوں سے مستفید ہو لیتا، بزرگان

بن کے مزاروں پر حاضری کی سعادت حاصل کر لیتا۔ بمبئی واپسی ممکن ہو جاتی تو ترمین کو یاد دیکھ لیتا۔ ایک وہی تو تھی جو میری زندگی کا سب سے قیمتی اور انمول نگینہ تھی۔ اشرفی بیگم نے اُسے چھیننے کی خاطر کیا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ میری اور میری کلدیپ کی مشترکہ منظور نظر فی۔ اُس کو دیکھ کر نرس کی یاد آ جاتی تھی..... ترمین کو یاد کر کے میں بے چین ہونے لگا۔ ہری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انکارانی نے اتنی لمبی چھلانگ کیوں لگائی تھی؟

”کس غور و فکر میں مبتلا ہیں محترم.....؟“ رکن الدین نے میری مسہری کے قریب آ کر بی محبت سے دریافت کیا۔

”میں یہاں کب آیا تھا.....؟“ میں نے رکن الدین کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”کل رات ہی کی بات ہے جب آپ نے اس حقیر کی حویلی کو دوبارہ عزت بخشی.....“ رکن الدین کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”طلعت نے دروازے پر جا کر آپ کا نام دریافت کیا، پھر وہ خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ اُس نے آپ کی آمد کی اطلاع دی تو مجھے یقین نہیں آیا۔ آپ کی طبیعت اُس وقت ٹھیک نہیں تھی، تھکے تھکے نظر آ رہے تھے۔ میں نے گھر کے تمام افراد کو منع کر دیا کہ کوئی آپ کو پریشان نہ کرے۔ آپ بستر پر لیٹتے ہی بے خبر ہو گئے تھے، ہم نے آپ کو جگانا مناسب نہیں سمجھا.....“

”مجھے کچھ خبر نہیں.....“ میں نے طویل سانس لے کر جواب دیا۔

”اتنے دنوں کہاں رہے.....؟“

”پاؤں میں چکر ہو تو انسان ایک جگہ نہیں ٹک سکتا۔ میں بھی گولوں کی طرح گردش کرتا رہا۔“

”پچھلی بار سہراب اور پریم آئے تھے تو اُن کی زبانی خبر ملی تھی کہ کوئی میم آپ کو اپنے ہاتھ لندن لے گئی تھی۔“ رکن الدین نے دبی زبان میں پوچھا۔

”ہاں.....“ میں نے بھی آواز میں اقرار کر لیا۔ ”ہندوستان سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔“

”واپسی کب ہوئی.....؟“ رکن الدین نے استفسار کیا۔

”اب تو ٹھیک سے یہ بھی نہیں یاد رہا.....“ میرے لہجے میں کرب بھی شامل ہو گیا۔

”آپ نے اچھا کیا جو غریب خانے کا رخ کیا۔“ رکن الدین نے بڑے خلوص سے

کہا۔ ”یہاں آپ کی طبیعت بہل جائے گی۔“

”شاید.....“ میں نے مختصر کہا۔

”اب آگئے ہیں تو واپسی میں جلدی نہ کیجئے گا۔“

”ایک ضروری کام باقی رہ گیا ہے۔“ میں نے چندرا کے بارے میں سوچتے ہوئے

سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”اُسے نمٹالوں تو پھر کہیں تک کر بیٹھنے پر غور کروں گا۔“

”ہمیں چار روز سے آپ کی آمد کا انتظار تھا.....“ رکن الدین معنی خیز انداز میں

سُکرائے لگا۔

”کیا مطلب.....؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”چار روز پیشتر سید آیا تھا، اُس نے کہا آپ آنے والے ہیں۔“

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سید مجذوب کا ذکر سن کر گویا میرے ناتواں جسم میں خوشی کی لہر دوڑ

گئی۔ وہ مجھ سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ خدا کا برگزیدہ بندہ تھا، خدا کے عشق میں ڈوب گیا تھا،

جذب ہو کر مجذوب بن گیا تھا۔ وہ بہت سارے بھیدوں سے واقف تھا، اُس کی نظروں نے

دیکھ لیا ہوگا کہ میرے اوپر کیا گزرنے والی ہے۔ اُسے حالات کی پیشگی اطلاع ہوگی۔ اسی

نے پنڈت نول کشور کو مندر سے باہر نکالنے کا طریقہ بتایا تھا۔ میں نہ سمجھ سکا، اُلجھتا رہا۔ اگا

رائی بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ پھر نول کشور کا قصہ پاک ہو گیا۔

”کیا سوچنے لگے.....؟“ رکن الدین نے مجھے خیالوں میں ڈوبا دیکھ کر پوچھا۔

”سید آتا رہتا ہے.....؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ہاں۔ وہ خواجہ کی چوکت کا دیوانہ ہے، اُسی کے آس پاس بھٹکتا رہتا ہے۔ مجھ پر بھی

اُس کی نظر عنایت ہے، آتا رہتا ہے۔“

”بھابھی صاحبہ کیسی ہیں.....؟“ میں نے بیگم رکن الدین کی خیریت دریافت کی۔

”وہ آج کل ناہید کے پاس گئی ہوئی ہیں۔“

”یہ غلط بات ہے ابا حضور.....“ طلعت نے اچانک سامنے آ کر شکوہ کیا۔ ”آپ نے کہا

تھا کہ ہمیں فوری خبر کریں گے۔ مگر آپ تو بات کرنے بیٹھ گئے۔“

اُس کے لہجے میں شوخی تھی۔ اتنے دے قدموں کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ مجھے ہنک

بھی نہ ملی۔ میں نے اُسے پیار سے دیکھا تو دوڑ کر اُس نے اپنا سر میرے کاندھوں پر رکھ

بیا۔ میں شفقت سے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اچانک میری نظروں میں دو

ہانے پچانے چہرے اور آگئے۔ وہ دونوں بھی رکن الدین کے عقب سے آہستہ آہستہ نمودار

ہوئی تھیں۔ شاید طلعت کے ساتھ وہ بھی چھپی بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھیں۔ اُن کو دیکھ کر

ہاضی کی اور بہت ساری تلخ و شیریں یادیں ذہن کے پردوں پر ابھرنے لگیں۔

وہ زرافشاں اور درخشاں تھیں جنہیں میں پیار سے زری اور رخشی کہا کرتا تھا۔ میں نے

انہیں ہاتھ کے اشارے سے قریب بلا لیا، وہ شرماتی لجاتی قریب آگئیں۔ طلعت علیحدہ

ہوئی تو وہ دونوں مجھ سے لپٹ گئیں۔

”کیسی ہوزری.....؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کی دُعا سے خیریت سے ہوں.....“ اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”جھوٹ.....“ طلعت شوخی سے بولی۔ ”اب تو اس کی خیریت ہم سب کو خدا سے نیک

مطلوب ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے رکن الدین کی سمت دیکھا۔ طلعت کی بات کا مطلب میرے

ذہن میں کچھ کچھ آ رہا تھا۔

”میں نے زرافشاں کی بات ایک نہایت مناسب رشتہ دیکھ کر پکی کر دی ہے۔“ رکن

الدین نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”آپ آگئے ہیں تو اب دو ایک روز میں تاریخ بھی پکی کر دوں

گا۔“

میں نے زرافشاں کی طرف دیکھا، وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ اُس کے ہونٹوں کے

گداز پر بڑی شرمیلی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ نکمکیوں سے طلعت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

شاید یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ ”بکرے کی ماں بھی کب تک خیر منائے گی۔ کسی نہ کسی گھر میں

تہارے اے بھی چھری پر دھار رکھی جا رہی ہوگی۔ موقع آنے دو، میں نے گن گن کر بدلہ

نہ لیا تو نام بدل دینا.....“

”میرے انتظار میں وقت ضائع نہ کریں۔“ میں نے کہا۔ ”جو کام جتنی جلدی ہو جائے

اتنا ہی اچھا ہے۔“

”نیک کام میں دیسے بھی دیر نہیں کرنی چاہئے..... کیوں جھوٹے ابا.....؟“ طلعت نے

میری طرف دیکھ کر پہلی بار چھوٹے ابا کے خطاب سے نوازا تو میرے دل کی پامال حسرتوں

جاتی۔ طلعت ہر وقت چمکتی پھرتی تھی۔ زرافشاں اور درخشاں بھی میرے آجانے سے بے خوش تھیں۔ ہر وقت میری آؤ بھگت ہوتی رہتی، زندگی کے ان ہنگاموں میں مجھے کلدیپ کی یاد آتی تو دل موسوس کر رہ جاتا۔ کبھی زنگس ہنستی مسکراتی سامنے آکھڑی ہوتی، کبھی پریم ال والی مالارانی کی سرگوشی میرے کانوں میں اُبھرتی.....

”پران ناتھ، مجھے شما کر دینا۔ نصیب نے مجھے اتنا سے نہیں دیا کہ میں تن من دھن سے نہاری سیوا کر سکتی۔ دوسرا جنم ملا تو سارے قرض چکاؤں گی۔“

میں ماضی اور حال کے ایسے سنگم پر کھڑا تھا جہاں کبھی سائے مجھے ٹھنڈک پہنچاتے تو میرا دل باغ باغ ہو جاتا، کبھی دھوپ کی تمازت میرے وجود کو جھلسانے لگتی۔ مستقبل کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ شاید انکارانی واقف ہو۔ سید مجذوب جانتا ہو۔

رکن الدین کی حویلی میں تین دن گزر گئے۔ انکا انی ابھی تک واپس نہیں لوٹی تھی، مجھے اس کی فکر لاحق تھی۔ وہ ہر دوار میں بری طرح اُلجھ گئی ہوگی۔ پنڈت نول کشور اور دو تین پنڈت پجاریوں کی لاشیں دیکھ کر ہریانہ اور کرناٹک کے علاوہ امر وہا اور دہلی تک پولیس کے ٹکے چوکس ہو گئے ہوں گے۔ ہر دوار کے سارے پولیس اسٹیشن ہل گئے ہوں گے، بڑے پانے پر چھان بین شروع ہو چکی ہوگی۔ شہجے کی بنیاد پر کئی مسلمانوں کو بے قصور اُن کے گھروں سے اٹھایا ہوگا، اُن پر تشدد کر کے بال کی کھال نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ بھون کے منیجر جھنڈاری کو بھی دھریا گیا ہو۔ اُس کا قصور اتنا تھا کہ میں نے اس کے ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ پنڈت شیوا کو بھی نہیں بخشا گیا ہوگا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس کی زبان پر میرا نام نہیں آیا ہوگا۔ اگر اُسے میری بربادی منظور ہوتی تو میری بندشوں کو کاٹنے کی غلطی کبھی نہ کرتا۔ اُس کا ہاتھ بہکا نہیں تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر مجھے نول کشور کے نظربانک سحر کی سلاخوں سے باہر نکالا تھا۔ میں نے اُس کی جان بخشی تھی، وہ حساب برابر کرنے کی ٹھانے بیٹھا تھا۔

دیکھا جائے تو پنڈت نول کشور خود اپنے اعتماد کا شکار ہوا تھا۔ اُس نے گلے سے جینو اتار کر جنتر منتر پڑھ کر میری طرف پھینکا تھا۔ اُسے اپنے مقصد میں مایوسی نہیں ہوئی۔ جینو کی دُور نے مجھے رستی بن کر جکڑ دیا تھا۔ جنگ اور جدل کے میدان میں زنگی اور موت گے فیصلے پلک جھپکتے میں ہو جاتے ہیں۔ اگر نول کشور کے برابر کھڑے ہوئے پنڈت نے اس

میں ابال آنے لگا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے پلکوں کی اوٹ تک آجانے والے آنسوؤں کو روکا، اُس کا چھوٹے ابا کہنا مجھے اچھا لگا۔ تزئین مجھے بابا کہا کرتی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ اگر حویلی میں ایک بار ہی دل کھول کر دھوم دھام کر لی جائے تو زیادہ مناسب رہے گا۔“ میں نے رکن الدین کی جانب دیکھ کر دبی زبان میں کہا، وہ میری بات کا مفہوم سمجھ گیا۔ طلعت مجھے خونخوار پلی کی طرح گھورنے لگی۔

”ابھی میں نے آپ کو کتنے پیار سے چھوٹے ابا کہا تھا اور آپ نے جھگڑے کی بات شروع کر دی۔“ اُس کی ٹھکی میں بھی محبت اور اپنائیت کے رنگ جھلک رہے تھے۔

”میں آپ کے مشورے سے متفق ہوں۔“ رکن الدین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ایک دوڑ کے ہیں میری نظر میں۔ میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ تینوں بچیوں کے ہاتھ ایک ساتھ پیلے کر دوں۔“

”ایک نہ شد..... دو شد۔“ طلعت نے کڑوا سا منہ بنا کر جواب دیا، پھر تینوں لڑکیاں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر زنان خانے کی طرف چلی گئیں۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب ایک بار پہلے بھی رکن الدین کی حویلی میں کئی لڑکیوں نے دُہنوں کے زرق برق لباس پہنے تھے، اُن کے دُہاؤں کے سر پر سہرے کی بہار منڈلائی تھی، پھر سب نکھر گئے۔ تزئین کو سید غوث کے عقد میں دیا گیا، سہراب اور پریم کا ہاتھ تھام کر زندگی کے ہم سفر بن گئے، آئندال اور مالا کی شادی بھی اُن کے رسم و رواج کے مطابق حویلی میں ہی انجام پائی۔ باقاعدہ لگن منڈپ سجایا گیا، دونوں نے دامن باندھ کر اگنی کے گرد سات پھیرے پورے کئے۔ پنڈت نے آکر ساری رسمیں پوری کرائی تھیں، چچا جان نے جیلہ کو اپنی بہو بتالیا۔ شادیوں کے سارے اخراجات رکن الدین نے برداشت کئے۔ وہ بڑا انسان ہونے کے ساتھ ساتھ کشادہ دل بھی تھا۔ میں نے اُس کا ہاتھ بٹانا چاہا، انکا کی موجودگی میں دولت کی ریل پیل بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن رکن الدین نے مجھے منع کر دیا۔

مجھے شمین خان اور شاردہ کی یاد بھی آئی۔ شمین خان کا نام میں نے شہر خان رکھ دیا تھا۔ شاردہ اپنی خوشی سے حلقہ اسلام میں داخل ہو گئی۔ اُس کا نام یاسمین رکھا گیا۔ اُن کی شادی کے موقع پر بھی رکن الدین نے بڑی فراخ دلی کا ثبوت پیش کیا تھا۔

گلبرگہ آکر میری طبیعت بہل گئی۔ تزئین اور سید غوث بھی موجود ہوتے تو رونق دو بالا ہو



”ہر دوار میں کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے اُس کی بات ٹال کر پوچھا۔

”خاک اُڑ رہی ہے.....“ سید نے دیدے نچاتے ہوئے جواب دیا۔ ”تو نو دو گیارہ ہو

گیا..... وہ پھدکتی پھر رہی ہے..... شیطان کی خالہ۔“

”وہ میرا پچھا نہیں چھوڑیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”تم کوئی راستہ دکھا دو۔“

”ٹیلے پر چڑھ جا..... رسیاں تڑا کر بھاگ لے۔“

”تم نے پھر مجھے الجھانا شروع کر دیا۔“ میں نے شکوہ کیا۔ ”مجھے اُنکی پکڑ کر اپنے ساتھ

لے چلو..... تم جو کہو گے میں وہی کروں گا۔“

”بتوڑے..... بزرگوں کے ساتھ بھی کٹکٹا لڑانے کی سوچ رہا ہے؟“ سید کے چہرے کا

رنگ بدلنے لگا۔

”تم میری بات نہیں سنو گے.....؟“

”کیا سناے گا..... ٹھہری یا دادرا.....؟“

”میں خود کشی کر لوں گا.....“ میں نے احتجاج کیا۔

”نزاکت جان بیوہ ہو جائے گی۔“ سید معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”ابھی دھاڑیں مارتا

رہ..... کپڑے پھاڑ کر رنگا ہو جا، پھر پتھر اٹھا کر سر پھوڑ لے..... سارا خون بہا دے، قوالی

میں جا کر ناچنا شروع کر دے۔“

”یہی سب کچھ کہنے کے ارادے سے آئے تھے.....؟“ میں نے اُسے گھورا۔ وہ سہم کر

اٹھ کھڑا ہوا۔

”کٹ کٹے.....“ اُس نے پھر دیدے گھمانے شروع کر دیے۔ ”جال ڈالنے کی ہانک

رہا ہے..... گرو گھنٹال..... اُلُو کی دُم فاختہ۔“

”کچھ اور نہیں کر سکتے تو چندرا کا پتہ ہی بتا دو۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔ ”ایک وہی

باقی رہ گیا ہے..... اُسے بھی ٹھکانے لگا دوں تو چھٹی ہو جائے گی۔“

”بارش ہوگی تو اور پودے نکل آئیں گے..... چٹانوں میں جا کر منہ چھپا لے..... رینکنا

شروع کر دے۔“

”پیر و مرشد، ایک بات کان کھول کر سن لو.....“ میں دوبارہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں راستہ

بھٹک گیا تو ذمہ داری تمہاری بھی ہوگی۔“

نازک مرحلے پر شیوا کا امتحان لینے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا، دھوتی میں چھپے شکاری چاقو کو شیوا کی طرف نہ اُچھالا ہوتا تو کہانی یقیناً مختلف ہوتی۔ نول کشور مجھے سنبھلنے کا موقع دینے کی حماقت کبھی نہ کرتا۔ اُس کے اگلے جنتر منتر کے پیر میری کتاب زندگی کے گرد سیاہ لکیروں کا مونا حاشیہ کھینچ کر نیچے جلی حروف میں ”سماپت“ یا ”ختم شد“ لکھ کر چھٹی کر دیتے۔ لیکن شیوا کے درمیان میں آ جانے سے وہ جھجکا ہوگا۔ شیوانے میری بندشیں کاٹ دیں..... میں نے نول کشور کی شہہ رگ کاٹ کر اُس کی زندگی ختم کر دی.....!!

پولیس کے حلقوں میں بے چینی پھیلی ہوگی۔ شیوانے زبان بند رکھنے کی قسم کھالی ہوگی۔ کالی کے مندر کے سینکڑوں بچاری، ہزاروں نگاہیں گواہ تھیں کہ قاتل میں تھا۔ انکارانی ایک وقت میں کسی ایک ہی سر پر جاسکتی تھی، وہ دن رات ایک سر سے دوسرے سر پر پھدکتی پھر رہی ہوگی، گواہوں کو منحرف کر رہی ہوگی، پولیس افسروں کے ذہنوں کو معطل کرنے میں مصروف ہوگی۔ اُس نے سب کے دماغ میں ایک ہی سوال اُبھارا ہوگا۔

”اگر قاتل جمیل احمد خاں تھا تو کہاں چھو منتر ہو گیا؟ زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا.....؟“

میں نے خود اپنے کانوں سے پولیس کی سائرن کاروں کی آوازیں سنی تھیں۔ پنڈت

نول کشور کی لاش دیکھ کر اُن کی پتلونیں ضرور ڈھیلی ہو گئی ہوں گی۔ اُن کے لاسکی نظام نے

حرکت میں آنے میں دیر نہیں کی ہوگی۔ ہوائی اڈوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر پولیس کے

پہرے بٹھائے گئے ہوں گے، دوسرے راستوں کی ناکہ بندی میں بھی غفلت کا مظاہرہ نہیں

کیا ہوگا۔ مسلمانوں کے علاوہ کچھ ایسے ہندوؤں کے گھروں کو بھی کھنگالا گیا ہوگا جن پر

”مسلم دوستی“ کی چھاپ لگی ہوگی۔ وہ چاروں طرف تیزی سے پھیل گئے ہوں گے، قریبی

شہروں کی پولیس کو بھی آگاہ کیا ہوگا، ہر طرف افراتفری کا سماں ہوگا۔ سب بغلیں جھانکتے پھر

رہے تھے۔ میں گلبرگہ میں بیٹھا طلعت، زرافشاں اور درخشاں کے ساتھ قہقہے لگا رہا تھا۔

ایک طرف صف ماتم پچھی تھی، دوسری جانب میں سب کی شادی کی باتیں کر رہا تھا۔

تین روز آرام سے گزر گئے۔ چوتھے روز میں سوکر اٹھا تو میری نظر سید مجذوب پر پڑی۔

وہ ایک طرف ٹانگیں سیٹھ رے ہاتھوں کے تکیے پر سر رکھے لیٹا تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر اٹھ بیٹھے۔

”مرغ با نگ دے چکا..... تو ابھی تک اننا غفیل ہے..... کن میلے.....“

”پھر بھونکنے لگا..... شروع کر دی ٹوٹکی.....“

”میں آخری دم تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا سید.....“ میں نے تنک کر کہا۔ ”میرے نامہ اعمال میں تمہارا نام بھی ضرور درج ہوگا۔ تم کب تک پہلو تہی کرو گے.....؟“

”قلعی کھل گئی..... ہو گیا ننگا..... آستین کے سانپ..... وہ رُوٹھ گئی..... اوپر چلی گئی تو کلیں کر رہا ہے۔“

”کون چلی گئی.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”تم کس کی بات کر رہے ہو؟..... تمہیں خدا کا واسطہ کھل کر سب کچھ کہہ ڈالو۔“

جواب میں سید نے ایک طویل انگڑائی لی، منہ سے بہتی رال کو آستین سے پونچھ کر بولا۔

”گھڑی کی آواز پر کان لگا دے..... ایک ٹانگ پر کھڑا ہو جا..... بارہ بج جائیں تو دریا میں چھلانگ لگا دینا..... اُس پار نکل جانا۔“

”تم نالنے کی باتیں کر رہے ہو..... میں حشر میں دامن گیر ہو جاؤں گا.....“

”بھٹ کنیا چبالے..... پارس پتھر بن جائے گا۔“ سید نے کھڑے کھڑے قلابازی کھائی، پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سید میرے ساتھ ”چھین چھپائی“ کا کھیل، کھیل رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کل کیا ہونے والا ہے، اُسے کھل کر بتانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ مجبور تھا، میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں چندرا کو ختم کر دیتا تو آخری حسرت بھی پوری ہو جاتی۔ پنڈت نول کشور کا انجام دیکھ کر باقی پنڈت پجاریوں کے حوصلے پست ہو گئے ہوں گے، وہ پناہ گاہوں میں دبکے بیٹھے ہوں گے۔ اُن کا کمپنی کمانڈر مارا گیا تھا، وہ فوری طور پر منظم نہیں ہو سکتے تھے۔ صرف نفری کام نہیں آتی، کوئی قائدانہ صلاحیت رکھنے والا رہبر ہو، تب بات بنتی ہے۔ کچھ بڑے پنڈت ممکن ہے کہ پنڈت نول کشور کی گدی سنبھال لیں کی تاک میں ہوں۔ کالی کے مندر کا بڑا پروہت ہونا بڑی نفع بخش آسامی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس مقام تک پہنچنے کی خاطر بھی کچھ وقت لگتا ہے۔ میں انہیں مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔

عین ممکن تھا کہ چندرا کو بھی بروقت نول کشور کی موت کی اطلاع مل گئی ہو..... اُس کا دایاں بازو کٹ چکا تھا، وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا ہوگا۔ میں اچانک اُس کے سر پر پہنچ جاتا تو وہ ضرور بوکھلا جاتا، میرا کام قدرے آسان ہو جاتا۔ انکارانی نے ہر دو ارم میں کہا تھا

کہ اُس کی دور بین نظریں چندرا کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہیں۔ میں نے سید سے دریافت کیا، وہ بھی نال گیا۔

ہندوستان کی پولیس پوری طرح فعال ہوگی، میری تلاش کا دائرہ وسیع کر دیا ہوگا، دوسرے صوبوں میں بھی جگہ جگہ جال ڈالے جا رہے ہوں گے۔ وہ میرے پتے ٹھکانوں سے واقف تھے۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا پولیس آفیسر رکن الدین کی حویلی تک پہنچ جاتا تو میں گرفتار ہو جاتا۔ رکن الدین کی عزت دو کوڑی کی بھی نہ رہ جاتی۔ مجھے پھر داؤ پیچ لڑانے پڑتے، وقت ضائع ہوتا رہتا۔ چندرا کو بھی قدم جمانے کا موقع مل جاتا۔

ناشتے کی میز پر میرا ذہن چندرا میں الجھا رہا۔ انکارانی کی طویل غیر حاضری میری الجھنوں میں اضافہ کر رہی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ آج دشمنوں کی طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے۔“ رکن الدین عمر سیدہ تھا، اُس نے میرے چہرے کے تاثرات کو پڑھ لیا۔

”میں جانے کی سوچ رہا ہوں۔“ میں روانی میں کہہ گیا۔

”کہاں.....؟“ کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ طلعت، زرافشاں اور درخشاں سب ہی کی نظریں میری جانب اٹھ گئیں۔

”ایسی بھی کیا جلدی ہے بڑے ابا؟“ طلعت نے پہل کی۔ ”ابھی تو آپ آئے ہیں۔“

”کم از کم طلعت کی بات طے ہو جانے تک تو انتظار کر لیتے۔“ زرافشاں نے طلعت کو چھیڑنے کی خاطر دبی زبان میں کہا۔

”میں آپ کو نہیں جانے دُوں گی۔“ درخشاں سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ ”کچھ ہمارا بھی حق ہے آپ کے اوپر۔“

”میں آپ کے معاملات میں دخل اندازی مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن میری بھی یہی گزارش ہے کہ بچیوں کی خوشی پوری ہونے تک ٹھہر جاتے تو اچھا تھا۔“ رکن الدین نے بڑی کسر نفسی سے کام لیا۔

”ایک ضروری کام درپیش ہے۔“ میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ”جلدی واپس لوٹ آؤں گا۔“

”آپ کی شکل میں اگر پھر وہ آ گیا تو.....؟“ درخشاں کا اشارہ رنج (جن) کی طرف

جواب ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کی زبانی سنی سنائی باتوں کو دہرا رہا ہے۔ صرف ایک شخص ہے مجھے جس کے سر پر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ بار بار سینہ تان کر اقرار کر رہا ہے کہ اسی نے پنڈت نول کشور کو ذاتی نوعیت کی دشمنی کی بنا پر قتل کیا ہے۔ تشدد کے باوجود اُس کا بیان بار بار یہی ہوتا ہے، قتل اُسی نے کیا ہے، کسی اور نے نہیں۔“

”وہ..... وہ کون ہے.....؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ میرے ذہن میں شیوا کا نام ابھرا۔ وہی ایک جیلا مرد تھا جو اس قسم کی بات کر سکتا تھا۔ میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ انکارانی نے میرے شبے کی تائید کی تو میں شپٹانے لگا۔

”گویا بات وقتی طور پر ٹل گئی ہے.....“

”شیوا کو اقبال جرم کی وجہ سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اُس پر فرد جرم بھی عائد کی جا چکی ہے۔ پولیس کا محکمہ اور عدالتی مشینری تعصب کی آگ بھڑک اٹھنے کے خیال سے بڑی تیزی سے معاملہ نمٹانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن وہ اندر ہی اندر تمہارے خلاف مواد بھی جمع کر رہے ہیں۔ پنڈت پجاریوں کے متضاد بیانات نے سب کو الجھا دیا ہے۔“

”شیوا کا کیا بنے گا.....؟“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”پنڈت نول کشور کے علاوہ تین اور لاشیں بھی موقع واردات سے ملی ہیں۔“ انکارانی نے کسمسا کر جواب دیا۔ ”پھانسی کا پھندا کسی نہ کسی کے گلے میں تو ضرور ڈالا جائے گا۔“

”میں حالات کی نوعیت کو سمجھ رہا ہوں۔ لیکن شیوا کو پھانسی نہیں ہونی چاہئے۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”سن رہی ہوں تم، میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”تم فکر مت کرو جمیل.....“ اُس نے مجھے یقین دلایا۔ ”شیوا ہمارا محسن بھی ہے اور بے گناہ بھی..... اُسے پھانسی کی سزا نہیں ہوگی۔ لیکن فی الحال جو کچھ ہو رہا ہے، اسے ہونے دو۔ بات ذرا دب جائے، دلوں کی آگ کچھ سرد پڑ جائے تو شیوا بھی دودھ کی مکھی کی طرح باہر آ جائے گا۔“

”کیسے.....؟“ میں جلدی میں سوال کر بیٹھا۔

”بالکل اسی طرح جس طرح تم اب تک بچتے رہے ہو۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”پریشان مت ہو۔ میں جب چاہوں گی بساط پلٹ دوں گی۔ شیوا کی گردن کی پیمائش کی ملتی جلتی کوئی اور گردن بھی بڑی آسانی سے مل جائے گی..... تمہارے دشمنوں میں سے ایک نفری اور کم ہو

تھا۔ میں مسکرا دیا۔

”خدا غارت کرے اُسے۔“ زرافشاں بولی۔ ”بڑا جنگ کیا تھا اُس نے.....“

”کیا مطلب؟ کیا میرے جانے کے بعد بھی.....؟“ میں نے درخشاں کی سمت سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جی ہاں.....“ رکن الدین نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”آپ کے جانے کے بعد بھی وہ بد بخت دونوں بچیوں کے پیچھے لگا رہا، ایک بار میری شکل میں حویلی تک آ گیا۔ درخشاں اور زرافشاں اُس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ خدا بھلا کرے سید کا کہ وہ عین وقت پر آ گیا۔ اُس روز سید نے اُس سے اپنی زبان میں کچھ گرما گرم بات کی تھی۔ پھر وہ دوبارہ حویلی کے قریب نہیں پھٹکا۔“

ہمارے درمیان رحیق کی بات ہو رہی تھی جب مجھے اپنے سر پر انکارانی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے عالم تصور میں دیکھا، وہ بے حد تھکی تھکی اور نڈھال نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں سے نیند کا خمار جھانک رہا تھا۔ میں جلدی جلدی ناشتے سے فارغ ہو کر ٹہلنے کا بہانہ کر کے حویلی سے باہر چلا گیا۔ انکا بھی موقع کی منتظر تھی۔ میں حویلی سے باہر نکلا تو اُس نے کہنا شروع کیا۔

”جمیل، حالات نے بڑی مخدوش صوت اختیار کر لی ہے۔ کالی کے مندر میں صف ماتم چمچی ہوئی ہے۔ پنڈت، پجاری، پجاریں اور دیوداسیاں سب ہی یک زبان ہو کر نول کشور کے قاتل کی گرفتاری کا زور مطالبہ کر رہے ہیں۔ کچھ پنڈت اور پجاریوں نے ہردوار کے بڑے پولیس اسٹیشن کے سامنے دھڑا دے رکھا ہے، سب کی زبان پر بار بار تمہارا نام آ رہا ہے، بڑے پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں آئی ہیں۔ شیوا اور بھنڈاری بھی گرفتار کر لئے گئے۔ میں پل پل سروں پر پھدکتی پھر رہی تھی، بھنڈاری نے میرے اشارے پر اس بات کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا کہ جمیل احمد خاں نام کا کوئی مسافر کبھی آئندہ بھون میں نہہرا تھا۔ اُس کے رجسٹروں میں تمہارے نام کا اندراج بھی نہیں تھا۔ پولیس کے اعلیٰ دماغ بھی چکرار ہے ہیں، یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی کہ جو پنڈت تمہارے بارے میں بڑے یقین سے قاتل ہونے کی بات کرتا ہے، وہی بعد میں مقدس گیتا ہاتھ میں لے کر کہتا ہے کہ اُس نے سرے سے نول کشور کو قتل ہوتے دیکھا ہی نہیں..... پولیس کے استفسار پر اس کا

مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ منڈل کھینچ کر اس کے اندر بیٹھ جائیں تو اور بات ہے۔ انہیں کسی معاملے میں دیوی کی حمایت حاصل ہو جائے تو بھی میں مجبور ہو جاتی ہوں..... اور میری شکتی کون چھین سکتا ہے؟“

”تم نے کسی پنڈت یا پجاری کا ذکر کیا تھا جو تمہیں قابو کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔“ میں نے بے چینی سے دریافت کیا۔ ”اُس کا چاپ پورا ہونے میں کتنا وقت باقی رہ گیا ہے؟“

”اس کی فکر مت کرو۔ ابھی خاصا وقت باقی ہے۔ میں اُسے آسانی سے کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“ انکارانی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”پریتم لال مہاراج نے جہاں مجھے دوسری شکلیاں دان کی تھیں، وہاں ایک ٹھکتی ایسی بھی دی ہے جو منڈل کے اندر بیٹھے ہوئے پجاری کی عقل بھی خطا کر سکتی ہے۔ ایک منٹ کے لئے وہ منڈل سے نکلا تو اُسے دوبارہ اندر جانے کا موقع نہیں دوں گی۔“

”تم..... تم مجھے بہلانے کی کوشش تو نہیں کر رہی ہو.....؟“

”ان باتوں میں سے مت برباد کرو جمیل، میری مانو تو اسی وقت بزرگ کے مزار پر حاضری دے لو۔ ہو سکتا ہے جو میں نے سوچا ہو، وہی سچ ہو۔“

”تم نے کیا سوچا ہے.....؟“

”ابھی نہیں..... پہلے تم حاضری دے لو، پھر بتاؤں گی۔“

میں نے انکارانی کی بات مان لی۔ وہ نہ کہتی تو بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ میں گلبرگہ تک آتا اور حضرت گیسو دراز کے مزار پر حاضری نہ دیتا۔ میں نے اسی وقت جا کر مزار پر حاضری دی، بڑی دیر تک روتا رہا، اپنی کوتاہیوں پر خدا سے معافی مانگتا رہا۔ میں نے براہ راست خواجہ سے کچھ نہیں مانگا۔ فاتحہ پڑھ کر خدا کے آگے ہاتھ پھیلا کر یہی دُعا کرتا رہا کہ وہ میری مشکلات آسان کر دے، میری مرادیں پوری ہوں اور میرا قدم صحیح منزل تک پہنچنے کا راستہ تلاش کر لے۔ میں فاتحہ پڑھ کر مزار سے باہر آیا تو سید ایک گولر کے درخت سے ٹیک لگائے کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ ہماری نگاہیں چار ہوئیں تو وہ دانت نکال کر بولا۔

”بھک مٹنے..... جب کہیں اور سایہ نہیں ملتا تو دوڑا دوڑا یہاں چلا آتا ہے..... بھری

جھولی؟ پھر گر دجھاڑ کر جانے کی حماقت کر بیٹھا.....؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، حسرت بھری نظروں سے اُسے گھورتا رہا۔ انکارانی اس

جائے گی۔“

میں پنڈت نول کشور سے متعلق ایک ایک بات بڑی تفصیل سے معلوم کرتا رہا۔ انکارانی نے جو حالات بیان کئے یا اُس کی پراسرار قوتوں نے حالات کو جو رنگ دیا تھا اس سے میری پوزیشن بڑی حد تک صاف ہو گئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ خاموش نہیں بیٹھیں گے، کسی اور معاملے میں اُلجھا کر دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش ضرور کریں گے.....!

”ایک بات پوچھوں انکارانی.....؟“ میں نے نول کشور کا موضوع ختم کر کے سوال کیا۔ ”تم مجھے ہر دوار سے گلبرگہ کیوں لے آئیں؟ ہم دہلی بھی جاسکتے تھے، بمبئی میں مرلی اور سروجنی کا اپارٹمنٹ بھی میرے لئے نہایت محفوظ پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی۔“

”تم کیا نتیجہ اخذ کر رہے ہو.....؟“ اُس نے مجھے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

میرا سوال سن کر وہ شپٹانے لگی تھی۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے.....“ میں نے انکارانی کے چہرے کے تاثرات کو بغور گھورتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”گلبرگہ تمہارے لئے دو اعتبار سے زیادہ مناسب جگہ ہے۔“ وہ سنبھل کر بولی۔ ”یہاں وہ مرد قلعہ رہی ہے جس نے تمہاری پشت تھام رکھی ہے، یہاں حضرت خواجہ گیسو دراز کا مزار بھی ہے جہاں تمہاری حاضری.....“

”میں سمجھا نہیں.....؟“ میں نے حضرت گیسو دراز کے حوالے پر چونک کر پوچھا۔

”تم چندرا کو کیوں بھول رہے ہو.....؟“ اُس نے میری دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”میرا دل کہتا ہے کہ اگر تم بزرگ کی درگاہ پر حاضری دے کر سچے دل سے دُعا مانگو تو وہ پردے میری نگاہوں کے سامنے سے ضرور سرک جائیں گے جنہوں نے چندرا اور میرے بیچ ایک عارضی دیوار کھڑی کر رکھی ہے۔“

”آخر وہ کون سی قوت ہے جو تمہارے آڑے آ رہی ہے.....؟“ میں نے ہونٹ کانٹے ہوئے پوچھا۔

”وہ کوئی غیر معمولی طاقت ہی ہو سکتی ہے جسے دُرگا اور کالی کی حمایت حاصل ہوگی۔“ اُس نے خلاء میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے اُس پراسرار قوت کے بارے میں جاننے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ یہ سارے پنڈت پجاری اور سادھو، مہرے

”چندرا اکیلا ہے؟..... یہ کیسے ممکن ہے؟“ میں نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”اُس کے ساتھ ذل کشور کے گرگے بھی ضرور ہوں گے، اُس پاس کہیں گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔“

”مجھے بھی حیرت ہے..... ہو سکتا ہے دُرگا اور کالی نے اُسے اپنی شرن میں لے رکھا ہو۔ وہ امر لال کا سپوت ہے، امر لال کالی کا سب سے مہان سیوک تھا۔ دیوی نے چندرا کو بے بارود دگا نہیں چھوڑا ہوگا۔“

”اور کچھ.....؟“

”میں پہلی بار چندرا کو دیکھ رہی ہوں۔“ انکارانی کی نظریں خلاء میں بھٹک رہی تھیں۔ بڑا گہرو اور سندرجوان ہے۔ اس کے انگ انگ سے خون کی سرخی پھوٹ رہی ہے۔ اس کے شریر پر بھبھوت کی سیاہی نے اس کی سندرتا کو اور نکھار دیا ہے۔ اس کی شکل امر لال سے ملتی جلتی ہے۔ میں نے اتنا جھجلا اکیلا اور سندرجوان پہلے نہیں دیکھا۔ ابھی تو اس کے کھیلنے کودنے کے دن تھے، یہ مورکھ دھرم کرم کی آگ میں کیسے کود پڑا.....؟“

”میرے دشمن کی شان میں قصیدے پڑھ رہی ہو.....؟“ میں نے تنک کر کہا۔

”ایسا مت سوچو جمیل.....“ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ ”میری باتوں کا مطلب وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو..... سادھنا یاد ہے کہ نہیں.....؟ اُسی کی طرح چندرا کے گال بھی گدرائے گدرائے نظر آ رہے ہیں۔ اُس کی رگوں میں دوڑتا ہوا گاڑھا خون بھی بالکل ویسا ہی ہوگا جیسا سادھنا کا تھا، ”گرم اور نمکین“ وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ اُس کی نگاہوں میں پیاس کی شدت ابھرنے لگی۔ ”چندرا کے خون میں بھی تاڑی جیسا سوندھا سوندھا نشہ ضرور ہوگا..... تم میرا مطلب سمجھ رہے ہوتا.....؟“

”ہاں جان جمیل.....“ میں نے پُر جوش انداز میں جواب دیا۔ ”میں تمہارا مقصد سمجھ گیا۔ تم اپنی خواہش کا اظہار نہ کرتیں تب بھی شاید چندرا کی بھرپور جوانی اور اس کے جسم میں دوڑتے ہوئے خون کا رنگ دیکھ کر میں اُسے مارنے کے بعد تمہارے حوالے کر دیتا۔ فکر مت کرو، یہ دعوت میری طرف سے ہوگی.....“

انکارانی میرا جواب سن کر خوش سے تھرکنے لگی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا رکن الدین کی حویلی پہنچا۔ میں نے اُسے بتایا کہ مجھے ایک فوری کام سے بنگلور جانا پڑ رہا ہے، کوشش کروں گا کہ جلدی لوٹ آؤں..... واپسی محض ایک بہانہ تھی، دل کا بہلاوا تھا۔ انسان گھر

وقت میرے سر پر نہیں تھی۔ پھر بھی شاید سید کی نظروں نے اُس کی واپسی کا احوال جان لیا تھا۔ مسکرا کر بولا۔

”پھر آگئی وہ کتو گلہری..... دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونک آئی..... سب گڑ چوتھ کر دیا..... تین پیہوں کی سائیکل کب تک گھنٹا رہے گا؟..... کلڑ گدے..... اپنی جھونپڑی ڈال لے..... گھنٹے توڑ مروڑ کر بیٹھ جا..... آنکھوں سے پیپ اور خون بہانا بند کر دے..... چنڈی اُتار کر پھینک دے..... کان تھام کر مرغابن جا..... پیٹھ پر سِل بٹا رکھ لے۔“

میں بدستور خاموش رہا، میری نظریں اُسی پر جمی رہیں۔

”انکھیاں لڑا رہا ہے..... بجز بو.....“

میں نے قدم آگے بڑھا دیے۔ سید کی نگاہیں چمکنے لگیں۔ نہ جانے میری خاموشی سے اُس نے کیا اندازہ لگایا ہوگا۔ میں کچھ دُور آگے نکل گیا تو اُس کی آواز پھر سنائی دی۔

”ناک کی سیدھ میں چلا جا..... پلٹ کر مت دیکھنا..... گر گٹ.....“

میری قوت برداشت جواب دے گئی، میں نے نظریں گھما کر دیکھا، وہ دُور دُور تک کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے رفتار تیز کر دی۔ انکارانی دوبارہ میرے سر پر آگئی۔ اُس کی نگاہیں چمک رہی تھیں۔

”کیا خوشخبری مل گئی؟.....“ میں نے پوچھا۔ بڑی پُر امید نظر آ رہی ہو.....“

”جمیل.....“ اُس نے کہا۔ ”تمہاری دُعا قبول ہو گئی۔ حضرت کی نظر التفات نے میری نظروں کے سامنے سے دُھند کی دبیز چادر سرکا دی۔ میں نے کہا تھا نا کہ چندرا زیادہ دُلوں میری آنکھوں سے دُور نہیں رہ سکے گا۔“

”کیا مطلب.....؟“ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ انکارانی کے جیلے کا مفہوم میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ میں تفصیل معلوم کرنا چاہتا تھا۔

”میں اُسے دیکھ رہی ہوں جمیل.....“ اُس نے پُر جوش لہجے میں جواب دیا۔ ”میں کسی اور کی نہیں، چندرا کی بات کر رہی ہوں۔ وہ بنگلور کے نواحی علاقے میں ایک اجازت مند میں چھپا بیٹھا جاپ کر رہا ہے۔ اس کے چاروں طرف منڈل کی ریکھائیں بھی نظر آ رہی ہیں۔ اسی منڈل کے چکر نے میرے سامنے تاریکی پھیلا رکھی تھی۔ بزرگ کی دُعا نے اُس کا بھرم توڑ دیا۔“



سے نکلنے وقت بھی واپسی کا یقین رکھتا ہے، راستے میں کوئی سانحہ، کوئی حادثہ پیش آجائے تو زندگی کا ڈراپ سین ہو جاتا ہے، کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ میری زندگی کا تو ہر لمحہ غیر یقینی تھا۔ کبھی کبھی انسان کو مصلحت بھی دروغ گوئی کرنی پڑتی ہے۔ میں جھوٹ نہ بولتا تو رکن الدین کے علاوہ زرافشاں، درخشاں اور طلعت بھی مجھے جانے کی اجازت نہ دیتیں۔ پاؤں کی بیڑیاں بن جاتیں.....!

اُسی روز میں رات کے کھانے کے بعد بنگلور کے لئے روانہ ہو گیا.....!!



گاڑی بنگلور کی سمت بھاگ رہی تھی۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں میرے علاوہ ایک لڑکھ بھی سفر کر رہا تھا۔ انکارانی اپنی نیند پوری کرنے کی خاطر میرے بالوں کے بیچ آڑی جھبی بکھری پڑی تھی۔ اُس کے خراٹے بتا رہے تھے کہ وہ گھوڑے بیچ کر سو رہی ہے۔ میرا ہن گاڑی کی رفتار سے کہیں زیادہ برق رفتاری سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ انکا نے کہا ماکہ چندرا، بنگلور کے ایک نواحی علاقے میں کسی غیر آباد مندر میں بیٹھا جاپ کر رہا ہے۔ بات میرے حلق کے نیچے نہیں اُتر رہی تھی۔

نول کشور نے چندرا کو ساتھ ملایا تھا تو اس میں کوئی مصلحت بھی ضرور ہوگی۔ وہ امر لال کا اکلوتا لڑکا تھا۔ امر لال کو کالی کی خوشنودی حاصل تھی، اُس کے سیوکوں کی تعداد لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ضرور رہی ہوگی۔ امر لال کے مرنے کے بعد اُس کے سیوکوں نے ہارن چندرا کی طرف موڑ دیا ہوگا۔ کالی کی شبہ کا منائیں بھی چندرا کو حاصل ہوں گی۔ ہندرا، نول کشور کے لئے یقیناً بڑی اہمیت کا حامل ہوگا، اسی لئے میرے ہر دوارجینچے سے پہلے نول کشور نے اُس کو بنگلور بھیج دیا..... مگر وہ میرے لئے دو محاذ کھولنے کی حسرت لئے دینا سے رخصت ہو گیا اور اب بقول انکارانی کے چندرا نے پھر کوئی جاپ شروع کر دیا تھا۔

امندر میں ضرور تنہا ہوگا۔ منڈل میں ایک وقت میں صرف ایک پنڈت یا پجاری اپنے اندوں کی تکمیل کی مدت پوری کرتا ہے۔ ممکن ہے وندھیا چل کی پہاڑیوں میں اُس کا جاپ دھورارہ گیا ہو؟ وہ اُسی کی تکمیل کر رہا ہو؟ میرے خلاف خم ٹھونک کر سامنے آنے سے پیشتر کچھ نئی قوتوں کا حصول اُس نے ضروری سمجھا ہو؟ اور بھی کچھ مصلحتیں اُس کے پیش نظر رہی ہوں گی۔ لیکن وہ تنہا ہوگا؟ میرا ذہن اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ذہن پر زیادہ زور نہیں دیا۔ میرا مقصد صرف چندرا کو ٹھکانے لگانا تھا، اُسے باور کرانا تھا کہ اُس نے جمیل محمد خاں کے مقابلے میں آکر دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ چندرا کی موت کے بعد پنڈت

”میں ندامت کی نہیں، طاقت کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ترجیبی کے بعد بھی نہارے آنے جانے کا سلسلہ لگا رہا۔ شیو چون سامنے آ گیا۔ پھر میرے سب سے بڑے دشمن بدری نرائن نے درمیان میں آ کر میرے اور ہندوستان کے پنڈت پجاریوں کے درمیان فساد کا جوج بویا اس کی فصلیں، میں آج تک کاٹا چلا آ رہا ہوں۔ چندرا کے بعد کوئی یا حرامزادہ اٹھ کھڑا ہوگا..... جو پنڈت، تمہارے لئے جاپ کر رہا ہے، وہ کامیاب ہو گیا تو میرے دشمنوں کی صف میں تم بھی شامل ہو جاؤ گی۔ کہانی میں جوڑ لگتے چلے جائیں گے، میں کب تک مقابلہ کرتا رہوں گا.....؟“

”اتنی باپوسی کی باتیں مت کرو جمیل.....“ اُس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ اب تمہاری قوت بھی مجھ سے کم نہیں ہے۔ کل کیا ہونے والا ہے؟ میں جانتی ہوں۔ مجبوریاں لاحق نہ ہوتیں تو تمہیں سب کچھ بتا دیتی۔ صرف اتنا جان لو کہ تمہاری منزل قریب آ رہی ہے۔ تمہیں ایک ٹھکانا مل جائے گا۔ ہو سکتا ہے تم مجھ سے بھی لگا ہیں پھیر لو.....“

”یہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....؟“ میں بے چین ہو گیا۔ ”مجھے بتاؤ انکارانی کہ تمہاری بات کا مقصد کیا ہے؟ بات اب میرے اور تمہارے درمیان طاقت کے توازن کی نہیں رہی۔ ہم ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن چکے ہیں۔ میں تم سے نظریں پھراؤں..... یہ کیسے ممکن ہے؟“

”جمیل.....“ وہ آبدیدہ ہو گئی۔ ”میں بھی تم سے دُور نہیں رہ سکتی۔ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی، تم بدل جاؤ، لگا ہیں پھیر لو تب بھی میں تم سے جدائی کا تصور نہیں کر سکوں گی۔“

”اور وہ..... جو منزل میں بیٹھا تمہیں مجھ سے چھین لینے کے سنے دیکھ رہا ہے.....“

”وہ کامیاب نہیں ہوگا..... میری بات پر اعتماد کرو۔ اب کوئی بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکے گا۔“ اُس کے لہجے میں یقین تھا۔

”تم..... تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ کوئی کامیاب نہیں ہوگا؟ کیا وہ تمہارا خیال دل سے نکال دیں گے.....؟“

”وقت کا انتظار کرو، سب کچھ جان جاؤ گے.....“

انکارانی کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ سکیں۔ چند روز پیشتر وہ دھمل یقین تھی، آج اُس کے لب و لہجے میں بھرپور اعتماد تھا۔ میں اُسے کریدنا چاہتا تھا جب وہ اچانک اٹھ کر

پجاریوں کا زور ٹوٹ جاتا، پنڈت نول کشور کے بعد چندرا کی موت کی خبر اُن کے لئے نیک شگون نہیں ہو سکتی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ میرا خیال اپنے ذہنوں سے جھٹک دیتے؟ اس راستے سے کتر اگر گزرتے جہاں میرے قدموں کے نشان موجود ہوتے، ان کو ماضی کے واقعات کا بھی تھوڑا بہت علم ضرور ہوگا۔ کیسے کیسے جغادری پنڈت اور پجاری مجھے ہنس نہس کرنے کی خواہش لے کر میدان میں کودے تھے، اُن کا انجام کیا ہوا.....؟ پولیس نے متعدد بار مجھے گھیرنے کی کوشش کی، عدالتوں نے اپنا قیمتی وقت برباد کیا، نتیجہ کیا برآمد ہوا.....؟ ڈھاک کے تین پات!

کئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔ پھر انتہ پور کے اسٹیشن سے دو آدمی اور ڈبے میں سوار ہو گئے۔ اُن کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ ممکن ہے ایک دو اسٹیشن دُور جانا رہا ہو۔ شکل و صورت سے وہ اچھے کردار کے مالک نظر نہیں آ رہے تھے۔ مجھے اُن کے ساتھ کوئی رشتہ بھی نہیں قائم کرنا تھا۔ میں نے اُن کی طرف پشت کر لی۔ پھر چندرا کے بارے میں غور کرنے لگا۔ انکارانی نے کسمنا شروع کیا۔ دو چار طویل انگڑائیاں لینے کے بعد اٹھ بیٹھی۔ جمائی لے کر بولی۔

”تم بھی کچھ دیر کمر سیدھی کر لو، بیٹھے بیٹھے تھک جاؤ گے۔“

”اب ایک ہی بار سکون سے آرام کروں گا۔“ میرے لہجے میں الجھن شامل تھی۔

”تم کیا سوچ رہے ہو.....؟“ اُس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”چندرا کے بارے میں زیادہ پریشان مت ہو۔ جب بڑے بڑے قد آور بت ڈھے گئے تو چندرا کس کھیت کی مولی ہے؟ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔“

”بات صرف چندرا کی نہیں ہے۔“ میں پہلو بدل کر بولا۔ ”میں اس روز روز کی اٹھاؤ سے تنگ آ گیا ہوں۔ تم روزِ اوّل سے میرے ساتھ ہو، میری زندگی کے تمام نتیجہ و نفاذ سے واقف ہو۔ بات پنڈت تربیتی سے شروع ہوئی تھی، وہ تمہیں مجھ سے چھیننے کی کوششوں میں مصروف تھا، میں تمہارے کہنے پر بھگوان پرشاد سے ملا۔ کیا کیا جتن کئے لیکن وہ کامیاب ہو گیا۔ تم میرا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں۔ پھر تم نے.....“

”ان باتوں کو بھول جاؤ جمیل۔“ وہ کسمنا لگی۔ ”میں تم سے کئی بار ندامت کا اظہار کر چکی ہوں۔“

کھڑی ہو گئی۔ اُس کی نظروں کے تعاقب میں میری نظریں بھی اُن دو مسافروں کی جانب اٹھ گئیں جو سفید فام غیر ملکی کولوٹے میں مصروف تھے۔ ایک نے پستول تان رکھا تھا، دوسرا شخص غیر ملکی کی جیبیں صاف کرنے کے بعد اُس کے سامان کی تلاشی لینے میں مصروف تھا۔ سفید فام غیر ملکی کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اُس کی سہمی سہمی نگاہیں بار بار میری جانب اٹھ رہی تھیں۔

”دیکھ رہے ہو جھیل.....“ انکارانی نے زہر خند سے کہا۔ ”ہندوستان میں اب وہ بھی محفوظ نہیں رہے جو کبھی حکومت کر چکے ہیں۔ اسی بھارت کے بڑے بڑے سورما، راجہ مہاراجہ اور نوابین اپنے انگریز آقاؤں کی پیشانی کے بل دیکھ کر زبان کھولنے کی جسارت نہیں کرتے تھے۔ اب اٹھائی گھرے اور چوراچکے بھی ان کی جیبیں ٹٹولنے لگے ہیں۔ وقت اور حالات بڑے ظالم ہوتے ہیں، کسی ایک کے اختیار میں نہیں رہتے، موسموں کی طرح رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی روشنی اندھیرے کو نگل جاتی ہے، اب اندھیرے روشنی پر کند پھینکنے لگے ہیں.....“

انکا بڑے فلسفیانہ انداز میں بدلتے حالات کا تجزیہ پیش کر رہی تھی۔ میں جواب میں کچھ کہنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ پستول والا جواں مرد مجھ پر غرانے لگا۔

”تمہاری نظر اب ادھر اٹھ ہی گئی ہے تو خاموشی سے بیٹھے تماشا دیکھتے رہنا۔ ہم بلاوجہ کسی کے خون سے ہاتھ سرخ نہیں کرتے۔ بہتر ہوگا کہ پھر اپنا رخ تبدیل کر کے انجان بن جاؤ۔ ہم اس سفید مرغے کو کھنگال کر اگلے اسٹیشن پر اتر جائیں گے۔“

”تم اپنی جیبیں بھرو گے لیکن تمہاری ان حرکتوں سے تمہارے دیس کی شہرت کو بڑا شدید دھچکا پہنچے گا۔“ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ”انگریز کی سیاست کو آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا، وہ اپنے تدبیر اور ٹھنڈی پالیسی کی آڑ لے کر اپنا کام کر گزرتے ہیں۔ تمہارا بھارت بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاست نہیں سمجھ سکا تھا، اُس وقت آنکھیں کھلیں جب پانی سر سے اُونچا ہو گیا.....“

”ہمیں تاریخ اور جغرافیہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ اُس کے تیور خطرناک ہو گئے۔

”اپنی چونچ بند رکھو، اسی میں تمہاری مکتی ہے۔“

”بڑی حیرت کی بات ہے.....؟“ مجھے ہنسی آ گئی۔ ”تم کام چوروں والے کر رہے اور

زبان پنڈت پجاریوں کی استعمال کر رہے ہو.....“

”تم چپ نہیں رہو گے.....؟“ اُس نے بڑی سفاکی سے پوچھا۔

”زندگی کی خیر مناد مہاشے.....“ اُس کے دوسرے ساتھی نے دھمکی دی۔ ”زیادہ ہیرو بننے کی کوشش کی تو مار کر چلتی گاڑی سے باہر پھینک دیرا۔ گے۔ سمجھ رہے ہو ہماری آسان بھاشا یا تم سے بارود کی زبان میں بات کریں؟“

”پلیز ہیلپ می (PLEASE HELP ME)“ سفید فام غیر ملکی نے پہلی بار مردہ آواز میں بولنے کی جسارت کی۔

”ڈونٹ وری (DON'T WORRY)“ میں نے سنجیدگی سے اُسے دلا سہ دیا۔

”گٹ پٹ کرنے سے باز نہیں آؤ گے؟“ دوسرے شخص نے بھی پستول نکال لیا۔ انکارانی بڑی تیزی سے میرے سر سے ریگ گرا۔

”ایک شرط ہوگی۔“ میں نے تھوڑے تو قف سے ان دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم جس کو لوٹ رہے ہو اس پر میری نظر پہلے سے تھی۔ سودا فنی فنی میں طے ہو سکتا ہے۔ کیا خیال ہے.....؟“

”اپنی کھال میں رہنے کی کوشش کرو۔“ پہلا ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔ ”ڈاکوؤں کے ڈیروں میں نقب لگانے کی بات وہی کرتے ہیں، زندگی سے جن کا دل بھر چکا ہوتا ہے.....“

”یہ اٹھی دیکھ رہے ہو.....؟“ میں نے سید کی لاسھی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تھری ناٹ تھری سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس سے نشانہ لینے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ وقت پڑنے پر یہ بلٹے پروف کا کام بھی انجام دیتی ہے۔ تمہیں یقین نہیں آتا تو باری باری دو چار فائر کر کے بھی اپنا اطمینان کر لو۔ مگر اس صورت میں میرا حصہ پچاس سے بڑھ کر پچھتر فیصد ہو جائے گا۔“

میں نے انکارانی کے سر سے اترتے ہی حصار باندھ لیا تھا۔ وہ ایک وقت میں دونوں کو کنٹرول نہیں کر سکتی تھی۔ انگریز مسافر کی وحشت دیدنی تھی۔ اُسے مال کی نہیں جان کی فکر زیادہ تھی۔

”میں تمہاری بکواس پر قہقہہ لاس یا تمہاری لاش پر بیٹھ کر آنسو بہانے کی تیاری کروں۔“ پہلے نے اپنا جملہ مکمل کر کے جست لگائی۔ اُچھل کر میرے قریب آ گیا۔ میں

نے بیٹھے ہی بیٹھے پیر سے لاشی سرکا دی۔ وہ جوتوں سمیت میری آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا، لاشی کی طرف سے بے خبر تھا۔ لاشی اُس کے جسم سے مس ہوئی تو یوں لگا جیسے اُس کے جسم میں آٹھ سواتی پاور کا کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ وہ فٹ بال کی طرح اُچھل کر دُور جا گرا۔ اُس کا جسم جل کر کوئلہ ہو گیا۔ سفید فام غیر ملکی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مرنے والے کا دوسرا ساتھی بھی جبر سے پلکیں چھپکانے لگا۔ اُس کے پستول کا رخ میری ہی طرف تھا۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اُس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ لہجی دہانے کے ارادے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سانس کے ناقابل یقین انجام پر بھی غور کر رہا تھا۔ میں نے اُسے گھور کر کہا۔

”اب بھی بات تیری سمجھ میں نہیں آئی؟“ میرا لہجہ تحکمانہ ہو گیا۔ ”پستول جیب میں رکھ لے، جو مر گیا اسے اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دے۔ اپنی جیبیں جھاڑ کر خود بھی میری نظروں سے دُور ہو جا..... سن رہا ہے میری بات؟.....“

سفید فام غیر ملکی کی عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ دوسرے شخص نے میرے حکم کی تعمیل میں سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے اپنے مُردہ ساتھی کی اکڑی ہوئی سرد اور سیاہ لاش کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر اُچھال دیا۔ اپنی جیبیں جھاڑ کر غیر ملکی کے قدموں میں سارا مال ڈال دیا پھر..... خود بھی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ سفید فام غیر ملکی کچھ دیر سکتے کی کیفیت سے دوچار رہا، پھر تحسین آیز لہجہ میں بولا۔

”یو آر گرےٹ..... گرےٹ میجیشن (MAGICIAN)، بہت بڑا جاؤ وگڑ معلوم ہوتا..... ہم پہلا کبھی نائی دیکھا..... گرےٹ..... گرےٹ.....“ ”دروہل (HORRIBLE)“

”چپ ہو جا سفید بندر.....“ میں نے ناخوشگوار لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔ ”بیرار..... کوٹا مت کر، جو کچھ دیکھا اسے اپنی کھوپڑی سے نکال دے۔ اگلے شیش پر تو بھی دفاعان ہو جا..... کوئی دوسری گاڑی پکڑ لینا۔“

میں جانتا تھا کہ انکارانی اب اُسی کے سر پر برا بھان ہوگی۔ پندرہ منٹ بعد گاڑی کی رفتار مدھم ہونی شروع ہوئی۔ وہ جلدی جلدی اپنا بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر زکی تو خاموشی سے دروازہ کھول کر اُتر گیا۔ انکا پھر میرے سر پر آگئی، مسکرا کر بولی۔

”جانتے ہو جمیل، وہ انگریز کیا سوچ رہا تھا؟ وہ تمہاری تصویریں کھینچنے کا خواہشمند تھا۔ تمہاری حیرت انگیز ماورائی قوتوں کے بارے میں لمبی چوڑی کہانی بنا کر بیرونی اخبارات میں شائع کرانے پر غور کر رہا تھا۔ تم نہ کہتے تب بھی اُتر جاتا۔ وہ مرنے والے کی کوئلہ بنی لاش کی تصویر بھی حاصل کرنا چاہتا تھا، تمہاری کہانی تصویروں کے ساتھ چھپتی تو تہلکہ مچ جاتا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس کے ذہن سے سارے واقعات کھرچ کر نکال دیئے ہیں۔“

میں نے موضوع بدل کر پھر چندرا کی بات شروع کر دی۔

”ایک بار پھر اُس کے آس پاس منڈلا کر دیکھو..... وہ تنہا ہوگا، میرا دل اس بات کو قبول نہیں کر رہا.....“

”جلدی کیا ہے.....؟“ اُس نے بے پرواہی سے جواب دیا۔ ”پنڈت نول کشور کے ساتھ ننگ دھڑنگ پنڈت پجاریوں کی پوری فوج تھی۔ بارود کا بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اُس نے۔ نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ سارا دھوم دھڑکا، ٹھس ہو کر رہ گیا۔ کالی کی مورت بھی دیکھتی رہ گئی۔“

”بنگلور آنے میں اور کتنی دیر باقی ہے.....؟“ میں نے بے چینی کا اظہار کیا۔

”خود کو ٹھنڈا رکھو..... جذبات میں کام بگڑ جاتے ہیں۔ بنگلور زیادہ دُور نہیں رہ گیا۔“ اُس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ہم ٹرین سے اُتر کر کسی عالیشان ہوٹل کا رخ کریں گے۔ تم نہادھو کرتازہ دم ہو لینا، کچھ دیر آرام کر لینا پھر سواری پکڑ کر ہم اس بستی کی طرف چل پڑیں گے جہاں چندرا ویران اور اُجاڑ مندر میں بیٹھا کسی دیوی کی حمایت حاصل کرنے کے لئے جاپ میں گمن ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے اختیار میں ہوتا تو اُڑ کر چندرا کے سر پر پہنچ جاتا، اُسے منڈل سے باہر نکال کر ایسی عبرتناک موت مارتا کہ امرالال کی آتما بھی بلبلاتا شقی۔ اُس کی موت کی خبر ہر دوار بھی ضرور پہنچتی۔ نول کشور کی باقیات کی دھوتیاں ڈھیلی پڑ جاتیں۔ تلے اوپر ہونے والے دو جھٹکے ان سبزی خوروں کو ہلاک کر رکھ دیتے۔ وہ جلدی سر اٹھانے کی ہمت کبھی نہ کرتے۔ پولیس کے اعلیٰ افسران اور حکومت کے سربراہ آئندہ لوگ بھی چکرا جاتے۔ ممکن تھا وہ میرے بارے میں ساری فائلیں بند کر کے ہمیشہ کے لئے خاموشی اختیار کر لیتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ”دیکھتے ہی گولی مار دو“ کا نادر شاہی حکم جاری کر دیتے، انہیں

بھی بار بار خفت اٹھانی پڑتی۔ مجھے بھی پولیس کی چیرہ دستیوں سے جھنکارا مل جاتا، طویل عدالتی چکروں سے نجات مل جاتی.....!

”بنگور میں تمہارے دیکھنے کی اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں۔“ انکارانی اپنی سناتی رہی۔ ”ٹیپو سلطان کے محل کے کھنڈرات دیکھنے کے لئے غیر ملکی سیاح دُور دُور سے آتے ہیں۔ میسور اور جنوبی ہند کا تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے یہاں خاصی گہما گہمی رہتی ہے۔ یہاں بھی دنیا کے تمام خطوں کی طرح انسانی جسموں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ مدراسی لڑکیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ان کے گٹھے ہوئے جسم اور چلنے پھرنے کا انداز منفرد ہوتا ہے۔ دُور سے پہچانی جاتی ہیں.....“

”تمہیں اس وقت ٹیپو سلطان کیسے یاد آگیا.....؟“ میں نے یونہی پوچھ لیا۔

”اُس پر بھی ٹیپوستان شاہ نامی ایک فقیر مہربان ہو گیا تھا، اُسی کی نسبت سے وہ ٹیپو سلطان بن گیا۔ پہلے صرف فتح علی کے نام سے جانا جاتا تھا۔“ اُس نے وضاحت کی۔ ”تم بھی خوش نصیب ہو جو سید مجذوب جیسا قلندر تم پر مہربان ہو گیا..... وہ بڑی ہمہ گیر صفتوں کا مالک ہے۔ میں بھی اُس کی گہرائیوں کو نہیں پاسکی۔ اُس کا دامن تھامے رہنا، جھوڑمت دینا۔ اُس کی نظر چٹانوں کو بھی مسمار کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ وہ جن بلند یوں پر پرواز کرتا ہے وہاں پرندوں کے پر بھی جل جاتے ہیں۔“

انکارانی مجھ سے باتیں کرتی رہی، وقت بڑی آسانی سے گزر گیا۔

بنگور کے اسٹیشن پر میں گاڑی سے باہر آیا تو میری رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ انکارانی مجھے شاندار ہوٹل میں لے جانے پر بضد تھی۔ میں نے انکار کر دیا۔ اُسے میری ضد کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ پلیٹ فارم سے باہر آ کر میں نے ٹیکسی پکڑی اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ انکارانی، ڈرائیور کے سر پر چلی گئی۔

شہر سے نواحی بستی کا سفر تھا کہ دینے والا تھا۔ دو گھنٹے بیت گئے، میں بار بار پہلو بدلتا رہا۔ چندرا میرے ذہن میں کسی کچھوے کی طرح کلبلار ہا تھا۔ وہ میری کلدیپ کے قاتل کا اکلوتا بیٹھا تھا۔ سب کہتے تھے کہ امر لال کی طرح اُسے بھی کالی کا آشیر واد حاصل ہے۔ کالی نے امر لال کے مقابلے میں کلدیپ کی جھینٹ قبول کر لی۔ امر لال کتے کی موت مارا گیا۔ اور اب اسی کتے کے پلے کی باری تھی۔ میں تمام راستے اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔

ٹیکسی نواحی آبادی کی ایک نیم پختہ روڈ پر پہنچ کر رُکی۔ میں نیچے اُترا۔ مجھے یقین تھا کہ انکارانی کی موجودگی میں کسی غلطی کا امکان نہیں تھا۔ کہیں اُس پاس وہ مندر بھی موجود ہوگا جہاں چندرا خود کو بڑا محفوظ سمجھ رہا ہوگا۔ اس بات سے بے خبر ہوگا کہ موت دے قدموں اس کے قریب پہنچنے والی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور خاموشی سے گاڑی واپس موڑ کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد انکارانی میرے سر پر آ گئی۔ اُس نے مجھے بائیں جانب کچے میدانی علاقے کی طرف چلنے کو کہا۔ داہنے ہاتھ پر چھدرے چھدرے مکانات نظر آ رہے تھے۔ وہاں غریب طبقہ آباد تھا جو محنت مزدوری کر کے روزی کماتا تھا۔

میدانی علاقے کو عبور کرنے کے بعد میں اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں میرا دشمن دیوی کی حمایت حاصل کرنے کی خاطر چاپ میں مگن تھا۔ سوگڑ کے فاصلے پر وہ مندر بھی نظر آ رہا تھا جو انکارانی کے بیان کے عین مطابق دُور ہی سے ویران اور اُجڑا اُجڑا نظر آ رہا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ پر ایک باغ تھا جہاں گھنے پھل دار درخت قطار اندر قطار دُور تک پھیلے نظر آ رہے تھے۔ دائیں ہاتھ پر ایک چھوٹا سا تالاب تھا جہاں کچھ جانور اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ ”جمیل.....“ انکارانی نے مندر کی سمت اشارہ کیا۔ ”چندرا اسی مندر میں بیٹھا چاپ کر رہا ہے۔ تمہارے کہنے پر میں نے چاروں طرف نظر دوڑالی ہے، اُس پاس کوئی پنڈت بچاری موجود نہیں ہے۔“

”گویا چندرا کی موت بڑی کسمپرسی کے عالم میں ہوگی۔ اُس کی لاش کو مرگھٹ تک پہنچانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔“ میں نے حقارت سے کہا۔ ”اچھا ہے۔ کسی جنگلی جانور کا بھلا ہو جائے گا۔ صرف ہڈیوں کا پنجر باقی رہ جائے گا، اُسے بھی کتے گھسیٹ لے جائیں گے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“

میں نے مندر کی جانب قدم اٹھانے شروع کر دیے۔ جوں جوں فاصلہ گھٹتا گیا، میرے اندر طوفان کی شدت زور پکڑتی رہی۔ مجھے حیرت تھی کہ نول کشور نے چندرا کو تنہا رہنے کی اجازت کس طرح دے دی؟ اُسے میری وجہ سے پہاڑیوں سے نیچے آنے کی دعوت دی گئی تھی، پھر ہر دوار سے کیوں بھیج دیا گیا؟ کیا مصلحت تھی؟ کیا راز تھا؟ کیا نول کشور کو دیوی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اُس کی موت سر پر کھیل رہی ہے؟ وہ اپنے اعتماد کا شکار ہو کر بے بسی کی موت مرنے والا ہے؟ وہ کالی کے مندر کا بڑا پروہت تھا۔ کالی اور اُس کے درمیان اتنے راز



و نیاز تو ہونے چاہئے تھے کہ وہ اُسے موت کی خبر کر دیتی۔ شاید اُس کی زندگی کے گئے چنے لہجوں میں دس بیس منٹ کا اور اضافہ ہو جاتا۔ وہ اپنی ہی موت سے بے خبر تھا تو چندرا کو اُس کے انجام کی خبر کیسے دے سکتا تھا؟ پتھر سے سر پھوڑنے کا انجام موت کے دروازے پر پہنچنے کے بعد ہی نظر آتا ہے۔ تب وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ چندرا ابھی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوگا، اُسے اُمید نہیں رہی ہوگی کہ نول کشور اور اُس کے سینکڑوں پنڈت پجاری ایک تنہا میری ذات کے آگے اتنی جلدی بے بس ہو جائیں گے۔ خود نول کشور کو بھی توقع نہیں ہوگی۔ اُس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی، دُور اندیشی سے کام لیتا رہا تھا۔ دیکھ درمیان میں نہ آ جاتا تو وہ منڈل سے باہر آنے میں جلدی نہ کرتا۔ باہر آنے کے بعد بھی اُس نے مردانگی سے مقابلہ کیا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی جوشیوا درمیان میں آ گیا تھا، نول کشور دھوکے میں مارا گیا....

اب چندرا کی باری تھی۔

میں مندر سے دس گز دُور ہی تھا جب میرے قدم رک گئے۔ میری نظریں اُس پجارن کے سراپا پر منڈلانے لگیں جو مندر سے باہر نکلتی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں چھوٹی سی پیتل کی تھالی تھی جس میں ایک دو برتن اور بھی تھے۔ وہ کسی جنگلی ہرنی کی طرح خوش نظر آ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ گہرے رنگ میں اُس کا خوبصورت وجود اور چمک اٹھا تھا۔ وہ حسین تھی، جاذبِ نظر تھی، اُس کے چلنے کا انداز بھی ہر نیو جیسا تھا، خراماں خراماں کسی ہوا کے معطر جھونکے کی طرح، اُس کا ایک ایک انداز زندگی کی سرمستیوں سے معمور تھا، گھنیرے زلفیں دونوں شانوں پر ناگوں کی طرح بل کھا رہی تھیں۔ وہ خود بھی کسی ناگن سے کم نہیں تھی، کوڑیا لی، لہر الہرا کر اور بل کھا کر چلنے والی۔ اُس کے سراپا میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ میرا ذہن چندرا کے خیال سے کھینچ کر اُس کے پیکر کے مطالعے میں غرق ہو گیا۔

”اس کا نام بھی اسی کی طرح بڑا سندھ ہے..... رُوپ کرن۔“ انکارانی مجھے جنگلی ہرنی کے بارے میں بتانے لگی۔ ”یہ نادان چندرا کو میں بسا کر اُس کی دیوانی ہو گئی ہے۔ روز اُس کے لئے تھالی میں پھل، دودھ اور میوے پروں کر لاتی ہے۔ تھالی منڈل کے قریب رکھ کر خود دُور بیٹھی نگاہوں نگاہوں میں چندرا کو پوجتی ہے۔ پھر خالی تھالی اُٹھا کر واپس چلی جاتی ہے۔ بہت دنوں سے اس کا یہی معمول ہے۔ ابھی تک چندرا سے اس کی ایک بات

بھی نہیں ہوئی نہ نظریں نکرائیں۔ وہ تھالی کو دیوی کا پرشاد سمجھ کر چٹ کر جاتا ہے۔ یہ سمجھتی ہے کہ چند رانے اسے سویکار کر لیا۔ بڑی نادان ہے۔ اپنی زندگی کو بلاوجہ روگ لگا بیٹھی....“

میں انکارانی کی باتیں سنتا رہا۔ اُس نے چندرا کی بھرپور جوانی کی جو تعریفیں کی تھیں غلط نہیں ہوں گی۔ اُس کا بیان غلط ہوتا تو رُپ کرن جیسی الہڑ جوانی اُس کے عشق میں دیوانی نہ ہوتی۔ وہ قریب آرہی تھی۔ میری نظریں اُس کے نشیب و فراز کے حسن کو داد تحسین دینے میں مصروف تھیں۔ وہ میرے قریب آکر ایک لمحے کو رُک، کسی خیال سے اُس نے پلٹ کر اُجڑے مندر کی طرف نظر ڈالی جہاں اُس کا پریم بیٹھا رام رام جب رہا تھا۔ پھر کتراکر جانے لگی تو میں نے لپک کر اُس کی کلائی تھام لی۔ وہ ساری جان سے لرز اُٹھی۔ پیتل کی تھالی اور چھوٹے چھوٹے برتن اُس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اُس کی بادامی آنکھیں سہم کر اور دلربا ہو گئیں۔

”کیا کرتے ہو.....؟“ اُس نے گھبرائے ہوئے مدھم لہجے میں پوچھا۔ میں اُس کے دل کی دھڑکنوں میں ڈوبنے لگا۔ ”میرا ہاتھ چھوڑ دو، تمہاری بڑی کرپا ہوگی.....“ وہ مجسم التجا بن گئی۔ میں اور دیوانہ ہو گیا۔

”مندرمیں تیرا کون بیٹھا ہے.....؟“ میں نے تیز آواز میں سوال کیا۔  
 ”مم..... میں نہیں جانتی.....“ اُس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔  
 ”نہیں جانتی تو وہاں روز روز کیا کرنے جاتی ہے.....؟“ میرے اندر رقابت کا جذبہ  
 کندلی مارنے لگا۔

”وہ..... وہ دیوی کے کارن کوئی چا پ کر رہا ہے۔ میں اُسے بھوجن کھلا کرواپس آ جانی ہوں۔“ وہ معصومیت سے بولی۔ ”مجھے جانے دو.....“

”تو اسے نہیں جانتی۔ لیکن مندر میں چھپا کر اس کی پوجا کر رہی ہے۔“

”ہاں..... وہ مجھے اچھا لگتا ہے.....“ وہ روانی میں حقیقت بیان کر گئی۔ میرے اندر کی آگ اور بھڑک اٹھی۔

”بعد میں اُس نے تیرا ہاتھ تھامنے سے انکار کر دیا تو.....؟“ میں نے تمکلا کر پوچھا۔  
 ”بھائیہ کے لکھ کو کون مٹا سکتا ہے؟“ وہ اُداس ہو گئی۔ اُس کا حسن سو گوار بھی قیامت  
 تھا۔ نظریں جھکا کر بولی۔ ”ہمارا شوگ نہ ہوا تب بھی وہ میرے دل میں دھڑکتا رہے گا۔ وہ

نہ مانے، پر میں نے اُس کے ساتھ بندھن باندھ لیا ہے۔“

”میں اس بندھن کو توڑ دوں گا۔ اُسے بھی نشٹ کر دوں گا تو جس کے سپنے دیکھ رہی ہے۔“ میں اپنے جنون پر قابو نہ پاسکا۔ میں نے اُس کی کلائی پر گرفت مضبوط کر کے جھکا دیا، وہ سنسبھل نہ سکی، چکرا کر میری بانہوں کے جال میں پھنس گئی۔ اُس کا قرب بڑا ہیجان انگیز تھا۔ میرے جسم سے سرخ چیونٹیاں پلٹ گئیں۔ میرا مقصد اس مورتی کو اپنے شبستان گناہ میں لا کر اُس کی دوشیزگی یا مال کرنا ہرگز نہیں تھا۔ لیکن وہ جو ویرانے کی حورتھی، جس کی جوانی کھٹل کا کھٹ مٹھا کو یا تھی، جس کی مست نگاہوں میں انگور کی شراب پھلک رہی تھی وہ میرے دشمن کی بانہوں میں کبھی سٹ کر اٹھیلیاں کرنے کی آرزو کرے، مجھے یہ بھی منظور نہیں تھا۔ میں نے روپ کرن کو گھسیٹ کر ایک طرف لے جانے کی کوشش کی تو انکارانی نے کہا۔

”اب ایسا مت کرنا جمیل..... اس ہرنی کو آزاد کر دو۔ تم نہیں جانتے، میری بات کا یقین کر لو، اگر تم نے اسے روند ڈالا تو بڑے خسارے میں رہو گے۔ شاید چندرا بھی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔“

”یہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....؟“ میرے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔

”میں تم سے غلط نہیں کہہ رہی ہوں..... روپ کرن کو چھوڑ دو، اسی میں تمہاری بہتری

ہے۔“

چندرا کا نام آیا تو میں نے روپ کرن کو وحشت بھری نظروں سے دیکھا، مجھے چندرا اور روپ کرن میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ انکارانی کی منطق میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن اُس نے جو کچھ کہا تھا کچھ سوچ سمجھ کر ہی کہا ہوگا۔ میں نے نفرت سے روپ کرن کو دھکا مار کر ایک سٹ گیا۔ میری نگاہیں پھر مندر پر جم گئیں۔

”تم جلد بازی سے کام نہ لینا۔ میں لڑکی کے ذہن سے تمہارا خیال نکال کر واپس آتی ہوں۔“ انکارانی میرے سر سے اتر گئی۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا مندر کے دروازے پر پہنچ گیا۔

سید کی لاشی میرے سیدھے ہاتھ میں تھی۔ میرے اندر آتش فشاں سر اُبھار رہا تھا۔ میں نے چندرا کو گھور کر دیکھا، وہ آنکھیں بند کئے کالی کی چابلیسی میں گمن تھا۔ زمین پر منڈل کا

یاں واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ انکا نے چندرا کے حسن کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ اس تعریف سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا، بڑا گہرو جوان تھا۔ اُس کی میس بھی پوری روح بھیگنی شروع نہیں ہوئی تھیں، ابھی اُس کے کھیلنے کودنے کے دن تھے۔ مجھے اُس کی ہانی پر ترس آنے لگا۔ وہ میرے دشمنوں کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ اُس کے چہرے کے بدوخال امر لال سے ملتے جلتے تھے۔ مجھے چندرا کو دیکھنے کے بعد روپ کرن جیسی حسینہ کی بلطرفہ محبت پر تعجب نہیں ہوا۔ وہ یقیناً چاہے جانے کے قابل تھا۔ جس مندر میں چلا جاتا ہوا سیاں اُس کے قرب کے جنون میں سر پھوڑنے کی حد سے بھی گزر جاتیں۔ پجاری میں س کے قدموں میں تڑپ تڑپ کر جان دینے کو کسی اعزاز سے کم نہ سمجھتیں۔ ایک اتار سو بار والی مثال صادق آ جاتی اور.....

”سنسبھلو جمیل احمد خاں.....“ میرے دل نے میری سوچ کو سرزنش کی۔ ”تم جس کے ماننے کھڑے ہو وہ تمہاری کلدیپ کے قاتل کا بیٹا ہے۔ سانپ کا بچہ سنو لا ہی کہلاتا ہے۔ اسے دودھ پلانے کی سوچ رہے ہو؟ کیکر کے درخت سے آم کی فصل کی توقع کرنا پاگل نا ہے۔ تم اسے دس بار معاف کرو گے، یہ سو بار تمہیں پلٹ کر ڈسنے کی کوشش کرے گا۔ سید لاکر اماتی لاشی تمہارے پاس ہے، اسے اٹھاؤ، ایک ہی وار میں اس کا سر کچل دو۔ اس سے بادہ سنہری موقع دوبارہ تمہارے ہاتھ میں نہیں آئے گا۔“

میں سنسبھل گیا۔ میرے اندر پھر آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ میں نے نفرت بھری نظروں سے چندرا کو گھورا۔ موت اُس کے سر پر کھڑی تھی لیکن وہ بے خبری کے عالم سے چار تھا۔ اُس نے جو منڈل کھینچ رکھا تھا اس کی میری نظروں میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ میں رلال کی موجودگی میں سید کی اسی لاشی سے بدری زرائن کا حصار بھی توڑ چکا تھا۔ میں لاشی لٹاتا، منڈل کی ساری شکلتیاں دُم دبا کر بھاگ جاتیں۔ دوسرا وار چندرا کے حسن کی تمام ٹائیاں ختم کر دیتا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ میرا دشمن ہونے کے باوجود کم عقل تھا، ران تھا، بچہ تھا، طفل مکتب تھا۔ میں تجربے کا رتھا، ہندوستان کے بے شمار بڑے بڑے اُت پجاری میری وحشتوں کا شکار ہو کر پر لوک سدھار چکے تھے۔ میرے جنون کے آگے نا کے قدم زیادہ دیر نہیں نک سکے۔ جمیل احمد خان کے نام سے سب واقف تھے۔ چندرا کو نا جہنم نصیب نول کشور نے بڑی تفصیل سے ایک ایک کہانی سنائی ہوگی، محتاط رہنے کا

مل گئیں۔ اُس نے بڑے سکون سے پلٹ کر مجھے دیکھا، اُس کے گداز ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگی۔ آنکھیں یوں چمکنے لگیں جیسے اُس کی دلی مراد پوری ہو گئی ہو۔ اُس کے ہونٹوں کی جنبش بریز ہو گئی۔ میں نے اُس کے تاثرات بھانپ کر سرد آواز میں کہا۔

”کھلی آنکھوں سے دن کے اُجالے میں سینے دیکھ رہا ہے؟..... مورکھ، دماغ میں جو بات بھرا ہے اسے نکال دے۔ مجھے تیرے جنتر منتر کے بیر گھیر کر نہیں لائے ہیں۔ میں خود ہی کر آیا ہوں۔ اب تو میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکے گا۔ سن رہا ہے میری بات.....؟“

”مجھے پورا دوشواں تھا کہ تو اوش آئے گا۔“ اُس نے بدستور فاتحانہ انداز میں کہا۔ ”دیوی گردواروں کی ساری تمیز مٹ جاتی ہے۔ جس کا داؤ چل جائے وہ اپنا کام کر گزرنے سے نہیں چوکتا۔ میں بھی چندرا کو اس طرح پشت سے وار کر کے منڈل کے اندر ہی ڈھیر کر سکتا ہوں۔ اب تو اس کا سوا بھی تھا کہ اُس غریب کو میری شکل دیکھنے کی مہلت بھی نہ ملتی، سیدھا دیوی کے چرنوں میں لے چکھنا ہوگا۔“

ڈنڈوت کرتا ہوا دنیا سے کوچ کر جاتا۔ میں اُسے مار کر نکل جاتا، اُس کی لاش سے حشرات الارض ہزاروں کی تعداد میں لپٹ جاتے۔ روپ کرن دوبارہ تھالی میں بھوجن پروں کے چمکتی چمکتی آتی تو تھالی اُس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی، اپنے پر تبسم کا انجام دیکھ کر وہ چیخ اُٹھتی، چکر اُڑا کر اُس کی لاش پر اوندھے منہ گر جاتی، پنڈت پجاریوں کو خبر ملتی تو وہ بھی ”رام رام“ ستیہ ہے“ کا نعرہ بلند کرتے ہوئے کر یا کرم کے لئے اکٹھا ہونا شروع ہو جاتے۔ کسی کو کان کان خبر نہ ہوتی کہ قاتل کون ہے؟ میرے بارے میں قیاس آرائیاں پھر بھی ہوتیں۔ اب تو میری سوگند پوری ہو جائے گی۔ پرنٹو میں ایسا نہیں کروں گا۔“ اُس میرے لئے چندرا سب سے آسان شکار ہو سکتا تھا، لیکن میں نے اُسے لکارنے کی ٹھان لی۔ ”تو مجھے بالک سمجھ رہا ہے؟ تجھے ابھی میری شکلیوں کا اندازہ نہیں کر بالک..... بس کر..... بس کر دے حرام کے تخم۔“ میں نے کرخت لہجے میں بلی ہے۔“

اُسے مخاطب کیا۔ ”جاپ چھوڑ کر اپنے آپ کو بچانے کی چتا کر۔ آنکھ کھول کر دیکھ، تیرے باپ کا باپ تیرے سر پر موت بن کر کھڑا ہے.....“

چندرا کی محویت میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ جاپ میں مگن تھا۔ میں نے اُسے دوبارہ نہیں چلے گی۔“ اُس نے میرا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ”تیرے بھائی کا سورج ڈوب گیا۔ تیری سہائتا کرنے والے اب اس دھرتی پر نہیں رہے، سب کو آکاش پر بلا لیا گیا۔

”دیوی کو پٹانے کا چکر چھوڑ دے مورکھ..... میری لٹھی گھوم گئی تو سارے جنتر منتر دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔“

اس بار وہ کسمسانے لگا۔ میری بلند آواز اُس کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں

تکر رہا ہوں۔ دیوی نے اُس کے ہاتھ بھی باندھ دیئے۔“

کر سامنے آ گیا۔ پہل بھی اُسی نے کی۔ میری کلدیپ خاموش کھڑی رہی، بار بار امر لال کو سمجھاتی رہی۔ لیکن وہ نہیں مانا۔ بڑا ناز تھا اُسے کالی کی شکتی پر۔ لیکن انجام کیا ہوا؟ کلدیپ نے انگلیوں سے اشارہ کیا، اُس کے شریر کے کٹڑے کٹڑے ہو گئے۔ میں نے بدری نرائن کو خارش زدہ کتوں کی طرح لتھاڑتھاڑ کر مارا۔ سن رہا ہے میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”جمیل.....“ انکارانی تملتا کر بولی۔ ”تم اس سنپو لے کو کیا سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو؟ تمہاری کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ جلدی کرو۔ پہلی فرصت میں اسے ٹھکانے لگا دو.....“

”تم جھوٹ بول رہے ہو جمیل احمد خاں۔“ چندرا نے نفرت کا اظہار کیا۔ وہ مجھ سے خائف نظر نہیں آ رہا تھا۔ ”تم مہا بھارت کی جو رام کہانی سنارہے ہو وہ تمہاری من گھڑت ہے۔ سچ کیا ہے، میں جانتا ہوں۔“

”ایک بات اور جان لے مورکھ.....“ میں ہونٹ چبا کر بولا۔ ”تو نے جو سو گند کھائی ہے وہ ابھی پوری نہیں ہوگی۔ نہ تو دھرتی کی کسی پجاری کو ہاتھ لگا سکے گا نہ آکاش پر اندر کے اکھاڑے کی کوئی زنتکی تیرے شریر کو چھوٹا پسند کرے گی۔ ہمیشہ لنڈو دار رہے گا۔ ابھی سے ہے، گردن نیچی کر لے، میرے چروں پر سر رکھ کر دیا کی بھیک مانگ، میں دجن نہیں دیتا کہ تجھے شاکر دُوں گا، ہو سکتا ہے مجھے تیری جوانی پر رحم آ جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تیرے کٹڑے کٹڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال دوں.....“

”جمیل.....“ انکارا کسمسانے لگی۔ ”جلدی کرو، اسے موقع نہ دو۔ مار ڈالو..... مار ڈالو..... سر پکھل دو اس کا۔“

چندرا میری بات سن کر آگے بڑھا۔ شاید میری بات اُس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ میرے قدموں میں جھکنے کو آمادہ ہو گیا تھا۔ میں خوش فہمی کا شکار ہو گیا، وہ سور کا بچہ اپنی چال چل گیا..... میرے قریب پہنچ کر اُس نے جسمانی قوت کا مظاہرہ کیا۔ وہ بلاشبہ مجھ سے کہیں زیادہ تو مند تھا۔ اُس نے میری ٹانگیں پکڑ کر ہوا میں اچھال دیں..... میں نے فوری طور پر عقل استعمال نہ کی ہوتی تو پتھر کی زین سے ٹکرا کر میرا سر ضرور پاش پاش ہو جاتا۔ انکارانی اچھل کر ایک طرف چلی گئی۔ میں نے اُنھیں میں سستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ چندرا کے ہونٹ بل رہے تھے۔ وہ کسی خطرناک جنت کا ورد کر رہا تھا کہ میری ہتھیلی اُٹھ گئی۔ میں نے ایک

میں چندرا کی زبان سے اپنی کلدیپ کا نام سن کر پاگل ہو گیا۔ میرے صبر کا پیمانہ ٹریز ہو چکا تھا۔ میں نے سید کی لاشی منڈل کی سمت پھینکی، کریناک چیخوں کی آوازیں ابھر رہی، روشنی کے تیز جھماکے ہوئے..... چندرا جس منڈل کو اپنے لئے ناقابل تخیل سمجھ رہا تھا، وہ ٹوٹ گیا.....

چندرا کی آنکھیں پٹ پٹانے لگیں..... وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

”اب بول مورکھ.....“ مجھ..... پاپی..... تو مجھے کیا بھاشن دے رہا تھا؟ بڑے دیدے نکال کر باتیں کر رہا تھا۔ راگ راگنیوں میں الاپ رہا تھا۔ اب سٹی گم ہو گئی۔ مجھے اوپر جانے کی صلاح دے رہا تھا، اب بول، میں تیرے ساتھ کیا کروں؟“

”تم نے چندرا کو چھیڑ کر اچھا نہیں کیا۔ تمہیں پچھتانا پڑے گا۔“ وہ خود کو سنبھال کر بولا۔

”دیوی میری رکھشا کرے گی۔ میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔“

”پھر بڑھنے لگا اوقات سے، پھر شروع کر دیں دیوی اور دیوتاؤں کی باتیں؟“ میں نے زہر خند سے جواب دیا۔ ”کچی گولیاں کھیلی ہوئیں مورکھ تو جمیل احمد خاں کے مقابلے پر آنے کی بھول کبھی نہ کرتا۔ کیا تیرے پرکھوں نے تجھے تیرے اصلی پتا کا نام نہیں بتایا تھا؟ نول کشور کے بل پر اکڑ رہا تھا، خبر ہے اُس کا کیا ہوا؟ میں اُس کی گردن ناپ کر آ رہا ہوں۔ اُس کے سیوک اب اُس کی چتا کی راکھ بھی سمیٹ چکے ہوں گے۔ اور تو یہاں بیٹھا دیوی کے ساتھ آنکھ مٹکا کر رہا ہے؟“

”تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے جمیل احمد خاں۔“ وہ سینہ تان کر بولا۔ ”میں تمہاری پوری کہانی سن چکا ہوں۔ وہ سندرنار درمیان میں نہ آ جاتی تو.....“

”چپ ہو جانظفہ نا حقیق، اپنی گندی زبان بند کر لے.....“ میں چیخ اُٹھا۔ ”تجھے بڑھوٹ گھوٹ کر پلایا گیا ہے اس میں زہر کی آمیزش بھی ہے۔ کلدیپ درمیان میں کبھی نہ آئی اگر تیرا باپ بدری نرائن کو ہتھیلی لگانے کی خاطر درمیان میں نہ آ گیا ہوتا۔ اُس غریب نے تیرے جہنم نصیب باپ سے کہا بھی تھا کہ وہ دونوں درمیان سے ہٹ جائیں، کوئی کسی کی نہ کرے۔ مجھے اور بدری نرائن کو مردوں کی طرح میدان میں چھوڑ دیا جائے، پھر جو جیت جائے۔ لیکن تیرے باپ نے یہ بات نہیں مانی۔ وہ کالی کے بل بوتے پر الکھ نرنجن کا نعرہ لگا

آزمودہ منتر پڑھ کر ہتھیلی کو اُس کی طرف جھٹکا۔ چندرا اڑتا ہوا مندر کی دیوار سے ٹکرایا۔ اُس نے ضبط کا مظاہرہ کیا۔ زمین پر گرتے ہی اُس نے اپنے سینے کا ایک بال توڑ کر کالی کی مورتی کی طرف پھینکا۔ مجھے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ہوا کا ایک گرم جھونکا مجھے دھکیلتا ہوا مندر سے باہر لے گیا۔

”جمیل.....“ انکارانی نے میرے سر پر آ کر بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے اجازت دو، میں چٹکی بجاتے میں کھیل ختم کر دوں گی۔ بات بڑھ گئی تو چندرا اس سے تمہارے ہاتھ میں نہیں آئے گا۔“

مجھے انکارانی کی بات اچھی نہیں لگی۔ شاید وہ چندرا کے مقابلے میں مجھے کمزور سمجھ رہی تھی۔ وہ میرے لمحے لمحے سے واقف تھی، پھر اُس نے ایک غلط بات کیوں کی؟ میں اُسے گھورتا ہوا تیزی سے اٹھا۔

”تم اس وقت میرے سر سے اتر جاؤ انکارانی، میرے اور چندرا کے مقابلے میں ٹانگ پھنسانے کی غلطی بھی مت کرنا۔“

میرا لہجہ کڑھتا تھا، انکا تمللا کر اتر گئی۔ میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ میں نے ارتکا ز اور مراقبہ کا عمل کیا، سید کی لاشی میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ چندرا نے سامنے آ کر دوسرا وار کیا۔ میں نے اُسے تیز نظروں سے گھورا، وہ دُور جا پڑا، مانی بے آب کی طرح تڑپنے لگا..... میں نے اُسے ختم کر دینے کی خاطر اُس کی طرف زور سے پھونکا لیکن وہ برق رفتاری سے قلابازی کھاتا ہوا میری زد سے دُور نکل گیا۔ میں لاشی اٹھانے کی خاطر لپکا، چندرا نے وار کر دیا۔ اُس کے جنتر منتر کے بیروں نے مجھے زمین سے بلند کر کے زور سے چٹا۔ میں نے سر پر دونوں ہاتھ جمائے۔ میری کھوپڑی پاش پاش ہونے سے بچ گئی۔ میں نے سید کی لاشی کو وقتی طور پر نظر انداز کر دیا، اُلٹا ہاتھ بلند کر کے انگلیاں لہرانے لگا۔ آگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے لپکے لیکن چندرا کے قریب جا کر سرد پڑنے لگے۔ شاید اُس نے موقع ملتے ہی دوسرا منڈل کھینچ لیا تھا۔

”جمیل احمد خاں..... اب تم میرا بال بھی میڑھا نہیں کر سکو گے۔“ اُس نے گرج کر کہا۔ ”میں نے اب جو منڈل باندھا ہے اس پر تمہارا کوئی جادو اثر نہیں کرے گا۔“

میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کا انجام دیکھ چکا تھا۔ میں نے بڑی بھرتی سے خود کو زمین پر

گرا کر لوٹ لگائی، سید کی لاشی تک پہنچ گیا۔ چندرا اقبہ لگا کر بولا۔

”اس لٹھ میں کیا بات ہے مہاراج جو تم بار بار اس کی طرف پلکتے ہو.....؟“ اُس نے میرا مضحکہ اڑانے کی کوشش کی۔ ”تم لکڑے تو نہیں ہو جو لکڑی سونگھا کر بچوں کو اغواء کرنے کا کام کرتے ہیں.....؟“

”دیر مت کرو جمیل.....“ انکارانی پھر میرے سر پر آ گئی۔ ”تم نہیں سمجھ رہے، چندرا جان بوجھ کر تمہیں باتوں میں الجھا رہا ہے۔ اُسے کسی کا انتظار ہے۔“

”کس کا انتظار ہے؟“ میں نے حیرت سے وضاحت چاہی۔ ”وہ کون مائی کالا ہے جسے اپنی زندگی پیاری نہیں؟ کس کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا؟ کون جان بوجھ کر موت کے منہ میں چھلانگ لگانے کا خواہشمند ہے؟ اگر کوئی ہے تو اُسے بھی آئیے دو۔ میں چندرا کے ساتھ اُسے بھی نرک میں جھونک دوں گا۔ ایک ساتھی ہو گا تو چندرا کا دل بھی بہلتا رہے گا۔“

”میں مجبور ہوں..... میں تمہیں اُس کا نام نہیں بتا سکتی۔ لیکن اگر وہ سامنے آ گیا تو کھیل خراب ہو جائے گا۔ پھر..... پھر شاید تم چندرا کو آسانی سے مار سکو گے۔“ انکارانی پھر ضد کرنے لگی۔ ”میرا کہا مان لو..... سید کی لاشی اس کی طرف اُچھال دو۔ اس نے جو منڈل قائم کیا ہے، وہ ٹوٹ جائے گا۔ اس کے بعد تم باتوں میں وقت برباد نہ کرنا۔ میں غلط نہیں کہہ رہی۔ تم نے دیر کر دی تو بازی طول پکڑ لے گی۔ یہ سنہری موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

”انکارانی.....“ میں نے اُس کی طرف بڑے غور سے دیکھا۔ ”میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم اب کچھ باتیں مجھ سے چھپانے لگی ہو۔ پراسرار باتیں کرنا آ گیا ہے تمہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا.....؟“

”ایسا نہیں ہے.....“ وہ تمللانے لگی۔ ”مجھے غلط مت سمجھو۔ کچھ مجبوریوں ہیں جو میں زبان نہیں کھول سکتی۔ لیکن میری نظریں آسمان پر خوفناک انسانی ہیولوں کو آپس میں گڈمڈ ہوتا دیکھ رہی ہیں۔ وہ نیچے اتر رہے ہیں..... جو کچھ کرنا ہے جلدی کر گزرو..... تمہارے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔“

”کس وچار میں کھو گئے خاں صاحب؟“ چندرا نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ ”کیا اُس ڈیڑھ باشتی سے کوئی مشورہ کر رہے ہو جو تمہارے سر پر رہتی ہے؟ سننا ہے بڑی نٹ کھٹ، بڑی چیچل حرافہ ہے۔ تم جو چاہتے ہو وہ پورا کر دیتی ہے۔ اسی نے تمہیں منش سے



راکھشس بنا دیا۔ پرکھوں سے سنا ہے کہ اس کی شکتی بھی اپرم پار ہے۔ تم سے نمٹ لوں تو پھر اسے بھی قابو کرنے کے بارے میں غور کروں گا۔“

”سور کے بچے..... خیالوں کے محل بنا رہا ہے۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”موت تیرے سر پر منڈلا رہی ہے اور تو سپنوں کی باتیں کر رہا ہے۔“

میں نے سید کی لالھی اُس کی طرف گھما کر پھینکی۔ لالھی منڈل سے ٹکرائی تو پھر پراسرار شور سے پورا علاقہ گونج اٹھا..... چندرا نے جو حفاظتی خول قائم کر رکھا تھا وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوا تو اُس کی آنکھیں پھر پٹ پٹانے لگیں۔ وہ جان گیا تھا کہ اس لالھی میں کوئی ایسی نادیدہ کراماتی طاقت ہے جو بار بار اسے نگا کر رہی ہے۔ اُس نے آسمان کی جانب توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی، پھر بڑی تیزی سے لپک کر لالھی پر ہاتھ ڈال دیا۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آسمان پر گڈمڈ ہوتے ان خوفناک انسانی ہیولوں کے لئے بھی انتہائی حیران کن رہا ہوگا جن کا ذکر انکارانی نے کیا تھا۔ سید کی لالھی کو ہاتھ لگاتے ہی چندرا کا اُلٹا ہاتھ کلائی تک اس طرح بھک سے اڑ گیا جیسے بارود نے چنگاری پکڑ لی ہو۔ وہ کہنا کہ انداز میں چیخنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے تانگیک شکر سریلی آواز میں کوئی درد بھرا گیت گارہی ہو۔

”نکو سنگھوے کی لالھی چھوٹنے سے کچھ سوا آیا یا بالک؟“ میں زہر خند سے بولا۔ ”بڑا چتر چالاک بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب تیری کھات کھڑی ہونے کا وقت آ گیا۔ تو رائن بیوہ کی طرح رو کیوں رہا ہے؟ کوئی جنت منتر پڑھ کر بھونک، مجھے جلا کر بھسم کرنے کی کوشش کر۔ اپنے بیروں کو آواز دے، اگر وہ بھی نہ سنیں تو اپنے پتا کا نام لے کر بلکنا شروع کر دے۔ شاید اُس کی اتما کو تجھ پر دیا آجائے۔“

چندرا کی چیخیں تھم گئیں۔ لیکن اب اُس کی نگاہوں سے خوف جھانک رہا تھا۔ کبھی وہ سید کی لالھی کو پھٹی پھٹی نظروں سے گھورنے لگتا، کبھی مجھے دیکھ کر ہونٹ چبانے لگتا۔

”سنا ہے تو دندھیا چل کی پہاڑی گبھاؤں میں بیٹھا دیوی کورا ضی کرنے کے کارن کوئی راگ سنار ہاتھا۔“ میں نے اُس کی بے بسی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ”تو نے ماتھے پر تک لگا کر کالی کے چرنوں میں بیٹھ کر سو گند کھائی تھی کہ جب تک مجھے نشت نہیں کر لے گا کسی ناری کے ریلے شیر کو ہاتھ نہیں لگائے گا..... یہ کیا غلطی کر بیٹھا۔ تیری پر تکیا پوری نہ ہوئی تو اُن پجارنوں اور دیو داسیوں کا کیا بنے گا جو بوڑھی ہوتی جا رہی ہیں.....؟ کس کس کے سپنے

کھوٹے کرے گا؟ ابھی وہ بھی آئی تھی، روپ کرن، اندر سے کی گولی، اوپر سے نرم اندر سے گرم۔ دُور سے جھلملا رہی تھی۔ وہ کس کے سہارے زندہ رہے گی؟“

”جیمیل.....“ انکارانی بے چین ہونے لگی۔ ”تم نے میری بات نہیں سنی۔ اب چندرا تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”یہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ یہ بیج کر نکل گیا تو میری کلدیپ کی بے چین رُوح کو قرار کس طرح آئے گا؟ وہ مشن کیسے پورا ہوگا جو پریتم لال میرے حوالے کر گیا تھا؟“

”تم نے باتوں میں وقت ضائع کر دیا..... اب کچھ نہیں ہو سکتا.....“

انکا کے لہجے میں کوئی بات تھی جو میرے دل کی دھڑکنیں ڈانوا ڈول ہونے لگیں۔ میں نے سید کی لالھی اٹھا کر سر سے بلند کی۔ میں اب وقت ضائع کئے بغیر چندرا کو نزک میں جھونکنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن شاید وقت گزر چکا تھا۔ مجھے جو مہلت ملی تھی اُس کی میعاد پوری ہو چکی تھی۔ میں سید کی لالھی تھامے رہ گیا، سیاہ ذرات کا ایک گولہ بڑی تیزی سے میرے اور چندرا کے درمیان حائل ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میری دونوں آنکھوں میں پسلی ہوئی سرخ مرچ جھونک دی ہو..... دوبارہ دیکھنے کے قابل ہوا تو چندرا دُور دُور تک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں چکر اکر رہ گیا۔ میں نے سر پر نظر ڈالی، انکارانی بھی پیچ و تاب کھا رہی تھی..... غلطی میری تھی، میں تسلیم کرتا ہوں، میں نے انکارانی کی بات مان لی ہوتی تو کھیل ختم ہو جاتا۔ لیکن میری خوش فہمی اور خود اعتمادی نے ایک بار پھر مجھے کف افسوس ملنے پر مجبور کر دیا..... اُس نے جو کچھ کہا غلط نہیں تھا۔ یہ پہلا اتفاق نہیں تھا، پہلے بھی متعدد بار میں اُس کے مشوروں کو نظر انداز کرنے کا خمیازہ بھگت چکا تھا۔

”اب..... کیا ہوگا.....؟“ میں ہونٹ چبانے لگا۔

”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ.....“

”میں سن چکا ہوں..... بار بار سن چکا ہوں۔ لیکن میں بھی کیا کر سکتا ہوں؟“ میں جھلا کر بولا۔ پھر مفاہمت کا انداز اختیار کر کے کہا۔ ”چلو ٹھیک ہے۔ میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں..... مجھے بتاؤ انکارانی، وہ کس کے ہیولے تھے جو تمہیں آسمان پر نظر آ رہے تھے.....؟ کس کی شکتی درمیان میں آ گئی؟ چندرا کہاں غائب ہو گیا؟ میری خاطر..... ہاں انکارانی، میری خاطر، صرف ایک بار اور چندرا کو تلاش کر دو۔ پھر میں تم سے.....“

”آگے کچھ نہ کہنا جمیل.....“ میری باتوں نے انکارانی کو موم کر دیا۔ اُس کے چہرے سے تناؤ کی کیفیت چھٹ گئی۔ وہ کچھ دیر تک خلاء میں ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ”تمہیں ایک دن کے لئے بنگلور میں قیام کرنا ہوگا۔ پریشان مت ہو، میں چندرا کو تلاش کر لوں گی۔ وہ میری نظروں سے زیادہ دیر اوچھل نہیں رہ سکتا۔“

میں بے نیل و مرام بنگلور آ گیا۔ انکارانی کی موجودگی میں مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس نے میرے قیام کا بندوبست ایک شاندار ہوٹل میں کر دیا۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر غسل کیا تو ذہن کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا۔ لیکن چندرا کا خیال میرے ذہن کو کچھ لگاتا رہا۔ وہ میرا آخری شکار تھا، میں اُسے تھکیاں دے دے کر آرام سے جہنم رسید کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی نادیدہ قوت درمیان میں آ گئی۔ چندرا بچ کر نکل گیا۔

وہ کس کی قوت تھی جس نے میرے اور چندرا کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کی تھی.....؟

میرے ذہن میں کالی اور دُرگا کا خیال ابھرا۔ پنڈت اوم پرکاش کی موت کے وقت دُرگانے میرا راستہ رد کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکی۔ اُس نے مجھے کمزور کرنے کی خاطر کالی کا روپ دھار لیا، کلدیپ کی آتما پر پابندی لگ گئی، پہرے بٹھا دیئے گئے۔ پر تيم لال کو آسمانوں پر طلب کر لیا گیا، گرو پرتاپ کو بھی میری مدد کرنے کے جرم میں کالی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ مرتے مرتے بھی وہ پر تيم لال سے اپنی دوستی کا حق ادا کر گیا۔

کالی اور دُرگا ایک ہی چہرے کے دو روپ ہیں۔ جن قارئین کو ہندی دیو مالا پڑھنے کا موقع نہیں ملا وہ اردو کی انسائیکلو پیڈیا اٹھا کر دیکھ لیں۔ جس میں بات پارتی دیوی سے شروع ہوتی ہے جو اپنے پتی دیو شیو کے ساتھ ہمالیہ کی بلند چوٹی کیلاش پر رہتی ہے۔ پارتی کا نام بھی پہاڑ (پر بت) کی سکونت کے باعث ہی پڑا۔ پارتی کی شکل میں بھی اُس کے دو روپ ہیں، ایک میں وہ بڑی رحم دل، حسین اور خوبصورت نظر آتی ہے۔ اس روپ میں اسے ”اوما“، ”گوری“ اور ”بھوانی“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے..... دوسرے روپ میں وہ انتہائی بھیاںک، خوفناک، سیاہ فام، قاتل عورت بن جاتی ہے۔ اس روپ میں وہ ”دُرگا“ اور ”کالی مائی“ کہلاتی ہے۔ پارتی کے کچھ اور نام ”بھیروی“، ”بھگونی“، ”ایشوری“،

”گرجا“، ”رجیا“ اور سستی بھی ہیں۔ ہندو اس کی پوجا ”دُرگا“ کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ ”دُرگا پوجا“ کا تہوار بڑے دھوم دھڑکے سے مناتے ہیں۔

مجھے دُرگا یا کالی کے اوصاف یا ان کی گوری کالی صورتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میرے پڑھنے والے گواہ ہیں کہ میں کئی بار کالی کے مندر میں گھس چکا ہوں، جو پنڈت پجاری، سادھو اور گیانی دھیانی میرے جنون کا شکار ہوئے وہ بھی منڈل میں دھونی رما کر انہی دیوی دیوتاؤں سے شتی حاصل کرنے کی خاطر جاپ کرتے رہے تھے۔ لیکن انجام کیا ہوا؟ ایک ایک کر کے سب میری وحشتوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اب صرف چندرا رہ گیا تھا جو میرے ہاتھ آ کر نکل گیا تھا۔ انکارانی جانتی تھی کہ کون میرے شکار کو میرے عتاب، میرے غضب کا نشانہ بننے سے بچالے گیا۔ اُس نے مجھے بڑے واضح الفاظ میں کہا تھا، کچھ مجبور یوں کے سبب وہ مجھے اس کا نام بتانے سے قاصر ہے۔ اُس نے آسمان پر خوفناک انسانی ہیولوں کو آپس میں گڈمڈ ہوتے دیکھا تھا۔ وہ اُس کی وضاحت کرنے سے بھی قاصر تھی۔ میں جوش میں تھا اس لئے اُس کی باتوں کو غلط رنگ دے بیٹھا۔ مگر ہوا وہی جو اُس نے کہا تھا۔ سیاہ ذرات کا خوفناک گولا طوفانی رفتار سے گردش کرتا ہوا نیچے آیا، میری آنکھیں جلنے لگیں، چندرا غائب ہو گیا..... اور اب میں بنگلور میں ایک ہوٹل کے آرام دہ بستر پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا، ذہنی جمناسٹک کر رہا تھا، خیالی گھوڑے دوڑا رہا تھا..... ان خیالوں کا سلسلہ طویل ہوتا گیا۔ رات آئی، گزر گئی۔ میں سوائے اس کے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکا کہ دُرگا نے ایک بار پھر میرے راستے میں حائل ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ اُسی نے ہمالیہ پر بت سے اپنے کسی سیوک کو سیاہ ذرات کے گولے کے روپ میں بھیجا ہوگا جو میری بینائی متاثر کر کے چندرا کو بچالے گیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میری وحشتیں پھر جنون کی سرحدوں کو چھو رہی تھیں جب میرے سر پر ہلکا سا دھماکہ ہوا۔ یہ انکارانی کی آمد کی نشانی تھی۔ میں اُسے عالم تصور میں دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ خالی ہاتھ واپس نہیں آئی۔

”کیا ہوا جان جمیل.....؟“ میں نے وحشتوں کو جھٹک کر بڑے پیار سے اُسے مخاطب کیا۔ ”تمہاری آنکھوں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ

تم نے میرے دشمن کو پالیا ہے۔“

”تمہارا اندازہ غلط نہیں ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”میرے اختیار میں ہوتا تو میں اُسے لا کر تمہارے قدموں میں ڈال دیتی، لیکن وہ پھر منڈل کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے کالی مائی کے نام پر ایک خطرناک جاپ شروع کر دیا ہے۔“

”وہ ہے کہاں.....؟“ میں نے بے چینی سے دریافت کیا۔

”میسور کی پہاڑی پر.....“ وہ کسمسا کر بولی۔ ”تمہیں ایک اور بات سن کر بھی تعجب ہوگا۔“

”وہ کیا.....؟“ میرا اضطراب بڑھنے لگا۔

”اُس کا جو ہاتھ جل کر بھسم ہو گیا تھا، دوبارہ اپنی اصل حالت میں واپس آ گیا۔“

”اور کوئی خاص بات.....؟“

”ہاں.....“ انکارانی نے عجب انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”اب جب تمہارا اور چندرا کا آمناسا منا ہوگا تو میں تمہیں کسی بات کے لئے مجبور نہیں کروں گی۔“

”کیا مطلب.....؟“ میں چونکا۔

”تم اُسے مارنے کے لئے دل کی جتنی چاہے بھڑاس نکال لینا۔“

”میں کیا سمجھوں؟“ میں نے اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کہا۔ ”کیا تم مجھ سے

خفا ہو.....؟“

”یہ بات نہیں ہے.....“ اُس نے جلدی سے جواب دیا۔ ”تم سے خفا ہو کر کہاں جاؤں

گی..... اب ہمارا ساتھ کبھی ختم نہ ہوگا۔“

”تم نے پھر معے میں گفتگو شروع کر دی؟“

”تھوڑا سا انتظار اور کر لو جمیل، ہر بات تمہیں معلوم ہو جائے گی۔“ اُس نے سنجیدگی

سے کہا، پھر موضوع بدل کر بولی۔ ”جمیل۔ تم نے جبرنا کے سلسلے میں جو وعدہ کیا تھا وہ یاد

ہے نا.....؟“ اُس کی آواز بھرانے لگی۔ ”تم نے کہا تھا کہ تم میرے لئے کوئی دوسری جبرنا لا

دو گے..... اس سے بھی بہتر۔“

”ہاں.....“ میں نے ہٹا کر اُس کا دل رکھنے کو کہا۔ ”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔“

”کیا ایک انسان کسی دوسرے کا نعم البدل بھی ہو سکتا ہے.....؟“ انکارانی کی

خوبصورت آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”ہاں.....“ میں نے اُسے دلاسا دینے کی خاطر کہا۔ ”اگر خاصیتیں ملتی جلتی ہوں، جذبوں میں صداقت ہو، انسان آپس میں سچے دل سے سمجھوتہ کر لے، افہام و تفہیم سے کام لیا جائے، دلوں میں گنجائش پیدا کر لی جائے تو ہر بات ممکن ہے.....“ میں نے اپنا جملہ مکمل کر کے گفتگو کا رخ بدل دیا۔ ”ہم میسور کب چلیں گے.....؟“

”جب تم حکم دو.....“ وہ آنکھوں کے راستے میرے دل میں اُترنے لگی۔

اور میں اُسی وقت اُٹھ کھڑا ہوا.....!!



”میری پیاس اب چندرا کے خون سے ہی بجھے گی۔“  
 ”وہ جہاں بیٹھا جا پ کر رہا ہے وہ جگہ یہاں سے دُور نہیں ہے۔“  
 ”مجھے وہاں لے چلو۔“ میں نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

انکارانی میری رہنمائی کرنے لگی۔ مجھے پُر پیچ اور سطح چٹانوں پر قدم جما کر چلنا پڑا۔ ایک ذرا سی غفلت مجھے میلوں نیچے کسی کھڈ میں گرا سکتی تھی۔ تین چار گھنٹے متواتر چلنے کے بعد مجھے چٹان کے اوپر ایک اور چٹان آسمان کی طرح جھکی ہوئی نظر آئی۔ دونوں کے درمیان اونچائی اتنی نہیں تھی کہ میں کھڑے کھڑے آرام سے چل سکتا۔ مجھے مزید احتیاط برتنی پڑی۔ سر جھکا کر چلنا پڑا۔ رفتار میں کمی آگئی۔ لیکن میں بالآخر اُس غار تک پہنچ گیا جہاں سورج کی روشنی بھی موجود تھی۔ شاید غار کے عقبی دہانے پر کوئی جگہ ایسی خالی تھی جہاں سے روشنی آ رہی تھی۔ غار خاصا کشادہ تھا۔ اوپری چٹان بھی بلندی پر تھی۔

میں نے چندرا کو دیکھا جو کمر اکڑائے تا بیٹھا دم آواز میں کسی منتر کا جاپ کر رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ میرے قدموں کی آہٹ پر نہیں چونکا۔ کالی کے جاپ میں بہت زیادہ منہمک معلوم ہوتا تھا۔

”جیل.....“ انکارانی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے، آج میں تمہارے اور چندرا کے بیچ کوئی دخل نہیں دوں گی۔ تم اپنے دل کی تمام حسرتیں پوری کر لینا۔“  
 میں نے اُسے غور سے دیکھا، وہ ناراض نہیں تھی۔ میں نے دو قدم آگے بڑھ کر چندرا کو لکرا۔

”بہت گزر گڑا چکا پاپی، اب کالی کا پیچھا چھوڑ دے۔ آج اس کی شکتی تیرے کسی کام نہیں آئے گی۔ پتھر کی مورلی میں جان ہوتی تو پنڈی پجاری اس کے چرنوں میں تھال سجا سکا کہیں نہ پیش کرتے۔ یہ سارے چڑھاوے تمہارے پروہتوں، پنڈتوں اور پجارنوں کا پیٹ بھرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ تمہارے گیانی دھیانی پنڈتوں نے اچھا ڈھونگ رچایا ہے۔ ادھر کوئی دھرمی عقیدت سے تھال اور ہار پھول رکھ کر ہٹا، ادھر تمہارے پجاری اس کو چٹ کر جاتے ہیں۔ ہار پھول دیو داسیوں کے گلے میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ ان کے بدن اور مہک اُٹھتے ہیں.....“ میں نے بلند آواز میں کہا۔ ”میں غلط تو نہیں کہہ رہا سور کے تخم، یہ باتیں تجھے تیرے پنڈت اور پجاری کبھی نہ بتائیں گے۔ تو جان کر کرے گا بھی کیا، تیرا سے آ

میں نے میسور کی پہاڑیوں پر قدم رکھا تو کلدیپ کی یاد نے مجھے ڈسنا شروع کر دیا.....  
 مجھے ماضی کی باتیں یاد آنے لگیں۔ زخم پر جی کھرٹ منہ کھولنے لگی۔ میں نے طے کر لیا کہ چندرا کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد میں پریتم لال کی اس کنیا پر بھی ضرور جاؤں گا جہاں کلدیپ نے میری خاطر پوری جوانی بچا دی تھی۔ میرے لئے اس سے زیادہ پُرسکون جگہ، راحت بخش ٹھکانا اور کون سا ہو سکتا تھا.....؟

میسور کی پہاڑیوں کے راستے میری آنکھوں میں بے تھے، ایک ایک پگڈنڈی میری دیکھی بھالی تھی۔ میرا ماضی میرے ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا۔ انکارانی بھی اُداس نظر آ رہی تھی۔ چار روز کی تھکن آمیز مسافت طے کرنے کے بعد میں اُس مقام پر پہنچ گیا جہاں میری اور مالا رانی کی ملاقات ہوئی تھی۔ میں درختوں سے گزر کر اُسی جھرنے کے قریب پہنچ گیا جہاں پہلی بار میں نے مالا رانی کو سرتا پا عریاں نہاتے دیکھا تھا۔ وہ اس علاقے میں پریتم لال کے ساتھ برسوں سے رہتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ وہاں دُور دُور تک کوئی دوسرا آدم زاد نہیں ہوگا۔ لیکن میری گناہ گار نظروں کو اس ہوشربا منظر کو دیکھنے کا اتفاق ہو گیا۔ آپ واقف ہیں، یہی اتفاق میری اور پریتم لال کی ملاقات کا سبب بنا تھا۔ اسی اتفاق نے میری کلدیپ کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ اُس نے میری خاطر پریتم لال کی کنیا میں آسن جما لیا۔ جب تک زندہ رہی، میری خاطر دیوی دیوتاؤں کا جاپ کرتی رہی۔ پھر امر لال کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد خود بھی امر ہو گئی۔

میں تا دیر اُس جھرنے کے کنارے کھڑا اپنے ماضی میں گم رہا۔ بڑی دیر گزر جانے کے بعد انکارانی نے مجھے مخاطب کیا۔

”تم یہاں رُک کیوں گئے جیل.....؟ رُکے ہو تو اپنی پیاس بھی بجھا لو۔ اتنا بیٹھا اور ٹھنڈا پانی تمہیں پورے میسور میں کہیں اور نصیب نہیں ہوگا۔“

چکا ہے۔“

چندرا نے آنکھیں کھول دیں، سرخ سرخ نگاہوں سے مجھے گھورنے لگا۔ شاید اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی جلدی دوبارہ موت بن کر اُس کے سر پر سوار ہو جاؤں گا۔ اُس کی آنکھیں سید کی لالھی پر بار بار اٹھ رہی تھیں جس نے دوبار اُس کے منڈل کو توڑ دیا تھا۔

”کیا دیکھ رہا ہے بالک، میں وہی ہوں جسے تو بجل دے کر بھاگ نکلا تھا۔ سیاہ ذرات کے بگولے نے تیری جان بچالی تھی، تجھے چار پانچ روز سانس لینے کا موقع اور مل گیا۔۔۔۔۔ آج ایسا نہیں ہوگا۔ سن رہا ہے تھرا کے پیڑے، مگد کے لڈو۔۔۔۔۔؟“

”تو دیوانہ ہو گیا ہے، گھمنڈی بن گیا ہے۔“ چندرا نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ”بڑی دُور سے چل کر آیا ہے، جا۔۔۔۔۔ جا کر اشان کر لے، کچھ کھا پی لے۔ تیرے چہرے پر جو گرد اور گند جی ہے اسے دُور کر لے، پھر آ جانا۔۔۔۔۔ آج میں تجھے ایسا پاٹھ پڑھاؤں گا جسے تیری آتما بھی کبھی نہیں بھولے گی۔“

”ایک اجازت اور دے دے بالک۔۔۔۔۔ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”بول۔۔۔۔۔“ وہ میرا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ اُس کی گردن اکڑ گئی۔

”تو کہے تو پھول چن لوں۔۔۔۔۔؟“

”کہاں ہیں پھول۔۔۔۔۔؟“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

”تیرے منہ سے جھڑ ہے ہیں۔۔۔۔۔ میں نے مسکرا کر کہا تو وہ تلملانا لگا۔

”پھر اونچا اُڑنے لگا۔۔۔۔۔؟“ اُس نے خود کو سنبھال کر جواب دیا۔ میں نے سید کی لالھی

کو مضبوطی سے تھام کر کہا۔

”چندرا۔۔۔۔۔ میں تجھے ایک موقع دے رہا ہوں، کوئی آخری خواہش ہو تو بتا دے۔ میں نے لالھی گھما دی تو پھر تجھے موقع نہیں ملے گا۔“

چندرا نے منڈل کے اندر بیٹھے بیٹھے پھونک ماری۔ تیز دھار برچھیاں ہوا میں لہراتی ہوئی میری سمت لپکیں۔۔۔۔۔ کوئی اور ہوتا تو اُبل ہوئی شکر قندی کی طرح ایک ہی ہلے میں کئی ٹکڑوں میں منقسم ہو جاتا۔ میں اس قسم کے ہزاروں کھیل تماشا دیکھ چکا تھا۔ میں نے سید کی لالھی سامنے کر لی۔ برچھیوں کی شکل میں نمودار ہونے والے بیر بھیانک چیخ مار کر غائب ہو گئے۔ میں نے چندرا کو لٹکانے سے پیشتر ارتکاز اور مراقبہ کے عمل کے علاوہ حصار بھی

باندھ لیا۔ چندرا نے دوسرا وار کیا۔ اس بار جہاں میں کھڑا تھا وہاں اوپر سے انکارے برسنے شروع ہو گئے۔ میرے حصار سے ٹکرا کر وہ بھی راکھ ہو گئے۔ میں نے ایک انگلی اٹھا کر جھٹکی، گرم راکھ اُڑ کر تیزی سے چندرا کی سمت لپکی۔ وہ گھبرا گیا۔ میں نے ہنس کر کہا۔

”ابھی تو نادان ہے بالک اتنی جلدی بھول گیا کہ تو نے بھی منڈل کھینچ رکھا ہے۔“ میں نے زہر خند سے پوچھا۔ ”بدھی سے کام لینا کب سیکھے گا۔۔۔۔۔؟“

وہ ایک لمحے کو خفیف ہوا، پھر اُس نے دونوں ہاتھ بلند کئے تو بادلوں کی چنگھاڑ شروع ہو گئی۔ میری نگاہوں کے سامنے چٹان کا ایک حصہ شق ہوا، اُس میں سے بھاپ کے ساتھ کھولتا ہوا پانی اتنی تیزی سے اُبل کر میری طرف آیا کہ میں بھی گھبرا گیا۔ انکارانی نے بروقت یاد نہ دلایا ہوتا تو شاید میں بوکھلا کر حصار سے باہر نکل گیا ہوتا۔ چندرا کی آواز چٹانوں میں گونجی۔

”تو بھی ڈر گیا نا۔۔۔۔۔ بڑا مرد بن رہا تھا۔“

”ہاں بالک۔۔۔۔۔ میں انکار نہیں کروں گا۔“ میں نے مردانگی سے اُس کی بات قبول کر لی۔ ”میں بھول گیا تھا کہ تو کس حرام زادے کی اولاد ہے۔ کالی مائی کے علاوہ اُس نے بھی تجھے بہت کچھ دان کیا ہوگا۔۔۔۔۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ تیری جھولی میں جتنی آتش بازی، جتنے پٹاخنے اور ہیں انہیں بھی پھوڑ ڈال۔ تو تھک جائے گا تو میں تجھے لالھی کا کمال دکھاؤں گا۔۔۔۔۔ نرک میں جا کر اپنے پتا کو بھی بتا دینا کہ تو نے کیسے کیسے اچنبھے دیکھے ہیں۔“

میں نے لالھی کو ذرا سا گھمایا تو چندرا کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ اُس نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا، پھر اُس نے ایک ایک کر کے اپنے ترکش کے سارے تیر آزما لئے۔ کبھی خوفناک درندے زمین سے اُبل اُبل کر میری طرف چھلانگیں مارتے، کبھی کوڑیا لے سانپوں کی فصل اُگ آتی، کبھی گاڑھے گاڑھے خون کی بارش ہونے لگتی، حشرات الارض بلبلاتے ہوئے میری جانب لپکتے، کبھی گھپ اندھیرا طاری ہو جاتا، بجلیاں زور زور سے کڑکنے لگتیں۔ میں سب کچھ دیکھتا رہا۔ میں حصار کے اندر محفوظ تھا۔ میں بجل سے کام نہیں لوں گا، میں تسلیم کروں گا کہ چندرا نے وندھیا چل کی بر فانی گپھاؤں میں بیٹھ کر اپنا وقت نہیں ضائع کیا تھا۔ اُس نے بدری نرائن سے زیادہ شکستیاں حاصل کی تھیں۔ جگدیو زندہ ہوتا تو وہ بھی چندرا کو گلے لگا کر تھکیاں دیتا، گرو پر تاپ بھی ششدر رہ جاتا، نول کشور کو خبر



ہوتی تو وہ اُسے ساتھ ہی رکھتا، خود سے علیحدہ نہ کرتا۔

بہر حال میری جگہ کوئی اور کھڑا ہوتا تو اُس کے قدم نہ جانے کب کے اپنی جگہ سے اُکھڑ چکے ہوتے۔ لیکن وہ میری تبت میں گزاری ہوئی زندگی سے ناواقف تھا۔ اُسے کمپالا اور نندا کی پراسرار قوتوں کے بارے میں بھی کوئی علم نہیں تھا۔ اُس نے میرا حصار توڑنے میں بھی کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ میں انکارانی نہیں کروں گا کہ مجھے بھی دانتوں پسینہ آ گیا تھا۔ سیدی متبرک لاشی نہ ہوتی، انکارانی بار بار مجھے نہ ہشکارتی تو گھبرا کر حصار سے باہر آ جاتا۔ بدری نرائن سے آخری معرکہ سر کرتے وقت چندرا کے باپ امر لال نے ایک بار مجھے دھوکہ دے کر حصار سے باہر کھینچ لیا تھا۔ اُس وقت کلدیپ میرے برابر نہ کھڑی ہوتی تو شاید بازی اُسی روز پلٹ جاتی۔

چندرا تھک ہار کر ہانپنے لگا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ پھر بار بار آسمان کی طرف نظریں اٹھا رہا تھا۔

”انکارانی.....“ میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”یہ بار بار اوپر کیا دیکھنے لگتا ہے؟ کیا پھر سیاہ ذرات کا کوئی گولائیچے اُترنے والا ہے؟“

”نہیں..... آج ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن.....“ انکا کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

”تم چیپ کیوں ہو گئیں.....؟“ میں نے وضاحت چاہی۔ ”کیا بات ہے.....؟“

”چندرا کسی کی مدد کا انتظار کر رہا ہے۔“

”کون آئے گا اس کی مدد کرنے.....؟“ میں نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”کون باقی

رہ گیا ہے جسے جمیل احمد خاں کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے؟ کس کو اپنی زندگی عزیز نہیں ہے؟

”تم..... تم کہیں دیوی دیوتاؤں کی نادیہ شکتیوں کی بات تو نہیں کر رہیں.....؟“

”نہیں.....“ وہ کسمسا کر بولی۔ ”چندرا اس وقت اپنے باپ کو یاد کر رہا ہے۔“

”اوہ..... امر لال.....“ میرے اندر جنون سر مارنے لگا۔ ”وہ امر لال جسے میری

کلدیپ نے کٹڑے کٹڑے کر دیا تھا.....؟ غور سے دیکھو انکارانی، وہ امر لال نہیں، اُس کی

بے چین رُوح ہوگی جو چندرا کو میرے سامنے دیکھ کر بلبلارہی ہوگی..... اچھا ہے، آنے دو

اُسے۔ میں آج اُس کی آتما کو بھی شانت کر دوں گا۔ دھرتی سے اس کے سمبندھ توڑ دوں

گا..... خاک میں ملا دوں گا۔“

پھر میں نے چندرا کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اپنے جہنم نصیب باپ کی آتما کا انتظار کر رہا

ہے.....؟ تیرے پلے میں کچھ نہیں رہ گیا.....؟“

”جمیل احمد خاں.....“ چندرا نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”میرے پتا کی شان میں

کوئی غلط شبہ زبان سے نہ نکالنا۔ وہ مہمان تھا، دھرتی پر اُس کے مقابلے کا کوئی دوسرا پنڈت

نہیں گزرا۔ کالی اُسے پسند کرتی تھی۔ تیری سندری نے اپنا جیون داؤ پر نہ لگا دیا ہوتا تو دیوی

اس کی سہائتا کبھی نہ کرتی۔ اب بات کچھ اور ہے۔ تیری سندری کے ہاتھ پیر جکڑ دیئے گئے

ہیں، اس کی آتما کو قید کر دیا گیا ہے۔ میرے پتا کو آج بھی دیویوں کا آشیر واد حاصل ہے۔

اس کی آتما آگئی تو تیری بولتی بھی بند ہو جائے گی۔“

”پھر سپنے دیکھنے لگا؟“ میں نے تحارت سے زمین پر تھوک دیا۔

انکارانی خاموش بیٹھی تماشا دیکھ رہی تھی۔ اُس نے مجھے بازی جلدی منانے کی بات

نہیں کی۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ چندرا کو جکڑ دوں، ایک ہی وقت میں چندرا اور امر لال کی

آتما کا مقابلہ مہنگا پڑ سکتا تھا۔ وہ کسی روپ میں آتا تو اور بات تھی۔ میں نے اپنے ارادے

پر عمل کرنے میں دیر نہیں کی۔ سیدی لاشی گھما کر منڈل کی طرف اُچھال دی۔ کالی کے نام پر

کھینچا گیا منڈل بھی ٹوٹ گیا۔ چندرا بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی نظریں پھر آسمان کی جانب

اٹھیں۔ میں نے شہادت کی اُننگی اٹھا کر دائرے کی شکل میں گھمانی شروع کی۔ چندرا

ڈوریوں اور رسیوں میں جکڑا گیا۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلانے سے قاصر تھا۔ اُس کی نگاہوں سے

ایسیاں اُبلنے لگیں..... میں نے سیدی لاشی اٹھالی۔ چندرا کو گھور کر تحارت سے کہا۔

”چننا مت کر ولد الحرام، میں اتنی جلدی تجھے اوپر نہیں بھیجوں گا۔ امر لال کی آتما کو بھی

نیچے آ لینے دے، آج فیصلہ ہو جائے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ میں روز روز کی بک بک

جھک جھک سے تنگ آ گیا ہوں.....“

میرا جملہ مکمل ہوا تو چٹانیں اس طرح لرزنے لگیں جیسے زلزلہ آ گیا ہو..... میں گھبرا گیا۔

”حصار سے باہر قدم نہ نکالنا جمیل۔“ انکارانی نے تیزی سے کہا۔ ”امر لال کی آتما نیچے

آگئی ہے۔ تم جسے زلزلہ سمجھ رہے ہو وہ اُسی کے جنتر منتر کا چمٹکار ہے۔“

”امر لال.....“ میں نے ججج کر کہا۔ ”اپنی آتما کو کوئی روپ دے کر سامنے آ جا۔

اُجروں کی طرح چھپ کر وار کرنا تجھے شوبھا نہیں دیتا۔ کالی اور دُرگا کے نام کو بٹا لگ جائے

گا..... میری بات سن رہا ہے.....؟“

”ہاں..... میں آگیا ہوں پاپی.....“ چندرا کی زبان سے امر لال کی آواز اُبھری۔  
”آج تجھے دھرتی کی کوئی سختی امر لال کی آتما کے عذاب سے نہیں بچا سکے گی۔ تیرے جیون کے دن گئے چنے رہ گئے ہیں.....“

”کس دھرتی کی بات کر رہے ہو مہاراج؟“ میں زہر خند سے بولا۔ ”اُس دھرتی کی جس پر چندرا ربیوں میں جکڑا کھڑا ہے؟ کچھ لاج کرو امر لال، جب تم زندہ تھے تو اپنی دھرم پتی کے شریر میں گھسے رہتے تھے، آج چندرا کا شریر تمہیں بھا گیا۔“

جواب میں چندرا نے پھیری لی۔ اُس کے جسم کی ذوریاں کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ گئیں۔ میں سمجھ گیا امر لال کی آتما نے کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے سنسجھل کر وار کیا، چندرا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اُس پر نظر جمادی، نندا کے ایک عمل کو آزما یا، وہ لڑھکتا

ہوا میرے حصار تک آگیا۔ میں نے سید کی لاشی اٹھا کر اُس کے سر پر ماری..... اُس کا پورا جسم شعلوں میں گھر گیا۔ اُس کے حلق سے نکلنے والی کر بناک چیخوں کی آوازیں چٹانوں میں صدائے بازگشت بن کر گونجنے لگیں۔ وہ جل کر راکھ ہو گیا..... چٹانیں پھر زلزلے کی کیفیت سے دوچار ہو گئیں۔ امر لال بلبلاتا اٹھا ہوگا۔

”مبارک ہو نیل.....“ انکارانی میرے سر پر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ”چندرا ختم ہو گیا۔ اُس کی آتما بھی فنا ہو گئی۔ اُس نے یہی کہا تھا.....“

”کس نے کہا تھا.....؟“ میں نے وضاحت چاہی۔ لیکن اُس کے جواب دینے سے پیشتر میری نظروں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ چندرا کے جسم کی راکھ نے پھیل کر پھر انسانی خاکے کی لیکریں بنانا شروع کر دیں..... اس خاکے سے اعضاء ترتیب پانے لگے

..... میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اعضاء نے مکمل ہو کر دوبارہ چندرا کی شکل اختیار کر لی۔ وہ اکڑی ہوئی لاش نظر آ رہا تھا۔ پھر میری سانس سینے میں رکنے لگی..... چندرا کی اکڑی ہوئی لاش میں تیزی سے زندگی کے آثار نظر آنے لگے..... اُس کے سینے نے دھڑکنا شروع کیا، اُس کے ہاتھ پیر آہستہ آہستہ متحرک نظر آئے۔ اُس کی آنکھیں کھلیں تو حلقوں کے درمیان دودھ پکے انکارے نظر آئے۔ پھر وہ پھرتی سے اٹھ کھڑا

ہوا..... میری جگہ کوئی کمزور دل آدمی ہوتا تو اُس کی رُوح فنا ہو جاتی، ہارٹ فیل ہو جاتا،

قدموں پر کھڑے رہنے کی بجائے دھڑام سے چٹان پر اوندھے منہ گر جاتا۔ لیکن میں جما کھڑا رہا۔ اس قسم کے مناظر سائنس فکشن پر بننے والی فلموں میں عام نظر آتے ہیں، وہ سب کیمرہ ٹرک کا کمال ہوتا ہے، شعبدے بازی ہوتی ہے، ایڈیٹنگ اور پروسیدنگ کا کمال ہوتا ہے۔ تماشا بینوں کی چیخیں نکل جاتی ہیں جب وہ کسی سرکے انسان کو خود اپنا سر ہاتھ میں اٹھائے چلتے پھرتے دیکھتے ہیں، کچھ بے ہوش ہو جاتے ہیں، بعض کمزور دل آنکھیں بند کر لیتے ہیں، کچھ اٹھ کر سینما ہال سے باہر نکل جاتے ہیں۔ لیکن میں کوئی فلم نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ ایک ناقابل یقین حقیقت تھی۔ اس سے پیشتر میری نظروں نے اتنا خوفناک، دل ہلا دینے والا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”یہ امر لال کی آتما کا کمال ہے جمیل۔“ انکا نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”اُس نے چندرا کے شریر پر قبضہ کر لیا۔ کالی اور ڈرگامل کر اس کی مدد کر رہی ہیں۔ کالی تو میں امر لال کی آتما کے گرد جمع ہو رہی ہیں.....“

میں نے کچھ عمل پڑھ کر اپنے حصار کو مضبوط کر لیا۔ سید کی لاشی کی موجودگی میں مجھے کوئی خوف نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ انکارانی نے مجھے پھر تلقین کی تھی کہ حصار سے باہر نہ نکلوں۔ امر لال کی آتما چندرا کو مرتا دیکھ کر پاگل ہوئی تھی۔ اُسے بھی یقین نہیں رہا ہو گا کہ میں چندرا کو اتنی آسانی سے مار لوں گا۔

”پاپی..... دشت..... ہتیارے..... تو نے چندرا کو مار کر اپنی موت کو آواز دی ہے۔“ امر لال کی آواز چٹانوں میں گونجتی ہوئی اُبھری۔ اُس کی آواز میں کرب اور اذیتوں کے علاوہ حقارت اور انتقام کے جذبے بھی مچل رہے تھے۔ مجھے تعجب نہیں ہوا۔ اُس کی جگہ میں ہوتا تو میری بھی وہی کیفیت ہوتی۔

”تم غلطی پر ہو امر لال.....“ میں نے تلملا کر کہا۔ ”چندرا کو میں نے نہیں، پنڈت نول کشور نے ہشکارا تھا۔ وہ گڑے مُردے اکھاڑنے کی خاطر خود اپنی موت کے دن گن رہا تھا۔ بات وہیں ختم ہو گئی تھی جہاں کلدیپ اور تمہارے درمیان طاقت کا فیصلہ ہوا تھا۔ تمہاری کالی نے اُس کی جھینٹ سویکار کر لی، بات برابر ہو گئی تھی۔ اگر تم مہان سختی کے مالک ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ میں لندن کیوں گیا تھا؟ پنڈت نول کشور نے اپنی دکان چکانے کے لئے بدری نرائن اور تمہارے نام کو استعمال کیا۔ پنڈت پجاریوں کے دلوں میں

طرح وہ بھی اُس کی کرامتوں کا راز جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے چلیوں کو جنبش دی، امرلال چکرار زمین پر گرا۔ اُس نے اُٹھنے کی بجائے جوابی حملہ کیا، میرا حصار ٹوٹ گیا۔ مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ آخری معرکے کے وقت بھی اُس نے میرے حصار کو توڑنے کی خاطر اپنے سارے جتر منتر آزمائے تھے، اُسے کامیابی نہیں ہوئی تھی..... پھر، وہ آج کس طرح کامیاب ہو گیا تھا؟ مجھے سکتے کی کیفیت سے دوچار دیکھ کر وہ بھی حیرت سے پلکیں جھپکاتا ہوا تیزی سے اُٹھا، اُس نے اپنے سر کو تیزی سے جھٹکا، میں قلابازیاں کھانے لگا۔ موت کا تصور میری پلکوں تلے گھوم گیا جب یکنخت کسی نادیدہ قوت نے مجھے چٹان سے ٹکرانے سے بچالیا..... میں نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ امرلال نے ہاتھ فضا میں بلند کئے، لیکن ہاتھ کے ساتھ وہ خود بھی اوپر اُٹھتا چلا گیا۔ دونوں چٹانوں کے بیچ فضا میں معلق ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف کے تاثرات اُبھر آئے۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اُلٹا پاؤں زمین پر مارا، آگ کے شعلے بلند ہو کر امرلال کی طرف لپکے، وہ ہوا میں پتنگ کی طرح تیرتا ہوا ایک طرف ہو گیا۔ میں نے دوسرا وار کیا، وہ لہرا کر دوسری طرف نکل گیا۔ میں نے تابو توڑ حملے شروع کر دیے۔ وہ پتنگ کی طرح فضا میں ادھر ادھر لہراتا رہا۔ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ امرلال کی آنکھیں بھی حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ مجھے تعجب تھا کہ اُس نے پلٹ کر ایک بار بھی میرے حملے کا جواب نہیں دیا..... انکارانی میرے سر پر سہمی بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

”یہ..... یہ کیا ہو رہا ہے.....؟“ میں نے انکارانی سے دریافت کیا۔

”ذور تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے جیل۔“ اُس نے بڑی مدہم آواز میں سرگوشی کی۔

”جس کے ہاتھ میں ہے، وہی چیچ لڑا رہا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”تم کس کی بات کر رہی ہو.....؟“

انکا کوئی جواب نہ دے سکی، امرلال فضا میں بلند ہو کر چٹان سے ٹکرایا۔ اُس کا سر پھٹ گیا۔ اُس کا چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ اسی پر اکتفا نہیں ہوئی، سر پھٹنے کے بعد وہ پہلے لہراتا ہو

دائیں جانب کی چٹان سے ٹکرایا، اُس کے اعضاء ٹوٹ ٹوٹ کر الگ ہو رہے تھے۔ اچانک وہ اوپر کی جانب بلند ہوا، قلابازی کھا کر پلٹا، پھر بڑی تیزی سے سر کے بل سے نیچے آ کر

فرش سے ٹکرایا۔ اُس کے جسم کو آگ لگ گئی۔ وہ جل بھن کر رکھ ہو گیا۔ ہوا کا ایک تیز جھوٹ

نفرت کے بیج بھی اُسی نے بوئے تھے، چندرا بھی اُس کے بہکاوے میں آ گیا اور تم..... تم نے بھی اُسے سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ کیا تمہیں میری شہمتی اور حالات کا علم نہیں تھا.....؟“

”شہمتی کی بات مت کر پاپی.....“ وہ بل کھانے لگا۔ ”جب میں نے تیری سندری پر وار کیا تھا اُس سے تو بھی وہاں موجود تھا۔ یاد ہے تجھے، اُس کے جسم میں کتنی سوئیاں چبھ گئی تھیں، میں نے تیرے سامنے اُسے ننگا کر دیا تھا۔ اُس کے اُبلے شریر کو سیاہ کر دیا، اُس کے پورے بدن پر آبلے اُبھر آئے تھے، اُس کا چہرہ بھیانک کر دیا تھا، وہ کشت کی حالت سے دوچار تھی، مجھے بعد میں خبر ملی کہ وہ دیوی کو اپنی بھیٹ کا وچن دے چکی ہے۔ میں مندر کی اور اسی کارن دوڑا تھا کہ دیوی کو راضی کر لوں، مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو میں اپنی بھیٹ پیش کر دیتا، تیری سندری کی ایک نہ چلتی۔ میں اُس کے ساتھ تجھے بھی نرک میں جھونک دیتا۔ بدری نرائن بھی نہ مرتا، چندرا اوتیرے منہ لگنے کی ضرورت بھی نہ پیش آتی.....“

”تو کب اس کر رہا ہے.....؟“ میں نے غضب ناک لہجے میں جواب دیا۔ ”میری کلدیپ

نے تجھے درمیان سے ہٹ جانے کو کہا تھا، تو نے اُس کی بات نہیں مانی، تجھے شہمتی آزمانے

کی دعوت بھی اُسی نے دی تھی۔ وہ پہل کر دیتی تو تجھے چسکا دکھانے کا موقع کبھی نہ ملتا۔ تو

نے جو کچھ کیا، مجھے یاد ہے..... تجھے بھی یاد ہو گا کہ اُس نے تجھے کئی موقع دیئے تھے،

جوابی حملہ کرنے سے پہلے بھی اُس نے تجھ سے اجازت لی تھی، پھر ایک بل میں وہ اپنی اصلی

حالت میں آ گئی۔ اُس نے صرف اپنا لڑتا ہاتھ اٹھایا تھا، تو بلبل اُٹھا، تیرے شریر سے خون

اُبلنے لگا، جان بچانے کی خاطر تو مندر کی طرف بھاگا تھا۔ اُس نے اُنکی گھمادی، تیرے

شریر کے ٹکڑے ہو گئے۔ اب وہ نہیں رہی تو شیخی بگھار کر مہمان بننے کی کوشش کر رہا ہے۔“

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ میں غصے سے لرز رہا تھا۔ ”یاد ہے تجھے کہیں؟ میں اُس وقت

بھی تجھ سے بھڑ گیا تھا۔ میں نے تیری ہڈیاں جھاڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کلدیپ کو زخا دے

بڑبڑولے، اُسی نے مجھے راستے سے ہٹنے کو کہا تھا، ورنہ میں بدری نرائن کی طرح تجھے بھی اٹھاڑ

لتھاڑ کر مارتا۔“

امرلال، چندرا کے زوپ میں سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی دہکتی ہوئی آنکھوں سے شعلے نکل

رہے تھے۔ میں نے سید کی لاٹھی پر اپنی گرفت مضبوط کی لیکن مجھے حملہ کرنے کی مہلت نہیں

ملی۔ امرلال اُچھل کر دُور چلا گیا۔ اُس کی نظریں اب لاٹھی کو گھور رہی تھیں۔ پریم لال کی

آیا، اُس کی راکھ کو اُڑا لے گیا۔ میں نے انکارانی پر نظر ڈالی، وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں نے اُسے اتنا خوفزدہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”تمہیں کیا ہو گیا.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”بیچ ختم ہو گیا..... کنکوا (پنگ) کٹ گیا.....“ وہ سید مجذوب کی آواز تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، وہ ایک طرف چٹان سے لگا بیٹھا اس طرح دونوں ہاتھ چلا رہا تھا جیسے چرنی پر ڈور پلیٹ رہا ہو..... بات میری سمجھ میں آگئی۔ امر لال کی آتما کالی طاقتوں کے ساتھ مجھے گھیرنے آئی تو وہ میرے بچاؤ کو آگیا..... وہی بیچ ختم ہو جانے کے بعد ڈور پلیٹ رہا تھا۔ انکارانی کا اشارہ اُسی کی طرف تھا، اُسی کی وجہ سے وہ سہمی سہمی نظر آرہی تھی۔ سید نے کھیل ختم کرنے کی ٹھان لی ہوگی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ درمیان میں کبھی نہ آتا۔ میرا دل بھرا آیا۔

”اب تو میری انگلی پکڑ لو سید.....“ میں نے التجا کی۔ ”مجھے کوئی ٹھکانا بتا دو جہاں میں سکون سے بیٹھ سکوں۔“

”جا کر نہا لے..... گند صاف ہو جائے تو اوپر کی طرف دوڑ لگا دینا.....“ سید نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ ”پودنی کے کہنے پر ٹھمکے مت لگانا..... داماد مست قلندر کیا کر۔“

میں اُس کی طرف لپکا، وہ پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ انکارانی کی سانس بحال ہو گئی۔ اُس نے سکون کا سانس لیا۔ میں بڑی دیر تک اسی جگہ کھڑا حالات پر غور کرتا رہا۔ انکارانی پھیل کر بیٹھ گئی تھی۔ مگر اب بھی گم صم نظر آرہی تھی۔ سید کے آخری جملے میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ میں تھکے تھکے انداز میں قدم اٹھاتا غار سے باہر آ گیا۔ میری رفتار سست تھی، ذہن میں سائیں سائیں کی آوازیں گونج رہی تھیں، ہنگامے ختم ہو جائیں تو اسی قسم کی صدائیں تعاقب شروع کر دیتی ہیں۔ میں مصطل انداز میں اپنی تھکی ماندی زندگی کو قدموں پر گھسیٹتا پھر اُسی جھرنے پر پہنچ گیا۔ انکارانی میرے سر سے اتر گئی۔ وہ میرا ارادہ بھانپ چکی تھی۔ میں نے ایک کچ میں جا کر لباس اُتارا، اوپر سے گرتے جھرنے کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھنڈا پانی جسم پر پڑا تو ذہن پر طاری کسلندی دور ہونے لگی۔ میں نے رگڑ رگڑ کے جسم سے سارا میل دور کیا۔ کسی جھرنے کے پانی سے نہانے کا پہلا اتفاق تھا۔ میں دیر تک غسل کرتا رہا۔ پھر میں نے خود کو ایک پتھر سے نکا دیا۔ پہاڑوں پر جھرنے سے نہانے والے تو یہ نہیں استعمال کرتے، دھوپ کی خوشگوار گرمی اور ہوا کے مست جھونکوں سے جسم

خشک کرتے ہیں۔ کچھ دیر بعد میں تازہ دم ہو گیا۔ میں لباس زیب تن کر کے کچ سے باہر آیا تو انکارانی دوبارہ سر پر آگئی۔ اُس کے گلابی ہونٹوں پر زندگی کے اثرات واپس آ رہے تھے۔ میں نے اُسے چھیڑنے کی خاطر کہا۔

”تم لباس اُتارتے وقت میرے سر سے اتر کیوں گئی تھیں؟ پہلے تو تم بڑی ڈھیٹ ہوا کرتی تھیں۔“

”وقت کے ساتھ ساتھ انسان کو بدلتے رہنا چاہئے.....“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”اب کیا ارادے ہیں.....؟“

”یہاں تک آیا ہوں تو ایک نظر کلدیپ کی کنیا پر بھی ڈالتا چلوں۔“ کلدیپ کی یاد آئی تو میں پھر اُداس ہو گیا۔

”کیا سوچنے لگے.....؟“

”اب تھک گیا ہوں۔ کہیں آرام سے بیٹھنا چاہتا ہوں۔“

”کلدیپ اور پریتم لال کے استھان سے زیادہ اور کون سی پرسکون جگہ ہوگی؟“

”ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ ”میرے دشمن مجھے کبھی سکون سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ بار بار ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتے رہیں گے۔“

میں انکارانی سے باتیں کرتا اُس مقام تک پہنچ گیا جہاں کلدیپ رہا کرتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جگہ اب ویران ہو گئی ہوگی۔ اُجاڑا اجاڑ محسوس ہوگی۔ لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ علاقہ اب بھی سرسبز و شاداب تھا جیسا پریتم لال کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ وہ کنیا بھی اصلی حالت میں تھی جس میں، میں نے اُسے آخری بار دیکھا تھا۔ لیکن اب کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے سامنے سبزے پر دونوں اطراف پھول دار درخت بڑے سلیقے سے لگے نظر آ رہے تھے۔ میں قدم قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں کک تھی، بیتے دنوں کی یاد مجھے تڑپا رہی تھی جب میں نے کلدیپ کو دیکھا۔ وہ اچانک اپنے حسن کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میرے سامنے آگئی تھی۔ میرے دل کے آگن میں جیسے بہار آگئی ہو۔ انکا میرے سر سے نہیں اُتری۔

”کلدیپ..... تم.....؟“ میں نے اُسے ڈرتے ڈرتے مخاطب کیا۔

”ہاں جمیل..... تم برسوں بعد آئے ہو، میں تمہارے قدموں کی آہٹ سن کر کنیا سے

باہر آگئی۔ تمہارا سواگت کرنا تو میرا دھرم ہے.....“ اُس کے لہجے میں محبت کی چاشنی گھل گئی۔ ”اب تم یہیں رہنے کی ٹھان لو واپس پلٹ کر مت دیکھنا۔ بلندیوں پر رہنے کی عادت پڑ جائے گی تو تم خود بھی نیچے کی طرف رُخ نہیں کرو گے.....“

”اور اگر تم نے پھر ساتھ چھوڑ دیا.....؟“ میں نے تڑپ کر پوچھا۔

”میں تم سے دُور کب ہوئی تھی.....؟“ اُس کا انداز دلربانہ تھا۔ ”اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھو، میں اب بھی تمہارے دل کی ایک ایک دھڑکن میں موجود ہوں، ہمیشہ رہوں گی۔ وہی میری اصلی جگہ ہے۔ جہاں میرے سوا کوئی اور قبضہ نہیں کر سکتا۔“

”تمہاری باتیں آج بھی تمہاری ہی طرح خوبصورت اور حسین ہیں۔“ میں شوخ ہونے لگا۔ ”دل کو گرمانے والی..... لیکن.....“ میں نیکھت خاموش ہو گیا۔

”لیکن کیا جمیل؟ تم چپ کیوں ہو گئے.....؟“ اُس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ اُس کی نیل کنول جیسی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

”تم..... تم تو مر گئی تھیں؟“ میری آواز بھرا گئی۔ ”کیا تم نے دوسرا جنم لیا ہے.....؟“ ”نہیں.....“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”دوسرے جنم کی باتیں جھوٹی ہیں، من کا بہلاوا ہیں، انسان جنم لیتا ہے تو اسے موت بھی ضرور آتی ہے۔ لیکن سچا پریم امر ہوتا ہے، کبھی نہیں مرتا۔ شریر کے سمبندھ تو بڑے عارضی ہوتے ہیں، کالج کے گلاسوں کی طرح، ذرا ٹھیس لگے تو ٹوٹ جاتے ہیں۔“

”مم..... میں تمہیں کیا سمجھوں.....؟“

”اپنا سچا پیار، اپنی سچی محبت، اپنی کلد پیپ۔“ وہ شرمناک بولی۔ ”کلد پیپ جو تمہارے من میں ہمیشہ خوشبو کی طرح رچی بسی رہے گی۔“

میں نے دودھ کر اُس کو ہاتھوں کے حصار میں لینا چاہا، وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ شاید وہ میرا تصور تھی، میرے پیار کی شدتوں نے ایک خیالی رُپ میرے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ میرے دل کی دھڑکنوں میں میرے ساتھ ساتھ رہے گی۔ اُس نے غلط نہیں کہا تھا، وہ میرا پیارا تھی، اُس نے میری زندگی کی خاطر اپنی جوانی برباد کر دی۔ وہ کبھی نہیں مر سکتی تھی۔ وہ میرے دل میں، میرے خیالوں میں، میری سانسوں میں شریک تھی، اُس کی جگہ جین بھی نہیں لے سکی.....

”جمیل.....“ انکا نے دبی زبان میں کہا۔ ”آگے بڑھ کر ایک نظر کنیا کے اندر بھی جھانک لو۔ وہاں بھی کوئی تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھا ہے۔“

”کون..... کون ہو سکتا ہے؟ کلد پیپ کے بعد اور کون باقی رہ گیا.....؟“ مجھ پر دیوانگی طاری ہونے لگی۔

”تم تزئین کو کیوں بھول رہے ہو.....؟“

”ہاں.....“ میرے اندر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لندن سے واپسی کے بعد میں تزئین سے نہیں مل سکا تھا۔ وقت اور حالات نے اتنی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ انکارانی نے تزئین کا نام لیا تو میرے دل میں اُس کی محبت جوش مارنے لگی۔ میں کنیا کی طرف بڑھتے بڑھتے رُک گیا۔

”تم رُک کیوں گئے؟“ انکارانی نے تعجب سے پوچھا۔

”مجھے اچانک ایک خیال آ گیا.....“ میں نے کہا۔ ”میں تمہارا مقروض ہوں، سید کے آ جانے سے تمہاری دعوت کا اہتمام نہ کر سکا۔“

”میں سمجھی نہیں.....؟“

”میں چندرا کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے یاد ہے تم نے کہا تھا کہ اس کے خون میں تاڑی جیسا سوندھا سوندھا نشہ بھی ضرور ہوگا۔“

”تم اپنا وعدہ پورا کرتے تو بھی میں انکار کر دیتی.....“ انکا آسمان کی بلندیوں میں گم ہونے لگی۔

”میں سمجھا نہیں.....؟“

”غلط مت سمجھنا.....“ اُس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ ”تمہیں یاد ہے ناکہ ایک پنڈت مجھے حاصل کرنے کے لئے جاپ شروع کر چکا تھا۔ وہ کامیاب ہو سکتا تھا، لیکن تمہارے مرد قلندر کے ایک اشارے نے اُس کی لٹیا بھی ڈبودی۔ اُس نے کہا تھا کہ اب دنیا کی کوئی قوت مجھے تسخیر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی، میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی۔ آج تمہیں ایک راز کی بات اور بھی بتاؤں۔“

میں نے جواب نہیں دیا، خاموشی سے اُس کی بات سنتا رہا۔

”تم جب حویلی میں ایک بزرگ کے مزار پر گئے تھے مجھے اُسی وقت پنڈت شیوا کے



بارے میں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ نارنگ کی حویلی میں تمہاری موجودگی کی بھنک پا کر نکل بھاگنے کی سوچ رہا ہے۔ میں اُسے روکنے کے لئے روانہ ہوئی تھی۔ لیکن کسی نے میرا راستہ روک لیا۔ جانتے ہو اُس شکتی نے مجھ سے کیا کہا تھا.....؟“ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”اُس نے کہا تھا کہ اپنی کھال میں رہا کر..... زیادہ پھدکنے کی کوشش کی تو پر قہقہہ کر دوں گا..... کلدیپ اور پریم لال کی آتماؤں کو بھی اسی نے تمہارے معاملات میں مداخلت سے روک دیا تھا، اس میں دُرگیا کالی کا ہاتھ نہیں تھا۔ نارنگ کی حویلی میں کلدیپ نے امریتا کے روپ میں تم سے اپنی مجبوری کا جو ذکر کیا تھا اس میں بھی دُرگیا کالی کی شکتیوں کا کوئی دخل نہیں تھا۔“

”پھر..... پھر وہ کون تھا.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”سب کچھ اُسی مرد قلندر کے اشارے پر ہو رہا تھا۔“ انکارانی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”کبھی وہ سامنے آئے تو میری سفارش بھی کر دینا۔ اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا، لیکن میں نے بھی اُسے اپنا بڑا مان لیا ہے، وہ مہمان شکتیوں کا مالک ہے۔ ہم اور تم تو اُس کے قدموں کی دھول بھی نہیں۔“

میرے ذہن میں پھر ماضی کے کچھ مناظر گھومنے لگے۔ میں نے کئی موقعوں پر انکارانی کی سرزنش کی تھی، اُسے جھڑک دیا تھا، سر سے اُتر جانے کا حکم دیا تھا۔ وہ تلخ باتوں کو برداشت کرتی رہی، اُس نے کبھی شکوہ نہیں کیا۔ سب سید مجذوب کی مہربانی تھی جو میری پشت پناہی کر رہا تھا۔ مجھے اس کی بھنک بھی نہ ملی، انکارانی کو بھی اس کا راز افشا کرنے کی جرأت نہیں ہو سکی۔

میں اپنے خیالات میں مستغرق تھا، مجھے سید کی مہربانیاں یاد آ رہی تھیں۔ میں تا دیر انہی خیالوں میں غرق رہا، پھر مجھے اپنی تزمین یاد آ گئی۔ انکارانی نے کہا تھا کہ وہ کنیا میں میری راہ دیکھ رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا آگے بڑھا لیکن کئی کے دروازے پر پہنچ کر ایک جھٹکے سے ٹک گیا۔ میری آنکھیں پٹ پٹانے لگیں۔ میرے سامنے تزمین نہیں، جھرتا کھڑی تھی..... وہ شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔ دوپٹے کا پلو اُس کے سر پر پڑا تھا۔ بڑی معصوم، بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ لیکن..... وہ تزمین نہیں تھی۔ میں نے اندر کے ساز و سامان پر نظر ڈالی، مجھے وہاں جانماز اور اپنی مقدس کتاب رعل پر رکھی نظر آئی۔ مجھے تعجب ہوا۔ میں نے پلٹ کر انکا

انی کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا، اُس کی آنکھوں کے گوشے بھیکنے لگے، لمسا کر بولی۔

”تم اتنی جلدی بھول گئے جمیل.....؟ مجھے تمہارا کہا ہوا ایک ایک لفظ حرف بحرف یاد ہے۔ تم نے کہا تھا کہ اگر خاصیتیں ملتی جلتی ہوں، جذبوں میں صداقت ہو، انسان سچے دل سے آپس میں سمجھوتہ کر لے..... افہام و تفہیم سے کام لیا جائے، دلوں میں گنجائش پیدا کر لی جائے تو ہر بات ممکن ہے..... یاد ہے تمہیں.....؟“

”تو کیا تزمین.....؟“ میری آواز حلق میں گھٹ گئی۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں جوار ہانے کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔

”ہاں..... تزمین اب اس دنیا میں نہیں رہی۔“ انکا کی آنکھیں برسے لگیں۔ ”ہر دوام میں جب تم پنڈت نول کشور کی قید سے نکل آئے تھے تو وہ پاگل ہو گیا تھا۔ اُس نے تمہیں کمزور کرنے کی خاطر ہماری تزمین کو درمیان سے ہٹا دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ تمہیں تزمین کے بارے میں علم ہوا تو تم واپس بمبئی چلے جاؤ گے، اُسے سنبھلنے کا موقع مل جائے گا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر تزمین کی موت کی خبر تم سے پوشیدہ رکھی۔ وہ وقت کا تقاضہ تھا جمیل، میں نے جھرتا کی موت کی آڑ لے کر اپنی تزمین کے لئے آنسو بہا لئے۔ وہ مجھے بہت زیادہ عزیز تھی۔ مرد قلندر کا اشارہ بھی یہی تھا کہ میں زبان کھولنے سے گریز کروں۔ رکن الدین کی حویلی میں بھی سب کو تاکید کر دی گئی تھی کہ کوئی تزمین کے سلسلے میں زبان نہ کھولے۔“

اُس نے بات جاری رکھی۔ ”اُس مرد قلندر کو بھی احساس تھا کہ تزمین کی موت تمہیں اور تمہارا کردے گی۔ اُس نے جھرتا کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا، اُس کی کایا پلٹ دی۔ کل تک یہ کھلے سر پنڈت پجاریوں کے سامنے پتھر کی مورتیوں کے بیچ اُچھلتی پھرتی تھی، اب یہ پانچوں وقت اپنے مالک کے سامنے سجدہ کرتی ہے، مقدس کتاب پڑھ رہی ہے۔ سب اُسی قلندر کی نگاہ عنایت کا نتیجہ ہے۔ اُسی نے اس کا نام بھی تزمین ہی تجویز کیا ہے.....“

میرے دل پر شستر چل رہے تھے۔ میں کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ میری زندگی کی آخری پونجی بھی تزمین کی شکل میں میرے دشمنوں نے لوٹ لی تھی۔ انکارانی اپنے حصے کے آنسو بہا چکی تھی، اب میں خون کے آنسو رو رہا تھا، مایہ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا جب وہ معصوم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میرے قریب آ گئی۔ سید نے اُسے عقل و شعور کی بے پناہ

دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ وہ میرے دل کا درد سمجھ گئی تھی۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں ڈرتے ڈرتے کہا۔

”بابا..... میں تمہاری خدمت کروں گی۔ میرا اس دنیا میں اب تمہارے سوا اور کون رو گیا ہے؟ تم مجھے اپنی تزئین نہیں قبول کرتے، نہ کرو۔ میں نوکرائی بن کر بھی تمہاری سیوا کروں گی۔ ہاں..... تم جس نام سے بھی پکارو گے میں دوڑ کر تمہارے پاس آ جاؤں گی۔“

اُس کی باتوں میں جذبوں کی صداقت تھی۔ میرا دل بھر آیا، میں نے اُسے بے تحاشہ ہاتھ بڑھا کر کھینچ لیا۔ اپنے سینے کی گہرائیوں میں چھپا لیا۔ اُس کی پلکوں سے بھی سادوں کی جھڑی لگ گئی۔ باہر سورج غروب ہو رہا تھا جب کسی کے بڑے خوش الحان انداز میں اذان دینے کی آواز سنائی دی۔ میں حیرت سے پلٹ کر سبزے کی طرف آیا جہاں ایک خوش پوش شخص سر پر عمامہ باندھے، قبلہ رخ کھڑا اذان دینے میں مصروف تھا۔ میرا دل نام معلوم جذبوں سے سرشار ہونے لگا۔ میں دُور کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ اذان دینے کے بعد فارغ ہوا تو میں لپکتا ہوا اُس کے قریب چلا گیا۔ اُس کے چہرے کے خدو خال نظر آئے تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، وہ سید مجذوب کے سوا اور کوئی نہیں تھا..... میں تیزی سے اُس کی طرف لپکا۔ اُس روز وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوا..... نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھی اُس کی امامت میں پیچھے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ لئے۔ میرے دل کا سارا غبار چھٹنے لگا.....!!

www.allpdfstuff.blogspot.com

(تمت بالخیر)

www.allpdfstuff.blogspot.com

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ  
بے شک اللہ ہر شے پر قادر ہے

www.allpdfstuff.blogspot.com